

فتاویٰ

اصحاب الحدیث

تالیف

فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد



مکتبہ اسلامیہ





مکتبہ ابن قیم
سلطان کالونی، میاں چنوں

مکتبہ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب .... فتاویٰ اصحاب الحدیث

www.KitaboSunnat.com

جلد .... اوّل

تالیف .... فضیلۃ الشیخ ابو محمد حافظ عبدالستار الحماد

ناشر .... محمد سرور عاصم

کمپوزنگ/ڈیزائننگ .... مکتبہ اسلامیہ پرنٹرز

اشاعت .... جون 2007ء

قیمت ....



لاہور بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار فون: 042-7244973

فیصل آباد بیرون امین پور بازار کوتوالی روڈ فون: 041-2631204

فہرست

تفصیلی فہرست کے لیے صفحہ نمبر 501 ملاحظہ فرمائیں۔

ابتدائیہ طبع دوم

الحمد للہ صاحب الجلالۃ والصلوٰۃ والسلام علی خاتم الرسالۃ

فقہ الحدیث کا موضوع، پوری تعلیماتِ اسلام پر مشتمل ہے، جس میں عقائد ونظریات عبادات ومعاملات معاشرت و معیشت اور اخلاق وسیاست کے مسائل کا حل موجود ہے فتاویٰ اصحاب الحدیث اس سلسلہ کی ایک ادنی سی کاوش ہے جسے اللہ کے فضل وکرم سے بے پناہ پذیرائی نصیب ہوئی مکتبہ اسلامیہ نے جنوری 2006ء میں اسے پہلی مرتبہ شائع کیا، ایک سال کے قلیل عرصہ میں اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا اہل علم اور دیگر علم دوست حضرات نے اس کی عدم دستیابی کو بڑی شدت سے محسوس کیا چنانچہ قارئین کرام کی آراء وتجاویز کی روشنی میں اب اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جارہا ہے جو اللہ کے فضل وکرم سے ''نقاش، نقش ثانی بہتر کشد ز اول'' کا مصداق ہوگا۔

پہلے ایڈیشن میں تفصیلی فہرست شامل اشاعت نہ تھی، جس کا ہمیں خود بھی احساس تھا اور قارئین نے بھی اس کمی کو محسوس کیا دراصل اسے ترتیب نو دیتے وقت متعلقہ مواد کو چودہ بڑے بڑے عنوانات میں تقسیم کیا گیا تھا جسے فہرست کے طور پر شروع میں لگادیا گیا، لیکن عام قاری کو مسئلہ تلاش کرنے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ اس نقش ثانی میں تفصیلی فہرست کو شامل اشاعت کرکے اس کی تلافی کردی گئی ہے اس کے علاوہ کچھ اہل علم کی طرف سے تخریج احادیث کے متعلق آراء موصول ہوئیں کہ اسے جدید انداز میں ہونا چاہیے، چونکہ عام قاری کو اس کی ضرورت نہیں ہے اس لیے ہم نے دانستہ اس سے پہلوتہی کی ہے نیز فتاویٰ اصحاب الحدیث کی دوسری جلد مرتب کرکے مکتبہ اسلامیہ کے حوالے کردی ہے امید ہے کہ وہ جلد ہی قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی ان شاء اللہ۔

قارئین کرام! فتاویٰ اصحاب الحدیث میں اگر کوئی خوبی ہے تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں بلکہ محض اللہ کا فضل ہے جس کی توفیق سے ہم اس خدمت کے قابل ہوئے، اور اگر کوئی کمزوری رہ گئی ہے تو ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی طلب کرتے ہوئے قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ حسب سابق ہماری راہنمائی کریں تاکہ آئندہ اشاعت میں اسے دور کردیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے ہاں شرف قبولیت سے نوازے اور امت مسلمہ کو اس سے استفادہ کی توفیق دے نیز مرتب، قارئین اور دیگر کارکنان کے لیے اسے ذخیرہ آخرت بنائے (آمین یارب العالمین)

ابو محمد عبدالستار الحماد
نواب کالونی میاں چنوں
جون 2007م
جمادی الثانی 1428ھ

خطبہ مسنونہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ وَمَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝﴾ [۳/آل عمران:۱۰۲]

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝﴾ [۴/النساء:۱]

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ۝﴾ [۳۳/الاحزاب:۷۰،۷۱]

أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَأَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ. [ماخوذ من کتب الحدیث]

یقیناً تمام تعریفوں کے لائق اللہ تعالیٰ ہے، ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی سے معافی کے طلبگار ہیں، نیز ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے نفوس کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی برائیوں سے پناہ لیتے ہیں، جسے اللہ ہدایت یافتہ کردے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

''اے ایمان والو! اللہ سے ایسے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تمہیں موت نہیں آنی چاہیے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔''

''لوگو! اپنے اس پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان دونوں سے بہت سارے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، نیز اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو نیز قریبی رشتوں کے معاملہ میں بھی اللہ سے ڈرتے رہو بلاشبہ اللہ تم پر ہر وقت نظر رکھے ہوئے ہے۔''

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ اور سیدھی بات کرو، وہ تمہارے کام درست کردے گا اور تمہیں بخش دے گا اور جس شخص نے خوشی سے اللہ اور اس کے رسول کا کہا مان لیا اس نے بڑی کامیابی حاصل کرلی۔''

امابعد! یقیناً سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے، اور سب سے اچھی راہنمائی حضرت محمد ﷺ کی راہنمائی ہے اور بدترین کام دینی معاملات میں خودساختہ چیزیں ہیں اور دین میں ہرنئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں لے جانے والی ہے۔

حرف اول

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں احسان ہے کہ اس نے ہمیں خوب صورت انسان بنانے کے بعد خوب سیرت بننے کے لئے ایک ایسا ضابطہ حیات عطا فرمایا ہے جس کی رات بھی دن کی طرح تابدار اور روشن ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے پاس ایسی ملت بیضا لے کر آیا ہوں جس کی رات بھی دن کی طرح چمکدار ہے اس سے وہی شخص دور رہے گا جس نے خود تباہ و برباد ہونے کا ارادہ کر لیا ہو۔'' (مسند امام احمد: ج ۴،ص ۱۲۶) اس طرز زندگی کا دوسرا نام ''اسلام ہے'' جو اللہ کے ہاں تمام ادیان سے پسندیدہ اور قابل اعتبار ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ کے ہاں دین صرف اسلام ہے۔'' [۳/آل عمران:۱۹]

اس عالم رنگ و بو میں یہودیت، نصرانیت، دہریت، بدھ مت، ہندو دھرم، کمیونزم، سوشلزم اور جمہوریت وغیرہ بطور دین نافذ ہیں اور متعدد لوگ ان پر عمل پیرا ہیں لیکن اللہ کے ہاں قابل قبول دین صرف اور صرف اسلام ہے، اسلام کا معنی خود سپردگی ہے۔ اس سے مراد اللہ کے احکام و ارشادات کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور اس کے حضور برضا و رغبت مطیع و منقاد بن جانا ہے، دنیا کے متعدد ادیان میں صرف اسلام ہی ایسا دین ہے جو دنیوی فلاح اور اُخروی نجات کا ضامن ہے، اسے مختصر طور پر عبادت اور طریقہ عبادت سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس دو لفظی تعریف کی وضاحت اس طرح ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور طریقہ عبادت صرف رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ عبادت صرف چند ایک مراسم عبودیت کو بجا لانے کا نام نہیں بلکہ بندۂ مسلم کا ہر وہ کام جس کی بجا آوری سے اللہ رب العزت خوش ہو، عبادت کہلاتا ہے اور یہ عبادت عقائد و نظریات اور اعمال و اخلاق پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے وسائل معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے جو ہمارے اور اللہ کے درمیان ایک مستند نمائندہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ہمیں صرف رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کن کن کاموں کی بجا آوری سے خوش ہوتے ہیں اور وہ کونسے کام ہیں جن کے ارتکاب سے وہ ناراض ہوتے ہیں، بندوں کو اس کی اطلاع دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ شروع فرمایا جو قرآن اور بیان قرآن پر مشتمل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اللہ کی وحی سے مطلع کرنے کے لیے کئی طریقے استعمال فرمائے، ان میں سے کامیاب اور کارگر ذریعہ سوال و جواب کا ہے، بعض اوقات خود وحی بھی سوال و جواب کی صورت اختیار کر لیتی تھی جیسا کہ حدیث جبرئیل سے معلوم ہوتا ہے، اس میں فرشتہ وحی خود کسی دینی معاملہ کے متعلق سوال کرتا ہے پھر خود ہی رسول اللہ ﷺ کے جوابات کی تصدیق کرتا ہے، صحابہ کرام کو یہ صورت حال دیکھ کر تعجب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ حضرت جبرائیل تھے جو تمہیں دین کی باتیں سکھانے کے لئے یہ انداز اختیار کئے ہوئے تھے۔'' (صحیح بخاری: الایمان ۵۰)

بعض دفعہ معلوم شدہ حقائق کی تصدیق بھی سوال و جواب سے ہوتی تھی جیسا کہ حضرت ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث میں ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے ہی اپنے سخت رویے کی وضاحت کر دی تھی کہ میں چند باتوں کی تصدیق سخت انداز سے کرنا چاہتا ہوں، آپ محسوس نہ فرمائیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''جس انداز میں جو چاہو سوال کرو۔'' (صحیح بخاری: العلم ۶۳)

اکثر طور پر دین اسلام کی بنیادی باتوں کی تعلیم بھی سوال و جواب کی صورت میں دی جاتی جیسا کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اہل نجد کا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کے بال سفر کی وجہ سے پراگندہ تھے، ہم اس کی آواز تو سنتے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوا تو پتہ چلا کہ وہ ارکان اسلام کے متعلق سوال کر رہا ہے۔ (صحیح بخاری: الایمان ۴۶)

اللہ تعالیٰ نے خود اس امت کو یہ انداز اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر تمہیں کسی بات کا علم نہ ہو تو اہل ذکر سے دریافت کر لیا کرو۔'' [۱۶/ النحل: ۴۳]

اس قرآنی ہدایت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اگر دینی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تو سرخیل اہل ذکر جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کرتے، چنانچہ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ابواہاب بن عزیز کی بیٹی سے نکاح کر لیا بعد میں کسی سیاہ فام عورت نے وضاحت کی میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، اس لیے تمہارا نکاح درست نہیں ہے، حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت سواری لی اور مکہ سے مدینہ کا سفر کر کے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا، رسول اللہ ﷺ کی وضاحت کے بعد انہوں نے اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (صحیح بخاری: العلم ۸۸)

قرآن کریم نے ﴿يَسْــَٔلُونَكَ﴾ کے انداز سے ایسے کئی ایک مسائل کی نشاندہی کی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیے اور اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ان کے جوابات دیئے، کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے بے شمار فتاویٰ منقول ہیں جو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کرنے پر ارشاد فرمائے، ان کی تفصیل امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تصنیف ''اعلام الموقعین عن رب العالمین'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بعض اوقات اس اجازت کے پیش نظر ایسے سوالات بھی سامنے آئے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مزاج کے خلاف تھے اور ان میں دنیوی یا دینی فائدہ نہیں تھا تو اللہ تعالیٰ نے محدود پیمانے پر اس سلسلہ میں کچھ پابندی عائد کر دی' چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ایمان والو! ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کیا کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں اور اگر تم کوئی بات اس وقت پوچھتے ہو جبکہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائے گی، اب تک جو ہو چکا اس سے اللہ تعالیٰ نے درگزر کر لیا ہے وہ درگزر کرنے والا اور بردبار ہے، تم سے پہلے کچھ لوگوں نے ایسے ہی سوال کیے تھے پھر انہی باتوں کی وجہ سے وہ کفر میں مبتلا ہو گئے۔''

[۵/ المآئدۃ: ۱۰۱، ۱۰۲]

اس کے بعد لوگوں پر پابندی عائد کر دی گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے سوالات نہ کیے جائیں جن میں کوئی دینی یا دنیوی

فائدہ نہ ہو، کیونکہ خواہ مخواہ سوال پوچھنے سے انسان کو نقصان ہی ہوتا ہے یا اس پر کوئی پابندی عائد کر دی جاتی ہے جیسا کہ درج ذیل احادیث سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں پوچھیں جو آپ کی ناگواری کا باعث ہوئیں، جب بہت سے سوال و جواب ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آ گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب جو چاہو پوچھتے جاؤ۔'' ایک شخص نے کہا: میرا باپ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا باپ حذافہ ہے۔'' پھر دوسرا شخص کہنے لگا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا باپ کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرا باپ شیبہ کا غلام سالم ہے۔'' جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کے چہرہ انور کو غضبناک دیکھا تو عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں تب مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (صحیح بخاری: الاعتصام ۷۲۹۱)

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے قیامت کے دن اپنے ٹھکانہ کے متعلق پوچھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو جہنم میں داخل ہوگا۔'' (صحیح بخاری: الاعتصام، ۷۲۹۴)

ایک شخص نے دریافت کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا حج ہر سال فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سوال سن کر خاموش رہے، سائل نے دوبارہ یہی سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر خاموش رہے، تیسری مرتبہ سوال کرنے پر فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جاتا پھر تم اسے ادا نہ کر سکتے۔'' اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ (مسند امام احمد: ج ۱ ص ۱۱۳)

ویسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے فائدہ گفتگو کرنے، زیادہ سوالات پوچھنے، مال و دولت ضائع کرنے، ماؤں کو ستانے' لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور دوسروں کا حق دبانے سے منع فرمایا ہے۔ (صحیح بخاری: الاعتصام، ۷۲۹۲)

کثرت سوال کی نحوست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ بیان فرمائی: ''کہ سب سے بڑا قصوروار وہ مسلمان ہے جو ایسی بات کے متعلق سوال کرے جو حرام نہ ہو لیکن اس کے پوچھنے کی وجہ سے وہ حرام ہو جائے۔'' (صحیح بخاری: الاعتصام، ۷۲۸۹)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں جس بات کو چھوڑ دوں یعنی اس کا ذکر نہ کروں تم بھی اس سے باز رہو کیونکہ تم سے پہلے لوگ زیادہ سوال کرنے اور اپنے انبیا سے اختلاف کرنے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے اس لیے جس کام سے میں تمہیں منع کروں اس سے باز رہو اور جس کام کا حکم دوں اسے جہاں تک ممکن ہو بجا لاؤ۔''

(صحیح بخاری: الاعتصام، ۷۲۸۸)

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر کچھ فرائض عائد کیے ہیں، انہیں ضائع نہ کرو یعنی انہیں ٹھیک طرح بجا لاؤ، اور کچھ چیزوں سے تمہیں منع کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو کچھ حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے اس کو بھول لاحق ہو لہٰذا ان کی کرید نہ کرو۔'' (دار قطنی: ج ۲ ص ۱۹۱ حدیث نمبر ۴۳۵۰)

کثرت سوالات کی نحوست کا عملی مظاہرہ بنی اسرائیل میں ہوا جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے پے در پے سوالات شروع کر دیئے کہ ہمیں اللہ سے پوچھ کر بتلاؤ کہ اس گائے کی عمر کیا ہو؟ اس کا رنگ کیا ہو؟ اور اس کی کیفیت کیسی ہو؟ حالانکہ اگر وہ کوئی سوال نہ کرتے تو کوئی بھی گائے ذبح کرنے میں آزاد تھے مگر مسلسل سوال کرنے سے اپنے آپ پر پابندی ہی

بڑھاتے گئے اور یہی زیادہ سوالات کرنے کا نقصان ہوتا ہے۔شریعت اگر ایک حکم اجمالاً بیان کرے تو اس کے اجمال سے فائدہ اٹھانے میں بھی مسلمانوں کو آسانی ہے اجتہاد و استنباط کر کے اس کی تفصیلات معین کر کے مسلمانوں کے لیے مشکلات کا باعث نہیں بننا چاہیے، کثرت سوالات کی پابندی کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی دینی ضروریات پوری کرنے اور علمی پیاس بجھانے کے لیے ایک اور انداز اختیار کیا کہ جب کوئی اجنبی آتا تو بہت خوش ہوتے کہ وہ سوال کرے گا اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے مستفید ہوں گے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر ضروری سوالات کے متعلق منع کر دیا گیا تو ہم کسی عقل مند دیہاتی کے انتظار میں رہتے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتا اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب سنتے اور اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرتے۔ (صحیح مسلم:الایمان،۱۰)

بلکہ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مدینہ میں کوئی دیہاتی آتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے چادر وغیرہ کا تحفہ دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی سوالات کرنے پر آمادہ کرتے کیونکہ خود اس حکم امتناعی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کو درست نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس سے ڈرتے تھے۔ (مسند امام احمد:ج۵،ص۲۶۶)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کرنے کی پابندی صرف مہاجرین اور مدینہ کے رہائش پذیر حضرات کے لیے تھی دیہاتی لوگ اس سے مستثنیٰ تھے۔چنانچہ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک سال تک قیام کیا، ہجرت کر کے مدینہ آنے سے صرف یہی بات رکاوٹ تھی کہ اس طرح میں آپ سے دینی سوالات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جب کوئی ہجرت کر کے مدینہ کا رہائشی بن جاتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات نہیں کرتا تھا۔ (صحیح مسلم:الآداب،۱۵)

درج بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ فضول اور بے فائدہ سوالات کرنے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو روک دیا گیا تھا، علامہ شاطبی نے سوالات کی چند ایک ممنوع صورتیں بیان کی ہیں، انہیں ذکر کیا جاتا ہے۔

① ایسے سوالات جن میں کوئی دینی فائدہ نہ ہو جیسا کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ اور حضرت سالم رضی اللہ عنہما نے اپنے اپنے باپ کی تعیین کے لیے سوال کیا تھا، اسی طرح ایک آدمی نے قیامت کے دن اپنے ٹھکانے کے متعلق دریافت کیا تھا۔ (صحیح بخاری:العلم،۸۰)

② دینی ضرورت پوری ہونے کے بعد بلاوجہ مزید سوالات کا سلسلہ جاری رکھنا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کی فرضیت کو بیان فرمایا تو ایک آدمی نے سوال کر دیا کہ ہر سال حج کرنا فرض ہے۔حالانکہ فرضیت حج سے متعلقہ آیت کریمہ کے اطلاق سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں ایک دفعہ ہی حج کرنا کافی ہے نیز بنی اسرائیل کا گائے کے متعلق سوالات کرنا بھی اسی قسم سے ہے۔ (صحیح مسلم:الحج،۴۱۲)

③ ایسے معاملات کے متعلق سوالات کرنا جن کے متعلق شریعت کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا بلکہ شارع کا سکوت ہی اس کے جواز کی دلیل ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس معاملہ کو میں نے چھوڑ دیا ہے تم بھی اسے چھوڑ دو، تم سے پہلے لوگ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے بلاوجہ اپنے انبیا علیہم السلام سے اختلاف کر کے سوالات کی بھرمار کر دی۔'' (صحیح مسلم:الحج،۴۱۲)

④ مشکل ترین اور حساس معاملات کے متعلق سوالات کرنا تا کہ جواب دینے والا الجھن اور پیچیدگی کا شکار ہو جائے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معمہ جات اور پہیلیوں کی صورت میں سوالات کرنے (اغلوطات) سے منع فرمایا ہے۔(ابوداؤد:العلم،۳۶۵۶)

⑤ تعبدی احکام کی غرض وغایت اوران کی علت سے متعلق سوال کرنا جیسا کہ حضرت معاذہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا تھا کہ حائضہ عورت روزے کی قضا تو دیتی ہے لیکن اس کے لئے نماز کی قضا دینا کیوں ضروری نہیں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ سوال ناپسند کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''تو حروریہ معلوم ہوتی ہے۔'' (مسلم:الحیض،۶۹)

⑥ تکلف کرتے ہوئے کسی چیز کی گہرائی اوراس کی حقیقت کے متعلق سوال کرنا جیسا کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک حوض کے متعلق اس کے مالک سے دریافت کیا تھا کہ درندوں کی آمدورفت تو نہیں ہوتی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا: ''تجھے اس کے متعلق ہمیں بتانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' (موطا امام مالک:الطہارۃ،۱۴)

⑦ ایسے سوالات کرنا جن میں عقل وقیاس کے ذریعے کتاب وسنت کی صریح نصوص کا رد مقصود ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ شکم مادر میں قتل ہونے والے بچے کے متعلق فیصلہ کیا تھا اس کے بدلے ایک لونڈی یا غلام تاوان دیا جائے، جس کے خلاف یہ فیصلہ ہوا تھا وہ کہنے لگا کہ میں ایسے بچے کا تاوان کیوں ادا کروں جس نے کھایا ہے نہ پیا ہے اور نہ ہی وہ بولا اور چلایا ہے ایسے بچے کا خون تو رائیگاں ہے۔آپ ﷺ نے اس کے انداز گفتگو کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''کہ یہ تو کاہنوں کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔'' (صحیح مسلم:القسامہ،۱۶۸۲)

⑧ متشابہات کے متعلق سوالات کرنا بھی اسی قبیل سے ہے جیسا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے کسی نے یہ آیت پڑھی ''رحمن نے اپنے عرش پر قرار پکڑا ہے۔'' [۲۰/طٰہٰ:۵] پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ استواء کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ''استواء تو معروف ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔'' [مختصر العلو للذھبی:ص۱۴۱]

⑨ اسلاف کے باہمی مشاجرات کے متعلق سوالات کرنا کہ اہل صفین کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے خون سے میرے ہاتھوں کو محفوظ رکھا میں نہیں چاہتا کہ اپنی زبان کو اس میں ملوث کروں۔''
[موافقات للشاطبی:ج۴،ص۳۲۰]

⑩ کج بحثی، کٹ حجتی اور دوسرے فریق کو لاجواب اور خاموش کرنے کے لیے سوالات کرنا جیسا کہ مشرکین مکہ اور یہود مدینہ رسول اللہ ﷺ سے مطالبات اور سوالات کرتے تھے، ایسے مطالبات وسوالات کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ اگر انہیں معقول جواب مل جائے تو اسے تسلیم کرلیں گے بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس قسم کے سوالات میں الجھا کر کم ازکم دوسروں کو حق سے دور رکھا جائے۔قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی مذمت کی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یہ لوگ سخت جھگڑالو ہیں۔'' [۴۳/الزخرف:۵۸] نیز حدیث میں ہے کہ ضدی اور سخت جھگڑالو اللہ کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ ہے۔(صحیح بخاری:التفسیر،۴۵۲۳)

سوالات کی مذکورہ امتناعی صورتیں علامہ شاطبی کی دریافت کردہ ہیں جو انہوں نے الموافقات ج ۴،ص ۳۲۰ میں بیان کی ہیں، ان کے علاوہ دو مزید صورتیں بھی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(ا) بے ضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر ان کی تحقیقات میں دماغ سوزی کرنا بھی ممنوع ہے کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع

کرنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''مسلمان کے اچھے اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ فضول باتوں کو چھوڑ دے۔''
(مسند امام احمد: ج۱ص۲۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ لامعنی اور بے مقصد چیزوں کے متعلق سوالات کرنا جس کا تعلق عمل زندگی سے نہیں ہے شریعت نے اسے مستحسن قرار نہیں دیا ہے مثلاً زلیخا کی شادی حضرت یوسف علیہ السلام سے ہوئی تھی یا نہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام کیا تھا؟ اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کا طول وعرض کتنا تھا؟ وغیرہ۔

(ب) فرضی مسائل کھڑے کر کے ان کے متعلق غور وخوض کرنا بھی اسی قبیل سے ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جس کا ابھی وقوع نہیں ہوا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''کہ ایسی چیز کے متعلق سوال نہ کرو جو واقع نہیں ہوئی۔ ہم نے اپنے والد گرامی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا وہ ایسے شخص پر لعنت کرتے تھے جو ایسی اشیاء کے بارے میں سوالات کرتا جو واقع نہ ہوئی ہوں۔'' (مسند دارمی: حدیث نمبر۱۲۳)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر پر فرمایا کرتے تھے: ''اللہ کی قسم! جو شخص ایسی چیز کے بارے میں سوال کرے گا جو واقع نہیں ہوئی میں اس پر راستہ تنگ کردوں گا، یقیناً اللہ تعالیٰ نے ہر ہونے والی چیز کو واضح کر دیا ہے۔'' (مسند دارمی: حدیث نمبر۱۲۶)

اس لیے ایسے سوالات ہرگز نہیں کرنے چاہئیں جو کبھی پیش نہ آتے ہوں کیونکہ ان میں بھی وقت کا ضیاع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ اہم ذمہ داری سونپی کہ وہ دینی مسائل میں لوگوں کی راہنمائی کریں، اس ذمہ داری کو قرآن کریم میں ''قول ثقیل'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ہم آپ پر ایک بھاری بات (کی ذمہ داری) نازل کرنے والے ہیں۔'' [۷۳/المزمل:۵]

دوسرے مقام پر بطور احسان فرمایا: ''ہم نے آپ سے اس بوجھ کو اتار دیا ہے جو آپ کی کمر کو توڑے جا رہا تھا۔''

[۹۴/الانشراح:۲،۳]

رسول اللہ ﷺ نے اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے لوگوں کے ساتھ آسانی اور نرمی کے اصول کو پیش نظر رکھا کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے اس ضابطہ کو پسند فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ نرمی کا برتاؤ چاہتا ہے سختی کا نہیں چاہتا۔'' [۲/البقرہ:۱۸۵]

دوسرے مقام پر فرمایا: ''کہ اس نے دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔'' [۲۲/الحج:۷۸]

رسول اللہ ﷺ کا اپنا عمل بھی یہی تھا کہ ہمیشہ آسان معاملات کو اختیار فرماتے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا جاتا تو آپ ہمیشہ آسان معاملات کو اختیار فرماتے بشرطیکہ اس میں گناہ کا کوئی پہلو نہ ہوتا۔ (صحیح بخاری: الادب، ۶۱۲۶)

رسول اللہ ﷺ نے افراد امت کو بھی یہی تلقین فرمائی ہے: ''تم آسانی کرنی والے بنا کر بھیجے گئے ہو، تنگی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔'' (صحیح بخاری: الادب، ۶۱۲۷)

اس آسانی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ مسائل میں اس قدر تساہل برتا جائے کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیا جائے بلکہ تنگی، مشقت، سختی اور بے جا شدت پسندی کو دور کرنا ہے اس لیے وارثانِ انبیا کو چاہیے کہ وہ لوگوں کی دینی راہنمائی کرتے وقت راہ اعتدال اختیار کریں اور آسانی کی طرف میلان رکھیں جیسا کہ حضرت عمر بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق فرماتے ہیں: ''کہ میں نے کوئی قوم نرمی کے اعتبار سے صحابہ سے زیادہ نرم اور شدت کے لحاظ سے ان سے کم شدت پسند نہیں دیکھی۔'' (دارمی: ج۱ ص۵۱)

ہم نے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے فتاویٰ میں سائلین کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بے جا سختی اور حرفیت پسندی سے اجتناب کیا ہے اور جواب دیتے وقت اس پہلو کو اختیار کیا ہے جس کا نفس انسانی متحمل ہو ورنہ تھوڑی بہت مشقت تو ہر کام میں اٹھانا ہی پڑتی ہے۔

نیز کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کے متعلق ہم نے جلد بازی سے احتراز کیا ہے ہاں کسی چیز کی حلت وحرمت اگر کتاب و سنت کی صریح نصوص سے ثابت ہو تو اس سلسلہ میں ہم نے کسی قسم کی مداہنت سے کام نہیں لیا ہے، کیونکہ اگر ایسے معاملات میں واضح حکم نہ لگایا جائے تو لوگ سستی کرتے ہوئے اس کے اسیر ہو جاتے ہیں اس سلسلہ میں ہمارا منہج یہ ہے کہ قرآن وسنت کو ایک ہی درجہ میں رکھا جائے ہم انہیں مسائل اخذ میں اکٹھا دیکھنے اور ان میں تفریق نہ کرنے کے قائل ہیں جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اسی اسلوب کو اختیار کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہم نے اس بات کا بھی التزام کیا ہے کہ استنباط مسائل میں ''سبیل المومنین'' سے خروج نہ کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کے ساتھ سبیل المومنین کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو شخص راہ راست واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور سبیل المومنین کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے تو ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر کا خود اس نے رُخ کر لیا ہے پھر ہم اسے جہنم میں جھونک دیں گے جو بہت بری جگہ ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱۵]

مختصر طور پر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارا منہج کتاب وسنت ہے اور انہیں سمجھنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کے فہم کا اعتبار کیا ہے، علوم نبوت کے وارثان کا یہی طرۂ امتیاز ہونا چاہیے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ جابر بن زید سے فرمایا: ''کہ تم فقہائے بصرہ میں سے ہو اس لیے قرآن ناطق اور سنت ثابتہ کے بغیر فتویٰ نہ دیا کرو اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو خود بھی ہلاک ہو جاؤ گے اور دوسروں کو بھی تباہ کرو گے۔''
[سنن دارمی: حدیث نمبر۱۶۶]

اسی طرح حضرت ابوسلمہ نے امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: ''کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ نہ دیا کرو، فتویٰ کے لیے صرف اللہ کی نازل کردہ کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا سہارا لیا کرو۔'' [سنن دارمی: حدیث۱۶۵]

ہم نے اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لوگوں کی دینی راہنمائی کے لیے ایک عرصہ سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس کا آغاز دسمبر 1987ء سے ہوا جب مکتب الدعوۃ سعودی عرب کی طرف سے جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں بطور مدرس تعینات ہوا، کتاب وسنت کی روشنی میں لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے انتظامیہ کی طرف سے ایک فتویٰ کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے سربراہ حضرت مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری تھے جواب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ اپنی رحمت

سے نوازے (آمین) کمیٹی کے دیگر اراکین شیخ الحدیث عبدالعزیز علوی، مولانا محمد یونس بٹ، شیخ اسماعیل محمد مالدیپی اور راقم الحروف تھے، سائلین کی طرف سے آمدہ سوالات کو ہفتہ وار اجلاس میں پیش کر دیا جاتا اور خوب بحث وتمحیص اور چھان بین کے بعد فتویٰ صادر کیا جاتا، چونکہ فتویٰ نویسی کا کام میرے سپرد تھا اس لیے قرآنی آیات اور احادیث کے حوالہ جات کے لیے کتب حدیث کی ورق گردانی بھی میرے ذمہ تھی، اس طرح مجھ جیسے طفل مکتب کو بزرگوں کی راہنمائی میں اس کام سے دلچسپی پیدا ہوئی، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِكَ حَمْدًا کَثِیْرًا۔

البتہ فتویٰ نویسی کا باضابطہ آغاز مارچ 2001ء میں ہوا جب ادارہ ہفت روزہ اہل حدیث لاہور کو موصول ہوئے سوالات نمٹانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی اگرچہ میں قطعاً اس منصب کے اہل نہ تھا تاہم اللہ کے فضل اور قارئین کرام کی دعاؤں سے تاہنوز کام جاری ہے، اس لحاظ سے میں پروفیسر علامہ ساجد میر امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان اور بقیۃ السلف جناب عبدالعزیز حنیف ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کا شکرگزار ہوں کہ انہوں نے مجھے بذریعہ ہفت روزہ اہل حدیث لوگوں کی دینی راہنمائی کا موقع فراہم کیا، بالخصوص محترم جناب بشیر انصاری مدیر اعلیٰ اور عزیزم پروفیسر بلال حماد مدیر معاون ہفت روزہ اہل حدیث جنہوں نے فتاویٰ کی ظاہری اور معنوی نوک پلک سنوارنے کا فریضہ سرانجام دیا، فتاویٰ اصحاب الحدیث کی اس جلد میں مارچ 2001ء تا جنوری 2005ء عرصہ چار سال کے فتاویٰ ہیں جنہیں قارئین کے اصرار پر فقہی ترتیب کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے عنوانات کا خاکہ تیار کر کے شائع شدہ فتاویٰ جات مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد کے حوالے کر دیئے اس اعتبار سے بندہ جناب محمد سرور عاصم مدیر مکتبہ اسلامیہ کا بے حد ممنون ہے جنہوں نے اپنے رفقا کے تعاون سے اسے از سرنو مرتب کر کے طباعت کے قابل بنایا، کیونکہ عوام الناس کے استفادہ کے لیے ایسا کرنا انتہائی ضروری تھا عنوانات کی ترتیب یہ ہے۔ توحید وعقیدہ، رسالت وولایت، مساجد واوقاف، طہارت ووضوء، اذان ونماز، عیدین وجمعہ، وتر وتہجد، اذکار ودعوات، جنائز وزیارت قبور، زکوٰۃ وصدقات، حج وعمرہ، روزہ واعتکاف، خرید وفروخت، وصیت ووراثت، نکاح وطلاق، عقیقہ وقربانی، زینت ولباس، زہد ورقاق، آداب واخلاق، مباحات وممنوعات۔ آخر میں محترم مولانا عبدالخالق بن محمد صادق آف کویت کا بھی سپاس گزار ہوں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے اپنا قیمتی وقت نکال کر ایک جاندار اور وقیع پیش لفظ رقم فرما کر میری حوصلہ افزائی، اسی طرح برادر صغیر حافظ عبدالغفار سہل، اہلیہ محترمہ، عزیزان محمد حماد، احمد حماد اور حامد حماد کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے ہاں عزت واحترام سے نوازے، جنہوں نے گھر میں مجھے ہر طرح کی سہولت دے کر اس کی تصحیح اور نظر ثانی میں میرا ہاتھ بٹایا، تحدیث نعمت کے طور پر اللہ تعالیٰ کی اس خاص مہربانی کا ذکر کرنا بھی ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہجوم مشاغل کے باوجود اس نے مجھے اس کار خیر کو سرانجام دینے کی توفیق دی ہے، اگر اس کی عنایات میرے شامل حال نہ ہوتیں تو شاید یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا، مکتب الدعوۃ اسلام آباد کی طرف سے علاقہ بھر میں تدریسی، دعوتی تبلیغی خدمات، صحیح بخاری کی تفہیم وتشریح، اپنے ادارہ مرکز الدراسات الاسلامیہ کو رواں دواں رکھنے کے لیے اعصاب شکن بھاگ دوڑ، مختلف مساجد میں درس قرآن، ادارۃ المشاریع الخیریہ کے تحت زیر تعمیر مراکز ومساجد کی نگرانی اور خطبہ جمعہ کے لیے ملتان آمد ورفت وغیرہ، عوام الناس کی دینی رہنمائی اور گھریلو مصروفیات اس کے علاوہ ہیں ایسے حالات میں فتویٰ نویسی کے لیے وقت نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف

ہے بہرحال میرے لیے والدین کریمین اور احباب کرام کی دعائیں بساغنیمت ہیں جن کے نتیجہ میں اللہ کے فضل سے کام چل رہا ہے "ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شیوخ واساتذہ، اہل خانہ، ابناء واحفاد، دوست واحباب اور دیگر اعوان وانصار کو اپنے ہاں اجر جزیل عطا فرمائے اور اس بضاعت مزجاۃ کو ہم سب کے لیے دنیا میں صدقہ جاریہ اور آخرت میں ذریعہ نجات بنائے ۔وَصَلَّى اللّٰهُ نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ وَاَجْمَعِيْنَ۔

طالب الدعوات

ابو محمد عبدالستار الحماد

14 رجب 1426ھ بروز جمعہ

برائے رابطہ

مرکز الدراسات الاسلامیہ

سلطان کالونی میاں چنوں

فون 065/2663316-17

موبائل 0300-4178626

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ وَمَنْ سَارَ عَلٰی مَنْهَجِهِمْ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ وَبَعْد.

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو پیدا کرنے کے بعد انہیں مطلق العنان اور آزاد منش نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کے لیے ایک کامل دستورِ حیات نازل فرمایا جس کی روشنی میں وہ اپنے خالق و مالک کی مرضی کے مطابق کامیابی کے ساتھ سفرِ زندگی طے کر سکیں پھر ایک ایسا پرامن اور مثالی معاشرہ تشکیل پا سکے جس میں ہر فرد کو جان و مال اور عزت وآبرو کا تحفظ نصیب ہو نیز لوگ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ایک ساتھ پاسداری کریں اور ان حقوق کی ادائیگی میں وہ سماوی دستور مشعل راہ ثابت ہو، اس کے بعد اس کی اطاعت کرنے والا مسلم اور فرمانبردار اور اس کی مخالفت کرنے والا کافر و نافرمان قرار پائے، اس نظامِ زندگی کا دوسرا نام دینِ اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں تک اپنا یہ پیغام پہنچانے کے لیے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، ان تمام برگزیدہ شخصیات نے تبلیغ دین کے تمام ممکنہ وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو اس کے بندوں تک بلا کم وکاست پہنچایا، تبلیغ دین کے وسائل میں سے ایک انتہائی عظیم القدر، عالی شان اور مفید ترین ذریعہ درس وافتا بھی ہے، چنانچہ مسندِ افتا پر فائز ہونے والے علمائے کرام میراثِ نبوت کے اعتبار سے اس منصب رفیع کے امین ہیں جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے: ''کہ یقیناً علمائے ربانی ہی علومِ نبوت کے وارث ہیں۔'' (سنن ابی داؤد: حدیث نمبر ۱۵۷۶)

علمائے کرام ہر دور میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روشنی میں مشکل مسائل کے متعلق عوام الناس کی راہنمائی کرتے ہیں اور انہیں دنیوی اور اُخروی تباہ کاریوں سے بچانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔

فتویٰ کا مفہوم

لغوی اعتبار سے فتویٰ اسم مصدر ہے جو کہ افتا کے معنی میں مشتمل ہے اور اس کی جمع فتاویٰ (بفتح الواو) اور فتاوِیٰ (بکسر الواو) آتی ہے، قرآن کریم میں بھی یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''لوگ آپ سے فتویٰ طلب کرتے ہیں، فرما دیجیے! اللہ تمہیں کلالہ کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔'' [۴/ النسآء: ۱۷۶] اصطلاحی طور پر مسائل طلب کرنے والے کے لیے دلائل کی روشنی میں شرعی حکم کی وضاحت کرنا فتویٰ کہلاتا ہے۔ (الفتاویٰ الشرعیہ: ج ۱ص ۴۶)

اہمیت فتویٰ

فتویٰ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کرتے ہوئے فرمایا: ''اے پیغمبر! یہ آپ سے عورتوں کے متعلق فتویٰ طلب کرتے ہیں فرما دیجیے! اللہ تمہیں ان کے متعلق فتویٰ دیتا ہے۔'' [۴/ النسآء: ۱۲۷]

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں اپنی مایہ ناز اور بلند پایہ کتاب کا نام ''اعلام الموقعین عن رب العالمین''

رکھا ہے،یعنی مفتی حضرات سے جب دینی مسائل دریافت کیے جاتے ہیں تو ان کا جواب دیتے وقت گویا وہ اللہ رب العزت کی طرف سے دستخط کرتے ہیں، علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ ''جب ملوک وسلاطین کی طرف سے دستخط کرنے کا منصب اس قدر بلند ہے کہ اس کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور دنیا میں اسے اعلیٰ مرتبہ شمار کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستخط کرنے کی عظمت وشان تو اس سے کہیں زیادہ بلند وبرتر ہے۔'' (اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۱۰)

رسول اللہ ﷺ زندگی بھر اس عالی شان منصب پر فائز رہے کیونکہ نبوت کا اصل محور یہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہم نے آپ کی طرف ذکر (شریعت) کو نازل فرمایا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے ان کی طرف نازل شدہ شریعت کی تشریح فرمائیں تاکہ وہ غور وفکر کریں۔'' [۱۶/النحل:۴۴]

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یقیناً فتویٰ دینا انتہائی حساس، قابل قدر اور بڑی فضیلت والا کام ہے کیونکہ مفتی، حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا وارث ہوتا ہے اور فرض کفایہ کو ادا کرتا ہے گو وہ ان کی طرح معصوم عن الخطا نہیں ہوتا بلکہ اس سے سہو وخطا کا صدور ممکن ہوتا ہے غالباً اسی لئے علما نے کہا ہے کہ مفتی اللہ رب العزت کی طرف سے دستخط کرنے والا ہوتا ہے۔'' (المجموع: ج ۱ ص ۷۲)

چونکہ فتویٰ کا موضوع اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کرنا ہے تاکہ لوگ ان کے مطابق عمل کر سکیں، اسی لیے مفتی کو اللہ تعالیٰ کا ترجمان قرار دیا جاتا ہے۔

مذکورہ حقائق سے معلوم ہوا کہ فتویٰ انتہائی حساس اور بلند پایہ معاملہ ہے اور بہت بڑی ذمہ داری کا حامل ہے۔

مفتی اور اس کی شروط

مسند افتا پر فائز ہونے والے حضرات افاضل کو مفتی کہا جاتا ہے، ان میں چند شروط کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

علم: اسلام، عقل اور بلوغ کی شرائط کے بعد ایک مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم کے زیور سے آراستہ ہو کیونکہ علم کے بغیر فتویٰ دینا حرام اور کبیرہ گناہ ہے، ایسا کرنے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر جھوٹ باندھتا ہے اور لوگوں کی گمراہی کا باعث بنتا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: آپ فرما دیجئے! یقیناً میرے رب نے ظاہری اور پوشیدہ فحاشی نیز گناہ اور ناحق بغاوت، بلا دلیل اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے اور علم کے بغیر اللہ پر افترا پردازی سے منع فرمایا ہے۔ [۷/الاعراف:۳۳]

اس آیت کریمہ میں کلمہ حصر ''اِنَّمَا'' کے ساتھ محرمات کو ذکر کرتے ہوئے بلا علم فتویٰ دینے کو فواحش، بغاوت اور شرک کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ترتیب کے اعتبار سے اسے آخر میں بیان کیا ہے، اس انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے تینوں گناہ اپنی جگہ پر اکبر الکبائر میں سے ہیں لیکن علم کے بغیر فتویٰ دینا ان تینوں سے زیادہ خطرناک ہے اس جرم کی شناعت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''جو جھوٹ تمہاری زبانوں پر آ جائے اس کی بنا پر یوں نہ کیا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام ہے کہ تم اللہ پر جھوٹ

افترا کرنے لگو، جولوگ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں وہ کبھی فلاح نہیں پاتے۔'' [۱۶/النحل:۱۱۶]

علامہ ابن صلاح اس آیت کریمہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ معنوی اعتبار سے اس آیت کے مفہوم میں ہر وہ شخص داخل ہے جوفتویٰ دینے میں سہل پسندی اور کجروی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حرام کوحلال اور حلال کوحرام قرار دیتا ہے۔

[ادب الفتویٰ لابن الصلاح: ص۱۹]

رسول اللہ ﷺ علمی انحطاط کی نحوست بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ یکبارگی علم کواس طرح نہیں اٹھالے گا کہ لوگوں کے دلوں سے کھینچ باہر کرے بلکہ علمائے ربانی کوفوت کرنے سے علم کواٹھائے گا حتیٰ کہ جب حقیقی علما کو باقی نہیں رکھے گا تو لوگ علم سے کورے جہلا کو ریاست علم کے مسند نشین مقرر کرلیں گے پھر جب ایسے لوگوں سے مسائل دریافت کیے جائیں گے تو وہ جہالت اور بے علمی کی وجہ سے غلط فتوے دیں گے انجام کار خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔'' (صحیح بخاری: العلم، ۱۰۰)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کہ فتویٰ دینا اقلیم علم کی حقیقی بادشاہت ہے اور علم کے بغیر فتویٰ دینا انتہائی قابل مذمت اور لائق نفرت ہے۔ (فتح الباری: ج۱، ص۲۳۶)

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا: ''جس شخص نے میری طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جو میں نے نہیں کہی تو اسے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالینا چاہیے اور اگر کسی مسلمان۔ سے اس کا کوئی مسلمان بھائی مشورہ طلب کرے تو وہ اسے غلط مشورہ دے تو اس نے اپنے بھائی سے خیانت کا ارتکاب کیا ہے اور جس نے بلا تحقیق اور دلائل میں غور وفکر کیے بغیر فتویٰ صادر کیا اور وہ غلط ہوا تو اس کا گناہ اس مفتی پر ہوگا۔'' (مسند امام احمد: ج۲، ص۳۲۱)

علامہ خطیب بغدادی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: کہ مسند افتا کے اہل وہ شخص ہوسکتا ہے جو کتاب اللہ کے علوم سے بخوبی آگاہ ہو، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ، آیات کی صحیح تاویل وتفسیر، اسباب نزول، مقام نزول اور مراد نصوص سے مکمل طور پر آگاہ ہو، پھر علوم قرآن کی طرح علوم حدیث میں بھی ماہر ہو یعنی ناسخ ومنسوخ سے واقف، وقائع واحداث اور اسباب ورود سے آگاہ، پھر صحیح وضعیف میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اسی طرح لغتِ عربی جو قرآن وحدیث کی زبان ہے اس کے قواعد واصول سے بھی واقف ہو، عرب شعرا کے کلام سے دلچسپی رکھنے والا ہوتا کہ اسے عربی زبان سمجھنے میں مدد مل سکے۔ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے ہر قسم کے ذرائع ووسائل سے باخبر ہو، اس کے ساتھ ساتھ وہ انصاف کی خوبی سے متصف ہو نیز مختلف علاقہ جات کے لوگوں کی عادات ورسوم اور ان کے عرف سے بھی باخبر ہو، اس کے علاوہ اس میں معاملات واحوال کو جانچنے کی صفت اور مہارت ہو، ایسے شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ دینی احکام میں گفتگو کرے اور حلال وحرام کے متعلق فتویٰ دے، اس کے علاوہ دوسرے شخص کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں۔ [الفقیہ والمتفقہ: ص۲۰۲]

واضح رہے کہ مذکورہ شروط ان علما وافاضل کے لیے ہیں جو ایک مجتہد کی حیثیت سے مسند افتا پر جلوہ افروز ہوتے ہیں وگرنہ عمومی مسائل جو کہ مجالس وعظ اور دروس کے بعد لوگ دریافت کرتے ہیں اگر ان کے متعلق وہ صحیح علم رکھتا ہے تو اسے عوام کی ضرور

راہنمائی کرنی چاہیے حتیٰ کہ اگر عوام میں سے بھی کوئی صحیح مسئلہ معلوم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی کرے، ان کے علاوہ بدیہی امور یعنی توحید، اتباع سنت، عبادات اور فکر آخرت سے متعلق لوگوں کو راغب کرنے کا فریضہ تو ہر مسلمان کو سرانجام دینا چاہیے، اس لحاظ سے ہر مسلمان مبلغ و داعی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''میری طرف سے فریضہ تبلیغ ادا کرو خواہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو۔''

ورع وتقویٰ

فتویٰ دیتے وقت مفتی کی نیت خالص اور اس کے دل میں اللہ کا خوف ہونا چاہیے، احبار و رہبان کی طرح نفسانی خواہشات اور دنیوی مفادات اسے اظہار حق اور ابطال باطل سے باز نہ رکھیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کسی شخص کو دینی سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے آپ کو جنت اور دوزخ پر پیش کر لینا چاہیے پھر نجات کا راستہ معلوم کر کے اسے جواب دینا چاہیے۔''
(المجموع للنووی: ج۱ص۸۲)

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ جب کوئی مسئلہ بتاتے یا فتویٰ دیتے تو فرمایا کرتے تھے: ''اے اللہ! مجھے محفوظ رکھنا اور لوگوں کو غلط بات کہنے سے مجھے باز رکھنا۔'' (الآداب الشرعیہ: ج۲ص۱۵۹)]

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ انسان کو چاہیے کہ وہ دینی مسائل میں سوچ و سمجھ کر گفتگو کرے کیونکہ وہ اپنے اعمال و احوال کے متعلق قیامت کے دن جواب دہ ہے۔'' (الآداب الشرعیہ: ج۲ص۱۵۵)

حضرت ابن خلدہ نے امام ربیع کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''اے ربیع! آپ لوگوں کو فتویٰ دیتے ہیں آپ کے پیش نظر سائل کو سہولت دینا نہیں ہونا چاہیے بلکہ آپ کو اپنی نجات کی فکر ہونی چاہیے کہ میں اس مسئلہ کے بھنور سے کیسے خلاصی حاصل کروں۔'' (الفقیہ والمتفقہ: ج۲ص۳۵۷)

علامہ ابن صلاح آداب مفتی کے متعلق فرماتے ہیں: ''کہ وہ سچا، پکا مسلمان، ثقہ اور امانت دار ہو، فسق و فجور اور اس کے اسباب سے بچنے والا اور اخلاق رذیلہ سے اجتناب کرنے والا ہو کیونکہ جو شخص ایسے اوصاف کا حامل نہ ہو اس کی بات قابل اعتماد نہیں ہوتی اگرچہ وہ مجتھد ہی کیوں نہ ہو۔'' (ادب الفتویٰ: ص۳۰)

آخر میں خلاصہ کے طور پر ہم امام اہل سنت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ جب تک کسی شخص میں مندرجہ ذیل پانچ چیزیں نہ ہوں وہ منصب افتا کے قابل نہیں ہے۔

1. خلوص نیت کیونکہ جس کی نیت خالص نہ ہو اس کے چہرے پر نور اور اس کی بات میں اثر نہیں ہوتا۔
2. وہ زیور علم سے آراستہ، بردبار اور باوقار شخصیت کا مالک ہو کسی صورت میں جلد بازی سے کام لینے والا نہ ہو۔
3. وہ اپنے فن (افتا) میں ماہر اور پیش آمدہ مسائل حل کرنے پر قدرت رکھنے والا ہو۔
4. وہ لوگوں سے بے نیاز ہو، بصورت دیگر لوگوں کی نظر میں اس کی ذرا بھر وقعت نہیں ہوگی۔

⑤ وہ لوگوں کی عادات ورسوم اوران کے احوال وظروف نیز زمینی حقائق سے آگاہ ہو۔
(اعلام الموقعین: ج۴،ص۱۵۲)

مفتی کے فرائض

فتویٰ دینے والے حضرات کی متعدد ذمہ داریاں ہیں جن کی بجاآوری ضروری ہے ہم ان میں سے چند ایک کا تذکرہ کرتے ہیں۔

① **تواضع**: مفتی کو چاہیے کہ وہ متواضع اور متفکر المزاج ہو اگر کوئی مسئلہ سمجھ میں نہ آئے یا اس کے جواب سے خود مطمئن نہ ہو تو صاف صاف کہہ دیا جائے کہ مجھے معلوم نہیں۔ صرف عزت نفس کو بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی جواب تراشنا یا ظن وتخمین سے اس کا جواب دینا درست نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب آپ سے کوئی ایسا مسئلہ دریافت کیا جائے جسے آپ نہیں جانتے تو اس کے جواب سے راہ فرار اختیار کرو۔'' شاگردوں نے پوچھا: وہ کیسے؟ تو فرمایا: ''کہو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔'' (مسند دارمی: ج۱،ص۲۷۵)

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا آپ نے جواب دیا کہ **مجھے معلوم نہیں**، سائل نے کہا: **معمولی سا** مسئلہ بھی آپ کو معلوم نہیں تو امام صاحب غصہ میں آکر فرمانے لگے: ''**علم میں کوئی چیز معمولی نہیں ہے۔**'' [المجموع للنووی: ج۱،ص۸۲]

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''**سائل کو الله اعلم سے جواب دینا بھی نصف علم ہے۔**'' (مسند دارمی: ج۱،ص۲۷۶)

علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں: ''کہ سلف صالحین سے جب مسائل دریافت کیے جاتے اور انہیں اگر جواب معلوم نہ ہوتا تو بلا دھڑک کہہ دیتے کہ میں نہیں جانتا یا جواب معلوم ہونے تک اسے مؤخر کردیتے کہ بعد میں جواب دوں گا کیونکہ جس چیز کا علم نہ ہو اسے تسلیم کرلینا ہی عالم کی شان ہے۔'' [ادب الفتویٰ: ج۱،ص۸]

② **حسن عمل**: جس نیکی اور بھلائی کے کام میں جواز کا فتویٰ دیا جائے یا کسی برائی اور اس کی حرمت کا کہا جائے تو مفتی کو چاہیے کہ اپنے فتویٰ پر خود بھی عمل پیرا ہو کیونکہ مخالفت کی صورت میں سائل اس کا فتویٰ قبول کرنے سے انکار کردے گا یا کم از کم شکوک وشبہات میں مبتلا ہوگا۔ [الفتاویٰ الشرعیہ: ج۱،ص۴۷]

③ **صبر وتحمل**: فتویٰ پوچھنے والا اگر کمزور فہم کا حامل ہو تو مفتی کو چاہیے کہ اس کے ساتھ شفقت اور نرمی سے پیش آئے اور صبر وتحمل کے ساتھ اس کی گفتگو سنے پھر نرمی کے ساتھ اس سے مسئلہ کی جزئیات معلوم کرے اس کے بعد محبت کے ساتھ اس کا جواب دے، اللہ تعالیٰ اس کام پر بہت اجر دیں گے۔ [ادب الفتویٰ: ص۱۰۱]

④ **مشورہ**: اگر قرآن وحدیث کی کوئی عبارت سمجھ نہ آئے یا کسی مسئلہ کے متعلق کوئی مشکل درپیش ہو تو جید اور قابل اعتماد علمائے کرام سے اس کے متعلق مشورہ کرلیا جائے، اللہ تعالیٰ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ ان سے مشورہ کرلیا کریں۔'' [۴۲/الشوریٰ: ۳۸]

نیز حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک شخص زخمی ہوگیا اور اسی دوران اس کو احتلام ہوا تو اس کے ساتھیوں نے اسے غسل کرنے کا فتویٰ دیا، چنانچہ اس نے غسل کیا اور سردی لگنے سے اس کی موت واقعہ ہوگئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ انہیں غارت کرے انہوں نے اسے مار دیا ہے، کیا

جہالت کا علاج کسی سے پوچھ لینا نہیں تھا؟'' [مصنف عبدالرزاق: حدیث نمبر ۷۸۶۷]

⑤ مزاج میں اعتدال: امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''مفتی کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں کہ وہ سخت غصے، شدید بھوک، انتہائی پریشانی، غلبۂ نیند، ہنگامی حالات، حاجت بول و براز، قلبی مشغولیت یا ایسی کوئی چیز محسوس کرے جس سے اس کا مزاج معتدل نہ رہے اور وہ مسئلہ کا پوری طرح ادراک نہ کر سکے تو اسے فتویٰ نہیں دینا چاہیے، اگر ایسی حالت میں فتویٰ صحیح ہوا تو اللہ تعالیٰ کی عظیم عنایت ہے بہرحال مفتی حضرات کو مذکورہ حالات میں فتویٰ دینے سے گریز کرنا چاہیے۔ [اعلام الموقعین: ج ۲ ص ۲۲۷]

⑥ سہل انگاری اور جلد بازی: فتویٰ دینے میں سہل انگاری سے کام لینا حرام ہے اور جو شخص اس سلسلہ میں معروف ہو اس سے فتویٰ لینا درست نہیں ہے واضح رہے کہ سہل انگاری کا مطلب یہ ہے کہ کامل غور و فکر اور تحقیق کے بغیر فتویٰ دیا جائے، اس بنا پر مفتی کے لیے ضروری ہے کہ وہ فقہ الواقع اور فقہ النوازل کا ادراک کرے، اس کے علاوہ عرف عام اور جدید اصطلاحات سے بھی واقف ہو نیز فتویٰ کا مضمون واضح ہو یعنی مبہمات، اشارات اور کنایات سے گریز کیا جائے تا کہ کج فہم لوگ اس کے فتویٰ سے اپنا مطلب نہ کشید کر سکیں [المجموع: ج ۱ ص ۷۹]

⑦ راز کی حفاظت: مفتی کی حیثیت ایک طبیب کی سی ہوتی ہے، لوگ اس کے پاس اپنے ذاتی احوال و ظروف بیان کر کے فتویٰ طلب کرتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کے ذاتی رازوں پر کوئی دوسرا مطلع ہو، ایسے حالات میں مفتی کو چاہیے کہ وہ سائلین کے اسرار و خصوصی احوال کو کسی پر ظاہر نہ کرے کیونکہ ایسا کرنا خیانت ہے۔ [الفتاویٰ الشرعیہ: ج ۱ ص ۷۵]

⑧ فتویٰ سے رجوع: اگر فتویٰ دینے کے بعد مفتی کو معلوم ہو کہ اس سے غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا جائے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ باطل میں پیش قدمی کرنے سے بہتر ہے کہ حق کی طرف رجوع کر لیا جائے۔ [اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۸۶] پھر اپنے رجوع سے لوگوں کو مطلع بھی کرنا چاہیے۔

⑨ وضاحت مزید: اگر مفتی کسی کو پیش آمدہ مسئلہ یا کوئی ضروری شرعی حکم سمجھانا چاہتا ہو تو اسے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے سائل کو مزید پند و نصائح سے نوازنا چاہیے جیسا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمندر کے پانی کے متعلق سوال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سائل کو سمندر کے مردہ جانوروں کے متعلق بھی آگاہ فرما دیا: ''سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔'' [جامع ترمذی: ج ۱ ص ۱۰۱]

مستفتی کے آداب:

فتویٰ طلب کرنے والے کو مستفتی کہا جاتا ہے، اس کے آداب حسب ذیل ہیں جن کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

① حقیقت بیانی: سائل کو چاہیے کہ وہ فتویٰ طلب کرتے وقت تمام احوال و واقعات سے مفتی کو آگاہ کرے اس سلسلہ میں کسی قسم کی چشم پوشی سے کام نہ لے تا کہ فتویٰ پیش آمدہ صورت حال کے عین مطابق ہو اگر حقائق کو چھپا کر کسی چیز کی حلت کا فتویٰ حاصل کر لیا تو وہ چیز اس کے لیے حلال نہ ہو گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس کی وضاحت فرمائی: ''کہ تم میرے پاس اپنے تنازعات

لے کر آتے ہو، بعض اوقات کوئی شخص اپنے زور بیان سے غالب آ جاتا ہے اور میں اس کے دلائل سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں لیکن درحقیقت وہ اس فیصلہ کا حقدار نہیں ہوتا تو ایسے حالات میں اگر میں نے اس کی چرب زبانی کے پیش نظر اس کے بھائی کا حق اسے دے دیا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے قبول نہ کرے کیونکہ میں اسے آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔" [صحیح مسلم: ج۲، ص۱۲]

اس حدیث کے پیش نظر اگر کوئی غلط بیانی سے فتویٰ حاصل کر لیتا ہے تو اس فتویٰ سے وہ چیز اس کے لیے حلال یا جائز نہیں ہو سکے گی بلکہ ایسے حالات میں خود انسان کا دل بھی اس پر مطمئن نہیں ہوتا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ایسے حالات میں خود انسان اپنے دل سے فتویٰ طلب کرے اگرچہ مفتی اس کے حق میں فتویٰ دے دے۔" [صحیح الجامع الصغیر: حدیث نمبر ۹۴۸]

② **خلوص نیت:** سائل کا مقصد اپنے مسئلہ کا شرعی حل معلوم کرنا اور دین کے بارے میں استفادہ کرنا ہو، سوالات کے ذریعے مفتی کا امتحان لینا قطعاً مقصود نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی یہ مطلب ہو کہ بلا مقصد ایسے مسائل کو اچھالا جائے جن سے فتنہ اور نزاع پھیلنے کا خدشہ ہو کیونکہ مجمع عام میں کسی کو پریشان کرنا یا فتنہ کو ہوا دینا دونوں ناجائز ہیں۔ یعنی جس طرح مفتی کے لیے کتمان حق جائز نہیں اسی طرح اظہار حق جو فتنہ وفساد کا پیش خیمہ ہو وہ بھی درست نہیں نیز فتویٰ پوچھنے والے کے لیے فتنہ پیدا کرنے کی غرض سے فتویٰ لینا جائز نہیں ہے چنانچہ علما نے لکھا ہے: کہ اگر فتویٰ سے فتنہ وفساد کا ڈر ہو یا فتویٰ پوچھنے والا فتویٰ پوچھ کر فتنہ کھڑا کرنا چاہتا ہو یا اس کا کوئی مذموم مقصد ہو تو مفتی کو مصلحت کی بنا پر فتویٰ نہیں دینا چاہیے۔ [الفتاویٰ الشرعیہ: ص......]

③ **مرضی کا فتویٰ:** سائل کے لیے ضروری ہے کہ وہ مفتی سے اپنی مرضی کے مطابق فتویٰ لینے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی اس پر اس سلسلہ میں کوئی دباؤ ڈالا جائے، اسے کسی صورت میں مجبور نہ کیا جائے کہ اگر آپ فلاں چیز کے جواز کا فتویٰ دے سکتے ہو تو لکھ دو بصورت دیگر رہنے دو اور نہ ہی اپنی مرضی کا فتویٰ حاصل کرنے کے لیے مختلف اہل علم کے پاس جائے کہ کسی طرح سود حلال ہو جائے یا کوئی مفتی مردوں کے لیے سونا یا ریشم حلال کر دے، سائل کو چاہیے کہ وہ ایسی خرافات سے اجتناب کرے۔ [ادب الفتویٰ: ص۱۴۸]

④ **کتاب وسنت کی بالادستی:** سائل کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق فتویٰ طلب کرے، یہ نہ کہے کہ میں فلاں امام کا مقلد ہوں لہٰذا مجھے اس کے مطابق فتویٰ دیا جائے کیونکہ ہم پر صرف کتاب وسنت کی اتباع لازم ہے، قرآن کریم میں اس اصول کو بیان کیا گیا ہے ویسے بھی تمام ائمہ دین کا یہی ارشاد ہے: "کہ اگر ہماری بات کتاب وسنت کے خلاف ہو تو ہمارا فتویٰ ترک کر کے کتاب وسنت کا تمسک کیا جائے۔"

⑤ **فرضی مسائل:** سوال پوچھتے وقت فرضی مسائل اور بال کی کھال اتارنے سے گریز کیا جائے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں تمہارے لیے ناپسند کی ہیں، قیل وقال، اضاعت مال اور سوال در سوال۔" [صحیح بخاری مع الفتح: ج۵ ص۶۸]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اپنے شاگرد حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کرتے تھے: "کہ جو شخص آپ سے بلا مقصد سوال کرے اسے ہرگز جواب نہ دیا جائے۔" [اعلام الموقعین: ج۴، ص۲۲۱]

⑥ **علمائے حق کی تلاش:** فتویٰ پوچھنے والے کو چاہیے کہ وہ کتاب وسنت کے ماہرین اور باعمل علمائے کرام کی طرف رجوع کرے اور قابل اعتماد ثقہ اہل علم سے فتویٰ حاصل کرے یہ درست نہیں کہ مذہبی تعصب کی بنا پر وہ جید اور فاضل علمائے حق کو نظر انداز کر کے

اپنے مسلک یا گروہ کے علما سے رابطہ کرے خواہ وہ علم سے کورے ہوں۔ سائل کو اس سلسلہ میں بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔

⑦ اکرام علما: علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں: ''کہ فتویٰ طلب کرنے والے کو چاہیے کہ وہ مفتی حضرات کا ادب واحترام ملحوظ رکھے، صاحب علم کی بنا پر اس کی قدر اور عزت کرے نیز بات کرتے یا فتویٰ پوچھتے وقت انتہائی ادب واحترام سے اس کو مخاطب کرے۔''

[ادب الفتویٰ: ص ۱۵۰]

قارئین کرام! ہم نے گزشتہ صفحات میں فتویٰ اور ارکان فتویٰ کے متعلق کچھ گزارشات پیش کی ہیں، اللہ کے فضل وکرم سے علمائے حق نے ہر دور میں پیش آمدہ دینی مسائل کے متعلق کتاب وسنت کی روشنی میں لوگوں کی راہنمائی کی ہے۔

یقیناً یہ بہت بڑی خدمت ہے، کتاب وسنت کے حاملین، علمائے اہل حدیث کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف وامتیاز بخشا ہے کہ وہ کتاب وسنت کے چشمہ صافی سے مستفیض ہو کر خدمت دین میں مصروف رہے ہیں، ان حضرات کے فتاویٰ بازار میں دستیاب ہیں جن کے مطالعہ سے ہر منصف مزاج قاری محسوس کرتا ہے کہ ان میں ظن وتخمین اور شخصی آراء پر مبنی فتاویٰ نہیں ہیں بلکہ کتاب وسنت سے مدلل اور مزین فتاویٰ پڑھ کر قارئین کو دلی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ فتاویٰ نذیریہ، فتاویٰ ثنائیہ، فتاویٰ ستاریہ، فتاویٰ اہل حدیث، فتاویٰ سلفیہ، فتاویٰ برکاتیہ اور فتاویٰ علمائے اہل حدیث اس سلسلۃ الذہب کی شاندار کڑیاں ہیں، ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

❁ فتاویٰ نذیریہ، مؤلف: شیخ الکل سید مولانا محمد نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ مجموعہ مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی کے دو نامور شاگردوں مولانا محمد شمس الحق عظیم آبادی اور مولانا محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری کا مرتب کردہ ہے، اس پر مولانا محمد شرف الدین دہلوی کی نظر ثانی اور مختصر تعلیقات ہیں، یہ فتاویٰ تین جلدوں، ایک ہزار نو صد پینتیس (۱۹۳۵) صفحات اور نو صد تنتالیس (۹۴۳) فتاویٰ پر مشتمل ہے، اس میں سید صاحب کے علاوہ چار صد ستائیس (۴۲۷) دیگر مفتیان کرام کے فتاویٰ بھی شامل ہیں، اس میں عقائد، تقلید واجتہاد، سنت وبدعت، طہارۃ وصلوٰۃ، صدقات وزکوٰۃ، نکاح وطلاق، قربانی وعقیقہ، حدود وتعزیر، صید وذبائح وصوم وحج، حظر واباحت اور بیوع وغیرہ تقریباً اٹھاون (58) مختلف عنوانات کے متعلق فتاویٰ موجود ہیں۔

❁ فتاویٰ ثنائیہ، مؤلف: مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (1870ء تا 1948ء)

اس فتاویٰ کی جمع وترتیب اور تبویب کا کام مولانا محمد داؤد راز دہلوی نے انجام دیا اور مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی نے حواشی وتعلیقات کا اضافہ کیا ہے، یہ فتاویٰ دو جلدوں، ایک ہزار چھ صد چودہ (۱۶۱۴) صفحات اور ایک ہزار چار سو تیرانوے (۱۴۹۳) فتاویٰ پر مشتمل ہے، اس میں مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ دینے کا انداز اکثر وبیشتر انتہائی مختصر ہے، سب سے زیادہ تشریحی فتاویٰ جناب ابوسعید شرف الدین دہلوی کے فتاویٰ ''شرفیہ'' کے عنوان سے مذکور ہیں، اس مجموعہ میں عقائد، صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، جنائز، نکاح وطلاق اور بیوع سے متعلق فتاویٰ موجود ہیں۔

❁ فتاویٰ ستاریہ، مؤلف: ابو محمد عبدالستار بن عبدالوہاب دہلوی (1905ء تا 1966ء)

اس فتاویٰ کی جمع وترتیب مفتی جماعت غرباء اہل حدیث مولانا حافظ عبدالغفار نے کی ہے۔ فتاویٰ کا یہ مجموعہ آٹھ سو آٹھ (۸۰۸) صفحات اور سات سو (۷۰۰) فتاویٰ پر مشتمل ہے، اس میں مختلف شعبہائے زندگی سے متعلق متفرق فتاویٰ

موجود ہیں، فتاویٰ کی تقسیم مضامین کے اعتبار سے نہیں کی گئی بلکہ ہر جلد میں بلا ترتیب فتاویٰ شامل ہیں، اکثر فتاویٰ کا تعلق عموی نوعیت کے شخصی مسائل سے ہے، اعتقادات اور فروعی اختلافات کے متعلق مسائل مفصل اور مدلل ہیں، اس میں مفتی ابو محمد عبدالستار کے علاوہ ان کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ عبدالغفار اور دیگر مفتیانِ کرام کے فتاویٰ بھی شامل ہیں۔

❁ فتاویٰ اہل حدیث' مؤلف: مولانا حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ (1887ء تا 1964ء)

اس مجموعہ کی جمع و ترتیب اور اشاعت کے فرائض ان کے نامور شاگرد مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیئے ہیں یہ مجموعہ دو جلدوں ایک ہزار چار سو اٹھاسی (۱۴۸۸) صفحات اور ایک ہزار ایک سو پچیس (۱۱۲۵) فتاویٰ پر مشتمل ہے، اس مجموعہ میں شامل تمام فتاویٰ حافظ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں، دوسرے مفتیان کرام کے فتاویٰ اس میں شامل نہیں ہے، فتاویٰ کا انداز تحقیقی لیکن انتہائی آسان اور سہل ہے، جس سے عام، معمولی پڑھا لکھا انسان بھی آسانی سے استفادہ کر سکتا ہے، اس مجموعہ میں ایمان وعقائد، طہارۃ، صلوۃ، زکوۃ، صوم، حج، تجارت، ھبہ، وقف، نکاح وطلاق، حظر واباحت اور امارت وغیرہ کے متعلق فتاویٰ ہیں، اس کا ماخذ قرآن وحدیث اور یہ مجموعہ مسلک اہل حدیث کا بے باک ترجمان ہے۔

❁ فتاویٰ سلفیہ' مؤلف: مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1968ء)

اس مجموعہ میں مولانا سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے ان فتووں کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے جو ہفت روزہ الاعتصام میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں، فتاویٰ کا یہ مجموعہ ایک جلد، ایک صد بانوے (۱۹۲) اور تیئس (۲۳) فتاویٰ پر مشتمل ہے اگر اس میں ضمنی فتاویٰ کو شامل کر لیا جائے تو کل تعداد تیس (۳۰) ہو جاتی ہے، یہ مجموعہ مروجہ محفل میلاد، نماز، نکاح وطلاق، احکام میت، گاؤں میں جمعہ اور رؤیت ہلال وغیرہ سے متعلق ہے، اس میں زیادہ تر دلائل قرآن وحدیث سے پیش کیے گئے ہیں اگر کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث سے دلیل نہیں مل سکی تو اس کی صراحت کر دی گئی ہے جیسا کہ عشر کے متعلق فتویٰ میں وضاحت کی گئی ہے۔

❁ فتاویٰ برکاتیہ' مؤلف: مولانا ابوالبرکات احمد بن محمد اسماعیل (1926ء تا 1991ء)

اس مجموعہ کو مولانا محمد یحییٰ طاہر نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ ایک جلد، تین سو اڑسٹھ (۳۶۸) صفحات اور پانچ صد اٹھاون (۵۵۸) فتاویٰ پر مشتمل ہے۔ اس مجموعہ میں عقائد وعبادات، نکاح وطلاق اور چند متفرق مسائل مثلاً عورت کی حکمرانی، انعامی بانڈز، پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت اور خون کا عطیہ وغیرہ سے متعلق فتاویٰ مذکور ہیں، اکثر فتاویٰ پر علامہ حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تصدیقی دستخط بھی موجود ہیں جو مولانا ابوالبرکات کے شیخ محترم ہیں، فتاویٰ مختصر اور آسان زبان میں ہیں جس سے سائل کے لیے صورت مسئلہ واضح ہو جاتی ہے۔

❁ فتاویٰ علمائے اہل حدیث:

اس مجموعہ کے مرتب جناب مولانا ابوالحسنات علی محمد سعیدی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، یہ مجموعہ کسی ایک مفتی کا تصنیف کردہ نہیں ہے بلکہ فتاویٰ نذیریہ، فتاویٰ ثنائیہ، فتاویٰ ستاریہ، فتاویٰ اہل حدیث اور اہل حدیث مکتب فکر کے مختلف رسائل میں شائع شدہ فتاویٰ، اس کے علاوہ سینکڑوں علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ کو مختلف ذرائع سے جمع کر کے شائع کیا گیا ہے، یہ مجموعہ دس جلدوں پر مشتمل ہے، ہر جلد

کے شروع میں ماخذ فتاویٰ علمائے اہل حدیث کے عنوان سے ان کتب اور مفتیان کرام کے نام موجود ہیں جن سے فتاویٰ اخذ کیے گئے ہیں، مولانا کی وفات کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

ان فتاویٰ کے علاوہ مولانا شمس الحق عظیم آبادی، اسلامی فتاویٰ از مولانا عبدالسلام بستوی اور فتاویٰ صراط مستقیم از مولانا محمود احمد میرپوری بھی مطبوع اور متداول ہیں۔ اس طرح حال ہی میں منظر عام پر آنے والے حافظ عبدالمنان نورپوری حفظہ اللہ کے فتاویٰ ''احکام ومسائل'' اور ہمارے فاضل بھائی مولانا مبشر احمد ربانی کے فتاویٰ ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' بھی قارئین کے سامنے ہیں، جن میں زندگی کے تمام شعبہ جات سے متعلق کتاب وسنت کی روشنی میں راہنمائی کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ ان محنتوں کو ثمر آور کرے (آمین)

فتاویٰ اصحاب الحدیث بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی اور بہترین کاوش ہے جو کہ حضرت العلام شیخ الحدیث حافظ عبدالستار الحماد کے فتاویٰ پر مشتمل ہے، حضرت حافظ صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں جیسا کہ ہفت روزہ الاعتصام کو حضرت العلام شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ کے فتاویٰ نے چار چاند لگا دیئے ہیں، اسی طرح اہل حدیث میں شائع ہونے والے فتاویٰ جات سے بھی اندرون وبیرون ملک لوگ مستفید ہو رہے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں جدید مسائل کا حل اور تمام مسائل کی جزئیات پر تفصیلی اور مدلل بحث جس سے قارئین کرام کو اطمینان قلب اور شرح صدر حاصل ہو پھر دلائل کی حسن ترتیب، اسلوب میں سلاست اور روانی، دلائل کی تحقیق اور استنباط مسائل کا محدثانہ انداز ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' کی امتیازی خصوصیات ہیں، اس فتاویٰ کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں جو اپنا تعارف آپ ہے۔ عطر آں باشد کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت حافظ صاحب کی اس عظیم خدمت کو شرف قبولیت سے نوازے نیز ان کے لیے اور اس کی تیاری میں ہر طرح سے تعاون کرنے والوں کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ (آمین)

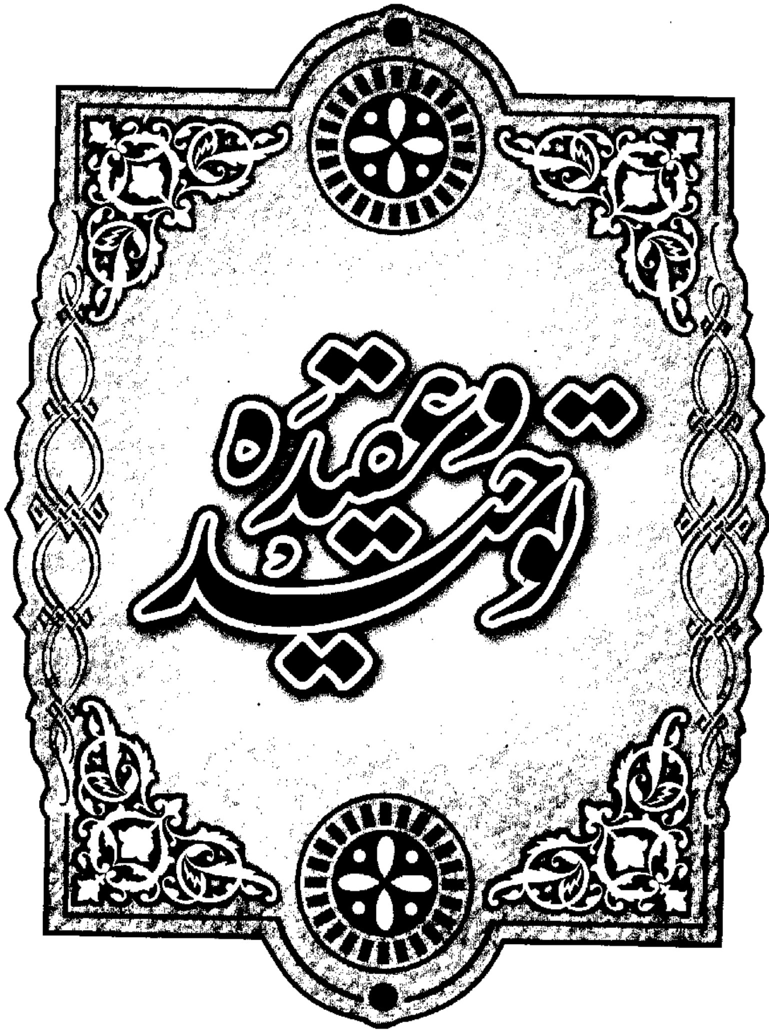
وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

کتبہ: عبدالخالق بن محمد صادق مدنی

2005/7/12ء م الموافق 13 جمادی الاول 1425ھ

کویت




توحید و عقیدہ

توحید وعقیدہ

سوال میلسی سے عبدالقہار لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں عقیدہ کے متعلق بہت زور دیا جاتا ہے، آخر یہ عقیدہ کیا ہے؟ جس کے متعلق اتنی تاکید کی جاتی ہے کہ اس کی صحت کے بغیر کوئی عمل بھی صحیح نہیں ہوگا۔

جواب لغوی طور پر لفظ عقیدہ ''عقد'' سے بنا ہے، جس کا معنی جوڑنا اور مضبوط کرنا ہے، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مختلف معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:

① زبان کی گرہ: ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ○﴾ [۲۰/طٰہٰ:۲۷]

''اے اللہ! میری زبان کی گرہ کو کھول دے''۔

② عقد نکاح: ﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ﴾ [۲/البقرہ:۲۳۵]

''عدت پوری ہونے تک عقد نکاح کا عزم نہ کرو''۔

③ دھاگے میں گرہ لگانا: ﴿النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ○﴾ [۱۱۳/الفلق:۴]

''دھاگے میں گرہ لگانے والی عورتوں کی پھونک جھاڑ''۔

④ مضبوط قسم: ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ [۵/المائدہ:۸۹]

''جن قسموں کو تم نے مضبوط کیا''۔

⑤ عہد و پیمان: ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ [۵/المائدہ:۱]

''اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو''۔

چادر باندھنے کے لیے عقد ازار استعمال ہوتا ہے، نیز خرید و فروخت اور باہمی لین دین کے معاملات کو بھی عقد کہا جاتا ہے، الغرض عربی زبان میں مضبوطی اور پختگی کے معنی کو ادا کرنے کے لیے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔

شرعی اصطلاح میں عزم بالجزم اور پختہ ذہن پر عقیدہ کا اطلاق ہوتا ہے، خواہ ذہن کی پختگی حق پر ہو یا باطل پر اگر ذہنی مضبوطی حق پر ہے تو عقیدہ صحیح کہلاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر پختہ ہونا اور اگر کسی باطل چیز پر ذہن پختہ ہوا ہے تو عقیدہ باطل ہے، جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث پر مضبوط ہونا۔

الغرض عقیدہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز پر پختہ یقین رکھے اور اسے دین کے طور پر اپنائے قطع نظر کہ وہ چیز حق ہو یا باطل، دین اسلام میں صحیح عقیدہ میں درج ذیل باتیں آتی ہیں۔

(الف) اللہ، اس کے فرشتوں، رسولوں، کتابوں، یوم آخرت اور اچھی یا بری تقدیر پر پختہ یقین رکھنا۔

(ب) جو کچھ قرآن یا سنت صحیحہ سے ثابت ہے، اس پر ایمان لانا، خواہ ان کا تعلق اصول ایمان سے ہو یا ارکان اسلام سے، خواہ وہ اوامر ونواہی پر مشتمل ہو یا اخبار مغیبات پر۔

اس میں توحید، ایمان، امورِ غیب، نبوت ورسالت، قضاوقدر، احکام واخبار آجاتے ہیں، اس کے علاوہ اللہ کے لیے کسی سے محبت کرنا، دشمنی رکھنا، صحابہ کرام کا احترام بھی عقیدہ کا حصہ ہے۔ محدثین عظام نے اس موضوع کو نکھارنے کے لیے کئی ایک نام استعمال کیے ہیں۔ مثلاً!

① توحید: امام بخاری، ابن مندہ اور امام ابن خزیمہ کی کتاب التوحید میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔

② الایمان: حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف کتاب الایمان میں عقیدہ سے متعلق مباحث بیان کئے ہیں۔

③ السنۃ: محدث ابن ابی عاصم نے کتاب السنۃ میں عقیدہ کے حقائق سے بحث کی ہے۔

ان کے علاوہ الشریعہ اور اصول الدین کے نام سے بھی اسے موسوم کیا جاتا ہے۔

سوال ملتان سے اکرام اللہ پوچھتے ہیں کہ کیا یہ صحیح ہے کہ عرش پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا ہے اگر کسی حدیث میں ہے تو حوالہ دیں۔

جواب عرش پر کلمہ طیبہ کا ذکر ایک طویل حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام نے غلطی کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ سے بایں الفاظ دعا کی: ''اے اللہ! میں تجھ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تو ابھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا نہیں کیا تو نے کیسے اس کا نام لے لیا؟ اس پر حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے تیرے عرش پر ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' لکھا دیکھا ہے۔'' [مستدرک حاکم: ج۲،ص۶۱۵]

پھر امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بایں الفاظ تبصرہ کیا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے اور یہ پہلی روایت ہے جو میں نے اس کتاب میں عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے حوالے سے درج کی ہے۔ اس تبصرہ کے متعلق علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''بلکہ یہ روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے، عبدالرحمٰن راوی واہی تباہی مچانے والا ہے۔ اس کے علاوہ عبداللہ بن مسلمہ الفہری کے متعلق بھی میں نہیں جانتا کہ وہ کون ہے جس پر اس روایت کا دارومدار ہے، بہر حال یہ روایت موضوع ہے۔ علامہ البانی مرحوم نے بھی اسے موضوع لکھا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ: ۱/ ۳۸) واللہ اعلم۔

سوال تحصیل شکر گڑھ سے ڈاکٹر ناصر شکیل بابر سوال کرتے ہیں کہ کیا ہمیں اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دینا چاہیے......؟۔

جواب وسیلہ اس سبب کو کہتے ہیں جو مطلوب تک پہنچائے، وسیلہ کی دو اقسام ہیں:

① وسیلہ تکوینی: اس سے مراد وہ طبعی سبب ہے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے مقصود تک پہنچائے مثلاً: پانی انسان کو سیراب کرنے کا وسیلہ ہے، اسی طرح سواری ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا وسیلہ ہے، یہ قسم مؤمن اور مشرک کے مابین مشترک ہے۔

② وسیلہ شرعی: اس سے مراد وہ شرعی سبب ہے جو اس طریقہ کے مطابق منزل مقصود تک پہنچائے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے ذریعے سے مقرر فرمایا ہو۔ یہ وسیلہ صرف اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ صلہ رحمی، درازی عمر اور وسعت رزق کا وسیلہ ہے وغیرہ۔

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی وسیلہ کی صرف تین صورتیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے ان صورتوں میں اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتے وقت رسول اللہ ﷺ کا واسطہ دینا مشروع نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہم براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور طلب حاجات کریں۔ وسیلہ کی جائز اقسام حسب ذیل ہیں:

☆ اللہ کے اسمائے حسنیٰ یا صفات عالیہ کا وسیلہ دے کر دعا کرنا: مثلاً یوں کہا جائے کہ اللہ! تو رحمٰن ورحیم ہے مجھ پر رحم فرما اور مجھے عافیت دے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ کے سب نام اچھے ہیں تو اس کو اس کے ناموں سے پکارو''۔

[۷/الاعراف:۱۸۰]

☆ کسی نیک عمل کا وسیلہ دینا: مثلاً اس طرح کہا جائے کہ اے اللہ! میں تجھ پر ایمان رکھتا ہوں، تیرے رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہوں ان نیک اعمال کے وسیلہ سے میرے گناہ معاف فرما دے۔

اصحاب غار کا قصہ بھی اسی قبیل سے ہے جنہوں نے اپنے اعمال کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا مانگی تھی تو وہ غار سے بحفاظت نکل گئے تھے۔ [متفق علیہ]

☆ نیک آدمی کی دعا کا وسیلہ: شریعت میں اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ کوئی مسلمان شدید تکلیف کے وقت کسی نیک آدمی سے دعا کا مطالبہ کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے سخت قحط کے وقت ایک اعرابی نے بارش کے لیے دعا کی اپیل کی تھی۔ [صحیح بخاری]

ان تین وسائل کے علاوہ جتنے وسیلے ہیں وہ ناجائز ہیں، ان کا کتاب وسنت میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت رسول کریم ﷺ کا واسطہ نہیں دینا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال راولپنڈی سے رانا اختر لکھتے ہیں کہ طاغوت کسے کہتے ہیں، موجودہ دور میں طاغوت کی کیا صورتیں ہیں اور اس سے کیونکر محفوظ رہا جا سکتا ہے؟

جواب لغت کے اعتبار سے طاغوت ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اپنی جائز حدود سے تجاوز کر جائے، قرآن کریم کی اصطلاح میں طاغوت سے مراد وہ بندہ ہے جو بندگی کی حد سے تجاوز کر کے خود آقائی کا دم بھرے اور اللہ کے بندوں سے اپنی بندگی کرائے۔

اللہ کے مقابلہ میں بندے کی سرکشی کے تین مراتب حسب ذیل ہیں۔

☆ بندہ اصولاً اس کی اطاعت کو ہی حق خیال کرے مگر عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرے، اس کا نام قرآنی اصطلاح میں فسق ہے۔

☆ بندہ اس کی فرمانبرداری سے اصولاً منحرف ہو کر یا تو خود مختار بن جائے یا اس کے علاوہ کسی دوسرے کی بندگی کرنے لگے یہ کفر ہے۔

☆ وہ اپنے مالک سے باغی ہو کر اس کے ملک میں اور اس کی رعیت میں خود اپنا حکم چلانے لگے، اس آخری مرتبے پر جو بندہ پہنچ جائے اس کا نام طاغوت ہے۔

کوئی شخص صحیح معنوں میں اللہ کا حقیقی بندہ نہیں ہوسکتا جب تک وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو اور اللہ کی بندگی سے منہ موڑ کر انسان صرف ایک طاغوت کے چنگل میں ہی نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں، ایک طاغوت، شیطان ہے جو اس کے سامنے نت نئی جھوٹی ترغیبات کا سدا بہار سبز باغ پیش کرتا ہے، دوسرا طاغوت آدمی کا اپنا نفس ہے جو اسے خواہشات کا غلام بنا کر زندگی کے ٹیڑھے راستوں پر دھکیل دیتا ہے، ان کے علاوہ بے شمار طاغوت باہر کی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، بیوی اور بچے، اعزہ واقربا، برادری، خاندان، دوست اور آشنا، سوسائٹی اور قوم، پیشوا اور راہنما، حکومت اور حکام یہ سب بندے کے لیے کبھی طاغوت کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں اور اس سے اپنی اغراض کی بندگی کراتے ہیں، پھر بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اس چکر میں پھنسا رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے اور کس کی ناراضگی سے محفوظ رہے۔ مختصر یہ ہے کہ طاغوت ہر وہ باطل قوت ہے جو اللہ کے مقابلہ میں اپنی عبادت یا اطاعت کرائے یا لوگ از خود اللہ کے مقابلہ میں اس کی عبادت یا اطاعت کرنے لگیں خواہ وہ مخصوص شخص ہو یا ادارہ، گویا طاغوت سے مراد دنیا دار چودھری اور حکمران بھی ہو سکتے ہیں، بت، شیطان اور جن بھی ہو سکتے ہیں اور ایسے پیر فقیر بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلہ میں اپنی اطاعت کروانا پسند کرتے ہیں اور شریعت پر طریقت کو ترجیح دیتے ہیں، اس طرح ہر انسان کا اپنا نفس بھی طاغوت ہوسکتا ہے جبکہ وہ اللہ کی اطاعت و عبادت سے انحراف کر رہا ہو۔ ان سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ ان سب کا انکار کر دیا جائے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اب جو شخص طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایسے مضبوط حلقہ کو تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتا''۔ [۲/البقرہ:۲۵۶]

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ''جو لوگ طاغوت کی عبادت کرنے سے بچتے رہے اور اللہ کی طرف رجوع کیا ان کے لیے بشارت ہے، لہٰذا آپ میرے بندوں کو خوش خبری دے دیجئے جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں پھر اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی اور یہ عقل مند ہیں''۔ [۳۹/الزمر:۱۸]......(واللہ اعلم بالصواب)

سوال سمندری سے نادر خاں لکھتے ہیں کہ جماعت المسلمین والے علما حضرات کو ''مولانا'' کہنا شرک بتاتے ہیں اور وہ بطور دلیل یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ''کوئی غلام اپنے آقا کے لیے لفظ مولیٰ استعمال نہ کرے کیونکہ تمہارا مولیٰ تو صرف اللہ تعالیٰ ہے''۔ [صحیح مسلم: کتاب الادب]

کیا واقعی علما حضرات کو ''مولانا'' کہنا شرک ہے؟ قرآن وحدیث کی رو سے اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب عزت واحترام کے پیش نظر علما حضرات کو ''مولانا'' یا ''مولوی'' کہا جاسکتا ہے اور ایسا کرنا شرک نہیں ہے جیسا کہ جماعت المسلمین کی طرف سے یہ تاثر دیا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ نے لفظ مولیٰ کو غیر اللہ کے لیے استعمال فرمایا بلکہ استعمال کی تلقین بھی فرمائی ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''تم میں سے کوئی یوں نہ کہے کہ اپنے رب کو کھانا دو اپنے رب کو وضو کراؤ بلکہ اپنے آقا کے لیے ''سید'' اور ''مولیٰ'' کہا جائے۔'' [صحیح بخاری: کتاب العتق]

اس حدیث کی رو سے غیر اللہ کے لیے لفظ ''سید'' کا استعمال بھی جائز معلوم ہوتا ہے جو صرف اعلیٰ اور محترم شخصیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو لفظ مولیٰ کا اطلاق تو بالاولیٰ جائز ہونا چاہیے جو اعلیٰ اور ادنیٰ دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے

پندرہ معانی کے لیے اس کے استعمال کی نشاندہی فرمائی ہے۔ جن میں آقا، مالک، ناصر، دوست، آزاد کنندہ اور آزاد کردہ غلام وغیرہ بھی شامل ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: کہ لفظ مولیٰ ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ لفظ سید صرف اعلیٰ اور محترم ذات کے لیے مخصوص ہے۔ جب غیر اللہ کے لیے لفظ سید استعمال ہوسکتا ہے تو غیر اللہ کے لیے لفظ مولیٰ کے استعمال پر کراہت کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ [فتح الباری: ۵/۱۸۰]

مذکورہ بالا سوال میں ذکر کردہ الفاظ ایک طویل حدیث کا حصہ ہیں بلکہ اصل حدیث میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حدیث کا متن یوں ہے کہ ''تم میں کوئی اپنے غلام کو ''عبدی'' نہ کہے کیونکہ تم سب اللہ کے بندے ہو، چاہیے کہ میرا نوکر یا میرا خدمتگار کے الفاظ کہے جائیں اسی طرح کوئی غلام اپنے آقا کو ''ربی'' نہ کہے بلکہ اسے ''سیدی'' کہنا چاہیے۔''

[صحیح مسلم: کتاب الالفاظ من الادب]

یہ حدیث بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کئی ایک طرق سے مروی ہے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

☆ جریر بن عبدالحمید عن الاعمش۔ [صحیح مسلم]

☆ عبداللہ بن نمیر عن الاعمش۔ [مسند امام احمد: ۲/۴۹۶]

☆ یعلیٰ بن عبید عن الاعمش۔ [مسند امام احمد: ۲/۴۹۶]

☆ ابومعاویہ محمد بن حازم عن الاعمش۔ [صحیح مسلم]

☆ ابوسعید عبداللہ بن سعید الاشج عن وکیع عن الاعمش۔ [صحیح مسلم]

یہ پانچوں حضرات ثقہ اور بخاری و مسلم کے رجال سے ہیں مؤخر الذکر دو حضرات یعنی ابو معاویہ اور ابوسعید الاشج نے اس روایت میں مذکورہ بالا ''اضافہ'' نقل کیا ہے جب کہ اول الذکر تین راوی یعنی جریر، ابن نمیر اور یعلیٰ اس اضافہ کے بغیر نقل کرتے ہیں۔ روایت میں مذکورہ اضافہ کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کے متعلق ہمارے سامنے دو راستے ہیں۔

① محدثین کے اصول کے مطابق کہ ثقہ کا اضافہ قبول ہوتا ہے، اس اضافہ کو قبول کیا جائے۔

② بیشتر ثقہ راویوں کی مخالفت کی بنا پر اس اضافہ کو شاذ قرار دے کر صرف اصل حدیث کے الفاظ کو تسلیم کیا جائے۔

ہمارے نزدیک مذکورہ اضافہ کے متعلق مؤخر الذکر صورت زیادہ راجح ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''امام مسلم نے حضرت اعمش سے منقول اس روایت کے متعلق اختلاف نقل فرمایا ہے، چند راوی اس اضافہ کو نقل کرتے ہیں جب کہ بعض دوسرے راوی صرف اصل حدیث ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس اضافہ کو روایت سے حذف کر دینا زیادہ صحیح ہے اور علامہ قرطبی کا بھی یہی موقف ہے''۔ [فتح الباری: ۵/۱۸۰]

ہم نے اس اضافہ کو شاذ قرار دیا ہے، اس کے درج ذیل دلائل ہیں:

☆ ابوسعید الاشج جب حضرت اعمش سے بواسطہ حضرت وکیع روایت کرتے ہیں تو مذکورہ الفاظ یعنی اضافہ نقل کرتے ہیں جبکہ حضرت

وکیع کے دوسرے شاگرد اسے ذکر نہیں کرتے، دوسرے شاگردوں کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''تم میں کوئی بھی اپنے غلام کو ''عبدی'' نہ کہے بلکہ خدمتگار کہہ کر آواز دے اسی طرح کوئی غلام اپنے آقا کو ''ربی'' نہ کہے بلکہ وہ سیدی کے الفاظ استعمال کرے۔''
[مسند امام احمد: ۲/۴۴۳]

اس وضاحت سے بلا اضافہ روایت کے محفوظ ہونے کا پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

☆ اضافہ والی روایت کی سند یوں ہے: ''ابو سعید'' الاشج عن وکیع عن الاعمش عن أبی صالح عن ابی ہریرۃ' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جب ابو صالح کے علاوہ دوسرے شاگرد اس روایت کو بیان کرتے ہیں تو وہ اس اضافہ کو ذکر نہیں کرتے ان کی تفصیل یہ ہے:

① عن العلاء بن عبدالرحمٰن عن ابیہ عن ابی ہریرہ [مسند امام احمد: ۲/۴۶۳]

② ہشام عن محمد بن سیرین عن ابی ہریرہ [مسند امام احمد: ۲/۴۹۱]

③ ایوب عن محمد بن سیرین عن ابی ہریرہ [مسند امام احمد: ۲/۴۲۳]

ان ہر سہ طرق میں مذکورہ بالا اضافہ نہیں ہے حضرت جریر' ابن نمیر اور یعلیٰ کے ساتھ ان حضرات کو ملانے سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ مذکورہ اضافہ غیر محفوظ ہے۔

☆ ہم نے شروع میں ایک حدیث کے حوالے سے لکھا ہے کہ اپنے آقا کو مولیٰ کہا جا سکتا ہے جبکہ اضافہ والی روایت میں اس کی صریح ممانعت ہے، اس صورت حال کے پیش نظر ایک روایت کو مرجوح قرار دیئے بغیر تطبیق کی کوئی صورت سامنے نہیں آتی۔ محدثین کرام نے اضافہ کے بغیر صرف اصل روایت کو راجح قرار دیا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ہم نے اضافہ کو کالعدم قرار دے کر ترجیح کی ایک صورت پیدا کی ہے۔ کیوں کہ دونوں روایات بایں طور متعارض ہیں کہ جمع و تطبیق ناممکن ہے اور تاریخ کا بھی علم نہیں تاکہ ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ قرار دیا جائے۔ [فتح الباری: ۵/۱۸۰]

اس طرح علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: کہ راویان حدیث نے حضرت اعمش سے اس لفظ یعنی مولیٰ کو نقل کرنے میں اختلاف کیا ہے بعض ذکر کرتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے ذکر نہیں کرتے ہمارے نزدیک اس اضافہ کا حذف کر دینا زیادہ صحیح ہے۔ [شرح نووی ۲/۲۳۸ طبع ہند]

مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں ان دو ثقہ راویوں ابو معاویہ اور ابو سعید الاشج کا یہ اضافہ شاذ اور غیر محفوظ معلوم ہوتا ہے اور انہی الفاظ پر ممانعت کی بنیاد ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال راولپنڈی سے میجر احتشام کیانی لکھتے ہیں کہ اللہ اکبر ہے، صدیق بھی اکبر ہیں، اللہ اعظم ہے، فاروق بھی اعظم ہیں، اللہ غنی ہے، عثمان بھی غنی ہیں۔ اللہ مشکل کشا ہے، علی مشکل کشا کیوں نہیں؟ گو خالق اپنی شان کے مطابق ہے اور مخلوق اپنی شان کے مطابق، اللہ تعالیٰ قرآن میں بادشاہ کو رب کہتا ہے، اگر بادشاہ رب ہے تو علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، داتا اور غوث کیوں نہیں؟ قرآن میں ہے کہ اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دیں گے یعنی اللہ کے ساتھ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی فضل فرماتے ہیں تو کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ یارسول اللہ! فضل کریں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اس عالمِ رنگ وبو میں اپنی توحید قائم کرنے کے لیے متعدد کتابیں نازل فرمائیں اور بے شمار رسولوں کو مبعوث کیا، توحید یہ ہے کہ اللہ کے اسما اور اس کی صفات نیز اس کے حقوق واختیارات اور احکام میں کسی مخلوق کو شریک نہ کیا جائے۔ اگر کسی نے اللہ کے اسما اس کی صفات، اس کے حقوق واختیارات واحکام میں کسی مخلوق کو شریک ٹھہرایا تو وہ اللہ کے ہاں مشرک ہے اگر توبہ کے بغیر اس جہاں سے رخصت ہوا تو ہمیشہ کے لیے اس پر جنت حرام اور جہنم واجب ہوگئی۔ داتا، غوث اعظم، مشکل کشا اور غریب نواز یہ سب اللہ کی صفات ہیں، بعض لوگ ان صفات کو مخلوق میں تلاش کرتے ہیں جیسا کہ سائل کے سوال سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کون ہے جو بے قرار کی پکار سنتا ہے جب کہ وہ اسے پکارتا ہے اور کون اس کی تکلیف کو رفع کرتا ہے اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی الٰہ بھی ہے۔'' [۲۷/النمل:۶۲]

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ سب سے بڑا فریاد سننے والا یعنی غوث اعظم صرف اللہ ہے، عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یقیناً تو ہی بہت بڑی عطا دینے والا ہے''۔ [۳/آل عمران:۸]

اس آیت کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ ہی سب سے بڑھ کر دینے والا یعنی داتا ہے علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ داتا نہیں ہیں۔ انہوں نے تو خود اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں اپنے متعلق داتا ہونے کی پرزور الفاظ میں تردید کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے لوگو! تم سب اللہ کے در کے فقیر ہو وہ اللہ تو غنی وحمید ہے''۔ [۳۵/فاطر:۱۵]

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ ہی غریبوں کو نوازنے والا ہے اس کے علاوہ اور کوئی غریب نواز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''اگر اللہ تمہیں کسی مشکل میں ڈال دے تو اس کے علاوہ اسے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تمہیں کوئی خیر پہنچانا چاہے تو اس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں۔'' [۱۰/یونس:۱۰۷]

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ تمام مشکلات حل کرنے والا یعنی مشکل کشا صرف اللہ ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد ایک دعا پڑھا کرتے تھے جس میں یہی مضمون بیان ہوا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے اللہ! جس کو تو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جس سے تو روک لے اسے کوئی دینے والا نہیں اور کسی صاحب حیثیت کو اس کی حیثیت تیرے مقابلے میں نفع نہیں پہنچا سکتی۔'' [صحیح بخاری: کتاب الدعوات، ۶۳۳۰]

سوال میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اکبر، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اعظم اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو غنی کہا گیا ہے۔ ان حضرات کے لیے اس قسم کے القاب ہم نے خود تجویز کیے ہیں۔ کتاب وسنت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات ایسی ہیں کہ قرآن میں ان کا اطلاق بندوں پر بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ سمیع اور بصیر ہے تو انسان کے لیے بھی سمیع اور بصیر کا اطلاق ہوا ہے۔ [۷۶/سورۃ الدھر:۲]

لیکن اللہ تعالیٰ کا سمیع ہونا' اللہ کا بصیر ہونا اس کی شان کے مطابق ہے اور بندے کا سمیع وبصیر ہونا اس کی شان کے لائق ہے یعنی بندے کی سماعت وبصارت انتہائی محدود ہے کیونکہ بندہ پس پردہ نہ کوئی چیز دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی سن سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ایسے عیوب ونقائص سے پاک ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بھی صراحت فرمائی ہے کہ اس کی ذات وصفات میں کوئی دوسرا اس جیسا نہیں ہے۔

[۴۲/الشوریٰ:۱۱]

سوال میں خود ہی ان نفوس قدسیہ کی طرف ایسی صفات کا انتساب کیا گیا ہے جس کا ثبوت قرآن وحدیث میں نہیں ہے پھر خود ہی صغریٰ کبریٰ ملا کر اس سے ایک غلط مقصد کشید کر لیا گیا ہے کہ اللہ مشکل کشا ہے تو علی رضی اللہ عنہ مشکل کشا کیوں نہیں؟ مشکل کشا تو اللہ کی صفت ہے اسے مخلوق میں کس بنیاد پر تسلیم کیا جائے حضرت علی رضی اللہ عنہ تو خود مشکلات میں پھنسے رہے وہ اپنے لیے مشکل کشائی تو نہ کر سکے دوسروں کے لیے کیونکر مشکل کشا ہو سکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اگر اللہ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو ہٹا سکتے ہیں؟ یا اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربانی کا ارادہ کرے تو کیا یہ اس کی مہربانی کو روک سکتے ہیں'' [۳۹/الزمر:۳۸]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوزیشن کو واضح فرمایا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ مشکل کشا بن جائیں، کتاب وسنت میں اس کے لیے کوئی سند نہیں ہے یہ سب خود ساختہ اور ایجاد بندہ ہیں۔ بلاشبہ سورۂ یوسف میں متعدد مرتبہ بادشاہ کے لیے رب کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن وہ علی الاطلاق نہیں بلکہ اضافت کے ساتھ ہے جس کا معنی آقا یا مالک کے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ رب علی الاطلاق اور اضافت کے ساتھ دونوں طرح مستعمل ہے پھر جب بندہ کے لیے اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس کی تانیث بھی کلام عرب میں مستعمل ہے مثلاً گھر کی مالکہ کو عربی میں رَبَّةُ الْبَيْت کہتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی تانیث کا استعمال شرک اکبر ہے۔ سوال میں یہ استدلال بھی عجیب ہے کہ اگر بادشاہ رب ہے تو علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ داتا اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ غوث اعظم کیوں نہیں؟ یہ تو ایسا ہی استدلال ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے باپ کا ہم نام ہو تو پہلا شخص دعویٰ کر دے کہ میرا باپ آپ کے باپ کی جائیداد میں برابر کا شریک ہے۔ کسی کے ہم نام ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ کوئی دوسرا ان کی جائیداد میں حصہ دار ہے۔ سوال میں قرآن کریم کے حوالے سے ایک اور مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے جو مجرمانہ کوشش کے مترادف ہے یعنی اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فضل سے تمہیں غنی کر دے گا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے الفاظ قطعاً نہیں ہیں اگر ایسا سہواً نہیں ہوا تو یہ ایک ایسی تحریف ہے جس کا ارتکاب یہودی کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے ''منافقین صرف اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے اور اس کے رسول نے دولتمند کر دیا ہے۔

[۱۰/التوبہ:۷۴]

اس آیت کریمہ سے یہ مفروضہ کشید کیا گیا ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی فضل فرماتے ہیں تو ''یا رسول اللہ! فضل کریں'' کہنا بھی صحیح ہے العیاذ باللہ، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس لیے ہے کہ اس غنا اور تونگری کا

ظاہری سبب رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہی بنی تھی ورنہ حقیقت میں غنی بنانے والا اللہ تعالیٰ ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ میں جب فضل کا ذکر ہوا ہے تو اس کے ساتھ واحد کی ضمیر استعمال ہوئی ہے یعنی اللہ نے اپنے فضل سے انہیں غنی کر دیا، دوسرے الفاظ میں فضل وکرم کرنا صرف اللہ کا کام ہے اس میں اس کے رسول ﷺ کا ذرا برابر بھی حصہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے ساتھ تثنیہ کی ضمیر استعمال کی جاتی بلکہ خود رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے فضل کے محتاج ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو بھی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ مجھے بھی میرا عمل نجات نہیں دلائے گا ہاں اگر اللہ کا فضل میرے شامل حال ہو جائے تو الگ بات ہے۔'' [صحیح بخاری: الرقاق' ۶۴۶۳]

نیز حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے موقع پر جب ان کے متعلق حسن ظن کا اظہار کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! مجھے اللہ کا رسول ہونے کے باوجود علم نہیں کہ قیامت کے دن میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟''

[صحیح بخاری: المناقب' ۳۹۲۹]

آخر میں ہم اپنے معزز قارئین اور سائلین سے یہ گزارش کریں گے کہ اسباب کے بغیر داتا، غوث اعظم، مشکل کشا اور غریب نواز صرف اللہ کی ذات ہے لہٰذا جب بھی دعا مانگو یا مدد کے لیے پکارو تو صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

سوال محمد بشیر بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ فرقہ بازی کیا ہے؟ جسے اللہ تعالیٰ نے معیوب قرار دیا ہے' حکومت اور عوام الناس بھی اس کی مذمت کرتے ہیں۔

جواب اہل تفرق کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور خود فرقوں میں بٹ گئے، ان سے آپ کو کچھ سروکار نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے'' ۔ [۶/الانعام:۱۵۹]

فرقہ بازی ایک ایسی لعنت اور باعث مذمت ہے جو ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیتی ہے، جن لوگوں میں یہ عادت بد پائی جاتی ہے، ان کی ساکھ اور عزت دنیا کی نظروں سے گر جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرقہ بندی کو اپنے عذاب کی ایک شکل قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ ان سے کہہ دیجئے! اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ تم پر تمہارے اوپر سے کوئی عذاب نازل کرے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے کوئی عذاب مسلط کر دے یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر کے ایک فرقے کو دوسرے سے لڑائی کا مزا چکھا دے۔'' [۶/الانعام:۱۵۹]

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت بالا میں ذکر کردہ تمام قسم کے عذابوں سے اللہ کی پناہ مانگی اور دعا کی کہ میری امت پر اس قسم کے عذاب نہ آئیں چنانچہ پہلی اور دوسری قسم کے عذابوں کے متعلق آپ ﷺ کی دعا قبول ہو گئی مگر تیسری قسم کے عذاب جو فرقہ بندی سے متعلق ہے، دعا قبول نہ ہوئی بلکہ آپ ﷺ نے اس عذاب کو پہلے دونوں عذابوں کی نسبت آسان قرار دیا ہے۔ [صحیح بخاری: تفسیر' ۴۶۲۸]

اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلی دو قسم کا عذاب اس امت کے کلی استیصال کے لیے نہیں آئے گا البتہ جزوی طور پر آسکتا ہے، رہا تیسری قسم کا عذاب تو وہ اس امت میں موجود ہے جس نے ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے مسلمانوں کو ایک مغلوب قوم بنا رکھا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بطور پیشین گوئی فرمایا تھا:

''بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوگئے جبکہ میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک گروہ کے علاوہ سب فرقے جہنم کا ایندھن ہوں گے۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ نجات یافتہ کون ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو اس راہ پر چلیں گے جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔'' [جامع ترمذی: الایمان: ۲۶۴۱]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس معیار کی نشاندہی فرمادی ہے جو قیامت کے دن اس کے ہاں اس کے عذاب سے نجات کا باعث ہوگا۔ قرآن پاک میں اسے صراط مستقیم اور سبیل المؤمنین کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرقہ بازوں کو مشرکین کے لفظ سے ذکر کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ان مشرکین سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنا دین الگ کر لیا اور گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہے۔'' [۳۰/الروم: ۳۲]

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مذہبی یا سیاسی فرقہ کا آغاز بدعی عقیدہ یا بدعی عمل سے ہوتا ہے مثلاً کسی رسول یا بزرگ کو اس کے اصلی مقام سے اٹھا کر اللہ کی صفات میں شریک بنا دینا، یہی وہ غلو فی الدین ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

پھر یہ فرقہ بازی عموماً دو قسم کی ہوتی ہے۔

☆ ایک مذہبی جیسے کسی امام کی تقلید میں بایں طور انتہا پسندی سے کام لینا کہ اس امام کو منصب رسالت پر بٹھا دینا گویا وہ معصوم عن الخطا ہے یا کسی معمولی اختلاف کو کفر واسلام کی بنیاد قرار دینا یا کسی اہم اختلاف کو باہمی رواداری کے خلاف خیال کرنا وغیرہ۔

☆ دوسری سیاسی جیسے علاقائی، قومی، لسانی بنیادوں پر لوگوں کو تقسیم کرنا۔ درج ذیل عقائد اس فرقہ بازی کی زد میں آتے ہیں۔

① اللہ کے بجائے عوام کی بالا دستی اور انہیں طاقت کا سرچشمہ قرار دینا۔

② اللہ کی ذات اور انبیا علیہم السلام کے معجزات کا انکار۔

③ کچھ ائمہ کو معصوم اور مامون قرار دینا۔

الغرض جتنے بھی فرقے ہیں خواہ مذہبی ہوں یا سیاسی، ان کا کوئی نہ کوئی عقیدہ یا عمل ضرور کتاب وسنت کے خلاف ہوگا۔ بدعی عمل کا تعلق سنت رسول ﷺ کے برعکس ہوتا ہے یعنی کسی سنت کو دیدہ دانستہ نظر انداز کر دینا یا کسی نئے کام کو ثواب کی نیت سے شروع کر دینا وغیرہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دین میں پہلے کمی رہ گئی تھی جو اس ترمیم یا اضافہ سے پوری کی جارہی ہے۔ اعاذنا الله منه.

اگر مزید غور کیا جائے تو گروہ بندی کی تہ میں دو ہی اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ایک مال کی محبت' دوسرے اقتدار کی چاہت۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ بکریوں کے کسی ریوڑ میں دو بھوکے بھیڑیے اتنی تباہی نہیں مچاتے جتنا مال کی محبت اور منصب کی چاہت کسی کے ایمان کو برباد کرتی ہیں۔'' [جامع ترمذی: الزہد: ۲۳۷۶]

اس فرقہ بندی سے محفوظ رہنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ قرآن اور صحیح احادیث کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور اس سلسلہ میں دائیں بائیں جھانکنے سے اجتناب کیا جا سکے۔

سوال ملتان سے چند ایک احباب جماعت لکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے خطیب صاحب کی کچھ باتیں بہت عجیب سی معلوم ہوتی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اپنی مرضی کے مطابق دین بناتے ہیں اس لیے یہ تمام فقہی مسالک کے لوگ کافر ہیں۔ ان سے نکاح کرنا، ان کے پیچھے نماز ادا کرنا، ان کے جنازے پڑھنا اور ان سے وراثت وغیرہ کے معاملات ممنوع ہیں۔ وہ بطور دلیل قرآن مجید کی اس آیت کو پیش کرتے ہیں کہ:

''جو لوگ اللہ کی طرف سے نازل شدہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی لوگ کافر ہیں۔'' [۵/المآئدہ:۴۴]

مہربانی فرما کر اس کے متعلق ہماری راہنمائی فرمائیں۔

جواب کسی کو کافر کہنا، تکفیر کہلاتا ہے، فتنہ تکفیر بہت خطرناک، تباہ کن اور ہلاکت خیز ہے، اس امت میں سب سے پہلے اس فتنہ کو خوارج نے برپا کیا، جنگ صفین کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان یہ طے پایا کہ حضرت عمرو بن العاص اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما جو فیصلہ کریں وہ فریقین کو قبول ہوگا، اسے معاہدہ تحکیم کہا جاتا ہے، خوارج نے اس معاہدہ کی آڑ میں امت کے پسندیدہ اور برگزیدہ حضرات کی تکفیر کی، انہوں نے اپنے اس موقف کے لیے قرآن پاک کی ایک آیت بطور دلیل پیش کی وہ یہ ہے: ''فیصلہ کرنے کا حق تو صرف اللہ کے لیے ہے۔'' [۱۲/یوسف:۴۰]

ان کا مطلب یہ تھا کہ جب فیصلہ کرنا اللہ کا حق ہے تو یہ حق بندوں کے حوالے کرنا کفر ہے اور یہ حق بندوں کو دینے والے سب کافر ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ذریعے ان پر اتمام حجت کرتے ہوئے ان کی غلطی کو واضح کیا جب وہ باز نہ آئے تو نہروان کے مقام پر ان کی خوب سرکوبی کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے انہی کے متعلق فرمایا تھا: کہ خارجی اللہ کی مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں، انہوں نے جو آیات کفار کے متعلق نازل ہوئی تھیں، ان کو مسلمانوں پر چسپاں کر دیا۔ [صحیح بخاری: المرتدین، باب ۶]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ تکفیر کی سنگینی بایں الفاظ بیان فرمائی کہ جب کوئی شخص اپنے بھائی کو ''اے کافر'' کہتا ہے تو ان دونوں میں سے ایک کافر ہو جاتا ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب الأدب، ۶۱۰۳]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس کو کافر کہا گیا ہے اگر وہ فی الحقیقت کافر ہے تب تو وہ کافر ہوا اگر وہ واقعتاً کافر نہیں تو کہنے والا کافر ہو گیا، یعنی تکفیر دودھاری تلوار ہے جس نے کسی ایک کو ضرور کاٹنا ہے۔ اس لیے کسی کو کافر کہنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ہمارے اسلاف اس سلسلہ میں بہت محتاط تھے۔ وہ کسی کلمہ گو اہل قبلہ کو کافر نہیں کہتے تھے انہوں نے تکفیر کے لیے قواعد وضوابط وضع کیے ہیں۔ جن کا ہم آیندہ تذکرہ کریں گے۔ تاہم امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ بالا حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''جو شخص اپنے بھائی کو بلا وجہ کافر کہتا ہے وہ خود کافر ہو جاتا ہے۔'' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتنہ کی تباہ کاریوں کو بچشم خود ملاحظہ کیا تھا۔ اس لیے وہ اپنی صحیح میں اس کے قواعد وضوابط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک عنوان یوں قائم کرتے ہیں: ''اگر کسی نے معقول وجہ

کے پیش نظر یا نادانستہ طور پر کسی کو کافر کہا کہنے والا کافر نہیں ہوگا۔'' [کتاب الادب: باب ۷۴]

اس عنوان کے تحت امام المحدثین نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ پیش کیا ہے جب انہوں نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا تھا کہ یہ منافق ہے اور ان کے پاس یہ کہنے کی معقول وجہ تھی کہ یہ کافروں سے دوستی رکھے ہوئے ہیں اور ہمارے جنگی راز اہل مکہ کو بتاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غلط فہمی کو دور فرمایا لیکن مذکورہ بالا حدیث کے پیش نظر آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تکفیر نہیں فرمائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ عمر! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو عرش پر سے دیکھا ہے اور انہیں مغفرت کا پروانہ عنایت فرمایا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الادب، باب ۷۴]

اسی طرح نادانستہ طور پر کلمہ کفر کہنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ دوران سفر اپنے باپ کی قسم اٹھائی اور غیر اللہ کی قسم اٹھانا کفر یا شرک ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تجدید ایمان کے لیے نہیں کہا بلکہ ان کی لاعلمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں باپ دادا کی قسم اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔'' [صحیح بخاری: الادب، ۶۱۰۸]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمۃ الباب سے تکفیر کے متعلق دو اصول سامنے آتے ہیں:۔

① جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے کوئی کفریہ کام یا بات سرزد ہو جائے تو اسے معذور خیال کیا جائے اور اسے کافر کہنے کی بجائے اس کی جہالت دور کی جائے۔ اگر اتمام حجت کے بعد بھی اصرار کرتا ہے تو اس کے بظاہر کلمہ گو ہونے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ وہ اصرار اور عناد کی وجہ سے خارج از ملت ہوگا۔

② اگر کوئی کفریہ کام یا بات کا مرتکب اپنے پاس کوئی تاویل یا معقول وجہ رکھتا ہے تو بھی اسے معذور تصور کیا جائے لیکن تاویل کے لیے ضروری ہے کہ الفاظ میں عربی قاعدہ کے مطابق اس تاویل کی کوئی گنجائش ہو اور علمی طور پر اس عمل یا بات کی توجیہ ممکن ہو اگر کسی کو اس کی تاویل یا معقول وجہ سے اتفاق نہ ہو تو اسے کافر کہنے کے بجائے بات کے قائل یا کام کے فاعل پر اس تاویل یا معقول وجہ کا بودا پن واضح کر دیا جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیش کردہ اصولوں کے علاوہ چند مزید ضوابط بھی ملاحظہ فرمائیں:

③ اگر کوئی انسان مجبوراً کلمہ کفر یا شرکیہ عمل کرتا ہے تو اسے بھی معذور سمجھنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر اللہ کے ساتھ کفر کرے سوائے اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ہو، درآنحالیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو، ہاں جس شخص نے کفر کے لیے اپنا سینہ کھول دیا ہو، تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔'' [۱۶/النحل: ۱۰۶]

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی مسلمان پر ان گنت مظالم توڑے جا رہے ہوں اور ناقابل برداشت اذیتیں دے کر کلمہ کفر پر مجبور کیا جا رہا ہو تو محض جان بچانے کے لیے کلمہ کفر کہہ دینے کی رخصت ہے۔ بشرطیکہ دل عقیدہ کفر سے محفوظ ہو، ایسے حالات میں اللہ کے ہاں کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ البتہ مقام عزیمت یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم تکا بوٹی کر ڈالا جائے بہر حال وہ کلمہ حق کا ہی اعلان کرتا رہے۔ حضرت خباب بن ارت اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما اس مقام عزیمت پر فائز تھے۔ البتہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے رخصت پر عمل کیا۔

④ اگر انسان پر شدت خوف کی کیفیت طاری ہو اور اس دہشت کے عالم میں اگر زبان سے کلمہ کفر نکل جائے تو بھی قابل مواخذہ نہیں ہے جیسا کہ ایک آدمی نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد میری لاش کو جلا دینا پھر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دینا یا پانی میں بہا دینا تاکہ اس طرح میں اللہ کے حضور پیشی سے بچ جاؤں گا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ مجھے زندہ نہیں کر سکے گا۔ یہ کفریہ عقیدہ ہے چونکہ مارے دہشت کے ایسا ہوا، اس لیے اسے معذور سمجھتے ہوتے معاف کر دیا گیا۔

[صحیح بخاری: الانبیاء ۳۴۸۱]

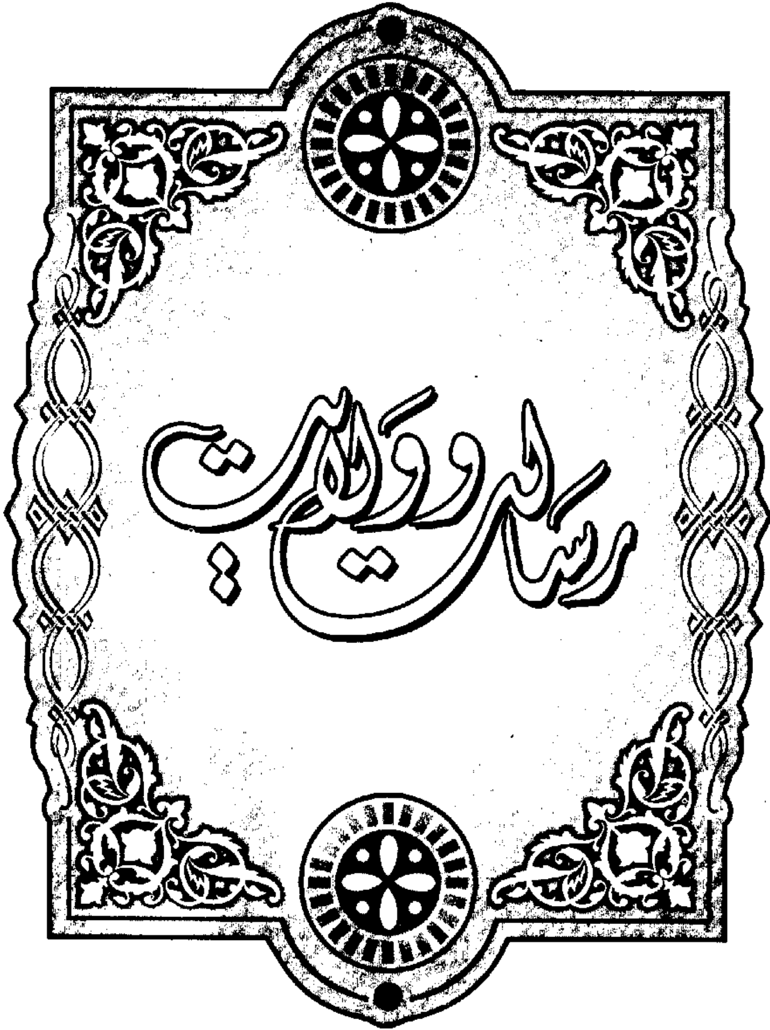
⑤ فرحت وانبساط کے عالم میں انسان اگر اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر منہ سے کلمہ کفر کہہ دے تو یہ بھی قابل معافی ہے۔ جیسا کہ ایک آدمی دورانِ سفر اپنی سواری زادِ سفر کے ساتھ گم کر بیٹھا، نیند کے بعد جب اس نے اونٹنی کو اپنے سامنے دیکھا تو مارے خوشی کے بطور شکر یہ الفاظ کہتا ہے: ''اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔'' [صحیح مسلم: کتاب التوبۃ ۶۹۶۰]

ان واقعات کے پیش نظر ہم احباب جماعت کو نصیحت کرتے ہیں کہ مذکورہ خطیب بڑی خطرناک فکر کا حامل ہے، اسے سمجھایا جائے اگر وہ ایسی حرکات سے باز آجائے تو ٹھیک بصورت دیگر اسے خطابت سے معزول کر دیا جائے۔ سوال میں اس ذکر کردہ آیت کریمہ کو پہلے حکمرانوں کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا اور اس کی آڑ میں انہیں کافر کہا جاتا تھا۔ اب اس فکر نے ترقی کی ہے اور اسے بنیاد بنا کر عامۃ الناس کی تکفیر کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات پیش کرتے ہیں جو انہوں نے خوارج کے جواب میں کہی تھی کہ ''بات صحیح ہے لیکن اس کا استعمال غلط کیا گیا ہے۔'' اگر اس کا وہی مطلب جو خطیب نے کشید کیا ہے تو اس کی زد میں یہ خطیب بھی آتے ہیں۔ مثلاً: حدیث میں ہے ''کہ جس نے امیر کی اطاعت نہ کی اور جماعت سے الگ ہو گیا اگر اسی حالت میں موت آئی تو جاہلیت کی موت ہوگی۔'' [صحیح مسلم: کتاب الامارۃ]

کیا بیعت کے بغیر زندگی بسر کرنا حکم بغیر ''ما انزل اللہ'' نہیں ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اس سے الگ تھلگ رہے پھر وہ شام کے علاقہ میں چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا، کیا اس حدیث کے پیش نظر ان کی موت بھی جاہلانہ موت تھی؟ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن وحدیث کی نصوص کو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق دے (آمین)۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اتمام حجت کے طور پر دین اسلام کی ترویج واشاعت میں لگے رہیں اور فتنہ تکفیر سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]




رسالت وولایت

رسالت وولایت

سوال جب رسول اللہ ﷺ کی بال کے برابر گستاخی کرنا باعث کفر ہے تو سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان میں کیوں لکھا ہے کہ آپ بھی مر کر مٹی ہو جانے والے ہیں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بال برابر گستاخی بھی باعث کفر ہے لیکن اپنی مرضی کے کسی لفظ سے گستاخی کشید کر لینا بھی درست نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ گستاخ رسول کعب بن اشرف کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا اشارہ فرمایا تو حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اس کام کو سرانجام دینے کے لیے میدان میں آئے لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ اگر میں اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے آپ کے لیے کچھ نازیبا الفاظ استعمال کروں تو مجھے کبھی دنیا و آخرت میں باز پرس نہیں ہوگی؟ آپ نے اسے اجازت دے دی، اس کے بعد حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کعب بن اشرف کا کام تمام کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی شان میں نازیبا کلمات بھی کہے لیکن ان کی باز پرس اس لیے نہیں ہوئی کہ گستاخانہ کلمات صرف زبان پر تھے دل میں گستاخانہ جذبات نہ تھے بلکہ دل رسول اللہ ﷺ کی محبت سے لبریز تھا۔ [صحیح بخاری: المغازی ۴۰۳۷]

اس لیے سید اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جن کی تمام زندگی اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے وقف تھی حتیٰ کہ انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی جان بھی جان آفریں کے حوالے کر دی۔ پھر محولہ کتاب بھی توحید باری تعالیٰ اور تعظیم رسول کریم ﷺ سے لبریز ہے ان کے متعلق کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے دانستہ دل و جان سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق گستاخانہ کلمات کہے ہوں گے۔ اب ہم اس عبارت کے سیاق و سباق کو دیکھتے ہیں جس کی آڑ میں سید شہید کی طرف ''گستاخی'' منسوب کی گئی ہے۔ سید شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''اللہ کو سجدہ اور پیغمبر علیہ السلام کی تعظیم'' اس عنوان کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کو سجدہ کرنے کے متعلق اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندگی کرو اپنے رب کی، تعظیم کرو اپنے بھائی کی۔'' پھر آپ نے قیس بن مرزبان رضی اللہ عنہ کی حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں آپ کو سجدہ کرنے کی خواہش کا ذکر ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ بھلا خیال کر اگر تو گزرے میری قبر پر کیا تو اسے سجدہ کرے گا۔'' میں نے کہا: نہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ یہ کام بھی نہ کرو۔'' اس کی وضاحت کرتے ہوئے سید شہید نے لکھا ہے کہ میں بس ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ کے لائق ہوں سجدہ تو صرف اسی ذات پاک کو ہے کہ نہ مرے کبھی۔''

[تقویۃ الایمان: ۱۱۲]

''اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ''میں مر کر دفن ہونے والا ہوں چنانچہ حدیث میں اس کی صراحت آ چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے اجسام کو زمین پر حرام کر دیا کہ وہ ان کو کھا سکے۔ اس مقام پر یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ تقویۃ الایمان کے نئے ایڈیشن میں اس کی نوک پلک سنوار دی گئی ہے چنانچہ سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کو نئے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اس نئے ایڈیشن میں عبارت اس طرح ہے: ''یعنی ایک نہ ایک دن میں بھی فوت ہو کر آغوش لحد میں جا سوؤں گا۔'' [تقویۃ الایمان: ۱۱۲]

ان شواہد کی بنا پر سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورہ عبارت میں گستاخی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کراچی سے محمد رفیق شاہد لکھتے ہیں کہ بعض واعظین حضرات عام طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کرتے ہوئے بکثرت یہ بیان کرتے ہیں کہ ''اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا ہی نہ کرتا۔'' بعض علما حضرات کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور مرتبہ کے متعلق قرآن وحدیث میں اس قدر مستند مواد موجود ہے کہ واعظین کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ حضرات ایسی باتیں بیان کرنے کے عادی ہیں جس میں کوئی انوکھا پن ہو، مذکورہ بالا روایت بھی اسی قبیل سے ہے۔ عام طور پر غالی قسم کے واعظین اس قسم کی روایات بیان کرتے ہیں، حالانکہ یہ روایت بناوٹی اور خود ساختہ ہے اس کے متعلق سرخیل احناف ملا علی قاری لکھتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ [الاسرار المرفوعہ: ۲۹۵]

لیکن اس روایت کو موضوع قرار دینے کے باوجود کہتے ہیں کہ اس کا معنی صحیح ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً دیلمی نے اپنی تالیف مسند الفردوس میں سے اسے بیان کیا ہے۔ [الاسرار المرفوعہ]

محدث العصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بہترین جواب دیا ہے فرماتے ہیں کہ ''محدث دیلمی کی طرف جو بات منسوب کی گئی ہے اس کے ثبوت کے بعد ہی اس کے معنی کو صحیح کہنے کے متعلق جزم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ میں اس کی سند پر مطلع نہیں ہوا ہوں تاہم مجھے اس کے ضعیف ہونے میں کوئی تردد نہیں ہے۔'' [الاحادیث الضعیفہ: حدیث ۲۸۲]

مسند دیلمی شائع ہو چکی ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث ہمیں نہیں مل سکی۔ نیز محدث دیلمی کی بیان کردہ احادیث اکثر ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل روایت بیان کی ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: ''اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا۔'' اسے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ روایت بناوٹی ہے، اس کی سند میں ابو السکین، ابراہیم اور یحییٰ بصری جیسے ضعیف راوی ہیں، جنہیں محدثین نے چھوڑ دیا تھا، امام فلاس کہتے ہیں کہ یحییٰ بصری جھوٹا راوی ہے جو خود ساختہ احادیث بیان کرتا ہے۔

[اللآلی الموضوعہ: ۱/۲۷۲]

امام جوزی اس طویل روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس روایت کے خود ساختہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں ایسے راوی ہیں جن کے متعلق کوئی اتا پتا نہیں ہے اور کچھ ایسے راوی ہیں جو ضعیف ہیں، اس کے بعد یحییٰ بصری کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم نے یحییٰ بصری کی بیان کردہ روایات کو جلا دیا تھا۔ [کتاب الموضوعات: ۲/۲۸۹]

امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ محدثین کے ہاں متروک ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مذکورہ روایت بناوٹی اور خود ساختہ ہے نیز اس طرح کی روایات حقیقت حال کی وضاحت کے لیے تو بیان کی جا سکتی ہیں لیکن فضائل اور سیرت کے سلسلہ میں ان کا سہارا لینا ناجائز اور حرام ہے، ہمارے واعظین حضرات کو اس طرح کی روایات بیان کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

سوال لاہور سے محمد بلال حماد لکھتے ہیں کہ آج کل اخبارات میں موئے مبارک کی زیارت کا بہت چرچا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ نیز بعض مفتیان کرام کی طرف سے یہ فتویٰ بھی جاری ہوا ہے کہ جو آنکھ موئے مبارک کی زیارت کرے گی، اس پر جہنم کی آگ کچھ اثر نہیں کرے گی اس فتویٰ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے بالوں کو موئے مبارک کہا جاتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے خوبصورت بالوں کی منظر کشی بڑے دلکش انداز میں کی ہے۔ ہم اس سلسلہ میں ''آئینہ جمال نبوت'' نامی کتاب کے الفاظ مستعار لے کر ہدیہ قارئین کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کے بال مبارک بڑے خوبصورت اور قدرے خمدار تھے نہ بالکل سیدھے اور نہ ہی زیادہ پیچیدار، جب رسول اللہ ﷺ ان میں کنگھی کرتے تو ہلکی ہلکی لہریں بن جاتیں جیسا کہ ریت کے ٹیلے یا پانی کے تالاب میں ہوا چلنے سے لہریں ابھر آتی ہیں اور جب کچھ دن کنگھی نہ کرتے تو آپس میں مل کر انگوٹھی کی طرح حلقوں کی شکل اختیار کر لیتے، پہلے پہل اپنے بالوں میں کنگھی کر کے انہیں پیشانی میں کھلے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر جب حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنے سر کے بالوں میں مانگ نکال کر تشریف لائے تو آپ نے بھی مانگ نکالنا شروع کر دی آپ کے بال کانوں کی لو تک ہوتے بعض اوقات کندھوں تک پہنچ جاتے کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ آپ بالوں کی مینڈھیاں بنا لیتے پھر دایاں کان دونوں گیسوؤں کے درمیان اسی طرح بایاں کان بھی دونوں گیسوؤں کے درمیان بڑا حسین اور خوشنما منظر پیش کرتا ایسا معلوم ہوتا کہ گھنے سیاہ بالوں کے درمیان خوبصورت کان چمکدار ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔'' [دلائل النبوۃ:١/٢٩٨]

① رسول اللہ ﷺ نے مختلف اوقات میں اپنے اللہ کے حضور چار دفعہ ان خوبصورت بالوں کا نذرانہ پیش کیا اور صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت خراش بن امیہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی استرے سے حجامت کی جبکہ آپ عمرے کا احرام باندھے ہوئے تھے۔

② اگلے سال عمرۃ القضاء کے موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کا قصر کیا۔

③ عمرہ جعرانہ سے فراغت کے بعد ابو ہند رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کا قصر کیا۔

④ حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں جب رسول اللہ ﷺ رمی جمار سے فارغ ہوئے تو آپ نے قربانی کی پھر حضرت معمر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے موئے مبارک کو استرے سے صاف کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی اس کا اندازہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے ایک بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جبکہ حجام آپ کے سر مبارک کے بال صاف کر رہا تھا اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے گرد تھے وہ چاہتے تھے کہ آپ کا کوئی بھی بال زمین پر گرنے کے بجائے کسی نہ کسی کے ہاتھ میں گرے۔'' [صحیح مسلم: کتاب الفضائل]

بلکہ حضرت عروہ بن مسعود کا بیان اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے کیونکہ آپ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ وہ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وعقیدت کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب وضو کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زمین پر گرنے والے پانی کو لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ جب آپ لعاب دھن تھوکتے تو جلدی سے اپنے ہاتھوں اور چہرے پر مل لیتے ہیں اور جب کبھی آپ کا موئے مبارک گرتا ہے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔''

[مسند احمد:۴/۳۲۴]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ آپ کے موئے مبارک سے اس قدر محبت وعقیدت کے باوجود کتب حدیث میں صرف دو ایسی خواتین کا ذکر ملتا ہے، جنہوں نے خاص طور پر آپ کے موئے مبارک کو محفوظ رکھنے کا اہتمام فرمایا۔ ایک ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور دوسری حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ: ''صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن موہب کا بیان بایں الفاظ نقل ہوا ہے کہ مجھے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک دکھائے تھے۔'' [حدیث نمبر:۵۸۹۸]

اس کی مزید تفصیل صحیح بخاری میں نقل ہوئی ہے کہ مجھے (عبداللہ بن موہب) میرے گھر والوں نے پانی کا ایک پیالہ دے کر ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کیونکہ ان کے پاس ایک خوبصورت چاندی کی ڈبیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک محفوظ تھے۔ آپ پانی میں انہیں ڈال کر ہلاتیں پھر وہ پانی نظر بد یا بخار والے مریض کو پلایا جاتا، میں نے اس وقت ڈبیہ میں سرخ رنگ کے موئے مبارک دیکھے تھے۔ [حدیث نمبر:۵۸۹۶]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ موئے مبارک کب اور کیسے حاصل کیے؟ حدیث یا تاریخ کی کتابوں میں اس کے متعلق کوئی صراحت نہیں ہے۔ البتہ ہمیں خارجی قرائن سے اس معمہ کو حل کرنا ہوگا۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد مشرکین نے مسلمانوں پر مسجد حرام کے دروازے بند کر رکھے تھے ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب آیا کہ آپ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مسجد حرام میں داخل ہوئے اور بیت اللہ کا طواف کیا پھر آپ کو دکھایا گیا کہ کچھ لوگوں نے سر کے بال منڈوائے اور کچھ نے ہلکے کرائے، جب آپ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس خواب کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئے کہ اس سال مکہ میں داخلہ نصیب ہوگا اور ہم عمرہ کریں گے۔ چنانچہ آپ یکم ذوالقعدہ ۶ ہجری سوموار کے دن پندرہ سو جانثاروں سمیت مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے آپ کے ہمراہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں حدیبیہ کے مقام پر پتہ چلا کہ مشرکین اس سال عمرہ نہیں کرنے دیں گے، چنانچہ ایک معاہدہ طے پایا جو صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں بظاہر ناروا شرائط بھی تھیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت پریشان، غمناک اور کبیدہ خاطر ہوئے کہ ہم اس سال عمرہ نہیں کرسکیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب معاہدہ صلح سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''اٹھو! اور اپنے جانور قربان کردو'' لیکن پریشانی کی وجہ سے آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی نہ اٹھا، آپ نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی مگر پھر بھی کوئی نہ اٹھا تو آپ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور لوگوں کے طرز عمل کا ذکر فرمایا۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بہت زیرک، صاحب بصیرت، دانا اور عقل مند خاتون تھیں، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ

دیا یارسول اللہ ﷺ! اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو آپ باہر تشریف لے جائیں اور کسی سے کچھ کہے بغیر خاموشی کے ساتھ اپنا جانور ذبح کر دیں اور حجام کو بلا کر اپنا سر منڈوالیں۔ رسول اللہ ﷺ اس کے بعد باہر تشریف لائے قربانی کا جانور ذبح کیا اور خراش رضی اللہ عنہ بن امیہ کو بلا کر اپنا سر منڈوالیا جب لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو سب کے سب اپنی قربانی کرنے اور سر منڈوانے میں مشغول ہو گئے، جلدی جلدی تعمیل حکم سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ فرط غم کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے۔ [صحیح بخاری: کتاب الشروط]

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس جو موئے مبارک محفوظ تھے وہ یہی تھے۔ کیونکہ آپ ﷺ کے جانثار اس موقع پر بہت پریشان اور کبیدہ خاطر تھے، انہیں آپ کے موئے مبارک کو محفوظ رکھنے کا خیال تک نہ آیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو آپ کے آثار شریفہ اور تبرکات سے خصوصی لگاؤ تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔

مقام جعرانہ پر تقسیم غنائم کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا کہ آپ میرا وعدہ کب پورا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تجھے بشارت ہو۔'' اعرابی کچھ جلد باز تھا اسے یہ بات اچھی نہ لگی آپ اس کی ناگواری دیکھ کر ناراض ہوئے اور بحالت غصہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''کہ اس نے تو میری بشارت کو مسترد کر دیا ہے۔ اب تم اسے قبول کر لو۔'' اس کے بعد آپ نے پانی کا پیالہ منگوایا اس میں چہرہ اور ہاتھ دھوئے اور اس میں کلی کی پھر فرمایا: ''کہ تم اس سے کچھ پانی نوش کر لو اور کچھ اپنے چہرے پر چھڑک لو۔'' اس کے بعد انہوں نے پیالہ لیا اور آپ کی ہدایات پر عمل کیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پردہ کے پیچھے سے آواز دی کہ اس بابرکت پانی سے اپنی ماں ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لیے کچھ بچا رکھنا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لیے بھی پانی بچا لیا۔ [صحیح بخاری: کتاب المغازی' غزوۃ الطائف]

دوسری خاتون جنہوں نے آپ کے موئے مبارک کو محفوظ کیا تھا وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا ہیں انہیں بھی آپ کے تبرکات سے خصوصاً لگاؤ تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت رسول کریم ﷺ آپ کے گھر تشریف لائے اور مشکیزے سے منہ لگا کر پانی نوش فرمایا تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے مشکیزے کا وہ حصہ کاٹ کر رکھ لیا تھا جہاں رسول اللہ ﷺ کے لب مبارک لگے تھے۔ [مسند احمد: ۳/۱۱۹]

اسی طرح آپ رسول اللہ ﷺ کا پسینہ مبارک جمع کرتیں اور اسے خوشبو میں ملاتیں جس سے خوشبو کی مہک دوچند ہو جاتی (صحیح مسلم کتاب الفضائل) جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے پاس بھی رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک تھے۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سلمانی سے کہا کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک ہیں جو ہمیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے عنایت ہوئے تھے یہ سن کر حضرت عبیدہ سلمانی کہنے لگے کہ کاش کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ کا صرف ایک بال ہوتا جو میرے نزدیک دنیا اور اس کے خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۷۰]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جب اپنا سر منڈوایا تو پہلے پہلے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ (حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے شوہر نامدار) تھے جنہوں نے آپ کے موئے مبارک حاصل کیے۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۷۱]

اس کی کچھ تفصیل اس طرح ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر دسویں تاریخ کو رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی پھر حجام کو بلایا اور دائیں جانب کے بال صاف کر کے لوگوں میں ایک ایک یا دو دو تقسیم کر دیئے۔ پھر بائیں جانب کے بال اتار کر حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو دے دیئے۔ [صحیح مسلم: باب بیان ان السنۃ یوم النحر]

دیگر روایات میں مزید تفصیل بھی ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے موئے مبارک کب اور کیسے حاصل کئے اور پھر کسے دے دیئے؟ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر رمی کرنے کے بعد قربانی کی پھر حجامت بنوائی اپنے سر کے تمام بال حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دے دیئے اور فرمایا: ''کہ دائیں جانب کے بال لوگوں میں تقسیم کر دو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ یہ بال اپنی بیوی ام سلیم کو دے دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کیا۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا ان بالوں کو دھوتیں اور اس پانی کو خوشبو میں ملاتیں جس سے خوشبو تیز ہو جاتی۔ [مسند امام احمد: ۱۴۵۰]

بعض روایات میں ہے کہ وہ بخار والے مریض کو پانی پلاتیں تو صحت مند ہو جاتا۔ (مسند امام احمد) رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک کی حقیقت بیان کرنے کے بعد ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس وقت آپ کے موئے مبارک موجود ہیں یا لوگوں کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے صرف دعویٰ کی حد تک اسے شہرت دی جاتی ہے۔ لیکن مسئلہ زیر بحث کی نزاکت کے پیش نظر ہم یہ وضاحت کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ آپ کے موئے مبارک اگر آج حقیقتاً موجود ہیں تو ان میں خیر و برکت کا پہلو بدرجہ اتم موجود ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔ جیسا کہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس موئے مبارک تھے، جو انہیں فضل بن ربیع کے کسی لڑکے نے عنایت فرمائے تھے۔ آپ ان بالوں کو بوسہ دیتے، آنکھوں پر لگاتے اور پانی میں بھگو کر شفا کے طور پر اس پانی کو نوش کرتے۔ جن دنوں آپ پر آزمائش آئی اس وقت وہ آپ کی آستین میں رکھے ہوئے تھے۔ بعض لوگوں نے آپ کی آستین سے موئے مبارک نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ ناکام رہے۔

[سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۲۵۰]

اس کے علاوہ بھی متعدد آثار و واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین عظام کے بعد بھی لوگ رسول اللہ ﷺ کے آثار شریفہ اور موئے مبارکہ سے تبرک لیتے تھے۔ اگرچہ اکثر واقعات صحیح نہیں ہیں بلکہ وہ غلط طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہیں۔ اس وقت آپ کے موئے مبارک کی موجودگی کا جائزہ لینے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

① حضرت عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے وفات کے وقت جائیداد کے طور پر نہ کوئی درہم و دینار چھوڑا اور نہ ہی کوئی لونڈی غلام آپ کا ترکہ بنا۔ صرف آپ کی سفید خچر، کچھ ہتھیار اور تھوڑی سی زمین تھی جسے آپ ﷺ نے زندگی میں ہی صدقہ کر دیا تھا۔ [صحیح بخاری: کتاب الوصایا]

اس کا مطلب یہ ہے کہ وفات کے وقت آپ ﷺ کی ذاتی اشیاء بہت کم تعداد میں موجود تھیں۔

② وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آپ کے آثار شریفہ اور تبرکات معدوم ہو گئے، یا جنگوں اور فتنوں کی نذر ہو کر ضائع ہو گئے۔ جیسا

کہ مندرجہ ذیل واقعات سے معلوم ہوتا ہے۔

(الف) رسول اللہ ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی تھی جسے آپ پہنتے تھے۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے استعمال کرتے تھے۔ ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس رہی بالآخر بئر اریس میں گر گئی اور تلاش بسیار کے باوجود وہ نہ مل سکی۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

(ب) عباسی دور کے آخر میں جب تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا تو رسول اللہ ﷺ کی رداء مبارک اور چھڑی جس سے آپ کھیلی کیا کرتے تھے ہنگاموں کی نذر ہوگئی۔ یہ سن ۶۵۶ کے واقعات ہیں۔

(ج) دمشق میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب پاپوش مبارک بھی نویں ہجری کے آغاز میں فتنہ تیمور لنگ کے وقت ضائع ہوگئی۔

(د) آپ کے آثار شریفہ کے فقدان کی ایک وجہ یہ تھی کہ جس خوش قسمت انسان کے پاس رسول اللہ ﷺ کی کوئی نشانی مبارک تھی اس نے وصیت کردی کہ اسے قبر میں اس کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے۔ مثلاً

☆ رسول اللہ ﷺ کے لیے ایک عورت نے اپنے ہاتھ سے چادر تیار کی اور آپ ﷺ کو بطور تحفہ پیش کی آپ ﷺ نے اسے قبول کرتے ہوئے زیب تن فرمایا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس خواہش کے پیش نظر کہ وہ چادر آپ کا کفن ہو رسول اللہ ﷺ سے مانگ لی۔ چنانچہ وہی چادر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا کفن بنی۔ [بخاری: کتاب الجنائز]

☆ رسول اللہ ﷺ نے اپنا قمیص مبارک رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کو پہنایا تا کہ اس کے بیٹے کی حوصلہ افزائی ہو۔ شاید اس کی بخشش کا کوئی ذریعہ بن جائے وہ قمیص بھی قبر میں بطور کفن دفن کردی گئی۔

☆ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس چند موئے مبارک تھے تو آپ نے وصیت کردی تھی کہ انہیں قبر میں ان کے ساتھ ہی دفن کردیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ [سیر اعلام النبلاء: ۱۱/۳۳۷]

اسلامی ممالک کے متعدد شہروں سے اخبارات میں یہ خبریں آتی ہیں کہ ان کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک ہیں، مثلاً ترکی کے دارالحکومت استنبول میں کسی نے دعویٰ کیا کہ اس کے پاس 43 موئے مبارک تھے۔ ان میں سے 25 بال ہدیہ کے طور پر مختلف سربراہوں کو دے دیئے گئے ہیں اور اب اس کے پاس 18 بال موجود ہیں۔ ہمارے ہاں پچھلے دنوں جامعہ اشرفیہ لاہور کے مہتمم کی طرف سے اخبارات میں یہ دعویٰ شائع ہوا تھا کہ ان کے پاس بھی موئے مبارک ہیں۔ جنہیں بہترین عطر سے غسل دیا جاتا ہے نیز خواتین وحضرات درود شریف کا ورد کرتے ہوئے ان کی زیارت کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ فتویٰ بھی دیا کہ جو آنکھ ان موئے مبارک کی زیارت کرے گی اس پر جہنم کی آگ کچھ اثر نہیں کرے گی۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ یہ موئے مبارک سعودیہ کے فرمانروا ملک عبدالعزیز مرحوم نے اپنے ایک ہندوستانی معالج حکیم نابینا دہلی والے کو تبرکاً دیئے تھے، الی آخرہ۔

رمضان المبارک کی ستائیسویں اور شعبان المعظم کی پندرھویں رات کو ان بالوں کی زیارت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے حالانکہ یہ سب بلا دلیل دعوے ہیں۔ سعودی حکومت اور پاکستان میں سعودی سفارت خانہ سے اس تمام خود ساختہ پلندے کے جھوٹ

ہونے کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ پھر اس فتویٰ کی بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں بلکہ لوگوں کو بے عمل بنانے کے لیے ایک مؤثر تحریک ہے۔ شریعت مطہرہ میں صرف دوقسم کی آنکھیں ہیں جن پر جہنم کی آگ حرام ہے۔

① وہ آنکھ جس نے اللہ کی راہ میں پہرادیا ہو۔

② وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے اشکبار ہوئی ہو۔

رسول اللہ ﷺ کے آثار شریفہ اگر صحیح ہوں تو ان سے دو شرائط کے ساتھ تبرک لیا جاسکتا ہے:

① تبرک لینے والا شرعی عقیدہ اور اچھے کردار کا حامل ہو، جو شخص سچا مسلمان نہیں اسے اللہ تعالیٰ اس قسم کے تبرکات کا کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔

② جو شخص تبرک حاصل کرنا چاہتا ہو اسے رسول اللہ ﷺ کے حقیقی آثار شریفہ میں سے کوئی شے حاصل ہو اور پھر وہ اسے استعمال بھی کرے محض دیکھ لینے سے کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ ہم مذکورہ حقائق کی روشنی میں علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ اب رسول اللہ ﷺ کے کپڑوں، بالوں اور اسی طرح کی دیگر اشیاء میں سے کچھ بھی باقی نہیں ہے اور نہ ہی کسی کے بس میں ہے کہ وہ قطعی اور یقینی طور پر یہ ثابت کرسکے کہ فلاں چیز واقعی رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر ان موئے مبارک کے ساتھ عملی طور پر تبرک تو ہمارے اس دور میں ممکن نہیں۔

آخر میں ہم اس امر کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اگرچہ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے آثار شریفہ سے تبرک حاصل کیا اور آپ کے لعاب دھن کو اپنے چہروں اور جسموں پر ملا اور آپ نے انہیں منع نہیں فرمایا۔ ایسا کرنا جنگی حالات کے پیش نظر انتہائی ضروری تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کفار قریش کو ڈرایا جائے اور ان کے سامنے اس بات کا اظہار کیا جائے کہ مسلمانوں کا اپنے راہبر و راہنما سے تعلق کس قدر مضبوط ہے۔ انہیں اپنے نبی اکرم ﷺ سے کس قدر والہانہ عقیدت و محبت ہے۔ وہ آپ کی خدمت میں کس قدر رفنا ہیں اور وہ کس کس انداز سے آپ کی تعظیم بجالاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے چھپایا جاسکتا ہے کہ اس صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بڑے حکیمانہ انداز میں اور لطیف اسلوب کے ساتھ مسلمانوں کی توجہ اعمال صالحہ کی طرف مبذول کرنے کی کوشش فرمائی جو اس قسم کے تبرکات کو اختیار کرنے سے کہیں بہتر ہیں۔ مندرجہ ذیل حدیث اس سلسلہ میں ہماری مکمل راہنمائی کرتی ہے:

''حضرت عبدالرحمٰن بن ابوقراد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن وضو فرمایا آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کے وضو کے پانی کو اپنے جسموں پر ملنا شروع کردیا۔ آپ نے دریافت فرمایا: کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کے پیش نظر ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرے یا اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ بات کرتے ہوئے سچ بولے، اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اسے ادا کرے اور

اپنے پڑوسیوں سے حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔'' [الاحادیث الصحیحہ: نمبر ۶/ ۹۹۸]

مختصر یہ ہے کہ ہمارے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا اصل تبرک یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں آپ ﷺ کے ذریعے اللہ کی طرف سے ملا ہے اس پر عمل کیا جائے اور آپ کی صورت و سیرت کی اتباع کی جائے اس دنیا و آخرت کی خیر و برکات سے ہم مشرف ہوں گے جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اہل مدینہ کو رسول اللہ ﷺ کی برکت کی وجہ سے دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ ور کیا گیا بلکہ ہر مؤمن جسے اس برکت کی بدولت ایمان نصیب ہوا اسے اللہ کے ہاں اتنی بھلائیوں سے نوازا جائے گا جس کی قدر و قیمت کو وہی جانتا ہے۔'' [مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۱/ ۱۱۳]

سوال قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو بددعا دی ہے یا نہیں۔ (عبدالرشید ملتان)

جواب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کریمانہ اخلاق سے نوازا تھا کہ آپ کسی کے حق میں بددعا یا لعنت نہ فرماتے تھے بلکہ ایک دفعہ آپ سے کہا گیا کہ مشرکین پر بددعا فرمائیں تو آپ ﷺ نے جواب دیا: ''کہ میں لعنت کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ مجھے باعث رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔'' [صحیح مسلم: کتاب البر]

اسی طرح آپ کو ایک مرتبہ قبیلہ دوس پر بددعا کے لیے کہا گیا تو آپ ﷺ نے ان کے لیے ہدایت پر آنے کی دعا فرمائی جس کے نتیجے میں وہ مسلمان ہو گئے۔ [صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ]

البتہ بعض اوقات عرب کی عادت کے پیش نظر اظہار تعجب یا افراد کے لیے کچھ الفاظ زبان پر جاری ہو جاتے ہیں مثلاً اس کی ناک خاک آلود ہو، تیری ماں تجھے گم پائے، تیرا دایاں ہاتھ خاک میں مل جائے وغیرہ۔ بعض اوقات ایک اور انداز میں اس طرح کے کلمات استعمال فرماتے ہیں مثلاً حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے پاس ایک بچی رہا کرتی تھی ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ''اب تو بڑی ہو گئی ہے تیری عمر دراز نہ ہو'' یہ الفاظ سن کر بچی روتی ہوئی حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے پاس آئی اور ماجرا بیان کیا، حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا: ''کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے بات سنوائی ہے کہ اگر میں کسی ایسے مسلمان کو بددعا دوں جو اس کا اہل نہ ہو تو قیامت کے دن اس بددعا کو اس کے لیے رحمت و قرب کا ذریعہ بنا دے''۔ [صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ]

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بھی اس باب کے تحت بیان کیا ہے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو بھیجا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر لائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے آکر جواب دیا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں آپ نے دوبارہ بھیجا انہوں نے پھر وہی جواب دیا اس پر آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اللہ کرے اس کا پیٹ نہ بھرے۔ [صحیح مسلم: کتاب البر والصلہ]

محدثین کرام نے اس حدیث کو مناقب معاویہ رضی اللہ عنہ میں بیان کیا ہے کیونکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تو اس بددعا کے اہل نہ تھے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انہیں کچھ کہنے کی بجائے دیکھ کر واپس آگئے تھے، بنابریں یہ کلمات آپ کے لیے دعا ہیں جو قیامت

کے دن اللہ کے ہاں رحمت وقرب کا ذریعہ ہوں گے، البتہ جب دشمنانِ اسلام کی مکارانہ سازشیں حد سے بڑھ گئیں تو مجموعی طور پر اور پھر نام لے لے کر بددعا فرمائی جیسا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اے اللہ! میں قریش کا معاملہ تیرے حوالے کرتا ہوں پھر آپ نے بڑے بڑے سرغنوں کے نام لے کر بددعا فرمائی۔'' [بخاری]

اسی طرح بعض افعال کے ارتکاب پر بھی مرتکب کو باعث لعنت قرار دیا، مثلاً والدین کی نافرمانی، شراب نوشی اور سودخواری یا جھوٹی قسم اٹھا کر کسی کا مال ناجائز طور پر ہتھیانے والے کے متعلق فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ اس کے مال میں برکت نہ کرے۔''

سوال ملتان سے احتشام الحق بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق ریڈیو، ٹی وی پر یہ حدیث بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں علم کا شہر ہوں اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہے'' کیا یہ حدیث صحیح ہے، اگر صحیح ہے تو اس کا کیا مطلب ہے۔

جواب ہمارے ہاں بیشتر احادیث زبان زد خاص وعام ہیں لیکن ان کی استنادی حیثیت انتہائی مخدوش ہوتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے جس کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے، اس روایت کو امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف مستدرک میں بیان کیا ہے۔ [ج۳ص۱۲۶]

یہ حدیث بیان کرنے کے بعد امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے اور ابوالصلت نامی راوی ثقہ اور باعث اطمینان ہے لیکن امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکم کے بیان پر بایں الفاظ تبصرہ کیا ہے۔ ''بلکہ یہ روایت موضوع اور خود ساختہ ہے اور ابوالصلت راوی نہ ثقہ ہے اور نہ باعث اطمینان'' [تلخیص المستدرک: ج۳ص۱۲۶]

اس روایت کے متعلق ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ امام حاکم کا اس طرح کی باطل روایات کو صحیح قرار دینا انتہائی تعجب انگیز ہے اور اس کا ایک راوی احمد تو دجال اور دروغ گو ہے اس کے بارے میں امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ محدثین کے نزدیک یہ روایت ضعیف بلکہ موضوع ہے۔ [احادیث القصاص: ص۷۸]

خطیب بغدادی امام یحییٰ بن معین کے حوالہ سے اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں کہ روایت جھوٹ کا پلندہ اور اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ [تاریخ بغداد: ج۱۱ص۲۰۵]

یہ روایت مختلف الفاظ سے مروی ہے اور اس کے تمام طرق بے کار ہیں امام جوزی نے اس روایت کے تمام طرق پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے جو تقریباً چھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے انہوں نے عقلی اور نقلی لحاظ سے اسے بے بنیاد قرار دیا ہے فرماتے ہیں یہ حدیث کسی بھی طریق سے صحیح ثابت نہیں ہے۔ [موضوعات: ج۱ص۳۵۳]

اس روایت کے دوسرے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ ''میں دانائی کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔'' [ترمذی: کتاب المناقب]

امام ترمذی اس روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں غرابت اور نکارت ہے۔ حافظ سخاوی، امام دارقطنی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ بے بنیاد بھی ہے۔ [المقاصد الحسنہ: ص۹۷]

اس روایت کے متعلق امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام ترمذی اور دیگر حضرات نے اسے بیان کیا ہے۔ ان کے بیان کرنے

کے باوجود یہ محض جھوٹ ہے۔ [احادیث القصاص:ص ۷۸]

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ روایت کو امام ترمذی نے اسماعیل بن موسیٰ سے، انہوں نے محمد بن عمر سے، انہوں نے شریک سے بیان کی ہے مجھے معلوم نہیں ان میں سے کس نے اسے وضع کیا ہے۔ [میزان الاعتدال: ج ۳' ص ۶۹۸]

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو موضوعات میں شمار کیا ہے۔ [الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ: ص ۳۴۸]

اگر چہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کثرت طریق کی وجہ سے حسن کہا ہے لیکن ان کا فیصلہ محل نظر ہے کیونکہ کثرت طرق سے روایت میں پایا جانے والا معمولی سقم تو دور ہوسکتا ہے لیکن بنیادی کمزوری اس سے رفع نہیں ہوتی چنانچہ محدث ابن الصلاح لکھتے ہیں: ''کثرت طرق سے ضعف رفع نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ اس روایت میں کوئی راوی متھم بالکذب ہو۔'' [مقدمہ ابن الصلاح: ص ۳۱]

اس روایت کی سند میں صرف تہمت زدہ راوی نہیں بلکہ کذاب اور جھوٹے راوی موجود ہیں، محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے موضوع قرار دیا ہے اور اس کے تمام طرق پر بحث کر کے اس کا خود ساختہ ہونا واضح کیا ہے۔ [ضعیف الجامع الصغیر: ۱۴۱۶]

اس روایت کے مقابلہ میں ایک صحیح روایت ملاحظہ ہو جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ خواب میں میرے پاس دودھ کا ایک پیالہ لایا گیا، میں نے اس میں سے کچھ دودھ نوش کیا حتیٰ کہ اس کی سیرابی میرے ناخنوں سے ٹپکنے لگی، میں نے اپنا بچا ہوا دودھ عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، اس کی تعبیر کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس کی تعبیر علم ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب تعبیر الرؤیا ۷۰۰۶]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کو نیچا دکھانے کے لیے مذکورۃ الصدر روایت کو وضع کیا گیا ہے عرصہ ہوا کہ راقم نے اس روایت کی استنادی حیثیت ہفت روزہ ''اہلحدیث'' 31/ مارچ 1989ء میں واضح کی تھی۔ اس کا دفاع سید شبیر حسین بخاری نے پندرہ روزہ ''ذوالفقار'' پشاور میں کیا۔ ان کے مبلغ علم سے قارئین اس دفاع کا اندازہ لگا سکتے ہیں، بخاری صاحب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ تمام قرآن حکیم کا لب لباب بسم اللہ میں ہے اور بسم اللہ کا اس کی ب میں اور ب کا اس کے نقطہ میں جو اس کے نیچے ہے اور وہ نقطہ میں ہوں'' پندرہ روزہ ذوالفقار مجریہ 16/ اپریل 1989ء معتقدین اور متوسلین کو خوش کرنے کے لیے تو اس طرح کی بے کار روایات سہارا بن جاتی ہیں لیکن علمی دنیا میں اس طرح کی روایات کا کوئی مقام نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہفت روزہ اہل حدیث مجریہ 2/ فروری 2001ء میں مولانا محمد اعظم آف گوجرانوالہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت سے متعلقہ دو احادیث کی استنادی حیثیت کے متعلق بایں الفاظ تبصرہ فرمایا ہے کہ:

''اس قسم کی احادیث موضوع ہیں، نیز حدیث کی کسی معتبر کتاب میں مذکور نہیں اور نہ ہی ائمہ اربعہ سے منقول ہیں امام بزار اور امام دار قطنی نے ضعیف سندوں سے ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی وضاحت کر دی ہے کہ یہ احادیث ضعیف ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔''

اس کے متعلق ہمارے ایک مہربان جناب محمد رفیق قادری نے تنقیدی مضمون سپرد قلم کیا ہے جو آپ کو ارسال کر رہا ہوں

براہ کرم ان احادیث کی مزید وضاحت فرمادیں۔......(دعاگو: عبدالغفار فردوسی، خانیوال)

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے متعلقہ جتنی احادیث مروی ہیں وہ سب ناقابل اعتبار اور ضعیف ہیں چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت سے متعلقہ تمام احادیث کمزور اور ضعیف ہیں دینی معاملات میں ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔'' [التوسل: ص ۷۱]

مولانا شیخ الحدیث محمد اعظم نے ان پر مختصر مگر جامع تبصرہ فرمایا ہم ان کی تائید مزید کرتے ہیں:

حدیث نمبر ۱: ''جس نے ایک ہی سال میں میری اور میری نسب ابراہیم کی زیارت کی، میں اللہ کی طرف سے اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ جنت میں جائے گا۔''

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ [سلسلۃ الاحادیث الموضوعہ: ۱/۶۱]

انہوں نے محدث زرکشی کے حوالہ سے لکھا ہے:

''یہ موضوع ہے علم حدیث رکھنے والوں میں سے کسی نے بھی اسے بیان نہیں کیا۔'' [اللآلی المنثورہ: نمبر ۱۵۶]

''امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے'' کہ یہ حدیث موضوع اور بے بنیاد ہے۔'' (الفوائد المجموعہ: ص ۱۱)

تفصیل کے لیے ''الصارم المنکی فی الرد علی السبکی'' کا مطالعہ مفید رہے گا۔''

حدیث نمبر ۲: ''جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی اور جس نے میری موت کے بعد میری زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔''

اس حدیث کو امام دارقطنی نے بایں سند بیان کیا ہے:

''عن هارون ابی قزعة عن رجل من آل حاطب عن حاطب رضی الله عنه''

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو باطل قرار دیا ہے۔ [سلسلۃ الاحادیث الموضوعہ: ص ۸۹/۳]

پھر اس کے بے بنیاد اور ضعیف ہونے کی تین وجوہات بیان کی ہیں:

① ہارون ابی قزعہ ضعیف ہے علامہ عقیلی نے اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔

[کتاب الضعفاء الکبیر: ص ۳۶۰/۴]

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے: ''لا یتابع علیه'' یہ راوی متابعت کے قابل نہیں۔

(میزان الاعتدال: ص ۲۸۵/۴)

② پھر انہوں نے حضرت حاطب کے حوالہ کے بغیر اس حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے گویا یہ حدیث مرسل ہے اس حدیث کی سند میں سخت اضطراب ہے پہلے تو ھارون ابی قزعہ کے نام میں اختلاف ہے، کچھ راوی اسے مرسل بیان کرتے ہیں جبکہ بعض راوی حضرت حاطب کے حوالہ سے اسے موصول بیان کرتے ہیں، اس کے متن کے متعلق بھی بہت اختلاف ہے۔

اس اختلاف کو دیکھنے کے لیے الصارم المنکی کا مطالعہ مفید رہے گا۔

علامہ ازدی لکھتے ہیں: ''هارون ابو قزعه يروى عن رجل من آل حاطب المراسيل'' [سلسلۃ الاحادیث]

③ اس ہارون ابوقزعہ کے شیخ بھی مجہول ہیں جن کے متعلق کوئی پتہ نہیں کہ وہ کس پائے کے ہیں، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ [ارواء الغلیل: ص۴/۳۳۵]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''یہ ایک کھلا جھوٹ ہے کہ ایک شخص جو صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد پیدا ہوا اسے محض قبر مبارک کی زیارت کرنے کی وجہ سے صحابی کے مرتبے پر فائز کر دیا جائے۔'' [التوسل: ص۷۱]

مولانا محمد اعظم نے اپنے مضمون میں انہی دو احادیث کا حوالہ دیا تھا۔ ان کی استنادی حیثیت کو مختصر طور پر ہم نے واضح کر دیا ہے۔ تنقیدی مضمون نگار نے ایک تیسری حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے:

حدیث نمبر ۳: ''جو شخص میری قبر کی زیارت کرے گا اس پر میری شفاعت واجب ہے۔''

اس حدیث کو امام دارقطنی نے بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کیا ہے۔ [دار قطنی: ۲/۲۷۸]

اس حدیث کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں:

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو موضوع احادیث میں شمار کیا ہے۔ [الفوائد المجموعہ: حدیث نمبر ۳۵]

اس حدیث کا ایک راوی موسیٰ بن ہلال ہے جس کے متعلق امام ابو حاتم لکھتے ہیں کہ مجہول ہے۔ [التعلیق المغنی: ص۲/۲۷۸]

علامہ عقیلی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''لا يصح حديثه ولا يتابع عليه.'' [کتاب الضعفاء: ص۴/۱۷۰]

اس کی بیان کردہ حدیث صحیح نہیں اور نہ ہی متابعت کے قابل ہے۔ پھر مذکورہ حدیث کا حوالہ دے کر اس کے ضعف کو واضح کیا ہے۔

علامہ ذہبی نے بھی اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد اس کی نکارت کو واضح کر دیا ہے۔ [میزان الاعتدال: ص۴/۲۲۶]

تنقیدی مضمون نگار نے آغاز میں قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ سے بھی اپنا مطلب کشید کرنے کی کوشش کی ہے:

''اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آ جاتے اور اللہ سے معافی مانگتے، اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے'' [۴/النساء: ۶۴]

اس آیت کے سیاق و سباق سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کے کردار کو بے نقاب کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھ خاص تھی، اور اس آیت میں بھی منافقین کو ہی خطاب کیا گیا ہے۔

''اللہ تعالیٰ ہمیں نفاق سے محفوظ رکھے''

مضمون نگار کا مطالبہ تھا کہ ان احادیث کو مستند اور مسلّم حوالہ جات سے موضوع ثابت کریں سو ہم نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا ہے ان کے علاوہ اور بھی احادیث ہیں جو پیش کی جاتی ہیں اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ان کے متعلق قلم اٹھایا جائے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال شاہدرہ سے غلام اللہ پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط بات منسوب کرے اس کے متعلق کیا وعید ہے۔

جواب رسول اللہ ﷺ کی طرف ایسی بات منسوب کرنا جو آپ نے نہ کہی ہے یا آپ ﷺ کی طرف کسی غلط بات کی نسبت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ: ''جو انسان مجھ پر دانستہ جھوٹ باندھتا ہے اس نے اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالیا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب العلم]

اس حدیث کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے اپنی بات کہنا یا آپ کی طرف غلط بات کو منسوب کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

سوال میلسی سے غلام محمد لکھتے ہیں کہ عام طور پر خطبا حضرات بیان کرتے ہیں کہ بیت اللہ کے اندر ۳۶۰ بت نصب تھے، یہ کہاں تک درست ہے؟ کیا ان میں کسی نبی کا بت بھی تھا جس کی پوجا کی جاتی۔ کیونکہ مشہور ہے کہ جو لوگ بتوں کو وسیلہ بناتے تھے وہ دراصل اس وقت کے صلحا کے فوت ہونے پر ان کے بت بنالیتے تھے۔ نبی سے بڑھ کر زیادہ صالح کون ہوسکتا ہے؟

جواب بیت اللہ کے اندر ۳۶۰ بتوں کا روایات میں ضرور آیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن جب مسجد حرام میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ بیت اللہ کے ارد گرد ۳۶۰ بت نصب تھے، آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، آپ اس سے ان بتوں کو ٹھوکر مارتے اور کہتے جاتے: ''حق آگیا اور باطل چلا گیا، یقیناً باطل جانے والی چیز ہے۔'' [۱۷/بنی اسرآءیل:۸۱]

''حق آچکا اور معبود باطل نہ تو پہلی بار پیدا کرسکتا ہے اور نہ ہی دوبارہ پیدا کرے گا۔'' [۳۴/سبا:۴۹]

آپ کی ٹھوکر سے بت چہرے کے بل گرتے جاتے۔ [صحیح بخاری: کتاب التفسیر، ۴۷۲۰]

بیت اللہ کے اندر کچھ مجسمے اور تصویریں ضرور تھیں، جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تصویر بھی تھی اور ان کے ہاتھ میں فال گیری کے تیر تھے، آپ نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا: ''کہ اللہ مشرکین کو برباد کرے انہیں خوب علم ہے کہ ان دونوں پیغمبروں نے کبھی فال کے تیر استعمال نہیں کئے۔'' [صحیح بخاری: کتاب المغازی، ۴۲۸۸]

روایات میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہاں حضرت مریم علیہا السلام کی تصویریں بھی تھیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ کسی نبی کا مجسمہ بنا کر بیت اللہ کے اندر رکھا گیا ہو۔ پھر اس کی عبادت کی جاتی ہو اس کا تذکرہ کسی صحیح روایت میں نہیں ملتا جو قابل اعتماد ہو، البتہ لات، منات اور عزیٰ کے متعلق وضاحت ہے کہ یہ صلحا اور نیک لوگ تھے اور ان کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے مجسمے بنالیے اور ان کی پرستش شروع کر دی، اس طرح جزیرہ عرب میں شرک کا آغاز ہوا، اگرچہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام لوگوں میں سب سے بڑھ کر نیک اور اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہیں۔ لیکن صلحا سے مراد ان کے علاوہ نیک سیرت اور پاکباز لوگ ہیں، اگرچہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مجسمے بنا کر ان کی عبادت شروع کر دی تھی۔ تاہم بیت اللہ کے اندر کسی نبی کا بت موجود نہ

تھا، جس کی عبادت کی جاتی ہو۔اس کا تذکرہ کسی حدیث یا تاریخ کی کتاب میں نہیں ملتا۔

سوال ملتان سے زبیر صدیق دریافت کرتے ہیں کہ قرب قیامت کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کس حیثیت سے ہوگی، وہ نبی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے یا ایک امتی کی حیثیت سے اگر وہ امتی بن کر آئیں گے تو ان سے نبوت کیوں چھینی گئی؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے بھی انبیا علیہم السلام تشریف لائے ہیں۔وہ ایک وقت مقررہ تک کے لیے ایک خاص قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے اور تمام لوگوں کے لیے ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ زمین پر تشریف لانے کا عقیدہ بھی صحیح احادیث سے ثابت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے نبی ہونے کا اعزاز اور اہلیت باقی رہے گی، البتہ نبی ہونے کے باوجود اس آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امت سے ہوں گے اور اسی دین کے مطابق زندگی بسر کریں گے، کیونکہ ان کی نبوت کے لیے ایک وقت تھا جو پورا ہو چکا ہے۔اب دوبارہ اس منصب پر فائز نہیں ہوں گے۔یعنی عیسائیت کو رواج نہیں دیں گے بلکہ دین اسلام کو فروغ دینے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کریں گے۔

سوال فاروق آباد سے محمد مشتاق سوال کرتے ہیں کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام مہدی ایک وقت میں تشریف لائیں گے نیز کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام امام مہدی کی اقتدا کریں گے؟ اگر کریں گے تو کس حیثیت سے؟ مفصل جواب عنایت فرمائیں۔

جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مہدی ایک ہی وقت میں تشریف نہیں لائیں گے بلکہ حضرت مہدی کا ظہور پہلے ہوگا پھر ان کی زندگی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے۔پھر ان دونوں کی موجودگی میں دجال کا خروج ہوگا، واقعات کی ترتیب کچھ اس طرح ہے کہ جب اس عالم رنگ و بو میں ظلم و ستم اور شرک و کفر حد سے بڑھ جائے گا تو اللہ تعالیٰ حضرت مہدی کو ظاہر فرمائیں گے۔وہ اس زمین پر اپنے دور حکومت میں عدل و انصاف قائم کریں گے جس کی بدولت زمین اپنی خیر و برکات اگل دے گی، متعدد احادیث کے مطابق مہدی کی خصوصیات حسب ذیل ہوں گی۔

① ان کا نام محمد بن عبداللہ اور وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد سے قریشی ہوں گے۔ [مستدرک حاکم، مسند امام احمد]

② وہ سات یا نو سال تک حکومت کریں گے اور ان کے دور اقتدار میں مال و دولت کی فراوانی ہوگی۔ [مستدرک حاکم]

③ اللہ تعالیٰ ایک ہی رات میں ان کی اصلاح فرمائیں گے اور ان میں حکمرانی کی صلاحیت پیدا کریں گے۔ [ابن ماجہ]

④ لوگوں کی اذیتوں سے بچنے کے لیے وہ بیت اللہ میں پناہ لیں گے۔ [صحیح مسلم]

⑤ بیت اللہ کے اندر حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ان کی بیعت کی جائے گی۔ [مسند امام احمد]

⑥ ان سے لڑنے کے لیے ایک لشکر آئے گا جسے مدینہ کے آگے میدان بیداء میں خسف کر دیا جائے گا۔ [صحیح بخاری]

⑦ ان دنوں مسلمان اور عیسائی صلح کرلیں گے پھر عیسائی غداری کرکے انہیں ختم کرنے کی تیاری کریں گے۔ [مسند امام احمد]

⑧ حضرت مہدی اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے روانہ ہوں گے ان کے ہمراہ ایک لشکر ہوگا۔عیسائیوں کی تعداد دیکھ کر ایک تہائی مسلمان میدان سے بھاگ جائیں گے اور ایک تہائی جام شہادت نوش کریں گے اور ایک تہائی عیسائیوں پر فتح پائیں گے۔

[صحیح مسلم]

⑨ اسی اثنا میں خروج دجال کی جھوٹی خبر پھیل جائے گی حضرت مہدی حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے دس شہسواروں کا دستہ روانہ کریں گے۔ [صحیح مسلم]

⑩ آخر کار دجال کی آمد ہوگی اور حضرت امام مہدی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو لے کر بیت المقدس روانہ ہوں گے پھر صبح کی نماز کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا اور حضرت عیسیٰ امام مہدی کی اقتدا میں نماز ادا کریں گے۔ [صحیحین]

نزول عیسیٰ علیہ السلام

① حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمانوں پر اٹھالیا گیا تھا اور قرب قیامت کے وقت ان کا نزول ہوگا۔ [قرآن]

② دمشق میں جامع اموی کا سفید مینار جو ۷۴۱ھ میں بنایا گیا تھا، فرشتوں کے سہارے اس مینار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔ [صحیح مسلم]

③ زمین پر چالیس برس قیام کے دوران وہ مندرجہ ذیل کام سرانجام دیں گے:

☆ فلسطین میں ریاست اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب کے نزدیک مقام پر دجال کو خود قتل کریں گے۔ [صحیح مسلم]

☆ روئے زمین کو خنزیروں سے پاک کردیں گے (جو انگریزوں کی محبوب غذا ہے) [صحیح مسلم]

☆ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کریں گے اور جزیہ بھی ختم کردیں گے۔ [مسند امام احمد]

☆ یاجوج ماجوج کی اقوام بھی ان کی دعاؤں سے انجام کو پہنچ جائیں گی۔

④ ان کے دور اقتدار میں خوب باران رحمت ہوگی جس کی وجہ سے زمین اپنے خزانوں کو اہل ایمان کے لیے اگل دے گی۔

[سنن ابی داؤد]

⑤ اللہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں اسلام کے سوائے تمام ملتوں کو مٹا دے گا۔ [مسند امام احمد]

⑥ چالیس سال قیام کرنے کے بعد ان کا انتقال ہوگا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ ادا کریں گے۔ [ابوداؤد: کتاب الملاحم]

⑦ رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کو جہنم سے آزادی کی بشارت دی ہے جو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے ساتھ ہوگا اور اسلام کی سر بلندی کے لیے جہاد کرے گا۔ [نسائی: کتاب الجہاد]

سوال کے دوسرے جز کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کس حیثیت سے دوبارہ تشریف لائیں گے کا جواب یہ ہے کہ ان کا دوبارہ آنا نبی مقرر ہوکر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہوگا نہ ان پر وحی نازل ہوگی اور نہ ہی کوئی نیا پیام لے کر آئیں گے، شریعت محمدی میں کوئی اضافہ یا کمی نہیں کریں گے اور وہ لوگوں کو اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت نہیں دیں گے اور نہ ہی وہ اپنے ماننے والوں کی ایک الگ امت بنائیں گے۔ وہ مسلمانوں کی جماعت میں آکر محض ایک فردکی حیثیت سے شامل ہوں گے، مسلمانوں کے امیر کے پیچھے نماز ادا کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں، ان کا آنا اس نوعیت سے ہوگا ایک صدر ریاست کے دور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں رہتے ہوئے مملکت کی کوئی خدمت سرانجام دے۔ ان سے منصب

نبوت چھینا نہیں جائے گا بلکہ اس کی مدت ختم ہو چکی ہو گی۔ جیسے انہوں نے اپنی دوبارہ آمد سے پہلی زندگی میں ادا کیا تھا۔ قرآن وحدیث میں اس بات کی وضاحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے اور دوسری طرف احادیث یہ خبر بھی دیتی ہیں کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام دوبارہ نازل ہوں گے اس سے صاف ظاہر ہے یہ آمد ثانی منصب نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہو گی بلکہ وہ اس وقت میں رائج تمام ملتوں کو ختم کر کے ملت اسلام کی ترویج واشاعت کے لیے اپنی توانائیاں خرچ کریں گے، علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ [تفصیل کے لیے روح المعانی کا مطالعہ مفید رہے گا]

سوال لاہور سے سرفراز احمد بھٹی خریداری نمبر 1205 لکھتے ہیں کہ ایک شخص مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی مانتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اگر اسے یقین ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو موت نہیں آئی اور نہ ہی وہ سرینگر میں مدفون ہیں تو وہ مرزا قادیانی کی نبوت سے تائب ہو جائے گا آپ سے حیات مسیح کے دلائل درکار ہیں۔ نیز جواب دیتے وقت سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹ کو ضرور مدنظر رکھیں۔

جواب حیات مسیح اور نزول مسیح علیہ السلام کا عقیدہ ہمارے ہاں بنیادی عقائد میں سے ہے جس کی بنیاد قرآنی آیات اور متعدد احادیث ہیں جو معنوی طور پر حد تواتر کو پہنچتی ہیں۔ ہمارا کام اس عقیدہ پر دلائل مہیا کرنا ہے انہیں قابل یقین بنا کر کسی کے دل میں اتارنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، واضح رہے کہ حیاتِ عیسیٰ اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدہ پر امت کا اجماع ہے اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر کبھی جمع نہیں کرے گا۔'' [مستدرک: ۱/۱۱۶]

اللہ تعالیٰ نے رفع عیسیٰ اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن کریم میں بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''اور یہود یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے اللہ کے رسول مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کر ڈالا ہے۔ حالانکہ انہوں نے اسے نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ یہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ ہو گیا اور یقیناً جن لوگوں نے اس معاملہ میں اختلاف کیا وہ خود بھی شک میں مبتلا ہیں، انہیں حقیقت کا کچھ علم نہیں ہے وہ محض ظن کی اتباع کرتے ہیں اور یقیناً وہ انہیں قتل نہیں کر سکے تھے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی طرف اٹھا لیا تھا اور اللہ زور آور اور حکمت والا ہے اور تمام اہل کتاب ابن مریم کی موت سے پہلے ضرور اس پر ایمان لائیں گے اور قیامت کے دن وہ (ابن مریم) ان کے خلاف گواہی دیں گے۔'' [۴/النسآء: ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹]

ان آیات میں صراحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا ہے اور قیامت کے نزدیک جب آپ نزول فرمائیں گے تو آپ کی شان وشوکت کو دیکھ کر یہود کو بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی اللہ کے رسول تھے اور انہوں نے ولد الحرام ہونے کا جو الزام لگایا تھا وہ غلط تھا۔ نیز ان کا یہ گمان کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو مار ڈالا ہے غلط ثابت ہو جائے گا۔

حیات عیسیٰ اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ متعدد احادیث سے بھی ثابت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے عنقریب تم میں ابن مریم عادل حکمران کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ وہ صلیب توڑ ڈالیں گے۔ خنزیر کو ہلاک کر دیں گے، جزیہ اٹھا دیں گے، اس زمانہ میں مال کی اتنی فراوانی ہو گی کہ اسے کوئی بھی قبول نہ کرے گا اور

ایک سجدہ ان کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا اگر چاہو تو قرآن کی آیت پڑھ لو ''تمام اہل کتاب ابن مریم کی موت سے پہلے ضرور اس پر ایمان لائیں گے۔'' [صحیح بخاری: الانبیاء ۳۴۴۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو بیان کرنے والے تقریباً پندرہ تابعین ہیں، پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت نواس بن سمعان، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت حذیفہ بن اسید، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت مجمع بن حارثہ، حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت واثلہ بن اسقع، حضرت ابوامامہ، حضرت عثمان، ابن ابی العاص اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہم سے بھی یہ حدیث ''نزولِ عیسیٰ علیہ السلام'' مروی ہے، اختصار کے پیش نظر ان کے حوالہ جات ذکر نہیں کیے گئے۔

سوال چیچہ وطنی سے محمد صادق لکھتے ہیں کہ زید نامی ایک شخص کے قادیانی ماموں جرمنی میں رہتے ہیں اور دو چار سال بعد چند ماہ کے لیے پاکستان زید کی والدہ اور اس کے خاندان سے ملنے آتے ہیں، زید اور اس کا خاندان ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے۔ نیز زید اپنی والدہ کے ہمراہ جب ربوہ میں ان سے ملنے جاتے ہیں تو ان کے گھر سے کھانا وغیرہ کھاتے ہیں، تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا ہے اور غمی خوشی میں بھی ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں جب کوئی اعتراض کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف دعوت دین کے لیے ان سے میل جول رکھتے ہیں اس صورت حال کے پیش نظر مندرجہ ذیل سوالات کا جواب قرآن وسنت کی روشنی میں درکار ہے۔

① مرزائیوں کے لیے دعوتِ طعام کا اہتمام کرنا اور ساتھ بیٹھ کر کھانا جائز ہے۔ جبکہ مقصود دعوت دین ہو، اگر گھر میں ان کے لیے علیحدہ برتنوں کا انتظام کر دیا جائے تو شرعاً کیسا ہے؟

② دعوتِ دین کے لیے ان سے میل جول رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

③ مرزائیوں سے تحفے تحائف کا تبادلہ، ان کے گھر سے کھانا اور ان کا ذبیحہ جائز ہے؟

④ مرزائیوں سے تعلقات رکھنے والے کی دعوتِ افطار یا دعوتِ طعام میں شرکت کی جا سکتی ہے؟

⑤ مرزائیوں کی غمی خوشی میں شریک ہونا جائز ہے؟

⑥ اگر زید اپنے ماموں مرزائی سے قطع تعلقی کرتا ہے تو اس کی والدہ ناراض ہو جاتی ہے ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟

جواب سوالوں کے ترتیب وار جوابات سے قبل کچھ تمہیدی گزارشات پیش خدمت کرتے ہیں تاکہ جوابات سمجھنے میں آسانی ہو۔

واضح رہے کہ عقیدہ ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''لوگو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ہاں وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔'' [۳۳/الاحزاب:۴۰]

اس آیت کا سیاق وسباق قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے ہیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلسلہ نبوت ختم کر دینے والے ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس معنی کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات سے بھی ہوتی ہے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''پس میں آیا اور میں نے انبیا کا سلسلہ ختم کر دیا۔'' [صحیح مسلم]

نیز آپ نے فرمایا: ''کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری]

اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں سب کے بعد آنے والا ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔'' [ترمذی]

یہی وہ عقیدہ ختم نبوت ہے جس کا منکر مرتد اور واجب القتل ہے رسول اللہ ﷺ کے بعد جن لوگوں نے بھی دعویٰ نبوت کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے جنگ کی اور عقیدہ ختم نبوت پر آنچ نہ آنے دی اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے کے لیے مسئلہ توحید باری تعالیٰ کے ساتھ اس امر کا اقرار کرنا انتہائی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر یہ سلسلہ نبوت ختم ہو چکا ہے، آپ دنیا کے آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کسی قسم کا تشریعی یا غیر تشریعی ظلی یا بروزی کوئی نبی نہیں آسکتا۔ نیز عقیدہ ختم نبوت ایمان کا ایک ایسا جزو ہے جس کے انکار سے ایمان ہی قائم نہیں رہتا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ایسے مدعیانِ نبوت کو دجال، کذاب اور مفتری قرار دیا ہے۔ انہی میں سے ایک مرزا غلام احمد قادیانی ہے جس نے قرآن وحدیث کی صریح نصوص کے خلاف دعویٰ نبوت کیا اس بنا پر مرزا قادیانی اور اس کے پیروکار دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ چونکہ یہ لوگ نص قطعی کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ صرف کافر ہی نہیں بلکہ مرتد واجب القتل ہیں یہ ایسے مار آستین ہیں جو کلمہ کی آڑ میں لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، ان کی حمایت کرنا بہت بڑا جرم ہے، ان کے متعلق نرم گوشہ رکھنے والا اگر جہالت کی وجہ سے ایسا کرتا ہے تو کفر نہیں البتہ خطرہ ہے کہ حمایت کرتے کرتے کہیں ان کے ساتھ شامل نہ ہو جائے لہٰذا ایسے آدمی کو اپنے متعلق نظر ثانی کرنی چاہیے کیونکہ قرآن مجید نے شریعت اسلامیہ کے ساتھ مذاق کرنے والوں کی حمایت کرنے والوں کو تنبیہ کی ہے کہ اگر تم باز نہ آئے تو تم بھی ان جیسے ہو گے۔ [۴/النسآء:۱۴۰]

نیز یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ کفار کے ساتھ تعلقات کی تین اقسام ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔

① **موالات** : دوستی اور قلبی تعلقات رکھنا یہ تو کسی حال میں درست نہیں ہیں۔ قرآن کریم نے سختی سے روکا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مومنو! کسی غیر (مسلم) کو اپنا راز داں نہ بناؤ''۔ [۳/آل عمران:۱۱۸]

② **مدارات** : ظاہری طور پر خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آنا ایسا کرنا رفع ضرر اور مصلحت دین کے پیش نظر جائز ہے۔ ذاتی مفاد یا دنیوی منفعت کے لیے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

③ **مواسات** : ضرورت مند پر احسان اور نفع رسانی کا اقدام یہ صرف ایسے کفار کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو اہل حرب نہ ہوں۔ یعنی اسلام اور اہل اسلام کو نیچا دکھانے میں مصروف نہ ہوں، اگر مخالفت کرتے ہوئے میدان میں اتر آئیں اور اہل اسلام کو تکلیف دینے کے لیے منصوبہ سازی میں سرگرم عمل ہوں تو ایسے کفار کے ساتھ مواسات درست نہیں ہے۔ سورۃ ممتحنہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کافر دشمن اور کافر غیر دشمن کو ایک ہی درجہ میں رکھنا درست نہیں۔ بلکہ ان میں فرق رکھنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر پسند لوگوں کے ساتھ خیر خواہانہ تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، اس تمہید کے بعد ان سوالات کا ترتیب وار جواب دیا جاتا ہے۔

دعوت دین کی خاطر مرزائیوں کے لیے دعوت طعام کا اہتمام

بلاشبہ دعوت دین شریعت اسلام کا اہم فریضہ ہے جس کے کچھ اصول وضوابط ہیں اور آداب وشرائط ہیں، سب سے بڑا ضابطہ یہ ہے کہ داعی صاحب علم ہو اور دعوت بھی علیٰ وجہ البصیرت دی جائے، نیز دعوت دیتے وقت ایسا پُر حکمت انداز اختیار کیا جائے جو دین اسلام کے شایان شان ہو، کہ دعوت دیتے وقت اسلام کا کوئی دوسرا ضابطہ مجروح نہ ہو، صورت مسئولہ میں زید کا ماموں دو چار سال بعد چند دنوں کے لیے اس کی والدہ سے ملنے آتا ہے تو زید ان کی ضیافت کرتا ہے، جب لوگوں کی طرف سے اعتراضات ہوتے ہیں تو مہمان نوازی کو دعوت دین کا نام دے دیتا ہے، ہمارے نزدیک یہ ایک ایسا چور دروازہ تلاش کیا گیا ہے جس کی آڑ میں رشتہ داری کو مستحکم کیا جاتا ہے، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا، انہوں نے مسیلمہ کذاب اور اس کے پیروکار لوگوں سے کوئی رواداری نہیں کی۔ دعوت دین کا سلسلہ تو ہر وقت جاری رہنا چاہیے نہ کہ دو چار سال بعد چند دنوں کے لیے جبکہ مرتدین (مرزائی) مہمان بن کر زید کے گھر اتر آئیں یہ تمام چیزیں ایک مسلمان کی دینی غیرت کے خلاف ہیں، ان پر اتمام حجت ہو چکی ہے اور دعوتِ دین بھی انہیں مل چکی ہے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں احساس دلایا جائے کہ ہمارے ارتداد کی وجہ سے ہمارے رشتہ دار ہم سے نفرت کرتے ہیں اور ہم سے دور رہتے ہیں، جبکہ زید کے کردار میں یہ چیزیں تلاش کے باوجود نہیں ملتیں۔ ان کے لیے اپنے گھر میں مہمان نوازی کی خاطر علیحدہ برتنوں کے اہتمام سے بھی ایمانی غیرت کا احیاء نہیں ہوگا۔ کیونکہ انہیں ضیافت کے ذریعے پورا پورا احترام مل گیا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سے اعلانِ بیزاری کر دیا جائے اور کھلانے پلانے کے تمام چور دروازوں کو بند کر دیا جائے، انہوں نے خود مسلمانوں کے ہاں اپنے احترام کو ختم کر لیا ہے تو ہمیں اس قدر تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، واضح رہے کہ ضیافت کا تعلق موالات سے ہے جس کی شریعت میں کفار سے اجازت نہیں ہے۔

دعوت دین کی خاطر مرزائیوں سے میل جول رکھنا

اس کا جواب بھی سابقہ سطور میں دیا جا چکا ہے کہ اگر اس سے مراد گھر میں بلا کر مہمان نوازی کرنا ہے اور ان کی غمی وخوشی میں شریک ہونا ہے تو ایسا کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ایسے میل جول کے بغیر بھی دعوت دین کا فریضہ سرانجام دیا سکتا ہے۔ مرزا قادیانی کے دجل و فریب کو واضح کیا جائے کہ وہ انگریز کا کاشت کردہ پودا تھا اور اس نے دعویٰ نبوت کر کے خود رسول اللہ ﷺ کی توہین کی ہے، اس طرح ان پر مرزائیت کی حقیقت بے نقاب کی جائے اور یہ دعوتِ دین خط وکتابت کے ذریعے سرانجام دی جا سکتی ہے، بہر حال دعوتِ دین موسمی نہیں بلکہ ہر وقت جاری رہنی چاہیے لیکن اس کی آڑ میں تعلقات کی استواری جائز نہیں ہے۔

مرزائیوں کے گھر کا کھانا ان کے ذبیحہ وغیرہ

نبوت کے مدعیان نے ایک ایسا جرم کیا ہے جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان سے بچنے اور دور رہنے کی تلقین فرمائی ہے اس بنا پر مرزائیوں سے رشتہ ناطہ کرنا، ان کے گھر سے کھانا پینا اور ان کا ذبیحہ کا استعمال کرنا سب ناجائز اور حرام ہے، فرمان نبوی ﷺ ہے: ''کہ جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو مشتبہ چیزوں کی پیروی کرتے ہیں تو ایسے لوگوں سے دور رہو۔'' [صحیح بخاری]

اس ارشاد نبوی ﷺ کا تقاضا یہ ہے کہ مرزائیوں سے کسی قسم کا میل ملاپ نہ رکھا جائے اور نہ ہی ان کے گھر سے کھانا کھایا

جائے ، نیز یہ لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں لہٰذا ان کے ذبیحہ کا کوئی اعتبار نہیں واضح رہے کہ انہیں اہل کتاب پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ لوگ دین اسلام قبول کر کے پھر مرتد ہوئے ہیں جبکہ اہل کتاب نے سرے سے دین اسلام قبول ہی نہیں کیا ہوتا بہر حال ایمانی غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ ان سے حتی المقدور اجتناب کیا جائے۔

مرزائیوں سے تعلقات رکھنے والے کی دعوتِ طعام یا دعوتِ افطار میں شرکت کرنا

بلاشبہ مرزائی دائرہ اسلام سے خارج اور ان کے ساتھ تعلقات رکھنے والا اگر جہالت کی وجہ سے ایسا کرتا ہے تو کفر نہیں ، اگر ہٹ دھرمی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے تو جرم عظیم کا مرتکب ہے ، اندیشہ ہے کہ تعلق داری کا اس حد تک خیال رکھنے کی وجہ سے کہیں ان کے ساتھ شامل نہ ہو جائے۔ لہٰذا دوسرے مسلمانوں کو چاہیے کہ اسے اچھے انداز سے سمجھائیں اور اسے قائل کریں اگر وہ باز نہیں آتا تو ایسے انسان کی دعوتِ طعام اور دعوت افطار میں شرکت بہتر نہیں تا کہ اسے کچھ نصیحت حاصل ہو۔ بالخصوص وہ لوگ جو معاشرہ میں اپنا اثر ورسوخ رکھتے ہیں انہیں تو اس طرح کی دعوت میں شرکت سے اجتناب کرنا چاہیے۔

مرزائیوں کے ساتھ غمی وخوشی میں شرکت کرنا

سابقہ سطور میں اس بات کی وضاحت ہو چکی ہے کہ جو شخص بظاہر احکام اسلام کا پابند ہے لیکن اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے کسی ایک کا منکر ہے یا اس کے عقائد میں سے کسی ایک کی ایسی بے جا تاویل کرتا ہے جس سے وہ عقیدہ ہی درہم برہم ہو جاتا ہے یا وہ شخص کسی ایسے امر کا دانستہ طور پر ارتکاب کرتا ہے جو اسلام کی نظر میں موجبات کفر سے ہے تو بلاشبہ ایسا شخص دائرہ اسلام سے خارج اور واجب القتل ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منکرین زکوٰۃ اور حامیان مسیلمہ کذاب کے ساتھ سلوک کیا تھا مرزا قادیانی اور اس کی ذریت بھی اسی سلوک کی حقدار ہے ان سے تعلقات رکھنے سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ لہٰذا ان کی غمی وخوشی میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اور نہ ہی ایسا کرنا باغیرت مسلمان کے شایان شان ہے۔

مرزائیوں کے ساتھ تعلقات ختم کرنے پر والدہ کا ناراض ہونا

والدین کی اطاعت ضروری ہے لیکن اس کی حد بندی یوں کی گئی ہے کہ ان کی اطاعت سے اسلام کا کوئی ضابطہ مجروح نہ ہو اگر والدین کی اطاعت کرنے سے اسلام کے کسی دوسرے ضابطہ پر حرف آتا ہو تو والدین کی اطاعت ترک کر کے اسلام کا تحفظ کرنا چاہیے ، حدیث میں ہے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مرزائیوں سے قطع تعلقی کی صورت میں والدہ کی اطاعت کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ البتہ دنیاوی معاملات میں والدہ سے حسن سلوک اور اس کی خدمت کرتے رہنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال منڈی راجووال سے قاری عبد الباسط قمر لکھتے ہیں کہ ہمیں درج ذیل دو مسائل کی وضاحت درکار ہے۔

① قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کس قوم کو بندر اور خنزیر بننے کا حکم دیا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے یا کسی اور نبی کی قوم کے متعلق حکم دیا تھا؟

② چیونٹی کو مارنے کے متعلق کیا حکم ہے بعض دفعہ کھانے وغیرہ پر چڑھ جاتی ہیں تو انہیں دھوپ میں ڈال دیا جاتا ہے اس طرح وہ مر جاتی ہیں کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب ①: واضح رہے کہ اس قسم کے سوالات کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، جبکہ اس کے برعکس ہماری پالیسی یہ ہے کہ ایسے سوالات کا حل دریافت کیا جائے جس کا براہِ راست تعلق ایک بندہ مؤمن کی عملی زندگی سے ہے اور سوال یوں ہونا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کس جرم کی پاداش میں انہیں بندر اور خنزیر بنایا تھا تاکہ اس کے جواب کی روشنی میں انسان اپنے کردار پر نظر رکھے، بہر حال جنہیں بندر اور خنزیر بنایا گیا تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھے۔ چنانچہ بنی اسرائیل (یہود) کے لیے قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتے کے دن کو آرام سے عبادت کے لیے مخصوص رکھیں اور اس روز کسی قسم کا دنیاوی کام نہ کریں، بلکہ انہیں سیر وشکار کی بھی ممانعت تھی اس کے متعلق یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حرمت پامال کرے گا وہ واجب القتل ہے۔ لیکن جب ان پر اخلاقی اور دینی انحطاط کا دور آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو شرعی پابندیوں سے آزاد کرنے کے لیے بہت سے شرعی حیلے ایجاد کر لیے، ان میں سے کچھ لوگ سمندر کے کنارے پر آباد تھے، جن کا کاروبار ہی سیر وشکار تھا، انہوں نے پابندی کے باوجود اس کے لیے بہت سی راہیں کھول لیں اور اس طرح وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے انہیں اس جرم کی پاداش میں بندر بنا دیا گیا اور یہ اصحاب السبت کے نام سے مشہور ہیں۔

سورۃ اعراف میں ان کا تفصیلی تذکرہ ہے مندرجہ ذیل قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں بندر بنایا گیا تھا وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھے۔

قرآن مجید میں یہود سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا، تو ہم نے انہیں کہہ دیا کہ جاؤ ذلیل بندر بن جاؤ۔'' [۲/البقرۃ:۶۵]

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسخ ہو کر بندر بننے والے یہودی تھے۔

ایک دفعہ مدینہ کے یہودیوں نے ''السام علیکم'' کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی تو صدیقہ کائنات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں جواب دیا۔ بایں الفاظ کتب حدیث میں محفوظ ہے۔

''بندروں اور خنزیروں سے تعلق والو! تم پر ہلاکت ہو، اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہو۔'' [مسند امام احمد: ۲/۲۴۱]

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جنہیں بندر اور خنزیر بنایا گیا تھا وہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو علامات قیامت بیان فرمائی ہیں وہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے: ''مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میری امت کے کچھ لوگ اکل وشرب، لھو ولعب اور فخر وغرور میں شب باشی کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بندر اور خنزیر بنا دیں گے۔ ان کا جرم یہ ہوگا:

(الف) اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء بالخصوص شراب کو اپنے لیے حلال سمجھیں گے۔

(ب) بازاری عورتوں اور رقاصاؤں سے تعلق رکھیں گے۔
(ج) سودخوری اور ریشم پوشی کو وطیرہ زندگی بنائیں گے۔
(د) آلات موسیقی کو بکثرت استعمال کریں گے۔ [مسند امام احمد: ۵/۳۲۹]

آج یہ جرائم بکثرت پائے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں بنی اسرائیل جیسی ذلت ورسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین

② صورت مسئولہ میں جس طرح چیونٹیوں کو مارنے کا ذکر ہوا ہے شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں۔ اگرچہ موذی چیز کو مارنے کی شرعاً اجازت ہے۔ بالخصوص چیونٹیوں کے متعلق حدیث میں ایک واقعہ بھی بیان ہوا کہ کسی نبی کو ایک چیونٹی نے کاٹ ڈالا تو انہوں نے بل کی تمام چیونٹیوں کو آگ لگادی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ایسی وحی بھیجی کہ تو نے صرف اس چیونٹی کو سزا کیوں نہ دی، جس نے تجھے کاٹا تھا۔ [صحیح بخاری: کتاب الجہاد]

ممکن ہے کہ اس واقعہ سے چیونٹیوں کو آگ سے جلا دینے کا جواز کشید کیا جائے لیکن واضح رہے کہ گزشتہ امتوں کے واقعات ہمارے لیے اس وقت قابل حجت ہوتے ہیں جب کسی مسئلہ کے متعلق ہماری شریعت میں حکم امتناعی نہ آیا ہو، ہماری شریعت میں چیونٹی کو مارنا بالخصوص آگ میں جلانا دونوں بصراحت منع ہیں چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار جانداروں کو قتل کرنے سے منع فرمایا: ''چیونٹی، شہد کی مکھی، ہدہد اور چڑیا۔'' [سنن ابی داؤد: کتاب الادب]

کیونکہ مذکورہ جاندار ایک ایذا رسانی کا باعث نہیں بنتے اگر کسی موقع پر ان کے ضرر کا اندیشہ ہو تو انہیں دھوپ میں پھینک کر بھسم کرنے کے بجائے انہیں بھگا دینا ہی کافی ہے۔ پھر دھوپ میں ڈال کر ختم کرنے اور آگ کے ذریعے جلا دینے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چیونٹیوں کو آگ سے جلا دینا بھی منع ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راستہ سے گزرتے ہوئے چیونٹیوں کو دیکھا جنہیں آگ سے جلا دیا گیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''کہ انہیں کس نے جلایا ہے؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہم نے ایسا کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مناسب نہیں کہ آگ کے پروردگار کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی کسی جاندار کو آگ سے جلائے۔'' [سنن ابی داؤد: کتاب الادب]

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم کھانے وغیرہ کو اچھی طرح محفوظ کریں اگر چیونٹیاں چڑھ جائیں تو انہیں جھاڑ دینا ہی کافی ہے۔ دھوپ میں ڈال کر انہیں ختم کرنا درست نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال بعض کتب دینیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم یا صلعم لکھا ہوتا ہے، اس طرح کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ کی علامت لکھی ہوتی ہے، اس قسم کی علامت اور اختصار کی کیا حیثیت ہے۔ (حافظ محمد یونس ربانی، فیصل آباد خریداری نمبر ۲۹۲۴)

جواب اسلامی آداب میں سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ محبت اور چاہت سے ''صلی اللہ علیہ وسلم'' لکھا جائے اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے شریفہ کے ساتھ رضی اللہ عنہم تحریر کیا جائے دیگر انبیائے کرام کے ساتھ علیہم السلام اور متقدمین اسلاف کے ساتھ رحمہ اللہ، زندہ اہل علم کے ساتھ اور برخورداران کے ساتھ سَلَّمَهُ اللهُ لکھا جائے۔ محدثین عظام نے وضاحت کی ہے کہ صلی اللہ علیہ وسلم

یا ﷺ کا اختصار یا اس کی علامت نہ لکھی جائے اور نہ ہی بار بار لکھنے سے دل میں کسی قسم کی اکتاہٹ پیدا ہونا چاہیے۔ چنانچہ شارح صحیح مسلم علامہ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں "کاتب کو چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ و تسلیم لکھنے کی پابندی کرے اور بار بار لکھنے میں کوئی اکتاہٹ محسوس نہ کرے، جو شخص اس سے غفلت کرتا ہے وہ گویا خیرِ کثیر سے محروم ہو گیا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کے ساتھ عزوجل جیسے الفاظ لکھے نیز صحابہ کرام اور دیگر اخیار امت کے لیے رضی اللہ عنہم جیسے الفاظ کا انتخاب کرے، اس سلسلہ میں رموز و اشارات سے کام نہ لے بلکہ انہیں کامل طور پر لکھا جائے۔" [شرح تقریب النووی: ص۲۹۱]

علامہ سیوطی رحمہ اللہ اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "کہ رسول اللہ ﷺ اگرچہ عزیز و جلیل ہیں لیکن آپ کے لیے عزوجل کے الفاظ نہ لکھے جائیں اسی طرح صلوٰۃ و سلام کے الفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے استعمال نہ کیے جائیں جیسا کہ امام نووی نے شرح مسلم میں وضاحت کی ہے۔" [تدریب الراوی: ص۲۹۳]

علامہ محمد جمال الدین قاسمی نے اپنی تالیف "قواعد التحدیث" میں باقاعدہ آداب کا عنوان قائم کر کے بڑی تفصیل سے اس مسئلہ کا حق ادا کیا ہے۔ [قواعد التحدیث: ص۲۳۷]

لہٰذا ہمیں اس سلسلہ میں سستی یا کوتاہی سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ ثواب و آداب کی نیت سے، اللہ تعالیٰ عزوجل، رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذکر خیر پر مذکورہ بالا آداب لکھنے کی پابندی کرنا چاہیے۔

سوال ایک طالب علم کسی کورس میں داخلہ لینے کے لیے خود کو احمدی ظاہر کرتا ہے۔ جبکہ وہ مسلمان ہے کیا کتاب و سنت کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ اس قسم کا مشورہ دینے کے متعلق شریعت اسلامیہ کا کیا فیصلہ ہے۔ سائل: عبدالغفار، میانوالی۔

جواب شریعت اسلامیہ میں انسان کے ایمان لانے کے بعد اس کی کامیابی کا مدار اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا وفادار اور رسول اللہ ﷺ کا اطاعت گزار ہو، اس قسم کی وفاداری اور اطاعت گزاری کو قرآن کریم کی اصطلاح میں "استقامت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگر انسان ایمان لانے کے بعد کڑی آزمائش کے وقت اپنے مفادات کو دین کے مطالبات پر ترجیح دیتا ہے تو یہ ایک ایسا دوغلہ پن ہے جس کے باعث اس کے اقرار ایمان اور دیگر عبادات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

ایمان کی اصل روح یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کو باطل کی بڑی سے بڑی قوت اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے اور اس راستہ میں پیش آنے والی ہر آزمائش کے سامنے کوہ استقامت بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں:

"یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے پھر اس پر جم گئے ان کے لیے کسی قسم کا خوف نہ ہو گا اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔" [۴۶/الاحقاف:۱۳]

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے کسی اتفاقی حادثہ کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو اپنا رب نہیں کہا اور نہ ہی اس غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ اللہ کو اپنا رب کہنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی اپنا رب بناتے جائیں۔ بلکہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد ساری عمر اس پر قائم رہے اور اپنی زندگی میں اس کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا رہے۔

صورت مسئولہ میں ایک کم ہمت انسان نے چند ٹکوں کی خاطر اپنی زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا ہے کیوں کہ احمدی ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں۔ شرعی طور پر یہ ارتداد ہی کی ایک قسم ہے، روزی رساں اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے رزق تلاش کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کی تلقین کی ہے۔ آخر اپنے منہ سے کلمہ کفر کہہ کر پیٹ پالنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر اسلامی حکومت ہو تو ایسا انسان سزائے ارتداد کا حقدار ہے اور اسے مشورہ دینے والا اس سے بھی بدتر ہے۔ قیامت کے دن وہ اپنا اور اس کا بوجھ اٹھا کر اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''قیامت کے دن دوسروں کو گمراہ کرنے والے اپنے اعمال کے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور جن کو انہوں نے گمراہ کیا ہے ان کا بوجھ بھی ان پر لادا جائے گا۔'' [۱۶/النحل:۲۵]

اللہ تعالیٰ ہمیں اسلام سے بے اعتنائی سے محفوظ رکھے اور اس پر ثابت قدم رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔




طہارت و وضو

طہارت و وضو

سوال عبداللہ سلام میاں چنوں سے دریافت کرتے ہیں کہ جرابوں پر مسح کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز اگر جرابیں پھٹی ہوئی ہوں تو کیا ان پر مسح کرنا جائز ہے اور اگر کسی نے مسح کرنے کے بعد جرابیں اتار دیں تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ دین اسلام کی بنیاد سہولت اور رفع حرج پر رکھی گئی ہے، اس کے احکام میں اس قدر آسانی ہے کہ مزید سہولت کا تصور نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ دین اسلام رحمت اور دلوں کی تسکین کا باعث ہے۔ جرابوں پر مسح کرنے کی سہولت بھی اسی قبیل سے ہے۔ احادیث میں صراحت کے ساتھ جرابوں پر مسح کرنے کی اجازت منقول ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین کرام، ائمہ دین اور محدثین کا بھی یہی موقف ہے کہ جرابوں پر مسح کیا جا سکتا ہے۔ چند احادیث کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

''حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مہم کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجا جنہیں سردی سے تکلیف ہوئی۔ جب وہ واپس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سخت سردی کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ پگڑی اور جرابوں پر مسح کر لیا کریں۔'' [مسند امام احمد: ج ۵، ص ۲۷۵]

''حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔''

[ابوداؤد: الطہارۃ، ۱۵۹]

''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ وضو کیا تو جرابوں اور جوتوں پر مسح فرمایا۔'' [ابن ماجہ: الطہارۃ، ۵۶۰]

حضرت ازرق بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ بے وضو ہوئے تو انہوں نے وضو کرتے ہوئے ہاتھ اور منہ دھوئے پھر اون کی جرابوں پر مسح کیا۔ ہم نے عرض کیا کہ ان پر مسح کرنا جائز ہے؟ اس پر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کیوں نہیں! یہ بھی موزے ہیں لیکن اون کے ہیں۔'' [الکنیٰ والاسماء للدولابی: ۱/۱۸]

حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابی اور عربی الاصل ہیں وہ خف کے معنی بیان کرتے ہیں کہ وہ صرف چمڑے کا ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر اس چیز کو شامل ہے جو قدم کو چھپا لے آپ کی یہ وضاحت معنی کے اعتبار سے نہایت دقیق ہے کیونکہ ان کے نزدیک لفظ جوربین لغوی وضعی معنی کے لحاظ سے خُفّین کے مدلول میں داخل ہیں اور خفین پر مسح میں کوئی اختلاف نہیں۔ لہٰذا جرابوں پر مسح میں کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت متعدد طرق سے مروی ہے ملاحظہ ہو۔ [محلی ابن حزم: ۲/۸۵]

ان احادیث پر کچھ اعتراضات بھی ہیں ہم ان کی وضاحت اور مفصل جواب اور فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔

اگر جراب یا موزہ پھٹ جائے تو اس پر مسح کرنے کے متعلق بہت اختلاف ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ جب تک جراب کا نام اور کام باقی ہے اس پر مسح کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ان کے لیے صحیح و سالم کی شرط لگانے کا کوئی ثبوت نہیں۔ نیز امام

نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ جب تک موزے پاؤں میں پہنے رہیں ان پر مسح کرتے رہو۔ مہاجرین وانصار کے موزے پھٹے پرانے اور پیوند لگے ہوتے تھے۔'' [محلی ابن حزم: ص ۲/۱۰۲]

حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ اگر موزے یا کسی دوسری چیز میں جو پاؤں میں پہنی ہوئی ہے کسی قسم کا چھوٹا یا بڑا سوراخ ہو جائے جس سے قدم کا تھوڑا یا زیادہ حصہ نظر آ رہا ہو تو ان سب صورتوں میں مسح جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ پاؤں میں پہنے ہوئے ہوں۔ سفیان ثوری، داؤد، ابوثور، اسحاق بن راہویہ اور یزید بن ہارون کا یہی مسلک ہے۔'' [محلی ابن حزم: ص ۱۰/۲۲]

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی موقف ہے وہ لکھتے ہیں: ''کہ پھٹے ہوئے موزے پر خف کا لفظ بولا جاتا ہے مسح جائز ہے۔'' [الاختیارات: ص ۳]

اسی طرح جرابیں جب تک گرد وغبار سے بچاؤ اور سردی سے تحفظ کا کام دیتی ہیں ان پر مسح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے جرابوں پر مسح کرنے کے بعد انہیں اتار دیا تو اس کا وضو صحیح رہے گا اسے پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ مسح اللہ کی طرف سے سہولت اور رخصت ہے اسے خود ساختہ شرائط سے مشروط کرنا عقل ونقل کے خلاف ہے اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ وضو کیا تو جوتوں پر مسح کیا پھر مسجد میں داخل ہوئے اور جوتوں کو اتار کر نماز ادا کی۔ [بیہقی: ۱/۲۸۸]

حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''موزے اور پگڑی پر مسح کرنے والا اگر ان کو اتار دے یا مدت مسح ختم ہو جائے تو وضو نہیں ٹوٹے گا اور نہ ہی اس پر دوبارہ سر کا مسح اور پاؤں کا دھونا واجب ہے۔ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا یہی فتویٰ ہے۔ نیز مسح کے بعد سر کے بال منڈوا دینے کی صورت میں جمہور اور امام احمد کا یہی مذہب ہے۔'' [الاختیارات]

جن روایات میں موزے اتارنے کے بعد دوبارہ وضو کرنے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہیں۔

حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے اور مخالفین کے دلائل پر عمدہ بحث کی ہے۔ جو پڑھنے کے قابل ہے۔ ملاحظہ ہو۔ [محلی ابن حزم: ۲/۱۰۵]

مختصر یہ ہے کہ جرابوں پر مسح جائز ہے خواہ موٹی ہوں یا باریک، خواہ پھٹی پرانی ہی کیوں نہ ہوں نیز مسح کرنے کے بعد انہیں کسی وجہ سے اتار دینا ناقض وضو نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال نوائے وقت میں ایک سوال کا جواب شائع ہوا ہے کہ آشوب چشم کی وجہ سے بہنے والے قطروں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے کیا یہ صحیح ہے؟ (محمد علی، خانیوال)

جواب آشوب چشم کی وجہ سے بہنے والے قطروں سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ کتاب وسنت میں ان کے نواقض وضو ہونے کے متعلق کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے خلاف دلائل ملتے ہیں۔ جن کی تفصیل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نقل فرمائی ہے۔ دراصل روزنامہ ''نوائے وقت'' میں شائع ہونے والے فتویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ فقہائے احناف کے نزدیک وضو کے بعد بدن سے

خون یا پیپ بہنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ:

''غزوۂ ذات الرقاع میں ایک صحابی کو دوران نماز تیر لگا اس کا خون بہہ نکلا لیکن اس نے اپنی نماز جاری رکھی۔''

[صحیح بخاری: کتاب الوضوء]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے ایک پھوڑے کو دبایا اس سے خون نکلا لیکن آپ نے اس خون کی وجہ سے نیا وضو نہیں کیا۔'' [صحیح بخاری: کتاب الوضوء]

''حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے دوران نماز خون تھوکا، انہوں نے بھی نیا وضو نہیں کیا بلکہ وہ اسی حالت میں نماز ادا کرتے رہے''۔ [صحیح بخاری: کتاب الوضوء]

''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سنگی لگوانے والے کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسے وضو کی ضرورت نہیں۔ صرف جہاں سنگی لگی تھی اسے دھولے''۔ [صحیح بخاری کتاب الوضوء]

امام طاؤس، عطاء بن ابی رباح اور فقہائے اہل حجاز کا مسلک یہی ہے کہ خون نکلنے سے وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''مسلمان ہمیشہ زخمی حالت میں نماز پڑھتے رہے ہیں۔'' [صحیح بخاری: کتاب الوضوء]

اس لیے خون وغیرہ سے وضو نہیں ٹوٹتا اور نہ ہی آشوب چشم سے بہنے والے قطروں سے وضو خراب ہوتا ہے۔

سوال دبئی سے ام ایمن بذریعہ ای میل سوال کرتی ہیں کہ مجھے ابتدائی تین سال تک ایام باقاعدہ آتے رہے، اس کے بعد بے قاعدہ ہونا شروع ہو گئے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ مہینہ میں صرف دس بارہ دن تک آرام رہتا ہے، اس معاملہ میں خاصی پریشان ہوں، براہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں الجھن دور فرمائیں۔

جواب عورت کو مخصوص ایام کے علاوہ جو خون آتا ہے اس کو استحاضہ کہا جاتا ہے، یہ خون کسی اندرونی بیماری یا رگ پھٹنے سے آتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے رکضۂ شیطان سے تعبیر کیا ہے۔ [ابوداؤد: الطہارۃ ۲۸۷]

کیونکہ ان ایام میں شیطان کو موقع ملتا ہے کہ وہ عورت کو پریشان کردے۔ چنانچہ عورت ان دنوں ایک دینی معاملہ میں اشتباہ کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہ خود کو نماز روزہ کے قابل سمجھے یا اس کے قابل خیال نہ کرے۔ واضح رہے کہ استحاضہ کی دو صورتیں ہیں:

(الف) عورت ہمیشہ اسی حالت میں مبتلا رہے کسی دن بھی سکون میسر نہ ہو جیسا کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے ایسا استحاضہ آتا ہے کہ کبھی پاک نہیں ہوتی ہوں۔ [صحیح بخاری: الحیض ۳۰۶]

(ب) عورت کو بکثرت اس حالت سے دوچار رہنا پڑے۔ مہینہ میں چند دن کے لیے آرام رہے، جیسا کہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: یا رسول اللہ ﷺ! مجھے جب حیض آتا ہے تو خون اکثر دنوں جاری رہتا ہے۔ [ابوداؤد: الطہارۃ ۲۸۷]

سوال میں اسی حالت کا ذکر ہے، عام طور پر اس کے متعلق طبعی شرم وحیا سے کام لیا جاتا ہے جبکہ صحابیات رضی اللہ عنہن مسائل دریافت کرنے میں اس طبعی حیا کو رکاوٹ خیال نہیں کرتی تھیں۔ لہٰذا اس کے متعلق ذرا تفصیل سے بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ سائلات اور غیر سائلات دونوں کے لیے راہنمائی کا باعث ہو۔

مستحاضہ عورت کی حالتیں ہیں:

① اسے اپنے ایام حیض معلوم ہوں، اس صورت میں جتنے ایام، حیض کے لیے مخصوص ہوں گے ان پر احکام حیض اور بقیہ ایام پر استحاضہ کے احکام جاری ہوں گے۔ یعنی حیض کے دنوں میں نماز روزہ ترک کر دیا جائے اور استحاضہ کے دنوں میں ہر نماز کے لیے تازہ وضو کر کے اسے ادا کیا جائے۔ حدیث میں ہے کہ: حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نے کہا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ایسے استحاضہ آتا ہے کہ کبھی پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی، کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، یہ خون ایک رگ سے آتا ہے، اپنے ایام حیض کی مقدار نماز ترک کر دے پھر غسل کر کے نماز کا آغاز کر دے۔'' [صحیح بخاری: الوضوء ۲۲۸]

واضح رہے کہ ایک روایت میں وضاحت ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے۔ اس لفظ کا تقاضا ہے کہ مستقل عذر والے مرد، عورت کو ہر نماز کے لیے وضو کرنا ہوگا۔ اور اس نماز سے متعلقہ سنن و نوافل بھی اس وضو سے پڑھے جا سکتے ہیں، نماز ادا کرنے کے بعد وضو خود بخود ختم ہو جائے گا، صورت مسئولہ میں سائلہ کو چاہیے کہ وہ اس ہدایت کے مطابق عمل کرے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام حبیبہ بنت جحش رضی اللہ عنہا جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں، انہیں فرمایا تھا: ''کہ جتنے دن تجھے تیرا حیض روکے رکھے اتنے دن تک نماز ترک کر دے، پھر غسل کر کے نماز شروع کر دو۔'' [ابوداود: الطہارۃ ۲۷۹]

اس قسم کی عورت کو فقہا کی اصطلاح میں معتادہ کہا جاتا ہے، یعنی اسے اپنی عادت کا پتہ ہوتا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ عادت کے علاوہ اگر بقیہ ایام میں خون جاری رہتا ہے تو روئی یا کپڑا یا لنگوٹ استعمال کر کے نماز شروع کر دی جائے۔ احادیث میں یہ تمام ہدایات ملتی ہیں۔

② مستحاضہ کی دوسری حالت یہ ہو سکتی ہے کہ اسے یاد نہیں یا اس میں بگاڑ آ گیا ہے یا جب سے حیض آنا شروع ہوا، خون جاری رہا کبھی بند نہیں ہوا تو ایسی عورت کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ خون حیض کی خود تمیز کرے، اس قسم کی عورت کو متمیزہ کہتے ہیں، تمیز کرنے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) خون سیاہی مائل ہو۔ (۲) وہ گاڑھا ہو۔ (۳) اس کی ناگوار گندی ہوا ہو۔

مثلاً ایک عورت کو جب حیض شروع ہوا تو ابتدائی دس دن اس کی رنگت سیاہ دیکھی یا وہ گاڑھا تھا یا اس کی ہوا گندی تھی تو وہ تمیز کردہ ایام حیض کے شمار کر کے بقیہ ایام استحاضہ میں غسل کرے اور ہر نماز کے لیے وضو کر کے نماز پڑھے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: ''کہ حیض کا خون سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، جس سے حیض کی پہچان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سیاہ خون آنے تک نماز ترک کر دو پھر وضو کر کے نماز شروع کر دو۔ کیونکہ اس کے بعد آنے والا خون استحاضہ کا ہے۔'' [ابوداود: الطہارۃ ۲۸۶]

③ تیسری صورت یہ ہے کہ اس عورت کے دن بھی مقرر نہ ہوں اور نہ ہی وہ تمیز کر سکتی ہو، مثلاً جب اسے حیض آنا شروع ہوا تو وہ ایک صفت رہا یا کبھی سیاہ پھر سرخ پھر سیاہ آتا رہا، جس سے حیض کی پہچان نہ ہو سکے۔ اس قسم کی عورت کو فقہا کی اصطلاح میں ''متحیرہ'' کہتے ہیں۔ احادیث کے مطابق اس قسم کی عورت کے متعلق یہ حکم ہے کہ وہ اپنی عمر اور جوانی کی صحت کے لحاظ سے ملتی جلتی عام عورتوں

کی عادت کے مطابق عمل کرے۔ یعنی وہ ہر مہینے چھ یا سات دن حیض کے شمار کر کے بقیہ ایام میں استحاضہ کے مطابق عمل کرے۔ جیسا کہ حضرت حمنہ بن جحش رضی اللہ عنہا نے کہا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بکثرت شدت سے خون آتا ہے۔ کیا میں نماز روزہ ترک کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم روئی استعمال کرو، اس سے خون رک جائے گا۔'' عرض کیا: خون کی مقدار اس سے بھی زیادہ ہے یعنی روئی وغیرہ کے استعمال سے بند نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ رکضہ شیطان ہے تو اللہ کے علم کے مطابق چھ یا سات دن تک نماز ترک کر دے، پھر غسل کر کے تیئس یا چوبیس دن نماز پڑھ اور روزہ بھی رکھ۔'' [ابوداؤد: الطہارۃ' ۲۸۷]

واضح رہے کہ چھ یا سات دن اکثر عورتوں کی عادت کے مطابق ہیں وہ عورت دیکھے کہ میری عمر اور جسمانی صحت کس سے ملتی ہے، اس کی عادت کے مطابق عمل کرے۔ ہمارے فقہائے کرام نے اس مقام پر بہت عجیب وغریب صورتیں پیدا کی ہیں، جنہیں ہم نے دانستہ نظر انداز کر دیا۔

سوال ہم نے سنا ہے کہ وضو کے بعد درود بیٹھ کر پڑھنا چاہیے، چلتے ہوئے پڑھنے سے جوڑوں میں درد ہو جاتا ہے کیا یہ صحیح بات ہے؟ (غلام اللہ۔ شاہدرہ)

جواب وضو کے بعد جو مسنون دعائیں پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے ان میں سرے سے درود شامل نہیں ہے، ویسے درود پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، البتہ اس کے لیے اپنی طرف سے کوئی ہیئت یا وضو کے بعد کی شرط عائد کرنا ناروا پابندی اور خود ساختہ طریقہ ہے، اس لیے بیٹھ کر وضو کرنے کے بعد بیٹھ کر درود پڑھیں یا کھڑے ہو کر اس میں کوئی حرج نہیں، نیز چلتے ہوئے پڑھنے سے جوڑوں میں درد والی بات بھی ایجاد شدہ ہے شریعت میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

سوال وضو کرنے کے بعد یا دوران نماز اگر جسم کے کسی حصہ سے خون نکل آئے تو کیا وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد ایسے آثار نقل کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وضو کے بعد اگر جسم کے کسی حصہ سے خون نکل آتا ہے تو وضو برقرار رہتا ہے اور اس سے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔

سوال غسل جنابت کے وضو سے نماز پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز غسل جنابت میں پاؤں کیسے دھوئے جائیں؟

جواب اگر دوران غسل کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا جس سے وضو ٹوٹ جائے تو اس وضو سے نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (غسل کے وقت) پہلے نماز کے وضو کی طرح وضو کیا لیکن پاؤں نہیں دھوئے۔ البتہ اپنی شرمگاہ اور جلد پر لگی آلائش کو دھویا پھر تمام جسم پر پانی بہایا۔ اس کے بعد جائے غسل سے الگ ہو کر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔ آپ کا غسل جنابت یہی تھا۔'' [صحیح بخاری: الغسل' ۲۴۹]

سوال جسم کے کس کس حصے کے بال صاف کئے جائیں نیز زیر ناف بالوں کو کتنے دنوں بعد صاف کرنا چاہیے۔

جواب بغلوں کے بال صاف کرنا اور اسی طرح زیر ناف بالوں کو اتارنا امور فطرت سے ہے۔ [صحیح بخاری: الاستیذان' ۶۲۹۷]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس قسم کے بالوں کو صاف کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چالیس دن کی مدت مقرر

ہے۔لہٰذا چالیس دن سے پہلے پہلے ان کی صفائی ضروری ہے۔ [نسائی:الطہارۃ'۱۴]

سوال نصیر آباد سے عبدالرحمٰن کھوسہ لکھتے ہیں کہ اگر کپڑوں کو شیر خوار بچے کا پیشاب لگ جائے تو کیا کرنا چاہیے؟ کیا انہی کپڑوں میں دھوئے بغیر نماز ہوسکتی ہے؟

جواب پیشاب پلید ہے خواہ شیر خوار بچے کا ہو یا بالغ مرد کا البتہ شریعت نے جس کپڑے کو پیشاب لگ جائے اس کے پاک کرنے کے متعلق شیر خوار بچے اور بچی کے پیشاب میں فرق ضرور رکھا ہے۔ بچے کے متعلق حکم یہ ہے کہ اس پر چھینٹے مارے جائیں۔ اسے دھویا نہ جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ام قیس رضی اللہ عنہا اپنے چھوٹے شیر خوار بچے کو جو کھانا نہیں کھاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گود میں بٹھالیا، بچے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے پر پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوا کر کپڑے پر چھینٹے مارے، اسے دھویا نہیں۔

بچی کے پیشاب کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ اسے دھویا جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: حضرت لبابہ بنت حارث رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پیشاب کر دیا (جو ابھی شیر خوار تھے) میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کوئی کپڑا پہن لیں اور تہ بند مجھے دے دیں تا کہ اسے دھو دوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے اور لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جاتے ہیں۔'' [ابن ماجہ:الطہارۃ'۵۲۲]

لڑکے اور لڑکی کے پیشاب میں تفریق کی حکمت حدیث میں بیان نہیں ہوئی۔ البتہ محدثین بیان کرتے ہیں کہ لڑکے کو اٹھانے والے اقارب اور اجانب سب ہوتے ہیں۔ اس لیے اس میں کچھ تخفیف ہے۔ جبکہ لڑکی کو اٹھانے والے صرف والدین یا اس کے بہن بھائی ہوتے ہیں اس لیے اصل حکم باقی رکھا گیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال احادیث میں ہے کہ نماز کی فرضیت شب معراج میں ہوئی جبکہ وضو سے متعلق آیت کا نزول مدینہ میں ہوا ہے یعنی سورۃ مائدہ میں آیت وضو ہے اور یہ سورت مدنی ہے۔ اب وضاحت طلب مسئلہ یہ ہے کہ نزول سورۃ مائدہ سے پہلے وضو کیسے کیا جاتا تھا؟ (حبیب گل ضلع صوابی)

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فرضیت نماز معراج کی رات ہوئی ہے جیسا کہ کتب حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے اور یہ امر بھی شکوک وشبہات سے بالاتر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نماز بھی وضو کے بغیر ادا نہیں کی چنانچہ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے: [الاتقان ص۳۶ ج۱]

اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب پہلے پہلے فرشتہ وحی لے کر آیا تو اس نے آپ کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھایا۔'' [مسند امام احمد: ج۴' ص۱۶۱]

سورۃ مائدہ میں جو آیت وضو ہے وہ اسی حکم کی تائید میں نازل ہوئی ہے جو بہت پہلے بذریعہ وحی خفی نزول ہو چکا تھا۔ گویا یہ ایک ایسا حکم ہے جس پر عمل پہلے ہوا اور قرآن مجید میں اس کا نزول بطور تائید بعد میں ہوا ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الاتقان میں اس کی مثالیں بھی دی ہیں جیسا کہ جمعہ کی فرضیت مکہ مکرمہ میں ہو چکی تھی اور اسی حکم کے پیش نظر حضرت اسعد بن

زرارہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں جمعہ کا اہتمام کر رکھا تھا۔لیکن جمعہ سے متعلقہ آیات کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا جو کہ بطور تائید تھا۔تفصیل کے لیےالاتقان کی بارہویں قسم کا مطالعہ مفید رہے گا۔حاصل کلام یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وضو کا طریقہ فرضیت نماز کے وقت ہی بتادیا گیا تھااور آپ اس پر طریقہ کے مطابق وضو کر کے نماز ادا کرتے تھے اور سورت مائدہ کی وضو سے متعلقہ آیات اسی حکم کی تائید کے لیے ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بورے والا سے شوکت علی لکھتے ہیں کہ مجھے بار بار پیشاب آنے اور ریح خارج ہونے کا مرض لاحق ہے،اس کے علاوہ پیشاب کے بعد قطرے آنے کی بھی شکایت ہے،دوران نماز بھی بعض اوقات یہ عمل جاری رہتا ہے اس لیے میں شلوار یا چادر کے نیچے جانگیہ پہنتا ہوں،ایسے حالات میں مجھے نماز کے لیے کیا کرنا چاہیے۔کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی کریں۔

جواب جس شخص کو بار بار پیشاب آنے یا ریح خارج ہونے کا مستقل عارضہ لاحق ہو اس کے متعلق محدثین کا یہ موقف ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے اور اس وضو سے ایک فریضہ خواہ ادا ہو یا قضا نماز پڑھ سکتا ہے۔اس نماز کی سنتیں وغیرہ بھی اسی وضو سے ادا کی جاسکتی ہیں۔اس موقف کی بنیاد حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک دفعہ شکایت کی کہ مجھے کثرت سے خون آتا ہے اور کسی وقت اس کی بندش نہیں ہوتی ایسے حالات میں کیا مجھے نماز چھوڑ دینے کی اجازت ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:"کہ یہ خون حیض کا نہیں ہے جس کی وجہ سے نماز ترک کر دی جائے بلکہ یہ ایک بیماری کی وجہ سے رگ خون بہہ پڑتی ہے،مخصوص ایام میں تو نماز ترک کی جاسکتی ہے،اگر خون بدستور جاری رہے تو غسل کر کے نماز ادا کرنا ہوگی،جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ہوگا حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر تجھے ہر نماز کے لیے وضو کرنا ہوگا۔"

[صحیح بخاری:الوضوء،۲۲۸]

استحاضہ کے خون کا حکم بے وضو ہونے کی طرح ہے کہ مستحاضہ ہر نماز کے لیے وضو کرے گی لیکن وہ اس وضو سے صرف ایک فریضہ ادا کرسکتی ہے۔ [فتح الباری:ج۱،ص۴۰۹]

اس پر قیاس کرتے ہوئے جس مریض کو بار بار پیشاب آنے یا ریح خارج ہونے کی شکایت ہے اسے چاہیے کہ وہ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرے،اگر دوران نماز قطرے آنے کا اندیشہ ہو تو جانگیہ نہ اتارے،اگر نماز میں قطرہ آنے کا خطرہ نہ ہو تو جانگیہ اتار کر نماز ادا کی جائے۔بہر حال اس کے لیے علاج جاری رکھنا انتہائی ضروری ہے۔




اذان ونماز

اذان ونماز

سوال قرآن وحدیث کی روشنی میں نمازوں کے اوقات کی وضاحت کریں۔ [محمد ادریس، رحیم یار خان]

جواب نمازوں کو ان کے اوقات پر ادا کرنا نہایت ضروری ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ نماز اس کے وقت کی پابندی کے ساتھ اہل ایمان پر فرض کی گئی ہے۔'' [۴/النساء:۱۰۳]

اوقات نماز کے متعلق صحیح ترین روایت حسب ذیل ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اٹھیے اور نماز ادا کیجیے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سورج ڈھلنے لگا، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام بوقت عصر آئے اور کہا: اٹھیے نماز ادا کیجیے پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نماز عصر اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل تک ہو چکا تھا۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام مغرب کے وقت آئے اور کہا: اٹھیے نماز ادا کیجیے، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نماز مغرب اس وقت پڑھائی جب کہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام عشاء کے وقت آئے اور آپ سے کہا: اٹھیے نماز ادا کیجیے پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عشاء کی نماز اس وقت پڑھائی جب سرخی غائب ہو چکی تھی، پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام بوقت فجر آئے اور اس وقت نماز پڑھائی جب فجر طلوع ہو چکی تھی۔ پھر اگلے دن ظہر کے لیے آئے اور کہا: اٹھیے نماز ادا کیجیے پھر ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہو چکا تھا پھر عصر کے وقت آئے اور کہا: اٹھیے نماز ادا کیجیے پھر نماز عصر اس وقت پڑھائی جب ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو چکا تھا۔ پھر مغرب کے لیے سورج غروب ہونے کے وقت ہی آئے پھر عشاء کے لیے آپ کے پاس اس وقت آئے جب نصف یا تہائی رات گزر چکی تھی۔ اس وقت نماز عشاء پڑھائی پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اس وقت آئے جب فجر خوب روشن ہو چکی تھی اور سفیدی پھیل چکی تھی اس وقت جبرائیل علیہ السلام نے نماز فجر پڑھائی اور کہا کہ ان دونوں اوقات کے درمیان نمازوں کا وقت ہے۔ [مسند امام احمد:۳۳۰/۲]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث اوقات نماز کے سلسلہ میں صحیح ترین حدیث ہے۔ [سنن الترمذی: کتاب المواقیت]

اس حدیث سے درج ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

① نمازوں کے اوقات کا تعلق سورج سے ہے۔

② ظہر کا وقت زوال آفتاب سے لے کر کسی چیز کا سایہ اس کے برابر ہونے تک ہے۔

③ عصر کا وقت سایہ ایک مثل ہونے سے لے کر دو گنا ہونے تک ہے۔

④ مغرب کا وقت تنگ اور محدود ہے سورج غروب ہونے پر ہے زیادہ سے زیادہ سرخی غائب ہونے تک ہے۔

⑤ عشاء کا وقت سرخی غائب ہونے سے لے کر نصف یا تہائی رات تک ہے۔

⑥ نماز فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر سورج نکلنے سے پیشتر سفیدی پوری طرح پھیل جانے تک ہے۔

جمعہ کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔ نیز آپ جمعہ کی نماز سردیوں میں جلدی پڑھتے اور سخت گرمی میں دیر سے ادا کرتے۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۹۰۶]

اوقات نماز کے متعلق مزید چند امور کا خیال رکھنا چاہیے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''گرمی کے موسم میں نماز ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرو۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۳۸]

اب اس کو ٹھنڈا کرنے کی کیا حد ہے۔ اس میں اختلاف ہے البتہ اس بات پر اتفاق ہے کہ اتنا بھی ٹھنڈا نہ کیا جائے کہ عصر کا وقت آجائے۔

☆ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز غروب شفق (سرخی) کے بعد پڑھاتے اگر لوگ جلد جمع ہو جاتے تو جلد پڑھا دیتے اور اگر دیر سے جمع ہوتے تو دیر سے پڑھاتے۔ لیکن اس نماز میں تاخیر کو پسند کرتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ نماز عشاء اس وقت پڑھائی جب رات کا کافی حصہ گزر چکا تھا۔ پھر فرمایا: ''اگر میری امت پر گراں نہ ہوتا تو عشاء کا اصل وقت تو یہی ہے۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۷]

☆ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز اس وقت پڑھاتے جبکہ نماز سے فراغت کے بعد بھی اندھیرا ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے۔ کہ ہم عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی جب نماز سے فارغ ہو کر نکلتیں تو اندھیرے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پہچان نہ سکتی تھیں۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۷۸]

☆ نماز عیدین کا مسنون وقت سورج کے نیزہ بھر بلند ہونے پر ہے۔ یعنی طلوع آفتاب سے تقریباً نصف گھنٹہ بعد شروع ہو جاتا ہے۔ ضرورت کے پیش نظر اس میں تاخیر کی جا سکتی ہے۔

☆ بعض فقہا کے نزدیک زوال سے پہلے جمعہ جائز ہے لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ جمعہ زوال آفتاب کے بعد ہونا چاہیے۔

☆ آج کل گھڑیوں کا دور ہے اس لیے گھنٹوں اور منٹوں کے اعتبار سے اوقات کی تعیین حسب ذیل ہے:

① نماز فجر کا آغاز طلوع فجر سے تقریباً بیس منٹ بعد ادا کرنا افضل ہے۔ واضح رہے کہ طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک تقریباً ۳۰/ا گھنٹہ تک کا وقفہ ہوتا ہے۔

② نماز ظہر زوال آفتاب سے تقریباً بیس منٹ بعد ادا کرنا افضل ہے لیکن سخت گرمی میں ایک گھنٹہ سے ڈیڑھ گھنٹہ تک تاخیر کی جا سکتی ہے۔

③ نماز عصر موسم سرما میں غروب آفتاب سے دو گھنٹے اور موسم گرما میں اڑھائی گھنٹے قبل ادا کرنا افضل ہے۔

④ نماز مغرب کا وقت بہت محدود ہے یہ غروب آفتاب کے بعد نصف گھنٹہ تک ہے۔

⑤ عشاء کا وقت غروب شفق کے بعد شروع ہوتا ہے اور غروب شفق کا وقت غروب آفتاب سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک ہوتا ہے۔ اس لیے مغرب اور عشاء کی نماز میں کم از کم دو گھنٹے کا وقفہ ہونا چاہیے۔ نماز عشاء میں اگر مزید تاخیر کی جا سکے تو بہتر ہے۔

[نوٹ: نماز عشاء کے علاوہ تمام نمازیں اول وقت میں ادا کی جائیں کیوں کہ ایسا کرنا رضائے الٰہی کا باعث ہے]

سوال سمندری سے صوفی محمد اقبال لکھتے ہیں کہ کسی سرکاری جگہ پر حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ایسی مسجد میں نماز ہو جاتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب عامۃ الناس کے لیے جو مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، ان کا وقف ہونا ضروری ہے۔ تاکہ تعمیر مسجد کے بعد کسی کو ذاتی تصرف کا حق نہ ہو، اس بنا پر سرکاری زمین پر حکومت کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کرنا شرعاً درست نہیں ہے، کسی کی مملوکہ زمین پر مسجد تعمیر کرنا یا اسے توسیع مسجد میں شامل کرنا اس بات پر موقوف ہے کہ مالک زمین سے اس کے متعلق صریح اجازت حاصل کر لی جائے، جبکہ سرکاری زمین پر بلا اجازت حکومت مسجد بنانے سے زمین بدستور حکومت کی ملکیت رہتی ہے اور حکومت کو اس میں تصرف کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے جو تعمیر مساجد کی اغراض ومقاصد کے منافی ہے، بلا اجازت مسجد تعمیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تعمیر کنندگان حکومتی اختیارات وتصرفات میں دخل اندازی کا ارتکاب کرتے ہیں جو شرعاً، اخلاقاً اور قانوناً کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ خاص طور پر اس پرفتن دور میں جبکہ بعض مقامات پر محض کاروباری نقطۂ نظر سے مساجد تعمیر ہو رہی ہیں، جہاں موقع ملا وہاں مسجد تعمیر کر ڈالی خواہ اس کی وہاں ضرورت ہی نہ ہو، جیسا کہ عام طور گزرگاہوں، چوراہوں اور سڑکوں کے کناروں پر ہو رہا ہے، ایسا کرنے سے حکومت کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے، اگر حکومت نے اپنی کسی اسکیم میں کوئی قطعہ اراضی مسجد کے لیے چھوڑ رکھا ہے تو بھی تعمیر کے لیے حکومت سے اجازت نامہ ضروری ہے تاکہ وہاں باہمی جدال واختلاف اور نفرت وکدورت کا دروازہ نہ کھلے۔ اگر کسی کی مملوکہ زمین پر مالک کی اجازت کے بغیر مسجد تعمیر کر لی جائے تو وہاں نماز پڑھنے سے فرض تو ساقط ہو جائے گا لیکن اللہ کے ہاں اس کے اجر وثواب کی امید نہیں کی جا سکتی، اس لیے ضروری ہے کہ تعمیر مسجد سے پہلے مالک سے اجازت حاصل کر لی جائے، خواہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت ہو یا سرکاری زمین ہو۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو سب سے پہلے تعمیر مسجد کا ارادہ کیا، اس کے لیے جس جگہ کا انتخاب ہوا وہ قبیلہ بنو نجار کے لوگوں کی ملکیت تھی۔ آپ ﷺ نے انہیں بلا کر اس قطعہ اراضی کی قیمت ادا کرنے کے متعلق پیش کش فرمائی۔ لیکن انہوں نے قیمت لینے کی بجائے اپنی خوشی سے فی سبیل اللہ وقف کر دی، اس کے بعد آپ نے وہاں مسجد تعمیر کی۔ اس لیے مسجد کے لیے زمین کا وقف ہونا ضروری ہے۔

سوال لاہور سے سعید ساجد لکھتے ہیں کہ پارکوں اور دوسرے پبلک مقامات پر قبضہ کے انداز میں مساجد اور مدارس تعمیر کرنا پھر ان مساجد میں نماز ادا کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے پیش نظر اس امت کے لیے تمام روئے زمین کو مسجد قرار دیا گیا ہے چند مخصوص مقامات کے علاوہ ہر جگہ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۳۳۵]

لیکن کسی قطعہ ارضی کو شرعی مسجد قرار دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ جگہ وقف تام ہو اور وقف کرنے سے پہلے وقف کنندہ اس کا مالک ہو، صورت مسؤلہ میں پارک اور پبلک مقامات حکومت کی ملکیت ہیں ایسے مقامات پر شرعی مسجد کے لیے دو صورتیں ہیں:

① حکومت وقف پارک یا پبلک مقامات کے کسی حصہ کو مسجد کے لیے وقف کر دے۔

② اگر قبضہ کے انداز میں مسجد بنائی گئی ہے۔تو حکومت قانونی طور پر اسے تسلیم کرکے اسے مالکانہ حقوق دے دے۔لیکن جس مقام پر غاصبانہ قبضہ ہو۔تو عدمِ صحت وقف کی وجہ سے اس پر بنائی ہوئی مسجد شرعی مسجد نہیں ہوگی۔ایسی مساجد کی انتظامیہ کو چاہیے کہ حکومت سے معاملات طے کرکے اس کی قیمت ادا کرے۔یا حکومت سے باضابطہ اجازت نامہ حاصل کرے۔بصورت دیگر حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسی جگہ کو منہدم کرکے اس جگہ کو کسی اور مصرف میں استعمال کرے۔کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب مسجد بنانے کا پروگرام بنایا۔تو آپ نے بنونجار کو قیمت ادا کرنے کی پیش کش فرمائی۔واضح رہے کہ ایسی مسجد میں نمازیوں کو نماز پڑھنے کا پورا ثواب ملتا ہے۔جو شرعی طور پر مساجد ہوں اور وہاں کوئی شرعی رکاوٹ نہ ہو۔شرعی رکاوٹیں حسب ذیل ہیں۔

① مال حرام سے مسجد تعمیر کی گئی ہو۔

② غصب شدہ زمین پر مسجد کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا ہو۔

③ مشترکہ قطعہ ارضی کو بلا اجازت شریک ثانی مسجد کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔

④ فخر ومباہات اور شہرت وریا کے پیش نظر مسجد بنائی گئی ہو۔

⑤ ضرر رسانی،ضد،ہٹ دھرمی اور پہلی مسجد کی مخالفت کی وجہ سے مسجد تعمیر کی گئی ہو۔

اگر مسجد کی تعمیر میں مندرجہ بالا امور میں سے کوئی ایک بھی پایا گیا تو ایسی مسجد شرعی مسجد نہیں ہے اگر کوئی مسجد ان امور سے مبرا ہو اور خالص لوجہ اللہ وقف تام مقام پر تعمیر کی گئی ہو بلا شبہ مسجد شرعی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال دفتر اہلحدیث لاہور کے حافظ محمد عثمان مدنی لکھتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی زندگی میں تقریباً دو کنال قطعہ ارضی زبانی طور پر مسجد کے لیے وقف کیا لیکن قانونی طور پر وقف نامہ لکھنے سے پہلے وہ فوت ہوگیا،اس کے بیٹے نے وہ موقوفہ زمین کسی دوسرے شخص کو فروخت کردی،اس کی قیمت وصول کرکے خریدار کے نام رجسٹری کرادی،اب مسجد کی انتظامیہ اور خریدار کا باہمی تنازعہ پیدا ہوا،مسجد والے کہتے ہیں کہ فروخت کردہ زمین مسجد کے لیے وقف ہے جب کہ خریدار کا دعویٰ ہے کہ میں نے اسے رقم صرف کرکے خریدا ہے اور میرے نام رجسٹری ہے۔پنچائتی فیصلہ یہ ہوا کہ خریدار،مسجد کو موجودہ زمین سے نو مرلے دے گا اور وضو خانہ وباتھ وغیرہ بھی تعمیر کرادے گا،فریقین اس پر راضی ہوگئے اور اس پر عمل درآمد بھی کرادیا گیا،اب مسجد کی انتظامیہ کے بعض افراد پھر مطالبہ کر رہے ہیں کہ مسجد کو دو کنال قطعہ ارضی ملنا چاہیے جبکہ خریدار کہتا ہے کہ یہ سراسر زیادتی اور حق تلفی ہے۔وضاحت فرمائیں کہ اس تنازعہ میں زیادتی کا مرتکب کون اور حق بجانب کون ہے؟

جواب واضح رہے کہ کسی قیمتی چیز کو اللہ کی ملک میں مقید کردینا اور اس کے منافع کو دوسروں پر نیک نیتی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے صدقہ کردینے کا صاف اور صریح اظہار وقف کہلاتا ہے وقف کے لیے شرعی طور پر کسی تحریری دستاویز کی ضرورت نہیں ہے،کسی جائیداد کے بطور وقف استعمال سے بھی اس کا وقف ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے۔البتہ از روئے قانون وقف کا تحریری ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔وقف کے جواز کے لیے حسب ذیل شرائط کا ہونا لازمی ہے۔

☆ وقف کنندہ عاقل، بالغ اور آزاد ہو۔

☆ وقف کے وقت شئی موقوفہ کا مالک ہو۔

☆ وقف کردہ چیز ہر قسم کے بار کفالت سے مبرا ہو۔

☆ وقف کردہ چیز کو موقوف علیہ کے حوالے کرنے پر قادر ہو۔

☆ وقف کا اعلان نیک نیتی اور حقیقی ارادے کے ساتھ ہو، اس میں کسی وارث کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔

جب ان شرائط کے مطابق وقف مکمل ہو جائے تو پھر وقف شدہ چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے نہ تو فروخت کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور کو ھبہ یا وراثت میں دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ [صحیح بخاری:۲۷۳۷]

اس طرح وقف کے بعد اگر کوئی وارث وقف شدہ چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے فروخت کرتا ہے تو اس فروختگی کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا کیوں کہ حدیث کے مطابق یہ ظالمانہ تصرف ہے جسے شریعت نے غیر معتبر ٹھہرایا ہے۔ [صحیح بخاری: المزارع ۲۳۳۵]

حدیث میں اس قسم کے تصرف کو عرق ظالم سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کی وضاحت راوی حدیث حضرت ہشام رضی اللہ عنہ نے بایں الفاظ کی ہے کہ آدمی کسی دوسرے کی زمین میں ناجائز تصرف کر کے اس کا مالک بن بیٹھے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر یوں کی کہ حق کے بغیر کسی قسم کا استفادہ کرنا عرق ظالم ہے۔ [ابوداود: الامارۃ ۳۰۷۸]

صورت مسئولہ میں ازروئے قانون وقف کی شرائط کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور نہ ہی وقف کرتے وقت اپنی اولاد کو اعتماد میں لیا گیا ہے، وقف کنندہ کو چاہیے تھا کہ وہ قطعہ ارضی مسجد کی انتظامیہ کے حوالے کر دیتا یا پھر اس کے قانونی تقاضے پورے کر کے مسجد کے نام رجسٹری کرا دیتا یا کم از کم اپنی اولاد کو اس سے آگاہ کر کے انہیں اعتماد میں لے لیتا، تاہم اس کے بیٹے نے زبانی وقف شدہ ارضی کو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر آگے فروخت کر دیا اور اس کی رقم وصول کر کے اس قطعہ ارضی کو خریدار کے نام رجسٹری بھی کرا دی ہے، اس میں خریدار کا کوئی قصور نہیں ہے، لیکن انتظامیہ مسجد کے تنازعہ کے پیش نظر پنچایتی فیصلہ ہوا کہ خریدار اس قطعہ ارضی سے نو مرلے زمین مسجد کو دے گا اور اس پر وضو خانہ اور باتھ وغیرہ تعمیر کرائے گا اور فریقین نے نہ صرف اس فیصلہ کو قبول کیا بلکہ حسب وضاحت بالا اس پر عمل درآمد بھی ہو گیا، اب انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ دوبارہ اس تنازعہ کو نہ اٹھائیں بلکہ اس فیصلہ کو قبول کر کے باہمی اتفاق و یگانگت کی فضا پیدا کریں، حدیث میں ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طے شدہ شرائط کی پاسداری کرنا چاہیے۔ اس بنا پر اہل مسجد، اب مسجد کی آبادی کے لیے خلوص کے ساتھ کوشش کریں اور اس قسم کے تنازعات سے باہمی نفرت کی فضا پیدا نہ کریں۔ هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

سوال پیر محل سے حافظ عبداللطیف لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک مسجد تقریباً ۳۰ سال قبل تعمیر ہوئی تھی۔ مسجد کے پلاٹ کی جب بولی ہوئی تو اس وقت تین جماعتی احباب پیش پیش تھے۔ ان میں عبدالغنی جٹ کے نام مسجد کا پلاٹ الاٹ کیا گیا تھا۔ پلاٹ چونکہ وقف نہ تھا۔ اس لیے عبدالغنی کی وفات کے بعد اس کی اولاد کے نام منتقل ہو گیا۔ اب جن کے نام انتقال ہوا ہے۔ ان میں سے

کچھ حضرات نے اس سابقہ مسجد اہلحدیث کو از سر نو تعمیر کیا ہے لیکن وقف نہ ہونے کی وجہ سے جماعتی احباب شدید اختلاف کا شکار ہیں، اکثریت کا موقف ہے کہ مسجد مذکورہ جماعت اہلحدیث کے نام وقف ہونی چاہیے۔ جبکہ عبدالغنی کی اولاد اس کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس مسجد میں نماز ہو جاتی ہے؟ نیز مسجد مذکور کا جماعت اہل حدیث کے نام وقف ہونا ضروری ہے۔

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ خاصہ ہے کہ آپ کے لیے روئے زمین کو مسجد قرار دیا گیا ہے، آپ کے لیے یہ اعزاز ہے کہ جہاں کہیں اسے نماز کا وقت ہو جائے وہیں نماز پڑھ لو۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۳۳۵]

اس عمومی خصوصیت کے علاوہ مساجد کی دو اقسام ہیں: ایک یہ کہ گھر یا کھیت یا فیکٹری کے کسی حصہ میں مسجد بنالی جائے اور وہاں نماز پڑھالی جائے، اس قسم کی مسجد کے لیے جملہ لوازمات از قسم اذان، جماعت اور جمعہ وغیرہ کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی تھی کہ آپ کسی وقت میرے گھر آکر نماز پڑھیں تاکہ ہم اہل خانہ اس جگہ کو جائے نماز بنالیں اور بوقت ضرورت وہاں نماز پڑھ لیا کریں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خواہش کے پیش نظر ایک مرتبہ گھر کے ایک مقام پر دو رکعت ادا کیں۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۴۲۵]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ گھروں میں مسجد بنانا مشروع ہے، اس قسم کی مسجد کا وقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس گھر میں اس طرح کی مسجد ہو اسے فروخت کیا جا سکتا ہے اور وہ بطور وراثت تقسیم بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ مسجد کو اس کے آداب و لوازمات کے ساتھ تعمیر کرنا اس میں نماز، جماعت اور جمعہ کا اہتمام ہو اور بوقت نماز ہر کلمہ گو مسلمان کو اس میں نماز ادا کرنے کی آزادی ہو، اس قسم کی مسجد کا وقف ہونا ضروری ہے تاکہ کوئی بھی نمازیوں کے لیے نماز کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر بنانے کو ترجیح دی اور اس کے لیے ایک جگہ کا انتخاب فرمایا اور اس جگہ کے مالکان بنو نجار سے کہا کہ تم اس جگہ کی قیمت وصول کر کے اسے ہر قسم کے بار ملکیت سے مبرا کر دو۔ انہوں نے بڑی فراخ دلی سے کہا کہ ہم اس کی قیمت اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی صورت میں وصول کریں گے، اس طرح جب وہ وقف ہو گئی تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں مسجد تعمیر کی۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۴۲۸]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''مسجد کے لیے زمین وقف کرنے کا بیان''۔ اس کے علاوہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''کہ اس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ کی مساجد میں اس کا ذکر کرنے سے لوگوں کو روکتا ہے۔'' [۲/البقرۃ:۱۱۴]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسجد ایک وقف عام چیز ہے، اس سے کسی کو منع نہیں کیا جا سکتا، بصورت دیگر روکنے والا بہت بڑا ظالم ہو گا اور یہ ظاہر بات ہے کہ اگر مسجد پر کسی کا قبضہ یا وہ کسی کی ملکیت ہو تو اسے اپنے تصرف و اختیار کے پیش نظر اس سے روک سکتا ہے۔ کیونکہ ملک سے مقصود تصرف و اختیار کا استعمال ہوتا ہے، خواہ وہ دوسروں کو روکے یا اسے فروخت کرے یا ہبہ کرے۔ صورت مسئولہ میں اس قسم کی صورت حال درپیش ہے کہ مرحوم عبدالغنی کے نام مسجد کا پلاٹ الاٹ ہوا، اس نے وقف نہ کیا، چنانچہ اس کی

وفات کے بعد وہ پلاٹ خود بخود اس کی اولاد کے نام انتقال ہوگیا، جو جماعت کے لیے اختلاف وانتشار کا باعث ہے۔لہٰذا پسماندگان کو چاہیے کہ وہ پلاٹ مسجد کے نام وقف کریں اور وقف میں لفظ اہلحدیث ضرور ذکر کریں۔ پھر اس کا انتظام خود کریں یا جماعت کے حوالے کر دیں اس میں انہیں اختیار ہے۔لیکن وہ اس جگہ کو اپنی ملکیت میں رکھنے کے مجاز نہیں ہیں، اگر وہ اس جگہ کو وقف نہ کریں تو مصلحتاً اس میں نماز ادا کرنا ترک کیا جاسکتا ہے،لیکن جماعت کے لیے یہ اصرار درست نہیں کہ وہ انجمن کے نام وقف کریں،لہٰذا ہم فریقین سے عرض کرتے ہیں کہ وہ آپس میں سر جوڑ کر مسجد کی آبادی کے متعلق غور وفکر کریں،اس کی بربادی کا ذریعہ بن کر دوسروں کے لیے جگ ہنسائی کا سامان پیدا نہ کریں۔ [هذا ما عندي والله اعلم بالصواب]

سوال ماسٹر صدیق صاحب کالا باغ ضلع ایبٹ آباد سے دریافت کرتے ہیں کہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی مسجد کو کسی دوسری جگہ منتقل کرکے پہلی جگہ پر دوکان تعمیر کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب مساجد کو بلا وجہ دوسری جگہ منتقل نہیں کرنا چاہیے ہاں اگر پہلی مسجد بے آباد ہو جائے یا اس سے وہ مقاصد پورے نہ ہو رہے ہوں جو تعمیر کے پیش نظر ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں ایک مسجد کو دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے اس صورت میں پہلی مسجد کا ساز وسامان دوسری مسجد میں استعمال کیا جائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی ایک پرانی مسجد کو دوسری جگہ منتقل کر دیا تھا اور پہلی مسجد کی جگہ کھجوروں کی منڈی بنادی تھی۔امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتویٰ میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ [۳۱/۲۶۵]

سڑک کے کنارے بنی ہوئی مسجد کو اگر کسی دکان وغیرہ کی صورت میں تبدیل کرنا ہو تو اس کا کرایہ یا آمدن دوسری مسجد پر صرف ہونی چاہیے۔

سوال ماسٹر صدیق صاحب کالا باغ ضلع ایبٹ آباد سے دریافت کرتے ہیں کہ کسی مسجد کا منبر جو لکڑی کا ہے اگر اس کی ضرورت نہ رہے کیا اس لکڑی کو مسجد ہی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے؟

جواب مسجد کا منبر اگر بے کار ہو جائے مثلاً پہلا لکڑی کا تھا اب وہاں پختہ اینٹوں سے منبر بنالیا گیا ہے تو لکڑی کے منبر کو کسی دوسری مسجد میں رکھ دیا جائے جہاں اس کی ضرورت ہو۔

سوال ماسٹر صدیق صاحب کالا باغ ضلع ایبٹ آباد سے دریافت کرتے ہیں کہ قبرستان کے قریب بنی ہوئی مسجد میں نماز ادا کرنا کیسا ہے؟

جواب قبرستان کے اندر مسجد بنانا یا قبرستان میں نماز ادا کرنا شرعاً ممنوع ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔البتہ قبرستان کے قریب جوار میں اگر کوئی مسجد ہے تو ایسی مسجد میں نماز ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں نیز اگر مسجد کو وسیع کرتے ہوئے کچھ قبریں مسجد کے صحن میں آجائیں جبکہ پہلے وہ مسجد کے باہر تھیں ایسے حالات میں بھی ان شاء اللہ مسجد میں نماز ادا کی جاسکتی ہے بشرطیکہ قبریں قبلہ کی جانب نہ ہوں۔ [واللہ اعلم]

سوال شہداد پور سے محمد رفیع لکھتے ہیں کہ مساجد کو نقش ونگار سے مزین کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے، نیز مسجد کے بلند وبالا

مینار بنانے پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے کیا یہ بہتر نہیں کہ ایسے مصارف پر خرچ ہونے والی رقم کسی مستحق غریب جماعت یا کسی دینی ادارہ کو دے دی جائے۔

جواب مساجد میں اس طرح کی مینا کاری اور نقش ونگار کرنا جو نماز پڑھتے وقت نمازی کے لیے باعث تکدر وخلجان ہو شرعاً درست نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسی اشیاء کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جو نماز پڑھتے وقت نمازی کی توجہ دوسری طرف لگا دیتی ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایک دفعہ بیل بوٹے دار چادر میں نماز ادا کی اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے واپس کردو اس نے مجھے نماز سے غافل کر دیا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ]

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ ہر وہ چیز جو نمازی کے لیے دوران نماز بے توجہی کا باعث ہو مکروہ ہے۔ اس میں نقش ونگار اور اس طرح کی دیگر اشیاء شامل ہیں۔'' [فتح الباری: ۱/۴۸۳]

مساجد کی بایں انداز زیب وزینت اور نقش ونگار کے متعلق کئی ایک احادیث مروی ہیں۔ جن میں رسول اللہ ﷺ نے اسے علامات قیامت میں شمار کرتے ہوئے اس سے منع فرمایا ہے۔ خاص طور پر جب یہ چیزیں فخر ومباہات کا ذریعہ بن جائیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں مساجد کو چونا گچ یا انہیں نقش ونگار سے آراستہ کروں لیکن تم اپنی مساجد کو یہود ونصاریٰ کی طرح خوب مینار کاری سے آراستہ کرو گے''۔ [صحیح ابن حبان: ۴/۷۰]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگوں پر ایک وقت آئے گا کہ وہ اپنی مساجد کو فخر ومباہات کا ذریعہ بنائیں گے۔ اور رشد وہدایت کے سامان سے انہیں آراستہ نہیں کریں گے۔ اس کی طرف بہت کم توجہ ہو گی''۔ [صحیح بخاری تعلیقاً]

پھر آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ لوگ اپنی مساجد کو خوبصورتی اور بلندی میں ایک دوسرے پر فخر کرنے کا ذریعہ بنائیں۔ [صحیح ابن حبان: ۴/۷۰]

آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں یہاں تک فرمایا: ''کہ جو قوم بدعملی کا شکار ہو جاتی ہے وہ اپنی مساجد کو نقش ونگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا شروع کر دیتی ہے۔'' (ابن ماجہ، کتاب المساجد) یہ روایت اگرچہ سند کے لحاظ سے ضعیف ہے تاہم اس قسم کی روایات کو تائید واستشہاد کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا احادیث کے پیش نظر مساجد میں نقش ونگار کو مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کے ستون کھجور ہی کے تنے تھے۔ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی سادگی کو برقرار رکھا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں بہت فتوحات ہوئیں لیکن انہوں نے مسجد کے نقش ونگار کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ البتہ لکڑیاں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے عمارت کی تجدید کر دی اور اس میں کسی قسم کا اضافہ نہ کیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی نقش ونگار کے بغیر ہی اسے پختہ کر دیا۔ اس پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر لوگوں نے اعتراض کیا جیسا کہ بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ، باب من بنی مسجداً]

مسلم کی روایت میں صراحت ہے کہ ولید بن عبد الملک وہ پہلا شخص ہے جس نے مسجد نبوی کو نقش ونگار سے خوب مزین اور

آراستہ کیا۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت فتنہ وفساد کے اندیشہ کے پیش نظر خاموش رہی۔(فتح الباری)۔البتہ مسجد تعمیر کرتے وقت محل وقوع کا اعتبار ضروری کرنا ہوگا۔جس مقام پر لوگ بہترین کوٹھیوں میں رہتے ہوں وہاں مسجد بھی اسی شان کی ہونی چاہیے۔ایسے مقام پر مسجد کو جدید سہولیات سے مزین کرنا باعث اجر وثواب ہوگا۔اسی طرح مینار بنانا مسجد کی ایک شناختی علامت ہے تاکہ دوسرے گھروں سے ممتاز نظر آئے۔اگر کوئی مسجد کی شان ورفعت کو اونچا کرنے کے لیے اسے عالی شان بناتا ہے تو کوئی حرج نہیں۔ضروری نہیں کہ فقرا ومساکین کے لیے یہی رقم صرف ہو۔ان کے لیے اور بہت سے ذرائع ہیں۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کو بہت عالی شان بنایا تھا۔حتی کہ مسجد میں استعمال ہونے والی ساگوان کی لکڑی ہندوستان سے منگوائی گئی تھی۔اس وقت اعتراض کرنے والوں کو آپ نے جواب دیا تھا کہ تم مجھ پر بہت اعتراض کرتے ہو۔حالانکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے اس کا گھر تیار کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے اسی جیسا گھر تعمیر کرے گا۔''

[بخاری: کتاب الصلوٰۃ]

مختصر یہ ہے کہ تعمیر مسجد کے وقت مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

1. اس میں بیل بوٹے اور بے جا نقش ونگار نہ ہوں،بالخصوص قبلہ والی دیوار اور محراب سادہ ہونا چاہیے۔
2. اصحاب ثروت اپنی گرہ سے تعمیر کریں اس کے لیے سفارتی مہم چلا کر چندہ وغیرہ جمع نہ کیا جائے۔
3. مسجد تعمیر کرتے وقت ریا کاری یا فخر ومباہات کا قطعاً کوئی ارادہ نہ ہو۔
4. جس مقام پر لوگ صاحب حیثیت نہ ہوں۔وہاں اپنے حسب حال ہی مسجد کو تعمیر کرلیا جائے۔
5. مسجد عام گھروں سے امتیازی حیثیت کی حامل ہونی چاہیے۔
6. مسجد کے ظاہری حسن سے زیادہ اس کے باطنی محاسن کو اجاگر کیا جائے جو تعمیر مسجد کی اصل روح ہے۔
7. تعمیر مسجد کے وقت محل وقوع کا ضرور اعتبار کرنا چاہیے تاکہ اللہ کا گھر اعلیٰ شان اور بلند مقام کا حامل ہو۔

سوال چونیاں سے عبدالستار سوال کرتے ہیں کہ مساجد میں نقش ونگار کرنا جائز ہے یا نہیں......؟ قرآن وحدیث کے مطابق جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ مساجد میں اس طرح کی مینار کاری اور نقش ونگاری جو نماز پڑھتے وقت نمازی کے لیے خلل اندازی کا باعث ہو،درست نہیں ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی زیب وزینت کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا ہے۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ منقش چادر میں نماز ادا کی تو بعد میں فرمایا:''اسے واپس کردو کیوں کہ اس کے نقش ونگار کی وجہ سے میری توجہ ہٹ جانے کا اندیشہ ہے۔'' [صحیح بخاری]

اس حدیث کے تحت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو نمازی کے لیے دوران نماز بے توجہی کا باعث بنے مکروہ اور ناپسندیدہ ہے جیسا کہ نقش ونگار وغیرہ۔ [فتح الباری:۱/۴۸۳]

مساجد کی زیب و زینت اور نقش و نگاری کی مذمت کے متعلق کئی ایک احادیث ہیں بلکہ احادیث میں صراحت کے ساتھ اسے علامات قیامت قرار دیتے ہوئے اس سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے خاص طور پر جب ایسی چیزیں فخر و مباہات کا ذریعہ بن جائیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں مساجد کو چونا گچ کروں یا انہیں نقش و نگار سے آراستہ کروں۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ تم اپنی مساجد کو یہود و نصاریٰ کی طرح خوب مینا کاری سے آراستہ کرو گے۔''

[صحیح ابن حبان: ۴/۷۰]

ایک اور حدیث میں ہے کہ لوگوں پر ایسا وقت ضرور آئے گا کہ وہ اپنی مساجد کو فخر و مباہات کا ذریعہ بنائیں گے، نماز اور رشد و ہدایت کے سامان سے اس کی تعمیر نہیں کریں گے۔ [صحیح بخاری تعلیقاً]

رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ ''جو قوم بدعملی کا شکار ہو جاتی ہے وہ مساجد کو نقش و نگار اور بیل بوٹوں سے مزین کرنا شروع کر دیتی ہے۔'' [ابن ماجہ: کتاب المساجد]

یہ روایت اگرچہ سنداً ضعیف ہے تاہم تائید کے لیے اسے پیش کیا جا سکتا ہے۔ مساجد کو مضبوط اور خوبصورت تو ضرور ہونا چاہیے لیکن نقش و نگار اور مینا کاری سے دور رکھنا چاہیے، خاص طور محراب والی دیوار پر بیل بوٹے یا شیشہ لگانا جس سے نمازی کی توجہ دوسری طرف لگ جائے سخت معیوب ہے۔

سوال فیصل آباد سے ابراہیم لکھتے ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ سے اذان فجر میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہنے کا ثبوت ملتا ہے؟ اس کے علاوہ کیا خرگوش کے حلال ہونے پر کوئی صریح نص ملتی ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب صبح کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو آپ نے جو اذان سکھائی تھی اس میں واضح طور پر اس کا ذکر ہے۔ آپ ﷺ کے الفاظ یہ ہیں: ''اگر صبح کی اذان ہو تو اس میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کہا کرو۔ [صحیح ابن خزیمہ: ۱/۲۰۲]

لہٰذا یہ بات غلط مشہور ہو چکی ہے کہ فجر کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کا اضافہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ نیز خرگوش حلال ہے، کیوں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ خرگوش لایا گیا آپ نے اسے ذبح کیا اور کچھ گوشت رسول اللہ ﷺ کے گھر بھیجا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ [صحیح بخاری: کتاب الصید، باب الارنب]

جن روایات میں اس کی مادہ کو خون آنے کی وجہ سے اسے نہ کھانے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے خرگوش کا گوشت کھانے کا جواز ملتا ہے تمام علما کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ البتہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کی کراہت منقول ہے۔ [فتح الباری: ۹/۶۶۲]

اس حدیث کی روشنی میں خرگوش حلال جانور ہے اور اسے شکار کیا جا سکتا ہے اور اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال جھنگ سے عبداللہ عمر لکھتے ہیں کہ انٹرمیڈیٹ کی اسلامیات اختیاری میں ہے کہ صبح کی اذان میں ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' کا اضافہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، کیا یہ صحیح ہے؟۔

جواب عام مشہور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صبح کی اذان میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا اضافہ کیا، بعض مؤرخین نے بھی اولیات عمر رضی اللہ عنہ کے عنوان سے اس کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ بات سرے سے غلط ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو جو اذان سکھائی تھی اس میں یہ وضاحت موجود ہے کہ اگر صبح کی اذان ہو تو اس میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" دو مرتبہ کہا جائے۔ [ابوداود:باب کیف الاذان]

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "باب الاذان فی السفر" میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔اس کے علاوہ بعض محدثین کرام نے اس کے متعلق ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ صبح کی اذان میں "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہنے کا بیان۔اس کے تحت چند احادیث بیان کی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:" یہ بات سنت سے ثابت ہے کہ جب مؤذن فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کہے تو اس کے بعد "الصلوٰۃ خیر من النوم" کہے۔" [صحیح ابن خزیمہ:۱/۲۰۲]

دراصل رافضی پروپیگنڈے کے تحت ایسا لکھا جاتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے صبح کی اذان میں اس کا اضافہ کیا تھا۔درج بالا تصریحات کے بعد اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے، بعض حضرات کو شاید ایک واقعہ سے یہ غلط فہمی ہوئی ہو۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:" کہ ہمیں یہ بات پہنچی کہ ایک دفعہ کوئی خادم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس صلوٰۃ صبح کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوا تو آپ اس وقت نیند فرما رہے تھے، اس نے آپ کے پاس "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے الفاظ کہے۔اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان الفاظ کو صبح کی اذان میں رہنے دو۔" [مؤطا امام مالک: کتاب الصلوٰۃ' باب ماجاء فی النداء للصلوٰۃ]

اس کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں۔

(اولاً) اس اثر کی سند منقطع ہے، لہٰذا یہ قابل استدلال نہیں۔ (ثانیاً) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ ان الفاظ کا یہ محل نہیں ہے بلکہ انہیں صبح کی اذان میں رہنے دو، لہٰذا اس منقطع اثر سے وہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی، جس کا سوال میں ذکر ہوا ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ماسٹر صدیق صاحب کالا باغ ضلع ایبٹ آباد سے دریافت کرتے ہیں کہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے الفاظ فجر کی پہلی اذان میں کہے جائیں یا دوسری اذان میں؟

جواب ہمارے ہاں بعض معاصر اہل علم کی جدید تحقیق یہی ہے کہ "الصلوٰۃ خیر من النوم" کے الفاظ صبح کی پہلی اذان میں کہے جائیں اور حدیث میں جو اذان شب کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اس اذان کے ذریعے سوئے ہوئے کو متنبہ کر دیا جائے اس کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن سبیل المؤمنین کے طور پر امت میں جو شروع سے عمل چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ ان الفاظ کو دوسری اذان میں کہا جائے اس کی بنیاد یہ ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "من السنة اذا قال المؤذن فی اذان الفجر حی علی الصلوة قال الصلوة خير من النوم" [صحیح ابن خزیمہ ۱/۲۰۲]

سنت یہ ہے کہ جب مؤذن صبح کی اذان میں "حی علی الصلوة" کہے تو اس کے بعد "الصلوة خير من النوم" کہے صحابی کا اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا حدیث مرفوع کا حکم رکھتا ہے۔

اس طرح روایات میں ہے کہ ابومحذورہ رضی اللہ عنہ اذان فجر میں "الصلوۃ خیر من النوم" کہتے تھے۔

[سنن ابی داؤد: کتاب الصلوۃ' باب کیف الاذان]

اور یہ طریقہ اذان انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا۔

رات کی اذان میں یہ الفاظ ثابت نہیں البتہ بعض روایات میں " فی الاولیٰ من الصبح "صبح کی پہلی اذان میں یہ الفاظ کہنے کی تصریح ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی دو اذانیں ہیں ایک طلوع فجر کے بعد اور دوسری اقامت الصلوۃ کے وقت جیسے عام طور پر اقامت کہا جاتا ہے اس اقامت کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "بَیْنَ کُلِّ اَذَانَیْنِ صَلٰوۃٌ" [ابوداؤد]

ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے۔ان دونوں سے مراد اذان عرفی اور اقامت ہے مختصر یہ ہے کہ "الصلوۃ خیر من النوم" کے الفاظ طلوع فجر کے بعد دی جانے والی اذان میں کہے جائیں رات کی اذان میں ان الفاظ کی ادائیگی محل نظر ہے۔

نوٹ: ہمارے ہاں رات کی اذان کو اذان تہجد کہا جاتا ہے یہ درست نہیں بلکہ یہ سحری کی اذان اور تہجد پڑھنے والوں کو واپس بھیجنے کے لیے کہی جاتی ہے تاکہ اگر انہوں نے روزہ رکھنا ہے تو اس کی تیاری کریں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بدین سے اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ اذکار ماثورہ نامی ایک کتاب میں حصن حصین کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب کسی شخص کو جنگل یا ویرانے میں بھوت پریت گھیر لیں تو با آواز بلند اذان دے اور آیت الکرسی پڑھے، کیا ایسا کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہے تو عورت ایسے موقع پر کیا کرے کیوں کہ وہ تو اونچی آواز سے اذان نہیں دے سکتی۔

جواب ہمارے ہاں اوراد و وظائف کے متعلق جتنی بھی کتب تالیف کی گئی ہیں، ان میں صحت روایات کا التزام بہت کم کیا گیا ہے، اذکار ماثورہ نامی کتاب جو محض صدقہ جاریہ کے طور پر شائع کی گئی ہے۔اس کا بھی یہی حال ہے۔مرتب نے روایات کی چھان پھٹک نہیں کی، سوال میں جس روایت کا حوالہ دیا گیا ہے۔اس کے الفاظ یہ ہیں کہ" جب تمہیں جن بھوت مختلف صورتوں میں ہراساں کریں تو بلند آواز سے اذان دیا کرو"۔ ہمارے ہاں جو مصائب و شدائد کے وقت اذانیں دینے کا رواج ہے وہ بھی غالباً اسی روایت کی وجہ سے ہے۔مثلاً بارش برسنے لگے یا حکمران برے کام کرنے لگیں تو اذانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی اور اس طرح کی دیگر روایات کی اسنادی حیثیت واضح کردی جائے۔کتب حدیث میں یہ روایت متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ: ہشام بن ہارون بواسطہ حسن بصری حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ" جب تمہیں جن بھوت پریشان کریں تو با آواز بلند اذان دیا کرو"۔ [مصنف ابن ابی شیبہ:۱۰/۳۹۷]

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو انہی راویوں سے نقل کیا ہے۔لیکن اس کے الفاظ یہ ہیں:" تم اذان دینے میں جلدی نہ کیا کرو"۔ [مسند احمد:۳/۳۰۵]

اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن اتصال سند نہ ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں ہے یعنی اس میں بایں طور انقطاع

ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سماع نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو حاتم اور البزار کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [الاحادیث الضعیفہ:۳/۲۷۷]

② حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ: یونس بواسطہ حسن بصری، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ جب ہمارے سامنے جن بھوت ظاہر ہو تو ہم اذان دیں۔ [مجمع الزوائد:۱۰/۱۳۴]

اس روایت میں بھی انقطاع کی علت موجود ہے۔ کیوں کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا سماع حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت نہیں ہے۔ جیسا کہ علامہ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے محدث البزار کے حوالہ سے لکھا ہے: ''یہ روایت بایں طریق صرف حسن بصری سے بواسطہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ منقول ہے اور ہم نہیں جانتے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کچھ سنا ہے''۔ [الاحادیث الضعیفہ:۳/۲۷۷]

علامہ ہیثمی لکھتے ہیں کہ ''اس روایت کے راوی ثقہ ہیں لیکن ہماری معلومات کے مطابق حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے کچھ بھی نہیں سنا ہے''۔ [مجمع الزوائد:۱۰/۱۳۴]

اس روایت کو عمرو بن عبید بواسطہ حسن بصری حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بایں الفاظ بیان کرتے ہیں ''کہ جب تمہیں جن بھوت پریشان کریں نماز کے لیے اذان دو''۔ [میزان الاعتدال:۳/۲۷۶]

اس روایت میں مذکورہ بالا خرابی عدم اتصال کے علاوہ مزید یہ ہے کہ عمرو بن عبید جو شیعہ راوی ہے اس کا سماع بھی امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ثابت نہیں ہے، امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متروک الحدیث کہا ہے اور یحییٰ بن معین لکھتے ہیں کہ اس کی بیان کردہ احادیث لکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ [الکامل لابن عدی:۵/۱۷۵۱]

③ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما: عمر بن صبح بواسطہ مقاتل بن حیان عن نافع عن ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ جب جن بھوت تمہیں تنگ کریں تو اذان دینے کا اہتمام کرو''۔ [الکامل لابن عدی:۵/۱۷۸۵]

حافظ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے متعلق خود وضاحت کرتے ہیں کہ اس حدیث کا کچھ متن مذکورہ سند کے ساتھ صرف عمر بن صبح عن مقاتل مروی ہے اور یہ راوی ''منکر الحدیث'' ہے۔ یعنی یہ راوی غیر معروف روایات بیان کرنے میں مشہور ہے۔

[الکامل لابن عدی:۵/۱۶۷۳]

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اس راوی کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''یہ راوی ثقہ نہیں اور نہ ہی امانت دار ہے۔'' [میزان الاعتدال:۳/۲۰۶]

امام ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ ''یہ حضرت، ثقہ راویوں کے نام سے حدیث بنایا کرتے تھے۔'' [تہذیب:۳/۴۰۷]

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متروک اور علامہ ازدی نے اسے کذاب قرار دیا ہے۔ [میزان الاعتدال:۳/۲۰۷]

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ: ان سے مروی حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ ''جب جن بھوت مختلف صورتوں میں تمہارے سامنے آئیں تو با آواز بلند اذان دو کیوں کہ شیطان جب اذان سنتا ہے تو گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے''۔ [مجمع الزوائد:۱۰/۱۳۴]

اس روایت میں ایک راوی عدی بن فضل ہے جو سہیل بن صالح سے روایت کرتا ہے اور عدی متروک ہے جیسا کہ

علامہ ہیثمی نے لکھا ہے۔ [مجمع الزوائد: ۱۰/۱۳۴]

عدی بن فضل کے متعلق امام جوز جانی لکھتے ہیں کہ لوگوں نے اس کی روایات کو قبول نہیں کیا۔ [احوال الرجال:۱۰۹]

اس روایت میں جو مزید الفاظ ہیں کہ شیطان اذان سنتا ہے تو گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے، یہ الفاظ صحیح مسلم میں سہیل بن ابی صالح سے مروی ہیں لیکن اس میں اصل روایت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''جب تمہیں جن بھوت ہراساں کریں تو اذان دیا کرو''۔ کے الفاظ سہیل راوی کے ہیں جسے عدی بن فضل نے مرفوع روایت کا حصہ بنا کر بیان کر دیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ بایں الفاظ نقل کیا ہے: ''حضرت سہیل کہتے ہیں کہ مجھے میرے والد نے ایک ساتھی کے ہمراہ بنو حارثہ کی طرف روانہ کیا گزرتے وقت ایک باغ کی چار دیواری کے اندر سے میرے ساتھی کا نام لے کر آواز دی گئی، اس نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہاں کوئی چیز نظر نہ آئی، میں نے جب اس واقعہ کا ذکر اپنے والد سے کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ کے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آ سکتا ہے تو میں تجھے کسی صورت میں وہاں نہ بھیجتا، آئندہ اگر اس طرح کی آواز آئے تو اذان دیا کرو۔ کیوں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے''۔ [صحیح مسلم: کتاب الصلوٰۃ]

واضح رہے کہ حدیث کے مطابق شیطان جس اذان سے بھاگتا ہے وہ نماز کے وقت دی جانے والی اذان ہے۔ نماز کے علاوہ مصائب و شدائد کے وقت اذان دینا ایک تابعی کا استنباط ہے، بلاشبہ نماز کے لیے اذان دینا تو حدیث سے ثابت ہے لیکن اس کے علاوہ اذان دینے کا ثبوت صحیح احادیث سے ہونا چاہیے۔

سوال میں جن بھوت کو بھگانے کے لیے آیت الکرسی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے بلاشبہ آیت الکرسی اس مقصد کے لیے تیر بہدف نسخہ ہے بلکہ یہ نسخہ شیطان لعین کا اپنا بتایا ہوا ہے جس کے صحیح ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر تصدیق ثبت کی ہے، کتب حدیث میں حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابو ایوب انصاری، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابو اسید انصاری اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی اپنی آپ بیتی بیان ہوئی ہے کہ شیطان نے مختلف اوقات میں ان کا کچھ سامان اٹھالیا اور پکڑا گیا، کافی منت و سماجت کے بعد یہ کہہ کر نجات ملی کہ تمہیں ایک نسخہ بتاتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے شیاطین (جن بھوت وغیرہ) آپ کے پاس نہیں بھٹکیں گے وہ یہ ہے کہ آیت الکرسی پڑھ لیا کرو۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ اس نے بات سچی کی ہے لیکن وہ خود جھوٹا ہے۔'' ان تمام واقعات کی تفصیل صحیح بخاری، سنن ترمذی، مسند امام احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن نسائی اور معجم الطبرانی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر جنگل میں یا ویرانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش آ جائے تو اذان کے بجائے آیت الکرسی پڑھی جائے یا نماز کے وقت اذان دی جائے نماز کے بغیر اذان دینا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے اگر ایسے موقع پر اکیلی عورت ہے تو اس کے لیے یہ سفر کرنا ہی ناجائز ہے۔ اگر کسی مجبوری کے وقت ایسا سفر ناگزیر ہو تو حادثہ پیش آنے کی صورت میں آیت الکرسی پڑھ سکتی ہے۔ امید ہے کہ ایسا کرنے سے تمام جن بھوت بھاگ جائیں گے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال محمد طیب بذریعہ ای میل دریافت کرتے ہیں کہ دوہری اذان ''اشھد ان محمدا رسول اللہ'' کہنے کے بعد

پھر ''اشھد ان لا الہ الا اللہ '' سے دہرائی جاتی ہے، میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ دوہری اذان کہتے وقت ''اللہ اکبر'' سے دہرایا جائے۔ کیا میرے دوست کا کہنا درست ہے؟

جواب دوہری اذان کہتے وقت ''اللہ اکبر'' سے دہرانا درست نہیں ہے بلکہ ''اشھد ان محمد ارسول اللہ '' دوسری مرتبہ کہنے کے بعد دوبارہ ''اشھد ان لاالـــہ الا اللہ '' سے شروع کرنا دوہری اذان کہلاتا ہے حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان کی تعلیم دی تو ''اشھد ان محمدارسول اللہ '' دوسری مرتبہ کہنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ دوبارہ ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' سے اذان کے کلمات لوٹاؤ۔ [صحیح مسلم: کتاب الصلوٰۃ]

اس روایت کے مختلف الفاظ ہیں، بعض روایات میں یوں ہے کہ پھر ''اشھد ان لا الـــہ الا اللہ '' سے باآواز بلند دوبارہ کہو۔ [ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ]

ان تمام روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ دوہری اذان کہتے وقت ''اشھد ان لاالہ الا اللہ'' سے دھرایا جائے۔

سوال مظفر گڑھ سے محمد احمد لکھتے ہیں کہ گم شدہ بچوں اور دیگر چیزوں کے متعلق مسجد میں اعلان کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جبکہ امتناعی حکم میں لفظ ''ضالۃ'' آیا ہے۔ جو گم شدہ حیوانات کے بارے میں ہے، لہٰذا اس کا اطلاق بچوں وغیرہ پر نہیں ہوتا، قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔

جواب واضح رہے کہ گم شدہ چیز یا بچے یا جانور کا مسجد میں اعلان کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ حدیث میں ہے اگر کوئی مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کو تلاش کرتا ہے یا اس کا اعلان کرتا ہے تو اس کا جواب بایں الفاظ دیا جائے کہ:

''اللہ وہ چیز تجھے واپس نہ کرے، کیوں کہ مساجد کی تعمیر اس کام کے لیے نہیں ہوئی ہے''۔ [صحیح مسلم: المساجد ۱۲۶۰]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو لوگوں سے اپنے گم شدہ سرخ اونٹ کے متعلق دریافت کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کرے تو اپنے اونٹ کو نہ پائے، کیوں کہ مساجد جن مقاصد کے لیے تعمیر کی گئی ہیں انہی کے لیے ہیں''۔

[صحیح مسلم: المساجد ۱۲۶۲]

ایک دوسری حدیث میں ان مقاصد کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ جن کے پیش نظر مساجد تعمیر کی جاتی ہیں۔

''یعنی مساجد تو اللہ کے ذکر، نمازوں کی ادائیگی اور تلاوت قرآن پاک کے لیے بنائی جاتی ہیں''۔ [صحیح مسلم: الطہارۃ ۶۶۱]

رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر اس قسم کے اعلانات کے متعلق حکم امتناعی جاری کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی گم شدہ اشیاء (حیوانات وغیرہ) کو مساجد میں تلاش کرنے اور ان کے متعلق دریافت کرنے سے منع فرمایا''۔ [ابن ماجہ: المساجد ۷۶۶]

نیز ایسے شخص کے لیے اس کی گم شدہ چیز نہ ملنے کے متعلق بددعا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ سوال میں لفظ ضالہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا اطلاق گم شدہ حیوان پر ہوتا ہے اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کیوں کہ حیوانات کے

علاوہ دوسری چیزوں کے لیے اس لفظ کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ چنانچہ کتب لغت میں ضالہ ہر گم شدہ چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ محسوسات سے تعلق رکھتی ہو یا معقولات سے یا خاص طور پر حیوانات کے لیے بولا جاتا ہے۔ [المعجم الوسیط:۱/۵۴۵]

حدیث میں ہے کہ دانائی کی بات مؤمن کے لیے ایک گم شدہ متاع ہے جہاں سے ملتی ہے اسے وصول کر لیتا ہے۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ لفظ''ضالۃ'' غیر حیوان کے لیے بھی مستعمل ہے جو گم شدہ ہو۔ بلکہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل انسانوں کی گم شدگی کے لیے مستعمل ہے، اللہ تعالیٰ نے کفار کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''اور کہنے لگے کہ جب ہم (مرکر) زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا پھر از سر نو پیدا ہوں گے''۔ [۳۲/السجدہ:۱۰]

''موت کے وقت اللہ کے فرشتے جب منکرین حق سے دریافت کریں گے کہ کہاں ہیں وہ جنہیں تم اللہ کے علاوہ پکارا کرتے تھے تو وہ جواب دیں گے کہ وہ ہم سے غائب ہیں''۔ [۷/الاعراف:۳۷]

حدیث میں ہے کہ''ایک شخص نے اپنے بچوں کو وصیت کی کہ مرنے کے بعد مجھے آگ میں جلا کر میری راکھ کو ہوا میں اڑا دینا یا پانی میں بہا دینا، وہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے خود کہتا ہے کہ شاید میں (ایسا کرنے سے) اللہ کی نظر میں نہ آؤں اور اس سے اوجھل رہوں''۔ [مسند احمد:۳/۵]

قرآن وحدیث کے مذکورہ استعمالات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ لفظ''ضالۃ'' انسانی گم شدگی کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اگرچہ اس کا زیادہ استعمال ذہول یا راہ راست سے بھٹک جانے کے لیے ہے۔ اس بنا پر سوال میں جس لفظ کو بنیاد بنا کر گم شدہ بچوں کے متعلق مساجد میں اعلان کا جواز کشید کیا گیا ہے وہ سرے سے بے بنیاد ہے۔

بعض اہل علم نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ بقائے نفس اور احترام آدمیت کے پیش نظر بچوں کے اعلان کو جائز ہونا چاہیے پھر ضروریات، ممنوع احکامات کو جائز قرار دے دیتی ہیں کے تحت لانے کی کوشش کی گئی ہے، یقیناً یہ ضابطہ اور اصول صحیح ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب اس کا کوئی متبادل انتظام نہ ہو سکتا ہو۔ صورت مسئولہ میں کوئی ایسی مجبوری نہیں جس کے پیش نظر ہم اس امتناعی حکم کو جائز قرار دیں، کیوں کہ مسجد کے باہر اس کا معقول بندوبست ہو سکتا ہے، ہاں اگر واقعی کوئی ایسی مجبوری ہو اور مسجد کے باہر اس کا انتظام کرنا ناممکن ہو تو اس قسم کے اعلانات کے متعلق نرم گوشہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

بعض حضرات مصالح مرسلہ کا سہارا لیتے ہوئے اس قسم کے اعلانات کے لیے جواز کی گنجائش پیدا کرتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ دور حاضر کے جدید مسائل میں مصالح مرسلہ بڑی کار آمد چیز ہے، لیکن صریح نصوص کے مقابلہ میں مصالح مرسلہ کا سہارا لینا ایک چور دروازہ کھولنے کے مترادف ہے، جس کے ذریعے ہر قسم کے دینوی، تجارتی اور غیر تجارتی اعلانات جائز قرار پائیں گے جیسا کہ آج کل ہم مساجد میں ایسے اعلانات کا مشاہدہ ہر روز کرتے ہیں، جو مسجد کے تقدس اور احترام کے بھی منافی ہوتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ اہل محلہ باہمی تعاون سے مسجد کے باہر اعلان کرنے کا بندوبست کریں، جیسا کہ بعض دیہاتوں میں ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے، یہ کوئی ظاہر پرستی یا حرفیت پسندی نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کا تقاضا ہے کہ انہیں جوں کا توں برقرار رکھا جائے ہاں اگر کوئی چیز مسجد یا بیرون مسجد سے ملتی ہے تو اس کے متعلق نمازیوں کو اطلاع دینے میں ان شاء اللہ

کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اگر چہ بہتر یہی ہے کہ اس سے بھی اجتناب کیا جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ انہوں نے گم شدہ چیز پانے والے کو مسجد کے دروازے پر اعلان کرنے کا حکم دیا تھا۔ [مغنی لابن قدامہ: ۵/۶۹۶]

لہٰذا ہر قسم کی گم شدہ چیزوں اور بچوں کے اعلانات مساجد میں نہیں ہونے چاہئیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال حیدرآباد سے محمد شفیق دریافت کرتے ہیں کہ کیا مسجد میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعے گم شدہ چیز، بچے یا جانور کا اعلان کرنا جائز ہے، اسی طرح کسی کے فوت ہونے یا جنازہ کا اعلان بھی مسجد میں کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب گم شدہ چیز، یا بچے یا جانور کا اعلان مسجد میں کرنا شرعاً درست نہیں ہے اور نہ اشیاء کی خرید وفروخت کا اعلان مسجد میں کرنا جائز ہے حدیث میں ہے کہ ''اگر کوئی شخص مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتا ہے تو اس کا جواب بایں طور دیا جائے کہ:

''اللہ اسے تیرے پاس واپس نہ کرے'' اس کی وجہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ:

''مساجد اس کام کے لیے نہیں بنائی گئیں''۔ [مسلم: کتاب المساجد]

رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں ایک ایسے شخص کو دیکھا جو لوگوں سے اپنے گم شدہ اونٹ کے متعلق دریافت کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کرے تو اپنے اونٹ کو نہ پائے کیوں کہ مساجد جن مقاصد کے لیے بنائی گئی ہیں، انہیں کے لیے ہیں''۔

[صحیح مسلم: کتاب المساجد]

بلکہ واضح طور پر اس کے متعلق حکم امتناعی وارد ہے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی گم شدہ اشیاء (حیوانات وغیرہ) کو مساجد میں تلاش کرنے اور اس کے متعلق دریافت کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [ابن ماجہ: کتاب المساجد]

حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد میں خرید وفروخت کرتا ہے تو اس کے حق میں یہ خرید وفروخت سودمند نہ ہونے کی بددعا کی جائے اسی طرح اگر کوئی مسجد میں اپنی گم شدہ چیز کے متعلق اعلان یا دریافت کرتا ہے تو اسے کہا جائے کہ اللہ کرے تجھے وہ واپس نہ ملے۔

ان احادیث میں اگر چہ لفظ 'ضالۃ' استعمال ہوا ہے جو صرف گم شدہ حیوانات کے لیے ہے۔ لیکن اس کے منع ہونے کی جو علت بیان کی گئی ہے اس کے پیش نظر یہ امتناعی حکم ہر گم شدہ چیز کے لیے خواہ وہ جانور ہو یا بچہ وغیرہ۔ البتہ جنازہ کا اعلان مسجد میں کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ اعلام ہے یعنی دوسروں کو اطلاع دینا ہے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ یہ اطلاع ایک دفعہ کر دی جائے بار بار پورے شجرہ نسب کے ساتھ اعلان کرنا درست نہیں، اسی طرح اگر مسجد کے اندر کوئی چیز گم ہو جائے یا کسی کو ملے تو اس کا اعلان مسجد کے نمازیوں میں کیا جائے۔

سوال پتوکی سے عبدالباری ذوق لکھتے ہیں کہ ہمارے شہر کی ایک مسجد میں ہر اذان کے بعد بآواز بلند سپیکر میں درودِ ابراہیمی پڑھا جاتا ہے کیا ایسا کرنا درست ہے۔

جواب عبادات کے متعلق محدثین کا اصول ہے کہ جس مقدار اور معیار سے ہم تک پہنچی ہیں انہیں اسی مقدار اور معیار میں ادا

کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم اس کی مقدار میں اضافہ کریں یا اس کے اوصاف و معیار میں تبدیلی کریں تو اسے بدعت کہا جاتا ہے۔ اسی کا نام شریعت سازی ہے، جسے اسلام نے انتہائی بری نظر سے دیکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ چند لوگ اجتماعی طور پر مسجد میں تسبیح و تہلیل کررہے ہیں تو آپ نے ان سے اظہار نفرت کرتے ہوئے فرمایا کہ ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفن بوسیدہ نہیں ہوا تم نے ابھی سے یہ گمراہی کا دروازہ کھول دیا ہے۔ [دارمی]

حالانکہ تسبیح و تہلیل کرنا بہترین عبادت ہے لیکن اس کے معیار کو بدل دینے سے وہ عبادت کے بجائے بدعت شمار ہونے لگی لہٰذا عبادات کے متعلق بندہ مؤمن کو بہت حساس رہنا چاہیے صورت مسئولہ میں اذان کے بعد درود پڑھنا مستحب ہے۔ اور اس کی بہت فضیلت ہے لیکن اسے فریق مخالف کے توڑ کے لیے سپیکر پر با آواز بلند پڑھنا درست نہیں ہے ویسے لوگوں کی ذہن سازی کرتے رہنا چاہیے۔ لیکن عملاً ایسا کام شروع کردینا جس کا قرونِ اولیٰ میں ثبوت نہیں اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ہاں اذان باآواز بلند کہنا مشروع ہے اس کے لیے سپیکر کا استعمال بھی مباح ہے لیکن اس کے بعد درود یا دعا بھی سپیکر پر با آواز بلند پڑھنا تاکہ لوگوں کو صحیح درود اور دعا مسنون کی تبلیغ کی جائے درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ فیصل آباد سے کچھ پوسٹرز شائع ہوئے ہیں جن پر کسی شخص کی تصاویر کی مدد سے نماز کا طریقہ سکھایا گیا ہے، تصاویر میں گردن سے اوپر کا حصہ چھپا دیا گیا ہے، کیا ایسے پوسٹرز مسجد میں لگائے جا سکتے ہیں؟

جواب بلاشبہ فتنہ تصویر نے پوری امت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حالانکہ شریعت مطہرہ نے تصویر کشی کی سخت حوصلہ شکنی کی ہے۔ بچے کی پیدائش سے لے کر زندگی کے مختلف مراحل میں اس فتنہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے حتی کہ مذہبی حضرات کی اسلامی تقریبات بھی اس کے بغیر ادھوری خیال کی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ ہوں:

''قیامت کے دن مصور حضرات اللہ کے ہاں سخت ترین عذاب سے دوچار ہوں گے''۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

''اللہ نے تصویر کشی کرنے والے پر لعنت کی ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الادب]

''جس گھر میں تصاویر ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں جاتے''۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

''جو حضرات تصویر کشی کرتے ہیں قیامت کے دن انہیں عذاب دیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ اپنی تخلیقات میں جان ڈالیں''۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

''فوٹو گرافر اللہ کے ہاں عذاب سے دوچار ہوگا تا آنکہ اس میں جان ڈالے حالانکہ وہ اس میں کبھی جان نہیں ڈال سکے گا''۔ [صحیح بخاری: کتاب البیوع]

''اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوسکتا ہے جو اللہ کی صنعتِ تخلیق کی نقالی کرتا ہے ذرا یہ حضرات مکئی، گندم یا جو کا ایک دانہ تو پیدا کر کے دکھائیں''۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

18687

اس قدر وعید شدید کے باوجود اس کے متعلق کچھ استثنائی حالتیں بھی منقول ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

☆ اگر کسی فائدے کا حصول تصویر کے بغیر ممکن نہ ہو تو تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

عمل جراحی کے لیے تصاویر سے مدد لینا۔

عالم اسلام کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے زخمی مجاہدین کی تصاویر لینا۔

مجرمین کو پکڑنے کے لیے تصویری خاکے شائع کرنا۔

بچیوں کو امور خانہ داری کی تربیت دینے کے لیے گڑیوں کا استعمال کرانا۔

اس استثنائی حالت کے جواز پر وہ احادیث دلالت کرتی ہیں جن میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گڑیاں تھیں۔ جن سے وہ کھیلا کرتی تھی۔ [بخاری و مسلم]

لیکن ان میں کتوں، بندروں اور خنزیروں کی تصاویر شامل نہیں ہیں۔

☆ ان تصاویر کی توقیر و تعظیم اور زیبائش و نمائش ختم کر دی جائے۔ مثلاً چٹائی گدے اور کمبل وغیرہ جنہیں نیچے بچھایا جاتا ہو۔ اور تصاویر کو پاؤں تلے روندا جاتا ہو اگر ان پر تصاویر ہوں اور لاعلمی میں خرید لیا جائے تو بایں طور پر استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کے جواز پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں تصویردار کپڑے کو پھاڑ کر تکیے بنا لینے کا ذکر ہے۔ [صحیح بخاری]

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے اس تکیہ کو استعمال کیا حالانکہ اس میں تصویر موجود تھی۔ [مسند احمد: ۶/۲۲۹]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے:

''ان تصاویر کا بیان جنہیں روندا جائے''۔

لیکن اس جواز کے باوجود تقویٰ شعار حضرات کو چاہیے کہ اس قسم کی تصاویر سے بھی پرہیز کیا جائے۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے بعد ایک اور عنوان قائم کر کے اپنے رجحان کا اظہار کرتے ہیں۔ ''جو تصاویر پر بیٹھنے کو بھی مکروہ سمجھتا ہے''۔

☆ ان تصاویر کے سر کاٹ کر انہیں درختوں کی طرح بنا دیا جائے، اس حالت میں انہیں گوارا کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کچھ مورتیاں تھیں، حضرت جبرائیل کی آمد و رفت معطل ہوگئی پھر آپ کو ہدایت کی گئی کہ گھر میں جو مورتیاں ہیں ان کے سر کاٹ کر انہیں درختوں کی طرح کر دیا جائے۔ [مسند امام احمد: ۲/۳۰۵]

☆ ایسی اشیاء کی تصویریں بنائی جا سکتی ہیں جن میں روح نہ ہو جیسے: درخت' سمندر، پہاڑ، وغیرہ کی منظر کشی کرنا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک فوٹوگرافر کو ہدایت کی تھی جس کا ذریعہ معاش ہی تصویرکشی تھا کہ تم درختوں اور ایسی چیزوں کی تصاویر بناؤ جن میں روح نہ ہو۔ [صحیح بخاری: کتاب البیوع' حدیث نمبر ۲۲۲۵]

صورت مسئولہ میں جن تصاویر کے متعلق دریافت کیا گیا ہے ان کے سر چھپائے گئے ہیں۔ یہ برائے نام تصاویر ہیں۔ لہٰذا ایسے پوسٹروں کو مساجد میں آویزاں کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان میں تصاویر کے ذریعے ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کا ارتکاب دوران نماز کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے ہوئے پاؤں اور ایڑیاں ملانا، ہاتھ اٹھانا، ہاتھ باندھنا، رکوع کا طریقہ، بحالت رکوع گھٹنے پکڑنا، سجدہ کرنے کا طریقہ، بحالت سجدہ ہاتھ رکھنے اور پاؤں ملانے کا طریقہ، تشہد بیٹھنا اور آخری تشہد

ئیں تورک کرنا' ان تمام مقامات پر بالعموم جو غلطیاں کی جاتی ہیں اس پوسٹر میں عملی طور پران کی وضاحت کی گئی ہے۔ پھر صحیح طریقہ سے آگاہ بھی کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اس اشتہار کی ترتیب وتسوید کے لیے متعدد شیوخ الحدیث کی تائید بھی حاصل کی گئی ہے۔

سوال لاہور دفتر اہلحدیث سے محترم رحمت اللہ صاحب سوال کرتے ہیں کہ دوران نماز سترہ کی کیا حیثیت ہے؟ کیا مسجد کے اندر یا اس کے صحن میں بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب نماز دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اس کے متعلق کئی ایک ایسے احکام ہیں جن کی پابندی انتہائی ضروری ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے ادا کرتے وقت سترہ کا اہتمام کیا جائے ۔رسول اللہ ﷺ نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ بلکہ عمل کے لحاظ سے بھی اس پر مداومت فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو سترہ کی طرف پڑھے۔ نیز اس سترہ کے نزدیک ہوکر اسے ادا کرے''۔

[ابوداؤد: الصلوٰۃ' ۶۹۸]

ایک روایت میں قریب ہوکر نماز پڑھنے کی حکمت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ:

''مبادا شیطان اس کی نماز کو خراب کردے''۔ [ابوداؤد: ۶۹۵]

ایک دوسری حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

''تم سترہ کے بغیر نماز نہ پڑھو اور کسی کو اپنے آگے سے گزرنے نہ دو۔ اگر کوئی روکنے کے باوجود بزور گزرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے سختی سے روکا جائے۔ کیوں کہ گزرنے والے کے ساتھ شیطان ہے''۔

[صحیح مسلم: الصلوٰۃ' ۱۱۳۰]

اس سترہ کے حجم کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اپنے آگے ضرور سترہ رکھے اگرچہ تیر ہی کیوں نہ ہو'' [مسند امام احمد: ۱/۱۶۲]

ان احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو سترہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور بغیر سترہ کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ واضح رہے کہ آپ کا امر وجوب کے لیے اور نہی تحریم کے لیے ہے۔ ہاں اگر کوئی قرینہ ہو تو وجوب کے بجائے استحباب کے لیے ہوتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے کہ آپ کے امر کو وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا جائے۔ پھر نہی سے مراد بھی نہی تحریمی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لیے سترہ بنانا واجب اور اس کے بغیر نماز ادا کرنا حرام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی سے بھی اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے اس پر مداومت کی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ:

''آپ ﷺ جب نماز عید کے لیے باہر نکلتے تو نماز کے لیے چھوٹے نیزے کو اپنے سامنے گاڑ دینے کا حکم دیتے۔ پھر آپ ﷺ اس کی طرف نماز پڑھتے ۔دوسرے لوگ آپ کے پیچھے ہوتے ۔دوران سفر بھی آپ ایسا کرتے تھے''۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ' ۴۹۴]

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں خود کو دیکھتی کہ چارپائی پر لیٹی ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے میری چارپائی کو اپنے اور قبلہ کے درمیان کر لیتے۔ پھر نماز پڑھتے۔ میں اس حالت میں آپ کے سامنے لیٹے رہنے کو ناپسند کرتی تو چارپائی کی پائینتی کی طرف سے کھسک کر لحاف سے نکل جاتی''۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۵۰۸]

اگر رسول اللہ ﷺ مسجد میں ہوتے تو مسجد کے کسی ستون کو آگے کرتے اور نماز پڑھتے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں مصحف کے قریب والے ستون کے پاس نماز پڑھتے اور فرماتے کہ:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ اس کے پاس قصداً نماز پڑھتے تھے''۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۵۰۲]

دوران سفر اگر کوئی دیوار ہوتی تو اسے سترہ بنالیا جاتا۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے دیوار کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، آپ نے اسے سترہ بنایا، دورانِ نماز بکری کا ایک بچہ آیا جو رسول اللہ ﷺ کے آگے سے گزرنے لگا، آپ اسے روکتے رہے، حتی کہ آپ کا بطن مبارک دیوار کے ساتھ لگ گیا اور وہ بچہ آپ کے پیچھے سے گزر گیا۔

[ابوداؤد: الصلوٰۃ ۷۰۸]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے بھی سترہ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی آدمی کو جو کہ دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ستون کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کی طرف نماز پڑھ۔

[صحیح بخاری تعلیقاً: کتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ الی الاسطوانۃ]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق حدیث ہے کہ وہ پالان کو اپنے اور قبلہ کے درمیان کرتے اور اس کی طرف نماز پڑھتے۔

[مصنف عبدالرزاق: حدیث نمبر ۲۳۷۴]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ مسجد حرام میں اپنی لاٹھی گاڑ لیتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ وہ جمعہ کے دن سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے کہ بنوابی معیط کے ایک نوجوان نے ان کے سامنے سے گزرنا چاہا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اسے روکا جب وہ باز نہ آیا تو آپ نے اس کو سینے پر مارا۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۵۰۹]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب مؤذن اذان دیتا تو کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جاتے اور جلدی جلدی ستونوں کی طرف بڑھتے، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے اور وہ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح مغرب سے پہلے دو رکعت ادا کرتے۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۶۲۵]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ستونوں کا رخ اس لیے کرتے تھے تاکہ نماز کے لیے انہیں سترہ بنائیں۔ کیوں کہ وہ علیحدہ علیحدہ نماز پڑھتے تھے۔ [فتح الباری: ۲/ ۱۳۷]

ان آثار سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نماز پڑھتے وقت سترے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ مسجد کے اندر بھی سترہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ احادیث کے عموم کا یہی تقاضا ہے۔ پھر متعدد روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انفرادی نماز میں ستونوں کا رخ کرتے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا بذاتِ خود بھی یہی عمل تھا۔ جیسا کہ بخاری کے باب الصلوٰۃ إلی الاسطوانہ میں

ہے، پھر اہل علم کا اختلاف ہے کہ مسجد حرام میں سترہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ اگر مسجد کے اندر سترہ کا تصور نہ ہوتا تو اس اختلاف کی چنداں ضرورت ہی نہ ہوتی۔

ایک استثنائی صورت: اگر کوئی شخص نماز کھڑی ہونے کے بعد شامل ہوا ہے تو بقیہ نماز ادا کرنے کے لیے اسے تلاش سترہ ضروری نہیں ہے بلکہ اس طرح کا لاحق مقتدی موجودہ ہیئت میں ہی نماز مکمل کرے اور نہ ہی پیشگی کسی سترہ کے بندوبست کی ضرورت ہے۔ غزوۂ تبوک کے سفر میں رسول اللہ ﷺ کی فجر کے وقت ایک رکعت جماعت رہ گئی تھی جو آپ نے بعد میں ادا فرمائی، حالتِ قضائی میں ثابت نہیں ہوسکا کہ اس وقت آپ ﷺ نے کسی سترہ کا اہتمام کیا ہو۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ستیانہ ضلع فیصل آباد سے حافظ محمد حماد لکھتے ہیں کہ آپ نے اہل حدیث شمارہ نمبر۲ مجریہ 10 جنوری 2004ء میں نمازی کے سترہ کے متعلق لکھا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو سترہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا اور بغیر سترہ کے نماز پڑھنے سے منع کیا ہے اور آپ کا امر وجوب اور نہی تحریم کے لیے ہے۔ ہاں اگر کوئی قرینہ ہو تو امر وجوب کے بجائے استحباب کے لیے ہوتا ہے، لیکن یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے کہ آپ کے امر کو وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا جائے، پھر نہی سے مراد بھی نہی تحریم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لیے سترہ بنانا واجب ہے اور اس کے بغیر نماز ادا کرنا حرام ہے۔ [الی آخرہ]

لیکن ہمارے سامنے کچھ ایسی احادیث اور آثار وقرائن ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے، آپ ان کی وضاحت فرمائیں:

☆ حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ شہر سے باہر ہماری رہائش گاہ میں تشریف لائے، وہاں صحرا میں آپ نے بایں حالت نماز ادا کی کہ آپ کے آگے سترہ نہیں تھا۔ [ابوداود: الصلوٰۃ ۷۱۸]

جواب ہم نے اپنے موقف کے لیے جو احادیث پیش کی تھیں وہ اپنے مفہوم میں صریح تھیں۔ اس کے برعکس یہ جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں، اگر صحیح ہیں تو اپنے مفہوم میں صریح نہیں ہیں۔ پیش کردہ حدیث کے متعلق علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ ہے کہ یہ باطل ہے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ عباس بن عبیداللہ بن عباس ہاشمی جو اپنے چچا حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چچا کو نہیں پایا، اس انقطاع کی وجہ سے یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہے۔ [محلی ابن حزم: ۴/۱۳]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس راوی کو ''مقبول'' لکھا ہے۔ [تہذیب التہذیب: ۵/۱۲۳]

مقبول راوی کی روایت اس وقت قبول ہوتی ہے جب اس کی متابعت ہو، لیکن مذکورہ حدیث کی متابعت کسی صحیح یا حسن حدیث سے نہیں ہوئی، اگر ایک ضعیف حدیث کے مختلف طرق ہوں تو بعض اوقات اسے حسن لغیرہ کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے، لیکن متعدد ضعیف روایات کا اجتماع انفرادی کمزوری کی تلافی نہیں کرسکتا۔ بہرحال یہ روایت ناقابلِ استدلال ہے، لہٰذا سترہ کا وجوب اپنی جگہ پر برقرار رہے گا، نیز پیش کردہ حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں کہ گدھی اور کتیا آپ کے آگے کھیل رہی تھیں، آپ نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ حدیث کا یہ مضمون ان صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہے، جن میں صراحت ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نماز

پڑھ رہے تھے اور ایک بکری دوڑتی ہوئی آئی، وہ آپ کے آگے سے گزرنا چاہتی تھی، آپ ﷺ نے اپنا بطن مبارک دیوار کے ساتھ لگا دیا حتی کہ اس بکری کو آپ ﷺ کے پیچھے سے گزرنا پڑا۔ [صحیح ابن خزیمہ: ۸۲۷]

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ گدھی اور کتیا آپ ﷺ کے آگے گھومتی رہیں اور آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ جبکہ آپ ﷺ ہی نے فرمایا ہے ''کہ کتا، گدھا اور عورت، ان کا نمازی کے آگے سے گزرنے سے نماز کا خشوع متاثر ہوتا ہے۔'' [صحیح مسلم: الصلوٰۃ ۲۶۶]

محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل میں تعارض ہوتو قول کو ترجیح دی جاتی ہے اور فعل کو خصوصیت پر محمول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پیش کردہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ایک فعل بیان ہوا ہے، لیکن آپ ﷺ کے متعدد اقوال اس کے معارض ہیں لہٰذا ان اقوال کو ترجیح دی جائے گی مختصر یہ ہے کہ مذکورہ حدیث اس قابل ہی نہیں کہ اسے صحیح اور صریح احادیث کے مقابلہ میں پیش کیا جائے، اگر کوئی ان کے معارضہ پر اصرار کرتا ہے تو اس میں آپ ﷺ کا فعل بیان ہوا ہے، جو آپ ﷺ کے فرامین کے مقابلہ میں مرجوح ہے۔

☆ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند البزار کے حوالہ سے حدیث نقل کی ہے: ''رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور آپ ﷺ کے سامنے کوئی چیز بطور سترہ نہ تھی''۔ [فتح الباری: ۱/۲۲۶]

وضاحت: علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو بایں الفاظ نقل فرمایا ہے کہ'' آپ ﷺ کے سامنے کوئی ایسی چیز بطور سترہ نہ تھی جو ہمارے اور آپ کے درمیان حائل ہو''۔ [نیل الاوطار: ۳/۱۲]

ہمارے نزدیک اس حدیث کی صحت مسلم نہیں ہے، کیوں کہ اس کی سند میں عبدالکریم بن ابی المخارق راوی ہے جسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ [تہذیب التہذیب: ۶/۳۷۶]

جن حضرات نے اسے صحیح کہا ہے انہوں نے اسے عبدالکریم الجزری خیال کیا ہے علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ جواب دیا ہے کہ اس سے مطلق سترے کی نفی نہیں ہوتی۔ بلکہ ایسے سترہ کی نفی کرتی ہے۔ جو لوگوں اور آپ ﷺ کے درمیان حائل ہو۔ جیسے بلند دیوار وغیرہ، جو دونوں کے درمیان ایک دوسرے کو دیکھنے سے مانع ہو۔ محدث عراقی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح: ۳/۴۹۹]

لہٰذا ایسی محتمل روایت صحیح اور صریح احادیث کے خلاف دلیل نہیں بن سکتی۔ واضح رہے کہ اس حدیث کے بنیادی الفاظ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں ایک گدھی پر سوار ہوکر آیا اور میں اس وقت قریب البلوغ تھا، رسول اللہ ﷺ اس وقت دیوار کے سوا کسی اور چیز کا سترہ کرکے لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، صف کے کچھ حصے سے گزر کر میں اپنی سواری سے اترا اور گدھی کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود صف میں شامل ہوکر شریک نماز ہوگیا، کسی نے اس وجہ سے مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔'' [صحیح بخاری: ۴۹۳]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے سترہ کو ثابت کیا ہے، جبکہ امام بیہقی نے اس سے سترہ کی نفی کو ثابت کیا ہے اور اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''سترہ کے بغیر نماز پڑھنا'' لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ انتہائی تعجب خیز ہے کہ وہ امام

بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ عنوانات سے احادیث کی مطابقت اور صحت استدلال کے لیے بڑی کوشش وکاوش کرتے ہیں۔ لیکن اس مقام پر وہ امام بیہقی سے متاثر نظر آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے سترے کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال محل نظر ہے۔ [فتح الباری:۱/۷۳۹]

اگر حافظ ابن حجر اور امام بیہقی دقتِ نظر سے کام لیتے تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر یہ نکتہ تھا کہ حدیث میں ''غیر جدار'' کے الفاظ ہیں اور غیر کا لفظ ہمیشہ کسی سابق کی صفت ہوا کرتا ہے، اس لیے حدیث کا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کے علاوہ کسی دوسری چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے، نفی جدار کا فائدہ بھی اس وقت ہوگا کہ وہاں کسی دوسری چیز کا سترہ ہو، بصورت دیگر یہ نفی لغو ہوگی۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ دوران جماعت میرے صف کے کچھ حصے کے آگے سے گزرنے کے باوجود مجھ پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے سترہ موجود تھا، وہی سترہ مقتدی حضرات کے لیے کافی تھا، اس لیے اعتراض کی گنجائش ہی نہیں تھی، اس حدیث پر ہم نے اپنی زیر ترتیب شرح بخاری میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ قارئین سے استدعا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے لیے دعا کرتے رہیں۔

☆ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں ایک صحابی کا عمل نقل کرتے ہیں کہ حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ نے صحرا میں سترہ کے بغیر نماز پڑھی۔ [موطا امام مالک: باب سترۃ المصلی فی السفر]

وضاحت: اس حدیث میں صحابی کا نہیں بلکہ ایک تابعی کا عمل پیش کیا گیا ہے، کیوں کہ حضرت عروہ بن زبیر رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں، صحیح احادیث کے مقابلہ میں ایک تابعی کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ہاں اس سے پہلی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ سفر میں بھی سترہ کا اہتمام کرتے تھے۔ [موطا امام مالک]

حضرت قرۃ بن ایاس کہتے ہیں کہ میں دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گدی سے پکڑ کر سترہ کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ۔ [صحیح بخاری، تعلیقا مع الفتح:۱/۵۷۷]

مصنف ابن ابی شیبہ میں اس روایت کو موصولاً بیان کیا گیا ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ:۳/۳۷۰]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ تم میں سے جب کوئی نماز پڑھے تو سترے کی طرف رخ کر کے پڑھے اور اس کے قریب کھڑا ہوتا کہ شیطان اس کے آگے سے نہ گزر سکے۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ:۱/۲۷۹]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سترے کا اس قدر اہتمام کرتے کہ اگر مسجد میں کوئی ستون نہ ملتا تو حضرت نافع سے کہتے کہ تم اپنی پیٹھ میری طرف کر کے بیٹھ جاؤ تاکہ میں تیری طرف رخ کر کے نماز پڑھوں۔ [مصنف ابن ابی شیبہ:۱/۲۷۹]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ نماز کی زیادتی اور بے انصافی یہ ہے کہ وہ سترہ کے بغیر نماز پڑھے۔'' [بیہقی:۲/۲۸۵]

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ صحرا میں کسی پتھر کو سامنے گاڑ لیتے پھر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ:۱/۲۷۸]

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو نماز کے لیے سترہ کا ازحد اہتمام کرتے۔

☆ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحرا میں بایں حالت نماز ادا کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کوئی چیز نہ تھی۔

[مسند امام احمد:۱/۲۲۴]

وضاحت: اس روایت کو سید سابق رحمۃ اللہ علیہ نے سترہ کے استحباب کے پیش نظر اپنی کتاب فقہ السنہ میں بیان فرمایا ہے۔ لیکن یہ روایت نا قابلِ استدلال ہے۔ کیوں کہ اس میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے جسے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

[مجمع الزوائد:۲/۶۶]

اس کے علاوہ یہ مدلس بھی ہے اور اس نے مذکورہ روایت ''عن'' کے صیغہ سے بیان کی ہے۔ [تمام المنۃ:۳۰۵]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ [الاحادیث الضعیفہ: رقم ۵۸۰۴]

اور علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ [مرعاۃ المفاتیح:۲/۵۰۴]

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ مذکورہ روایت کی تائید حضرت فضل بن عباس کی روایت سے بھی ہوتی ہے، لیکن تائید میں پیش کی جانے والی روایت کے متعلق امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ یہ منقطع ہے۔ کیوں کہ عباس بن عبید اللہ نے اپنے چچا حضرت فضل بن عباس کو نہیں پایا، اس کے علاوہ ماہرِ فن ابن قطان فرماتے ہیں کہ عباس بن عبید اللہ مجہول ہے۔ جس کے حالات کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ [تمام المنۃ:۳۰۵]

☆ نماز مغرب سے پہلے صحابہ کرام سنتیں پڑھنے کے لیے ستونوں کی طرف جلدی کرتے، مسجد نبوی میں اس قدر ستون نہ تھے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے سترہ کا کام دے سکتے، اس سے معلوم ہوا کہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سترہ کے بغیر نماز پڑھتے تھے۔

وضاحت: جس روایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب مؤذن اذان دیتا تو کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہو جاتے اور جلدی جلدی ستونوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے۔ [صحیح بخاری:۶۲۵]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سترہ کا اہتمام کرتے تھے۔ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سترہ کے لیے ستونوں سے کام لیتے، باقی ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے۔ پھر سامنے والی دیوار کو بھی سترہ بنا لیا جاتا تھا۔

ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جب ایک چیز صحیح احادیث سے ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل نے اسے مزید تقویت دی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس پر عمل پیرا نظر آتے ہیں، تو پھر اس قسم کے موہوم خدشات کے پیش نظر اسے نظر انداز کر دیا جائے، بہر حال اس قسم کے دلائل وجوب سے استحباب کے لیے ''قرینہ صارفہ'' نہیں ہو سکتے۔

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بیان کی ہے کہ آپ نے ان لوگوں پر اعتراض کیا جو کہتے ہیں کہ کتے، گدھے اور عورت کا آگے سے گزرنا قاطع صلوٰۃ ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا شکوہ تب ہی درست ہو سکتا ہے جب نمازی کے سامنے سترہ نہ ہو، ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاؤں کو ہاتھ لگاتے تو آپ اپنے پاؤں سکیڑ لیتیں اور جب آپ سجدہ سے فارغ ہو جاتے تو پاؤں پھیلا دیتیں۔ پاؤں کو سکیڑنا اور پھیلانا مرورہی تو ہے؟۔

وضاحت: برخوردار دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رات کے وقت رسول اللہ ﷺ جب تہجد پڑھتے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے ہوتیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے سامنے بیٹھنے کو پسند نہ کرتیں، چنانچہ وہ پائنتی طرف سے کھسک کر لحاف سے باہر نکل جاتیں، اس طرح آپ ﷺ کے سامنے سے گزر جاتیں اور آپ کے سامنے کوئی سترہ نہیں ہوتا تھا، لیکن روایات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو واقعات ہیں، ایک واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چار پائی پر ہوتیں اور رسول اللہ ﷺ نیچے اتر کر چار پائی کو سترہ بنا کر نماز پڑھتے۔ اس صورت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جنازہ کی طرح آپ کے سامنے لیٹی رہتیں، جب آپ کو ضرورت ہوتی تو پائنتی کی طرف سے کھسک کر باہر نکل جاتیں۔ اس میں آپ کے پاؤں کو ہاتھ لگانے اور انہیں سمیٹنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورت پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''چار پائی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا'' یعنی رسول اللہ ﷺ کے سامنے چار پائی بطور سترہ ہے۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اٹھ کر چلی جاتیں تو چار پائی آپ کے سامنے رہتی اور سترے کا کام دیتی، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو متعدد مقامات پر بیان کیا ہے۔ [۵۰۸، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۴، ۵۱۹]

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسی بستر پر نماز پڑھتے جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لیٹی ہوتی تھی۔ اس صورت میں سترہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ہوتی چنانچہ سجدہ کے وقت رسول اللہ ﷺ آپ کے پاؤں کو دباتے تو وہ انہیں سمیٹ لیتیں سجدہ سے فراغت کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا انہیں پھیلا دیتیں۔ اس واقعہ میں لحاف سے نکل کر باہر جانے کی صورت ہے۔ اس روایت پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''عورت کو سترہ بنا کر نوافل پڑھنا'' اسے بھی متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ [۵۱۳، ۵۱۹، ۱۲۰۹]

بہر حال رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ گھر، مسجد، آبادی، صحرا، منیٰ، عرفات، بیت اللہ، الغرض جہاں بھی نماز پڑھتے، سترہ کا اہتمام کرتے۔ آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ اس لیے یہ نمازی کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود سترہ کا اہتمام کرے، اہل مسجد کی ذمہ داری نہیں کہ وہ متعدد ''سترات'' کا مسجد میں بندوبست کر کے رکھیں۔ اس قسم کی سہولیات فراہم کرنا انتظامیہ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ صحیح احادیث سے ثابت ہو جائے تو وہ اس پر عمل پیرا ہونے کی فکر کرے نہ کہ اسے نظر انداز کرنے کے لیے موہوم خدشات یا پائے چوبین کا سہارا لے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ڈجکوٹ سے علی محمد (خریداری نمبر 2003) لکھتے ہیں کہ جب دوران جماعت پہلی صف مکمل ہو چکی ہو تو بعد میں آنے والا کسی دوسرے نمازی کا انتظار کرے یا صف کے پیچھے اکیلا کھڑا ہو جائے یا اگلی صف سے کسی آدمی کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملائے اور نماز شروع کر دے۔

جواب دورانِ جماعت اگر کوئی نمازی آتا ہے تو اس کے لیے جماعت میں شمولیت کی تین صورتیں ممکن ہیں:

(الف) وہ انتظار کرتا رہے کہ دوسرا آدمی آجائے اور اس کے ساتھ صف بنا کر نماز میں شامل ہو جائے، لیکن ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ کیوں کہ حدیث میں ہے:

''جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے آئے تو امام کو جس حالت میں پائے اسی حالت میں امام کے ساتھ شامل

ہو جائے''۔ [جامع ترمذی:الجمعۃ۵۹۱]

نیز حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کسی سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، دورانِ سفر نماز کا وقت ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ ایک آدمی الگ تھلگ کھڑا ہے جس نے جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے باز پرس کرتے ہوئے فرمایا: ''تو نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں ادا کی؟'' اس نے عرض کیا کہ میں جنابت کی حالت تھا لیکن غسل کے لیے پانی نہیں مل سکا، اس لیے نماز میں شمولیت نہیں کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تجھے تیمم کرکے نماز میں شامل ہو جانا چاہیے تھا''۔ [صحیح بخاری:التیمم ۳۴۴]

اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لیے آنے والے کی نماز میں شمولیت ضروری ہے، البتہ اگر کوئی شرعی عذر ہو تو الگ بات ہے، صورت مسئولہ میں کوئی شرعی عذر ایسا نہیں جس کے پیش نظر اسے کسی دوسرے شخص کا انتظار کرنے کے لیے یونہی مسجد میں ٹہلنے اور پھرنے کی اجازت دی جائے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اکیلا کھڑا ہو جائے جیسا کہ آج کل ''بزعم تحقیق'' کی آڑ میں اس کی تلقین کی جاتی ہے، اس کے متعلق احادیث میں ممانعت ہے:

''رسول اللہ نے ایک شخص کو دیکھا جو صف کے پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا''۔ [ابوداؤد:الصلوٰۃ ۶۸۲]

حضرت علی بن شیبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''صف کے پیچھے اکیلے آدمی کی نماز نہیں ہوتی''۔ [ابن ماجہ:اقامۃ الصلوٰۃ ۱۰۰۳]

امیر صنعانی حدیث ابی داؤد کے پیش نظر لکھتے ہیں کہ ''جس نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی اس کی نماز باطل ہے۔'' [سبل السلام:۲/۵۹۳]

(ج) تیسری صورت یہ ہے کہ اگلی صف سے کوئی نمازی کھینچ کر اپنے ساتھ ملایا جائے، اس طرح صف بندی کرکے نماز میں شامل ہو جائے، ہمارے نزدیک یہ صورت کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ سنت میں اس کی نظیر ملتی ہے وہ یہ ہے کہ جب امام اور ایک مقتدی ایک ساتھ نماز پڑھ رہے ہوں، اسی حالت میں ایک تیسرا آدمی آجائے تو اس کی شمولیت دو طرح سے ممکن ہے۔

امام کو آگے کر دیا جائے اور خود مقتدی کے ساتھ صف بندی کرکے نماز شروع کر دے۔

اگر آگے دیوار ہے تو مقتدی کو پیچھے کھینچ کر اپنے ساتھ ملائے اور نماز ادا کرے۔

اس پر قطع صف کا الزام اس لیے درست نہیں ہے کہ صف بندی کے لیے اس نے ایسا کیا ہے اور اس کے پیچھے آنے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے دائیں یا بائیں جانب سے پر کر لیا جائے جیسا کہ دورانِ نماز اگر کسی کا وضو ٹوٹ جائے تو وہ بھی اس کی زد میں آتا ہے۔ واضح رہے کہ عورت کے اکیلے نماز پڑھنے کو امام کے پیچھے اکیلے کھڑے رہنے کے لیے نظیر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیوں کہ

عورت کو دوران جماعت اکیلی نماز پڑھنے کی اجازت ہے چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں: ''عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اکیلی صف بنالے'' پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر نماز با جماعت کا اہتمام فرمایا: میں اور ایک لڑکا آپ کے پیچھے اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اکیلی ہمارے پیچھے کھڑی تھیں۔ اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کرائی۔

[صحیح بخاری: الاذان ۷۲۷]

اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی ہے جسے امام طبری نے بیان کیا ہے۔ جو ضعیف ہے، اس لیے ہم نے اسے بطور دلیل پیش نہیں کیا۔ اسے بطور تائید پیش کیا جاسکتا ہے۔ [الاحادیث الضعیفہ: ۹۲۲]

چونکہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے، اس لیے ہم نے اس صورت کو اختیار کیا ہے جو کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہے۔ دوسری دونوں صورتوں میں شرعی قباحتیں ہیں جن کی تفصیل ہم نے بیان کردی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ضلع گوجرانوالہ سے محمد یوسف ثاقب (خریداری نمبر ۳۴۰۸) لکھتے ہیں کہ صبح کی نماز کھڑی ہوتی ہے۔ بعض لوگ جماعت میں شامل ہونے کے بجائے الگ سنتیں شروع کردیتے ہیں، کسی عالم دین نے صحیح بخاری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صبح کی جماعت ہوتے ہوتے سنتیں ادا کی تھیں۔ اس کی وضاحت کریں۔

جواب نماز فجر سے پہلے دو سنتوں کی بہت اہمیت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نوافل میں فجر کی سنتوں کا سب سے زیادہ اہتمام کرتے تھے''۔ [صحیح بخاری: التہجد ۱۱۶۹]

ایک روایت میں ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کبھی ترک نہیں کیا''۔ [صحیح بخاری: التہجد ۱۱۵۹]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی اہمیت کو بایں الفاظ اجاگر کرتے ہیں:

''کہ نماز فجر کی دو سنتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں''۔ [صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین ۱۶۸۸]

اگر یہ سنتیں فجر سے پہلے نہ پڑھی جاسکیں تو انہیں نماز سے فراغت کے بعد بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو جماعت کے بعد یہ دو سنتیں پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ [مسند امام احمد: ۵/۴۴۷]

اگر نماز کے بعد بھی نہ پڑھی جائیں تو طلوع آفتاب کے بعد انہیں پڑھا جاسکتا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کہ جس نے فجر کی دو سنتیں نہ پڑھیں وہ سورج طلوع ہونے کے بعد پڑھ لے''۔ [جامع ترمذی: الصلوٰۃ ۴۲۳]

جماعت کے دوران الگ تھلگ دو سنتیں پڑھنا جیسا کہ صورت مسئولہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ، یہ درست نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز قبول نہیں ہوتی''۔

[صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین، ۷۱۰]

احناف نے یہ گنجائش نکالی ہے کہ اقامت کے بعد فجر کی سنتیں پڑھی جاسکتی ہیں، اگر فجر کی دوسری رکعت فوت ہوجانے کا اندیشہ ہوتو سنتیں چھوڑ کر جماعت میں شامل ہوجانا چاہیے، لیکن ان کا یہ موقف کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ سوال میں صحیح بخاری کے حوالہ سے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ صبح کی جماعت کھڑی ہونے کے باوجود صبح کی سنتیں پڑھ لیتے تھے، تلاش بسیار کے باوجود ہمیں یہ اثر صحیح بخاری میں نہیں مل سکا بہرحال اگر صبح کی سنتیں رہ جائیں تو انہیں جماعت کے فوراً بعد یا طلوع آفتاب کے بعد پڑھا جاسکتا ہے۔ لیکن دورانِ جماعت پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے عبدالغفور لکھتے ہیں کہ ایک آدمی نماز فجر کی جماعت کے بعد مسجد میں آتا ہے، اور اپنی الگ نماز پڑھ لیتا ہے، اس کے بعد ایک مولانا کے ہمراہ چند آدمی آتے ہیں اور نماز فجر کی دوسری جماعت کراتے ہیں، اپنی الگ نماز پڑھنے والا پہلا شخص بھی ان کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے، حالانکہ نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی دوسری نماز نہیں ہوتی، قرآن وحدیث کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح ہو کہ نماز فجر پڑھنے کے بعد طلوع آفتاب تک کوئی نماز جائز نہیں ہے۔ البتہ کسی وجہ سے گھر میں نماز فجر ادا کرلینے کے بعد اگر مسجد میں وقت مقررہ پر نماز باجماعت مل جائے تو جماعت میں شامل ہوجانا چاہیے، یہ دوسری نماز نفل ہوگی۔ یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ چنانچہ حضرت یزید بن اسود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد خیف میں نماز فجر پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپ نے دو آدمیوں کو دیکھا جو جماعت میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ فجر کی نماز گھر میں پڑھ آئے ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کہ اگر تم نے گھر پر نماز ادا کی ہو بعد میں امام کے ساتھ جماعت بھی مل جائے تو جماعت کے ساتھ بھی اس نماز کو ادا کرلو اور تمہاری یہ دوسری نماز نفل ہوتی''۔ [مسند امام احمد: ۶/۱۹۱]

لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلی جماعت وہ ہو جو وقت مقررہ پر ادا کی جاتی ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ دانستہ شامل نہ ہونے کی صورت میں کئی قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح اگر فتنہ وفساد کا اندیشہ ہوتو بھی ایسا کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا:

''اگر حکام وقت نماز کو تاخیر سے پڑھیں تو بروقت نماز ادا کرلینا اس کے بعد اگر نماز باجماعت کا موقع ملے تو ان کے ساتھ بھی پڑھ لینا یہ دوسری نماز تیرے لیے نفل ہوگی''۔ [صحیح مسلم]

صورت مسئولہ میں اصل جماعت ہوچکی ہے اور آدمی نے نماز فجر انفرادی طور پر ادا کرلی ہے، اس کے بعد دوسری جماعت میں اسے شمولیت کی دعوت دی گئی ہے۔ چونکہ اس نے نماز پہلے پڑھ لی ہے اس لیے جماعت ثانی میں اس کا شامل ہونا ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ اس دوسری جماعت میں شامل نہ ہونے سے کسی قسم کے شکوک وشبہات پیدا نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ پہلی جماعت میں شمولیت نہ کرنے سے ان کا اندیشہ تھا، اس سلسلہ میں یہ کہنا کہ نیت بدلی جاسکتی ہے کہ پہلی نماز کو نفل اور جماعت والی کو

فرض قرار دے دیا جائے، یہ بھی غلط ہے کیوں کہ اس صورت میں دوسری نماز ہی نفل قرار پائے گی، جیسا کہ احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

سوال فاروق آباد سے سعید ساجد دریافت کرتے ہیں کہ اگر مقتدی دورانِ نماز جماعت سے ملے تو کیا اسے تکبیر تحریمہ کے بعد سینے پر ہاتھ باندھ کر شامل ہو جانا چاہیے یا جس حالت میں امام کو پائے اسی حالت میں شریک ہو جائے نیز جو امام بار بار وعدہ خلافی کرتا ہو کیا اس کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟

جواب حدیث میں ہے کہ نماز میں داخل ہونے کا ذریعہ تکبیر تحریمہ اور اختتام السلام علیکم کا کہنا ہے، اب اگر کوئی مقتدی اپنے امام کو بحالت قیام پاتا ہے تو اسے چاہیے کہ تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ قیام میں شامل ہو جائے اور سینے پر ہاتھ باندھ لے اور اگر کوئی امام کو بحالت رکوع یا سجدہ یا بحالت جلوس پاتا ہے تو اسے چاہیے کہ تکبیر کہہ کر امام کی ہی حالت اختیار کر لے اسے سینے پر ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے ہاں نماز میں شمولیت کے لیے جن غلطیوں کو دھرایا جاتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے اس لیے مقتدی کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ امام کس حالت میں ہے، تاکہ وہ تکبیر تحریمہ کے ذریعے نماز میں داخل ہو کر امام کی اسی حالت کو اختیار کرے جس حالت میں اسے پاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ امامت کے لیے اپنے سے بہتر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ وعدہ خلافی کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اسے اہل نفاق کی علامت قرار دیا ہے، جو امام بار بار وعدہ خلافی کرتا ہے اسے اس جرم کا احساس دلانا چاہیے اگر توجہ دلانے کے باوجود وعدہ خلافی سے باز نہیں آتا تو اسے امامت سے معزول کر دینا چاہیے۔ البتہ اس کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ محدثین اور ائمہ کرام نے مرتکب کبیرہ کے پیچھے نماز ادا کرنے کو جائز قرار دیا ہے، اسے بنیاد بنا کر جماعت میں کسی قسم کے انتشار کی بنیاد نہ رکھی جائے، افہام و تفہیم کے ذریعے معاملات کو سلجھایا جائے، مساجد کے ائمہ کرام کو چاہیے کہ وہ اپنے منصب کے تقدس کا خیال رکھیں اور ایسے کام سے اجتناب کریں جس سے یہ تقدس مجروح ہوتا ہو، اسے اپنے مقتدیوں کی اصلاح کرنا چاہیے نہ کہ وہ خود ان کے سامنے قابل اصلاح بنتا چلا جائے۔

سوال گوجرانوالہ سے عظمت لکھتے ہیں کہ نماز کے وقت زبان سے نیت کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

جواب نیت دل کا فعل ہے، نماز کے آغاز میں نیت کے وقت دل کی زبان سے ترجمانی کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ طریقہ نبوی کے خلاف ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم سے بھی ایسا کرنا ثابت نہیں ہے، جیسا کہ دیگر اعمال کرتے وقت صرف دل کا ارادہ اور عزم کافی سمجھا جاتا ہے اسی طرح نماز کے لیے بھی دل سے نیت ہونی چاہیے اور اسی نیت پر اعمال کی صحت کا دارومدار ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ا]

سوال مقبول احمد بذریعہ ای میل دریافت کرتے ہیں کہ جماعت کے وقت صف کے درمیان سے کوئی نمازی کسی وجہ سے نماز توڑ کر چلا جاتا ہے یا پچھلی صف سے کسی نمازی نے اسے پیچھے کھینچ لیا اس طرح صف میں پیدا ہونے والا خلا کیسے پُر کیا جائے یا اسے رہنے دیا جائے۔؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت درکار ہے۔

جواب اگر دوران جماعت کسی نمازی کو کوئی عارضہ لاحق ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ نماز جاری نہیں رکھ سکتا اور نماز توڑ کر چلا جاتا ہے تو صف میں پیدا ہونے والا خلا پر کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اسے یونہی رہنے دینا صف بندی کے خلاف ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے جماعت کے وقت صف بندی کو بہت اہمیت دی ہے، صف کو سیدھا رکھنا، کندھے سے کندھا اور ٹخنے سے ٹخنہ ملانا انتہائی ضروری ہے ایسا نہ کرنے کو آپ ﷺ نے دلوں میں اختلاف کا باعث قرار دیا ہے۔ چنانچہ اختیاری حالات میں صفوں کے خلا کو برقرار رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اگر کوتاہی کی وجہ سے دوران صف کوئی خلا رہ جائے تو اسے ''فرجات الشیطان'' یعنی شیطان کے شگاف کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''صفوں کو سیدھا کرو، کندھوں کو برابر رکھو، دوران صف پیدا ہونے والے خلا کو پر کرو، اپنے بھائیوں کے سامنے نرمی کو اختیار کرو، شیطان کے لیے شگاف مت رہنے دو۔ جو نمازی صف ملاتا ہے اللہ اس سے اپنا تعلق جوڑے گا اور جو صف کو توڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے تعلقات توڑے گا۔ [ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ، باب تسویۃ الصفوف، ۶۶۶]

اس وضاحت سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صفوں میں خلا چھوڑنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ بلکہ اسے پر کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں یا بائیں جانب سے امام کی طرف پاؤں ملائے جائیں کیوں کہ مخالف سمت اختیار کرنے سے خلا پر ہونے کے بجائے مزید بڑھے گا جو صف بندی کے خلاف ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے والدہ محمد ایوب لکھتی ہیں کہ ہم نماز کی ابتدا میں دعائے استفتاح کے طور پر ''**سبحانک اللھم وبحمدک**......الخ'' پڑھتے چلے آ رہے ہیں مگر آج کل کسی عالم نے بتایا ہے کہ یہ دعا صحیح نہیں ہے بلکہ ''**اللھم باعد بینی وبین خطایای**......الخ پڑھنی چاہیے۔ اس کے متعلق راہنمائی فرمائیں کہ ہم کونسی دعا پڑھیں۔

جواب مذکورہ دعائے استفتاح متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً و موقوفاً مروی ہے اور محدثین کرام نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کا آغاز کرتے تو مذکورہ دعا پڑھتے۔

[ابوداؤد: الصلوٰۃ ۷۷۶؛ ترمذی: الصلوٰۃ ۲۴۳؛ ابن ماجہ: اقامۃ الصلوات ۸۰۶]

☆ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے اور علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ [مستدرک: ۱/۲۳۵]

لیکن اس کی سند میں ایک راوی حارثہ ہے جس کے متعلق علمائے جرح و تعدیل نے کلام کیا ہے مگر اس حدیث کی ایک دوسری سند سے اسے تقویت پہنچتی ہے۔ [دارقطنی: حدیث نمبر ۱۱۲۸]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''یہ سند منقطع ہونے کے باوجود پہلی روایت کے لیے بہترین مؤید ہے۔ اس بنا پر یہ روایت درجہ حسن تک پہنچ جاتی ہے اگر اس کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ملا دیا جائے تو درجہ صحت تک پہنچ جاتی ہے۔''

[ارواء الغلیل: ۲/۵۰]

☆ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کے وقت نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اللہ اکبر کہہ کر مذکورہ دعا پڑھتے تھے۔ [نسائی: ۲/۱۳۲؛ دارمی: ۱/۲۸۲؛ مسند امام احمد: ۳/۵۰]

شیخ احمد شاکر نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [تحقیق ترمذی: ۲/۱۱]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل:۲/۵۳]

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو اللہ اکبر کہتے پھر اپنے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھاتے اس کے بعد مذکورہ دعا پڑھتے۔ [دار قطنی: حدیث نمبر ۱۱۳۵]

اس حدیث انس رضی اللہ عنہ کو امام طبرانی نے بھی بیان کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً یہ دعا مروی ہے۔ لیکن اس کے بعد **وجھت وجھی للذی** کا بھی ذکر ہے۔ [بیہقی:۱/۳۵]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً یہ دعا پڑھنا منقول ہے۔ [صحیح مسلم: الصلوٰۃ ۸۹۲]

لیکن مسلم کی روایت میں انقطاع ہے۔ کیوں کہ اس میں ایک راوی عبدہ ہے جس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا ہے لیکن امام دار قطنی نے یہ موقوف روایت متعدد اسانید سے موصولاً بیان کی ہے۔ [دار قطنی: حدیث نمبر ۱۱۳۰ تا ۱۱۳۳]

دار قطنی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس روایت کو مرفوعاً بھی بیان کیا ہے تاہم وضاحت کردی ہے کہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ [دار قطنی: حدیث نمبر ۱۱۲۹]

اس روایت کے پیش نظر بہتر ہے کہ صحیحین کی روایت کے مطابق نماز کے آغاز میں ''**اللھم باعد بینی**'' پڑھی جائے لیکن اگر کوئی سہولت کے پیش نظر ''**سبحانک اللھم وبحمدک**'' پڑھتا ہے تو یہ بھی صحیح ہے، متعدد محدثین کرام رضی اللہ عنہم نے مجموعی طور پر مذکورہ بالا روایت کو صحیح اور قابل حجت قرار دیا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال پیراں غائب سے محمد اشرف ندیم سوال کرتے ہیں کہ نماز ظہر اور نماز عصر کی پہلی رکعت میں ثنا پڑھی جاتی ہے۔ کیا اس کی دوسری رکعات میں بھی اسے پڑھنا چاہیے۔

جواب واضح رہے کہ ثنا کا پڑھنا نماز کے آغاز میں ہے یعنی اسے پہلی رکعت میں پڑھنا چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے نماز کے افتتاح میں پڑھتے تھے''۔ [جامع ترمذی: کتاب الصلوٰۃ ۲۴۲]

اس بنا پر دوسری یا تیسری رکعت میں اسے نہیں پڑھنا چاہیے، اگر کوئی آدمی نماز میں امام کے ساتھ پہلی رکعت کے علاوہ دوسری، تیسری یا چوتھی رکعت میں شامل ہوتا ہے تو اسے ثنا پڑھنی چاہیے۔ کیوں کہ بعد میں شامل ہونے والے کی یہ پہلی رکعت ہے ہاں اگر اتنا وقت نہ ہو اور امام کے رکوع چلے جانے کا اندیشہ ہو تو پھر صرف سورۂ فاتحہ پڑھ لی جائے کیوں کہ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اس لیے رکعت فوت ہونے کے اندیشہ کے پیش نظر ثنا کو چھوڑا جا سکتا ہے۔

سوال ملتان سے محمد گلزار عابد سوال کرتے ہیں کہ میں نماز میں رفع الیدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھ کر کرتا ہوں جب کہ میرے والدین اس کے خلاف ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ اس سنت کو چھوڑ دیا جائے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج اور جہاد کے موقع پر اطاعت والدین کو ترجیح دی تھی، اب مجھے بتایا جائے کہ والدین کی اطاعت کس حد تک کروں تا حال سنت پر سختی سے پابند ہوں، لیکن پریشان رہتا ہوں کہ اللہ کے ہاں والدین کا نافرمان نہ لکھا جاؤں، کیا مجھے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا چاہیے یا والدین کی اطاعت کرتے ہوئے اسے ترک کر دینا چاہیے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ رفع الیدین ایک ایسی سنت ہے جس کا ترک رسول اللہ ﷺ سے ایک دفعہ بھی ثابت نہیں ہے، اس کے متعلق مروی احادیث حد تواتر کو پہنچتی ہیں اور نہ ہی اس سنت کا نسخ ثابت ہے، جیسا کہ بعض اہل علم کی طرف سے دعویٰ کیا جاتا ہے، نیز یہ عمل اس معنی میں سنت نہیں کہ اگر اسے ادا نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس معنی میں سنت ہے کہ نماز ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے اور ''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ ''(اس طریقہ کے مطابق نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے) کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بغیر نماز نہ پڑھی جائے بلکہ اس کے بغیر نماز پڑھنا ادھوری اور نامکمل نماز ہے، اس کے علاوہ اس سنت میں اللہ کی عظمت و کبریائی کا بھی اظہار ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر اس ادا کو عمل میں لایا جائے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنایا ہے۔ اور آپ کی کسی سنت کو مصلحت یا رواداری کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے باقی رہا مسئلہ اطاعت والدین کا تو اس کی کچھ حدود و قیود ہیں، اس کے متعلق شریعت کا ایک بنیادی اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی بات کو نہ مانا جائے اور نہ اس پر عمل کیا جائے۔ لہٰذا رفع الیدین کی سنت پر عمل کرنے پر والدین کا اس پر ناراض ہونا برمحل نہیں ہے۔ حج اور جہاد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے خدمت والدین کے لیے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا تھا، کیوں کہ والدین کی خدمت دینِ اسلام کا ایک اہم تقاضا ہے اور اسے ادا کرتے رہنا چاہیے۔ تاہم ادب و احترام کے دائرہ میں رہتے ہوئے والدین کو رفع الیدین کی سنت کا احساس دلایا جائے کہ نبی اکرم ﷺ نے زندگی بھر رفع الیدین کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس پیاری سنت کے ساتھ ہی نمازیں ادا کرتے رہے تو ہم سب کو بھی نبی کریم ﷺ کی اس سنت مطہرہ پر عمل کرتے ہوئے ہی نمازیں ادا کرنی چاہئیں اور اس سلسلہ میں والدین کے ساتھ نرمی اور حسنِ سلوک کا بھی برتاؤ کیا جائے۔ امید ہے کہ اللہ کے ہاں رفع الیدین کی اہم سنت پر عمل کرنے میں آپ والدین کے نافرمان نہیں ٹھہریں گے۔

سوال رحیم یار خان سے محمد ادریس لکھتے ہیں کہ نماز کے اوقات اور ان کی ادائیگی کا طریق کار سکھانے کے لیے حضرت جبرائیل علیہ السلام دو دن مسلسل آتے رہے۔ کیا مکی دور کے طریق کار اور رسول اللہ ﷺ کے آخری ایام میں نماز کی ادائیگی کے متعلق کوئی فرق تھا تو اسے واضح کیا جائے جیسا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نماز میں رفع الیدین پہلے تھا بعد میں اسے منسوخ کر دیا گیا، قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے پاس رسول اکرم ﷺ کو اوقات و طریقہ نماز بتانے کے لیے حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے، رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو نماز کے متعلق کچھ نئے احکام نازل ہوئے اور کچھ احکام ایسے بھی تھے جن کی مدت ختم ہونے پر انہیں ختم کر دیا گیا، مثلاً دوران نماز پہلے کسی ضرورت کے پیش نظر گفتگو کرنے کی اجازت جسے منسوخ کر دیا گیا۔ چنانچہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''کہ ہمیں پہلے دوران نماز گفتگو کرنے کی اجازت تھی۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کے حضور ادب سے کھڑے ہوا کرو۔'' [بخاری: کتاب العمل فی الصلوٰۃ، باب ما ینھی من الکلام فی الصلوٰۃ، رقم ۱۲۰۰]

پھر ہمیں نماز میں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔

اسی طرح سلام پھیرتے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے جیسا کہ گھوڑا اپنی دم کو ہلاتا ہے، تاہم بعد میں اس سے منع کر دیا گیا۔

''نماز کی رکعات پہلے دو، دو تھیں، بعد میں ظہر، عصر اور عشاء کی نماز جب حضر میں پڑھی جائے تو اس میں مزید دو، دو رکعات کا اضافہ کر دیا گیا البتہ سفر کی نماز کو اپنی حالت پر برقرار رکھا گیا''۔ [مسلم: کتاب الصلوٰۃ، باب الامر بالسکون فی الصلوٰۃ، رقم ۹۶۸]

لیکن رفع الیدین ایک ایسی سنت ثابتہ ہے، جس میں کسی وقت کسی صورت میں نسخ ثابت نہیں ہے، رفع الیدین کے چار مواقع ہیں، تکبیر تحریمہ کے وقت، رکوع جاتے وقت، رکوع سے سر اٹھاتے وقت اور تیسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت، تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین پر تمام امت کا اجماع ہے اور باقی تین مقامات میں رفع الیدین کرنے پر بھی اہل کوفہ کے علاوہ تمام علمائے امت کا اتفاق ہے۔ بقول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اظہار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر اس سنت پر عمل کیا، اس سنت متواترہ کو عشرہ مبشرہ کے علاوہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بیان کرتے اور اس پر عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سبیل المومنین کی اتباع کے پیش نظر تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ رکوع جاتے، اس سے سر اٹھاتے وقت اللہ کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے رفع الیدین کریں، اس کے علاوہ دعویٰ نسخ یا منافی سکون کا شوشہ، عدم دوام کا شاخسانہ، سنت غیر مؤکدہ کی تحقیق، غیر فقیہ راویوں کا غیر درایتی نکتہ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سنت کو ثابت کرنے کے لیے ایک مستقل رسالہ ''جزء رفع الیدین'' لکھا ہے جو استاذی المکرم حضرت شاہ بدیع الدین راشدی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے مطبوع و متداول ہے۔

سوال ڈیرہ نواب سے عبد العلی لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر دورانِ جماعت مقتدی حضرات بعض آیات کے اختتام پر با آواز بلند ان کا جواب دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب مختلف حضرات کی طرف سے ہمیں یہ سوال موصول ہوا ہے مسئلہ کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر ہم اسے ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں تا کہ اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دورانِ قرأت یہ معمول بیان کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسبیح پر مشتمل آیات تلاوت کرتے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے اور جب کبھی سوال کی آیت سے گزرتے تو سوال کرتے، اسی طرح جب کبھی تعوذ کی آیات پڑھتے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے۔ [مسلم: کتاب صلوٰۃ المسافرین]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول اگرچہ صلوٰۃ اللیل سے متعلق ہے تاہم محدثین کرام نے اسے عام رکھا ہے یعنی جب بھی کوئی ایسی آیات کی تلاوت کرے جس میں اللہ کی تسبیح یا پناہ یا سوال کا ذکر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے اس وقت اللہ کی تسبیح کرے، اللہ سے سوال کرے نیز دینی اور دنیوی ضرر رسیاں، نقصان اور خسران سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ دوران قرأت یہ ایک عام ہدایت ہے۔ جس کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔ واضح رہے کہ یہ ہدایت صرف قاری یعنی پڑھنے والے کے لیے ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع صرف اس معنی میں تمام افراد امت کے لیے عام ہے جب فرد کی حالت بھی وہی ہو جس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام سرانجام دیا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد ہم جن آیات کا جواب دیا جاتا ہے اس کی حیثیت بیان کرتے ہیں۔

① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ پڑھتے تو ((سُبْحَانَ رَبِّيَ

الاَعْلٰی)) کہتے۔ [سنن ابوداؤد]

یہ تسبیح پر مشتمل آیت پڑھنے کے بعد تسبیح بیان کرنے کا عملی نمونہ ہے، اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث کے بیان کرنے میں حضرت وکیع کی دوسرے طرق سے مخالفت کی گئی ہے۔اس حدیث کو جب حضرت ابووکیع بن جراح اور حضرت شعبہ بیان کرتے ہیں تو اسے مرفوع کے بجائے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً بیان کرتے ہیں''۔

اس کا مطلب ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے، اس کے علاوہ حضرت معمر نے بھی حضرت وکیع کی مخالفت کرتے ہوئے اسے موقوف بیان کیا ہے۔ [مصنف عبدالرزاق:۲/۴۵۲]

لیکن حضرت وکیع بھی چونکہ ثقہ راوی ہیں اس لیے ان کا مرفوع بیان کرنا ایک اضافہ ہے جسے محدثین کرام کے اصول کے مطابق قبول کیا جانا چاہیے اس لیے یہ روایت مرفوع ہوگی۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت اسی سند سے بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث شیخین بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ [مستدرک حاکم:۱/۲۶۷]

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے یونہی برقرار رکھا ہے (تلخیص المستدرک) اگر یہ روایت موقوف بھی ہو تو بھی اسے مرفوع کا حکم دیا جائے گا کیوں کہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اجتہاد کو کوئی دخل نہیں ہے واضح رہے کہ آیات کا جواب دینے کا یہ عمل صرف قاری یعنی پڑھنے والے کے لیے ہے خواہ دورانِ نماز ہی کیوں نہ ہو، سامع کے لیے نہیں ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر عمل ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق روایت میں ہے کہ انہوں نے جمعہ کی نماز میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی﴾ پڑھا تو ((سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی)) کہا۔ [سنن بیہقی:۲/۳۱۱]

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی وضاحت ہے کہ انہوں نے نماز میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی﴾ کے جواب میں ((سبحان ربی الاعلیٰ)) کہا۔ [بیہقی:۲/۳۱۱]

ان احادیث وآثار کے پیشِ نظر اگر کوئی نماز میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی﴾ پڑھتا ہے تو اسے جواب میں ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہنا چاہیے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نمونہ ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس نمونے کو اپنایا ہے مگر اسے مقتدیوں کے لیے جواب دینے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

☆ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی تم میں سے ﴿وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ﴾ پڑھے۔اور ﴿اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ﴾ ''تک پہنچے تو اسے ((بَلٰی وَاَنَا عَلٰی ذَالِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ)) کہنا چاہیے۔ [مسند امام احمد:۲/۲۴۹]

اس روایت کو بھی مقتدی حضرات کے لیے جواب دینے کی دلیل بنایا جاتا ہے لیکن یہ روایت بھی محدثین کرام کے قائم کردہ معیارِ صحت پر پوری نہیں اترتی کیوں کہ اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والا ایک راوی مجہول ہے جس کے حالات کا کوئی سراغ نہیں ملتا محدثین کی بیان کردہ شرائط کے مطابق جس روایت میں ''جہالت'' پائی جائے وہ ضعیف اور ناقابل حجت ہوتی

ہے۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

''یہ روایت صرف اسی سند کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے اعرابی کا نام مذکورہ نہیں''۔ [جامع ترمذی: حدیث نمبر ۳۳۴۷]

مصنف عبدالرزاق میں یہ روایت اعرابی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بغیر بیان ہوئی ہے لیکن یہ اس لیے نا قابلِ قبول ہے کہ اس کی سند سے دو راوی ساقط کر دیے گئے ہیں۔ [مصنف عبدالرزاق: ۲/۴۵۲]

☆ حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی ﴿لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیَامَۃِ﴾ پڑھے تو اس کی آخری آیت کی تلاوت کے بعد اسے ''بَلٰی'' کہنا چاہیے۔ [مسند امام احمد: ۲/۲۴۹]

اس روایت میں بھی وہی سقم ہے جو اس سے پہلے والی میں بیان ہو چکا ہے کیوں کہ یہ ایک ہی روایت ہے جسے ہم مسئلہ کی وضاحت کے پیش نظر الگ الگ بیان کر رہے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص اپنے مکان کی چھت پر نماز پڑھا کرتا تھا جب وہ سورۃ قیامۃ کی اس آخری آیت کو تلاوت کرتا تو اس کے بعد ''سُبْحَانَکَ بَلٰی'' کہتا جب لوگوں نے اس سے پوچھا تو بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہتے سنا ہے۔ [بیہقی: ۲/۳۱۰]

اوّل: تو اس روایت میں ایک راوی موسیٰ بن ابی عائشہ ہے جس کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے کسی صحابی سے یہ حدیث سنی ہو جس کا ذکر مذکورہ روایت میں ہے اور اس روایت کو موسیٰ بن ابی عائشہ کے علاوہ دوسرا کوئی بیان کرنے والا بھی نہیں ہے۔

ثانیاً: یہ صرف قاری کے لیے ہے۔مقتدی حضرات کے لیے جواب دینے کی دلیل یہ واقعہ نہیں بن سکتا۔

☆ حدیث میں ہے کہ تم میں سے اگر کوئی سورۃ مرسلات کی تلاوت کرے تو ﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ﴾ پڑھنے کے بعد اٰمَنَّا بِاللّٰہِ کہے۔ [بیہقی: ۲/۳۱۰]

اس حدیث میں وہی سقم ہے جس کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے کیوں کہ یہ بھی پہلی روایت کا ایک حصہ ہے۔

☆ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم کے سامنے سورۃ رحمٰن تلاوت فرمائی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے یہ سورت جنوں کے سامنے پڑھی تھی تو وہ جواب دینے میں تم سے بڑھ کر تھے۔میں جب بھی ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ پڑھتا تو وہ جواب میں ''لَا بِشَیْءٍ مِنْ نِّعَمِکَ رَبَّنَا نُکَذِّبُ فَلَکَ الْحَمْدُ'' کہتے تھے۔ [سنن ترمذی حدیث نمبر: ۳۲۹۱]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ [جامع ترمذی: کتاب التفسیر]

لیکن علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ [مشکوٰۃ تحقیق البانی: ۱/۲۷۳]

لیکن اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ جنوں کا جواب دینا دورانِ نماز تھا بلکہ قرائن ایسے ملتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت نماز کے علاوہ کسی اور وقت تلاوت کی تھی کیوں کہ صرف جنوں کی جماعت کرانا کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہے۔

☆ ہمارے ہاں عام طور پر سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر "اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا" کے الفاظ بطور جواب امام اور مقتدی حضرات کی طرف سے باآواز بلند ادا کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ کسی صحیح حدیث میں ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر یہ کلمات کہے ہوں۔ البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک بیان کتب حدیث میں موجود ہے کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی کسی نماز میں یہ کہتے ہوئے سنا: "اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَاباً یَّسِیْرًا"۔ [مسند امام احمد: ۶/۴۸]

لیکن اس دعا کا تعلق سورۃ غاشیہ کے اختتام سے نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات بطور جواب کہے ہوں بلکہ آپ ان کلمات کو بطور دعا پڑھتے تھے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "کہ اس دعا کو تشہد میں سلام سے پہلے پڑھا جاسکتا ہے۔" انہوں نے اس دعا کو ان دعاؤں میں ذکر کیا ہے جو بوقت تشہد سلام سے پہلے پڑھی جاتی ہیں۔ [صفۃ صلوٰۃ النبی ﷺ: ۲۰۱، الدعا قبل السلام وانواعہ]

خلاصہ کلام حسب ذیل ہے:

☆ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی﴾ کی تلاوت کے وقت صرف امام کو سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کی اجازت ہے۔ کیوں کہ یہ عمل متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے۔ یعنی وہ جب اس کی تلاوت کرتے تو جواب کے طور پر سبحان ربی الاعلیٰ کہتے۔

☆ باقی جوابات پر مشتمل روایات محدثین کرام کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں جن حضرات کے ہاں ضعیف روایت پر عمل کرنے کی گنجائش ہے وہ اگر انہیں عمل میں لانا چاہیں تو یہ قرأت کے وقت تو ہوسکتا ہے جبکہ وہ خود تلاوت کررہے ہوں مقتدی حضرات کے لیے جواب دینے کا جواز ان روایات سے ثابت نہیں ہوتا۔

☆ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ کا جواب خارج از نماز سننے کے لیے دیا جاسکتا ہے کیوں کہ دوران نماز رسول اللہ ﷺ کا تلاوت فرمانا اور جنوں کا جواب دینا اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ جو تلاش بسیار کے باوجود ہمیں نہیں مل سکتا ہے۔

سورۃ غاشیہ کے اختتام پر "اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَّسِیْرًا" جیسے کلمات سے جواب دینا تو انتہائی محل نظر ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال کیا نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بغیر سورۃ الفاتحہ پڑھی جاسکتی ہے؟ (فاطمہ بیگم: ناگرہ)

جواب نماز میں جب سورۃ فاتحہ پڑھی جائے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم آہستہ پڑھنا چاہیے۔ خواہ نماز سری ہو یا جہری، جن روایات میں نماز کو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ سے شروع کرنے کا ذکر ہے اس سے یہی مراد ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کو باآواز بلند نہ پڑھا جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ سرے سے بسم اللہ ہی نہ پڑھی جائے۔ چنانچہ امام مسلم رحمہ اللہ نے ایک باب یوں قائم کیا ہے: "بسم اللہ کو باآواز بلند نہ پڑھنے کی دلیل" اس کے تحت وہ حدیث لائے ہیں: "حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر صدیق، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی وہ بلند آواز سے بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے۔ [حدیث نمبر: ۳۹۹]

سوال پیراں غائب سے محمد اشرف ندیم سوال کرتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورت ملانے کا کیا ضابطہ ہے، سری، جہری، انفرادی اور امام کے ساتھ نماز ادا کرتے وقت ان تمام صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے تسلی بخش جواب دیں:

جواب نماز میں سورت فاتحہ کے بعد دوسری سورت ملانے کے متعلق عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلی دو رکعات میں سورت ملانا چاہیے۔

اس کے علاوہ کسی موقع پر یہ سورت ملانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی اس صورت میں ہے جب اکیلا نماز ادا کر رہا ہو۔ اگر امام کے پیچھے ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں: (الف) سری۔ (ب) جہری۔ یعنی جن رکعات میں امام آواز بلند قرأت کرتا ہے ان میں مقتدی کو صرف سورت فاتحہ پڑھنا چاہیے۔ امام کی باقی قرأت خاموشی سے سنی جائے اور جن رکعات میں امام آہستہ قرأت کرتا ہے ان میں مقتدی مذکورہ بالا قاعدہ کے مطابق پہلی دو رکعات میں سورت فاتحہ کے ساتھ کوئی بھی دوسری سورت ملا سکتا ہے، ان کے علاوہ دیگر رکعات میں صرف فاتحہ پر اکتفا کیا جائے، اکیلا آدمی بھی صرف فاتحہ پر اکتفا کرتے ہوئے پوری نماز ادا کر سکتا ہے۔ بعض حالات میں اس کی گنجائش ہے جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز نہ پڑھنے والے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تھا کہ تو نماز میں کیا کرتا ہے تو اس نے جواب دیا تھا کہ میں فاتحہ پڑھتا ہوں اللہ سے جنت مانگتا ہوں اور جہنم سے محفوظ رہنے کا سوال کرتا ہوں۔ تو آپ نے اس کی تصویب فرمائی تھی۔ [صحیح ابن خزیمہ: کتاب الصلوٰۃ]

اس طرح پہلی دو رکعات کے علاوہ تیسری اور چوتھی رکعات میں سورت فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورت بھی ملائی جا سکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دو رکعت میں اندازاً پندرہ آیات پڑھتے تھے"۔ [مسند امام احمد]

اس سے معلوم ہوا کہ سورت فاتحہ کے علاوہ مزید قرأت بھی کی جا سکتی ہے کیوں کہ سورۂ فاتحہ کی تو سات آیات ہیں۔

[واللہ اعلم]

سوال فتح پور سے ابو سیف مکی خریداری نمبر ۲۹۳۵ لکھتے ہیں کہ اگر امام جہری نمازوں میں کسی بڑی سورت سے چند آیات کی قرأت کرتا ہے تو کیا اسے مضمون اور ترجمہ کا خیال رکھنا چاہیے یا نہیں۔ بعض اوقات امام کسی آیت پر قرأت ختم کر دیتا ہے حالانکہ اس آیت کا تعلق آئندہ آیات سے بھی ہوتا ہے۔

جواب نماز میں قرأت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول یہی تھا کہ آپ ہر رکعت میں مکمل سورت تلاوت کرتے تھے۔ تاہم سورت کا کچھ حصہ یا بعض آیات کی تلاوت بھی کتب حدیث میں مروی ہے چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ دو سورتیں ایک رکعت میں پڑھنا، سورتوں کی آخری آیات یا ابتدائی آیات یا سورتوں کو تقدیم وتاخیر سے پڑھنے کا بیان۔ [کتاب الاذان: باب نمبر ۱۰۶]

پھر آپ نے اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے کچھ آثار وروایات پیش کی ہیں جو اس مسئلہ کے اثبات کے لیے کافی ہیں اس لیے نماز میں جہاں سے چاہیں قرآن پڑھ سکتے ہیں۔ اس کے متعلق کوئی پابندی نہیں ہے تاہم بہتر ہے کہ اختتام کے وقت مضمون کا خیال رکھا جائے۔ قرائے کرام اور اہل علم حضرات کے نزدیک قرأت کا مسنون اور پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ ہر آیت کے اختتام پر وقف کیا جائے اور اسے الگ الگ پڑھا جائے۔ فصل ووصل کی اصطلاحات خیر القرون سے بعد کی پیداوار ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قرأت کرتے تو ہر آیت کو علیحدہ علیحدہ پڑھتے۔ [مسند امام احمد: ج ۶، ص ۳۰۲]

بلکہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ کی قرأت کے وقت تمام حروف وکلمات واضح اور علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔ [ترمذی: فضائل قرآن، ۲۹۲۳]

ایک روایت میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ﴿الحمد لله رب العالمين﴾ پڑھتے تو ٹھہرتے پھر ﴿الرحمن الرحيم﴾ پڑھتے تو پھر ٹھہرتے۔ [ترمذی: القراءت، ۲۹۲۷]

ان احادیث کے پیش نظر ہم کہتے ہیں کہ مساجد کے قراء کرام کو کم ازکم ترجمہ قرآن ضرور پڑھے ہونا چاہیے تو آیات کے اختتام کے وقت انہیں پتہ ہو کہ ان کا مابعد آیات سے تعلق ہے یا نہیں۔ تاہم اگر کوئی اس بات کا خیال نہیں رکھتا تو اس سے نماز کی ادائیگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔

سوال دورانِ نماز قرأت کے لیے کیا قرآنی سورتوں کی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے.....؟

جواب نماز یا غیر نماز میں قرآن مجید کو موجودہ ترتیب کے برعکس پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں آخری مرتبہ جو حضرت جبرائیل علیہ السلام سے قرآن مجید کا دور کیا تھا وہ اس موجودہ ترتیب کے مطابق تھا۔ تاہم قرأت کے وقت اس کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں ہے۔ مجتہد مطلق اور فقیہہ کامل حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''دو سورتوں کا ایک رکعت میں پڑھنا'' سورتوں کی آخری آیات کی تلاوت، موجودہ ترتیب کے برعکس سورتوں کا پڑھنا یا سورتوں کی ابتدائی آیات کا پڑھنا'' پھر آپ نے اپنے دعاوی کو ثابت کرنے کے لیے متعدد دلائل دیئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

☆ احنف بن قیس نے پہلی رکعت میں سورۃ کہف اور دوسری رکعت میں سورۃ یوسف یا سورۃ یونس کو تلاوت کیا پھر وضاحت فرمائی کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز صبح ادا کی تو آپ نے اسی طرح پہلی رکعت میں سورۃ کہف اور دوسری میں سورۂ یوسف یا یونس کو تلاوت فرمایا۔ [صحیح بخاری]

☆ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھے ان دو سورتوں کا بخوبی علم ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ ملا کر نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ [صحیح بخاری]

ان سورتوں کی تفصیل سنن ابی داؤد میں موجود ہے، ان میں متعدد سورتوں کے جوڑے موجودہ ترتیب کے خلاف ہیں۔ مثلاً: سورۃ طور اور ذاریات، سورۃ تطفیف اور عبس، سورۃ نبا اور مرسلات، سورۃ دھر اور قیامہ وغیرہ۔

☆ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ ایک انصاری مسجد قبا میں امامت کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور وہ سورۃ فاتحہ کے بعد سورۃ اخلاص پڑھ کر پھر کوئی اور سورت ساتھ ملاتا اسی طرح دوسری رکعت میں کرتا، رسول اللہ ﷺ کے پاس جب اس کا تذکرہ ہوا تو آپ نے اس عمل کی تصویب فرمائی۔'' [صحیح بخاری]

☆ ان دلائل کے علاوہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ نماز تہجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہوا تو آپ ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۃ بقرہ، سورۃ نساء پھر سورۃ آل عمران تلاوت فرمائی۔ [صحیح مسلم حدیث نمبر: ۱۸۱۲]

ان تمام احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ ترتیب کے برعکس پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے بیگم عبد الاحد خریداری نمبر ۱۰۱۷ لکھتی ہیں کہ نماز میں قرأت کرتے وقت قرآنی سورتوں کی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے یا اسے بلا ترتیب بھی پڑھا جاسکتا ہے نیز عصر یا ظہر کی آخری دو رکعت میں فاتحہ کے علاوہ قرأت کی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب نماز میں قرأت کرتے وقت قرآنی سورتوں کی ترتیب کا خیال رکھنا ضروری نہیں ہے۔ تاہم بہتر ہے اس کا خیال رکھا جائے۔ کیوں کہ عام طور پر جن سورتوں کو رسول اللہ ﷺ نے نماز میں پڑھا ہے ان میں ترتیب کا خیال رکھا ہے البتہ بعض اوقات بلا ترتیب پڑھنا بھی منقول ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نماز میں پہلے سورۃ البقرہ، پھر سورۃ نساء اور پھر آل عمران پڑھی۔ [مسند امام احمد: ج۵ ص۳۸۲]

حالانکہ سورۂ نساء، سورۂ آل عمران کے بعد ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق اپنی صحیح میں مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ دوران نماز قرأت کرتے وقت تقدیم وتاخیر میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نیز ظہر اور عصر کی آخری دو رکعات میں بھی فاتحہ کے علاوہ قرأت کی جاسکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی آخری دو رکعات میں پندرہ آیات کے برابر قرأت کرتے تھے۔

[ابوداؤد: الصلوٰۃ ۸۰۵]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخری دو رکعات میں سورۂ فاتحہ کے بعد قرأت کرنا مسنون عمل ہے۔ اگر کوئی آخری دو رکعات میں صرف فاتحہ پڑھتا ہے تو بھی جائز ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات آخری دو رکعت میں صرف سورۂ فاتحہ کی قرأت کرتے تھے۔ [صحیح بخاری: صفۃ الصلوٰۃ ۷۷۶]

لہٰذا اس میں وسعت ہے دونوں طرح عمل کیا جاسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال منڈی احمد آباد سے محمد رفیق ساجد کہتے ہیں کہ ظہر اور عصر کی نماز میں سری قرأت کی کیا حکمت ہے.....؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کے لیے اس کی حکمتیں تلاش نہیں کرتے تھے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی سنت صحیح سند سے ثابت ہو جائے تو اسے عمل میں لانا چاہیے، اس کی حکمت معلوم ہونے تک توقف نہیں کرنا چاہیے، صورت مسئولہ کے متعلق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز میں قرأت کرتے تھے جہاں آپ نے بآواز بلند پڑھا وہاں ہم بھی آہستہ سے پڑھتے ہیں اور جہاں آپ نے آہستہ پڑھا وہاں ہم بھی اونچی آواز سے پڑھتے ہیں اور جہاں آپ نے آہستہ پڑھا ہم بھی وہاں آہستہ پڑھتے ہیں۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۷۷۱]

علما نے بیان کیا ہے کہ ذکر الٰہی کی دو اقسام ہیں: (الف) جہری۔ (ب) سری۔ رات کی نمازوں میں بآواز بلند قرأت ہوتی ہے، اور دن کی نمازوں میں قرأت آہستہ ہوتی ہے، تاکہ نمازی دونوں قسم کے اذکار پر عمل پیرا ہو سکے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''چونکہ دن کے وقت شور وشغب ہوتا ہے ایسی حالت میں جہری قرأت مفید نہیں ہوتی اس لیے دن کے وقت آہستہ قرأت کا حکم دیا گیا ہے اس کے برعکس رات کے وقت سکون اور ٹھہراؤ ہوتا ہے لوگ جہری قرأت سے مستفید ہوتے ہیں اس لیے رات کے وقت جہری قرأت کا حکم رکھا گیا ہے۔ جمعہ وعیدین میں چونکہ مجمع کثیر ہوتا ہے اس لیے اجتماع کے پیش نظر جہر مناسب ہے۔ واللہ اعلم۔

سوال ڈھولن ہٹھارے سے حافظ محمد مرتضیٰ ساجد خریداری نمبر ۱۱۴۸ لکھتے ہیں کہ کیا نوافل میں قرآن مجید سے دیکھ کر قرأت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز سونے سے پہلے سورۃ الملک اور سورۃ سجدہ پڑھنے کے متعلق حدیث میں آیا ہے اگر ان دونوں سورتوں کو نوافل میں

پڑھ کر سو جائے تو کیا ایسا کرنا درست ہے۔

جواب نماز میں قرآن کریم سے دیکھ کر قرأت کی جا سکتی ہے لیکن اس پر دوام درست نہیں ہے چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک ذکوان نامی غلام جماعت کراتے ہوئے قرآن سے دیکھ کر قرأت کرتا تھا۔ [صحیح بخاری تعلیقا: باب امامۃ العبد]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام ابو داؤد نے اپنی تالیف المصاحف، اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے موصولاً بیان کیا ہے اور رمضان المبارک میں تراویح پڑھاتے ہوئے وہ ایسا کرتے تھے، بعض حضرات نے عمل کثیر کی وجہ سے اسے ناپسند کیا ہے لیکن اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیوں کہ سیدنا عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے یہ عمل سرانجام پاتا تھا اگر ناپسند ہوتا تو آپ ضرور منع فرمادیتیں، نیز بعض اوقات اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے، جب دوران نماز بچہ اٹھانا جائز ہے تو قرآن کریم اٹھانے میں چنداں حرج نہیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نواسی حضرت امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا کو نماز میں اٹھالیتے تھے۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۵۱۶]

البتہ اسے بطور عادت اپنانا درست نہیں بلکہ زبانی یاد کر کے پڑھنا ہی افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سونے سے پہلے سورۃ الملک اور سورۃ السجدہ پڑھتے تھے۔ [ترمذی]

لیکن پڑھنے کی کیفیت کا ذکر احادیث میں نہیں ہے۔ اس اطلاق کے پیش نظر انہیں نوافل میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ کبھی نوافل میں پڑھ کر سو جائے اور کبھی سونے سے پہلے ویسے تلاوت کرے۔

سوال منڈی احمد آباد سے محمد رفیق ساجد لکھتے ہیں کہ دوران جماعت اگر امام بحالت رکوع ہو تو کیا ساتھ شامل ہونے والا تکبیر کے بعد قیام میں ہاتھ باندھ کر پھر رکوع میں شامل ہوگا یا اسے فوراً رکوع میں شامل ہو جانا چاہیے۔

جواب دوران نماز ہمیں امام کی متابعت کا حکم ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ امام جس حالت میں ہو نمازی نماز میں شامل ہو کر وہی حالت اختیار کرے، چونکہ نماز میں داخل ہونے کے لیے تکبیر تحریمہ اور ہاتھوں کا اٹھانا ضروری ہے۔ یہ عمل بجالانے کے بعد اگر امام رکوع میں ہے تو مقتدی کو چاہیے کہ وہ رکوع میں چلا جائے، اسے قیام کر کے سینہ پر ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں ہے ایسا کرنا سنت سے ثابت نہیں ہے اگر امام رکوع میں ہے اور مقتدی شامل ہونے کے بعد قیام میں ہاتھ باندھ لے تو یہ امام کی مخالفت ہے۔ جس کی حدیث میں سخت ممانعت ہے واضح رہے کہ ہمیں مخالفت اور مسابقت سے منع کیا گیا ہے۔ صرف امام کی متابعت کا حکم ہے، موافقت صرف دو امور میں ہے ایک آمین کہنے میں اور دوسرے **سمع اللہ لمن حمدہ** کہنے میں، ان کے علاوہ جملہ امور میں متابعت کا حکم ہے۔ لہٰذا مقتدی کو چاہیے کہ وہ نماز میں شامل ہو کر وہی صورت اختیار کرے جس حالت میں امام ہے اگر امام سجدہ میں ہے تو سجدہ میں چلا جائے، اگر وہ تشہد میں بیٹھا ہے تو مقتدی بھی تشہد میں بیٹھ جائے، نماز میں داخل ہونے کے بعد قیام کر کے ہاتھ باندھنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ الا یہ کہ امام بھی اسی حالت میں ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال منڈی احمد آباد سے محمد رفیق ساجد لکھتے ہیں کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت ہو جائے گی یا نہیں۔

جواب نماز دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے، قیامت کے دن سب سے پہلے اس سے متعلق باز پرس ہوگی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کچھ لوازمات و ارکان اور شرائط ہیں، ان میں سے قیام اور قرأت سورۂ فاتحہ سرفہرست ہیں، ان کی ادائیگی

کے بغیر نماز نہیں ہوتی، نماز میں بحالت رکوع شامل ہونے والا ان دونوں سے محروم رہتا ہے، لہٰذا اس حالت میں امام کے ساتھ شامل ہونے والے کو رکعت دوبارہ ادا کرنا ہوگی، چنانچہ حدیث میں ہے: ''کہ جس قدر نماز امام کے ساتھ پاؤ وہ پڑھ لو اور جو (نماز کا حصہ) رہ جائے اسے بعد میں پورا کرلو۔'' [صحیح بخاری]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف جزء القراءت میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے، رکعت شمار کرنے کے متعلق جو صریح روایات ہیں وہ صحیح نہیں ہیں اور جو صحیح ہیں وہ صریح نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے ایک خاتون سوال کرتی ہیں کہ دورانِ جماعت مقتدی کو رکوع سے اٹھنے کے بعد ''سمع اللہ لمن حمدہ'' پڑھنا چاہیے یا صرف ''ربنا ولک الحمد'' ہی کہہ دینا کافی ہے؟

جواب امام، مقتدی اور منفرد سب رکوع سے اٹھتے وقت ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہیں اور سیدھے کھڑے ہونے کے بعد انہیں ''ربنا ولک الحمد'' کہنا چاہیے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کہتے، پھر جب رکوع کرتے تو اللہ اکبر کہتے۔ رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ کہتے، پھر جب سیدھے کھڑے ہوتے تو ربنا ولک الحمد کہتے۔ [صحیح بخاری: الاذان ۷۸۹]

اور ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ نماز اس طرح ادا کرنی چاہیے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔
[صحیح بخاری: الاذان ۶۳۱]

البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب امام سمع اللہ لمن حمدہ'' کہے تو ''ربنا ولک الحمد'' کہو۔ [صحیح بخاری: الاذان ۷۳۲]

اس حدیث سے بعض حضرات نے استنباط کیا ہے کہ مقتدی کو ''سمع اللہ لمن حمدہ'' نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن یہ استنباط اس لیے درست نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دوران نماز دونوں کلمات کا کہنا ثابت ہے اور ہمیں اس طرح نماز پڑھنے کا حکم ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے۔ نیز اس استنباط کا مطلب یہ ہے کہ امام کو ربنا ولک الحمد نہیں کہنا چاہیے۔ حالانکہ ایسا کرنا صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

واضح رہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ مقصد نہیں کہ اس موقع پر امام اور مقتدی کو کیا کہنا چاہیے۔ بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مقتدی کا ربنا ولک الحمد امام کے سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے بعد ہونا چاہیے۔ اس کی مزید وضاحت علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ''صفۃ الصلوٰۃ'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال سرگودھا سے محمد یونس انصاری سوال کرتے ہیں کہ دوسری رکعت کے لیے ہاتھوں کے سہارے اٹھنا چاہیے یا مٹھی بند کر کے، کتاب و سنت کے حوالہ سے اٹھنے کی کیفیت کو وضاحت سے بیان کریں۔

جواب دوسری رکعت کے لیے اٹھتے وقت کچھ لوگ اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگا کر اٹھنے کے بجائے سیدھے تیر کی طرح اٹھتے ہیں اور بطور استدلال یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دونوں ہاتھوں پر ٹیک لگائے بغیر تیر کی مانند اٹھتے تھے

لیکن یہ حدیث من گھڑت اور موضوع ہے کیوں کہ اس کی سند میں خصیب بن حجدر نامی ایک راوی کذاب ہے۔[مجمع الزوائد:۲/۱۳۵]

نیز یہ روایت صحیح بخاری کی اس حدیث کے بھی خلاف ہے، جس میں صراحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دوسرے سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھاتے تو بیٹھتے زمین پر ٹیک لگاتے پھر دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے، اب سوال یہ ہے کہ زمین پر ٹیک لگا کر اٹھتے وقت ہاتھوں کی کیفیت کیا ہو، کیا کھلے ہاتھوں اٹھنا چاہیے یا مٹھی بند کر کے کھڑے ہونا چاہیے، اس کے متعلق ازرق بن قیس رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ نماز میں جب (دوسری رکعت کے لیے) کھڑے ہوتے تو آٹا گوندھنے والے کی طرح مٹھی بند کر کے زمین پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے، میں نے ان سے اس کے متعلق سوال کیا تو فرمایا: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔" [غریب الحدیث لابی اسحاق الحربی:۲/۵۲۵]

اگرچہ اس روایت پر ہیثم بن عمران کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہے لیکن امام ابن حبان نے اسے کتاب الثقات میں ذکر کیا ہے۔ [۷/۵۷۷]

محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ:۲/۳۹۲]

بعض اہل علم نے اس کی یہ توجیہ بھی کی ہے کہ آٹا گوندھتے وقت کبھی کھلے ہاتھ استعمال ہوتے ہیں لہٰذا کھلے ہاتھوں سے ٹیک لگا کر اٹھنے کی گنجائش ہے۔ لیکن یہ توجیہ امر واقعہ کے خلاف ہے کیوں کہ کھلے ہاتھوں سے آٹا نہیں گوندھا جاتا بلکہ مٹھی بند کر کے اسے گوندھا جاتا ہے، لہٰذا ہماری تحقیق یہی ہے کہ دوسری رکعت سے کھڑے ہوتے وقت مٹھی بند کر کے زمین پر ٹیک لگا کے کھڑے ہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ضلع چکوال سے محمد حیات صاحب دریافت کرتے ہیں کہ تشہد میں کلمہ شہادت پر انگلی سے اشارہ کرنے کی کیا دلیل ہے۔ نیز سجدہ سات اعضاء پر کیا جاتا ہے اس سے مراد کون کون سے اعضاء ہیں اس کے علاوہ اہل حدیث مجریہ 24 اگست میں مضمون "قبر آخرت کی پہلی منزل" شائع ہوا ہے۔ اس میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت کا ذکر ہے اس کا حوالہ مع حالت سند درکار ہے۔

جواب تشہد میں شروع سے آخر تک انگشت شہادت اٹھا کر حرکت دیتے رہنا سنت نبوی ہے لیکن صرف شہادتین کے موقع پر انگلی اٹھانا اور پھر اسے رکھ دینا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، پہلے اور دوسرے تشہد میں انگلی اٹھانے کے دو طریقے ہیں:

① دائیں ہاتھ کی تین انگلیاں بند کر لی جائیں پھر انگوٹھے کو درمیانی انگلی کی جڑ میں رکھ کر انگشت شہادت کو قبلہ رخ کریں اور اسے مسلسل ہلاتے رہیں۔

② دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں بند کر لی جائیں پھر انگوٹھے اور درمیانی انگلی سے حلقہ بنا کر انگشت شہادت کو متواتر حرکت دیتے رہیں۔

[مسلم؛ ابوداود؛ نسائی، کتاب الصلوٰۃ]

بعض روایتوں میں انگشت شہادت کو حرکت نہ دینے کی صراحت ہے لیکن علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی تمام روایات شاذ یا منکر ہیں انہیں حرکت دینے والی روایات کے مقابلہ میں لانا صحیح نہیں ہے۔ تشہد میں انگلی اٹھا کر حرکت کرتے رہنا اس کا فائدہ

یہ ہے کہ نماز میں یکسوئی کا باعث ہے خیالات پراگندہ نہیں ہوتے حدیث میں بھی اس کا اشارہ ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں۔ ’’تشہد میں انگلی اٹھانا شیطان کے لیے لوہے کے نیزہ سے زیادہ ضرب کاری کا باعث ہے‘‘۔ [مسند امام احمد:۲/۱۱۹]

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا پابند کیا گیا۔ پیشانی، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر۸۰۹]

بعض روایات میں صراحت ہے کہ دونوں پاؤں کے پنجوں پر سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ (دارمی، ابن خزیمہ) پیشانی کے ساتھ ناک کو بھی شامل کیا جائے کیوں کہ حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سجدے میں اپنی ناک اور پیشانی کو اچھی طرح زمین پر ٹکاتے۔ (ابوداؤد، ترمذی) نیز حدیث میں ہے: ’’کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جس کی ناک پیشانی کی طرح زمین پر نہیں لگتی۔‘‘ [مستدرک حاکم:۱/۲۷۰]

واضح رہے کہ بحالت سجدہ پاؤں کی انگلیاں قبلہ رو ہوں اور قدموں کو کھڑا کر کے ان کی ایڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہوں۔ [صحیح ابن خزیمہ: حدیث نمبر۶۵۴]

☆ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی یہ طویل روایت مسند امام احمد ۴/۲۸۸ اور ابوداؤد کتاب السنة باب المسئلة فی القبر میں ہے علامہ ہیثمی اس کی سند کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کے تمام راوی ’’صحیح‘‘ کے راوی ہیں۔ [مجمع الزوائد:۵/۴۹۳]

(ب) تشہد میں انگشت شہادت کو کب حرکت دینا چاہیے؟۔

(ب) تشہد میں بیٹھتے ہی انگشت شہادت کو اٹھانا اور سلام پھیرنے تک اسے ہلاتے رہنا چاہیے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تشہد میں **اشھد** کے الفاظ کہتے ہی انگلی اٹھالی جائے اور إلا اللہ کہنے کے بعد اسے گرادیا جائے، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس انداز سے انگلی کو حرکت دینا بالکل بے بنیاد ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے، حتیٰ کہ اس کے متعلق کوئی من گھڑت روایت بھی کتب حدیث میں مروی نہیں ہے۔ [صفة الصلوة:۱۲۴]

بلکہ احادیث سے جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ شروع تشہد ہی سے انگلی اٹھالی جائے اور سلام پھیرنے تک اسے حرکت دیتے رہنا چاہیے جیسا کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ [سنن النسائی: کتاب الصلوة]

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ’’میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی کو اٹھایا پھر اسے حرکت دیتے رہے اور دعا کرتے رہے۔

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ’’کہ اس حدیث میں انگلی کے متعلق مسنون طریقہ بیان ہوا ہے کہ اس کا اشارہ اور حرکت سلام تک جاری رہے، کیوں کہ دعا سلام سے متصل ہے۔‘‘ [صفة الصلوة:۱۵۸]

جن روایات میں انگشت شہادت کو حرکت نہ دینے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہیں، اس تحریک کا فائدہ یہ ہے کہ نمازی انسان خارجی وسواس اور سوچ وبچار سے محفوظ رہتا ہے، اس کے علاوہ حدیث میں ہے: ’’کہ انگلی کی یہ حرکت شیطان کے لیے لوہے (کے تیر) سے بھی زیادہ سخت ہے۔‘‘ [مسند امام احمد:۲/۱۱۹]

سوال حافظ سیف الرحمٰن بٹ خریداری نمبر ۵۳۹۳ لکھتے ہیں کہ تشھد میں انگشت شہادت کو حرکت دینا چاہیے یا نہیں؟ اگر دینا چاہیے تو کب اور کیسے ہو؟ اس مسئلہ کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب دوران نماز تشھد کی حالت میں انگشت شہادت کو حرکت دینا نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا طریقہ مبارکہ ہے چنانچہ امام حمیدی نے ایک آدمی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس نے شام کے کسی گرجا میں انبیاء علیہم السلام کے مجسموں کو دیکھا کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور اپنی انگشت شہادت کو اٹھائے ہوئے تھے۔ [مسند حمیدی: ص ۱۸۳، حدیث نمبر ۶۴۸]

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس سنت کو زندہ رکھا بلکہ اگر کسی سے اس سلسلہ میں کوتاہی ہو جاتی تو یہ حضرات اس کا مواخذہ کرتے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۲، ص ۳۶۸]

لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں اس سنت کو باہمی اختلاف کی نذر کر دیا گیا۔ اس اختلاف کی بدترین صورت یہ ہے کہ اس سنت کو صحت نماز کے منافی قرار دیا گیا چنانچہ خلاصہ کیدانی احناف کے ہاں ایک معروف کتاب ہے جس کے متعلق سرورق پر لکھا ہے۔

اگر طریق صلوۃ کہہ وانی اگر نخوانی خلاصہ کیدانی

اگر تو نے خلاصہ کیدانی نہ پڑھا تو نماز کے طریقہ کے متعلق تجھے کچھ پتہ نہیں ہوگا۔ اس کتاب کا پانچواں باب ''محرمات'' کے متعلق ہے، اس میں ان چیزوں کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا ارتکاب دوران نماز حرام اور ناجائز ہے بلکہ ان کے عمل میں لانے سے نماز باطل قرار پاتی ہے، ان میں سرفہرست بآواز بلند آمین اور رفع الیدین کو بیان کیا گیا ہے، اس کی مزید وضاحت بایں الفاظ کی ہے۔

الاشارة بالسبابة کاهل الحدیث [خلاصہ کیدانی: ص ۱۱]

سبابہ انگلی کے ساتھ اشارہ کرنا جیسا کہ اہلحدیث کرتے ہیں، یعنی یہ عمل ان کے ہاں نماز کو باطل کر دیتا ہے، ستم بالائے ستم یہ ہے کہ مذکورہ بالا عربی عبارت کا فارسی زبان میں بایں الفاظ ترجمہ کیا ہے۔ ''اشارہ کردن بانگشت شہادت مانند قصہ خواناں'' اس عبارت میں اہلحدیث کا ترجمہ ''قصہ خواناں'' کیا گیا ہے گویا اہلحدیث محض داستان گو اور قصہ خوان ہیں۔ مصنف خلاصہ کی اس ناروا جسارت کے پیش نظر احناف کے معروف فقیہ اور عالم دین ملا علی قاری نے اسے آڑے ہاتھوں لیا، لکھتے ہیں کہ مصنف نے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا، جس کی وجہ قواعدِ اصول اور مراتب فروع سے ناواقفیت ہے اگر اس کے متعلق حسن ظن سے کام نہ لیں اور اس کے کلام کی تاویل نہ کریں تو اس کا کفر واضح اور ارتداد صریح ہے۔ کیا کسی مسلمان کے لیے جائز ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ایک ثابت شدہ سنت کو حرام کہے اور ایسی چیز سے منع کرے، جس پر عامۃ العلما پشت در پشت عمل کرتے چلے آتے ہیں۔ [تزیین العبارۃ لتحسین الاشارہ: ص ۶۷]

بہرحال دوران تشہد انگشت شہادت کو حرکت دینا مصنف خلاصہ کیدانی کے نزدیک ''خاکم بدھن'' ایک نازیبا حرکت ہے جس سے نماز باطل ہوتی ہے۔ **نعوذ باللہ من هفوات الفهم والقلم**۔ جب کہ تشہد کی انگلی اٹھانا بڑی بابرکت اور عظمت والی سنت ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ تشہد میں انگلی اٹھانا شیطان کے لیے دہکتے لوہے سے زیادہ ضرب کاری کا باعث ہے۔''

[مسند امام احمد: ج ۲، ص ۱۱۹]

حضرت امام حمیدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب نمازی اپنی انگشت شہادت کو حرکت دیتا ہے تو شیطان سے دور رہتا ہے اس وجہ

سے نمازی گو خارجی وساوس اور نماز کے منافی سوچ وبچار سے محفوظ رہتا ہے کیوں کہ انگشت شہادت کا براہِ راست دل سے تعلق ہے۔اس کے حرکت کرنے سے دل بھی رک رہتا ہے جیسا کہ حدیث بالا میں اس کا اشارہ موجود ہے۔حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دوران نماز، شیطان کو اپنے سے دور رکھنے کے لیے انگشت شہادت کی یہ حرکت بہت کارگر ہے۔[مسند ابی یعلیٰ: ص ۲۷۵/۲۷]

ایک روایت میں ہے کہ شیطان اس سے بہت پریشان ہوتا ہے۔ [سنن بیہقی: ص ۱۳۲/۲۷]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کی ترغیب بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز (کے قعدہ) میں بیٹھتے تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھتے اور اپنے دائیں ہاتھ کی وہ انگلی اٹھا لیتے جو انگوٹھے سے متصل ہے پھر اس کے ساتھ دعا مانگتے۔ [صحیح مسلم: المساجد' ۵۸۰]

جو حضرات اس اشارہ اور حرکت کے قائل ہیں ان میں سے بعض کا موقف یہ ہے کہ تشہد میں "اشهد ان لا اله الا الله" کہتے وقت انگشت شہادت اٹھائی جائے اور جب یہ شہادت توحید ختم ہو جائے تو اپنی انگلی کو نیچے کر لیا جائے، ان کی دلیل مندرجہ ذیل حدیث ہے۔

حضرت خفاف بن ایماء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشہد کے لیے بیٹھتے تو انگلی سے اشارہ کرتے جس سے آپ کی مراد توحید ہوتی۔ [بیہقی: ج ۲' ص ۱۳۳]

علامہ صنعانی لکھتے ہیں کہ دوران تشہد اشارے کا مقام لا اله الا الله کہتے وقت ہے۔کیوں کہ امام بیہقی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک نقل فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس اشارہ سے مراد توحید واخلاص ہے۔ [سبل السلام: ج ۱' ص ۳۱۹]

لیکن اس حدیث میں کسی قسم کی صراحت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا الـــه الا الله کہنے پر اشارہ کرتے تھے۔پھر یہ حدیث معیار محدثین پر پوری بھی نہیں اترتی، اس لیے محل اشارہ کی تعیین کے لیے کوئی صریح اور صحیح حدیث مروی نہیں ہے بلکہ بظاہر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع تشہد سے انگلی اٹھانا چاہیے اور سلام پھیرنے تک اسے حرکت دیتے رہنا چاہیے چنانچہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مبارک بایں الفاظ بیان کرتے ہیں۔"ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انگلی ہلا رہے تھے اور اس کے ساتھ دعا کر رہے تھے۔" [ابوداؤد: الصلوٰۃ' ۷۲۷]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کہ اس حدیث میں انگشت شہادت کے متعلق مسنون طریقہ بیان ہوا کہ اس کا اشارہ اور حرکت سلام تک جاری رہے کیوں کہ دعا سلام سے متصل ہے۔" [صفۃ الصلوٰۃ: ۱۵۸]

برصغیر کے نامور محدثین کا بھی یہی موقف ہے کہ انگشت شہادت کی حرکت شروع تشہد سے آخر تشہد تک جاری رہنی چاہیے۔
[عون المعبود: ج ۱' ص ۳۷۴؛ تحفۃ الاحوذی: ج ۱' ص ۲۴۱؛ مرعاۃ المفاتیح: ج ۲' ص ۴۶۸]

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوران تشہد اپنی انگلی کو حرکت نہیں دیتے تھے۔ [ابوداؤد: الصلوٰۃ' ۹۸۹]

لیکن عدم حرکت کا یہ اضافہ شاذ ہے کیوں کہ مذکورہ روایت محمد بن عجلان کی بیان کردہ ہے جو متکلم فیہ راوی ہے، اس کے بیان کرنے والے خالد الاحمر، عمرو بن دینار، یحییٰ اور زیاد چار راوی ہیں، مذکورہ اضافہ بیان کرنے والے صرف زیاد ہیں جو باقی رواۃ کی مخالفت کرتے ہیں، اگر ثقہ راوی، دوسرے ثقات کی مخالفت کرے تو اس کی بیان کردہ روایت کو شاذ قرار دیا جاتا ہے، علامہ

البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔ [تمام المنہ :صفۃ الصلوٰۃ]

محمد بن عجلان کے علاوہ حضرت عامر بن عبداللہ سے جب دیگر ثقہ راوی بیان کرتے ہیں تو وہ اس اضافہ کو نقل نہیں کرتے ، پھر اس اضافہ کے شاذ اور نا قابل حجت ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ امام مسلم نے ابن عجلان سے اس روایت کو مذکورہ حدیث کے بغیر ہی بیان کیا ہے۔ [صحیح مسلم: المساجد ۵۷۹]

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ اضافہ والی روایت نافی ہے اور جن روایات میں اشارہ کا ذکر ہے وہ مثبت ہیں اور محدثین کے بیان کردہ اصول کے مطابق مثبت روایت ، نافی پر مقدم ہوتی ہے۔'' [زادالمعاد: ج ۱ ص ۲۳۸]

مختصر یہ ہے کہ تشہد بیٹھتے ہی انگشت شہادت کو اٹھا کر اسے مسلسل ہلاتے رہنا چاہیے اور اس عمل کے منافی جو روایات ہیں وہ شاذ ، منکر اور نا قابل حجت ہیں ، اب ہم تشہد بیٹھتے وقت دائیں ہاتھ اور اس کی انگلیوں کی کیفیت بیان کرتے ہیں ، محدثین کرام رضی اللہ عنہم نے اسے تین طرح سے بیان کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

☆ دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کو بند کر لیا جائے پھر انگوٹھے کو انگشت شہادت کی جڑ میں رکھ کر انگشت شہادت سے اشارہ وحرکت ہو ، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تشہد بیٹھتے تو اپنا بایاں ہاتھ بائیں گھٹنے پر رکھتے اور دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر رکھتے اور ترپن کی گرہ لگاتے پھر انگشت شہادت سے اشارہ کرتے۔ [صحیح مسلم: المساجد ۵۸۰]

عرب کے ہاں کا ایک معروف طریقہ ہے کہ ترپن کا عدد بتانے کے لیے پہلی تین انگلیوں کو بند کر کے انگوٹھے کو انگشت شہادت کی جڑ میں رکھ دیتے ، حدیث میں ترپن کی گرہ لگانے کا یہی مطلب ہے تمام انگلیوں کو بند کر کے انگوٹھے کو درمیانی انگلی پر رکھا جائے اور انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوران تشہد اپنے دائیں ہاتھ کی تمام انگلیاں بند کر لیتے پھر انگوٹھے کے ساتھ متصل انگلی سے اشارہ کرتے۔ [صحیح مسلم: المساجد ۵۸]

☆ ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ انہی انگشت شہادت سے اشارہ کر کے انگوٹھے کو درمیانی انگلی پر رکھ لیتے۔

[صحیح مسلم المساجد: ۵۷۹]

☆ پہلی دو انگلیوں کو بند کر لیا جائے پھر درمیانی انگلی اور انگوٹھے سے حلقہ بنا کر انگشت شہادت سے اشارہ کیا جائے چنانچہ حدیث میں ہے ''کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو بند فرمایا پھر درمیانی انگلی اور انگوٹھے کے ساتھ حلقہ بنایا اور انگشت شہادت سے اشارہ فرمایا۔'' [ابوداؤد: الصلوٰۃ ۷۲۶]

ان تینوں صورتوں کو گاہے بگاہے کرتے رہنا چاہیے ، اب ہم اس کا فلسفہ بیان کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں مولانا محمد صادق سیالکوٹی مرحوم کے الفاظ مستعار لیتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ''جب انگلی کو کھڑا کر کے اس نے توحید کی گواہی دی کہ اللہ ایک ہے پھر جب انگلی کو بار بار ہلانا شروع کیا تو اس نے بار بار ایک ، ایک ، ایک ہونے کا اعلان کیا مثلاً دوران تشہد اگر انگلی کو سات بار ہلایا تو اتنی ہی مرتبہ انگلی نے توحید کا اعلان کیا گویا انگلی کھڑی ہوئی اور بول بول کر ایک اللہ ، ایک اللہ کہتی رہی اور نمازی کے کیف کا یہ عالم ہو کہ نظر انگلی کے رفع اور حرکت پر اور دماغ وحدانیت کو صلوٰۃ آبشار دل پر گرائے اور قلب عطشاں پر آب حیات پیا جائے (صلوٰۃ الرسول) حاصل

کلام یہ ہے کہ انگشت شہادت کو دوران تشہد حرکت دینا چاہیے اور حرکت سلام پھیرنے تک برقرار رہے، حرکت نہ دینے کے متعلق جو روایات ہیں شاذ اور ناقابل حجت ہیں، نیز نمازی کی نظر دوران حرکت انگلی اور اس کے اشارہ پر مرکوز ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ نمازی داخلی انتشار اور خارجی خیالات سے محفوظ رہتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال لدھڑ سے محمد افضل خریداری نمبر ۵۵۲۶ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کا کیا طریقہ ہے اور اس کے کیا الفاظ ہیں۔؟

جواب قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی آسمانوں اور زمین دونوں جگہ لائق صداحترام ہے۔ آسمان میں اللہ اور اس کے فرشتے آپ ﷺ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں اور زمین میں تمام اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ بھی آپ ﷺ کی ذات گرامی پر درود وسلام بھیجتے رہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر صلوٰۃ اور بکثرت سلام بھیجو۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۶]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی صلوٰۃ سے مراد، فرشتوں کی محفل میں آپ کا ذکر خیر ہے اور فرشتوں کی صلوٰۃ سے مراد آپ کے لیے دعائے برکت ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب التفسیر]

حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہم نے آپ پر سلام پڑھنا تو سیکھ لیا ہے، درود کیسے پڑھیں تو آپ ﷺ نے اس کے لیے متعدد درود پڑھنے کی تاکید فرمائی۔ درود ابراہیمی جسے ہم تشہد میں پڑھتے ہیں وہ آسان اور متداول ہے جیسا کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ ملے تو فرمایا کہ میں ایک تحفہ نہ دوں جو میں نے رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا ہے، میں نے کہا کہ آپ ہمیں ضرور وہ تحفہ دیں، تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر سلام پڑھنا تو سکھا دیا ہے البتہ صلوٰۃ پڑھنے کا کیا طریقہ ہے تو آپ ﷺ نے درودِ ابراہیمی کی تلقین فرمائی۔ [صحیح بخاری: احادیث الانبیاء ۳۳۷۰]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سلام پڑھنے کی تعلیم سے مراد تشہد کی تعلیم ہے کیوں کہ اس میں یہ الفاظ ہیں۔ ''**السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ**''۔ [فتح الباری: ج ۸ ص ۶۷۷]

ان احادیث کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنے کا کوئی مخصوص طریقہ نہیں ہے آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں درود پڑھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اس درود کی وصولی اور مقام مقصود تک پہنچانے کے لیے تعینات ہیں۔ بہتر ہے کہ درود کے لیے انہی الفاظ کا انتخاب کیا جائے جن کی رسول اللہ ﷺ نے خود ہمیں تعلیم دی ہے اپنی طرف سے کوئی خاص طریقہ یا خاص الفاظ ایجاد نہ کیے جائیں۔

سوال لدھڑ ضلع سیالکوٹ سے محمد افضل صارم لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر کونسا درود وسلام پڑھا جائے۔؟

جواب رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام پڑھنا چاہیے، ہمیشہ پڑھنا چاہیے۔ لیکن مسنون درود وسلام پڑھنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ خود ساختہ درود وسلام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام پڑھنے سے متعلقہ آیت کا نزول ہو کہ ایمان

دارو! تم رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام پڑھا کرو۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے آپ پر سلام پڑھنا تو سیکھ لیا، لیکن درود کیسے پڑھا کریں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو درود ابراہیمی پڑھنے کی تلقین فرمائی جو نماز میں التحیات پڑھنے کے بعد ادا کیا جاتا ہے۔ [صحیح بخاری: ۳۳۷۰]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم التحیات میں یہ کہتے: ''السلام علیک ایھا النبی ورحمة الله وبرکاته'' یعنی آپ پر اس انداز سے سلام پڑھتے تھے جس کے متعلق انہوں نے عرض کیا تھا کہ ہم نے سلام پڑھنا تو سیکھ لیا ہے۔

اس سلسلہ میں ہماری گزارش ہے کہ مسنون درود وسلام پڑھنے کا اہتمام کیا جائے اور لوگوں کو بھی مسنون طریقہ سے درود وسلام پڑھنے کی دعوت دی جائے، لیکن دعوتِ دین کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے الجھاؤ کی صورت نہ پیدا کی جائے، اس سے نفرتیں جنم لیتی ہیں جو ایک داعی کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں۔

سوال رحیم یار خان سے ڈاکٹر سید محمد افضال شاہ خریداری نمبر ۲۵۸۶ لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب کتاب وسنت کی روشنی میں دیں۔

☆ ہمارے ہاں امام صاحب فرض نماز پڑھانے کے بعد دعا نہیں مانگتے۔ کہتے ہیں کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

☆ نماز پنجگانہ کتنی رکعات ہیں، ہر نماز کی رکعات مفصل تحریر فرما دیں۔

جواب نماز کے بعد اگر کوئی انفرادی طور پر دعا مانگتا ہے تو اس میں کوئی حرج والی بات نہیں ہے۔ البتہ نماز کے بعد اجتماعی دعا کا ثبوت محل نظر ہے، اس سلسلہ میں جتنی بھی روایات پیش کی جاتی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں اگر صحیح ہیں تو مدعا ثابت کرنے کے لیے صریح نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں دس سال رہے پانچوں وقت اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نمازیں پڑھائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کثیر تعداد نے آپ ﷺ کی اقتدا میں نمازیں ادا کیں مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اجتماعی دعا کا ذکر نہیں کرتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے معمول بنا لینا سنت کے خلاف ہے، اگر کوئی امام صاحب سے استدعا کرے تو اس کی تعمیل پر اجتماعی دعا کی جا سکتی ہے، اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

☆ نماز پنجگانہ کی فرض رکعات حسب ذیل ہیں:

نماز فجر دو فرض، نماز ظہر چار فرض، نماز عصر چار فرض، نماز مغرب تین فرض اور نماز عشاء چار فرض، نماز جمعہ دو فرض۔

نماز پنجگانہ کی سنت رکعات حسب ذیل ہیں:

☆ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص دن اور رات میں (فرض رکعات کے علاوہ) بارہ رکعات پڑھے اس کے لیے جنت میں ایک محل تیار کیا جاتا ہے۔ چار رکعات ظہر سے پہلے، دو رکعت اس کے بعد، دو رکعت مغرب کے بعد، دو رکعت عشاء کے بعد اور دو رکعت فجر سے پہلے۔'' [ترمذی: الصلوۃ، ۴۱۵]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعات (سنت) پڑھے۔''
[صحیح مسلم: صلوۃ المسافرین، ۷۲۹]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظہر سے پہلے چار سنت کے بجائے دو رکعت بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ ان بارہ رکعات کو سنن مؤکدہ کہا جاتا ہے، ان کے علاوہ کچھ سنتیں غیر مؤکدہ بھی ہیں مثلاً

☆ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص عصر سے پہلے چار رکعت (سنت) پڑھے اللہ اس پر رحم کرے۔'' [صحیح مسلم: صلوۃ المسافرین، ۷۳۰]

☆ رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ فرمایا: ''کہ مغرب سے پہلے دو رکعات ادا کرو، تیسری بار فرمایا کہ جسکا دل چاہے'' یہ اس لیے فرمایا کہ کہیں لوگ اسے سنت مؤکدہ نہ بنالیں۔ [صحیح بخاری: التہجد ۱۱۸۳]

☆ جمعہ سے پہلے نوافل کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں ہے حدیث میں ہے: ''کہ جو شخص غسل کر کے جمعہ کے لیے آئے اور خطبہ شروع ہونے تک جس قدر ہو سکے نوافل ادا کرتا رہے پھر خطبہ جمعہ شروع سے آخر تک خاموشی سے سنے تو اس کے گزشتہ جمعہ سے لے کر اس جمعہ تک اور مزید تین دن کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ [صحیح مسلم: الجمعۃ، ۸۵۷]

☆ جمعہ کے بعد چار رکعات سنتیں پڑھنا چاہئیں جیسا کہ حدیث میں ہے ''کہ جب تم جمعہ کے بعد نماز پڑھنا چاہو تو چار رکعات ادا کرو۔'' [صحیح مسلم: الجمعۃ ۸۸۱]

اگر کوئی گھر آ کر پڑھنا چاہے تو دو رکعات ہی کافی ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے بعد کچھ نہیں پڑھا کرتے تھے تا آنکہ اپنے گھر آتے اور دو رکعات پڑھتے۔ [صحیح بخاری: الجمعۃ، ۹۳۷]

نماز عشاء کے ساتھ ہم نے وتروں کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وتر عشاء کی نماز کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وتر نماز تہجد کا حصہ ہیں جو تہجد کے ساتھ ملا کر پڑھے جاتے ہیں۔ جو حضرات رات کو اٹھنے کے عادی نہ ہوں شریعت نے انہیں سہولت دی ہے کہ وہ نماز عشاء کے ساتھ انہیں پڑھ لیں۔ حدیث میں ہے: ''جسے اندیشہ ہو کہ رات کے آخری حصہ میں نہیں اٹھ سکے گا وہ اول شب ہی میں وتر پڑھ لے۔'' [صحیح مسلم: صلوۃ المسافرین ۷۵۵]

ان فرائض و سنن کے علاوہ نوافل کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ حضرات اپنی خوشی سے جس قدر چاہیں نوافل پڑھ سکتے ہیں لیکن ان نوافل کو فرائض کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے۔ واضح رہے کہ قیامت کے دن جب نماز کے متعلق باز پرس ہوگی تو فرائض کی کمی کو نوافل و سنن سے پورا کیا جائے گا۔ اس لیے فرائض کی حفاظت کے لیے سنن اور نوافل بھی ادا کرنے چاہئیں۔

سوال خانیوال سے عبدالحمید صاحب دریافت کرتے ہیں کہ نماز کے بعد تسبیحات دائیں بائیں دونوں ہاتھوں پر کی جا سکتی ہیں یا صرف دایاں ہاتھ ہی استعمال کرنا چاہیے؟

جواب رسول اللہ ﷺ کا عام معمول تھا کہ پسندیدہ اور خیر و برکت کے کام دائیں ہاتھ سے بجا لاتے مثلاً: کھانا، پینا وغیرہ البتہ کراہت پر مبنی کاموں کے لیے بایاں ہاتھ استعمال فرماتے جیسا کہ ناک صاف کرنا یا استنجا وغیرہ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ حتی المقدور اپنے تمام کام (پسندیدہ کام) بجا لانے میں دائیں جانب کو پسند کرتے تھے وضو کرنے، کنگھی پھیرنے اور جوتا پہننے میں بھی دائیں جانب کو پسند کرتے تھے''۔ [صحیح بخاری: کتاب الصلوۃ، حدیث نمبر ۴۲۶]

تسبیحات میں خیر و برکت کا پہلو نمایاں ہے اس لیے انہیں دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے، کتب حدیث میں اس کے متعلق نص

صریح بھی منقول ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ تسبیحات کہتے وقت وہ دائیں ہاتھ سے گرہ لگاتے تھے''۔ [ابوداؤد: ابواب الوتر' باب التسبیح بالحصی]

واضح رہے کہ امام ابوداؤد نے اس روایت کو اپنے دو اساتذہ عبیداللہ بن عمر اور محمد بن قدامہ سے بیان کیا ہے مذکورہ الفاظ دوسرے شیخ محمد بن قدامہ نے نقل کیے ہیں اور عبیداللہ بن عمر ''یعقد التسبیح'' پر روایت ختم کر دیتے ہیں۔ چونکہ ثقہ راوی کا اضافہ قبول ہوتا ہے اس لیے امام منذری نے جب ابوداؤد کی تلخیص کی تو انہوں نے وَفِيْ رِوَايَةٍ بِيَمِيْنِهٖ کے الفاظ بیان کیے ہیں۔

[مختصر ابی داؤد: ج ۱ ص ۱۴۷]

اور علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح ابی داؤد میں ''یعقد التسبیح بیمینه'' کے الفاظ سے روایت بیان کی ہے۔

[صحیح ابی داؤد: حدیث نمبر ۱۳۳۰]

یہ وضاحت اس لیے کی گئی ہے کہ بعض اہل علم ان الفاظ کو ابن قدامہ کا استنباط قرار دیتے ہیں۔

سوال محمد یٰسین صدیقی آزاد کشمیر سے پوچھتے ہیں کہ مجھے ننگے سر نماز پڑھنے کی وجہ سے بہت تنگ کیا جاتا ہے کیا شریعت میں ننگے سر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ نیز بتائیں کہ غیر اہلحدیث کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے۔؟

جواب سر جسم کا ایسا حصہ نہیں ہے جس کا نماز میں ڈھانپنا ضروری ہو البتہ ننگے سر رہنا انسانی وقار اور شرافت کے خلاف ضرور ہے اس لیے ہمیشہ ننگے سر نماز پڑھنے کو عادت نہیں بنانا چاہیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عام حالات میں ننگے سر نماز پڑھنے کا ثبوت کسی صحیح اور صریح حدیث سے نہیں ملتا اس بنا پر ننگے سر نماز پڑھنا ضروری نہیں اور نہ ہی اس عادت کو اپنے لیے طرۂ امتیاز بنایا جائے۔ نماز کی ادائیگی ایسے لوگوں کی اقتدا میں ہونی چاہیے جن کے عقائد ونظریات کتاب وسنت سے متصادم نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ''امامت کے لیے ایسے حضرات کا انتخاب کرو جو تم سے بہتر ہوں'' اس لیے مستقل طور پر غلط عقائد کے حاملین کو امام نہیں بنانا چاہیے، اگر کبھی کبھار لاعلمی کی صورت میں اتفاقاً ایسا ہو جائے تو ان شاء اللہ نماز ہو جائے گی۔

سوال بستی دھرم پورہ عبدالحکیم سے محمد رمضان جوہری دریافت کرتے ہیں کہ اگر مسجد کے محراب کو اونچا کر دیا جائے اور امام وہاں اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر جماعت کرائے مقتدی امام سے نیچے ہوں تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب اگر امام اونچا ہو اور مقتدی نیچے ہوں نماز میں کوئی خلل نہیں آتا البتہ ایسی صورت کسی مقصد کے پیش نظر ہو اسے معمول بنانا اچھا نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ منبر پر قیام فرمایا جب کہ لوگ آپ کی اقتدا کر رہے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر رکوع فرمایا پھر سجدہ کے لیے نیچے اترے فراغت کے بعد پھر منبر پر تشریف لے گئے دوسری رکعت کا قیام اور رکوع منبر پر کیا پھر نیچے اتر کر سجدہ کیا اس طرح آپ نے اپنی نماز کو مکمل کیا۔ [صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ' ۳۷۷]

علی بن مدینی اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے اونچے تھے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ امام لوگوں سے اونچا کھڑا ہو''۔ [صحیح بخاری حوالہ مذکورہ]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ اگر امام اور مقتدی کے کھڑے ہونے میں بلند اور نیچے کے لحاظ سے فرق ہو تو اس حدیث سے اس کا جواز ملتا ہے۔'' [فتح الباری: ج۱،ص۶۳۱]

لیکن انہوں نے امام ابن دقیق العید کے حوالہ سے اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ اس حدیث سے ارادۂ تعلیم کے علاوہ مقتدیوں سے امام کے اونچا کھڑے ہونے کا جواز صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ حدیث کے الفاظ سے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

[فتح الباری حوالہ مذکورہ]

بہرحال مسئلہ زیر بحث میں جواز کی حد تک وسعت ہے امام اونچا ہو اور مقتدی نیچے کھڑے ہوں یا اس کے برعکس امام نیچے کھڑا ہو اور مقتدی کسی بالائی حصہ میں اس کی اقتدا میں نماز ادا کر رہے ہوں یہ جائز ہے۔...... [واللہ اعلم بالصواب]

سوال صادق آباد سے بابو حیدر لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں مسجد میں امام مسجد حنفی مقلد ہے، کیا میں اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہوں یا میرے لیے گھر میں نماز پڑھنا بہتر ہے؟۔

جواب ہمارے ہاں مقلدین حضرات کی چند اقسام ہیں، بعض ایسے مقلدین ہیں جو شرک وبدعت کا ارتکاب کرتے ہیں اور اس شرک وبدعت کو مشرف باسلام کرنے کے لیے پوری توانائیاں صرف کئے ہوئے ہیں، اس قسم کے امام کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔ بعض ایسے ہیں جو کھلے بندوں بدعات کا ارتکاب تو نہیں کرتے، البتہ امامت کے وقت نماز کا جھٹکا کرنے کے عادی ہیں، رکوع وسجود اور قومہ وجلسہ میں کوئی اعتدال نہیں ہوتا، حالانکہ ٹھہر ٹھہر کر نماز ادا کرنا نماز کا حصہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز سے نماز پڑھنے والے کو اپنی نماز دوبارہ ادا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس قسم کے امام کے پیچھے نماز تو ہو جاتی ہے لیکن اسے مستقل امام بنانا صحیح نہیں ہے، اگر امام مذکورہ بالا صفات یعنی شرک وبدعت کا مرتکب اور جلدی جلدی نماز پڑھانے کا عادی ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ ایسی مسجد بنانے کا اہتمام کیا جائے جہاں قبول صفات امام کا تعین ممکن ہو یا آس پاس کسی ایسی مسجد میں نماز پڑھنے کی کوشش کی جائے جہاں قبول صفت امام متعین ہو یا گھر میں باجماعت نماز پڑھنے کا اہتمام کیا جائے، گھر میں اکیلے نماز ادا کرنے سے جماعت کے ثواب سے محروم رہنا ہوگا۔ جسے ایک پختہ مسلمان گوارا نہیں کر سکتا۔ ہم لوگ اپنی دنیا سنوارنے میں بڑے ہوشیار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن دینی معاملات میں رخصتوں کو تلاش کرتے ہیں، اپنی ذہنی آبیاری اور بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے لیے ایسی مسجد کا ہونا ضروری ہے۔ جہاں کتاب وسنت کے مطابق فریضہ نماز ادا کیا جا سکے۔ اور قرآنی تعلیم کا صحیح بندوبست بھی ہوتا کہ ہمارے بچے شروع ہی سے اسلامی تعلیمات سے روشناس ہوں اور اسلامی فضا میں پروان چڑھیں، ہمیں اس بات کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

سوال ٹبہ سلطان سے فیصل محمود لکھتے ہیں کہ ہماری مسجد کے امام ایک عالم دین ہیں لیکن اہل جماعت کو ان سے کچھ اختلافات ہیں جن کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

① بحالت نماز منہ میں بیڑا رکھتا ہے۔

② مسجد میں بیٹھ کر فحش گندی گالیاں دیتا ہے۔

③ صوم وصلوٰۃ کی پابندی نہیں کرتا۔

④ قرآن اٹھا کر جھوٹی گواہی کا مرتکب ہے۔ کیا ایسے حالات میں اس کی امامت درست ہے۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ اگر مذکورہ باتیں کسی عالم دین میں پائی جاتی ہیں تو انتہائی قابلِ افسوس اور لائق ملامت ہیں اور یہ تمام فسق و فجور اور کبیرہ گناہوں کے زمرہ میں آتی ہیں، جن کا ارتکاب کسی بھی صورت میں درست نہیں۔ اس قسم کا انسان منصب امامت کے قطعاً قابل نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ''تم اپنے بہترین لوگوں کو امام بناؤ۔ کیوں کہ یہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان رابطہ ہیں۔'' [بیہقی: ۳/۹۰]

اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے تاہم اس کی تائید میں متعدد روایات ملتی ہیں مثلاً

☆ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نماز شرف قبولیت سے نوازی جائے تو اپنے میں سے بہتر امام کا انتخاب کرو۔'' [مستدرک حاکم: ۴/۲۲۲]

☆ رسول اللہ ﷺ نے ایک امام کو صرف اس لیے امامت سے معزول کر دیا تھا کہ اس نے بحالت نماز قبلہ کی طرف تھوکا تھا۔ [ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ]

اگرچہ ائمہ دین نے فاسق و فاجر کی امامت کو صحیح قرار دیا ہے تاہم انہوں نے یہ بھی تلقین کی ہے کہ عام حالات میں ایسے لوگوں کی امامت کو برقرار رکھنا درست نہیں ہے، لہٰذا اگر مقتدی حضرات اسے تبدیل کر سکتے ہیں تو کسی پسندیدہ انسان کو اس منصب پر فائز کریں، بہتر تو یہ ہے کہ ایسا امام خود امامت سے الگ ہو جائے جسے مقتدی اچھا نہ سمجھتے ہوں اگر وہ امامت نہیں چھوڑنا چاہتا تو اسے اس ناگفتہ حالت پر ضرور نظر ثانی کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمارے ائمہ کرام کو عمل کی توفیق دے۔ آمین

سوال محمد شفیع بذریعہ ای میل پوچھتے ہیں کہ بدکردار اور بدعقیدہ امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب اگر کوئی امام کفریہ عقائد رکھتا ہے مثلاً رسول اللہ ﷺ غیب کلی جانتے ہیں اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، نیز اولیاء اللہ حاجت روا اور مشکل کشا ہیں تو اختیاری حالات میں ایسے امام کے پیچھے نماز درست نہیں ہے۔ اس طرح اگر کوئی امام کھلے عام شرک کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے پیچھے بھی نماز ادا کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ نماز کے لیے ایسے امام کا انتخاب کرو جو تم سے بہتر ہو، کیوں کہ امام تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک رابطہ ہے۔'' [بیہقی: ۳/۹۰]

اس حدیث کے پیش نظر امام کسی ایسے شخص کو بنایا جائے جو عقائد کے لحاظ سے اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے صاف ستھرا ہو، البتہ اضطراری حالت میں اگر امام کا پتہ نہ چل سکے تو کرید کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن قصداً کفر و شرک کے مرتکب کو امام نہیں بنایا جا سکتا۔ [واللہ اعلم]

سوال سیالکوٹ سے محمد شریف سوال کرتے ہیں کہ اگر امام اپنی داڑھی کو سیاہ خضاب لگائے تو کیا اس کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟

جواب اپنے سفید بالوں کو سیاہ خضاب لگانا حرام اور ناجائز ہے، حدیث میں ہے کہ فتح مکہ کے دن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا تو اس کی داڑھی اور سر کے بال بالکل سفید تھے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اس کے بالوں کی سفیدی کو تبدیل کرو، لیکن سیاہ رنگ سے پرہیز کرو۔'' [صحیح مسلم: اللباس ۵۵۰۹]

اس حدیث میں سیاہ رنگ سے پرہیز کرنے کا حکم ہے اور آپ کا امر وجوب کے لیے ہے، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ، سیاہ رنگ کا خضاب حرام ہے اور یہی صحیح موقف ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قرب قیامت ایسی قومیں پیدا ہوں گی جو کبوتر کی گردن کی طرح اپنے بالوں کو سیاہ کریں گی، وہ جنت کی خوشبوں سے محروم رہیں گی۔'' [ابوداود: الخاتم/۴۲۱۲]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سر یا داڑھی کو سیاہ خضاب لگانا حرام ہے، اگر کوئی امام مسجد اپنی داڑھی کو خضاب لگاتا ہے تو وہ کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے، اسے چاہیے کہ اس سے اجتناب کرے، البتہ اس کے پیچھے نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر وہ اسے حلال سمجھتا ہے اور اپنے اس فعل کے جواز پر من گھڑت تاویلیں پیش کرتا ہے تو اسے امامت سے معزول کیا جاسکتا ہے، اہل جماعت کو چاہیے کہ وہ ایسے امام کا حکمت اور دانائی سے نوٹس لیں، باہمی اختلاف اور کسی دوسرے کی ذلت کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

سوال جوہر آباد سے طالب حسین پوچھتے ہیں کیا گھر میں کوئی مرد خواتین کی جماعت کراسکتا ہے؟

جواب اگر مستورات نماز با جماعت ادا کرنے کی خواہشمند ہوں اور ان میں سے کوئی بھی جماعت کرانے کے قابل نہ ہو تو اپنے محارم سے کسی کو جماعت کے لیے کہا جاسکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک ذکوان رضی اللہ عنہ نامی غلام ان کی جماعت کراتا تھا۔ [بخاری: باب امامۃ العبد]

اس حدیث کے پیش نظر افراد خانہ میں سے کوئی شخص عورتوں کی جماعت کراسکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے ڈاکٹر بشیر احمد قاضی سوال کرتے ہیں کہ میرے دو بیٹے قرآن مجید حفظ کرتے ہیں۔ ہم رمضان میں ان سے نماز تراویح میں قرآن مجید سننے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ نابالغ بچے کا جماعت کرانا صحیح نہیں ہے۔ اس کے متعلق ہماری رہنمائی کریں۔

جواب ہمارے ہاں احناف کا موقف یہ ہے کہ نابالغ بچے کے ذمے نہ تراویح سنت مؤکدہ ہے۔ جب کہ بالغ شخص کے لیے تراویح کی ادائیگی سنت ہے۔ اس لیے اقتدائے ضعیف کی وجہ سے نابالغ بچے کو تراویح میں امام بنانا درست نہیں۔ تاہم اگر وہ نابالغ بچوں کو تراویح پڑھائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ [امداد الفتاویٰ: ۱/۳۶۱]

لیکن یہ موقف کتاب وسنت کے خلاف ہے۔ کیوں کہ امامت کی شرائط میں کوئی ایسی شرط نہیں ہے کہ بچہ امامت کے اہل نہیں صرف اتنا ضرور ہے کہ بچہ طہارت ونجاست کی تمیز کرسکتا ہو۔ اگر بچہ سمجھدار ہے اور سن رشد میں پہنچ کر اپنی پاکی پلیدی کا خیال رکھتا ہے تو اس کی امامت بلا کراہت جائز ہے، حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارا گھر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں مسلمان بکثرت گزرتے تھے۔ میں نے ان سے مسلمان ہونے سے پہلے قرآن کریم کا کافی حصہ یاد کرلیا تھا۔ جب فتح مکہ ہوا تو میرے والد محترم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ میں حاضر ہوئے اور اپنا اسلام پیش کیا۔ آپ نے نماز روزہ کے متعلق ہدایات دینے کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جب نماز کا وقت ہوجائے تو تم میں سے کوئی ایک اذان دے اور جسے قرأت زیادہ یاد ہو وہ امامت کے فرائض سرانجام دے۔ مجھے چونکہ قرآن کا کافی حصہ یاد تھا۔ اس لیے جماعت کے لیے مجھے منتخب کرلیا گیا۔ اس

وقت میری عمر بمشکل چھ یا سات سال تھی، دوران جماعت مجھ پر صرف ایک چادر ہوتی جو بعض اوقات بحالت سجدہ پیچھے سے ایک طرف ہٹ جاتی، ایک دن کسی عورت نے کہا کہ اپنے امام کی مکمل طور پر ستر پوشی تو کرو، اہل قبیلہ نے مجھے ایک قمیص بنوا دی، جس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ [صحیح بخاری: کتاب المغازی ۴۳۰۲]

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نابالغ بچہ جسے طہارت ونجاست کی تمیز ہے وہ فرائض کی امامت بھی کرا سکتا ہے، نماز تراویح تو نوافل ہیں اس کی جماعت تو بالا ولی درست ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جماعت کے لیے جو معیار قائم فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کریم زیادہ یاد ہو۔ اگر قرأت میں برابر ہیں تو عمر کے لحاظ سے جو بڑا ہو اسے جماعت کے لیے منتخب کرنا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں بچے نماز تراویح کی جماعت کرا سکتے ہیں۔ جبکہ وہ قرآن کریم کا بیشتر حصہ یاد کئے ہوئے ہیں۔

سوال محمد الیاس بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک عورت جو حافظہ قرآن ہے، وہ گھر میں عورتوں کو نماز تراویح باجماعت پڑھاتی ہے کیا عورت تراویح کی جماعت کرا سکتی ہے؟

جواب امت کے اکثر علمائے سلف اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کا عورتوں کی جماعت کرانا صحیح اور جائز ہے، اگرچہ کچھ حضرات نے اس موقف سے اختلاف کیا ہے، تاہم عورت کا جماعت کرانا صحیح احادیث سے ثابت ہے، محدثین کرام نے اپنی کتب حدیث میں اس کے متعلق باقاعدہ عنوان بھی قائم کیے ہیں۔ چنانچہ امام ابوداؤد نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے'' کہ عورتوں کی امامت کا بیان'' پھر اس عنوان کو ثابت کرنے کے لیے شہیدہ فی سبیل اللہ حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا تھا کہ وہ اپنے اہل خانہ کی نماز باجماعت کے لیے امامت کے فرائض سرانجام دے، اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مولانا شمس الحق عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے عورتوں کی امامت اور ان کی نماز باجماعت کے اہتمام کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ [عون المعبود: ۱/۲۳۰]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ'' عورتوں کی امامت کے اثبات کا بیان'' پھر انہوں نے صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ نماز کے لیے عورتوں کے درمیان کھڑے ہو کر ان کی امامت کرائی تھی۔ [بیہقی: ۳/۱۳۰]

حضرت ام حسن رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو عورتوں کی امامت کراتے دیکھا کہ آپ ان کے درمیان کھڑی تھیں۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۵۳۶]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں'' کہ عورت، دیگر عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے، لیکن وہ آگے کھڑے ہونے کے بجائے عورتوں کے درمیان کھڑی ہو۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۵۳۶]

تابعین میں سے حضرت حمید بن عبدالرحمن اور امام شعبی کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ حوالہ مذکورہ]

ان احادیث وآثار کے پیش عورت دوسری عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے۔ لیکن جماعت کراتے وقت اسے عورتوں کے درمیان کھڑے ہونا چاہیے۔ بعض روایت میں امام شعبی سے منقول ہے کہ رمضان المبارک میں عورت دوسری عورتوں کو نماز تراویح پڑھا سکتی ہے۔

سوال فیصل آباد سے قاری حبیب اللہ بسمل (خریداری نمبر ۱۴۸۳) لکھتے ہیں کہ اگر امام سے دورانِ جماعت کوئی سجدہ رہ جائے اور سلام کے بعد یاد آئے تو اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے؟ کیا اس کے لیے سجدہ سہو کافی ہوگا یا نہیں؟۔

جواب دورانِ نماز اگر کوئی سہو ہو جائے تو اس کی تلافی کے لیے سجدہ سہو کیا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ہر سہو کے لیے دو سجدے ہیں۔ [ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلوٰۃ ۱۲۱۹]

چونکہ یہ سجدے شیطان کے لیے ذلت اور رسوائی کا باعث ہیں۔ [صحیح مسلم: ۵۷۱]

اس لیے اگر کوئی مسنون عمل رہ جائے تو اس کی تلافی صرف دو سجدوں سے ہو جائے گی۔ جیسا کہ پہلا تشہد واجب نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ درمیانہ تشہد چھوڑ دیا اور تیسری رکعت کے لیے کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے اس کی تلافی کے لیے آخر میں دو سجدے کر لیے۔ [صحیح بخاری: السہو ۱۲۲۴]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اس بات کے لیے دلیل بنایا ہے کہ پہلا تشہد ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک دفعہ رہ جانے کے بعد اس کا اعادہ نہیں کیا بلکہ دو سجدوں کو ہی کافی خیال کیا ہے۔ [صحیح بخاری: الاذان ۸۲۹]

سجدہ، نماز کا رکن ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایمان والو! تم رکوع اور سجدہ کرو''۔ [۲۲/الحج: ۷۷]

رسول اللہ ﷺ نے اس آدمی کو سجدہ اچھی طرح کرنے کا حکم دیا تھا۔ جس نے جلدی سے نماز کو ادا کر لیا تھا، اس لیے رکن کے رہ جانے سے پہلے رکن ادا کرنا ہوگا، پھر سجدہ سہو کیے جائیں۔ جیسا کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر کی ایک رکعت بھول کر چھوڑ دی۔ پھر وہ رکعت ادا کی اور بعد میں سجدہ سہو کیا۔ [صحیح مسلم: المساجد ۵۷۴]

جس رکعت میں سجدہ یا رکوع رہ جائے وہ رکعت شمار نہیں ہوگی، اگر کسی کا سجدہ یا رکوع رہ جائے تو مکمل رکعت ادا کرنا ہوگی، پھر دو سجدے بطور سہو ادا کیے جائیں گے، اگر سلام کے فوراً بعد یاد آ جائے تو اسی رکعت کا اعادہ کافی ہوگا۔ اگر نماز کے کافی دیر بعد یاد آئے جبکہ امام اور مقتدی مسجد سے چلے گئے یا دنیاوی گفتگو میں مصروف ہو گئے تو مکمل نماز کا اعادہ کرنا ہوگا۔ آخر میں سجدہ سہو دونوں صورتوں میں کرنا ہوں گے۔ صورت مسئولہ میں اگر سلام کے فوراً بعد یاد آ جائے تو ایک رکعت پڑھ کر سجدہ سہو کر لیا جائے۔ مقتدی حضرات کو بھی امام کے ساتھ رکعت کا اعادہ کرنا ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ضلع قصور سے حافظ زکریا دریافت کرتے ہیں کہ کیا مسجد کی چھت امام مسجد کی رہائش کے لیے جائز ہے؟۔

جواب مسجد کے لیے جو قطعہ اراضی حاصل کیا جائے اس پر وضو کی جگہ اور طہارت خانے بھی بنائے جاتے ہیں، لوازمات مسجد کی بنا پر اسے جائز قرار دیا جاتا ہے۔ امام مسجد کے لیے مکان کی تعمیر بھی لوازمات مسجد سے ہے۔ بشرطیکہ اس کا کوئی اور متبادل بندوبست نہ ہوسکتا ہو۔ مسجد کے ظاہری آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ جہاں وضو کی جگہ یا طہارت خانے ہوں ان کی چھت پر امام مسجد کے لیے رہائشی مکان تعمیر کیا جائے۔ اگر وہاں گنجائش نہ ہو تو مسجد کی چھت پر مکان تعمیر کرنے میں ان شاء اللہ کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن محلِ وقوع ایسا ہونا چاہیے کہ مسجد کے اندر سے آمد و رفت نہ ہو۔ بلکہ باہر سے سیڑھی وغیرہ کا انتظام ہونا

چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال میر پور خاص سے محمد مشتاق دریافت کرتے ہیں کہ فرض نمازوں کے بعد نوافل کی تعداد کے متعلق احادیث میں کیا وارد ہے؟۔

جواب نوافل کی ادائیگی کے متعلق کوئی پابندی نہیں ہے۔ اللہ کے حضور جتنی بھی نفلی عبادت پیش کی جائے گی اتنا ہی اجر وثواب ملے گا۔ البتہ فرائض سے پہلے یا بعد سنن کی ادائیگی کے متعلق احادیث میں آیا ہے۔ بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد بارہ ہے ان کی ادائیگی اور محافظت پر اللہ کی طرف سے جنت میں ایک عظیم الشان محل تیار کر دینے کی بشارت ہے، دو رکعت فجر سے پہلے، چار ظہر سے پہلے اور دو رکعت اس کے بعد دو رکعت مغرب کے بعد اور دو رکعت عشاء کے بعد، وتر نماز عشاء کا حصہ نہیں ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہ نماز تہجد کا حصہ ہے جسے سونے سے پہلے ادا کرنے کی اجازت ہے، بعض دوسری روایات میں سنن کی تعداد دس بھی ہے اس میں ظہر سے پہلے دو رکعت کو شمار کیا گیا ہے ہمارے ہاں عام طور پر گنجائش تلاش کی جاتی ہے جیسا کہ ظہر سے پہلے دو رکعت ادا کرنے کا ذکر بعض روایات میں ملتا ہے اسے اپنانے کی کوشش کی جاتی ہے حالانکہ ظہر کے بعد چار رکعت ادا کرنے پر جہنم سے آزادی کی بشارت دی گئی ہے۔ لیکن اس پر بہت کم لوگوں کو عمل پیرا ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ بہر حال سنن رواتب کی پابندی سے فرائض کی مخالفت ہوتی ہے اس کے علاوہ اللہ کے ہاں ہم اجر وثواب کے بھی حق دار ٹھہر سکتے ہیں لہٰذا ان کی ادائیگی میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

سوال جوہر آباد سے طالب حسین پوچھتے ہیں کہ نماز عشاء کی کل رکعات سترہ ہیں یا سات؟

جواب نماز عشاء کی کل چھ رکعت ہیں چار فرض، دو سنت اور تین وتر البتہ نماز وتر عشاء کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک الگ رات کی نماز ہے جسے سہولت کے پیش نظر عشاء کے ساتھ پڑھنے کی اجازت دی گئی ہے۔ نماز عشاء کے لیے سترہ رکعات کا ثبوت کسی صحیح حدیث سے نہیں ملتا، ویسے نوافل ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

سوال رحیم یار خان سے محمد ادریس بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی رو سے مرد اور عورت کی نماز میں کیا فرق ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ہمارے لیے نمونہ بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں بصراحت موجود ہے، لہٰذا نماز پڑھنے کی ہیئت وکیفیت اور مقدار ومعیار میں بھی آپ کو نمونہ سمجھنا چاہیے ایک دفعہ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر نماز ادا کی سجدہ نیچے اتر کر ادا کیا، آخر میں فرمایا: ''کہ میں نے نماز کی ادائیگی کا یہ اسلوب اس لیے اختیار کیا ہے تا کہ تم لوگ میری اقتدا کرو اور میری نماز سیکھو۔'' [صحیح بخاری: کتاب الجمعۃ، ۹۱۷]

اس حدیث میں نماز کے لیے مرد اور عورت کے درمیان فرق کرنے کی کوئی وضاحت نہیں ہے آپ کا طریقہ نماز مرد اور عورت دونوں کے لیے ہے اسی طرح حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم قریب قریب ایک ہی عمر کے چند نوجوان رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور تقریباً بیس دن آپ کی صحبت میں رہے پھر ایک دن آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب تم اپنے گھروں کو لوٹ

جاؤ، انہیں دین سکھاؤ اور نماز پڑھنے کی تلقین کرو، نیز جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اسی طرح نماز پڑھتے رہو۔''

[صحیح بخاری: کتاب الاذان ۶۳۱]

یہ حدیث فیصلہ کن ہے کہ مرد اور عورت کے طریقہ نماز میں کوئی فرق نہیں ہے اگر کوئی فرق ہوتا تو آپ ﷺ اس کی وضاحت فرمادیتے۔ رئیس المحدثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا کے متعلق فرماتے ہیں ''کہ وہ نماز میں مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور نہایت ہی عقلمند اور دین کی واقفیت رکھنے والی خاتون تھیں۔'' [صحیح بخاری: کتاب الاذان ۱۴۵]

اس اثر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی ادائیگی کے لیے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''کہ عورت نماز میں بالکل اسی طرح بیٹھے جیسے مرد بیٹھتا ہے۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱/۲۴۲]

طریقہ نماز کے علاوہ چند ایک چیزوں میں فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً:

☆ دوران نماز عورت کا پردہ سر سے پاؤں تک ہونا چاہیے حتٰی کہ پاؤں بھی مستور ہوں۔ [ابو داؤد] جبکہ مرد کے لیے یہ پابندی نہیں ہے۔

☆ جب عورت، عورتوں کو امامت کرائے گی تو عورتوں کے آگے نہیں بلکہ ان کے درمیان کھڑی ہوگی۔ [مستدرک حاکم] جبکہ مرد امامت کے لیے آگے کھڑا ہوگا۔

☆ امام جب بھول جائے تو عورت تالی بجا کر اسے متنبہ کرے گی۔ [صحیح بخاری] جبکہ مرد سبحان اللہ کہہ کر امام کو خبردار کردے گا۔

اس کے علاوہ ہمارے ہاں جو فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ مرد کانوں تک ہاتھ اٹھائے اور عورت کندھوں تک نیز عورت سینے پر ہاتھ باندھے اور مرد ناف کے نیچے یا عورت بحالت سجدہ اپنے بازوؤں کو زمین پر بچھادے، یہ سب بے بنیاد اور خودساختہ ہیں۔

سوال کیا عذر کے بغیر دو نمازوں کو جمع کیا جاسکتا ہے؟ نیز اگر مقیم ہونے کی صورت میں بوجہ بارش مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ لی جائے تو مغرب کی سنتیں پڑھیں گے یا نہیں اور عشاء کی سنتیں بھی پڑھنی ہوں گی یا نہیں؟ (فیصل نذیر۔ ڈجکوٹ)

جواب دو نمازوں کو کسی سبب کی بنا پر تو جمع کیا جاسکتا ہے جیسا کہ سفر وخوف یا بارش آندھی یا بیماری وغیرہ۔ لیکن بلاوجہ نمازوں کو جمع کرنا درست نہیں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بلاوجہ نمازوں کو جمع کرنا کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے اگرچہ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بھی اس قسم کی روایت مروی ہے لیکن وہ حنش بن قیس راوی کی وجہ سے ناقابل اعتماد ہے، پھر سنن ونوافل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مقیم ہونے کی صورت میں پہلی نماز کے بعد والی سنتیں نہیں پڑھنی چاہئیں۔ مثلاً ظہر اور عصر کو جمع کیا ہے تو ظہر کی آخری سنتیں اور اگر مغرب وعشاء کو جمع کیا ہے تو مغرب کی دو سنتیں نہ پڑھی جائیں۔ البتہ عشاء کے بعد کی دو سنتیں اور وتر وغیرہ پڑھنے چاہئیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ انہوں نے بصرہ میں ظہر اور عصر جمع کر کے ادا کیں اور ان کے درمیان کچھ نہ پڑھا پھر مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھا ان کے درمیان بھی کچھ نہ پڑھا آپ نے کسی مصروفیت کی بنا پر ایسا کیا پھر انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ میں ظہر اور عصر کی آٹھ رکعات اکٹھی پڑھی تھیں۔ آپ نے درمیان میں کچھ نہ پڑھا تھا۔ [سنن نسائی: کتاب المواقیت، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر]

اس حدیث کے پیش نظر حضر میں بوقت جمع پہلی نماز کی بعد والی سنتیں چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ کے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے دیکھئے۔ [ج ۳' ص ۱۲۷ تا ۱۴۰]

سوال منڈی احمد آباد سے محمد عابد خریداری نمبر ۶۱۹۶ سوال کرتے ہیں کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے اگر مغرب کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ لی جائے تو نماز عشاء کے لیے اذان کہنا ضروری ہے۔

جواب سفر وحضر میں اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے دو نمازوں کو جمع کیا جائے تو اذان ایک ہی کہی جائے گی البتہ اقامت ہر نماز کے لیے الگ الگ کہنا ہوگی جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران حج میدانِ عرفات میں وقوف فرمایا اس ثنا میں مؤذن نے اذان دی پھر اقامت کہی تو آپ نے نماز ظہر ادا کی۔ پھر اقامت کہی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر ادا کی۔ [صحیح مسلم: الحج' ۱۲۱۸]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع کرتے وقت دوسری نماز کے لیے اذان کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے صرف اقامت ہی کافی ہے۔ البتہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوران سفر اگر دو نمازوں کو جمع کرنے کی ضرورت پڑے تو ہر نماز کے لیے صرف اقامت پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ کے لیے انہوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بھی قائم کیا ہے۔

''جب مغرب اور عشاء کو جمع کیا جائے تو کیا اذان دی جائے یا صرف اقامت پر اکتفا کیا جائے''۔ پھر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل پیش کیا ہے کہ اگر انہیں سفر میں جلدی ہوتی تو اقامت کہہ کر نماز مغرب کی تین رکعات ادا کرتے پھر تھوڑی دیر بعد اقامت کہی جاتی تو آپ عشاء کی دو رکعت ادا کرتے۔ [صحیح بخاری: تقصیر الصلوٰۃ' ۱۱۰۹]

دار قطنی کی روایت میں مزید وضاحت ہے کہ دوران سفر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کسی نماز کے لیے اذان نہیں کہتے تھے۔

[فتح الباری: ج ۲' ص ۲۵۰]

بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران سفر اگر جمع کرنا ہو تو ایک اذان کہی جائے پھر ہر نماز کے لیے اقامت الگ الگ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال فاروق آباد سے سعید ساجد لکھتے ہیں کہ مسجد اہلحدیث دور ہونے کی وجہ سے ایک دوکاندار اپنی دکان پر نماز ادا کر سکتا ہے؟ نیز کیا وہ ظہر اور عصر عادتاً جمع کر سکتا ہے؟ مدلل جواب دیں۔

جواب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا تذکرہ بایں الفاظ میں کیا ہے: ''کہ مسجدوں میں صبح وشام اس کی تسبیح ایسے لوگ پڑھتے ہیں جنہیں کوئی تجارت اور کوئی خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوۃ دینے سے غافل نہیں کرتی ہے۔'' [۹/التوبہ: ۳۷]

آیت کریمہ میں نماز قائم کرنے سے مراد صرف نماز پڑھ لینا ہی نہیں بلکہ اس کے پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنا ہے، نماز کا یہ حق ہے کہ اسے با جماعت ادا کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہدایت کے طریقے سکھائے ان ہدایت کے طریقے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس مسجد میں نماز ادا کی جائے۔ جس میں اذان دی جاتی ہے

اگر تم نماز اپنے اپنے گھروں میں پڑھو گے جیسے جماعت سے پیچھے رہنے والا یہ شخص (منافق) اپنے گھر میں پڑھ لیتا ہے تو تم اپنے نبی کی سنت چھوڑ دو گے اور اگر نبی کی سنت چھوڑ دو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔'' [صحیح مسلم: کتاب المساجد]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں نے پختہ ارادہ کیا کہ میں لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں پھر اذان کہلواؤں اور کسی شخص کو امامت کے لیے کہوں پھر ان لوگوں کے گھر جلا دوں جو نماز باجماعت میں حاضر نہیں ہوتے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الاذان]

حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا صحابی تھے انہوں نے اپنے اندھے ہونے کا عذر پیش کرتے ہوئے گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اذان سنتے ہو؟'' عرض کیا جی ہاں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر نماز باجماعت ادا کرو۔'' [صحیح مسلم: کتاب المساجد]

ایک شخص نابینا ہے اسے تو گھر میں نماز ادا کرنے کی اجازت نہیں ملی، ہم لوگ جو آنکھیں رکھتے ہیں، اذان بھی سنتے ہیں، صرف دنیاوی کاروبار کی خاطر نماز دوکان پر پڑھ لیں اور باجماعت ادا نہ کریں، قیامت کے دن ہمارا کیا حال ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ نماز باجماعت ادا کی جائے، حدیث میں ہے: ''نماز باجماعت سے سوائے کھلے منافق کے کوئی پیچھے نہیں رہتا بیمار بھی دو آدمیوں کے سہارے نماز ادا کرنے کے لیے صف میں کھڑا کیا جاتا تھا۔'' [صحیح مسلم]

نمازوں کو ناگزیر قسم کے حالات اور شدید مجبوری کی صورت میں تو جمع کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ سفر، خوف، بیماری، بارش اور سخت آندھی یا اور کوئی ہنگامی ضرورت کے وقت دو نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ تاہم شدید ضرورت کے بغیر دو نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں جیسے کہ کاروباری لوگوں کا عام معمول ہے کہ وہ سستی یا کاروباری مصروفیت کی وجہ سے ایسا کر لیتے ہیں یہ صحیح نہیں بلکہ سخت گناہ ہے، بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ عذر کے بغیر نمازوں کو جمع کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ [بیہقی: ۱۶۹/۳] ہر نماز کو اس کے وقت پر ہی ادا کرنا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال جب مقامی طور پر کسی وجہ سے دو نمازوں کو جمع کیا جائے تو پہلے اور بعد کی مؤکدہ سنتوں کو پڑھا جائے یا چھوڑ دیا جائے؟۔

جواب دو نمازوں کو کسی معقول سبب کی بنا پر جمع کیا جا سکتا ہے جیسا کہ سفر و خوف، بارش و آندھی، بیماری و نقاہت وغیرہ، لیکن بلا وجہ نمازوں کو جمع کرنا درست نہیں، بلا سبب جمع کرنا کسی حدیث یا کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے عمل سے ثابت نہیں ہے، بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بلا وجہ نمازوں کو جمع کرنا کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے، پھر سنن و نوافل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن مقیم ہونے کی صورت میں معقول عذر کی بنا پر جمع کرتے وقت پہلی نماز کے بعد والی سنتیں چھوڑ دینی چاہئیں۔ مثلاً: اگر ظہر اور عصر کو جمع کیا ہے تو ظہر کی آخری سنتیں اور اگر مغرب، عشاء کو جمع کیا ہے تو مغرب کی دو سنتیں نہ پڑھی جائیں البتہ عشاء کے بعد کی سنتیں اور وتر پڑھنا چاہئیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ انہوں نے بصرہ میں ایک دفعہ ظہر اور عصر کو جمع کیا اور ان کے درمیان کچھ نہ پڑھا، نیز آپ نے کسی مصروفیت کی بنا پر ایسا کیا، پھر انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ منورہ میں ظہر اور عصر کی

آٹھ رکعات اکٹھی پڑھی تھیں۔اور آپ نے درمیان میں کچھ نہ پڑھا تھا۔

[سنن نسائی: کتاب المواقیت، باب الجمع بین الصلوٰتین فی الحضر]

اس حدیث کے پیش نظر حضر میں دو نمازوں کو جمع کرتے وقت پہلی نماز کے بعد والی سنتیں چھوڑ دینے میں چنداں حرج نہیں ہے۔مغنی ابن قدامہ میں اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ [مغنی ابن قدامہ:۳/۱۲۷۔۱۴۰]

سوال لاہور سے ام کلثوم لکھتی ہیں کہ سردی کے موسم کی آمد آمد ہے، اس میں دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض مساجد میں قبلہ کی دیوار پر گیس ہیٹر نصب ہوتے ہیں، جبکہ احادیث میں ہے کہ سامنے آگ جلا کر نماز ادا نہ کرو، کیوں کہ یہ مجوسیوں سے مشابہت ہے۔

جواب واضح رہے کہ نمازی کے سامنے آگ ہونے کی صورت میں نماز ادا کرنا، اس میں اختلاف ہے، احناف کا موقف ہے کہ اس طرح نماز پڑھنے سے آتش پرست مجوسیوں سے مشابہت ہوتی ہے۔لہٰذا یہ درست نہیں۔ [ارشادالساری:۱/۴۳۲]

اسی طرح امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق منقول ہے کہ انہوں نے تنور کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کو مکروہ کہا اور فرمایا ہے کہ ''تنور آگ کا گھر ہے۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ بحوالہ فتح الباری]

کتب حدیث میں اس کے متعلق کوئی صریح اور صحیح حدیث نہیں ہے، جس میں اس طرح نماز ادا کرنے کو مکروہ کہا گیا ہو، سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ تلاش بسیار کے باوجود ہمیں نہیں مل سکی، بلکہ ایسی روایات تو ملتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دورانِ نماز آگ پیش کی گئی اور بعض اوقات وہ آگ قبلہ کی جانب اتنی قریب ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بچنے کے لیے ذرا پیچھے ہٹے۔یہ تمام روایات صحیح بخاری میں موجود ہیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی احادیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''یہ عنوان اس شخص کے متعلق ہے جو نمازی نماز پڑھتا ہو اور اس کے آگے تنور یا آگ یا کوئی ایسی چیز ہو جس کی عبادت کی جاتی ہے لیکن نمازی کی نیت اس کی عبادت کرنا نہ ہو بلکہ اللہ کی عبادت کا ارادہ کیے ہوئے ہو۔''

اس عنوان سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک اس طرح نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اس میں مشابہت کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لیے سامنے والی دیوار میں گیس ہیٹر نصب کرنے سے احتیاط کی جائے، البتہ نماز کی ادائیگی میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال رحیم یار خان سے محمد ادریس خریداری نمبر ۶۰۵۴ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے متعلق حساب ہوگا۔ اگر نماز سنت کے مطابق نہ ہوئی تو کیا حساب آگے چلے گا یا وہیں ختم کردیا جائے گا۔''

جواب واضح رہے کہ انسان پر دو طرح کے واجبات ادا کرنا ضروری ہیں ایک حقوق اللہ اور دوسرے حقوق العباد، قیامت کے دن حقوق العباد سے قتلِ ناحق کے متعلق پہلے حساب لیا جائے گا جیسا کہ حدیث میں ہے: ''کہ قیامت کے دن سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خونِ ناحق کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔'' [صحیح بخاری: الرقاق ۶۵۳۳]

البتہ حقوق اللہ سے نماز کے متعلق سب سے پہلے حساب ہوگا، اس حساب کی نوعیت حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ قیامت کے دن سب سے پہلے انسانی اعمال میں سے نماز کا حساب ہوگا، اگر وہ صحیح ہوئی تو اسے

کامیاب وکامران قرار دیا جائے گا۔اور اگر اس کا معاملہ خراب ہوا تو انسان خسارے میں رہے گا،اگر اس فریضہ میں کچھ کوتاہی ہوئی تو سنن ونوافل سے اس کی تلافی کردی جائے گی،اسی طرح دیگر اعمال کا محاسبہ ہوگا۔'' [جامع ترمذی:الصلوۃ'۴۱۳]

نماز میں کمی کے متعلق شارحین نے لکھا ہے کہ وہ معیار ومقدار کے متعلق بھی ہوسکتی ہے اور فرائض وشروط کے بارے میں ایسا ہوسکتا ہے۔دونوں صورتوں میں نوافل وغیرہ سے اس کمی کو پورا کیا جائے گا،اگر کسی انسان کے نامہ اعمال میں نماز نامی کوئی چیز برآمد ہی نہ ہوئی تو ایسے انسان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ تو احادیث کی صراحت کے مطابق دائرہ اسلام سے ہی خارج ہے،اس کے علاوہ رکعات کی تعداد یا کیفیت ادا کے متعلق اگر کمی کوتاہی ہوئی تو اسے نوافل وسنن سے پورا کیا جائے گا،جیسا کہ دیگر احادیث میں اس کی وضاحت ہے۔ [نسائی:الصلوۃ'۴۶۷؛ابن ماجہ:الصلوۃ'۱۴۲۵]

عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے سے چھوٹے عمل کا حساب ہوگا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:''ہم قیامت کے دن عدل وانصاف کا ترازو قائم کریں گے۔لہٰذا کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہوگی اور اگر کسی کا رائی کے دانہ کے برابر بھی عمل ہوگا تو وہ بھی سامنے لائیں گے اور حساب لینے کے لیے ہم کافی ہیں۔'' [۲۱/الانبیآء:۴۷]

مذکورہ حدیث کے آخر میں بھی ہے''کہ اسی طرح دیگر اعمال کا محاسبہ ہوگا،البتہ ارکان اسلام،نماز،روزہ،حج اور زکوۃ لازمی مضامین کی حیثیت سے ان کا حساب لیا جائے گا۔اگر ان میں انسان ناکام رہا تو اسے ناکام ہی قرار دیا جائے گا۔''البتہ حساب وکتاب تو زندگی بھر کے اعمال کا ہوگا۔تاکہ برسرعام ایک نامراد انسان کی ناکامی کو واضح کیا جائے۔قرآن میں ہے:''کہ جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔'' [۹۹/الزلزال:۷،۸]

سوال ضلع قصور سے حافظ زکریا دریافت کرتے ہیں کہ دوران نماز سوئے ہوئے آدمی کو دوسرا نمازی بیدار کرسکتا ہے یا نہیں؟

جواب دورانِ نماز سو جانا نماز کی صحت کے منافی ہے اس کی اصلاح کے لیے اگر کوئی دوسرا نمازی اسے بیدار کرتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے،اصلاح نماز کے لیے ایسا کرنے سے نماز میں کوئی خرابی نہیں آتی چنانچہ رسول اللہ ﷺ رات کو نماز پڑھ رہے تھے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے بائیں جانب کھڑے ہوگئے تو آپ نے اسے پکڑ کر اپنے پیچھے سے اپنی دائیں جانب کھڑا کردیا۔ [صحیح بخاری:کتاب الاذان]

لہٰذا اصلاحِ نماز کے لیے دوران نماز ایسا کیا جاسکتا ہے۔

سوال صوابی سے اکرم نیازی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی نماز کے وقت اپنی شلوار ٹخنوں سے اوپر کرے اور نماز کے بعد عام حالات میں اس کی پروا نہ کرے تو کیا اس کا یہ عمل درست ہے؟نیز ننگے سر نماز پڑھنے کی شرعی حیثیت بھی واضح کریں۔

جواب سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل ٹخنوں کے اوپر کپڑا رکھنے کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ شاید یہ حکم صرف نماز کے لیے ہے۔حالانکہ اس حکم کا تعلق صرف نماز سے نہیں بلکہ مطلق طور پر ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا جو تکبر غرور کرتا ہوا،اپنے کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔'' [صحیح بخاری:کتاب اللباس]

ایک دوسری حدیث کے متعلق کپڑا ٹخنوں سے نیچا کرنے کو تکبر کی علامت قرار دیا گیا ہے۔جسے اللہ پسند نہیں کرتے۔

[ابوداود: کتاب اللباس]

نماز کے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ چادر یا شلوار ٹخنوں سے نیچے نہ ہو، کیوں کہ ایسا کرنے سے نماز قبول نہیں ہوتی۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''کہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کی نماز قبول نہیں کرتا جو ٹخنوں کے نیچے کپڑا لٹکاتا ہو۔'' [مسند امام احمد: ۴/ ۶۷] رسول اللہ ﷺ نے اس جرم کی سنگینی بایں الفاظ بیان فرمائی ہے: ''کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص کو صرف اس بنا پر زمین میں دھنسا دیا گیا کہ وہ متکبرانہ انداز میں اپنی چادر کو ٹخنوں کے نیچے لٹکا کر چلا کرتا تھا۔'' [صحیح بخاری: کتاب الانبیاء]

البتہ عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ وعید سنائی تو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا عرض کرنے لگیں کہ عورتیں اپنی چادر کے متعلق کیا کریں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ وہ ایک بالشت ٹخنوں سے نیچے لٹکا سکتی ہیں۔'' اس پر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اتنی سی مقدار نیچے لٹکانے سے چلتے وقت عورتوں کے قدم کھل جائیں گے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک ہاتھ کی مقدار کپڑا نیچے لٹکائیں، اس سے زیادہ نہ ہو۔'' [جامع ترمذی: کتاب اللباس]

مختصر یہ ہے کہ مسلمان کو ہر وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی چادر یا شلوار اس کے ٹخنوں سے نیچے نہ ہونے پائے۔ ننگے سر نماز ہو جاتی ہے لیکن عام حالات میں اسے عادت نہ بنایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے عام حالات میں ننگے سر نماز پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ ویسے بھی سر ننگا رکھنا اسلامی تہذیب نہیں بلکہ مغربی کلچر ہے جسے ہماری اکثریت نے بطور فیشن اپنا لیا ہے، بعض انتہا پسند حضرات اسے ''مردہ سنت'' خیال کر کے اس کے احیا کا بڑی سختی سے اہتمام کرتے ہیں۔ ان کا یہ طرز عمل عامۃ الناس میں نفرت کا باعث ہے۔ اس لیے احتراز کیا جائے۔ کپڑا موجود ہونے کی صورت میں عام طور پر ننگے سر نماز پڑھنا، صرف جواز کی گنجائش ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ضلع گجرات سے لال خاں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ننگے سر نماز پڑھتے تھے یا سر ڈھانپ کر۔ ان دونوں میں سے کون سا عمل آپ ﷺ کی دائمی سنت کے قریب اور زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے؟

جواب دوران نماز سر ڈھانپنے یا ننگا رکھنے کے متعلق ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ کچھ حضرات اس سلسلہ میں اس قدر افراط کرتے ہیں کہ سر ڈھانپے بغیر نماز پڑھنے کو مکروہ خیال کرتے ہیں جبکہ دوسری طرف تفریط یہ ہے کہ کپڑا ہوتے ہوئے بھی ننگے سر نماز پڑھنے کو اپنی شناختی علامت باور کراتے ہیں۔ مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ دوران نماز عورتوں کے لیے سر کا ڈھانپنا ضروری ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ بالغہ عورت کی نماز اوڑھنی یعنی دوپٹے کے بغیر قبول نہیں فرماتے۔''

[ابوداود: الصلوٰۃ ۶۴۱]

مرد حضرات کے لیے یہ پابندی نہیں ہے۔ وہ ننگے سر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ایسا کرنا صرف جواز کی حد تک ہے، ضروری نہیں' لیکن بہتر ہے کہ دوران نماز اپنے سر کو پگڑی، رومال یا ٹوپی وغیرہ سے ڈھانپا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے اولاد آدم! تم ہر نماز کے وقت اچھا لباس زیب تن کیا کرو۔'' [۳/ آل عمران: ۳۱]

آیت کریمہ میں زینت سے مراد اعلیٰ قسم کا لباس نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس حصہ جسم کو ڈھانپ کر آؤ جس کا کھلا رکھنا معیوب

ہے۔ چونکہ لباس والا جسم ننگے جسم کے مقابلہ میں مزین نظر آتا ہے اس لیے لباس کو زینت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں ننگے سر گھومتے پھرنا انتہائی معیوب ہے۔ سر ڈھانپ کر چلنا انسان کے پروقار اور معزز ہونے کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عام حالات میں اپنے سر کو ڈھانپ کر رکھتے تھے، صرف حج کے موقع پر اسے کھلا رکھنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ضروری ہے۔ ایسا کرنا حج کے شعائر سے ہے۔ اس پر قیاس کر کے ننگے سر نماز پڑھنے کی عادت بنا لینا اچھا نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک رسالہ میں یہ روایت لائے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے ایک غلام کو دیکھا کہ وہ ننگے سر نماز پڑھ رہا تھا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ اگر تمہیں لوگوں کے پاس جانا ہو تو اسی حالت میں چلے جاؤ گے؟ غلام نے جواب دیا، نہیں تب آپ نے فرمایا: ''کہ پھر تو اللہ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کے سامنے آنے کے لیے خوبصورتی اور آرائش اختیار کی جائے۔''

[حجاب المرأۃ ولباسہا فی الصلوٰۃ]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں ''کہ جن الفاظ کے ساتھ مصنف نے اس حدیث کو نقل کیا ہے وہ جملے کسی کتاب میں نہیں مل سکے۔ ممکن ہے کہ ننگے سر کا ذکر جو مصنف نے اس حدیث میں کیا ہے اس کا وجود کسی ایسی کتاب میں ہو جو مجھے نہیں مل سکی۔'' [حاشیہ حجاب المرأۃ]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ مزید لکھتے ہیں: ''کہ میرے خیال کے مطابق بلا وجہ ننگے سر نماز پڑھنا ناپسندیدہ حرکت ہے کیوں کہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ایک مسلمان کو نماز کی ادائیگی کے لیے اسلامی شکل وصورت اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس کے لیے زینت اختیار کی جائے۔'' [سنن بیہقی: ج ۲'ص ۲۳۶]

ہمارے اسلاف کی نظر میں ننگے سر رہنا، اسی حالت میں بازاروں، گلی کوچوں میں گھومتے پھرنا پھر اسی طرح عبادت کے مقامات میں چلے آنا کوئی اچھی عادت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ مغربی تہذیب کے برگ وبار ہیں۔ جو ہمارے متعدد اسلامی ممالک میں گھس آئے ہیں۔ جب مغربی تہذیب کے سلسلہ علمبردار اسلامی ممالک میں آئے تو اپنی عادات وخصائل بھی ساتھ لائے، ان کی دیکھا دیکھی ناپختہ کار مسلمان بھی آنکھیں بند کر کے ان کی تقلید کرنے لگے۔ اس طرح مسلمانوں نے اپنے اسلامی تشخص کو مجروح کر ڈالا ہے۔ [تمام المنہ: ص ۱۶۲]

رسول اللہ ﷺ سے قطعی طور پر یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے حالتِ احرام کے علاوہ ننگے سر نماز ادا کی ہو۔ اس سلسلہ میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ اپنے مفہوم میں صریح نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کتب حدیث وسیرت میں اس کا ضرور تذکرہ ہوتا۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حج وعمرہ کے علاوہ ننگے سر نماز ادا کی ہے وہ دلیل پیش کرے۔

الغرض ننگے سر نماز ادا کرنا صرف جائز ہے واجب یا مستحب نہیں ہے، اسی طرح سر ڈھانپ کر نماز ادا کرنا مستحب تو ہے لیکن ضروری نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھے پر کچھ نہ ہو۔'' [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۳۵۹]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مرد کے لیے دوران نماز سر ڈھانپنا واجب نہیں بصورتِ دیگر رسول اللہ ﷺ کندھوں کے

ساتھ سر کا بھی ذکر کر دیتے، البتہ یہ عمل مستحب ضرور ہے۔ لوگوں کو اس کی ترغیب بھی دینی چاہیے۔ ان دلائل وحقائق کے پیش نظر صورت مسئولہ میں پگڑی، رومال یا ٹوپی سے سر ڈھانپ کر نماز ادا کرنا سنت نبوی کے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس طرح اسلامی شکل وصورت میں نماز کی ادائیگی اللہ کے ہاں زیادہ اجر وثواب کا باعث ہوسکتی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بشیر احمد بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک آدمی صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے مگر اس کی بیوی بے نماز ہے، کیا ان دونوں کا نکاح جائز ہے۔ کیا آدمی بے نماز بیوی کے ہاتھ سے تیار شدہ کھانا استعمال کرسکتا ہے نیز کیا بے نماز کا ذبیحہ جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

جواب نماز دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے، قیامت کے دن بھی حقوق اللہ میں سے اسی کے متعلق سب سے پہلے سوال ہوگا۔ دانستہ نماز چھوڑ دینے والے کے متعلق رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''کہ بندے اور کفر کے مابین حد فاصل نماز ہے۔'' [صحیح مسلم: کتاب الایمان]

البتہ متقدمین میں اس کے متعلق اختلاف ہے کہ ترک نماز جیسے سنگین جرم کی نوعیت کیا ہے،؟ اکثر محدثین کا یہ موقف ہے کہ اس مقام پر کفر سے مراد ''کبیرہ گناہ'' ہے جسے وہ ''کفر دون کفر'' سے تعبیر کرتے ہیں، اس بنا پر جواز کی حد تک فتویٰ دیا جاسکتا ہے کہ نمازی پرہیز گار کا نکاح بے نماز عورت سے جائز ہے۔ لیکن اسے سمجھانے اور نماز کی تلقین کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔ البتہ ﴿الطیبات للطیبین﴾ کے پیش نظر افضل یہی ہے کہ کسی دین دار اور پابند شریعت عورت کا انتخاب کرے، اسی طرح جب اہل کتاب کا ذبیحہ استعمال کرنے کی اجازت ہے تو بے نماز کا ذبیحہ کیوں نا جائز ہوسکتا ہے؟۔ بے نماز اگر بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھ کر ذبح کرتا ہے تو اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، خواہ مخواہ شبہات میں نہیں پڑنا چاہیے، بے نماز آدمی کے ساتھ فاسق وفاجر جیسا سلوک کرنا چاہیے کیوں کہ یہ لوگ انتہائی قابلِ نفرت ہیں، بامر مجبوری بے نماز عورت کا تیار کردہ کھانا کھایا جاسکتا ہے۔ اختیاری حالات میں پرہیز بہتر ہے۔ تا کہ اس عورت کو اپنے کردار پر ندامت ہو، شاید اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنے سے وہ اس جرم سے باز آجائے۔

سوال حاصل پور سے میرداد قریشی لکھتے ہیں کہ نماز قصر کتنے میل کے ارادۂ سفر پر جائز ہے؟ کیا سفر کی کوئی حد مقرر ہے کہ کم ازکم اتنے میل کا سفر ہو تو نماز قصرا ادا ہوتی ہے، نیز کتنے روز تک قیام سفر میں نماز قصر کرنا جائز ہے، کیا دوران سفر نماز قصر کی بجائے پوری پڑھی جاسکتی ہے، ایسا کرنا بدعت تو نہ ہوگا، میں کچھ عرصہ سے بسلسلہ ملازمت لاہور میں مقیم ہوں، میرا ذاتی مکان میانوالی، بھکر شہر میں بھی موجود ہے اور ذاتی زرعی زمین کسی اور جگہ ہے اس کی نگرانی کے لیے جانا پڑتا ہے، کیا ان تمام مقامات پر مجھے قصر پڑھنا ہوگی یا پوری نماز ادا کرنا پڑے گی؟ براہِ کرم ان تمام سوالات کا جواب تفصیل سے دیں۔

جواب نماز قصر کے لیے مقدار سفر کے متعلق علمائے سلف میں خاصا اختلاف ہے، ظاہری حضرات کے نزدیک کسی قسم کی مقدار سفر معین نہیں ہے ان کے نزدیک ہر سفر میں نماز قصر کی جاسکتی ہے، خواہ سفر کم ہو یا زیادہ، بعض محدثین ایک دن اور ایک رات کی مسافت پر نماز قصر جائز قرار دیتے ہیں، الغرض رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق کوئی صریح قولی روایت نہیں ملتی جس سے نماز قصر کے لیے

مسافت کی مقدار کو معین کیا جا سکتا ہو، البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ جو سفر و حضر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک خادم خاص کی حیثیت سے رہے ہیں، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فعل سے استنباط کیا ہے کہ کم از کم نو میل کی مسافت پر نماز قصر کی جا سکتی ہے، چنانچہ آپ کے شاگرد یحییٰ بن یزید نے نماز قصر کے لیے مسافت کی مقدار کے متعلق سوال کیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین میل یا تین فرسنگ کا سفر کرتے تو نماز قصر فرماتے (روایت میں سفر کی تعیین کے متعلق تردد ایک راوی شعبہ کو ہوا ہے)

[صحیح مسلم: حدیث نمبر ۱۶۹۱]

واضح رہے کہ روایت میں تین میل کے بجائے تین فرسنگ مراد لینا زیادہ قرین قیاس ہے، کیوں کہ اس میں میل بھی آ جاتے ہیں کہ ایک فرسنگ تین میل کا ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسافت اگر نو میل ہو تو اپنے شہر یا گاؤں کی حد سے نکل کر نماز قصر کی جا سکتی ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ اتنی مسافت طے کرنے کے بعد قصر کا آغاز ہونا چاہیے۔ روایت میں انتہائے سفر کا بیان نہیں ہے۔ لیکن روایت کا یہ مفہوم اس لیے درست نہیں ہے کہ سائل نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے جواز قصر کے لیے مسافت کے متعلق سوال کیا تھا اور اس کے سوال کے مطابق ہی اسے جواب دیا گیا۔ اس کے بعد یہ مفروضہ قائم کرنا کہ واقعاتی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف اتنی مسافت پر مشتمل سفر کرنا ثابت نہیں، اس کی حیثیت نکتہ آفرینی سے زیادہ نہیں کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ سائل کے سوال کو سمجھ کر اس کے مطابق جواب دیتے ہیں جو ہمیں تسلیم کرنا چاہیے۔

دورانِ سفر کتنے روز کے قیام میں نماز قصر کی جا سکتی ہے؟ اس کے متعلق بھی ائمہ کرام سے اختلاف منقول ہے، اس بارے میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صریح حکم مروی نہیں ہے، البتہ آپ کے عمل مبارک سے جو بات سمجھ آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ دورانِ سفر، قیام پڑاؤ یا منزل مقصود پر پہنچے اور روانگی کے دن کے علاوہ اگر تین دن اور تین رات ٹھہرنے کا ارادہ یقینی ہو۔ تو نماز قصر ادا کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ قیام مقصود ہو تو نماز پوری پڑھنا ہوگی۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقعہ پر چار ذوالحجہ صبح کے وقت مکہ مکرمہ پہنچے ہیں اور آٹھویں ذوالحجہ صبح کی نماز ادا کر کے منیٰ کو روانہ ہوئے ہیں، یعنی آمد اور روانگی کا دن نکال کر پانچ، چھ اور سات ذوالحجہ تک تین دن مکمل قیام کیا اور یہ قیام اتفاقی نہیں بلکہ حسب پروگرام تھا اور اس دوران آپ نماز قصر پڑھتے رہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دورانِ سفر اگر بیس نمازیں ادا کرنے تک قیام رکھنا ہو تو نماز قصر ادا کرنے کا ثبوت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ملتا ہے اس موقف کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اور فرمان سے بھی ہوتی ہے کہ آپ نے مہاجرین کو مناسک حج ادا کرنے کے بعد صرف تین دن مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''کہ حج ادا کرنے کے بعد مہاجر تین دن مکہ میں ٹھہر سکتا ہے۔''

[صحیح مسلم: کتاب الحج، باب جواز الاقامۃ بمکۃ للمہاجر]

اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ مہاجرین نے چونکہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے مکہ مکرمہ کو چھوڑا تھا اس لیے مکہ فتح ہونے کے باوجود ان کی مسافرانہ حالت برقرار رہنی چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق تین دن اور تین رات کے قیام سے ایک مسافر انسان مقیم کے حکم میں نہیں آتا، بلکہ اس قدر قیام کرنے سے اس کی مسافرانہ حالت برقرار رہتی ہے۔ اس بنا پر محدثین کی اکثریت کا یہی موقف ہے کہ آمد اور روانگی کے دن کو نکال کر اگر پورے تین دن اور تین رات قیام کا پختہ ارادہ ہو تو نماز قصر

پڑھی جاسکتی ہے۔البتہ کسی جگہ پر آدمی مجبوراً رکا ہوا ہو اور ہر وقت یہ خیال دامن گیر ہو کہ مجبوری ختم ہوتے ہی گھر واپس چلا جاؤں گا تو ایسی غیر یقینی صورت حال کے پیش نظر علما کا اتفاق ہے کہ ایسی جگہ پر بلاتعیین مدت نماز قصر کی جاتی رہے گی۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے متعدد ایسی مثالیں کتب حدیث میں موجود ہیں کہ انہوں نے ایسے غیر یقینی حالات میں لمبی مدت تک کے لیے نمازیں قصر سے پڑھی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپ ہمیشہ سفر میں قصر کرتے تھے، کسی معتبر روایت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ آپ نے کبھی سفر میں چار رکعات پڑھی ہوں، یعنی نماز پوری ادا کی ہو۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ متعدد مرتبہ سفر کیا ہے، میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان حضرات نے دوران سفر پوری نماز پڑھی ہو، یعنی قصر نمازیں ادا کرتے رہے ہیں، پھر آپ نے سورۂ احزاب میں سے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہترین نمونہ ہے''۔ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۶۸۹]

البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ انہوں نے حج کے موقع پر منیٰ میں چار رکعات پڑھائی تھیں اور محدثین کرام نے اس کی متعدد وجوہ بیان فرمائی ہیں اور اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی منقول ہے کہ آپ دورانِ سفر کبھی کبھار پوری نماز پڑھ لیتی تھیں۔ان احادیث کے پیش نظر محتاط ائمہ کرام نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔اور اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اس کی رخصت کو قبول کیا جائے اس بنا پر ہمارے نزدیک یہی افضل ہے کہ دورانِ سفر نماز قصر پڑھی جائے، لیکن اگر کوئی اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھاتے ہوئے نماز پوری ادا کرتا ہے تو اس کا جواز ہے اور بدعت وغیرہ کے زمرے میں نہیں آتی۔

فقہائے اسلام نے وطن کی دو اقسام لکھی ہیں:

① وطنِ اصلی: وہ مقام جہاں انسان پیدا ہوا ہے اور اپنے والدین یا اہل وعیال کے ہمراہ وہاں رہائش رکھے ہوئے ہو۔

② وطنِ اقامت: وہ مقام جہاں وہ شرعی مسافت سے زیادہ دنوں کے لیے رہائش رکھے ہوئے ہو۔

احکام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔لہٰذا اگر کوئی انسان کاروبار کے لیے کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہے اور اس کا پہلا گھر (وطنِ اصلی) بھی موجود ہے تو اس صورت میں جائے کاروبار یا جائے ملازمت (وطنِ اقامت) اور رہائشی گھر اقامت ہی کے حکم میں ہیں۔ذاتی مکانات اگرچہ متعدد ہوں اور مختلف مقامات پر ہوں وہاں نماز پوری ادا کرنا ہوگی، اسی طرح اپنی ذاتی زمین کی دیکھ بھال کے لیے کبھی کبھار جو سفر اختیار کرنا پڑتا ہے دورانِ سفر قصر اور اپنی زمین پر پہنچ کر پوری نماز پڑھنا ہوگی۔ذاتی دکانوں اور پلاٹوں کی بھی یہی حیثیت ہے۔

صورت مسئولہ میں ذاتی مکانات جہاں کہیں ہوں اور ذاتی زرعی زمین بھی جہاں کہیں ہو وہاں نماز پوری ادا کرنا ہوگی۔ کیوں کہ جب تک مکان یا ذاتی جائیداد موجود ہے وہ اس کی اقامت گاہ ہے اور نماز کے لیے قصر کی رعایت مسافر کو ہے، مقیم کو نہیں۔

سوال لاہور سے شوکت علی لکھتے ہیں کہ ہم روزانہ شہر سے باہر کام کرنے کے لیے جاتے ہیں وہ تقریباً ۹ میل سے زائد سفر ہے، ڈیوٹی کے دوران جو نماز آئے گی اسے کیسے ادا کریں نیز اپنے سسرال کے ہاں نماز کیسے ادا کی جائے گی، جبکہ اس کا فاصلہ ۹ میل سے

زائد ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ سسرال کا گھر اپنا ہی گھر ہوتا ہے لہٰذا نماز پوری پڑھی جائے راہنمائی فرمائیں۔

جواب جو لوگ محنت و مزدوری کے لیے روزانہ اتنی مسافت پر جاتے ہیں کہ جہاں نماز قصر کی جا سکتی ہے وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں ایسے لوگ شرعاً مقیم نہیں ہیں۔ بلکہ مسافر ہیں اور ان پر سفر کے احکام لازم ہوں گے۔ نیز احادیث نبویہ اور آیات قرآنیہ عام ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دائم السفر کو بھی قصر کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ تجارت پیشہ حضرات جو تجارت کے لیے ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اس نے عرض کیا کہ میں تجارت پیشہ ہوں اور اپنے کاروبار کے لیے ہمیشہ بحرین کا سفر کرتا ہوں تو آپ ﷺ نے اسے دو رکعت یعنی نماز قصر ادا کرنے کا حکم دیا۔

[مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/۴۴۸]

یہ روایت اگرچہ مرسل ہے تاہم عمومات کی تائید کے لیے اسے پیش کیا جا سکتا ہے، چونکہ صورت مسئولہ میں مزدوری کرنے والوں کا سفر تقریباً ۱۹ میل ہے لہٰذا اتنی مسافت پر قصر کی جا سکتی ہے جیسا کہ یحییٰ بن یزید نامی ایک تابعی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نماز کے متعلق دریافت کیا کہ اسے کتنی مسافت پر قصر کرنا چاہیے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے عمل کا حوالہ دیا کہ آپ ﷺ جب تین میل یا تین فرسخ کی مسافت پر نکلتے تو نماز قصر کرتے۔ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۱۵۸۳]

محدثین کرام نے تین فرسخ کو ترجیح دی ہے اور فرسخ لفظ فارسی فرسنگ کا معرب ہے جو تین میل کا ہوتا ہے اس لحاظ سے تین فرسنگ نو میل کے ہوں گے نیز اگر آدمی کے سسرال اتنی مسافت پر ہوں جہاں نماز قصر کی جا سکتی ہے تو اسے اپنے سسرال کے ہاں بھی قصر کرنا چاہیے، بعض اس موقف سے اختلاف کرتے ہوئے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''جو شخص کسی شہر میں شادی کرے اسے وہاں مقیم جیسی نماز پڑھنی چاہیے''۔ [مسند امام احمد: ۱/۶۲]

لیکن یہ روایت قابل حجت نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیوں کہ اس میں انقطاع ہے اور اس میں ایسے راوی بھی ہیں جو قابلِ حجت نہیں۔ [فتح الباری: ۲/۵۷۰]

اس کی سند میں عکرمہ بن ابراہیم نامی راوی ضعیف ہے۔ [نیل الاوطار: ۴/۱۳۰]

خود رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں نماز قصر کی ہے حالانکہ آپ کے سسرال مکہ مکرمہ میں تھے، حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے، ان کی لخت جگر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ نیز آپ ﷺ نے راستہ میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی تھی لیکن اس کے باوجود وہاں نماز کو قصر کے بغیر ادا کرنے کا کہیں ذکر نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو سسرال کے ہاں نماز قصر پڑھنی چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے چند ایک طلبا نے لکھا ہے کہ ہم گورنمنٹ کالج بوسن روڈ پر رہائش رکھے ہوئے ہیں اور ہمارا گھر سے ملتان کا سفر پچاس کلومیٹر سے زیادہ بنتا ہے۔ یہاں ہم نے ایک سال رہنا ہے، کیوں کہ ہمارے کورس کی مدت ایک سال ہے اور رہائش کے واجبات وغیرہ بھی ادا کر دیئے ہیں، ہم ہفتہ کے دن گھر جاتے ہیں اور اتوار کو مستقل چھوٹی ہوتی ہے، نماز کے متعلق راہنمائی فرمائیں کہ کالج یا گھر میں ہمیں نماز قصر پڑھنی چاہئے یا پوری ادا کرنی چاہیے؟

جواب دوران سفر کتنے روز قیام میں نماز قصر کی جاسکتی ہے اس کے متعلق ائمہ کرام میں کچھ کا اختلاف ہے کیوں کہ اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے کوئی واضح اور صریح حکم مروی نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے کہ اگر کسی جگہ پر انیس دن ٹھہرنے کا ارادہ ہوتو نماز قصر کی جائے اور اس سے زیادہ اقامت کی نیت ہوتو نماز پوری پڑھی جائے۔ [صحیح بخاری: ابواب التقصیر]

لیکن اکثر محدثین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ دورانِ سفر مقام پڑاؤ یا منزل مقصود پر پہنچنے اور وہاں سے روانگی کے دن کے علاوہ اگر تین دن اور تین رات ٹھہرنے کا پختہ اور یقینی ارادہ ہوتو وہاں نماز قصر کی جائے گی۔ اگر اس سے زیادہ قیام کا پروگرام ہے تو نماز پوری ادا کرنا ہوگی۔ فقہا کی اصطلاح میں اسے وطن اقامت کہا جاتا ہے اور جہاں انسان کی پیدائش ہو اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں رہائش رکھے ہوئے ہو تو وطن اصلی کہا جاتا ہے، محدثین عظام نے اپنے اس موقف کی بنیاد اس حدیث پر رکھی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ کا مہاجرین کے متعلق ایک حکم منقول ہے کہ وہ مناسک حج ادا کرنے کے بعد صرف تین دن تک مکہ مکرمہ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''حج ادا کرنے کے بعد مہاجر تین دن مکہ مکرمہ میں قیام رکھ سکتا ہے۔'' [صحیح مسلم]

اس کا مطلب یہ ہے کہ مہاجرین نے چونکہ اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے مکہ مکرمہ کو چھوڑا تھا، اس بنا پر مکہ فتح ہونے کے باوجود ان کی مسافرانہ حالت برقرار رہنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق مکمل تین دن اور تین رات کے قیام سے انسان مقیم کے حکم میں نہیں آتا بلکہ اس قدر اقامت رکھنے کے باوجود اس کی مسافرانہ حالت برقرار رہتی ہے۔ اس موقف کی تائید رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی ہوتی ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر سامنے آیا تھا کہ آپ نے اپنی آمد اور روانگی کے دن کے علاوہ مکہ مکرمہ میں پورے تین دن قیام فرمایا اور نماز قصر کرتے رہے، صورت مسئولہ میں طلبا کا کالج میں پورا ایک سال رہنے کا پروگرام ہے اور اپنے قیام کے لیے انہوں نے واجبات بھی ادا کر دیئے ہیں، اس بنا پر یہ کالج ان کے لیے وطنِ اقامت بن چکا ہے، لہٰذا وہ قصر کرنے کی رخصت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، بلکہ انہیں کالج میں دورانِ اقامت پوری نماز پڑھنا ہوگی، اس طرح جب وہ اپنے گھر والدین سے ملنے آئیں گے تو یہ ان کا وطنِ اصلی ہے یہاں بھی انہوں نے پوری نماز ادا کرنا ہے۔ البتہ دوران سفر اگر نماز کا وقت ہو جائے تو اسے قصر کر کے پڑھ سکتے ہیں، البتہ کالج جوان کا وطنِ اقامت ہے اور گھر جوان کا وطنِ اصلی ہے دونوں مقام پر نماز پوری ادا کرنی ہوگی۔ [واللہ اعلم]

سوال شہداد پور سے عبدالشکور لکھتے ہیں کہ ایک آدمی اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ میں ملازمت کے لیے جاتا ہے کچھ عرصہ بعد ایک دو دن کے لیے گھر آتا ہے، اس صورت میں اسے نماز پوری ادا کرنا ہوگی یا قصر پڑھنے کی گنجائش ہے؟۔

جواب فقہائے اسلام نے وطن کی دو اقسام لکھی ہیں: ایک وطن اصلی جہاں وہ پیدا ہوا ہے اور اپنے والدین یا اہل وعیال کے ہمراہ وہاں رہائش رکھے ہوئے ہے۔ دوسرا وطنِ اقامت، اس سے مراد وہ مقام جہاں شرعی مسافت سے زیادہ دنوں کے لیے رہائش رکھے ہوئے ہے، احکام کے لحاظ سے ان دونوں اقسام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی انسان کاروبار کے لیے کسی دوسری جگہ چلا جاتا ہے اور اس کا پہلا گھر (وطن اصلی) بھی موجود ہے تو اس صورت میں جائے ملازمت (وطن اقامت) اور رہائشی گھر (وطنِ اصلی) دونوں مقامات پر نماز پوری ادا کرنا ہوگی، البتہ دورانِ سفر قصر کی اجازت ہے۔ جس مقام پر انسان کی رہائش یا ملازمت یا جائیداد

یا اور کوئی ذریعہ معاش ہو وہ اقامت ہی کے حکم میں ہے۔ ذاتی مکانات اگر چہ متعدد ہوں اور مختلف مقامات پر ہوں، وہاں نماز پوری ادا کرنا ہوگی، اسی طرح اپنی ذاتی زمین کی دیکھ بھال کے لیے کبھی کبھار جو سفر کرنا پڑتا ہے۔ دورانِ سفر قصر اور زمین پر پہنچ کر پوری نماز پڑھنا ہوگی۔ دکانوں، ذاتی پلاٹوں کی بھی یہی حیثیت ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر کوئی ملازم ایک دو دن کے لیے گھر آئے تو اسے اپنے وطن اصلی میں نماز قصر نہیں بلکہ پوری ادا کرنا ہوگی۔ کیوں کہ اس کے ملازمت کے لیے چلے جانے سے اس کی اقامتی حیثیت ختم نہیں ہوگی بلکہ جب تک اس کا مکان یا جائیداد موجود ہے وہ اس کی اقامت گاہ ہے۔ اور نماز کے لیے رعایت مسافر کو ہے مقیم کو نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال فیصل آباد سے قاری حبیب اللہ بسمل خریداری نمبر ۱۴۸۳ لکھتے ہیں کہ اگر مسافر آدمی کسی مقیم امام کی اقتدا میں نماز ادا کرے اور اتفاق سے آخری دو رکعات میں شامل ہوا تو کیا اسے امام کے ساتھ سلام پھیر دینا چاہیے یا اسے چار رکعات پڑھنا ضروری ہیں۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب مسافر انسان پر دو رکعت ادا کرنا ہی فرض ہے۔ اس لیے عقل کا تقاضا تو یہی ہے کہ مسافر اگر مقیم کی اقتدا میں تیسری یا چوتھی رکعت میں شامل ہو تو اسے دو رکعت ادا کرنے پر سلام پھیر دینا چاہیے لیکن شریعت کی بعض نصوص اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار ایسے ملتے ہیں کہ اس معاملہ میں عقل کے فیصلے کے مطابق عمل نہیں کیا جا سکتا چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ مسافر جب اکیلا نماز پڑھتا ہے تو دو رکعات ادا کرتا ہے اور جب مقیم کی اقتدا میں پڑھتا ہے تو چار رکعتیں پڑھتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: ''یہی ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔'' [مسند الامام احمد: ج ۲، ص ۵۰۳]

امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تالیف میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ جب مسافر، مقیم امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو تو کیا کرے؟ اس کے تحت انہوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے چند ایسے آثار نقل فرمائے ہیں کہ مسافر جب کسی مقیم شخص کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اسے مکمل نماز پڑھنی چاہیے، ان آثار کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ اگر مسافر، مقیم امام کے ساتھ ایک رکعت میں شامل ہو تو امام کے ساتھ با جماعت نماز ادا کرنے کے بعد جو نماز رہ گئی ہو اسے ادا کرے۔''

② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ جب مسافر، مقیم امام کے پیچھے نماز ادا کرے تو اسے پوری نماز پڑھنی چاہیے۔''

③ حضرت مکحول سے روایت ہے: ''کہ اگر مسافر کسی مقیم امام کے پیچھے نماز پڑھے اور اسے ایک یا دو رکعت با جماعت مل جائیں تو امام کے ساتھ نماز ادا کر کے اس کے بعد بقیہ نماز پوری کرے۔''

④ حضرت جابر بن زید رضی اللہ عنہ سے سفر کی نماز کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''کہ اگر تم اکیلے نماز پڑھو تو دو رکعت اور با جماعت ادا کرو تو مقیم امام کی اقتدا کے پیش نظر پوری نماز پڑھو۔'' حضرت سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، قاسم اور عطاء بن ابی رباح کا بھی یہ فتویٰ ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۱، ص ۳۸۲]

ان آثار کے پیش نظر مسافر کو چاہیے کہ مقیم امام کی اقتدا کرتے ہوئے پوری نماز ادا کرے۔

نوٹ: راقم الحروف کافی عرصہ تک عقل کے تقاضے کے مطابق اگر مقیم امام کے پیچھے اتفاقاً مسافر کو دو یا ایک رکعت مل جانے پر مسافر کے لیے دو رکعت ادا کرنے کا قائل اور فاعل تھا مذکورہ حوالہ جات دستیاب ہونے پر اس مؤقف سے رجوع کیا، ان آثار کی نشاندہی عزیزم محمد حماد نے کی، جزاہ اللہ خیراً، واضح رہے کہ تحدیث نعمت کے طور پر یہ نوٹ لکھا گیا ہے۔

سوال ملتان سے حاجی محمد اسماعیل دریافت کرتے ہیں کہ آج کل بعض مقامات پر تہجد کی اذان دی جاتی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں یہ اذان دی جاتی تھی۔؟

جواب رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں فجر کی دو اذانیں ہوتی تھیں ایک فجر سے پہلے اور دوسری فجر کے بعد اس میں رمضان یا غیر رمضان کی تخصیص نہیں ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ''کہ بلال رضی اللہ عنہ رات کو اذان دیتا ہے۔ پس تم (سحری) کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دے۔'' [بخاری: کتاب الاذان]

اس حدیث سے قبل از فجر اذان دینے کا ثبوت ملتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''فجر سے پہلے اذان دینے کا بیان'' لیکن یہ اذان نماز فجر کے وقت کا اعلان اور سامعین کو حضورِ جماعت کی دعوت دینے کے لیے نہیں ہے۔ اسے تہجد کی اذان کہنے کی بجائے سحری کی اذان کہنا زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی غرض وغایت خود بیان فرمائی ہے'' کہ تہجد پڑھنے والا گھر لوٹ جائے اور گھر سونے والا بیدار ہو جائے۔'' [صحیح بخاری]

ہمارے ہاں عام طور پر یہ اذان فجر کی اذان سے کافی وقت پہلے کہہ دی جاتی ہے۔ جو درست نہیں ہے کیوں کہ یہ سحری کرنے اور نماز فجر کی تیاری کے لیے ہے۔ ان دونوں کاموں کے لیے چالیس پینتالیس منٹ کافی ہیں اور گھنٹوں پہلے یہ اذان دینا مناسب نہیں ہے۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ کیوں کہ سحری کا تعلق صرف رمضان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مہینوں میں بھی روزے رکھے جاسکتے ہیں۔ تفصیل کے لیے مرعاۃ المفاتیح: ۲/ ۱۵۵ دیکھا جاسکتا ہے۔

سوال نماز تہجد کے وقت رکوع اور سجود میں کون سے کلمات رسول اللہ ﷺ سے بار بار پڑھنا ثابت ہیں نیز ''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' سجدہ میں پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے؟۔

جواب سوال میں ذکر کردہ دعا کا سجدہ میں پڑھنا حدیث سے ثابت ہے، صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات اپنے رکوع اور سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے۔ ''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ''۔
[صحیح بخاری: کتاب الصلوٰۃ]

عام نمازوں میں رکوع وسجود کے وقت جن اذکار وادعیہ کا بار بار پڑھنا ثابت ہے انہیں نماز تہجد کے رکوع وسجود میں بار بار پڑھا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ مندرجہ ذیل ذکر خاص طور پر تہجد کے رکوع، سجود میں پڑھنا منقول ہے، اسے بھی بار بار پڑھا جاسکتا ہے۔ ''سُبْحَانَ ذِی الْجَبَرُوْتِ وَالْمَلَکُوْتِ وَالْکِبْرِیَاءِ وَالْعَظْمَۃِ''۔

سوال کیا نماز وتر کے ساتھ فرض ادا کیے جاسکتے ہیں؟

جواب نوافل کے ساتھ فرض کی ادائیگی ہوسکتی ہے بشرطیکہ نوافل کی ہیئت ادا بھی فرض جیسی ہو، نماز وتر کے ساتھ فرض پڑھنے کی

بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں فرض نماز کے کچھ ارکان رہ جاتے ہیں جن کی وجہ سے فرض نماز کی ادائیگی انتہائی ناقص ہوتی ہے جیسا کہ ایک سلام کے ساتھ تین وتر پڑھنے کی صورت میں چار رکعت والی فرض نماز کا تشہد اول رہ جائے گا لہٰذا ایسی صورت میں نماز وتر کے ساتھ فرض کی ادائیگی درست نہیں ہے البتہ اگر دو سلام کے ساتھ وتر پڑھے جائیں یا دو وتر باقی ہوں تو اس صورت میں نماز وتر کے ساتھ فرض نماز کی ادائیگی ممکن ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے بیگم عبدالاحد خریداری نمبر ۱۰۱۷ لکھتی ہیں کہ نماز تہجد کی گیارہ رکعات کس طرح ادا کی جائیں نیز اگر کسی وجہ سے نماز تہجد نہ پڑھی جائے تو اسے بطور قضا پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ عام طور پر تہجد کی گیارہ رکعات ادا کرتے تھے، بعض اوقات تہجد سے پہلے دو رکعات بطور تمہید یا افتتاح کے ادا کرتے جو ہلکی پھلکی ہوتیں، اس طرح تہجد کی رکعات تیرہ ہو جاتیں، رسول اللہ ﷺ نماز تہجد مختلف انداز سے ادا کرتے تھے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ دو، دو رکعات ادا کرنے کے بعد سلام پھیر دیا جائے آخر میں ایک وتر الگ پڑھ لیا جائے، عام طور پر رسول اللہ ﷺ نماز تہجد اسی طرح ادا کرتے تھے۔ [صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین ۷۳۶]

☆ پہلے دو رکعات الگ پڑھ لی جائیں پھر نو رکعات اس طرح ادا کی جائیں کہ آٹھویں رکعت میں تشہد پڑھا جائے پھر کھڑے ہو کر ایک رکعت ادا کی جائے۔ [صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین ۷۴۶]

☆ پہلے دو، دو کر کے چار رکعات ادا کی جائیں پھر سات رکعات کی نیت کر کے آخری رکعت میں سلام پھیرا جائے۔

[مسند امام احمد: ج ۳، ص ۲۳۹]

☆ پہلے دو، دو کر کے چھ رکعات ادا کی جائیں پھر پانچ رکعت اس طرح ادا ہوں کہ آخری رکعت میں تشہد مکمل کر کے سلام پھیر دیا جائے۔ [صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین ۷۳۷]

☆ پہلے آٹھ رکعات دو، دو کر کے ادا کی جائیں پھر تین وتر حسب ذیل طریقہ سے پڑھے جائیں۔ ① دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے اور ایک وتر الگ پڑھا جائے اسے فصل کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ [صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین ۷۳۶]

② تین رکعات درمیان میں تشہد بیٹھے بغیر ادا کی جائیں اور آخری رکعت میں تشہد کو مکمل کر کے سلام پھیر دیا جائے۔

[مستدرک حاکم: ج ۱، ص ۴۴۷]

اسے طریقہ وصل کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آخری طریقہ کے مطابق تین وتر ادا کرتے تھے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اہل مدینہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے مطابق نماز وتر پڑھتے تھے اگر رات کو نیند کا غلبہ ہو یا نسیان کی وجہ سے تہجد یا وتر بھول جائیں تو اس کی ادائیگی کے متعلق علمائے کرام میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وتر کی ادائیگی ضروری ہے اس لیے ان کے نزدیک ان کی قضا بھی ضروری ہے، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ اگر تہجد یا وتر رہ جائیں تو انہیں بطور قضا نہیں پڑھنا چاہیے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ اسے بطور قضا پڑھا جاسکتا ہے اس کے لیے وقت کی کوئی پابندی نہیں

جب بھی بیدار ہو یا یاد آئے تو اسے ادا کیا جا سکتا ہے۔'' اس موقف کی بنیاد حدیث نبوی پر ہے۔ [مستدرک حاکم: ج ۱ ص ۴۴۳]

صحیح موقف یہ ہے کہ اگر کسی کا وظیفہ شب رہ جائے تو اس کی قضا ضروری نہیں، اگر پڑھنا چاہے تو اگلے دن ظہر سے پہلے پہلے اسے ادا کرے، اس صورت میں اسے رات کے وقت ادائیگی کا ہی ثواب ملے گا۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین: ۱۴۲]

رسول اللہ ﷺ کا طریقہ مبارکہ یہ تھا کہ جب نیند یا کوئی تکلیف قیام اللیل سے رکاوٹ بن جاتی تو دن میں بارہ رکعات ادا فرما لیتے تھے۔ [صحیح مسلم، صلوٰۃ المسافرین ۱۳۹]

سوال تین وتر ایک سلام سے پڑھے جائیں یا دو سلام سے؟ اگر دو سلام سے پڑھے جائیں تو نیت اکٹھی ہو گی یا علیحدہ علیحدہ۔

جواب تین وتر پڑھتے وقت رسول اللہ کا ارشاد گرامی ہے کہ انہیں ایسے انداز سے پڑھا جائے کہ نماز مغرب سے مشابہت نہ ہو۔ [دار قطنی: ۲/۲۵]

اس حدیث کے پیش نظر تین وتر ادا کرنے کے دو طریقے حسب ذیل ہیں:

① مفصول: دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے، پھر ایک رکعت ادا کی جائے، ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اس صورت میں آخری ایک رکعت کے لیے نیت الگ کرنا ہو گی۔

② موصول: دو رکعت کے بعد تشہد کے بغیر کھڑا ہو جائے اور تیسری رکعت ادا کرے، رسول اللہ ﷺ سے ایسا کرنا عملاً ثابت ہے۔ [نسائی، بیہقی]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ [محلی ابن حزم: ۳/۴۷]

سوال متعدد قارئین کی طرف سے یہ سوال موصول ہوا ہے کہ اگر کوئی عشاء کے بعد وتر پڑھ لے اور سو جائے تو رات کسی وقت بیدار ہو کر اسے تہجد پڑھنے کی اجازت ہے؟ تہجد پڑھنے کی صورت میں وتروں کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا ایک رکعت پڑھ کر پہلے ادا کردہ وتروں کو ختم کر دے۔ پھر آخر میں دوبارہ وتر پڑھے یا بیداری کے بعد حسب توفیق نوافل پڑھتا رہے اور اسے آخر میں وتر کی ضرورت نہیں بلکہ پہلے سے ادا کردہ وتر ہی کافی ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مفصل جواب دیا جائے۔

جواب محدثین کی اصطلاح میں ایک رکعت پڑھ کر پہلے ادا کردہ وتروں کی تعداد کو جفت کرنا نقض وتر کہلاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نقض وتر کے متعلق اختلاف تھا کچھ حضرات اس کے قائل تھے اور اکثریت اس کی قائل نہ تھی۔ چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کچھ تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم نقض وتر کے قائل تھے۔ وہ اس طرح کہ دوبارہ بیدار ہو کر ایک رکعت پڑھے اور اسے ادا کردہ وتروں سے ملا دیا جائے پھر جس قدر نوافل میسر ہوں پڑھ لیے جائیں۔ اس کے اختتام پر وتر ادا کر لیے جائیں کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہوتے، اس کے برعکس کچھ اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم کا موقف ہے کہ اگر کوئی عشاء کے بعد وتر پڑھ کر سو جائے پھر رات کے کسی حصہ میں بیدار ہو تو حسب توفیق نفلی نماز پڑھتا رہے۔ اسے نقض وتر کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کے پہلے سے ادا کردہ وتر ہی برقرار رہیں۔ اسے دوبارہ وتر پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ یہ آخری موقف زیادہ صحیح ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے

نماز وتر کے بعد نفل ادا کرنا ثابت ہے۔ پھر امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی وہ حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتروں کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔ [جامع ترمذی: کتاب الصلوٰۃ' باب لا وتران فی لیلۃ]

اس اختلاف کی بنیاد احادیث وآثار کا بظاہر تعارض ہے کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہوتے۔ [ترمذی: وتر' ۴۷۰]

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے ''کہ تم اپنی رات کی نماز کے آخر میں وتر پڑھا کرو۔'' [صحیح بخاری: وتر' ۹۹۸]

ان احادیث کا تقاضا ہے کہ اگر کسی نے رات کے پہلے حصہ میں وتر پڑھے ہیں پھر وہ پچھلی رات اٹھ کر نفل پڑھنا چاہتا ہے تو اسے پہلے سے ادا کردہ وتر ختم کر دینے چاہئیں، پھر حسب توفیق نوافل پڑھنے کے بعد آخر میں وتر پڑھے جائیں۔ تاکہ تمام احادیث اپنے اپنے مقام پر صحیح رہیں۔ لیکن احادیث میں سیرت طیبہ کا یہ پہلو بھی سامنے آیا ہے کہ آپ وتروں کے بعد دو رکعت پڑھتے تھے۔ [صحیح مسلم: صلوٰۃ المسافرین' ۱۷۲۴]

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وتروں کے بعد دو رکعت پڑھنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ رات کو بیدار ہونا بہت محنت طلب اور بھاری کام ہے۔ اس لیے وتروں کے بعد اگر دو رکعت پڑھ لی جائیں تو تہجد کے لیے یہی کافی ہیں۔'' [سنن بیہقی: ۳/۳۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور امت کو اس کی ترغیب کا تقاضا ہے کہ وتروں کے بعد نوافل پڑھے جا سکتے ہیں، رات کی نماز کے آخر میں وتروں کا ہونا ضروری نہیں نیز نوافل پڑھنے کے لیے نقض وتر کی بھی ضرورت نہیں ہے، امام محمد بن نصر مروزی نے اس مسئلہ پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے، ہم اپنی گزارشات میں جستہ جستہ اس سے بھی استفادہ کریں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق احادیث میں ہے کہ وہ نماز وتر اول شب میں پڑھ لیتے، پھر جب آخر رات بیدار ہوتے تو ایک رکعت پڑھ کر نوافل شروع کر لیتے اور فرماتے کہ یہ اجنبی اونٹوں کی طرح ہیں جنہیں اصل اونٹوں سے ملا دیا جاتا ہے۔ حضرت سعید بن مالک رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی احادیث میں ہے فرماتے ہیں: ''کہ رات کو وتر پڑھنے کے بعد دوبارہ اٹھ کر نفل پڑھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پہلے ایک رکعت پڑھتا ہوں پھر دو رکعت، پھر دو رکعت اسی طرح نوافل ادا کرتا ہوں آخر میں وتر ادا کر لیتا ہوں۔'' [مختصر قیام اللیل: ۲۱۹]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی نے وتر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''کہ اگر میں سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں پھر بیدار ہو کر نفل پڑھنا چاہوں تو اپنے پہلے ادا کردہ وتروں کو ایک رکعت پڑھ کر جفت کر لیتا ہوں پھر دو، دو رکعات نماز ادا کرتا ہوں آخر میں ایک رکعت پڑھتا ہوں کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہاری رات کی آخری نماز وتر ہونی چاہیے''۔ [مسند امام احمد: ۲/۱۳۵]

حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقض وتر کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا: ''کہ میرے پاس اس سلسلہ میں کوئی روایت نہیں ہے بلکہ اپنے اجتہاد سے کام لے کر ایسا کرتا ہوں۔'' حضرت مسروق کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھی اس عمل پر بہت تعجب کیا کرتے تھے۔ [مختصر قیام اللیل: ۲۲۰]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جب نقض وتر کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: ''کہ نقض وتر کرنے والا وتروں سے کھیلتا ہے نیز

آپ نے فرمایا: ''اس طرح تو رات میں تین دفعہ وتر پڑھے جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے رات کو دو دفعہ وتر پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''جو لوگ نقضِ وتر کرتے ہیں وہ گویا اپنی نماز کے ساتھ کھیلتے ہیں۔'' [مختصر قیام اللیل:۲۲۱]

اس سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر کسی نے رات کے پہلے حصہ میں وتر پڑھ لیے ہیں تو اگر اسے رات کے پچھلے حصے میں نفل پڑھنے کے لیے وقت میسر آجائے تو اسے نفل پڑھنے کی اجازت ہے، وہ نہ تو نقضِ وتر کرے اور نہ دوبارہ وتروں کو ادا کرے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل بھی یہی ہے کہ وہ رات کے پہلے حصے میں وتر پڑھ لیتے تھے۔ اگر رات بیدار ہو جاتے تو دو، دو رکعت نفل ادا کرتے۔ تا آنکہ اپنی نماز سے فارغ ہو جاتے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ میں سونے سے پہلے وتر پڑھ لیتا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد رات کا قیام میرے مقدر میں لکھا ہوتا تو میں اٹھ کر دو، دو رکعت صبح تک پڑھتا رہتا ہوں۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ میں نماز عشاء کے بعد پانچ وتر پڑھ کر سو جاتا ہوں۔ اگر صبح بیدار ہو جاؤں تو دو، دو رکعت پڑھتا رہتا ہوں۔ اور پہلے سے ادا کردہ وتروں کو کافی سمجھتا ہوں۔'' حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے بھی یہی عمل مروی ہے، یہ تمام حضرات نقضِ وتر نہیں کرتے تھے بلکہ ایسا کرنے کو اچھا خیال نہیں کرتے تھے۔ [مختصر قیام اللیل:۲۲۱]

پہلے حدیث گزر چکی ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہوتے اس سلسلہ میں تفصیلی روایت ملاحظہ فرمائیں:

حضرت قیس بن طلق کہتے ہیں کہ طلق بن علی رضی اللہ عنہ ایک دن ہماری ملاقات کو آئے، انہوں نے ہمارے ہاں روزہ افطار کیا اور اس رات نماز تراویح وتر سمیت پڑھائی، پھر وہ اپنی مسجد میں تشریف لے گئے، وہاں جا کر اپنے مقتدی حضرات کو نماز پڑھائی، جب وتر رہ گئے تو ایک آدمی کو مصلیٰ پر آگے کر دیا اور اسے کہا کہ اپنے ساتھیوں کو وتر پڑھا دو، کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہوتے۔'' [ابوداؤد: الوتر'۱۴۳۹]

اس پر امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے نقضِ وتر کا باب قائم کیا ہے۔ یعنی نقضِ وتر کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اگر اس کا ثبوت ہوتا تو حضرت طلق رضی اللہ عنہ اپنی مسجد میں نماز تراویح پڑھانے سے قبل نقضِ وتر کرتے اور آخر میں اسے ادا کرتے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔

حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے نقضِ وتر کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''کہ نقضِ وتر کی ضرورت نہیں۔ جب تم نے پہلے وتر پڑھ لیے ہیں تو آخر شب میں وتر پڑھنے کی ضرورت نہیں، بلکہ بیداری کے بعد جس قدر نوافل میسر ہوں پڑھ لیے جائیں۔''
[صحیح بخاری: المغازی'۴۱۷۶]

اسماعیلی کی روایت ہے کہ جب تم نے آخری رات کے کسی حصے میں وتر پڑھنے ہیں تو اول شب پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ میں نے نقضِ وتر کے متعلق پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا تو انہوں نے حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ جیسا جواب دیا۔ [فتح الباری: ۷/۵۶۴]

حدیث میں ہے ''کہ رات کی نماز دو، دو رکعت ہے۔'' [صحیح بخاری: وتر'۹۹۰]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی نے اس کی تفصیل پوچھی تو فرمایا: ''دو، دو رکعت پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے۔'' [صحیح مسلم:۱۷۶۳]

اس حدیث کا بھی یہی تقاضا ہے کہ وتر کے بغیر ایک رکعت پڑھنا جائز نہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ وتر وا

کے علاوہ دو رکعت سے کم نفلی عبادت جائز نہیں۔'' [فتح الباری:۲/ ٦١٨]

ایک رکعت پڑھ کر جو نقض وتر کیا جاتا ہے اس رکعت کی کیا حیثیت ہے؟ جبکہ پہلے وتر اور اس رکعت کے درمیان نیند، گفتگو اور بے وضو ہونا سب کچھ حائل ہوا ہے۔ اب یہ ایک رکعت ادا کردہ وتروں کے ساتھ مل کر ان کی تعداد کو کیسے جفت کر سکتی ہے۔ بلکہ پہلے سے ادا کردہ وتر اور حالیہ ایک رکعت دو الگ الگ نمازیں ہیں، جو ایسا کرتا ہے اس نے گویا دو دفعہ وتر ادا کیے ہیں۔ پھر جب نقضِ وتر کے بعد نفل نماز پڑھے گا، پھر آخر میں وتر ادا کیے تو اس نے رات میں تین دفعہ وتر ادا کر لیے، جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

[تحفۃ الاحوذی:۲/ ۳۴۵]

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ شارح ترمذی نے بھی اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ رات کے پہلے حصہ میں وتر پڑھ کر پچھلی رات دوبارہ نفل پڑھے جا سکتے ہیں اور ایسا کرنا کسی حدیث کے مخالف نہیں ہے، رات کی نماز کے آخر میں وتر پڑھنا یہ امر استحباب ہے امر وجوب نہیں ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کے بعد نفل پڑھنا ثابت ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے عبدالعزیز صاحب دریافت کرتے ہیں کہ پہلے ہم قنوت وتر کے آخر میں ''وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ'' کے الفاظ پڑھا کرتے تھے۔ پھر ہمیں آپ کے ایک جمعہ کے خطبہ سے معلوم ہوا کہ یہ الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں اس کے بعد ہم نے ان الفاظ کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ لیکن ''صحیفہ اہلحدیث'' شمارہ ١٦ صفحہ ١٢ میں ان الفاظ کے ثبوت کے لیے سنن الکبریٰ بیہقی ص ٣٨ ج ٣ اور حصن حصین ص ٥٦ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اصل حقیقت کی وضاحت مطلوب ہے اولین فرصت میں ہماری ذہنی الجھن دور کریں۔

جواب بدقسمتی سے ہمارے ہاں رسم کے طور پر کچھ ایسے الفاظ رواج پا چکے ہیں جو کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہیں جیسا کہ خطبہ پڑھتے وقت ''وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حدیث کی کسی معروف یا غیر معروف کتاب میں ان الفاظ کا ذکر نہیں آیا۔ اسی طرح قنوتِ وتر میں ''وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ'' کے الفاظ کا معاملہ ہے۔ ہم علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ قنوتِ وتر میں مذکورہ الفاظ الحاقی ہیں کسی متداول میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ سب سے پہلے علامہ جزری شافعی نے ان الفاظ کو دریافت کرکے اپنی تالیف ''حصن حصین'' میں انہیں درج فرمایا، واضح رہے کہ حصن حصین حدیث کی مستقل کتاب نہیں ہے بلکہ مشکوٰۃ اور بلوغ المرام کی طرح بنیادی کتب حدیث سے ماخوذ ہے۔ علامہ جزری نے اس کتاب میں حوالہ جات کے لیے رموز کو استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ قنوتِ وتر مع الفاظ مذکورہ کے لیے انہوں نے مندرجہ ذیل رموز استعمال کیے ہیں: (ع، حب، مس، مص) ان رموز کا مطلب یہ ہے کہ قنوت وتر کی دعا درج ذیل کتب حدیث سے منقول ہے۔ سنن اربعہ (ع) صحیح ابن حبان (حب) مستدرک حاکم (مس) مصنف ابن ابی شیبہ (مص)۔

لیکن جب ہم نے ''وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنَتُوْبُ اِلَیْکَ'' کے الفاظ مذکورہ محولہ کتب میں تلاش کیے تو ہمیں بہت مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ دور دور تک ان الفاظ کا نام ونشان تک نہ مل سکا قارئین کی سہولت کے لیے ہم مکمل حوالہ جات درج کر دیتے ہیں۔

[ابوداؤد: کتاب الصلوۃ، باب القنوت فی الوتر؛ ترمذی: ابواب الوتر، باب القنوت فی الوتر؛ نسائی: کتاب قیام اللیل، باب الدعاء فی الوتر؛ ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلوۃ، باب ماجاء فی القنوت فی الوتر؛ صحیح ابن حبان: ج ۳، ص ۹۴؛ مستدرک حاکم: ج ۳، ص ۱۷۲؛ مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۲، ص ۲۰۰]

یہ بھی واضح رہے کہ ملا علی قاری نے حصن حصین کی شرح میں لکھا ہے کہ: ''یہ اضافہ ابن حبان کی روایت میں موجود ہے''، لیکن جب ہم نے صحیح ابن حبان کی طرف مراجعت کی تو تلاش بسیار کے باوجود یہ الحاقی الفاظ نہیں مل سکے۔ البتہ دعا وتر صفحہ ۹۴ ج ۳ میں موجود ہے۔ حصن حصین کے حاشیہ نگار نے اپنی گلوخلاصی بایں الفاظ کرائی ہے کہ: ''وَهُوَ مَوْجُوْدٌ فِي اَصْلِ الْاَصِيْلِ'' کہ ''یہ الفاظ اصل اصیل میں موجود ہیں''۔ اس اصل اصیل کی اصلیت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ ابھی تک ہماری رسائی اس کتاب تک نہیں ہوسکی ہم ان الفاظ کی تلاش میں عرصہ دراز سے اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ الفاظ ابن ابی عاصم کی روایت میں موجود ہیں۔ [مرعاۃ المفاتیح ص ۲۱۲ ج ۳]

چنانچہ ان کی راہنمائی میں ہم نے محدث ابن ابی عاصم کی تالیف کتاب السنۃ میں ان الفاظ کو تلاش کیا، مذکورہ روایت تو مل گئی لیکن صد حسرت مذکورہ الحاقی الفاظ وہاں بھی نہ مل سکے۔ [کتاب السنۃ: ج ۱/ ۱۶۴]

سوال میں مندرج بیہقی کا حوالہ ہمارے ممدوح مولانا عبد الرحمٰن عزیز الہ آبادی کا انکشاف ہے لیکن افسوس کہ بیہقی صفحہ ۳۹ جلد ۳ میں یہ روایت تو موجود ہے لیکن مذکورہ الفاظ نہیں مل سکے۔ حالانکہ مولانا محترم نے ''صحیفہ اہلحدیث'' میں ایڈیٹر کے نام حوالہ کی درستگی کے عنوان سے یہ شکوہ کیا ہے کہ ''صحیفہ اہلحدیث'' میں درست حوالہ جات کا فقدان ہے اور انہوں نے اہل صحیفہ سے ادباً گزارش کی ہے کہ حوالہ کا، کتاب، صفحہ، مطبوعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندراج کریں تاکہ قاری مطمئن ہوسکے۔ اور تلاش کرنے میں آسانی رہے۔

ہم بصد احترام اس گزارش پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ حوالہ کے لیے نقل در نقل کافی نہیں بلکہ اسے بچشم خود دیکھ کر اندراج کرنا چاہیے تاکہ قاری مزید کسی الجھن میں گرفتار نہ ہو۔ ہم اپنے موقف کی وضاحت کے لیے آج سے سولہ برس پہلے اہلحدیث [مجریہ جنوری ۱۹۸۶] میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون کا اقتباس ہدیہ قارئین کرتے ہیں۔

''قنوت وتر میں ''وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ'' کے الفاظ کتب متداولہ میں نہیں مل سکے۔ بعض علما نے صحیح ابن حبان کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن تلاش بسیار کے باوجود میں یہ الفاظ نہیں پاسکا۔ اسی طرح بعض حضرات نے سند کی جانچ پڑتال کیے بغیر حصن حصین کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ لوگوں نے اپنی طرف سے ان کا اضافہ کیا ہے حدیث سے یہ ثابت نہیں [روضۃ الطالبین: ۲/ ۲۵۳]

ان الفاظ کے بجائے ''لَا مَنْجَا مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ'' پڑھنا چاہیے۔ جو صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ [کتاب التوحید لابن مندۃ: ۲/ ۱۹۱]

آخر میں ہم اہل علم حضرات سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ آمین

سوال کوریا سے محمد طاہر لکھتے ہیں کہ موجودہ حالت میں قنوت نازلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ آیت کریمہ ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ (۳/آل عمران: ۱۲۸) کے نزول کے بعد قنوت نازلہ سے رک گئے تھے، کیا جواز کی صورت میں ہر نماز میں اسے پڑھا جا سکتا ہے، انڈیا، امریکہ اور بش وغیرہ کا نام لے کر قنوت نازلہ پڑھنا کیسا ہے، نیز اس کے ساتھ دیگر غیر

متعلقہ ادعیہ شامل کرکے اسے چالیس پچاس منٹ کی قنوت نازلہ بنا دینا درست ہے؟ نیز ہم جمعہ کے لیے تقریباً چالیس میل کا فاصلہ طے کرکے جاتے ہیں تو کیا وہاں قصر نماز پڑھی جاسکتی ہے؟

جواب یہاں سوال در سوال سے کئی ایک سوالات بن گئے ہیں، ترتیب وار جوابات حسب ذیل ہیں:

① اس میں کوئی شک نہیں کہ امت مسلمہ آج شدید بحرانی کیفیت سے گزر رہی ہے، اس میں اپنوں کی بے وفائی، مفاد پرستی اور مصلحت کو بڑا دخل ہے، دراصل اغیار کی وحشت و بربریت کو نام نہاد مسلمانوں کی ہوس اقتدار نے حوصلہ دیا ہے ایسے حالات میں ہم کمزور و ناتواں لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا و پکار کے علاوہ اور کیا کرسکتے ہیں، ایسے سنگین اور ہنگامی حالات میں دوران نماز رکوع کے بعد باآواز بلند امام کا دعا کرنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا قنوت نازلہ کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایسا کرنا ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی قوم کے لیے دعا 'بددعا کرتے تو رکوع کے بعد قنوت فرماتے۔ (صحیح بخاری)۔ اس لیے ائمہ مساجد کا یہ مستحسن اقدام ہے کہ انہوں نے ایسے کٹھن حالات میں قنوت نازلہ کا اہتمام کیا ہے۔ سوال میں جو لکھا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک آیت کریمہ کے نزول کے بعد قنوتِ نازلہ سے رک گئے تھے، اس سے اس کا مطلق طور پر نسخ مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ محدث ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر اپنی صحیح میں طویل گفتگو کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ قنوت نازلہ میں مخصوص کنتی لعنت فرماتے تھے آیت کریمہ میں آپ کو اس لعنت کرنے سے روکا گیا تھا کہ آپ اس معاملہ میں بے اختیار ہیں اللہ کا معاملہ ہے جسے چاہے توبہ کی توفیق عنایت فرمادے اور جسے چاہے عذاب دے کیوں کہ یہ ظلم پیشہ ہیں، چنانچہ جن کے متعلق آپ لعنت کرتے تھے، وہ مسلمان ہوگئے تھے۔

بعض اوقات ہنگامی حالات ختم ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے قنوت کا اہتمام ترک کردیا تھا کیوں کہ جن مسلمانوں کے لیے آپ دعا فرماتے تھے وہ کافروں کی قید و بند سے رہائی پاکر مدینہ پہنچ چکے تھے، اس سے بھی بعض لوگوں کو دھوکہ ہوا ہے کہ شاید آپ نے منسوخ ہونے کی وجہ سے قنوت ترک کردی تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ سے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قنوت کو بیان کرتے ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہنگامی حالات میں قنوت کا اہتمام کرتے تھے جیسا کہ سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا انس، سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے لہٰذا اسے علی الاطلاق منسوخ خیال کرکے ترک کردینا صحیح نہیں ہے۔

② دعا قنوت نازلہ پانچوں نمازوں میں کی جاسکتی ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مہینہ بھر میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر یعنی تمام نمازوں میں اہتمام کے ساتھ مسلسل قنوت نازلہ فرمائی۔ [ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ' باب القنوت فی الصلوات]

محدثین کرام رحمہم اللہ نے اپنی کتب حدیث میں ہنگامی حالات کے پیش نظر پانچوں نمازوں میں قنوت نازلہ کا اہتمام کرنے کے لیے باقاعدہ باب قائم کیے ہیں، چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم میں ایک باب یوں قائم کیا: ''**باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات**'' ''تمام نمازوں میں قنوت کا استحباب''۔

واضح رہے کہ قنوت نازلہ کو رکوع کے بعد باآواز بلند کرنا چاہیے اور مقتدی حضرات کو ساتھ ساتھ دعائیں پڑھنے کی بجائے صرف آمین کہنا چاہیے، جیسا کہ مسند امام احمد، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

③ رسول اللہ ﷺ نے جن ادعیہ کا اہتمام کیا ہے وہ ضرور پڑھی جائیں، ان کے علاوہ ہر وہ دعا بھی پڑھی جاسکتی ہے، جس کا ہنگامی حالات سے تعلق ہو، لادین حملہ آور امریکہ بھارت اور روس وغیرہ کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ رعل، مضر اور ذکوان کا نام لے کر ان کے لیے بد دعا فرمائی تھی، پھر ان سے نبرد آزما ہونے والے مجاہدین کا نام لے کر ان کی فتح ونصرت کے لیے دعا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے عیاش بن ربیعہ، سلمہ بن ہشام اور ولید بن ولید کا نام لے کر ان کے لیے دعائیں فرمائی تھیں۔ [صحیح بخاری]

④ ہنگامی حالات سے غیر متعلق ادعیہ کا قنوت نازلہ میں پڑھنا درست نہیں ہے، ائمہ مساجد کو چاہیے کہ وہ مقتدی حضرات کا خیال رکھیں، بے جا طوالت وتکرار سے اجتناب کریں، البتہ خشوع اور خضوع چیزے دیگر است۔ اسے ہر حال میں برقرار رہنا چاہیے، جب بھی ہنگامی حالات ختم ہو جائیں تو قنوت نازلہ کو موقوف کر دینا بھی مسنون ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بڑے اہتمام سے ان ناتواں اور کمزور مسلمانوں کی نجات کے لیے دعا فرماتے تھے، جو کفار کے ہاں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے، پھر آپ نے یہ سلسلہ بند کر دیا تو عرض کیا گیا کہ اب آپ دعا کیوں نہیں کرتے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ کفار کی قید سے رہائی پا کر مدینہ آ گئے ہیں''۔ [صحیح بخاری وصحیح مسلم]

امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک باب یوں قائم کیا ہے''۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ دعائے قنوت نہیں فرماتے تھے بلکہ جب کسی کے لیے دعا یا بد دعا کرنا مقصود ہوتی تو اس کا اہتمام فرماتے اور جب حالات ساز گار ہوتے تو قنوت کو موقوف کر دیتے۔

⑤ اگر کوئی نو میل یا اس سے زیادہ مسافت پر جمعہ پڑھنے کے لیے جاتا ہے اگر وہاں عصر کی نماز کا وقت ہو جائے تو قصر کر کے پڑھنا چاہیے، اسی طرح دوران سفر بھی نماز قصر پڑھی جاسکتی ہے۔

سوال کسی مدرسہ کے چند طلبا نے سوالات کئے ہیں کہ امت مسلمہ بالخصوص افغانستان شدید بحران کا شکار ہے اس سلسلہ میں ائمہ مساجد نے قنوت نازلہ کا اہتمام کر رکھا ہے کیا اس قنوت نازلہ کو پانچوں نمازوں میں پڑھا جاسکتا ہے؟ نیز بتائیں کہ قنوت نازلہ کی اصل دعا کیا ہے؟ کیا اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے اور اسے کس حد تک لمبا کیا جاسکتا ہے؟

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ امت مسلمہ آج شدید بحرانی کیفیت سے گزر رہی ہے اس میں اپنوں کی بے وفائی، مفاد پرستی اور مصلحت کوشی کو بڑا دخل ہے، دراصل اغیار کی وحشت وبربریت کو نام نہاد مسلمانوں کی ہوس اقتدار نے حوصلہ دیا ہے، ایسے حالات میں ہم کمزور اور ناتواں لوگ دعا کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں، ایسے سنگین اور ہنگامی حالات میں دوران نماز رکوع کے بعد آواز بلند دعا کرنا قنوت نازلہ کہلاتا ہے رسول اللہ ﷺ سے ایسا کرنا ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی قوم کے لیے بد دعا یا دعا کرتے تو رکوع کے بعد قنوت فرماتے۔ [صحیح بخاری]

اس لیے ائمہ مساجد کا یہ مستحسن اقدام ہے کہ انہوں نے ایسے حالات میں قنوت نازلہ کا اہتمام کیا ہے اسے پانچوں نمازوں میں برقرار رکھنا چاہیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر یعنی تمام نمازوں میں اہتمام کے ساتھ مسلسل قنوت نازلہ فرمائی۔ [ابوداؤد: کتاب الصلوۃ، باب القنوت فی الصلوات]

محدثین کرام نے اپنی کتب حدیث میں ہنگامی حالات کے پیش نظر پانچوں نمازوں میں قنوت نازلہ کا اہتمام کرنے کے لیے باقاعدہ باب قائم کئے ہیں، چنانچہ امام مسلم نے ایک باب یوں قائم کیا ہے" باب استحباب القنوت فی جمیع الصلوات" اس قنوتِ نازلہ کو رکوع کے بعد باآواز بلند کرنا چاہیے اور مقتدی حضرات کا آمین کہنا بھی احادیث سے ثابت ہے جیسا کہ مسند امام احمد، ابوداؤد اور مستدرک حاکم میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ احادیث میں قنوت نازلہ بایں الفاظ میں منقول ہے:۔

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَاَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِهِمْ وَانْصُرْهُمْ عَلٰى عَدُوِّكَ وَعَدُوِّهِمْ، اَللّٰهُمَّ الْعَنِ الْكَفَرَةَ الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِكَ وَيُكَذِّبُوْنَ رُسُلَكَ وَيُقَاتِلُوْنَ اَوْلِيَاءَكَ، اَللّٰهُمَّ خَالِفْ بَيْنَ كَلِمَتِهِمْ وَزَلْزِلْ اَقْدَامَهُمْ وَاَنْزِلْ بِهِمْ بَاْسَكَ الَّذِيْ لَاتَرُدُّهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ، اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيْعَ الْحِسَابِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمِ الْاَحْزَابَ وَزَلْزِلْهُمْ اَللّٰهُمَّ اَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْاَتَكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ وَاَلْقِ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ وَاَرْسِلْ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ وَعَذَابَكَ"

اس کے علاوہ ہر دعا پڑھی جاسکتی ہے جس کا ہنگامی حالات سے تعلق ہے،لادین حملہ آور بھارت، امریکہ حکومت کا نام بھی لیا جاسکتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ مضر، رعل، ذکوان کا نام لے کران کے لیے بددعا فرمائی تھی، پھران سے نبردآزما ہونے والے مجاہدین کا نام لے کران کی فتح ونصرت کے لیے دعا کی جاسکتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے عیاش بن ربیعہ، سلمہ بن ہشام اور ولید بن ولید کا نام لے کران کے لیے دعائیں فرمائیں تھی۔ [صحیح بخاری]

ہنگامی حالات سے غیر متعلق ادعیہ کا قنوت نازلہ میں پڑھنے کا ثبوت نہیں ملتا، اسی طرح ائمہ مساجد کو چاہیے کہ وہ مقتدی حضرات کا خیال رکھیں بے جا طوالت وتکرار سے اجتناب کریں، البتہ خشوع اور خضوع چیزے دیگراست، اسے بہر حال برقرار رہنا چاہیے، جب بھی ہنگامی حالات ختم ہوجائیں تو قنوت نازلہ کو ترک کردینا بھی مسنون ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بڑے اہتمام سے ان ناتواں اور کمزور مسلمانوں کی نجات کے لیے دعا فرماتے تھے جو کفار کی قید میں صعوبتیں برداشت کررہے تھے پھر آپ نے یہ سلسلہ موقوف کردیا تو عرض کیا گیا کہ اب آپ وہ دعائیں کیوں نہیں کرتے تو آپ ﷺ نے فرمایا:"تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ کفار کی قید سے رہائی پاکر مدینہ آگئے ہیں"۔ [صحیح بخاری وصحیح مسلم]

سوال اگر نماز کی چار رکعت پڑھنا ہوں تو کیا پہلے تشہد میں درود شریف پڑھنا ضروری ہے؟(خورشید عالم، جڑانوالہ خریداری نمبر ۵٦٨٧)

جواب اس سلسلہ میں ہمارے ہاں افراط وتفریط اور انتہا پسندی ہے، کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ پہلے تشہد میں اگر درود پڑھ لیا جائے تو اس سے نماز میں نقص آجاتا ہے اور اس کی تلافی سجدہ سہو سے ہوسکے گی جبکہ دوسری طرف کچھ اہل علم کا اصرار ہے کہ تشہد اول میں بھی دوسرے تشہد کی طرح درود پڑھنا ضروری ہے، اعتدال یہ ہے کہ پہلے تشہد میں درود پڑھا جاسکتا ہے جیسا کہ صدیقہ کائنات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کے وقت نماز کی کیفیت بیان کرتی ہوئی فرماتی ہیں: ''پھر آپ نو رکعت ادا کرتے اور آپ آٹھویں رکعت کے علاوہ کسی رکعت میں نہیں بیٹھتے تھے، آٹھویں رکعت میں بیٹھ کر اللہ کی تعریف کرتے اور اس کے نبی پر درود بھیجتے، دعا کرتے پھر سلام کے بغیر کھڑے ہو جاتے اس کے بعد نویں رکعت ادا کر کے بیٹھتے، اللہ کی حمد کرتے، اس کے نبی پر درود بھیجتے اور دعا کر کے سلام پھیر دیتے۔'' [سنن النسائی: قیام اللیل ۱۷۲۱]

اس حدیث میں واضح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تشہد میں بھی اپنی ذات پر اسی طرح درود پاک پڑھا جس طرح دوسرے تشہد میں پڑھا تھا، لیکن یہ درود پہلے تشہد میں ضروری نہیں ہے بلکہ صرف تشہد پر اکتفا بھی کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درمیانی تشہد سے فارغ ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔

[مسند امام احمد: ج ۱ ص ۴۵۹]

اس روایت پر محدث ابن خزیمہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''پہلے تشہد میں دعا وغیرہ ترک کر کے صرف التحیات پڑھنے پر اکتفا کرنا۔ [صحیح ابن خزیمہ: ج ۲ ص ۳۵۰]

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رفاعہ بن رافع کو حکم دیا تھا کہ جب تم نماز کے درمیان میں (تشہد) بیٹھو تو اطمینان وسکون سے اپنا بایاں پاؤں بچھا دو پھر تشہد پڑھو۔ [ابوداؤد: الصلوٰۃ ۸۶۰]

واضح رہے کہ یہاں وسط الصلوٰۃ سے مراد درمیانی تشہد ہے کیوں کہ یہ آخر الصلوٰۃ کے مقابلہ میں ہے ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ درمیانی تشہد میں درود پڑھا جا سکتا ہے لیکن ضروری نہیں ہے، البتہ آخری تشہد میں اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ اب مذکورہ روایات سے واضح اور صریح حکم کے باوجود بعض اہل علم کی طرف سے اس تاویل کی کیا گنجائش ہے کہ ''جن روایات میں تشہد اول کا بغیر درود کے ذکر ہے انہیں سورۃ احزاب کی آیت ﴿صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا﴾ کے نزول سے پہلے پر محمول کیا جائے گا''۔ [واللہ اعلم]

سوال: اگر امام درمیانہ تشہد بیٹھے بغیر کھڑا ہو جائے تو کیا مقتدیوں کو بھی کھڑا ہو جانا چاہیے یا وہ اپنا تشہد مکمل کر لیں اور اگر امام سیدھا کھڑا ہو کر پھر بیٹھ جائے تو اس صورت میں سجدہ سہو کرنا پڑے گا یا نہیں، نیز اگر امام آخری تشہد میں جلدی سلام پھیر دے تو کیا مقتدی حضرات بھی اس کے ساتھ سلام پھیر دیں یا وہ اپنا تشہد مکمل کر کے سلام پھیریں۔ (شوکت علی۔ فیصل آباد)

جواب: اگر امام دو رکعت پڑھنے کے بعد تشہد پڑھے بغیر کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

① بالکل سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے اسے خود یاد آ جائے یا مقتدیوں کے یاد دلانے پر وہ بیٹھ جاتا ہے تو اس صورت میں کوئی سجدہ سہو نہیں ہے۔

② اگر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے تو اسے یاد آنے یا مقتدیوں کے یاد دلانے پر نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ اسی حالت میں نماز مکمل کر کے آخر میں دو سجدے سہو کے طور پر کرے، اس صورت میں مقتدی حضرات بھی اس کے ساتھ کھڑے ہوں گے اور آخر میں سجدہ سہو میں شریک ہوں گے۔ حدیث میں ہے ''کہ اگر امام دو رکعت میں بیٹھنے کی بجائے کھڑا ہو جائے تو اگر سیدھا کھڑا ہونے سے پہلے یاد آ جائے تو بیٹھ جائے اور اپنی نماز مکمل کر لے اور اگر سیدھا کھڑا ہو گیا ہے تو یاد آنے پر مت بیٹھے بلکہ آخر میں دو سجدے سہو کے طور پر

کر دے''۔ [ابوداؤد: الصلوٰۃ ۱۰۳۶]

اس روایت کو بیان کرنے کے بعد امام ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میری اس کتاب میں جابر جعفی سے صرف یہی ایک حدیث مروی ہے تاہم علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اگر امام سیدھا کھڑا ہونے کے بعد پھر بیٹھ گیا ہے تو اس صورت میں بھی سجدہ سہو کرنا ہوں گے اور مقتدی بھی اس سجدہ سہو میں شریک ہوں گے۔

اگر امام نے اس قدر جلدی سلام پھیر دیا ہے کہ مقتدی حضرات تشہد اور درود نہیں پڑھ سکے تو انہیں تشہد اور درود پڑھ کر سلام پھیرنا چاہیے اور اگر انہوں نے تشہد اور درود پڑھ لیا ہے لیکن دیگر ادعیہ وغیرہ نہیں پڑھ سکے تو اس صورت میں مقتدی حضرات کو امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دینا چاہیے کیوں کہ حدیث میں ہے: ''امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔'' [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۶۸۹]

پہلی صورت میں امام کے ساتھ ہی مقتدیوں کو سلام نہیں پھیرنا چاہیے بلکہ ان کا تشہد مکمل نہیں ہوا تھا اور اس کا مکمل کرنا ضروری تھا جبکہ دوسری صورت میں مقتدی حضرات تشہد اور درود پڑھ چکے ہیں لہٰذا انہیں امام کے ساتھ ہی سلام پھیر دینا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال گرمی کے موسم میں دوران نماز مکمل جسم ڈھانپنا چاہیے یا کندھوں پر رومال وغیرہ ڈال لیا جائے تو اتنا ہی کافی ہے، قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت کریں۔ (محمد فاروق ناگی گوجرانوالہ خریداری نمبر ۳۷۴۲)

جواب نمازی کے لیے ضروری ہے کہ دوران نماز اپنے ستر کے سمیت دونوں کندھوں کو بھی ڈھانپ کر نماز پڑھے۔ مرد حضرات کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے جب کہ عورتوں کا سارا جسم ہی ستر ہے، مردوں کے لیے اپنے ستر کے علاوہ کندھوں کا ڈھانپنا بھی ضروری ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھے پر کچھ نہ ہو۔'' [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۳۵۹]

نیز حضرت عمرو بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ صرف ایک کپڑے میں نماز بایں طور پر پڑھتے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دونوں کناروں کو مخالف سمتوں میں کندھوں پر ڈال رکھا تھا۔ [صحیح بخاری: الصلوٰۃ ۳۵۶]

ان احادیث کے پیش نظر ایک ستر پوش نمازی کے لیے یہ گنجائش ہے کہ وہ صرف رومال وغیرہ کندھوں پر ڈال کر نماز پڑھ لے یا بازو والی بنیان پہن لے ہاں اگر رومال وغیرہ کندھوں پر ڈالا ہے تو اس کے دونوں کناروں کو کھلا نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی گرہ دے لی جائے۔ کیوں کہ کپڑے کو کھلا چھوڑ دینا سدل ہے جس کی نماز میں ممانعت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوران نماز منہ ڈھانپنے اور سدل سے منع فرمایا ہے۔ [ابوداؤد: الصلوٰۃ ۶۴۳]

سدل یہ ہے کہ سر یا کندھوں پر اس طرح کپڑا اڈالا جائے کہ وہ دونوں طرف لٹکتا رہے ہاں اگر سر یا گردن پر کپڑے کو بل دے کر لپیٹ لیا پھر اس کے دونوں کنارے لٹکیں تو یہ سدل نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ممانعت ہے۔ البتہ عورت کے لیے ضروری ہے کہ دوران نماز اس کے چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ اس کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ ہو حتیٰ کہ اس کے قدم بھی ڈھکے ہوئے ہوں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عورت اوڑھنی اور ایسے لمبے کرتے میں نماز پڑھے جس میں اس کے قدم بھی چھپ جائیں۔ [سنن بیہقی: ج ۲، ص ۲۳۲]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا موقوف ہونا زیادہ صحیح ہے۔ [بلوغ المرام: حدیث نمبر ۲۰۷]

تاہم اس قسم کی موقوف روایت مرفوع کے حکم میں ہے کیوں کہ اس میں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا تعلق اجتہاد واستنباط سے نہیں ہے۔صورت مسئولہ میں اگر رومال وغیرہ سے کندھوں کو ڈھانپ لیا جائے تو اس میں نماز ہو جاتی ہے بشرطیکہ قابل ستر حصہ ڈھانپا ہوا ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال حافظ سیف الرحمٰن بٹ خریداری نمبر ۵۳۹۳ لکھتے ہیں کہ امام کو دوران قرأت بعض آیات کا جواب خود دینا چاہیے یا مقتدی حضرات بھی باآواز بلند جواب دیں۔

جواب اس سوال کا مفصل جواب اہل حدیث مجریہ 7 مارچ 2003ء شمارہ نمبر 10 میں شائع ہو چکا ہے۔اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دوران قرأت یہ معمول بیان کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تسبیح کی آیات تلاوت کرتے تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے،اور جب کبھی سوال پر مشتمل آیت سے گزرتے تو سوال کرتے اسی طرح جب کبھی تعوذ کی آیات تلاوت کرتے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے۔ [صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ المسافرین]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول اگرچہ صلوٰۃ اللیل سے متعلق ہے تاہم محدثین کرام نے عمل کے لحاظ سے اسے عام رکھا ہے یعنی جب بھی کوئی دوران نماز ایسی آیات کی تلاوت کرے جس میں اللہ کی تسبیح یا پناہ یا سوال کا ذکر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرتے ہوئے اس وقت اللہ کی تسبیح کرے اللہ سے سوال کرے نیز دینی اور دنیوی ضرر رسانی،نقصان اور خسران سے اللہ کی پناہ طلب کرے دوران قرأت یہ ایک عام ہدایت ہے جس کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔واضح رہے کہ یہ ہدایت صرف قاری یعنی پڑھنے والے کے لیے ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع صرف اس معنی میں تمام افراد امت کے لیے عام ہے جب فرد کی حالت بھی وہی ہو جس حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کام سرانجام دیا ہے،بعض آیات کے جوابات کے متعلق مندرجہ ذیل گزارشات پیش خدمت ہیں۔

☆ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾ کی تلاوت کے وقت صرف امام کو **سبحان ربی الاعلیٰ** کہنے کی اجازت ہے کیوں کہ یہ عمل متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے۔وہ جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو جواب کے طور پر **سبحان ربی الاعلیٰ** کہتے۔

☆ باقی جوابات پر مشتمل روایات محدثین کرام کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں،جن حضرات کے ہاں ضعیف روایات پر عمل کرنے کی گنجائش ہے وہ اگر انہیں عمل میں لانا چاہیں تو یہ قرأت کے وقت تو ہو سکتا ہے جبکہ وہ خود تلاوت کر رہے ہوں،مقتدی حضرات کے لیے جواب دینے کا جواز ان روایات سے ثابت نہیں ہوتا۔

☆ ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ﴾ کا جواب خارج از نماز سنتے وقت دیا جا سکتا ہے کیوں کہ دوران نماز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تلاوت فرمانا اور جنوں کا جواب دینا احادیث سے ثابت نہیں۔

☆ سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر **اللھم حاسبنی حسابا یسیرا** جیسے کلمات سے جواب دینا انتہائی محل نظر ہے کیوں کہ کسی صحیح یا ضعیف روایت سے ثابت نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات بطور جواب کہے ہوں بلکہ آپ ان کلمات کو بطور دعا پڑھتے تھے۔

[مسند امام احمد:ج ۶،ص ۴۸]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ اس دعا کو تشہد میں سلام سے پہلے پڑھا جا سکتا ہے، انہوں نے اس دعا کو ان دعاؤں میں ذکر کیا ہے جو بوقت تشہد سلام سے پہلے پڑھی جاتی ہیں۔'' [صفۃ الصلوٰۃ:ص۲۰۱]

سورۃ الغاشیہ کے اختتام پر بطور جواب اس دعا کو پڑھنا کسی روایت سے ثابت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اسلام آباد سے آسیہ خاتون لکھتی ہیں کہ ایک عورت جو نماز پنجگانہ پابندی سے ادا کرتی ہے اور باقاعدہ تلاوت قرآن بھی کرتی ہے لیکن ہر وقت اسے فلمی گانوں کا جنون رہتا ہے، اس کے علاوہ وہ ٹی وی پر فلم اور ڈرامہ دیکھنے کا بھی شوق رکھتی ہے، اپنے سسرال کے ساتھ اچھا سلوک نہیں رکھتی بلکہ طیش میں آکر بعض اوقات وہ اپنے خاوند کو بھی گالیاں دیتی ہے، اس کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے باہر سیر وتفریح کے لیے چلی جاتی ہے ایسی عورت کے متعلق شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

جواب قرآن کریم نے نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک وصف بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔'' [۲۹/العنکبوت:۴۵]

یعنی نماز کا وصف لازم یہ ہے کہ وہ نمازی کو اخلاقی برائیوں سے روکتی ہے اور وصف مطلوب یہ ہے کہ اسے ادا کرنے والا فحش اور برے کاموں سے رک جائے، اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی کرنے کے باوجود عملاً برائیوں سے باز کیوں نہیں آتا جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو اس بات کا انحصار خود اس شخص پر ہے جو نماز پڑھتے وقت اصلاح نفس کی تربیت لے رہا ہے۔ اگر وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر ضرور مرتب ہوں گے اور اگر وہ اس کے برعکس اس کا اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہی نہیں یا دانستہ اس کی تاثیر کو دفع کرتا ہے تو ایسے بدبخت کی شقاوت میں کیا شک ہے۔ نماز کی قبولیت کا یہ ایک معیار ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد انسان برائی کرنے سے رک جائے ایسے حالات میں یقیناً اس کی نماز اللہ کے ہاں شرف قبولیت سے نوازی گئی ہے۔ سوال میں ذکر کردہ نماز اور تلاوتِ قرآن کے علاوہ دیگر تمام کام ناجائز اور حرام ہیں، ایسے حالات میں خاوند کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خاموش تماشائی بننے کے بجائے اپنی بیوی کو احسن انداز سے وعظ ونصیحت کرے اور گھر میں رہتے ہوئے اپنے اختیارات کو استعمال کرے اور اصلاح احوال کی کوشش کرے۔ اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گھر میں ٹی وی کون لایا ہے؟ یہ زہر آلود پودا خاوند کا خود کاشت کردہ ہے اگر وہ اسے گھر میں نہ لاتا تو اس تلخ حقیقت کا خطرہ دیکھنے سے محفوظ رہتا پھر وہ عورت یہ سب برے کام خاوند کے سامنے کرتی ہے آخر وہ کس مرض کا علاج ہے؟ عین ممکن ہے کہ خاوند خود بھی ایسی باتوں کا عادی ہو اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بیوی میں یہ عادات بد پڑ گئی ہوں۔ قرآن کریم کی اس نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ ''ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آتش جہنم سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔'' [۶۶/التحریم:۶]

ان حالات کے پیش نظر خاوند کو چاہیے کہ وہ خود اپنی بیوی کی اصلاح کی طرف توجہ دے اور اس سلسلہ میں اپنی ذمہ داری کا احساس کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہری پور سے عبدالقدوس لکھتے ہیں کہ اگر قرآن مجید سننا فرض ہے تو امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کیوں پڑھی جاتی ہے؟ نیز یہ بتائیں کہ اگر صبح کی جماعت کھڑی ہو تو کیا صبح کی سنتیں ایک طرف کھڑے ہو کر پڑھی جا سکتی ہیں جہاں امام کی قراءت نہ سنی جاتی ہو۔

جواب جس ذات اقدس نے قرآن مجید خاموشی سے سننا فرض قرار دیا ہے اسی ذات باری تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے یہ حکم دیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی (صحیح بخاری) دوران جماعت جب امام باآواز بلند قرأت کر رہا ہو تب بھی یہی حکم ہے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب میں اونچی آواز سے قرأت کروں تو (میرے پیچھے) سورۃ فاتحہ کے علاوہ اور کچھ نہ پڑھا کرو۔'' [دار قطنی: ج۱ص۳۱۹]

جو حضرات امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں آخر وہ بھی امام کی قرأت کے دوران کچھ پڑھنے کی گنجائش نکال لیتے ہیں جیسا کہ بوقت قرأت جماعت میں شامل ہونے والے کے لیے تکبیر تحریمہ اور دعائے استفتاح یعنی سبحانک اللھم وبحمدک پڑھنے کا جواز ان کے ہاں بھی مسلم ہے، اس بنا پر امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا اس ''انصات'' کے خلاف نہیں ہے جس کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا ہے اور نہ ہی حدیث اور قرآن میں کوئی قضا ہے لہٰذا ہمیں قرآن کا سہارا لے کر رسول اللہ ﷺ سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ ایسا کرنا ایمان کے منافی ہے باقی رہا مسئلہ کہ جب صبح کی نماز کھڑی ہو تو ایک طرف کھڑے ہو کر صبح کی سنتیں ادا کرنا تو یہ بھی حدیث کے خلاف ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب فرض نماز کے لیے اقامت ہو جائے تو اس وقت فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں ہوتی۔ [صحیح مسلم]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب فرض نماز کی ادائیگی کے لیے تکبیر کہہ دی جائے تو اس وقت سنت ادا کرنا جائز نہیں ہے، اس حکم میں صبح کی سنتیں بھی شامل ہیں، اس لیے مسجد کے کونے یا ستون کے پیچھے یا مسجد کے باہر دروازے کے پاس کسی جگہ پر انہیں ادا کرنا درست نہیں بلکہ جماعت میں شامل ہو کر فراغت کے بعد فوت شدہ سنتوں کو ادا کیا جائے، اس کا جواز احادیث سے ملتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ دوران جماعت سنتیں پڑھنے والوں کو سزا دیا کرتے تھے جیسا کہ محدثین کرام نے وضاحت کی ہے۔
[معالم السنن: ج۸ص۷۷]

سوال سیالکوٹ سے مشتاق احمد لکھتے ہیں کہ کیا ظہر کے وقت عصر کی نماز پڑھی جا سکتی ہے جبکہ سفر پر جانا ہو، اگر مسافر عصر کے وقت اپنی منزل پر پہنچ جائے تو کیا ظہر کے ساتھ ادا کی ہوئی نماز عصر دوبارہ پڑھنا ہوگی، وضاحت سے لکھیں۔

جواب واضح رہے کہ محدثین کرام کی اصطلاح میں پہلی نماز کے وقت میں دوسری نماز ادا کرنا جمع تقدیم اور دوسری نماز کے وقت میں پہلی نماز ادا کرنا جمع تاخیر کہلاتا ہے دوران سفر دونوں طریقوں سے نمازوں کو جمع کیا جا سکتا ہے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے سفر میں اگر کوچ سورج ڈھلنے کے بعد ہوتا تو ظہر کے وقت عصر بھی پڑھ لیتے پھر اپنے سفر کا آغاز کرتے اور اگر سورج ڈھلنے سے پہلے کوچ کرتے تو نماز ظہر کو مؤخر کر کے عصر کے ساتھ ادا کرتے، اس طرح مغرب اور عشاء کی ادائیگی میں کرتے تھے۔ [سنن ابی داؤد؛ سنن ترمذی]

سفر کے علاوہ بارش، بیماری یا کسی اہم ضرورت کے پیش نظر بھی جمع تقدیم یا جمع تاخیر کی جا سکتی ہے۔ اگر جمع تقدیم میں پہلی نماز کے وقت میں دوسری نماز ادا کر لی ہے تو سفر یا بارش کا عذر ختم ہونے کے بعد دوسری نماز کا وقت باقی ہو تو ادا شدہ نماز کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [مغنی ابن قدامہ: ج۲ص۲۸۱]

صورت مسئولہ میں وہ مسافر جو ظہر کے وقت نماز عصر پڑھ چکا ہے اگر وہ اپنی منزل پر عصر کے وقت پہنچ جائے تو اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال حافظ خالد محمود فیصل آباد سے دریافت کرتے ہیں کہ ہر نماز کے بعد باآواز بلند کلمہ کا ورد کرنا شرعاً کیسا ہے، نیز ہم جب قبرستان جاتے ہیں تو اہل قبور کو سلام کہتے ہیں کیا وہ ہمارا سلام سنتے اور جواب دیتے ہیں؟

جواب ہر نماز کے بعد بلند آواز سے کلمہ طیبہ کا ورد کرنے کے متعلق کوئی حدیث منقول نہیں ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول بایں الفاظ مروی ہے: ''فرض نماز کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پایا جاتا تھا۔''

[صحیح بخاری: باب الذکر بعد الصلوٰۃ]

لیکن اس روایت میں مطلق ذکر کا بیان ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ اس روایت کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے اختتام کو ''اللہ اکبر'' کہنے سے معلوم کرتا تھا یعنی آپ سلام پھیرنے کے بعد بلند آواز سے اللہ اکبر کہا کرتے تھے جس سے مجھے پتہ چل جاتا کہ نماز ختم ہو چکی ہے۔

لیکن اس روایت کا ہمارے ہاں رائج کردار سے کوئی تعلق نہیں ہے جس میں نماز کے بعد سپیکر کھول کر آپس میں تال سر ملاتے ہوئے لا الــــہ الا اللہ کی ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ ایسا کرنا نہ صرف خلاف سنت ہے بلکہ نمازی حضرات کے لیے باعث تشویش بھی ہے۔ نیز ایسا کرنے سے ریاکاری اور نمائش کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس بنا پر نماز کے بعد ذکر اذکار آہستہ آواز سے کرنا چاہیے تاکہ نمازیوں کے لیے اذیت کا باعث نہ ہو اور نہ ہی ریاکاری کا شائبہ پایا جائے۔

جہاں تک اہل قبور کو سلام کہنے کا تعلق ہے یہ ایک دعائیہ کلمہ ہے یعنی یہ سلام دعا ہے، سلام تحیہ نہیں جس کا جواب دینا سننے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے اہل قبور کا لفظ ہی اس حقیقت سے پردہ اٹھا رہا ہے کہ اس شہر خموشاں میں رہنے والوں کا تعلق اہل دنیا سے منقطع ہو چکا ہے۔ اب یہ حضرات عالم برزخ میں ہیں جس کا نظام دنیا کے نظام سے الگ تھلگ ہے۔ اہل قبور کے سننے اور پھر ان کے جواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں ہے: ''اے نبی! آپ اہل قبور کو نہیں سنا سکتے''۔ [۳۵/ فاطر: ۲۲]

اس نص قطعی کے بعد مردوں کے سننے کے لیے کونسی گنجائش رہتی ہے؟

سوال سانگلہ ہل سے ملک عبدالستار لکھتے ہیں کہ بے نماز کے ہاتھ سے پکی ہوئی چیز کھانا جائز ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

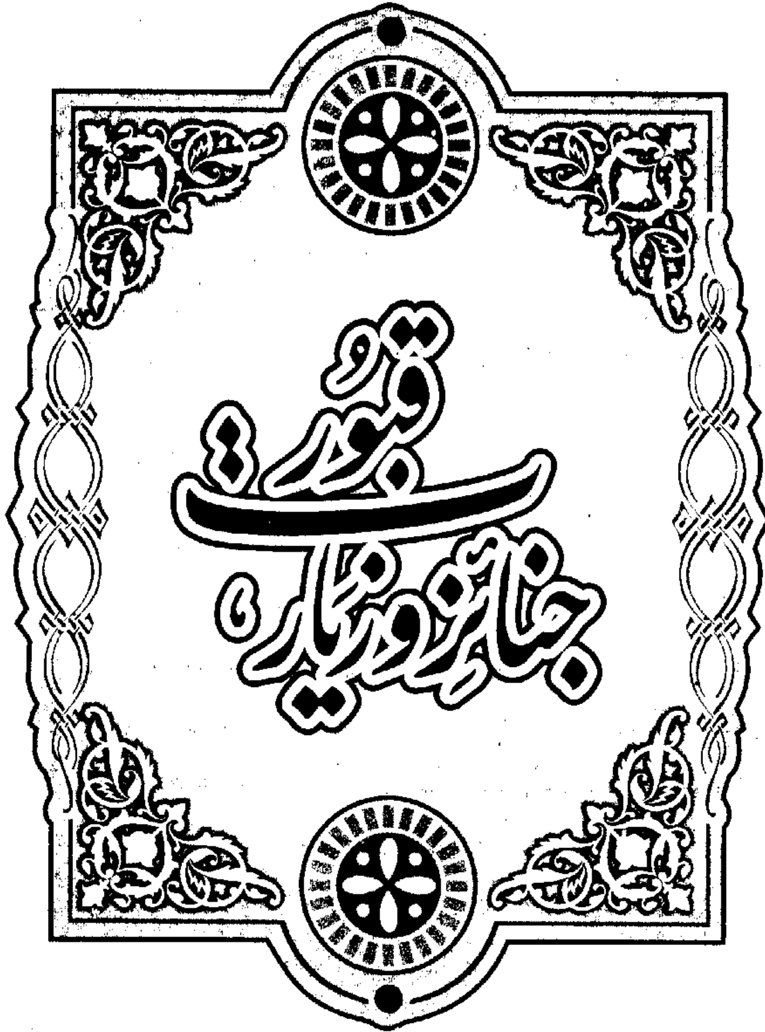
جواب اس سوال کا پس منظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعدد احادیث کے مطابق بے نماز کافر ہے تو کیا کفر کے مرتکب انسان کے ہاتھوں پکی ہوئی چیز استعمال کی جاسکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ کفر اور بندے کے درمیان نماز کا پردہ ہے۔'' یعنی اگر نماز کو ترک کر دیا جائے تو کفر کی حدیں انسان سے مل جاتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ بندے اور کفر وشرک کو باہمی شیر وشکر کر دینے والی چیز نماز کا ترک کر دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ دین نے بے نماز کا تلوار سے سر قلم کر دینے کا حکم دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نماز چھوڑنے سے جو کفر لازم آتا ہے وہ کونسا کفر ہے؟ کیا ایسا کفر ہے جس کے ارتکاب سے انسان

دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یا ''کفر دون کفر'' کی قسم سے ہے۔ جس کے ارتکاب سے انسان دائرہ اسلام سے تو خارج نہیں ہوتا البتہ کبیرہ گناہ کا سزاوار ٹھہرتا ہے، ہمارے نزدیک تارکِ نماز کفر کا مرتکب ضرور ہوتا ہے مگر یہ کفر اسے اس مقام پر نہیں پہنچاتا جہاں وہ اسلام لانے سے پہلے تھا۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''پانچ نمازوں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، جو شخص اچھی طرح وضو کر کے بروقت انہیں ادا کرنے کا اہتمام کرتا ہے ان کے رکوع وسجدہ کو اعتدال سے بجالاتا ہے خشوع وخضوع کو بھی برقرار رکھتا ہے ایسے نمازی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اسے ضرور معاف فرمائے گا اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو وہ اللہ کی مشیت کے تحت ہے اگر چاہے تو معاف کردے چاہے تو سزا دے۔ [مسند امام احمد: ۳۲۲/۵]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا تارک ایسے کفر کا مرتکب نہیں ہوتا جس سے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے کیوں کہ دائرہ اسلام سے خارج ہونے والا اللہ کی مشیت کے تحت نہیں بلکہ انہیں تو یقیناً جہنم کا ایندھن بنایا جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد ترک نماز ایک سنگین جرم ہے لیکن اس کی پکی ہوئی چیز استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ خاوند، بے نماز بیوی سے اس قسم کا احتجاج کر سکتا ہے تاکہ اس کا دماغ درست ہو جائے، عام لوگوں کے متعلق اس قسم کا ضابطہ عمل میں لانا بہت مشکل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود ایک یہودی عورت کے گھر سے کھانا تناول فرمایا تھا۔ جبکہ اس نے آپ کو دعوتِ طعام دی تھی اور کھانے میں سخت قسم کا زہر بھی ملا دیا تھا۔ اس طرح کے متعدد واقعات کتب حدیث میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے ساتھ قلبی تعلقات تو نہیں رکھے جا سکتے۔ البتہ دیگر روابط قائم کیے جا سکتے ہیں، جبکہ مقصود انہیں اسلام کے قریب کرنا ہو، کھانا وغیرہ اسی قسم سے ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں بے نماز کے ہاتھ سے پکی ہوئی چیز استعمال کی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]




جنازہ وزیارت قبور

جنائز و زیارتِ قبور

سوال لاہور سے عبدالرحمٰن سوال کرتے ہیں کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

جواب خودکشی کرنا بہت سنگین جرم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی سنگینی کو بایں الفاظ بیان فرمایا ہے: ''جو شخص اپنا گلا گھونٹ کر خودکشی کرے وہ جہنم میں بھی گلا گھونٹنے کی سزا سے دوچار ہوگا اور جو شخص برچھی وغیرہ اپنے پیٹ میں گھونپ کر خودکشی کرے گا وہ جہنم میں بھی برچھی گھونپتا رہے گا۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۳۶۵]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تم سے پہلے لوگوں میں ایک آدمی تھا اسے زخم ہوا اس سے بے قرار ہو کر اس نے چاقو سے اپنا ہاتھ کاٹ لیا خون بند نہ ہوا تا آنکہ وہ مر گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے نے جان دینے میں جلد بازی سے کام لیا اس لیے میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۳۶۴]

رسول اللہ ﷺ نے خودکشی کرنے والے کے متعلق مزید فرمایا: ''کہ جو شخص پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پہاڑ سے گرتا رہے گا اور جو زہر پی کر اپنے آپ کو ختم کرے گا تو قیامت کے دن جہنم میں وہی زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا اور اسے گھونٹ گھونٹ کر پیتا رہے گا اور جو شخص کسی ہتھیار سے خودکشی کرے گا وہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا اور جہنم میں اسی ہتھیار کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۷۷۸]

محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے خودکشی کرنے والے کے متعلق مختلف انداز میں ابواب قائم کیے ہیں۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ میں عنوان قائم کیا ہے: ''خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کا بیان۔'' یہ عنوان امام مسلم کی ایک حدیث پر قائم کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ایسا آدمی لایا گیا جس نے اپنے جسم میں برچھا گھونپ کر خودکشی کر لی تھی تو آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔

اس حدیث کے پیش نظر متعدد علما کا موقف ہے کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھنا چاہیے، اس کے برعکس امام مالک، امام نخعی، امام حسن بصری، امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہم) اور جمہور علما کا خیال ہے کہ خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنا چاہیے اور رسول اللہ ﷺ کا ایسے شخص پر جنازہ نہ پڑھنا زجر و تنبیہ پر محمول ہے تاکہ لوگ اس قسم کے فعل شنیع سے باز رہیں۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا جنازہ نہیں پڑھا البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کا جنازہ پڑھا تھا۔ کیونکہ نسائی شریف میں یہ روایت بایں الفاظ مروی ہے: ''لیکن میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔'' [نیل الاوطار]

رسول اللہ ﷺ نے خائن کے متعلق فرمایا تھا کہ تم اس کی نماز جنازہ پڑھو لیکن میں نہیں پڑھوں گا۔ ہمارا رجحان اسی طرف ہے کہ معاشرے میں ممتاز حضرات جو صاحب علم و بصیرت ہیں خودکشی کرنے والے کا جنازہ نہ پڑھیں تاکہ اس قسم کا جرم کرنے والوں کو تنبیہ ہو، البتہ عوام الناس اس کا جنازہ پڑھ لیں کیونکہ مرنے والا مسلمان ہے اور اس جرم کے ارتکاب سے وہ دین اسلام سے خارج نہیں ہوا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کوٹ سوہندا ضلع شیخوپورہ سے سعید ساجد لکھتے ہیں کہ دشمن کے ہاتھوں قید ہونے کے بجائے خود کو بم وغیرہ سے ختم کر لینا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ایسی موت خودکشی تو نہیں جو شریعت میں حرام ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل درکار ہے؟

جواب بلاشبہ انسان کا خود اپنے آپ کو مار ڈالنا بہت بڑا جرم اور سنگین حرکت ہے اور ایسی گھٹیا حرکت وہی شخص کرتا ہے جو ایمان اور عقل وخرد کی دولت سے تہی دست ہوتا ہے اس اقدام خودکشی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کی نظر میں زندگی اور اس کی نعمتوں کی کوئی قدر وقیمت نہیں، وہ اس فعل بد کے جواز کے لیے خواہ کتنے ہی حیلے کیوں نہ تلاش کرے، اس کا یہ اقدام کسی صورت میں درست ثابت نہیں ہوسکتا۔ اور نہ وہ قیامت کے دن خود کو قدرت کے انتقام اور عذاب الٰہی سے بچا سکتا ہے خودکشی کے متعلق متعدد احادیث وارد ہیں جن میں سخت وعید سنائی گئی ہے فرمان نبوی ﷺ ہے: ''جو شخص پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے وہ دوزخ کی آگ میں اسی طرح گرتا رہے گا اور جس نے زہر پی کر اپنے آپ کو ختم کیا وہ جہنم کی آگ میں بھی زہر پیتا رہے گا اور جس نے لوہے کے کسی ہتھیار سے خود کو قتل کیا وہ آتش جہنم میں بھی اسی ہتھیار کو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہے گا اور کبھی اس کو نجات نہیں ملے گی۔''
[صحیح بخاری و مسلم]

''جس شخص نے کسی چیز سے خودکشی کی قیامت کے دن اس سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔'' [بخاری]

ایک حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''میرے بندے نے خودکشی کے لیے جلدی کی لہٰذا میں نے اس پر جنت حرام کردی۔'' [صحیح بخاری]

صورت مسئولہ میں اگر خودکشی کسی ذاتی غرض کے لیے ہے تو یقیناً اسی وعید کا حق دار ہے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے جیسا کہ اکثر وبیشتر ایسے واقعات اخبارات میں آتے رہتے ہیں اگر اقدام خودکشی اسلام یا مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کے لیے ہے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں مواخذہ نہیں ہوگا، جیسا کہ سورۂ بروج میں اصحاب الاخدود کا واقعہ بیان ہوا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے ایک لڑکے نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو کسی میدان میں عوام الناس کے روبرو ''بِسْمِ اللهِ رَبِّ الْغُلَامِ'' پڑھ کر تیر مارا جائے اس طرح تم مجھے ختم کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہو۔ [فتح الباری: ۸/۸۹۲]

اس طرح وہ لڑکا تو قتل ہوگیا لیکن اس کے نتیجہ میں تمام لوگ جو اس منظر کو دیکھ رہے تھے مسلمان ہوگئے۔ اس نے احیاء اسلام کے لیے خود کو اللہ کے حوالے کر دیا، مختصراً یہ ہے کہ اگر کوئی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی تکلیف کی تاب نہ لاتے ہوئے خودکشی کرتا ہے تو وہ عظیم جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ مثلاً

① کسی زخم کی شدت کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے خود کو مار لینا۔
② گھریلو پریشانی کی وجہ سے خودکشی کر لینا۔
③ اپنی عزت وناموس کو بچانے کے لیے خود کو زہر پی کر ختم کر لینا وغیرہ۔

اگر احیائے اسلام یا اجتماعی ملی مفاد کے لیے اپنے آپ کو ختم کرتا ہے یا کسی کو کہتا ہے کہ اگر میں دشمن کے گھیرے میں آجاؤں تو مجھے قتل کر دینا تاکہ دشمن اسلام اہل اسلام کے متعلق راز افشاں کرانے میں کامیاب نہ ہوسکے تو یہ اقدام اللہ کے ہاں اجر وثواب کا

باعث ہوگا۔

سوال میاں چنوں سے محمد صالح سوال کرتے ہیں کہ ماں کے پیٹ سے جو مردہ بچہ پیدا ہو اس کا جنازہ پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ مرنے والے مسلمان کا جنازہ ادا کرنا فرض کفایہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ چند ایک مسلمانوں کی شرکت سے یہ فرض ادا ہو جاتا ہے۔ تمام لوگوں کی شمولیت ضروری نہیں ہے۔ اگر کوئی بھی جنازہ نہ پڑھے تو جرم میں سب شریک ہوتے ہیں، لیکن نابالغ بچے اور شہید کے متعلق یہ فرض کفایہ بھی نہیں ہے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لخت جگر ابراہیم رضی اللہ عنہ جو تقریباً ڈیڑھ سال زندہ رہے، ان کا جنازہ نہیں پڑھا تھا۔ [مسند امام احمد]

اسی طرح شہدائے احد کا بھی آپ نے جنازہ نہیں پڑھا تھا۔ جیسا کہ متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچے اور شہید کا جنازہ جائز نہیں کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بچوں اور سید الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جنازہ پڑھا تھا بچے کے متعلق یہ بھی روایات میں آیا ہے کہ اگر وہ ماں کے پیٹ سے مردہ بھی پیدا ہو تو بھی اس کا جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ مردہ پیدا ہونے والے بچے کا جنازہ پڑھا جائے اور اس کے والدین کے لیے مغفرت و رحمت کی دعا کی جائے۔ [سنن ابی داود۔ صحیح ابن حبان]

محدث العصر علامہ البانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''احکام الجنائز'' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔ نیز اس قسم کے بچے کا جنازہ اس صورت میں جائز ہوگا جب شکم مادر میں اس کے اندر روح پڑ چکی ہو۔ اور مدت حمل سے پہلے ہی اس کی ولادت ہو جائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کم از کم چار ماہ کا ہو۔ اگر ماں کے پیٹ میں چار ماہ نہیں گزرے تو اس قسم کے بچے کا نماز جنازہ مشروع نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں اسے مردہ کہا جائے گا اور جن روایات میں بچے کی آواز کے بعد جنازہ پڑھنے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال اسلام آباد سے محمد اکرم پوچھتے ہیں کہ غائبانہ نماز جنازہ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں مفصل جواب دیا جائے۔

جواب غائبانہ نماز جنازہ کے متعلق علمائے متقدمین میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، اور دیگر جمہور سلف صالحین اسے جائز کہتے ہیں۔ جبکہ احناف اور مالکی حضرات اسے ناجائز خیال کرتے ہیں۔ ہمارا رجحان جواز کی طرف ہے۔ جس کی دلیل مندرجہ ذیل فرمان نبوی ہے۔

''آج حبشہ سے تعلق رکھنے والا ایک نیک سیرت انسان (شاہ حبش) فوت ہو گیا ہے آؤ ہم اس کی نماز جنازہ پڑھیں۔'' راوی کہتے ہیں کہ ہم نے صفیں درست کیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ ادا کی (نماز جنازہ کے وقت) ہم نے صف بندی کر رکھی تھی۔ [بخاری: کتاب الجنائز]

صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے: کہ

''رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر عید گاہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں چار تکبیروں کے ساتھ اس کی نماز جنازہ ادا کی۔'' [کتاب الجنائز]

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ کا اہتمام اس لیے کیا تھا کہ مسلمانوں کی سرزمین کے علاوہ (لغیر ارضکم) غیر ملک میں فوت ہوا تھا اور اس کا جنازہ نہیں پڑھا گیا تھا۔ یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ ایک ملک کا سربراہ مسلمان ہو اور اس کے اسلام کا چرچا بھی ہو چکا ہو لیکن وہاں اس کا ہم نوا نہ ہو۔ حتیٰ کہ اعیان سلطنت، اہل خانہ اور دوست واحباب بھی اس نعمت سے محروم رہے ہوں اور اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو۔'' [الفتح الربانی: ۷/۲۲۳]

''لغیر ارضکم'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ سرزمین مدینہ میں فوت نہیں ہوا اگر یہاں فوت ہوتا تو تم ضرور اس کا جنازہ پڑھتے لہٰذا تم اس کی نماز جنازہ ادا کرنے کا اہتمام کرو۔'' [عون المعبود: ۲/۱۹۸]

البتہ غائبانہ نماز جنازہ کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے:

① فوت ہونے والا اچھی شہرت اور سیاسی، مذہبی اور علمی حیثیت کا حامل ہو۔ ہر چھوٹے بڑے کی نماز جنازہ غائبانہ طور پر درست نہیں۔

② غائبانہ نماز جنازہ کی ادائیگی میں سیاسی یا مالی مفادات وابستہ نہ ہوں۔ صرف اللہ کی رضا جوئی مطلوب ہو۔

③ اس کے لیے اعلانات یا انتظار یا دیگر ذرائع ابلاغ کو استعمال نہ کیا جائے جیسا کہ ہمارے ہاں آج کل رواج کے طور پر کیا جاتا ہے۔

④ وہاں تقاریر یا خطابات کا بھی قطعاً اہتمام نہ ہو، ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت نہیں ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال پیراں غائب سے محمد رمضان گجر نے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب طلب کیے ہیں:

① میت کا جنازہ پڑھنے تک ایک یا دو آدمی قبر کے پاس بیٹھے رہتے ہیں تاکہ قبر کو تنہا نہ چھوڑا جائے، کیا ایسا کرنا درست ہے؟

② جنازہ لے جاتے وقت بآواز بلند ''کلمہ شہادت'' کہا جاتا ہے، کیا اس طرح میت کو ثواب پہنچتا ہے؟

③ میت کو قبرستان کی طرف لے جاتے وقت اگر اس کے پاؤں قبلہ کی طرف ہو جائیں تو ایسا کرنا گناہ ہے؟

④ جنازہ پڑھنے کے بعد جب میت کو قبر کے نزدیک لے جانا ہو تو کیا اسے کندھوں پر اٹھایا جا سکتا ہے یا بازوؤں پر اٹھا کر اسے نیچے ہی نیچے لے کر جانا چاہیے؟

⑤ ہمارے ہاں دفن کرنے کے بعد ستر قدم پر جا کر دعا کی جاتی ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟

جواب ① قبر کو اکیلا چھوڑنے والا مسئلہ من گھڑت دیہاتی مسائل سے ہے قبر کے پاس بیٹھنے والوں کو چاہیے کہ وہ جنازہ میں شریک ہوں ان کا وہاں بیٹھے رہنا شرعاً درست نہیں ہے۔

② جنازہ لے جاتے وقت اونچی آواز میں کلمہ شہادت کہنا اور دوسرے لوگوں کا بطور جواب کلمہ شہادت پڑھنا بھی نئی ایجاد ہے۔ سلف صالحین سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور نہ ہی ایسا کرنے سے میت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔

③ جاتے وقت جنازہ کا رخ جس طرف ہے۔ سر اسی طرف ہونا چاہیے۔ اگر اتفاق سے میت کے پاؤں قبلہ کی طرف ہو جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً: اگر قبرستان مشرق کی طرف ہے تو میت کا رخ بھی مشرق کی طرف ہوگا، اس صورت میں پاؤں قبلہ رخ ہی ہوں گے۔ صرف اس بات کا خیال رکھا جائے کہ جانے کی طرف میت کا سر ہونا چاہیے۔

④ حسب ضرورت جو مناسب ہو کر لیا جائے، ضروری نہیں کہ میت کو قبر کی طرف لے جانے کے لیے اسے کندھوں پر اٹھایا جائے، جنازہ کے بعد اگر قبر نزدیک ہے تو میت کو کندھوں پر اٹھائے بغیر اسے قبر کے قریب کیا جا سکتا ہے، اگر قبر دور ہے تو اسے کندھوں پر اٹھا کر لے جانا بھی جائز ہے۔

⑤ دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر دعا مانگنا جائز ہے، لیکن قبر سے ستر قدم دور جا کر دعا کرنا محض ایک رسم ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس قسم کی تمام رسومات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال قبرستان میں میت رکھنے سے پہلے بیٹھنا جائز ہے؟

جواب جنازہ رکھنے سے پہلے بیٹھنے کے متعلق عام طور پر فقہا اور محدثین کے ہاں تین موقف ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① زمین پر جنازہ رکھنے سے پہلے کھڑے رہنا ضروری ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پہلے بیٹھنے سے منع فرمایا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے وہ اسے زمین پر رکھنے سے پہلے نہ بیٹھے۔'' [صحیح بخاری]

② جنازہ زمین پر رکھنے سے پہلے نہ بیٹھنے کا حکم امتناعی منسوخ ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنازہ کے لیے کھڑے رہنے کا حکم دیا تھا پھر خود بھی بیٹھ گئے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دیا۔ [مسند امام احمد:۲/۸۲]

③ زمین پر جنازہ رکھا جانے سے پہلے کھڑے رہنا ایک پسندیدہ عمل ہے لیکن اگر کوئی اس دوران بیٹھ جائے تو اس کے لیے جائز ہے یعنی کھڑے رہنا ایک مستحب عمل ہے ضروری نہیں۔ جمہور محدثین نے اس موقف کو اختیار فرمایا ہے اور یہی درست معلوم ہوتا ہے البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ انہوں نے کچھ آدمیوں کو دیکھا کہ وہ جنازہ کو زمین پر رکھنے کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کھڑے ہونے کے بعد بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔ [طحاوی:۱/۲۸۲]

لیکن یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک استنباط ہے حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے کیونکہ بادی النظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم جنازہ پاس سے گزرنے کے متعلق ہے، جنازہ اگر پاس سے گزرے تو کھڑے ہونا ایک الگ معاملہ ہے اور جنازہ زمین پر رکھے جانے سے قبل کھڑے رہنا ایک دوسرا معاملہ ہے، اس کے علاوہ کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسرے موقف کو اختیار کیا ہے چنانچہ ابو حازم کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم کے ہمراہ ایک جنازے میں شریک ہوا تو یہ حضرات جنازہ زمین پر رکھنے سے پہلے تک کھڑے رہے۔ جب اسے زمین پر رکھ دیا گیا تو بیٹھ گئے میرے سوال کرنے پر جواب دیا گیا کہ کھڑا رہنے والا اجر و ثواب میں جنازہ اٹھانے والے کی طرح ہے۔ [سنن بیہقی:۴/۲۷]

اس لیے بہتر ہے کہ جنازے کے ساتھ جانے والے حضرات جنازہ زمین پر رکھے جانے سے پہلے پہلے کھڑے رہیں اور جب اسے زمین پر رکھ دیا جائے تو بیٹھ جائیں لیکن یہ ضروری نہیں بلکہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔

سوال شورکوٹ سے شیخ محمد آصف شہزاد لکھتے ہیں کہ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ سے پہلے ثنا پڑھنا احادیث سے ثابت ہے یا نہیں......؟

جواب واضح رہے کہ عبادات کے ثبوت کے لیے دلیل کا ہونا ضروری ہے لیکن معاملات میں اصل اباحت ہے الا یہ کہ اس سے منع کر دیا گیا ہے نماز جنازہ کا تعلق عبادات سے ہے اس لیے اس میں ہر عمل کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے نیز عبادات میں قیاس وغیرہ بھی نہیں چلتا بلکہ قطعی نصوص سے اس کا ثبوت مطلوب ہوتا ہے، اس وضاحت کے بعد نماز جنازہ میں ثنا پڑھنے کے متعلق تلاش بسیار کے باوجود مجھے کوئی ثبوت دستیاب نہیں ہو سکا اگرچہ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اسے ثابت کرنے کے لیے کوشش فرمائی ہے آپ فرماتے ہیں کہ: ''حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دعا کرتے ہوئے سنا جس نے دعا کرنے سے پہلے نہ اللہ کی ثنا کی تھی اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ اس نے جلدی کی۔'' اس حدیث سے نماز جنازہ میں ثنا کا پڑھنا ثابت ہے۔ [کتاب الجنائز: ص ۵۲]

پھر فرماتے ہیں: ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نماز جنازہ کیونکر پڑھتے ہیں، انہوں نے کہا کہ میں جنازہ کے ساتھ لوگوں کے ہمراہ چلتا ہوں جب جنازہ رکھا جاتا ہے تو اللہ اکبر کہتا ہوں اور اللہ کی حمد کرتا ہوں اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتا ہوں...... اس اثر سے بھی نماز جنازہ نماز میں پہلی تکبیر کے بعد ثنا پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، اور اس کا ثبوت اس سے بھی ہے کہ جنازہ 'نماز ہے جیسے تمام نمازوں میں ثنا پڑھی جاتی ہے نماز جنازہ میں بھی اسے پڑھنا چاہیے۔

[کتاب الجنائز: ۵۲]

لیکن ان دلائل سے مجھے اطمینان نہیں ہوا کیونکہ دعائے جنازہ سے پہلے سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی بدرجہ اتم حمد و ثنا موجود ہے بلکہ اس کا نام ہی سورۃ الحمد ہے اس کی موجودگی میں ثنا کی ضرورت نہیں یہی وجہ ہے کہ علامہ البانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''امام احمد رحمہ اللہ سے اس آدمی کے متعلق سوال ہوا جو جنازہ میں دعائے استفتاح یعنی سبحنک اللھم پڑھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا۔'' [احکام الجنائز: ۱۱۹]

علامہ البانی رحمہ اللہ کا رجحان بھی یہی ہے کہ نماز جنازہ میں ثنا وغیرہ نہ پڑھی جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کیا نماز جنازہ باآواز بلند پڑھنا صحیح احادیث سے ثابت ہے؟

جواب واضح رہے کہ نماز جنازہ سری اور جہری دونوں طرح سے جائز ہے۔ جہری نماز جنازہ کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① طلحہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ ادا کی تو آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا: ''کہ میں نے بتانے کے لیے ایسا کیا ہے تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ یہ سنت ہے۔'' [صحیح بخاری]

فاتحہ پڑھنے کا علم تبھی ہو سکتا ہے جب اسے باآواز بلند پڑھا جائے ایک دوسری روایت میں اس کی صراحت ہے کہ

آپ ﷺ نے باآواز بلند ہمیں سناتے ہوئے سورۃ فاتحہ کو پڑھا۔ [صحیح ابن حبان: ۶/۳۹]

② سعید بن ابی سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھی اور فرمایا: ''کہ میں نے باآواز بلند اس لیے فاتحہ پڑھی ہے تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ ایسا کرنا سنت ہے۔'' [مستدرک حاکم: ۱/۳۵۸]

③ سورۃ فاتحہ کے بعد دوسری سورت بھی باآواز بلند پڑھنی چاہیے ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت کو اونچی آواز سے پڑھا حتی کہ ہمیں آپ کی آواز سنائی دی۔

④ دعاؤں کو بھی اونچی آواز سے پڑھنا ثابت ہے راوی کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پڑھا تو میں نے آپ سے سن کر دعاؤں کو یاد کیا۔ [صحیح مسلم]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ باآواز بلند پڑھی جاسکتی ہے تاہم ترجیح آہستہ پڑھنے کو ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال عبدالغنی بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کیا نماز جنازہ میں صرف ایک طرف سلام پھیرنا بھی جائز ہے؟

جواب نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی جائز ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ نماز جنازہ پڑھی تو چار تکبیرات کہنے کے بعد آپ نے صرف ایک طرف سلام پھیرا۔ [مستدرک حاکم: ۱/۳۶۰]

حضرت عطاء بن سائب سے ایک مرسل روایت بھی اس کی مؤید ہے۔ [بیہقی: ۴/۴۳]

نیز حضرت علی ابن ابی طالب، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عباس، جابر بن عبد اللہ، عبد اللہ بن ابی اوفیٰ، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم بھی نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرتے تھے۔ [مستدرک حاکم: ۴/۳۶۰]

ان روایات و آثار کے پیش نظر نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرنا بھی جائز ہے تاہم اکثر اور عام حالات میں ایسا کرنا بہتر نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ تین خصلتوں کو لوگوں نے چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ان پر عمل تھا ان میں ایک یہ ہے کہ نماز جنازہ کا سلام عام نمازوں کے سلام کی طرح ہے۔'' [بیہقی: ۴/۴۳]

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں دونوں طرف سلام پھیرتے تھے۔ [صحیح مسلم]

لہٰذا افضل یہی ہے کہ نماز جنازہ میں دونوں طرف سلام پھیرا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال میت کو لحد میں لٹانے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ چت لٹا کر صرف چہرہ قبلہ کی طرف کرنا چاہیے یا دائیں کروٹ پر قبلہ رخ لٹانا چاہیے، نیز یہ بھی تحریر کریں کہ رسول اللہ ﷺ کو قبر مبارک میں کس طرح لٹایا گیا ہے؟ (سائل:۔ محمد صدیق وہاڑی)

جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو بہت عظمت سے نوازا ہے۔ اس عظمت کا تقاضا ہے کہ زندگی اور مرنے کے بعد اسے قبلہ قرار دیا جائے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا بیت اللہ کے متعلق ارشاد گرامی ہے:

''بیت اللہ تمہارے زندوں اور مردوں کا قبلہ ہے۔'' [ابوداؤد، نسائی]

اس حدیث کے پیش نظر میت کو قبر میں قبلہ کی طرف کر کے لٹانا چاہیے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:

''زندوں سے مراد نماز کے وقت بیت اللہ کی طرف منہ کرنا اور مردوں سے مراد قبر میں اسے قبلہ رخ لٹانا ہے۔''

[نیل الاوطار: ج۴'ص۵۰]

محدث ابن حزم نے اس پر علما کا اجماع نقل کیا ہے۔ [محلی ابن حزم: ۱۷۳/۵]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ [احکام الجنائز: ۱۵۱ مسئلہ نمبر ۱۰۴]

اس حدیث کے پیش نظر میت کو قبر میں لٹاتے وقت اس کا منہ قبلہ کی طرف کرنا چاہیے اس کی دو صورتیں ہیں۔ چت لٹا کر صرف قبلہ کی طرف منہ کر دیا جائے، یا دائیں جانب لٹا کر پورا پہلو قبلہ رخ کر دیا جائے، بہتر ہے کہ دوسری صورت کو اختیار کیا جائے۔ کیونکہ سونے کے وقت اس حالت کو پسندیدہ کہا گیا ہے اور اس حالت پر موت آنے کو فطرت کے مطابق قرار دیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی واضح حدیث میری نظر سے نہیں گزری البتہ احادیث کا تقاضا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبلہ رخ لٹایا ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال پینسرہ ضلع فیصل آباد سے انعام اللہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ایک بزرگ کی قبر کے نزدیک بوہڑ کا درخت ہے اور اس کے ساتھ ہی پانی کا نالہ ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس پانی اور درخت کی جڑوں کی وجہ سے قبر خراب ہو چکی ہے۔ ہم اس قبر کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتے ہیں کیا شریعت کی رو سے ہمیں ایسا کرنے کی اجازت ہے۔

جواب واضح رہے کہ میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد کسی ہنگامی ضرورت کے پیش نظر قبر سے نکالا جا سکتا ہے۔ لیکن اس اقدام کے لیے ضروری ہے کہ اس سے کوئی غرض فاسد یا دنیوی مفاد وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ''کیا میت کو قبر یا لحد سے کسی غرض کی بنا پر نکالا جا سکتا ہے؟''

انہوں نے سوالیہ انداز میں عنوان قائم کیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ اس کے تحت جو احادیث پیش کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رجحان اثبات کی طرف ہے، انہوں نے اس عنوان کے تحت متعدد احادیث بیان کی ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کو قبر سے نکالا اور اس کے بیٹے کی دل جوئی کے لیے اس کے منہ میں اپنا لعاب مبارک ڈالا اور اسے اپنی قمیض بھی پہنائی پھر دوبارہ اسے دفن کر دیا گیا، اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد محترم حضرت عبد اللہ کا واقعہ ہے کہ غزوہ احد کے موقع پر وہ شہید ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سفر و حضر کے دوست حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہیں ایک ہی قبر میں دفن کر دیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے یہ بات کھٹکتی رہتی، چنانچہ میں نے اس خلش کو دور کرنے کے لیے اپنے والد کو قبر سے نکالا اور انہیں دوسری جگہ دفن کر دیا۔

مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں مقام احد سے ایک چشمہ نکالا گیا اس کے پانی کی وجہ سے حضرت عمرو بن جموح اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی قبروں کو کچھ نقصان پہنچا تو چھیالیس سال کے بعد انہیں دوبارہ نکال کر کسی دوسری محفوظ جگہ دفن کیا گیا۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ میت کو کسی خاص حقیقی ضرورت کے پیش نظر قبر سے نکالا جا سکتا ہے اور کسی دوسری جگہ دفن کیا جا سکتا ہے، لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ کوئی غرض فاسد اس سے وابستہ نہ ہو جیسا کہ کسی بارونق جگہ پر اس کا مزار بنانا مقصود ہو یا اسے پختہ بنانا پیش نظر ہو اگر ایسی بات ہے تو قبر اکھاڑنا شرعاً جائز نہیں ہے، صورت مسئولہ میں انہی شرائط کے ساتھ میت کو قبر سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا جا سکتا ہے اور ایسا کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال حشمت علی تحصیل جہانیاں سے سوال کرتے ہیں کہ اہل حدیث حضرات تعزیت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کیوں نہیں کرتے جبکہ مسلم شریف میں تعزیت کی دعا مروی ہے جو "اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِاَ بِیْ سَلَمَةَ......" سے شروع ہوتی ہے نیز بتائیں کہ تعزیت کے لیے کتنے دنوں تک بیٹھا جا سکتا ہے؟ تیسرے دن رشتہ دار اکٹھے ہوتے ہیں اب اہلحدیث علما بھی لواحقین کے بلانے پر تیسرے دن تقریر کر دیتے ہیں، کتاب وسنت کی روشنی میں شرعی حیثیت سے واضح کریں۔

جواب تعزیت میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک میت کے لیے اخروی کامیابی کی دعا کرنا اور اہل میت کو تسلی دینا اور صبر وتحمل کی تلقین کرنا۔ الحمدللہ اہل حدیث ان دونوں چیزوں کی پابندی کرتے ہیں لیکن اہل میت کے گھر جا کر مخصوص انداز اختیار کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ملتا اس لیے اہل حدیث اس رسم پر عمل نہیں کرتے، سوال میں جس دعا کا حوالہ دیا گیا ہے اس پر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ باب قائم کیا ہے۔ "جب موت واقع ہو جائے تو میت کی آنکھیں بند کرنا اور اس کے لیے دعا کرنا"

دراصل جب حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو ان کی آنکھیں کھلی تھیں آپ نے انہیں بند فرمایا اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی یہ کفن ودفن سے پہلے کا معاملہ ہے نیز اس میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں ہے۔ میت پر تین دن تک سوگ کر سکتے ہیں صرف بیوی کو اپنے خاوند کی وفات پر چار ماہ دس دن تک سوگ کرنے کی اجازت ہے، لیکن سوگ کے ایام میں دریاں بچھا کر بیٹھ رہنا اور آنے والوں کا مخصوص انداز سے تعزیت کے لیے فاتحہ خوانی کرنا قرآن وحدیث سے ثابت نہیں ہے تعزیت کے لیے تین دن کی تحدید بھی بدعت ہے جبکہ انسان کو جب بھی موقع ملے اہل بیت سے تعزیت کی جا سکتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے اہل خانہ سے تین دن کے بعد تعزیت فرمائی تھی۔ [مسند امام احمد: حدیث نمبر ۱۷۵۵]

حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم میت کے دفن کرنے کے بعد اہل میت کے ہاں اجتماع اور ان کے گھر کھانا پکانے کو نوحہ کی ایک قسم شمار کرتے تھے۔ [مسند امام احمد: ج۲، ص۲۰۴]

اہل میت کے لیے کھانے کا اہتمام دیگر رشتہ داروں یا پڑوسیوں کو کرنا چاہیے۔

بہرحال اہل میت کے ہاں اجتماع کتاب وسنت سے متصادم ہے تفصیل کے لیے دیکھئے۔

[المجموع: ج۵، ص۳۰۶؛ زاد المعاد: ج۱، ص۳۰۴]

دین اسلام چونکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں ترمیم واضافہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے میت کے مرنے کے تین چار دن بعد مسجد یا گھر میں اکٹھے ہونا، تقریر کرنا پھر میت کے لیے اجتماعی دعا کرنا سب رواجی چیزیں ہیں جس کا شریعت سے کوئی تعلق

نہیں اور نہ قرونِ اولیٰ میں اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے، اس لیے بریلوی حضرات کا فوتگی کے تیسرے دن قل خوانی کا اہتمام اور اہل حدیث حضرات کا مسجد یا گھر میں تقریر اور اس کے بعد میت کے لیے اجتماعی دعا کا اہتمام ان دونوں میں اصولی طور پر کوئی فرق نہیں ہے یہ سب حیلے بہانے مروجہ بدعات و رسوم کو مشرف باسلام کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ایک باغیرت مسلمان اور خوددار اہل حدیث کو تمام باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے تعزیت سے مراد اہل میت کو صبر کی تلقین اور ان کے لیے دعا استقامت پر پھر میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا ہے۔ اس کے لیے کسی دن، جگہ یا خاص شکل وصورت کا اہتمام قطعاً درست نہیں ہے۔

سوال اہل میت سے تعزیت کے لیے شرعی حکم کیا ہے؟ کیا تعزیت کے لیے تین دن تک بیٹھنا ضروری ہے۔ (محمد اکرم لیہ)

جواب تعزیت کے لیے مندرجہ ذیل آداب کو پیش نظر رکھیں۔

① تعزیت سے مراد اہل میت کو صبر کی تلقین، ان کے لیے دعائے خیر اور میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا ہے، اس کے لیے کوئی مخصوص الفاظ یا طریقہ نہیں بلکہ جن الفاظ سے بھی اہل میت سے اظہار ہمدردی اور انہیں تسلی دی جاسکے ادا کیے جاسکتے ہیں۔ حدیث میں اس طرح اہل میت سے تعزیت کرنے کو باعث اجر وثواب بتایا گیا ہے۔

② تعزیت کے لیے بایں طور پر تین دن کی تحدید کرنا کہ ان کے بعد تعزیت جائز نہ ہو شرعاً ثابت نہیں ہے۔ بلکہ جب کبھی جہاں کہیں موقع ملے تعزیت کی جاسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے پسماندگان سے تین دن کے بعد تعزیت کی تھی۔

③ تعزیت کے سلسلہ میں دو چیزوں سے بطور خاص پرہیز کیا جائے۔

(الف) مخصوص مقام پر دری یا چٹائی بچھا کر اہتمام کے ساتھ بیٹھے رہنا۔

(ب) اہل میت کی طرف سے آنے والوں کے لیے کھانے کا اہتمام کرنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان دونوں چیزوں کو نوحہ میں شمار کرتے تھے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے البتہ باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے تین دن تک کھانے اور ان کے بیٹھنے کا اہتمام اہل میت کے علاوہ دوسرے اقرباء یا اہل محلّہ پر ضروری ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ڈجکوٹ سے علی محمد لکھتے ہیں کہ اگر اہل میت کے لیے کوئی دوسرا کھانا تیار نہ کرے تو کیا وہ خود پکا سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز آپ نے ایک فتویٰ میں لکھا ہے کہ ''تعزیت سے مراد اہل میت کو صبر کی تلقین کرنا پھر میت کے لیے دعائے مغفرت کرنا ہے'' یہ وضاحت کریں کہ مذکورہ دعائیں ہاتھ اٹھا کر کی جائیں یا ویسے کہہ دی جائیں۔

جواب اگر اہل میت کے رشتہ داروں یا تعلق داروں میں کوئی بھی ان کے لیے کھانا تیار نہ کرے تو اہل میت خود کھانا تیار کرسکتے ہیں، شریعت نے رشتہ داروں اور دیگر خویش واقارب سے کہا ہے کہ اہل میت تو غم سے نڈھال ہیں ان کے لیے کھانا وغیرہ دوسروں کو تیار کرنا چاہیے۔ گھر میں بچے وغیرہ بھی ہوتے ہیں انہیں کھلانے پلانے کے لیے گھر میں کھانا تیار کیا جاسکتا ہے، اس سے خود بھی کھایا جاسکتا ہے۔ البتہ جو چیز منع ہے وہ ہے اہل میت کے ہاں اجتماع اور اہتمام کے ساتھ اس اجتماع کے لیے شان وشوکت کے ساتھ کھانے کی تیاری، اس قسم کے اجتماع اور اہتمام کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نوحہ کی ایک قسم شمار کرتے تھے۔ جہاں تک تعزیت کے لیے ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے اس کے متعلق ہم نے وضاحت سے لکھا تھا کہ ''تعزیت میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک میت کے لیے اخروی کا

میابی کی دعا کرنا اور دوسرا یہ کہ اہل میت کو تسلی دینا اور انہیں صبر و تحمل کی تلقین کرنا، لیکن اہل میت کے گھر جا کر مخصوص انداز اختیار کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا ثبوت کتاب و سنت سے نہیں ملتا، بہر حال ہم اپنے موقف کو دھراتے ہیں کہ تعزیت میں میت اور اہل میت کے لیے دعا ضرور کی جائے لیکن اس کے لیے کسی دن، جگہ یا خاص شکل وصورت کا اہتمام قطعاً درست نہیں، یہ تمام امور مرجہ اور خود ساختہ ہیں ایک مسلمان کو ان سے اجتناب کرنا چاہیے؟ خوشی غمی کے مواقع پر ہمارے اسلاف جو روایات چھوڑ گئے ہیں انہیں پر عمل کرنے میں خیر و برکت ہے۔

سوال لاہور سے محبوب الرحمٰن خریداری نمبر 1333 لکھتے ہیں کہ ہمارے جو رشتہ دار فوت ہو چکے ہیں، ان کی قبر پر جا کر دعا کرنے سے انہیں فائدہ ہوگا یا جہاں چاہے دعا کرنے سے رفع درجات کا باعث ہوگا؟

جواب اگر کوئی شخص اپنے فوت شدگان کے لیے دعا کرتا ہے تو وہ ضرور اس کی دعا سے بہرہ ور ہوتے ہیں بشرطیکہ قبولیت کے آداب و شرائط موجود ہوں۔ حدیث میں ہے ’’کہ اگر کوئی مسلمان اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے، اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تعینات کر دیا جاتا ہے جب غائبانہ طور پر کوئی مسلمان دوسرے کے لیے دعا کرتا ہے تو فرشتہ اس پر آمین کہتا ہے اور اس کے لیے اللہ کے ہاں اس کے مثل اجر ملنے کی دعا کرتا ہے۔‘‘ [مسند امام احمد: ج ۶ ص ۴۵۲]

میت کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا صرف جائز اور مشروع ہے، قبولیت دعا کے آداب یا شرائط سے نہیں ہے قبولیت دعا کی کچھ شرائط حسب ذیل ہیں۔

☆ دعا کرتے وقت انسان کو خلوص سے سرشار ہونا چاہیے، ریاکاری کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ خاص طور پر میت کے لیے دعا کرتے وقت اس کی شرائط کا پایا جانا انتہائی ضروری ہے۔ [ابوداؤد: ۳۱۸۳]

☆ دعا کرتے وقت دل کا حاضر باش ہونا بھی ضروری ہے غفلت شعار دل سے نکلی ہوئی دعا قبول نہیں ہوتی۔

[جامع ترمذی: الدعوات ۳۴۷۹]

☆ اکل حلال اور صدق مقال کے بغیر بھی دعا قبولیت کا درجہ حاصل نہیں کر پاتی۔ [صحیح مسلم]

پھر قبولیت دعا کے لیے کچھ آداب بھی ہیں چند ایک حسب ذیل ہیں:

☆ دعا میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا جائے۔

☆ دعا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہیے کہ وہ ہماری دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔

☆ دعا کے وقت اس کی قبولیت کے متعلق پورا عزم اور یقین بھی انتہائی ضروری ہے۔

قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا اگرچہ دعا کے آداب یا شرائط سے نہیں ہے البتہ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دعا کرنے والے کو آخرت اور قبر یاد آتی ہے تو اس میں عاجزی اور مسکنت کا اضافہ ہو جاتا ہے دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قبر کو سامنے پا کر میت کے متعلق اسکے مخلصانہ جذبات میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے اس لیے وہ میت کے لیے دل کی گہرائی سے دعا کرتا ہے، مختصر یہ ہے کہ قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنا جائز ہے ضروری نہیں اس لیے میت کی مغفرت کے لیے ہر جگہ دعا کی جاسکتی ہے۔

سوال ڈیرہ غازی خاں سے محمد اسحاق لکھتے ہیں کہ میت کے لیے ایصالِ ثواب کی خاطر قرآن خوانی کے جواز پر مندرجہ ذیل روایت کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

جو شخص قبرستان سے گزرتے وقت گیارہ دفعہ سورۃ اخلاص پڑھ کو اس کا ثواب مردوں کو بخشے تو اسے مردوں کی تعداد کے مطابق ثواب دیا جائے گا۔

جواب اس خود ساختہ حدیث کو علامہ اسماعیل عجلونی نے التاریخ للرافعی کے حوالہ سے بلا سند نقل کیا ہے۔ [الکشف:۲/۲۸۲]

پھر اس پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی بجائے اس پر سکوت اختیار فرمایا ہے۔ حالانکہ کتاب کا موضوع لوگوں میں زبان زد عام اور مشہور روایات سے پردہ اٹھانا ہے۔ اس تساہل کے پیش نظر بعض اہل نے اس روایت کو صحیح تسلیم کرکے اس پر ایک مسئلہ (میت کو قرآن خوانی کا ثواب پہنچتا ہے) کی بنیاد رکھ دی۔ چنانچہ مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں یہی روایت دارقطنی کے حوالہ سے نقل کرکے بطور حجت پیش کی گئی ہے۔ [حاشیہ طحاوی:۳۴۲]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ [تفہیم القرآن:۵/۲۱۶]

ہمارے ناقص علم کے مطابق یہ روایت بالکل من گھڑت ہے، تلاش بسیار کے باوجود ہمیں روایت سنن دارقطنی میں نہیں مل سکی، یقیناً یہ روایت دارقطنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اسے ابومحمد الخلال نے بایں بیان کیا ہے۔ "عن نسخة عبد الله بن احمد بن عامر عن ابيه عن علي الرضا عن آبائه." [القراءۃ علی القبور:۲/۲۰۱]

جس نسخہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے وہ پورے کا پورا موضوع روایات کا پلندہ ہے جیسا کہ حافظ امام ذہبی لکھتے ہیں۔

[میزان الاعتدال:۲/۳۹۰]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لسان المیزان میں اس کی تصدیق کی ہے، یہ عجیب بات ہے کہ علامہ سیوطی نے اس بے اصل روایت کو "ذیل الاحادیث الموضوعہ" میں بیان کرنے کے باوجود اپنے ایک رسالہ میں اسے بطور دلیل پیش کیا ہے، چنانچہ اسے ابومحمد سمرقندی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور اس کے ضعف کی طرف اشارہ کرنے کے باوصف اس کا پورا پورا دفاع کیا ہے وہ بطور دلیل مندرجہ ذیل دو مزید روایات بیان کرتے ہیں:

(الف) جو شخص قبرستان میں داخل ہو کر سورۃ فاتحہ، سورۃ اخلاص اور سورۃ تکاثر پڑھے اور کہے کہ میں نے اس کی تلاوت کا ثواب اس قبرستان میں مدفون اہل اسلام کو بخش دیا ہے، تو وہ مردے قیامت کے دن اللہ کے حضور اس کی سفارش کریں گے۔

(ب) جو شخص قبرستان میں داخل ہو کر سورۃ یٰسین پڑھے تو اللہ تعالیٰ مردوں پر عذاب میں تخفیف کر دیتا ہے اور مردوں کی تعداد کے مطابق پڑھنے والے کو نیکیاں دیتا ہے۔ [شرح الصدور:۱۳۰]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اس قسم کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ روایات اگرچہ ضعیف ہیں تاہم اس مجموعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کچھ بنیاد ضرور ہے۔ [شرح الصدور:۱۳۰]

لیکن دین اسلام میں مسائل شرعیہ کی بنیاد اس طرح کی موضوع اور من گھڑت روایات پر نہیں رکھی جا سکتی۔ چنانچہ مولانا

عبدالرحمٰن مبارکپوری، علامہ سیوطی کی یہ "بنیاد" بایں الفاظ منہدم کرتے ہیں۔ "یہ ضروری نہیں کہ ضعیف احادیث کے ہر مجموعہ کی کوئی اصل بھی ہو۔" [تحفۃ الاحوذی:۲/۱۲۶]

علامہ مبارک پوری نے بالکل صحیح فرمایا ہے کیونکہ ضعیف احادیث کی گھٹیا اور بدترین قسم موضوع روایت کو کسی مسئلہ کی بنیاد نہیں قرار دیا جاسکتا، جمہور محدثین تو مطلق طور پر ضعیف روایت کو قابل عمل نہیں سمجھتے، البتہ بعض اہل علم کا اصرار ہے کہ فضائل اعمال میں (اعمال میں نہیں) ضعیف حدیث قابل حجت ہے وہ بھی مشروط طور پر اور وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

☆ روایت میں شدید قسم کا ضعف نہ ہو، یعنی اس کے بیان کرنے والا کوئی راوی کذاب یا جھوٹ بولنے کے متعلق تہمت زدہ نہ ہو ،جبکہ زیر بحث روایات خود ساختہ ہیں۔

☆ نفس مسئلہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہو، البتہ اس کی فضیلت بیان کرنے میں ضعیف روایت کا سہارا لیا جاسکتا ہے جبکہ زیر بحث مسئلہ سرے سے ثابت ہی نہیں ہے۔

☆ روایت میں بیان شدہ حکم کسی عقیدہ یا عبادت سے متعلق نہ ہو، نیز اس روایت کو بیان کرتے وقت اس کی نسبت براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی طرف نہ کی جائے، بلکہ "رُوِیَ" جیسے الفاظ سے بیان کی جائے۔

مذکورہ بالا شرائط میں سے کوئی شرط بھی ان روایات میں نہیں پائی جاتی بلکہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں قرآن خوانی ہوسکتی ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا اس کے متعلق ایک واضح فرمان ہے: "کہ اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ (بلکہ ان میں قرآن کی تلاوت کرتے رہا کرو) کیونکہ جس گھر میں سورۃ بقرۃ کی تلاوت ہوگی وہاں سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔" [صحیح مسلم: کتاب الصلوۃ]

محدثین کرام نے قبرستان میں قرآن پاک کی تلاوت نہ کرنے پر اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث کو قبرستان میں نماز نہ پڑھنے کے لیے دلیل بنایا گیا ہے۔ "گھروں میں نماز پڑھا کرو انہیں قبرستان نہ بناؤ۔" [صحیح مسلم: کتاب الصلوۃ]

مروجہ قرآن خوانی اور ایصال ثواب کے قائلین کی کل کائنات یہی ہے جو ہم نے بیان کردی ہے اب قارئین کرام خود فیصلہ کریں۔ س طرح کے "سہاروں" پر کسی شرعی حکم کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے؟ بعض اہل علم نے عقل وقیاس اور زور بیان سے اس مسئلہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "آدمی جس طرح مزدوری کرکے مالک سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجرت میری بجائے فلاں شخص کو دے دی جائے، اس طرح وہ کوئی نیک عمل کرکے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرسکتا ہے کہ اس کا اجر میری طرف سے فلاں شخص کو عطا کردیا جائے اس میں بعض اقسام کی نیکیوں کو مستثنیٰ کرنے اور بعض اقسام کی نیکیوں تک اسے محدود رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔" [تفہیم القرآن:۵/۲۱۶]

حالانکہ اس طرح شرعی مسائل عقل وقیاس سے نہیں بلکہ صریح اور واضح نصوص سے ثابت ہوتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس عقلی مفروضے کا خوب جواب دیا ہے۔ چنانچہ سورۃ نمبر ۵۳ سورۃ نجم آیت نمبر 39 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "انسان کے لیے کچھ نہیں مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔" اس آیت سے امام شافعی اور اس کے متبعین نے استنباط کیا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے کا

ثواب مردوں کو نہیں پہنچتا کیونکہ یہ مردوں کا عمل وکسب نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو اس کا حکم نہیں دیا اور نہ اشارۃً یا صراحتاً اس کی راہنمائی فرمائی ہے اور نہ ترغیب دی ہے، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی یہ منقول نہیں ہے۔ اگر میت کے لیے قرآن خوانی کوئی کارِ خیر ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سعادت کو حاصل کرنے کے لیے ہم سے پیش پیش ہوتے، عبادات اور اعمال خیر میں صرف نصوص پر انحصار کیا جاتا ہے۔ عقل و قیاس کو اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں۔ ہاں دعا اور صدقہ وخیرات کے متعلق شارع علیہ السلام کی طرف سے واضح نصوص ہیں کہ ان کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ [تفسیر ابن کثیر:۴/۳۰۵]

میت کو ثواب پہنچانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جن امور کی نشاندہی کی ہے ان میں قرآن خوانی کا ذکر نہیں اور نہ ہی اس کا وجود عہد صحابہ اور تابعین میں ملتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال اسلام آباد سے حافظ محمد سلیم سوال کرتے ہیں کیا میت کو ثواب پہنچتا ہے اور اس کے لیے قرآن خوانی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب احادیث کی رو سے چند ایک چیزوں کا ثواب میت کو پہنچتا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① کسی مسلمان کا اس کے لیے دعا کرنا، بشرطیکہ وہ دعا ان آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے کی جائے جو قبولیت کے لیے ضروری ہیں۔

② اس کے ذمہ نذر کے روزے ہوں جو وہ ادا نہ کر سکا تو اس کی طرف سے روزے رکھنا بھی باعث ثواب ہے۔

③ نیک بچہ جو بھی اچھے کام کرے گا والدین اس کے ثواب میں شریک ہوں گے۔

④ مرنے کے بعد اچھے آثار اپنے پیچھے چھوڑ جانے سے بھی میت کو ثواب ملتا ہے، صدقہ جاریہ بھی اس میں شامل ہے۔

میت کے لیے قرآن خوانی کے ثواب کے متعلق ائمہ اربعہ کا اختلاف ہے۔ صحیح موقف یہی ہے قرآن پڑھنے کا میت کو ثواب نہیں پہنچتا۔ البتہ قرآن پڑھنے کے بعد میت کے لیے دعا کرنے سے میت کو فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں اجتماعی طور پر ''قرآن خوانی'' ایک رواج ہے جس کا کوئی ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا۔

سوال ضلع سیالکوٹ سے خواجہ لئیق احمد بٹ خریداری نمبر 1393 لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کچھ لوگ عذاب قبر اور زکوٰۃ کے منکر ہیں۔ وہ صرف سونے کی زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ ایسے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا ایسے لوگوں کو مسلمانوں کی مساجد میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام ہمیں قرآن وسنت کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔ اس پر عمل کرنے میں ہمیں ہر مقام پر سرخرو ہونے کی بشارت اور ضمانت دی گئی ہے لیکن دشمنان اسلام نے اس کی نقب زنی کے لیے ایک ایسے رہزن کا انتخاب کیا ہے جو مارِ آستین ہونے کے ساتھ ساتھ دامِ ہم رنگ زمین بچھانے میں بڑا ماہر ہے کراچی کی سرزمین اس قسم کے رہزن پیدا کرنے میں بڑی زرخیز واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ مسعود الدین عثمانی اور مسعود احمد اسی قماش کے لوگ تھے جنہوں نے دور حاضر میں خوارج اور معتزلہ کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے امت کے ہاں مسلمہ افکار ونظریات کا انکار کیا، پھر ایک ایسے منہج اور طرز عمل کی بنیاد رکھی جو سبیل المؤمنین سے ہٹ کر تھا۔ اہل حق نے ان کی خوب سرکوبی کی۔ ان کا مسئلہ عذاب قبر یا زکوٰۃ کا انکار نہیں بلکہ جو بھی قرآنی آیت انکے مزعومہ

خیالات کے خلاف ہوتی ہے۔ اسکی دوراز کار تاویل اور جو حدیث ان کے لیے سد راہ ہوتی ہے اسکا انکار کر دیتے ہیں۔ ان حضرات کا روحانی نسب نامہ بنو تمیم کے ذوالخویصرہ نامی شخص سے جا ملتا ہے جس نے اس امت میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث یعنی عمل مبارک پر اعتراض کیا تھا کہ آپ اللہ سے نہیں ڈرتے اور عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت پیشین گوئی کے طور پر فرمایا تھا: ''کہ اس کی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآن تو پڑھیں گے لیکن قرآن ان کے حلق کے نیچے نہیں اترے گا''

[صحیح بخاری: الادب' ۶۱۶۳]

یہ لوگ ظاہری خشونت اور باطنی یبوست سے پہچانے جاتے ہیں۔ اتمام حجت کے لیے ان کے افکار و نظریات کا توڑ کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں مقامی پختہ کار علما سے رابطہ کر کے احادیث و سنن کے ذریعے ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نا پختہ ذہن حضرات کو ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اہلحدیث مساجد سے یہ حضرات لوگوں کو دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور بزعم خود اپنے مراکز توحید میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے گریز کیا جائے بلکہ یہ لوگ کسی دوسرے کو اپنے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ وَمِنْ شَرِّهِمْ.

سوال گوجرانوالہ سے محمد فاروق ناگی خریداری نمبر 3742 لکھتے ہیں کہ

☆ کیا اپنے کٹھن معاشی حالات کے پیش نظر موت مانگی جا سکتی ہے؟

☆ وہ کیا چیزیں ہیں جن کا مرنے کے بعد ثواب پہنچتا رہتا ہے؟

کتاب و سنت کی روشنی میں ان کا جواب دیں۔

جواب دنیا میں کیسے بھی کٹھن حالات ہوں کسی بھی صورت میں موت کی آرزو نہیں کرنا چاہیے، حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بحالت مرض موت کی تمنا کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے چچا جان! موت کی تمنا مت کیجئے، کیونکہ اگر آپ نیک ہیں تو آپ بقیہ زندگی میں مزید نیکیاں حاصل کریں گے یہ آپ کے لیے بہتر ہے اور آپ اگر گناہ گار ہیں تو اپنے گناہوں سے توبہ کر سکتے ہیں یہ آپ کے لیے بہتر ہے لہٰذا آپ کسی بھی صورت میں موت کی تمنا نہ کریں۔'' [مسند امام احمد: ج ۲' ص ۳۳۹]

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی اپنی کسی مصیبت کے پیش نظر موت کی تمنا نہ کرے، اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اس طرح کہہ لے ''اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی بہتر ہے اور اس وقت مجھے فوت کر لینا جب میرے لیے مرنا بہتر ہو۔'' [صحیح بخاری: الدعوات' ۶۳۵۱]

مرنے کے بعد میت کو مندرجہ ذیل چیزوں کا ثواب پہنچتا رہتا ہے۔

☆ اگر کوئی اس کے حق میں دعا کرتا ہے تو میت اس سے بہرہ ور ہوتی ہے بشرطیکہ دعا میں قبولیت کی شرائط موجود ہوں۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی بھی مسلمان اپنے بھائی کے لیے غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے، اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تعینات کر دیا جاتا ہے۔ جب وہ کسی کے لیے دعائے خیر کرتا ہے تو فرشتہ اس پر آمین کہتا ہے اور اسے اللہ کے ہاں اس کے مثل اجر ملنے کی دعا کرتا ہے۔

[مسند امام احمد: ج ۶' ص ۴۵۲]

☆ میت کی نذر پوری کرنا: میت نے اپنی زندگی میں کوئی نذر مانی تھی لیکن اسے پورا کیے بغیر موت آ گئی تو لواحقین کو چاہیے کہ اسے پورا کریں وہ نذر خواہ روزے کی ہو یا حج یا نماز ادا کرنے کی چنانچہ روزے کے متعلق صحیح بخاری: ۱۹۵۲، حج کے متعلق صحیح بخاری: ۱۸۵۲اور نماز کے متعلق صحیح بخاری تعلیقاً باب من مات و علیه نذر، مطلق نذر کے متعلق بھی حدیث میں آیا ہے۔

[صحیح بخاری: الایمان والنذور' ۶۶۹۸]

☆ میت کی طرف سے قرض کی ادائیگی: رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو تاکید کی تھی کہ وہ اپنے فوت شدہ بھائی کا قرض ادا کرے کیونکہ وہ عدم ادائیگی کی وجہ سے اللہ کے ہاں محبوس ہے۔ [مسند امام احمد: ج۴' ص۱۳۶]

☆ نیک اولاد جو بھی اچھے کام کرے گی والدین کو وفات کے بعد اس کا فائدہ پہنچتا رہتا ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ انسان کے لیے وہ کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی'' (۵۳/ النجم: ۳۹) اور اولاد بھی انسان کی کوشش اور کمائی میں سے ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ [دارمی: ج۲' ص۲۴۷]

☆ صدقہ جاریہ اور باقیات صالحات: حدیث میں ہے ''کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو تین اعمال کے علاوہ اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں یعنی صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہوں اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی رہے۔''

[صحیح مسلم: الوصیة' ۱۶۳۱]

اس سلسلہ میں ایک جامع حدیث بھی ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انسان کی موت کے بعد جو حسنات اور اعمال جاری رہتے ہیں وہ یہ ہیں:

☆ وہ علم جس کی اس نے لوگوں کو تعلیم دی اور اس کی خوب نشر و اشاعت کی۔

☆ نیک اولاد جو اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔

☆ کسی کو قرآن مجید بطور عطیہ دیا۔

☆ مسجد بنا کر وقف کر دی۔

☆ محتاج اور ضرورت مند کو گھر بنا کر دیا۔

☆ کسی غریب کے لیے پانی کا بندوبست کر دیا۔

☆ وہ صدقہ جسے اپنی زندگی اور صحت میں نکالا اس کا ثواب بھی مرنے کے بعد بدستور پہنچتا رہے گا۔'' [ابن ماجہ: المقدمہ' ۲۴۲]

درج بالا وضاحت کے علاوہ کچھ چیزیں لوگوں نے خود ایجاد کر رکھی ہیں اور ایصال ثواب کے لیے انہیں عمل میں لایا جاتا ہے لیکن وقت اور مال کے ضیاع کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا مثلاً قل خوانی، ساتواں، چالیسواں اور برسی وغیرہ پر قرآن خوانی اور کھانے وغیرہ کا بندوبست ہوتا ہے، اس کا میت کو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ اس کا کتاب و سنت میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

سوال فضل داؤد خاں اسلام آباد سے پوچھتے ہیں کہ جہری نماز جنازہ کا ثبوت کتاب و سنت سے درکار ہے؟

جواب واضح ہے کہ نماز جنازہ سرّی اور جہری دونوں طرح جائز ہے جہری نماز جنازہ کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

☆ طلحہ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز جنازہ ادا کی تو انہوں نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا: ''میں نے تمہیں بتانے کے لیے ایسا کیا ہے تاکہ تمہیں علم ہو جائے کہ یہ سنت ہے'' (صحیح بخاری) فاتحہ پڑھنے کا علم تبھی ہو سکتا ہے جب اسے بآواز بلند پڑھا جائے ایک دوسری روایت میں اس کی صراحت ہے کہ آپ نے بآواز بلند ہمیں سناتے ہوئے سورۃ فاتحہ کو پڑھا۔

[صحیح ابن حبان:۶/۲۹]

☆ سعید بن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ اونچی آواز سے پڑھی اور فرمایا: ''کہ ایسا کرنا سنت ہے۔'' [مستدرک حاکم:۱/۳۵۸]

سورۃ فاتحہ کے بعد دوسری سورت بھی بآواز بلند پڑھنی چاہیے ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے سورۃ فاتحہ اور دوسری سورت کو اونچی آواز سے پڑھا تا آنکہ آپ کی آواز سنائی دینے لگی۔

دعا بھی اونچی آواز سے پڑھنا ثابت ہے۔ راوی کہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پڑھا تو میں نے آپ سے سن کر دعا کو یاد کیا (صحیح مسلم)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ نماز جنازہ بآواز بلند پڑھی جا سکتی ہے۔ تاہم ترجیح آہستہ پڑھنے کو ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال احادیث میں عذاب قبر کا ذکر آیا ہے ہمارے ہاں چند حضرات کا کہنا ہے کہ قبر سے مراد زمینی گڑھا نہیں بلکہ یہ ایک برزخی قبر ہے جہاں عذاب وثواب ملتا ہے اور کچھ لوگ اس کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں کہ عذاب و آرام اسی معہود قبر میں ہوتا ہے جسے ہم اپنے ہاتھوں سے بناتے ہیں، قرآن و حدیث کی رو سے وضاحت فرمائیں کہ قبر سے مراد کونسی قبر ہے۔؟ (عبداللطیف' جہانیاں منڈی)

جواب ہمارے ہاں آج کل بے شمار فتنے رونما ہو رہے ہیں، اس سلسلہ میں کراچی کی زمین بڑی زرخیز واقع ہوئی ہے وہاں مسعود الدین عثمانی نے یہ فتنہ کھڑا کیا تھا کہ اس سے مراد زمینی قبر نہیں بلکہ ایک برزخی قبر ہے جس میں عذاب وثواب ملتا ہے، چونکہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اور اسے یقین ہو چکا ہو گا کہ کس قسم کی قبر میں عذاب ہوتا ہے، جب ہم قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں شریعت میں برزخی قبر کا وجود نظر نہیں آتا، برزخی قبر کی دریافت اس قسم کے فتنہ پروروں کی ہے جو علم شریعت سے نابلد ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جرم پیشہ حضرات کو عالم برزخ میں ہی عذاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن اس عذاب کا محل یہ قبر ہے یا اور کوئی جگہ محدثین عظام نے اس سلسلہ میں جو راہنمائی فرمائی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ زمینی قبر ملتی ہے انہیں تو اسی قبر میں عذاب سے دوچار کیا جاتا ہے اور جن کو یہ قبر نہیں ملتی ان کے اجزائے جسم جہاں پڑے ہیں ان کے لیے وہی قبر کا درجہ رکھتے ہیں، اس موقف کے متعدد دلائل ہیں ہم صرف دو دلائل کا ذکر کرتے ہیں۔

① اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین کے لیے ان کی قبر پر کھڑے ہو کر دعا کرنے سے منع فرمایا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ ان میں سے کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ ہی ان کی قبر پر کھڑے ہوں۔'' [۹/التوبہ:۸۴]

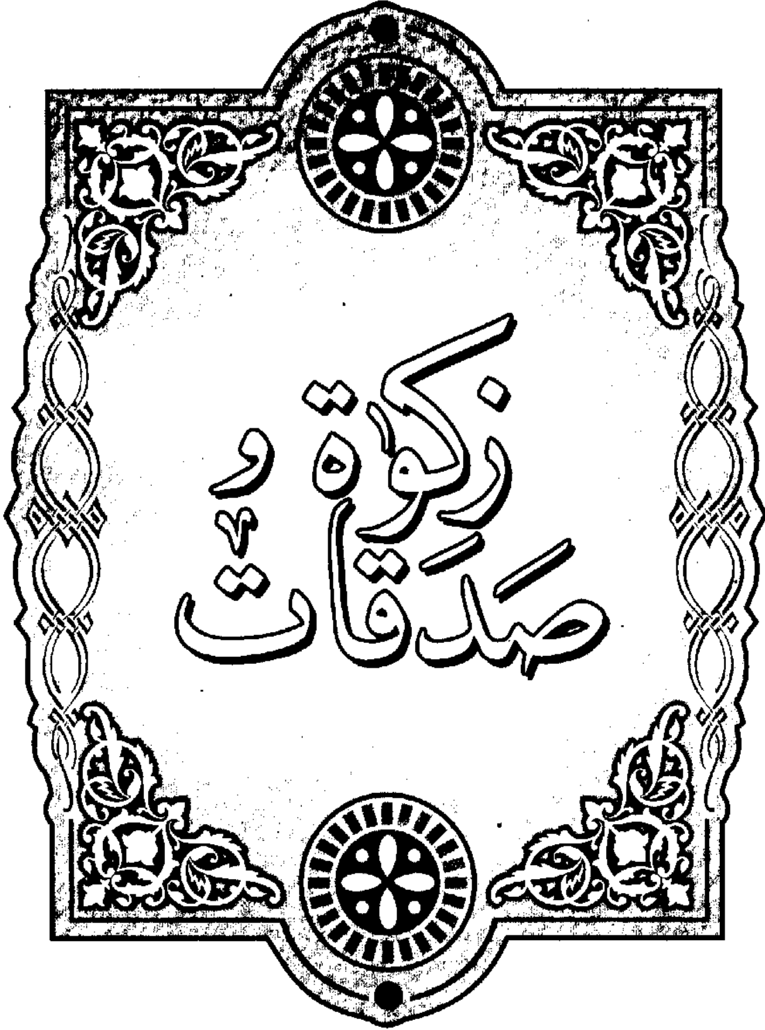
اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی قبر ہے جس پر کھڑے ہو کر دعا کرنے سے آپ کو منع کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اسی زمینی قبر کے

متعلق یہ حکم دیا گیا ہے۔

② رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں جاتے ہوئے اپنے صحابہ کرام سے دریافت کیا تھا کہ دو نئی قبریں کن لوگوں کی ہیں، کیوں کہ انہیں عذاب دیا جارہا ہے، لوگوں نے نشاندہی کی تو آپ نے کھجور کی ایک چھڑی لے کر اس کے دو حصے کیے اور دونوں قبروں پر ایک ایک حصہ گاڑ دیا نیز فرمایا: ''کہ امید ہے کہ ان کے خشک ہونے تک ان کے عذاب میں کمی کر دی جائے۔'' [صحیح بخاری: الجنائز ۱۳۶۱]

رسول اللہ ﷺ کا ان زمینی قبروں پر کھجور کی چھڑیوں کو گاڑنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ انہیں اسی قبر میں عذاب دیا جاتا تھا، برزخی قبر کی دریافت ایجاد بندہ ہے جس کا ثبوت قرآن و حدیث سے نہیں ملتا۔




زکوٰۃ و صدقات

زکوٰۃ و صدقات

سوال ملتان سے چوہدری عبدالرشید لکھتے ہیں کہ عشر، زمین کی کس قسم کی پیداوار سے کتنا ادا کرنا پڑتا ہے؟ نیز پھلوں اور سبزیوں کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔ تفصیل سے لکھیں۔

جواب عشر کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے ''کہ فصل کاٹتے ہی اس سے اللہ کا حق ادا کردو۔'' [۶/الانعام:۱۴۱]

نیز قرآن کریم میں ہے ''کہ ایمان والو! جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں اچھی چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔'' [۲/البقرہ:۲۶۷]

پہلی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے حق سے مراد وہ صدقہ ہے جو اللہ کے نام پر زمین کی پیداوار سے فقرا ومساکین کو دیا جائے، کیوں کہ یہ فصل اللہ نے ہی اپنے فضل سے پیدا کی ہے، اس مقام پر اس ''حق'' کی مقدار معین نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی تعیین خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ وہ زمین جسے بارش یا قدرتی چشمہ کا پانی سیراب کرتا ہو یا کسی دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے خود بخود سیراب ہو جاتی ہو، اس قسم کی زمین کی پیداوار سے دسواں حصہ بطور عشر لیا جائے گا اور وہ زمین جسے کنوئیں وغیرہ سے پانی کھینچ کر سیراب کیا جاتا ہو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جائے گا۔'' [صحیح بخاری: زکوٰۃ ۱۴۸۳]

اس حدیث میں پیداوار دینے والی زمین کی حقیقت اور اس کی پیداوار پر مقدار عشر کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، شریعت نے مقدار عشر کے لیے زمین کی سیرابی یعنی پیداوار لینے کے لیے پانی کو مدار قرار دیا ہے۔ اگر کھیتی کو سیراب کرنے کے لیے پانی بسہولت دستیاب ہے، اس پر کسی قسم کی محنت یا مشقت نہیں اٹھانا پڑتی تو اس میں پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا ہوگا، اس کے برعکس اگر پانی حاصل کرنے کے لیے محنت ومشقت اٹھانا پڑتی ہے یا اخراجات برداشت کرنا پڑیں تو اس میں نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہے، ہمارے ہاں عام طور پر زمینوں کی آبپاشی دو طرح سے ہے:

① نہری پانی، حکومت نے اس کے لیے ایک مستقل محکمہ ''انہار'' قائم کر رکھا ہے، اس پر زمیندار کو محنت ومشقت کے علاوہ اخراجات بھی برداشت کرنا پڑتے ہیں، آبیانہ وغیرہ ادا کرنا ہوتا ہے، اس کے باوجود نہری پانی فصلوں کے لیے کافی نہیں ہوتا، اس کے لیے دوسرے ذرائع سے ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔

② ٹیوب ویل: اول تو ٹیوب ویل لگانے کے لیے کافی رقم درکار ہوتی ہے، جب اس کی تنصیب مکمل ہو جاتی ہے تو پھر محکمہ واپڈا کا رحم وکرم شروع ہو جاتا ہے، اس کا کنکشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، اس کے بعد تیسرا مرحلہ جو مسلسل جاری رہتا ہے وہ ماہ بماہ کمر توڑ اور اعصاب شکن بجلی کے بل کی ادائیگی ہے، یا پھر گھنٹے کے حساب سے پانی خرید کر فصل کو سیراب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا زمین سے پیداوار لینے کے لیے ذاتی محنت ومشقت اور مالی اخراجات کے پیش نظر ہمارے ہاں پیداوار پر نصف عشر یعنی بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ دینا ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ اس کے علاوہ جتنے بھی اخراجات ہیں، ان کا تعلق زمین کی سیرابی یا آبپاشی سے نہیں بلکہ وہ اخراجات زمیندار

پیداوار بچانے یا بڑھانے کے لیے کرتا ہے، مثلاً: کھاد یا سپرے وغیرہ یا پھر زمیندار اپنی محنت و مشقت سے بچنے اور اپنی سہولت کے پیش نظر کرتا ہے۔ مثلاً: بوتے وقت ٹریکٹر کا استعمال، کٹائی کے وقت مزدور لگانا یا فصل اٹھاتے وقت تھریشر وغیرہ کا استعمال۔

مذکورہ حدیث میں مقدار جنس کو بیان نہیں کیا گیا ہے یعنی کتنے نصاب پر عشر واجب ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت ایک دوسری حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ پانچ وسق سے کم پیداوار میں زکوٰۃ یعنی عشر نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری: الزکوٰۃ ۱۴۸۴]

عشر کے لیے یہ غلہ کا نصاب ہے، اس سے کم پر عشر دینا ضروری نہیں کیوں کہ اس سے کم مقدار تو کاشتکار یا زمیندار کے گھر کا سالانہ خرچہ ہی تصور کیا جائے گا، ہاں پانچ وسق یا اس سے زیادہ پر عشر واجب ہوگا، ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے گویا جنس کا نصاب 300 صاع ہیں، جدید اعشاری نظام کے مطابق ایک صاع 2 کلو 100 گرام کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے پانچ وسق کے 630 یعنی چھ صد تیس کلوگرام ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض اہل علم کے نزدیک ایک صاع اڑھائی کلو کے مساوی ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں نصاب 750 کلوگرام مقرر کیا جانا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ شریعت نے مقدار عشر کے لیے زمین کی سیرابی کو مدار بنایا ہے، اس کے علاوہ جو بھی اخراجات ہیں ان کا تعلق مقدار عشر سے نہیں۔ لہٰذا جہاں زمین کی سیرابی کے لیے قدرتی وسائل ہوں وہاں پیداوار سے دسواں حصہ (عشر) لیا جائے گا اور جہاں زمین کو سیراب کرنے کے لیے قدرتی وسائل نہیں بلکہ محنت و مشقت اور اخراجات برداشت کرنا پڑیں تو وہاں بیسواں حصہ یعنی نصف عشر دینا ہوگا۔ ہمارے ہاں عام طور پر پیداوار کا بیسواں حصہ دیا جاتا ہے۔ پیداوار سے دسواں حصہ دینے والی زمین بہت کم ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں عام طور پر مہاجرین تاجر اور انصار زراعت پیشہ تھے، وہ لوگ زمین کو خود کاشت کرتے تھے اور خود ہی کاٹتے اور فصل اٹھاتے تھے، زمین کی سیرابی کے لیے محنت و مشقت اور اخراجات برداشت کرنے کی وجہ سے انہیں پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کے اخراجات پیداوار سے منہا نہیں کیے جاتے تھے، اب عشر کے متعلق کچھ مزید وضاحتیں پیش خدمت ہیں:

① زرعی زکوٰۃ کے لیے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے، بلکہ جب بھی فصل کاٹی جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، جیسا کہ درج ذیل آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے: ''فصل کاٹتے وقت ہی اس سے اللہ کا حق ادا کرو۔''

② رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گندم، جو، منقّی اور کھجور سے زکوٰۃ لی جاتی تھی، مگر ہمارے ہاں اور بھی اجناس بکثرت پیدا ہوتی ہیں، مثلاً: چاول، چنے، جوار، باجرہ اور مکئی وغیرہ۔ ان سب اجناس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

③ ایسی سبزیاں اور ترکاریاں جو جلدی خراب نہیں ہوتیں۔ مثلاً: آلو، پیاز، لہسن، ادرک، اور پیٹھا وغیرہ۔ ان پر زرعی زکوٰۃ یعنی عشر واجب ہوگا۔ لیکن جو ترکاریاں تازہ استعمال ہوتی ہیں اور جلدی خراب ہو جاتی ہیں، مثلاً: کدو، ٹینڈا، کریلے اور توریاں وغیرہ ان پر زرعی زکوٰۃ نہیں بلکہ سال کے بعد ان کے منافع پر تجارتی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے، یعنی اڑھائی فیصد یا چالیسواں حصہ ادا کرنا ہوتا ہے۔

④ پھلوں میں بھی زرعی زکوٰۃ ہے، بشرطیکہ انہیں دیر تک استعمال کیا جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں منقّی اور کھجور سے عشر ادا کیا جاتا تھا، لیکن ہمارے ہاں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے خشک پھل پیدا ہوتے ہیں، مثلاً: اخروٹ، بادام، خوبانی، مونگ پھلی

وغیرہ اگر اس قسم کے پھل حد نصاب کو پہنچ جائیں تو ان پر زرعی زکوٰۃ واجب ہو گی۔

⑤ کپاس بھی زمینی پیداوار ہے اور ہمارے ملک میں تو خاصی منفعت بخش فصل ہے، لہٰذا اس میں بھی عشر ادا کرنا ہو گا، یعنی بیس من میں سے ایک من بطور عشر ادا کیا جائے، اگر کوئی کاشتکار تجارت پیشہ بھی ہے تو اسے چاہیے کہ اگر کپاس کی پیداوار حد نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے پہلے عشر ادا کرے اور پھر اگر اسے تجارت میں فروخت کر دیتا ہے تو اس کی رقم حد نصاب کو پہنچ جائے تو تجارتی زکوٰۃ بھی ادا کرے یعنی کھیتی کا حساب علیحدہ ہو گا اور تجارتی مال کی زکوٰۃ کا حساب الگ ہو گا، تجارتی مال کی رقم خواہ کہاں سے بھی آئے، اس سے زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ کپاس کا ذکر حدیث میں بھی ہے، چنانچہ ابیض بن حمال رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور صدقہ وغیرہ کی معافی کے لیے درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے قوم سبا سے تعلق رکھنے والے! صدقہ کی ادائیگی تو ضروری ہے۔'' پھر اس نے مزید وضاحت کی کہ ہم تو صرف کپاس کاشت کرتے ہیں اور سبا پر جب آفت آتی ہے تو مارب مقام پر تھوڑی بہت کپاس کاشت ہوتی ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے ستر جوڑے سالانہ وصول کرنے پر اس سے صلح کر لی۔ [ابوداود: الخراج، ۳۰۲۸]

مختصر یہ ہے کہ کپاس سے بھی عشر دینا ہو گا

⑥ ہمارے بعض علاقوں میں گنا بھی کاشت کیا جاتا ہے، اگر اسے ملوں کو فروخت کر دیا جائے تو اس سے تجارتی زکوٰۃ ہو گی اور اگر اسے بطور چارہ استعمال کر لیا جائے تو قابل معافی ہے۔ اگر اس کماد سے گڑ، شکر یا چینی بنائی جائے تو اس سے عشر دینا ہو گا، بشرطیکہ حد نصاب کو پہنچ جائے۔

⑦ اگر کسی نے اپنی زمین کسی دوسرے کو عاریۃً برائے کاشت دی ہے تو اس صورت میں جس نے فصل اٹھائی ہے وہی اس کا عشر وغیرہ ادا کرے گا۔ مالک زمین کے ذمے اس کی ادائیگی نہیں ہے۔ کیوں کہ اسے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، اگر زمین کے مالک نے کسی دوسرے کو طے شدہ حصے پر کاشت کرنے کے لیے دی ہے تو اس صورت میں دو موقف ہیں:

① ہر ایک کا حصہ اگر حد نصاب کو پہنچ جائے تو اس سے عشر دینا ہو گا۔ اگر کسی کا بھی حصہ حد نصاب تک نہیں پہنچتا تو کسی پر عشر واجب نہیں، یعنی جس شخص کا حصہ حد نصاب کو پہنچ جائے گا اسے اپنے حصے سے عشر دینا ہو گا۔

② امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ موقف ہے کہ اگر مجموعی پیداوار حد نصاب کو پہنچ جائے تو ہر ایک اپنے حصے کے مطابق عشر ادا کرنے کے بعد دونوں طے شدہ حصوں کے مطابق پیداوار کو تقسیم کر لیں گے۔

ہمارے نزدیک یہ دوسرا موقف وزنی معلوم ہوتا ہے، نیز اس میں غربا اور مساکین کا بھی فائدہ ہے۔ خیبر کی زمین بھی پیداوار کے لیے طے شدہ حصے کے عوض کاشت کی جاتی تھی۔ چونکہ یہودی عشر ادا کرنے کے پابند نہیں تھے۔ اس کے لیے صحابہ کرام کو جو حصہ ملتا اگر وہ نصاب کو پہنچ جاتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا حصہ الگ کر دیتے تھے۔ اگر زمین کو ٹھیکے پر دے دیا جائے تو زمیندار چونکہ زمین کا مالک ہوتا ہے وہ ٹھیکے کی اس رقم کو اپنی مجموعی آمدنی میں شامل کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا۔ بشرطیکہ وہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس کی ضروریات سے فاضل ہو اور اس پر سال بھی گزر جائے۔ زمین، ٹھیکے پر لینے والا، کاشت کرنے میں خود مختار ہوتا ہے اور پیداوار کا مالک بھی وہی ہوتا ہے۔ تو وہ صاحب اختیار ہونے کی حیثیت سے عشر ادا کرے گا، ٹھیکے کی رقم اس سے منہا نہیں کی جائے گی،

کاشتکار کو متعدد مالی اخراجات کی وجہ سے بیسواں حصہ دینے کی رعایت دی گئی ہے۔ اگر اس رعایت کے باوجود ٹھیکہ کی رقم، کھاد، سپرے کے اخراجات، کٹائی کے لیے مزدوری اور تھریشر وغیرہ کے اخراجات بھی منہا کر دیئے جائیں تو باقی کیا بچے گا۔ جو عشر کے طور پر ادا کیا جائے گا۔ لہٰذا ہمارا رجحان یہ ہے کہ کاشتکار کسی قسم کے اخراجات منہا کیے بغیر اپنی پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرے گا۔ بشرطیکہ اس کی پیداوار پانچ وسق تک پہنچ جائے اگر اس سے کم ہے تو عشر نہیں، ہاں اگر چاہے تو فی سبیل اللہ دینے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال اٹک سے محمد زمان لکھتے ہیں کہ زکوٰۃ کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ دو سو درہم چاندی کے پچاس روپے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بیس دینار سونے کے ساٹھ روپے اس حساب سے جس شخص کے پاس پچاس روپے یا پچاس روپے کی چاندی، اسی طرح ساٹھ روپے یا ساٹھ روپے کا سونا ہو اور اس پر سال گزر جائے تو ان سے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ مسئلہ کہاں تک درست ہے؟ قرآن و حدیث کی رو سے جواب دیا جائے۔

جواب سونے کی زکوٰۃ کے متعلق ہمارے علما میں اختلاف ہے کہ اس میں وزن کا اعتبار ہے یا قیمت کو مدنظر رکھا جائے؟ مولانا عبدالوہاب دہلوی کا فتویٰ ہے کہ قیمت کا اعتبار کیا جائے چونکہ عہد نبوی میں ایک دینار تین روپے کے برابر ہوتا تھا اور سونے کی زکوٰۃ کا نصاب بیس دینار ہے۔ اس لیے سونے کی زکوٰۃ کے لیے ساٹھ روپے کی مالیت کا سونا ضروری ہے، حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ زکوٰۃ کے لیے وزن معتبر ہوگا۔ کیوں کہ بعض روایات میں بیس مثقال سونے سے زکوٰۃ ادا کرنے کا ثبوت ملتا ہے اور مثقال کا تعلق وزن سے ہے نقدی سے نہیں اور مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے اس حساب سے بیس مثقال ساڑھے سات تولے کے مساوی ہے جس سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں حضرات کے موقف کے بین بین ایک تطبیقی صورت بیان فرمائی ہے کہ نص حدیث سے وزن معتبر ہے اور اقتضائے وقت کے پیش نظر قیمت کا اعتبار کیا جائے۔ جس صورت میں بھی غربا اور مساکین کا فائدہ ہو اسے اختیار کیا جائے، ہمارا رجحان وزن کی طرف ہے اور اگر قیمت کا لحاظ رکھنا ہے تو بھی حاضر بھاؤ سے لگائی جائے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ عہد رسالت میں سونے کی قیمت کے مطابق آج حساب لگا کر 60 روپے کی مالیت پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے۔ اب اگر کسی کے پاس ساڑھے سات تولے سونا موجود ہو اور اس پر سال گزر جائے تو چالیسواں حصہ سونا یا اس کے مساوی حاضر بھاؤ کے حساب سے قیمت بطور زکوٰۃ نکالی جائے، نقدی کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس اتنی نقدی ہو جس سے ساڑھے باون تولے چاندی خریدی جا سکے اور اس جمع شدہ نقدی پر سال گزر جائے تو چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ سوال میں ذکر کردہ پچاس یا ساٹھ روپے کی مالیت سے زکوٰۃ ادا کرنا، ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال محمد اسماعیل صاحب کراچی سے لکھتے ہیں کہ ہم نے ایک خدمت کمیٹی تشکیل دی ہے جس کا کام صاحب حیثیت افراد سے زکوٰۃ وصول کر کے مستحق افراد تک پہنچانا ہے، نیز اس جمع شدہ زکوٰۃ سے مستحقین کا علاج و معالجہ بھی کیا جاتا ہے اور ان کے بچوں کے لیے ماہانہ وظائف اور بچیوں کی شادی وغیرہ کے اخراجات بھی برداشت کیے جاتے ہیں۔ مجھے مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کب تک رکھ سکتے ہیں؟ کیا جس سال کی زکوٰۃ ہو اسی سال خرچ کرنا ضروری ہے؟

جواب واضح رہے کہ خدمت کمیٹی کی حیثیت بیت المال کی طرح ہے۔ یعنی مال زکوٰۃ ان کے پاس بطور امانت ہے کوشش کرنا چاہیے کہ یہ امانت حقداروں تک جلد از جلد پہنچ جائے دانستہ دیر کرنا درست نہیں ہاں اگر کسی معقول وجہ سے مال زکوٰۃ سال سے پہلے پہلے ختم نہیں ہوتا تو اس میں ان شاء اللہ کوئی حرج نہیں، البتہ صاحب نصاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر سال زکوٰۃ دیتا رہے اسے بھی اگر مستحقین نہ مل سکیں تو ایک سال کی زکوٰۃ دوسرے سال میں جمع کر سکتا ہے۔ مگر ایسا کم ہوتا ہے۔ لیکن خدمت کمیٹی نے ایک نظم کے تحت کام چلانا ہوتا ہے اس لیے کسی وجہ سے اگر ایک سال کی کچھ زکوٰۃ بچ جائے تو اسے دوسرے سال کی زکوٰۃ کے ساتھ جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال حافظ والا ضلع بہاولنگر سے حاجی ضیاء الدین لکھتے ہیں کہ ایک آدمی کاشتکاری کے لیے زمین ٹھیکہ پر لیتا ہے پھر اس کی کاشت کاری پر اخراجات اٹھاتا ہے۔ مثلاً ٹریکٹر کے ذریعے اسے بویا جاتا ہے پھر اس پر کھاد، سپرے، کٹائی کی مزدوری اور تھریشر وغیرہ پر کافی خرچہ آتا ہے کیا عشر دینے سے پہلے ان اخراجات کو پیداوار سے منہا کر لیا جائے یا کل پیداوار سے عشر ادا کیا جائے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب اس جواب سے پہلے عشر کی حیثیت اور مقدار نیز پیداوار کا تعین ضروری ہے۔ جس پر عشر وصول کیا جاتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ وہ زمین جسے بارش یا قدرتی چشمہ کا پانی سیراب کرتا ہو یا کسی دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے خود بخود سیراب ہو جاتی ہو تو اس کی پیداوار سے دسواں حصہ بطور عشر لیا جائے گا اور وہ زمین جسے کنوئیں سے پانی کھینچ کر سیراب کیا جاتا ہے تو اس کی پیداوار سے بیسواں حصہ لیا جائے گا۔'' [صحیح بخاری: زکوٰۃ ۱۴۸۳]

اس حدیث میں پیداوار دینے والی زمین کی حیثیت اور اس کی پیداوار پر مقدار عشر کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جس کی تشریح آئندہ کی جائے گی لیکن کتنی مقدار جنس پر عشر دینا ہوگا وہ ایک دوسری حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ پانچ وسق سے کم پیداوار میں زکوٰۃ یعنی عشر نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الزکوٰۃ ۱۴۸۴]

اور واضح رہے کہ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے گویا نصاب جنس 300 صاع ہیں، جدید اعشاری نظام کے مطابق صاع 2 کلو 100 گرام کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے پانچ وسق کے 630 کلوگرام ہوتے ہیں، بعض اہل علم کے نزدیک ایک صاع اڑھائی کلو کے مساوی ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کے ہاں پیداوار کا نصاب 750 کلوگرام ہے۔

غربا اور مساکین کی ضروریات کے پیش نظر پیداوار کا نصاب 630 کلوگرام مقرر کیا جانا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اول الذکر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے مقدار عشر کے لیے اس کی سیرابی یعنی پیداوار لینے کے لیے پانی کو مدار قرار دیا ہے۔ اگر کھیتی کو سیراب کرنے کے لیے پانی بسہولت دستیاب ہے، اس پر کسی قسم کی محنت یا مشقت نہیں اٹھانا پڑتی تو اس میں پیداوار کا عشر یعنی دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا ہوگا، اس کے برعکس اگر پانی حاصل کرنے کے لیے محنت و مشقت اٹھانا پڑتی ہو یا اخراجات برداشت کرنا پڑیں تو اس میں نصف العشر یعنی بیسواں حصہ ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر زمینوں کی آبپاشی دو طرح سے کی جاتی ہے۔

① نہری پانی: حکومت نے اس کے لیے مستقل محکمہ انہار قائم کر رکھا ہے، اس پر زمیندار کو محنت و مشقت کے علاوہ اخراجات بھی

برداشت کرنا پڑتے ہیں، آبیانہ وغیرہ ادا کرنا ہوتا ہے، اس کے باوجود نہری پانی فصلوں کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ اس کے لیے دوسرے ذرائع سے ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔

② ٹیوب ویل: ٹیوب ویل لگانے کے لیے کافی رقم درکار ہوتی ہے۔ جب اس کی تنصیب مکمل ہو جاتی ہے تو واپڈا کا رحم وکرم شروع ہو جاتا ہے۔ ماہ بماہ کمر توڑ اور اعصاب شکن بجلی کا بل ادا کرنا پڑتا ہے، یا پھر گھنٹے کے حساب سے پانی خرید کر کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ لہٰذا زمین سے پیداوار لینے کے لیے ذاتی محنت ومشقت اور مالی اخراجات کے پیشِ نظر ہمارے ہاں پیداوار پر نصف العشر یعنی بیسواں حصہ بطور زکوٰۃ دینا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بھی اخراجات ہیں ان کا تعلق زمین کی سیرابی یا آب پاشی سے نہیں ہے بلکہ وہ اخراجات زمیندار پیداوار بچانے یا بڑھانے کے لیے کرتا ہے۔ مثلاً: کھاد، سپرے وغیرہ یا پھر زمیندار اپنی محنت ومشقت سے بچنے اور اپنی سہولت کے پیش نظر کرتا ہے۔ مثلاً بوتے وقت ٹریکٹر کا استعمال، کٹائی کے وقت مزدور کو لگانا یا فصل اٹھاتے وقت تھریشر وغیرہ کا استعمال۔

مختصر یہ کہ شریعت نے مقدار عشر کے لیے زمین کی سیرابی کو مدار بنایا ہے، اس کے علاوہ جو اخراجات ہیں ان کا تعلق مقدار عشر سے نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں زمین کی سیرابی کے لیے قدرتی وسائل ہوں گے وہاں پیداوار سے عشر (دسواں حصہ) لیا جائے گا اور جہاں زمین کو سیراب کرنے کے لیے قدرتی وسائل نہیں بلکہ محنت ومشقت اور اخراجات برداشت کرنا پڑیں تو وہاں نصف العشر یعنی بیسواں حصہ دینا ہوگا۔ ہمارے ہاں عام طور پر پیداوار کا بیسواں حصہ دیا جاتا ہے، پیداوار میں دسواں دینے والی زمینیں بہت کم ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں عام طور پر مہاجرین تجارت اور انصار زراعت پیشہ تھے، وہ لوگ زمین کو خود کاشت کرتے تھے اور خود ہی کاٹتے اور فصل اٹھاتے تھے۔ البتہ زمینوں کی سیرابی کے لیے محنت ومشقت اور اخراجات برداشت کرنے کی وجہ سے انہیں پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرنا ضروری تھا، اس کے علاوہ کسی قسم کے اخراجات پیداوار سے منہا نہیں کیے جاتے تھے، اسی طرح خیبر کی زمین پیداوار کے طے شدہ حصے کے عوض کاشت کی جاتی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو حصہ ملتا اگر وہ نصاب کو پہنچ جاتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا حصہ الگ کر دیتے تھے، زمیندار چونکہ زمین کا مالک ہوتا ہے۔ وہ ٹھیکے کی اس رقم کو اپنی مجموعی آمدنی میں شامل کر کے اگر وہ نصاب تک پہنچتی ہے تو اس میں سے زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اور زمین ٹھیکے پر لینے والا کاشت کرنے میں صاحب اختیار ہوتا ہے اور پیداوار کا مالک بھی وہی ہوتا ہے تو وہ مختار کی حیثیت سے عشر ادا کرے گا، ٹھیکے کی رقم اس سے منہا نہیں کی جائے گی، اسی طرح سہولت کے لیے یا اپنی پیداوار بڑھانے کے لیے جو رقم خرچ کی جاتی ہے یہ اخراجات بھی پیداوار سے منہا نہیں ہوں گے، البتہ محنت ومشقت یا مالی اخراجات جو زمین کی سیرابی پر آتے ہیں ان کے پیش نظر شریعت نے اسے رعایت دی ہے کہ وہ اپنی پیداوار سے بیسواں حصہ ادا کرے، اگر اس رعایت کے باوجود ٹھیکہ کی رقم، کھاد، سپرے کے لیے اخراجات، کٹائی کے لیے مزدوری اور تھریشر وغیرہ کے اخراجات بھی منہا کر دیے جائیں تو باقی کیا بچے گا جو عشر کے طور پر ادا کیا جائے گا، لہٰذا ہمارا رجحان یہ ہے کہ کاشتکار کسی قسم کے اخراجات منہا کیے بغیر اپنی پیداوار سے بیسواں حصہ بطور عشر ادا کرے گا۔ بشرطیکہ اس کی پیداوار پانچ وسق تک پہنچ جائے، اگر اس سے کم ہے تو عشر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر چاہے۔ تو دینے پر قدغن نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک آدمی اپنے دو شادی شدہ بیٹوں کے ساتھ رہائش رکھے ہوئے ہے، گھر میں کھانا وغیرہ بھی اکٹھا ہی کھایا جاتا ہے، میری بیوی اور دونوں بیٹوں کی بیویوں کا زیور اگر جمع کیا جائے تو نصاب کو پہنچ جاتا ہے، کیا ہمیں اس زیور سے زکوٰۃ دینا پڑے گی۔

(غلام رسول خریداری نمبر ۸۳۷ فیصل آباد)

جواب زکوٰۃ کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی طور پر ہر ایک کا زیور ۷ تولہ ۶ ماشہ ہو، اس میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ واجب ہو گی، اگر انفرادی طور پر ہر ایک کا اتنا نہیں ہے تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہوگی، ان تمام کے زیورات کا مجموعی وزن اگر نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، اگر چہ کھانا وغیرہ اکٹھا ہی کیوں نہ ہو۔

سوال میں ایک سرکاری ملازم ہوں، میرے پاس کوئی ذاتی مکان نہیں ہے، میں نے اپنی تنخواہ میں سے تھوڑی تھوڑی رقم پس انداز کر کے اقساط پر دو پلاٹ اس لیے خریدے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک کو بیچ کر دوسرے پر مکان تعمیر کر سکوں کیا ایسے ذاتی استعمال کے لیے خریدے گئے ان پلاٹوں پر زکوٰۃ دینا ضروری ہے، اولین فرصت میں جواب دیں۔ (ابو رافع، اسلام آباد خریداری نمبر ۵۷۸۰)

جواب زکوٰۃ کے لیے تین شرائط ہیں:

① رقم وغیرہ نصاب کو پہنچ جائے۔

② وہ ضروریات سے فاضل ہو۔

③ اس پر سال گزر جائے۔

صورت مسئولہ میں پلاٹوں کی مالیت اگر چہ نصاب کو پہنچتی ہے لیکن وہ ذاتی ضرورت کے لیے خریدے گئے ہیں، اس قسم کے پلاٹوں پر زکوٰۃ نہیں ہے، ہاں جو پلاٹ تجارتی مفاد کے پیش نظر خریدے گئے ہوں، ان کی بازاری قیمت کے مطابق ہر سال زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔




حج و عمرہ

حج وعمرہ

سوال گجرات سے بیگم عبدالطیف لکھتی ہیں کہ حج مبرور کیا ہوتا ہے؟ اوراس کی کیا فضیلت ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے حج مبرور کو افضل ترین اعمال سے شمار کیا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل عمل کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا'' پھر سوال ہوا اس کے بعد کس عمل کا درجہ ہے؟ فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا'' پھر سوال کیا گیا کہ اس کے بعد؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ حج مقبول۔'' [صحیح بخاری: الحج '۱۵۱۹]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے خیال کے مطابق جہاد فی سبیل اللہ افضل ترین عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تمہارے یعنی عورتوں کے لیے افضل ترین عمل حج مبرور ہے۔'' [صحیح بخاری: الحج '۱۵۲۰]

حج کی فضیلت کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جو شخص حج کرے اور دورانِ حج شہوت انگیز اور اخلاق سے گری ہوئی باتوں سے پرہیز کرے۔ نیز اللہ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے تو گناہوں سے ایسے صاف ہو جاتا ہے جیسے آج ہی اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا۔'' [صحیح بخاری: الحج '۱۵۲۱]

ہمارے نزدیک حج مبرور یہی ہے کہ جس حج میں مذکورہ بالا فضیلت مل جائے، یعنی اسے کامل آداب وشرائط کے ساتھ اس طرح ادا کیا جائے کہ انسان کے سابقہ گناہ دُھل جائیں اور آیندہ ان سے اجتناب کا خیال کرے، ویسے محدثین وعلما نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں جن کی وضاحت حسب ذیل ہے:

☆ وہ حج جس کے دوران کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ حج مبرور کہلاتا ہے۔

☆ اس سے مراد وہ حج ہے جو عنداللہ مقبول ہو جائے اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ آیندہ اسے گناہوں سے نفرت ہو جائے۔

☆ وہ حج ہے جس میں ریاکاری، شہرت، فحاشی، لڑائی جھگڑا نہ کیا گیا ہو۔

☆ حج مبرور یہ ہے کہ آدمی پہلے کی نسبت بہتر ہو کر لوٹے اور گناہوں کی کوشش نہ کرے۔

☆ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ حج مبرور یہ ہے کہ انسان اس کے بعد دنیا سے بے رغبت اور آخرت کا طلب گار بن جائے۔''

درحقیقت حج میں تمام امور بالا شامل ہوتے ہیں۔ [مرعاۃ المفاتیح: ۶/۱۹۰]

سوال فیصل آباد سے محمد اسماعیل لکھتے ہیں کہ ایک بیوہ عورت حج کرنا چاہتی ہے لیکن مالی کمزوری کی وجہ سے کسی محرم کو ساتھ نہیں لے جا سکتی، اس کے پاس حج کرنے کا خرچہ وغیرہ موجود ہے عمر تقریباً ساٹھ سال ہے صحت مند، نمازی، پرہیزگار ہے ایسے حالات میں اسے محرم کے بغیر حج یا عمرہ کے لیے سفر کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

جواب محرم کے بغیر عورت کے لیے حج کرنے کے متعلق ائمہ دین میں اختلاف ہے بعض علما عورت پر فرضیت حج کے لیے سفر خرچ کی طرح محرم کا ساتھ ہونا بھی شرط قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت اکیلی حج یا عمرہ نہیں کر سکتی بلکہ اس کے ساتھ محرم یا خاوند کا ہونا ضروری ہے چنانچہ حدیث میں ہے: ''کوئی عورت محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔'' [صحیح مسلم]

چونکہ حج یا عمرہ بھی ایک سفر ہے لہٰذا محرم کے بغیر اسے ادا نہیں کرنا چاہیے جبکہ بعض دوسرے علما کا خیال ہے کہ عورت کے لیے زاد اور راحلہ کے علاوہ خاوند یا محرم کی معیت اس کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: ''جس عورت نے حج نہیں کیا اور اس کا کوئی محرم نہیں یا موجود ہونے کی صورت میں کسی وجہ سے ساتھ نہیں جا سکتا۔ تو فریضہ حج ترک نہ کرے بلکہ دوسری عورتوں کی جماعت کے ہمراہ جا کر حج ادا کرے''۔ (مؤطا امام مالک: کتاب الحج) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔

صورت مسئولہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ بیوہ عورت اپنے ساتھ مالی تنگی کی وجہ سے محرم کو ساتھ لے جانے سے قاصر ہے لہٰذا اگر ایسی عورت دوسری دیندار، قابل اعتماد عورتوں کے ساتھ حج پر چلی جائے جو اپنے شوہروں یا محرموں کے ہمراہ حج پر جا رہی ہوں تو ان شاء اللہ کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ البتہ اسے اکیلے حج پر جانا شرعاً جائز نہیں ہے۔

سوال قاری محمد یحییٰ صاحب اٹک سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا بیت اللہ کے اندر اور میزاب رحمت کے نیچے قبریں موجود ہیں اور بیت اللہ کا طواف انہیں قبروں کی وجہ سے کیا جاتا ہے؟ ہمارے ہاں ایک بریلوی عالم دین نے اس قسم کا دعویٰ کیا ہے قرآن وحدیث کے حوالہ سے جواب مطلوب ہے۔

جواب بریلوی حضرات جو ہر سال حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے واپس وطن آتے ہیں ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس ''نئی دریافت'' کا مشاہدہ کیا ہے یقیناً یہ دعویٰ باطل غلط اور بے بنیاد ہے اگرچہ بعض مؤرخین نے بلا تحقیق ایسی باتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے لیکن یہ سب خود ساختہ ہیں۔ مثلاً محب الدین الطبری لکھتے ہیں کہ: ''مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیان ننانوے انبیائے کرام مدفون ہیں''۔ نیز حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی والدہ ھاجرہ رضی اللہ عنہا کے ہمراہ حطیم میں محو استراحت ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام کی آخری آرام گاہیں بھی اسی خطہ میں ہیں۔ یہ باتیں علامہ ازرقی کی تالیف اخبار مکہ کے حوالہ سے نقل کی ہیں۔ [القریٰ فی احوال ام القریٰ: ص ۶]

لیکن ان ''حقائق'' کو بلا سند بیان کیا گیا ہے جبکہ محدثین عظام کے ہاں سند صحیح ہونا ہی کسی بات کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، بلا سند ہونے کی وجہ سے محدثین نے ایسی باتوں کو اپنی کتب میں جگہ نہیں دی ہے۔ علامہ سیوطی نے الکنیٰ للحاکم کے حوالہ سے بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک حدیث بایں الفاظ نقل کی ہے: ''ان قبر اسماعیل فی الحجر'' (الجامع الصغیر) ''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر حطیم میں ہے۔''

لیکن مصنف نے خود ہی اس حدیث کے ضعیف ہونے کی صراحت کر دی ہے پھر محدث عصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ [ضعیف الجامع الصغیر: حدیث نمبر ۱۹۰۵]

اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی اس موقف کی دلیل نہیں بن سکتی کیوں کہ بریلوی عالم دین نے بیان کیا ہے کیوں کہ اگر قبر کا وجود ختم ہو جائے تو اس کے احکام وہ نہیں ہیں جو ظاہر قبر کے ہوتے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جس جگہ مسجد کی بنیاد رکھی تھی اس کے ایک حصہ میں مشرکین کی قبریں تھیں انہیں اکھاڑ کر پھینک دیا گیا اور جگہ صاف کر کے وہاں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد رکھی گئی۔ [صحیح بخاری]

اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسجد نبوی قبرستان میں بنائی گئی کیوں کہ قبروں کو نیست و نابود کر دیا گیا تھا اس طرح اگر مسجد حرام یا حطیم میں قبریں تھیں تو وہ حوادث زمانہ سے خود بخود ختم ہو گئی ہیں۔ ملا علی قاری کہتے ہیں: ''کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر (اگر تھی) تو وہ ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس سے مسجد میں قبر کے جواز پر استدلال صحیح نہیں ہے۔'' [مرقاۃ]

سوال میں ایک بے بنیاد سی بات کا ذکر ہے کہ بیت اللہ کا طواف انہیں قبروں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قبر کے پجاریوں میں قبر پرستی کے جراثیم اس قدر سرایت کر چکے ہیں کہ اب انہیں ہر جگہ سے یہی بو آتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور شرک کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لیے اس گھر (بیت اللہ) کو تعمیر کروایا اور اس کا طواف کرنے کو بھی اپنی عبادت قرار دیا تو پھر طواف جیسی اہم عبادت میں کسی کی شراکت کیونکر گوارا ہو سکتی ہے۔ پھر یہ گھر تو مذعومہ قبروں کے معرض وجود میں آنے سے پہلے موجود تھا اور اس کا طواف کیا جاتا تھا۔ یقیناً یہ بہت بڑا جھوٹ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس قسم کے شرک اکبر سے محفوظ رکھے اور بے بنیاد باتوں نیز بے اصل کاموں سے دور رکھے۔ آمین [واللہ اعلم]

سوال حافظ آباد سے ضیاء اللہ سوال کرتے ہیں کہ جو شخص بغرض عمرہ سعودیہ جاتا ہے وہاں چھپ کر کئی سال تک کام کرتا ہے ایسے شخص کی کمائی جائز ہے؟۔

جواب مملکت سعودیہ میں عمرہ کے لیے جانا بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن وہاں کے قوانین و ضوابط کی پابندی بھی انتہائی ضروری ہے۔ ان کی خلاف ورزی کرنے سے کئی ایک مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ البتہ ویزے کی مدت کے دوران محنت و مزدوری کرنا کوئی جرم نہیں ہے، حج کے موقع پر دنیاوی کاروبار کرنے کی خود قرآن کریم نے اجازت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''دورانِ حج اگر تم ''فضل ربی'' تلاش کر دتو کوئی حرج نہیں ہے''۔ [۲/البقرہ:۱۹۸]

لیکن یہ کاروبار اس مدت کے دوران ہونا چاہیے جتنی مدت کا قیام رکھنے کی اجازت دی گئی ہے، اس مدت کے بعد چھپ کر وہاں رہنا اور کمائی کرنا ملکی قوانین کی خلاف ورزی تو ضرور ہے، لیکن کمائی کے حلال و حرام ہونے پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ اگر حلال ذرائع سے کمائی کرتا ہے تو بلا شبہ حلال اور جائز ہے اور اگر ناجائز وسائل کے استعمال سے دولت اکٹھی کرتا ہے تو حرام اور ناجائز ہے، ملکی قوانین کی خلاف ورزی ایک الگ موضوع ہے، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔

سوال لاہور سے اکرام بھٹی لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل روایت کے متعلق تحقیق درکار ہے، کیونکہ ہمارے واعظین اسے بکثرت بیان کرتے ہیں۔ جبکہ کچھ علما اسے صحیح نہیں کہتے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے دریافت کیا کہ ان قربانیوں کی کیا حیثیت ہے؟ آپ نے فرمایا: ''کہ تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے'' نہوں نے عرض کیا کہ ہمیں اس سے کیا حاصل ہو گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہیں قربانی کے ہر بال کے بدلے نیکی ملے گی۔''

جواب اس روایت کو امام ابن ماجہ نے قربانی کے باب میں بیان کیا ہے لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے، بلکہ بعض محدثین نے اس کے موضوع ہونے کا فیصلہ دیا ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی عائذ اللہ المجاشعی ہے جس کے متعلق علامہ ذہبی نے امام ابو حاتم کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ منکر روایات بیان کرنے والا ہے۔ [تلخیص المستدرک:۱/۳۸۹]

نیز اس کے استاد ابوداود بن الحارث الاعمی کو محدثین نے وضاع قرار دیا ہے۔ [میزان الاعتدال:۴/۲۷۲]

علامہ بوصیری نے اس کو متروک کہا ہے اور وضع حدیث سے متہم کیا ہے۔ [تعلیق ابن ماجہ: حدیث نمبر ۳۱۲۷]

اس کے متعلق امام ابن حبان لکھتے ہیں کہ یہ ایسا راوی ہے جو ثقات کے نام سے موضوع روایات بیان کرتا تھا۔اس کی بیان کردہ روایات بطور دلیل درست نہیں ہیں۔ [کتاب الضعفاء:۳/۵۵]

ابن حبان نے اس وضاحت کے بعد مذکورہ روایت کو بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

محدث العصر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔ [سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ:۳/۱۵۷]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو معلق یعنی بلاسند بیان کیا ہے، جو اس روایت کے کمزور ہونے کی علامت ہے۔الفاظ یہ ہیں: ''کہ قربانی کرنے والے کو ہر بال کے عوض نیکی ملے گی''۔ [جامع ترمذی]

واضح رہے کہ وہ روایت جس میں مندرجہ ذیل مضمون بیان ہوا ہے۔''قربانی قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت آئے گی''۔یہ بھی سخت ضعیف ہے۔ [سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ:۲/۱۴]

قربانی کے فضائل ومناقب بے شمار صحیح احادیث سے منقول ہیں واعظین کو چاہیے کہ عوام میں شوق پیدا کرنے کے لیے انہیں بیان کیا جائے، اس قسم کی من گھڑت روایات کو بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔کیوں کہ ضعیف اور وضعی روایات سے کسی قسم کا استحباب ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کے بیان کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔

سوال سکھر سے عطاء اللہ دریافت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن قربانی کے جانور ہمارے لیے سواری کا کام دیں گے کیا اس کے متعلق کوئی حدیث ہے؟

جواب ہمارے واعظین اکثر ایک حدیث بیان کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں: ''اپنی قربانیوں کو خوب موٹا تازہ کیا کرو کیوں کہ یہ قیامت کے دن پل صراط پر سواری کا کام دیں گی۔'' کتب حدیث میں ان الفاظ کے ساتھ کوئی حدیث مروی نہیں ہے، اس کے متعلق حافظ ابن صلاح لکھتے ہیں: ''یہ حدیث محدثین کے ہاں غیر معروف ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں''۔ [کشف الخفاء:۲/۷۵]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں: ''ان الفاظ کے ساتھ مروی یہ حدیث بالکل بے بنیاد ہے۔'' [سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ:۱/۱۰۲]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مسند الفردوس کے حوالہ سے ایک حدیث کی نشاندہی کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''اپنی قربانیوں کو خوب موٹا کرو، اس لیے کہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی''۔ [تلخیص الحبیر:۴/۱۳۸]

پھر خود ہی اس پر ناقدانہ تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس کی سند میں یحییٰ بن عبید اللہ نامی ایک راوی انتہائی ضعیف ہے۔'' [حوالہ مذکورہ]

محدثین نے اس راوی کے متعلق ضعیف الحدیث، منکر الحدیث اور متروک الحدیث کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس کا باپ عبید اللہ بن عبد اللہ بھی مجہول ہے۔جس کے متعلق امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ غیر معروف ہے، ان وجوہات کی بنا پر علامہ البانی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں ''کہ یہ روایت انتہائی ضعیف ہے۔''

ان بے اصل روایات کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ قربانی کے جانور کو موٹا تازہ نہ کیا جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ واعظین حضرات ایسی من گھڑت احادیث بیان کرنے سے گریز کریں کیوں کہ بے اصل اور خود ساختہ احادیث سے کسی قسم کا استحباب ثابت نہیں ہوتا بلکہ ان کے بیان کرنے پر سخت وعید آئی ہے، قربانی کے فضائل میں بے شمار صحیح احادیث کتب حدیث میں مروی ہیں انہیں بیان کرنا چاہیے۔

سوال اسلام آباد سے راجہ فضل داد خان لکھتے ہیں کہ قربانی، ذوالحجہ کے کتنے دنوں تک کی جا سکتی ہے کیا تیرہ ذوالحجہ کو قربانی کرنا قرآن وحدیث سے ثابت ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے حج کے دینی اور دنیوی فوائد بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''تا کہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں ان کے لیے رکھے گئے ہیں اور چند مقررہ دنوں میں ان جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انہیں بخشے ہیں''۔ [۲۲/الحج:۲۸]

اس مقام پر جانوروں پر اللہ کا نام لینے سے مراد انہیں اس کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ ایام معلومات (چند مقررہ دنوں) سے مراد کونسے دن ہیں اس میں اختلاف ہے۔ بالعموم اس کے متعلق دو آراء ہیں:

① اس سے مراد یوم النحر یعنی 10 ذوالحجہ اور اس کے بعد تین دن ہیں، اس کی تائید میں ابن عباس، ابن عمر، ابراہیم نخعی، حسن بصری اور عطا رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال پیش کیے جاتے ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول نقل کیا جاتا ہے۔

② اس سے مراد صرف تین دن ہیں یعنی یوم النحر اور دو دن اس کے بعد اس کی تائید میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہم) اور سعید بن مسیّب کے اقوال بیان ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں کچھ شاذ اقوال بھی ہیں: مثلاً کسی نے یکم محرم تک ایام قربانی کو دراز کیا ہے اور کسی نے صرف یوم النحر تک اسے محدود کر دیا ہے اور کسی نے یوم النحر کے بعد صرف ایک دن قربانی کا تسلیم کیا ہے، بعض نے ذوالحجہ کے پہلے دس دن مراد لیے ہیں، بہر حال یہ شاذ اقوال ہیں جن کے متعلق کوئی مضبوط دلائل نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک پہلا قول یعنی یوم النحر اور ایام التشریق یعنی 13,12,11,10 دن تک قربانی ہو سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تو دسویں ذوالحجہ کو قربانی فرمائی ہے البتہ جواز کی حد تک 13,12,11 دن برابر ہیں، تیرہ تاریخ کے لیے کوئی الگ حکم نہیں دیا ہے جب یہ آخری دن احکام حج میں دوسرے ایام کے برابر ہے تو قربانی کے لیے بلا وجہ اسے الگ کیوں کیا جائے چنانچہ اس موقف کی تائید میں ایک حدیث بھی مروی ہے۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: ''منیٰ میں ہر جگہ قربانی کی جا سکتی ہے اور ایام تشریق تمام کے تمام ذبح کے دن ہیں''۔ [مسند امام احمد:۴/۸۲]

اس روایت میں اگر چہ انقطاع ہے تاہم مجموع طرق سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کی کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ ائمہ حدیث میں اکثر کا رجحان اسی طرف ہے، تفصیل کے لیے نیل الاوطار، زاد المعاد کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ضروری نوٹ: قربانی کے لیے افضل دن یوم النحر دسویں ذوالحجہ ہے بلا وجہ اس دن سے تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ آخری دن قربانی کرنا مردہ سنت کو زندہ کرنا نہیں جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر یہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بلا وجہ نماز آخر وقت میں ادا کرے۔ ایسا کرنے سے نماز تو ادا ہو جائے گی لیکن شان اور فضیلت سے محروم ہو گی۔

سوال فیصل آباد سے حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ خصی جانور کی قربانی کرنا کیسا ہے؟ فیصل آباد میں نام نہاد جماعت المسلمین کی طرف سے ایک پوسٹر شائع ہوا ہے کہ خصی جانور کی قربانی جائز نہیں، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو خصی کرنے سے منع کیا ہے، وضاحت فرمائیں۔

جواب کسی جانور کو خصی کرنے کے مثبت اور منفی دو پہلو ہیں۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ خصی جانور کا گوشت عمدہ اور بہتر ہوتا ہے، جبکہ اس کے علاوہ غیر خصی جانور کے گوشت میں بو پیدا ہو جاتی ہے، جس کے کھانے سے طبیعت میں ناگواری اور تکدر پیدا ہوتا ہے اور اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ خصی جانور کی فحولیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ افزائش نسل کے لیے نقصان دہ ہے، قربانی کا تعلق مثبت پہلو سے ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود قربانی کے لیے بعض اوقات خصی جانور کا انتخاب کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو ایسے مینڈھوں کی قربانی دیتے جو گوشت سے بھرپور اور خصی ہوتے تھے۔ [مسند امام احمد: ۵/۱۹۶]

قربانی کے ذریعے چونکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے اس لیے قربانی کا جانور واقعی بے عیب ہونا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے چند ایک ایسے عیوب کی نشاندہی کی ہے جو قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہیں، لیکن قربانی کے لیے جانور کا خصی ہونا عیب نہیں، اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ایسے جانور کا قربانی کے لیے انتخاب نہ فرماتے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ قربانی کے جانور کا خصی ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ خصی ہونے سے اس کے گوشت کی عمدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ [فتح الباری: ۱۰/۷]

اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت المسلمین کی طرف سے شائع شدہ پوسٹر بد دیانتی پر مبنی ہے، جس میں خصی جانور کی قربانی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، اب ہم جانوروں کو خصی کرنے کے متعلق اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں۔

متقدمین علما کا اس کے متعلق اختلاف ہے ایک گروہ جانوروں کے خصی کرنے کے عمل کو مطلقاً جائز قرار دیتا ہے، خواہ جانور حلال ہو یا حرام، جبکہ کچھ علما کی رائے ہے کہ یہ حرمت صرف حرام جانوروں سے متعلق ہے جب کہ حلال جانوروں کا خصی کرنا جائز ہے، جو حضرات حرمت کے قائل ہیں ان کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

① اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کے متعلق شیطان کا طریقہ واردات قرآن کریم میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے: ''میں انہیں حکم دوں گا کہ وہ میرے کہنے سے اللہ کی ساخت میں ردوبدل کریں گے''۔ [۴/النساء: ۱۱۹]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس آیت سے جانوروں کا خصی کرنا مراد ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت انس، حضرت سعید بن مسیّب، حضرت عکرمہ، اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم کی بھی یہی رائے ہے۔ [تفسیر ابن کثیر]

② علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے مسند البزار کے حوالہ سے ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو خصی کرنے کی شدت سے ممانعت کی ہے۔ [نیل الاوطار: ۸/۲۴۹]

③ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں، گائیوں، بھیڑ، بکریوں اور گھوڑوں کے خصی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [شرح معانی الآثار: ۲/۲۸۳]

ان دلائل کا دوسرے فریق کی طرف سے یہ جواب دیا گیا:

''آیت کریمہ کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات کسی صحیح یا ضعیف روایت سے مرفوعاً ثابت نہیں ہے، جہاں تک سلف صالحین کے اقوال کا تعلق ہے، تو اس کے متعلق خود ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، اور سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد اللہ کا دین ہے، یعنی وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرائیں گے، جیسا کہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے جب سلف صالحین سے مختلف تفاسیر منقول ہیں تو اس کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات حتمی طور پر نہیں کہی جاسکتی، چونکہ اس کی تفسیر میں کوئی مرفوع حدیث موجود نہیں، لہٰذا'' ﴿لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ﴾ ''اللہ کے دین میں کوئی تبدیلی نہیں۔ کے پیش نظر آیت مذکورہ میں خلق اللہ سے دین اللہ ہی مراد ہے۔

مسند البزار کے حوالہ سے جو روایت بیان ہوئی ہے تو اس سے مراد حلال جانوروں کا خصی کرنا مراد نہیں ہے، کیوں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمل سے ایک حرام کی تائید کریں، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مروی ہے کہ ان کے پاس ایک خصی غلام فروخت کے لیے لایا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں خصی کرنے کی تائید و حمایت نہیں کرتا۔

[شرح معانی الآثار:۲/۳۸۳]

گویا انہوں نے اس کی خریداری کو اس عمل کی تائید خیال کیا، لہٰذا اگر حلال جانوروں کا خصی کرنا بھی ناجائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خصی شدہ جانوروں کی قربانی ہرگز پسند نہ کرتے۔ لہٰذا خصی کرنے کی ممانعت اور خصی جانور کی قربانی کرنے میں یہی تطبیق ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا خصی کرنا درست ہے، مگر جن جانوروں کا گوشت کھانا حرام ہے، ان کا خصی کرنا بھی درست نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، بلکہ وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

جب ہم علمائے متقدمین کو دیکھتے ہیں تو ان میں سے بیشتر حلال جانوروں کے خصی کرنے کے قائل اور فاعل ہیں۔ حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اونٹ کو خصی کرایا تھا، نیز حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''کہ اگر نر جانور کے کاٹنے کا اندیشہ ہو تو اسے خصی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' [شرح معانی الآثار:۲/۳۸۳]

امام نووی نے شرح مسلم اور حافظ ابن حجر نے شرح فتح الباری میں اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قربانی کے لیے خصی جانور کو ذبح کیا جاسکتا ہے اور جن روایات میں امتناع ہے۔ وہ ان جانوروں کے متعلق ہے جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال فیصل آباد سے محمد شفیع دریافت کرتے ہیں کہ خصی جانور کی قربانی کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک عیب ہے اور قربانی کا جانور بے عیب ہونا چاہیے وضاحت فرمائیں۔

جواب قربانی کے ذریعے چونکہ اللہ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے اس لیے قربانی کا جانور بے عیب ہونا چاہیے۔ لیکن قربانی کے لیے جانور کا خصی ہونا عیب نہیں ہے۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے لیے بعض اوقات خصی جانور کا انتخاب کرتے تھے، حدیث میں ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو ایسے مینڈھوں کی قربانی دیتے جو گوشت سے بھرپور اور خصی ہوتے تھے''۔ [مسند امام احمد:۵/۱۹۶]

اگرچہ بعض اہل علم نے خصی جانور کی قربانی کو مکروہ لکھا ہے لیکن یہ موقف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے خلاف ہونے کی وجہ

سے نا قابلِ التفات ہے۔حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''قربانی کے جانور کا خصی ہونا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ خصی ہونے سے گوشت کی عمدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے''۔ [فتح الباری:۱۰/۷]

سوال حبیب اللہ بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ اگر قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اس میں عیب پڑ جائے تو اسے ذبح کیا جاسکتا ہے؟ یا اس کی جگہ کوئی صحیح وسالم جانور خریدنا ہوگا؟

جواب احادیث میں قربانی کے جانور کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول بیان ہوا ہے کہ اسے ذبح کرتے وقت ان عیوب کو دیکھتے تھے۔جو قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہیں،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خریدنے کے بعد ذبح کرنے سے پہلے قربانی کے جانور میں کوئی عیب پڑ جائے تو وہ قربانی کے قابل نہیں رہتا۔اسے تبدیل کرنا چاہیے۔یہ ایسے ہے جیسے قربانی کے جانور کو قبل از وقت ذبح کر دیا جائے۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نے عید سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر دیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ عام گوشت ہے،اس کے بدلے کوئی اور جانور ذبح کیا جائے۔ [صحیح بخاری،الاضاحی:۵۵۶۰]

خریدنے کے بعد عیب پڑنے کی صورت میں بعض علمائے کرام اس جانور کو قربانی کے طور پر ذبح کر دینے کا فتویٰ دیتے ہیں اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے قربانی کے لیے ایک دنبہ خریدا،لیکن ذبح سے پہلے اس کی چکی ایک بھیڑیا لے گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں وہی جانور ذبح کرنے کی اجازت فرمائی۔ [مسند امام احمد:۷۸/۳]

لیکن ایک تو یہ حدیث اس قابل نہیں کہ اسے بطور حجت پیش کیا جائے،کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی جابر جعفی ہے جو محدثین کے ہاں انتہائی مجروح اور نا قابلِ اعتبار ہے۔نیز اس کی سند میں ایک دوسرا راوی محمد بن قرظہ جو جابر جعفی کا استاد ہے کتب جرح میں اسے مجہول قرار دیا گیا ہے۔ [خلاصۃ تہذیب الکمال:ص۳۵۶]

دوسری بات یہ ہے کہ دنبے کی چکی کا نہ ہونا کوئی ایسا عیب نہیں ہے جو قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہو۔یہ ایسے ہے کہ اگر قربانی کے جانور کا دانت ٹوٹ جائے تو اسے قربانی کے طور ذبح کیا جاسکتا ہے۔حاصل یہ ہے کہ قربانی کا جانور نامزد کرنے کے بعد اگر اس میں عیب پڑ جائے تو اس کے بدلے دوسرا جانور ذبح کرنا چاہیے۔اگر قربانی کی استطاعت نہیں تو اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال صادق آباد سے عبدالحمید لکھتے ہیں کہ کیا عورت قربانی ذبح کرسکتی ہے،اس کے متعلق کوئی حدیث ہو تو ذکر کریں۔

جواب عورت کے متعلق قربانی ذبح کرنے کے بارے میں کوئی حکم امتناعی کتب حدیث میں مروی نہیں ہے نہ ہی کوئی کراہت منقول ہے بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواز ثابت کیا ہے۔حدیث میں ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی بکریاں چرایا کرتی تھی۔ہنگامی طور پر اس نے ایک تیز پتھر سے بکری ذبح کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ذبیحہ کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ [صحیح بخاری:حدیث نمبر ۵۵۰۵]

حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ اپنی بیٹیوں کو قربانی ذبح کرنا کا حکم دیا کرتے تھے۔(صحیح بخاری) لہٰذا عورت کے لیے قربانی کا جانور ذبح کرنے پر کوئی پابندی نہیں یہ مسئلہ لوگوں کے ہاں غلط مشہور ہو چکا ہے۔

سوال ایک خاتون بذریعہ ای میل سوال کرتی ہیں کہ اپنی قربانی کا جانور عورت خود ذبح کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب عورت کے متعلق قربانی کا جانور ذبح کرنے کے بارے میں کتب حدیث میں کوئی ممانعت مروی نہیں ہے۔اور نہ ہی کوئی کراہت منقول ہے۔ بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔جس کے الفاظ یہ ہیں: ''عورت کے ذبح کرنے کا بیان''۔

پھر اس کے جواز پر حدیث لائے ہیں کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی بکریاں چرایا کرتی تھیں۔ ہنگامی طور پر اس نے ایک تیز دھار پتھر سے بکری ذبح کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ذبیحہ کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔

[صحیح بخاری: الذبائح' ۵۵۰۵]

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنی بیٹیوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ [صحیح بخاری]

لہٰذا عورت کے لیے قربانی کا جانور ذبح کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ مسئلہ لوگوں کے ہاں غلط مشہور ہو چکا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

سوال کراچی سے عبدالمجید نے بذریعہ فون سوال کیا ہے کہ آپ نے عید نمبر اہلحدیث میں عورت کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود قربانی کر سکتی ہے۔اس سلسلہ میں آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے متعلق ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ بخاری کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن تلاش بسیار کے باوجود مجھے بخاری سے یہ روایت نہیں ملی۔ براہِ کرم نشاندہی کر دیں۔

جواب اس روایت کو امام بخاری نے معلق طور پر ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو(صحیح بخاری: الاضاحی' ۵۵۵۹ سے پہلے) اس معلق روایت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس روایت کو امام حاکم نے اپنی مستدرک میں سعید بن میتب کے طریق سے موصولاً بیان کیا ہے۔جس کے الفاظ یہ ہیں کہ: ''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اپنی بیٹیوں کو کہا کرتے تھے کہ اٹھو اور اپنی قربانیوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کرو''۔اس کی سند بھی صحیح ہے۔ [فتح الباری: ۱۰/ ۲۵]

علامہ عینی لکھتے ہیں'' کہ عورت اپنی قربانی کو خود ذبح کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اچھی طرح ذبح کر سکتی ہو اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔'' [عمدۃ القاری: ۱۴/ ۵۶۲]

سوال اسلام آباد سے محمد صدیق لکھتے ہیں کہ میت کی طرف سے قربانی دینے کی شرعی حیثیت واضح کریں۔

جواب زندہ کی طرف سے غائبانہ قربانی کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جیسا کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی بیویوں کی طرف سے گائے ذبح کی تھی۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۵۴۸]

میت کی طرف سے قربانی دینے کے متعلق مجھے کوئی صحیح اور صریح حدیث نہیں مل سکی۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ دو جانوروں کی قربانی دیتے تھے،ایک اپنی طرف سے دوسری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اور فرمایا کرتے تھے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ [جامع ترمذی]

لیکن یہ روایت ضعیف ہے کیوں کہ اس کی سند میں ایک شریک نامی راوی کثرت خطا اور سوء حفظ کے باعث ضعیف ہے،اس

کے علاوہ اس کے شیخ ابو الحسناء مجہول ہیں، ان دو علتوں کی وجہ سے یہ روایت قابل حجت نہیں، اگر کسی کو اس کی صحت پر اصرار ہو تو وصیت کرنے کی صورت میں میت کی طرف سے قربانی کی جا سکتی ہے، اس کے علاوہ دور کے استدلال و استنباط ہیں، جن کے متعلق ہمیں شرح صدر نہیں ہے۔

سوال سکھر سے محمد اکرم لکھتے ہیں کہ ان عیوب کی نشاندہی کریں جو قربانی کے جانور میں نہیں ہونے چاہئیں، نیز اگر جانور خریدنے کے بعد کوئی عیب پڑ جائے تو اس جانور کو ذبح کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب متعدد احادیث میں چند عیوب کی نشاندہی کی گئی ہے جو قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہیں ایک حدیث میں چار قسم کے جانوروں کی قربانی کو ناجائز کہا گیا ہے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① کانا (بھینگا) جس کا کانا پن نمایاں ہو۔

② بیمار جانور جس کی بیماری بالکل واضح ہو۔

③ لنگڑا جس کا لنگڑا پن ظاہر ہو۔

④ عمر رسیدہ جانور جس کی ہڈیوں میں گودا نہ رہا ہو۔ [مسند امام احمد: ۴/۳۰۰]

ایک روایت میں ہے کہ قربانی کا جانور خریدتے وقت آنکھ اور کان کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے پھر رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ مقابلہ، مدابرہ، شرقاء اور خرقاء نہ ہو۔ [مسند امام احمد: ۱/۱۰۵]

حدیث میں مذکور عیوب کی تشریح کچھ یوں ہے "مقابلہ" وہ جانور جس کے کان اوپر کی جانب سے کٹے ہوئے ہوں۔ "مدابرہ" وہ جانور جس کے کان نیچے کی جانب سے کٹے ہوئے ہوں۔ "شرقاء" وہ جانور جس کے کان لمبائی میں چیرے ہوئے ہوں۔ "خرقاء" وہ جانور جس کے کان میں گول سوراخ ہو۔

ان کے علاوہ "عوراء" یعنی وہ جانور جو بالکل اندھا ہو وہ بھی قربانی کے لائق نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہ تھا کہ ذبح کرتے وقت ان عیوب کو دیکھتے تھے جو قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خریدنے کے بعد ذبح کرنے سے پہلے قربانی کے جانور میں عیب پڑ جائے تو وہ قربانی کے قابل نہیں رہتا، اسے تبدیل کرنا چاہیے یہ ایسے ہے جیسے قربانی کے جانور کو وقت سے پہلے ذبح کر دیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نے عید سے پہلے ذبح کر دیا تھا رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: "کہ یہ عام گوشت ہے، اس کے بدلے کوئی دوسرا جانور ذبح کیا جائے۔" [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۵۰۷]

خریدنے کے بعد عیب پڑنے کی صورت میں بعض علما اسی جانور کو ذبح و قربانی کر دینے کا فتویٰ دیتے ہیں کیوں کہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے قربانی کے لیے ایک دنبہ خریدا لیکن ذبح سے پہلے اس کی چکی ایک بھیڑیا لے گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے وہی جانور ذبح کرنے کی اجازت فرمائی۔ [مسند امام احمد: ۳/۷۸]

اس کا جواب یہ ہے:

① یہ حدیث ضعیف ہے کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی جابر جعفی ہے محدثین کے ہاں یہ شخص انتہائی مجروح اور ناقابل اعتبار ہے نیز

اس سند میں محمد بن قرظہ ایک راوی ہے جو جابر جعفی کا استاد ہے۔ کتب جرح میں اسے مجہول قرار دیا گیا ہے۔ [خلاصۃ تہذیب الکمال:۳۵۶]

② یہ کوئی ایسا عیب نہیں ہے جو قربانی کے لیے رکاوٹ کا باعث ہو یعنی جانور کی چکی ہو یا نہ یا اس میں نقص پڑ جائے تو بھی قربانی ہو جاتی ہے جیسے قربانی کے جانور کا دانت ٹوٹ جائے تو بھی قربانی ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ ہے کہ جانور نامزد ہونے کے بعد اگر عیب پڑ جائے تو اس کے بدلے دوسرا جانور ذبح کرنا چاہیے۔

سوال ملک محمد یونس ایک اور سوال کرتے ہیں کہ قربانی کے جانور کی ہر چیز استعمال میں لائی جا سکتی ہے، قربانی دینے والا انہیں فروخت کیے بغیر کھال وغیرہ بھی اپنے مصرف میں لا سکتا ہے، اگر اس کے ناخن کسی دوا میں استعمال کیے جائیں تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ کیا ایسی دوا کو فروخت کیا جا سکتا ہے؟

جواب قربانی دینے والا لوجہ اللہ قربانی کا جانور ذبح کرتا ہے اس کے کسی حصہ کی خرید وفرخت جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر اس کی کھال وغیرہ غربا اور مساکین کو دے دی جائے تو وہ اسے فروخت کر سکتے ہیں، اس جانور کے ناخن اتار کر پھینک دیئے جاتے ہیں، اگر انہیں دوا میں استعمال کیا جائے تو شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ یہ دوا فی سبیل اللہ مفت دی جائے۔ چونکہ اس میں دیگر ادویات بھی شامل کی جاتی ہیں ان کا حساب لگا کر مناسب نفع سے اگر فروخت کر دی جائے تو اس میں بھی کوئی حرج والی بات نہیں ہے، قربانی کرنے والے کے علاوہ اگر کوئی دوسرا شخص ان ناخنوں کو بطور دوا استعمال کرتا ہے تو اسے کھلی اجازت ہے کہ اس دوا کی خرید وفروخت کر لے، البتہ قربانی کرنے والا اس سے احتیاط کرے، تقویٰ اور پرہیز گاری کا تقاضا یہی ہے۔ نیز حدیث میں ہے کہ جہاں شک پڑ جائے اسے چھوڑ دینے میں عافیت ہے، چونکہ اس میں دوا بنانے کی محنت اور دیگر ادویات بھی شامل ہیں لہٰذا احتیاط کے دائرہ میں رہتے ہوئے اسے فروخت کیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے عبداللطیف سوال کرتے ہیں کہ چرمہائے قربانی کا صحیح مصرف کیا ہے، کیا انہیں جہاد فنڈ میں دیا جا سکتا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سو اونٹ ذبح کیا تھا اور ان کی کھالوں کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ ان کی جلیں اور کھالیں صدقہ کر دی جائیں۔ [صحیح بخاری: کتاب الحج]

اس کی مزید وضاحت صحیح مسلم میں بایں الفاظ وارد ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ قربانی کے اونٹوں کی دیکھ بھال کریں، نیز ان کا گوشت، کھالیں اور جلیں مساکین میں تقسیم کر دیں اور قصاب کو بطور اجرت ان کھالوں سے کچھ نہ دیں''۔ [صحیح مسلم:۱/۴۲۴]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کھالوں کا بہترین مصرف اپنے علاقے کے غربا اور مساکین ہیں، دیگر مصارف زکوٰۃ کے بجائے انہی کو دی جائیں، دینی مدارس کے طلبا پر بھی خرچ کی جا سکتی ہیں۔ مقامی لائبریریوں کی توسیع یا مساجد کی تعمیر وترقی میں انہیں خرچ نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی جہاد فنڈ میں دینی چاہئیں۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں کھالوں اور فطرانہ وغیرہ کو جہاد فنڈ میں نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ اپنی گرہ سے جہاد فنڈ کو مضبوط کرنا چاہیے اس مقام پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مجلّہ الدعوہ نے ایک دفعہ میرے نام سے ''قربانی کے احکام ایک نظر میں'' شائع کیے تھے جس میں لکھا تھا کہ قربانی کی کھال یا اس کی قیمت فقرا مساکین، طالبانِ دین

اور مجاہدین کو دینی چاہیے۔ میرے الفاظ میں ''طالبانِ دین اور مجاہدین'' کا اضافہ کر کے خیانت کی گئی ہے۔ میں نے صرف یہ لکھا تھا کہ قربانی کی کھال یا اس کی قیمت فقرا اور مساکین کو دینی چاہیے۔ [ملاحظہ ہو احکام صیام و مسائل عیدین و آداب قربانی: ۱۱۷]

قربانی کی کھال سے قربانی کرنے والا خود بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اس کا مصلیٰ وغیرہ بنا کر اپنے استعمال میں لا سکتا ہے، اسے فروخت کر کے اس کی قیمت اپنے ذاتی استعمال میں درست نہیں ہے اور نہ ہی اس کھال کو اجرت کے عوض دینا چاہیے۔ بلکہ قصاب کو مزدوری اپنی گرہ سے دینی چاہیے جیسا کہ حدیث بالا سے واضح ہے۔

سوال ایک آدمی حج کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس صرف پچاس ہزار روپے تھے جو فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں۔ چند مخیّر حضرات نے زکوٰۃ سے اس کی بقیہ رقم پوری کر دی، اس شخص کی حج کے لیے دی ہوئی درخواست منظور ہو گئی لیکن وہ حج پر جانے سے پہلے فوت ہو گیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ حج کے لیے بینک میں جمع شدہ رقم کی کیا حیثیت ہو گی، کیا وہ تمام رقم زکوٰۃ شمار ہو گی یا مرحوم کا ترکہ خیال کیا جائے گا یا صرف وہی رقم زکوٰۃ شمار ہو گی جو مخیّر حضرات نے زکوٰۃ سے دی تھی۔ قرآن و حدیث کے مطابق اس کا جواب دیں تاکہ ہماری الجھن دور ہو جائے (حاجی نور اللہ...... گوجرانوالہ)

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں مذکورہ آدمی کے پاس جو رقم پہلے سے موجود تھی اور جو مخیّر حضرات نے مال زکوٰۃ سے اسے دی، سب اس کی ذاتی شمار ہو گی، اور اس کے فوت ہونے کے بعد اس کے ورثاء اس ترکہ کے حق دار ہیں، اس میں زکوٰۃ اور غیر زکوٰۃ کی تمیز نہیں ہو گی۔ کیوں کہ صدقہ و خیرات جب اپنے مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے احکام بدل جاتے ہیں اور لینے والے کے لیے ذاتی ملکیت بن جاتی ہے، پھر وہ اس میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ گوشت لایا گیا، دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ یہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا پر صدقہ کیا گیا تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق فرمایا: ''یہ گوشت بریرہ کے لیے صدقہ تھا اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔'' [صحیح بخاری: الھبہ، ۲۵۷۷]

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے وہ گوشت ہدیہ کے طور پر آپ کے گھر بھیجا تھا اس لیے آپ نے اسے اپنے لیے ہدیہ قرار دیا، اسی طرح ایک واقعہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی مروی ہے، آپ ﷺ نے اسے قبول کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''یہ گوشت اپنے مقام کو پہنچ چکا ہے۔'' [صحیح بخاری: الھبہ، ۲۵۷۹]

اس پر امام بخاری نے یوں باب قائم کیا ہے: ''جب صدقہ کی حیثیت تبدیل ہو جائے''۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''صدقہ جب فقیر کے پاس پہنچ جاتا ہے تو اس میں اس کے لیے تصرف کرنا جائز ہے یعنی اسے فروخت کرنا یا کسی دوسرے کو ھبہ کرنا جائز ہے۔'' [فتح الباری: ج ۳، ص ۴۴۹]

مذکورہ سوال میں جو رقم مخیّر حضرات نے بطور زکوٰۃ اسے دی تھی اب وہ اس کی ملکیت شمار ہو گی، اس کے مرنے کے بعد اس تمام رقم میں وراثت کا قانون جاری ہو گا۔ [واللہ اعلم]

سوال قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کسی بہتر جانور سے تبادلہ کرنا یا اسے فروخت کر کے اس سے بہتر جانور خریدنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ (ایک سائلہ خریداری نمبر ۳۴۸۰)

جواب اس مسئلہ کے متعلق متقدمین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک بہتر جانور سے تبادلہ کیا جا سکتا ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قربانی کے جانور کو وقف کی طرح خیال کرتے ہوئے اسے فروخت کر کے یا کسی اور طریقہ سے تبادلہ کو جائز خیال نہیں کرتے جیسا کہ فقہ القدیم میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

[مغنی ابن قدامہ: ج ۱۳' ص ۳۵۳]

ہمارے ہاں بعض علما اسے ناجائز کہتے ہیں، کچھ تو اس قدر انتہا پسند ہیں کہ قربانی کا جانور خریدنے کے بعد کوئی عیب پڑ جانے کی صورت میں بھی اسے تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دیتے بلکہ اسے ذبح کر دینے کی تلقین کرتے ہیں حالانکہ جس حدیث ابی سعید رضی اللہ عنہ (مسند امام احمد: ج ۳' ص ۳۲) سے یہ مسئلہ کشید کیا ہے وہ سخت ضعیف ہے کیوں کہ اس میں ایک راوی جابر جعفی انتہائی کمزور اور دوسرا اس کا شیخ محمد بن قرظہ مجہول ہے (سبل السلام: ج ۴' ص ۹۴) اس بنا پر ہم اس مسئلہ کو ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

جو حضرات قربانی کے جانور کو فروخت کر کے بہتر جانور خریدنے یا کسی بہتر سے تبادلہ کے قائل ہیں، ان کے دلائل یہ ہیں۔

حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں (قربانی کی) بکری خریدنے کے لیے ایک دینار دیا، انہوں نے ایک دینار سے دو بکریاں خریدیں، ان میں سے ایک کو دینار سے فروخت کر دیا، پھر جب ایک دینار اور بکری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے خرید وفروخت میں برکت کی دعا فرمائی۔ [صحیح بخاری: المناقب' ۳۶۴۲]

بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قربانی کا جانور خریدنے کے لیے بھیجا تھا لیکن راوی نے بعض اوقات قربانی کے بجائے صرف بکری خریدنے کا ذکر کیا ہے۔ [مسند امام احمد: ج ۴' ص ۳۷۵]

اس روایت کو ابو داؤد: البیوع' 3384 ترمذی: البیوع' 1258 اور ابن ماجہ: الصدقات' 2402 میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قربانی کی بکری خریدنے کا حکم دیا تھا۔ سفیان راوی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ وہ آپ کے لیے بکری خریدے گویا وہ قربانی ہے۔ [صحیح بخاری: المناقب' ۳۶۴۳]

اس موقف کی تائید میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی روایت بھی پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی قربانی خریدنے کے لیے ایک دینار دیا، انہوں نے اس کے عوض ایک مینڈھا خریدا، واپسی پر راستہ میں اسے دو دینار کے عوض فروخت کر دیا پھر منڈی سے ایک دینار کے عوض قربانی کا جانور خرید کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قربانی کا جانور اور دینار، دونوں پیش کر دیئے، آپ نے اس دینار کو بھی بطور صدقہ خرچ کر دیا اور حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کے لیے اس کی تجارت میں خیر و برکت کی دعا فرمائی۔

[ابوداؤد: البیوع' ۳۳۸۶]

بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ قربانی ذبح کر دو اور منافع کے دینار کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ [ترمذی: البیوع' ۱۲۵۷]

اس مقام پر یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں ایک راوی مجہول ہے جبکہ ترمذی کی روایت میں انقطاع ہے جیسا کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بیان کیا ہے تاہم اس قسم کی روایت کو بطور تائید پیش کیا جا سکتا ہے۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

تالیف میں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''کہ جو شخص قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اسے تبدیل کر لیتا ہے'' پھر اس کے تحت ایک روایت لائے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک شخص کے بارے میں سوال ہوا جو قربانی کا جانور خریدتا ہے پھر اسے فروخت کر کے اس سے موٹا تازہ خریدنا ہے تو آپ نے رخصت کا ذکر فرمایا اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد: ۴/۲۱) ان روایات کے پیش نظر قربانی کا جانور فروخت کر کے اس سے بہتر خریدا جاسکتا ہے اور کسی بہتر جانور سے اس کا تبادلہ کیا جاسکتا ہے۔

اور جو حضرات قربانی کا جانور متعین کرنے کے بعد اسے فروخت یا تبادلہ کو ناجائز کہتے ہیں ان کا موقف ہے کہ قربانی چونکہ وقف کی طرح ہے اس لیے اس میں خرید و فروخت یا تبادلہ جیسا تصرف درست نہیں ہے۔ چنانچہ حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ھدی کے طور پر ایک عمدہ اونٹ کا انتخاب کیا، بعد میں کسی نے اس کی تین سو دینار قیمت لگا دی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور بتایا کہ میں ایک عمدہ اونٹ ھدی کے طور پر مکہ مکرمہ بھیجنے کا پروگرام بنا چکا ہوں، اب مجھے اس کا تین سو دینار ملتا ہے کیا میں اسے فروخت کر کے مزید اونٹ خرید سکتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، تم اسی کو ذبح کرو۔'' [ابوداود: المناسک]

اس روایت کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بیان کیا ہے لیکن اس میں عمدہ اونٹ کے بجائے بختی اونٹ کا ذکر ہے جس کی گردن ذرا لمبی ہوتی ہے اور وہ بھی بہترین اونٹوں میں شمار ہوتا ہے۔ [مسند امام احمد: ج ۴ ص ۱۴۵]

منتقی الاخبار میں اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا گیا ہے ''کہ ھدی کو متعین کرنے کے بعد اسے بدلنا جائز نہیں ہے'' چنانچہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ھدی کی بیع درست نہیں ہے خواہ اس جیسی یا اس سے بہتر کا تبادلہ مقصود ہو۔'' [نیل الاوطار: ج ۵ ص ۱۸۵]

چنانچہ قربانی بھی ھدی کی طرح ہے اس بنا پر قربانی کا جانور بھی فروخت یا تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ امام بخاری کی بیان کردہ حدیث اس مسئلہ پر واضح نہیں ہے۔ نیز محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر بھی پوری نہیں اترتی کیوں کہ اس میں ایک راوی شبیب بن غرقدہ کہتے ہیں کہ میں نے حی یعنی قبیلہ سے سنا جو عروہ بارقی سے بیان کرتا ہے، اس قبیلہ کے افراد کی تعیین نہیں ہو سکی، لہٰذا اس ''جہالت'' کی وجہ سے یہ حدیث قابل استدلال نہیں ہے چنانچہ چند ایک ائمہ حدیث نے اس حدیث پر اعتراضات کیے ہیں جن میں علامہ خطابی اور امام بیہقی سرفہرست ہیں۔ [فتح الباری: ج ۶ ص ۴۷۷]

جہاں تک بخاری کی حدیث کے ضعف کا مسئلہ ہے اس کے متعلق ہماری گزارش ہے کہ محدثین کے فیصلے کے مطابق جس راوی کو امام بخاری اپنی صحیح میں لائے ہیں وہ جرح و تعدیل کا پل عبور کر چکا ہے یعنی امام بخاری اس کے متعلق خوب چھان پھٹک کرنے کے بعد اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں، لہٰذا اس حدیث پر بلاوجہ اعتراض درست نہیں ہے۔ ہاں علامہ خطابی اور امام بیہقی نے اس حدیث کو غیر متصل قرار دیا ہے، اس کا جواب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ جب سماع کی تصریح موجود ہے تو اسے مرسل یا منقطع کیونکر کہا جاسکتا ہے بلکہ یہ روایت ایسی متصل ہے جس کی سند میں ایک مبہم راوی ہے پھر اس ''مبہم حی'' کے متعلق لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک جماعت سے سنا ہے کہ جس کے کم از کم تین افراد ہیں۔ [فتح الباری: ج ۶ ص ۴۷۷]

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شرط کے عین مطابق ہے کیوں کہ عام طور پر ایک قبیلہ کا جھوٹ پر

اتفاق کر لینا ناممکن ہے۔ [فتح الباری: ج۶ ص۷۷۵]

پھر اس حدیث کے متابعات وشواھد بھی ملتے ہیں جو اس کی تائید کرتے ہیں جن میں ''حی'' کے بجائے ابولبید لمازہ بن زیاد، حضرت عروہ بارقی سے نقل کرتے ہیں۔ [مسند امام احمد: ج۴ ص۳۷۶]

امام منذری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں ''کہ امام ترمذی نے بکری خریدنے والی اس روایت کو ابولبید لمازہ بن زیاد سے بیان کیا ہے جو حضرت عروہ بارقی سے بیان کرتے ہیں اس طریق سے یہ روایت حسن قرار پاتی ہے۔'' [مختصر ابی داؤد: ج۵ ص۵۱]

اس متابعت کے علاوہ حضرت حکیم بن حزام کی حدیث کو بطور شاھد پیش کیا جاسکتا ہے الغرض یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں کسی طرف سے ضعف کا شائبہ تک نہیں ہے، البتہ مانعین کی طرف سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو حدیث پیش کی گئی ہے اس کے متعلق ہماری گزارشات حسب ذیل ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ناقابل حجت ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں ''کہ محدث ابن خزیمہ نے اس حدیث کو اپنی صحیح میں نقل کیا ہے لیکن اس سے حجت لینے میں توقف کیا ہے۔'' [التہذیب: ج۲ ص۱۲۱]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس روایت میں ایک راوی جہم بن جارود ہے جو حضرت سالم بن عبداللہ سے بیان کرتا ہے اس کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ اس جہم کا حضرت سالم سے سماع معروف نہیں ہے۔'' [تاریخ کبیر: ص۲۳۰ ج۲ القسم الثانی]

اس کے علاوہ جہم بن جارود بھی غیر معروف راوی ہے چنانچہ اس کے متعلق امام ذھبی فرماتے ہیں: ''کہ یہ بڑے بڑے تابعین سے روایت کرتا ہے لیکن خود مجہول ہے۔'' [دیوان الضعفاء: ص۴۷ رقم ۷۹۳]

نیز فرماتے ہیں: ''کہ اس راوی میں جہالت ہے، خالد بن ابی یزید کے علاوہ اس سے اور کوئی راوی بیان نہیں کرتا۔''

[میزان الاعتدال: ج۳ ص۴۲۶]

محدثین کے ہاں کسی راوی کی جہالت صرف اسی صورت میں دور ہوسکتی ہے کہ کم از کم اس سے بیان کرنے والے دو ثقہ راوی ہوں۔ امام ذھبی نے مذکورہ بات کہہ کر اس بات کی توثیق کی ہے کہ اس کی جہالت بدستور قائم ہے کیوں کہ اس سے صرف ایک راوی بیان کرتا ہے اور مجہول کی روایت ناقابل قبول ہوتی ہے، بلاشبہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس راوی کو چھٹے درجے کا مقبول راوی بنادیا ہے۔ [التقریب: ج۱ ص۱۳۵]

لیکن اس لفظ سے اکثر اہل علم دھوکہ کھاجاتے ہیں حالانکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے راوی کی مرویات متابعت کے بغیر قبول نہیں ہوتیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے مقدمہ میں رواۃ کی درجہ بندی کرتے ہوئے وضاحت کی ہے۔ ''چھٹے درجے سے مراد وہ راوی ہیں جن سے بہت کم احادیث مروی ہیں لیکن ان میں کوئی ایسا سقم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ان کی مرویات کو رد کر دیا جائے ایسے حضرات کے متعلق ''مقبول'' کا لفظ استعمال ہوگا جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر متابعت ہو تو مقبول بصورت دیگر ان کی مرویات کمزور رہوں گی''۔ [مقدمہ: ص۵]

زیر بحث حدیث کی متابعت نہیں مل سکی اور نہ ہی اس کی تائید میں کوئی شاھد پیش کیا جاسکتا ہے، امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس

حدیث کے متعلق لکھتے ہیں۔''

''محدث ابن قطان نے اس حدیث کو بایں وجہ موصول قرار دیا ہے کہ اس کے راوی جہم بن جارود کے حالات کے متعلق کوئی پتہ نہیں چل سکا اور اس سے بیان کرنے والا بھی ابوعبدالرحیم خالد بن ابی یزید نامی ایک راوی ہے۔'' [التھذیب السنن: ج۲،ص۲۹۲]

محدث ابن خزیمہ نے بھی اس حدیث کے متعلق اظہار تردد فرمایا ہے فرماتے ہیں: ''کہ جہم بن جارود ایک ایسا راوی ہے کہ غیر کی وجہ سے اس کی بیان کردہ روایت کو بطور دلیل پیش کیا جاسکتا ہے۔'' [صحیح ابن خزیمہ: ج۴،ص۲۹۱]

صحیح ابن خزیمہ پر تعلیق ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی نے لکھی ہے اور محدث البانی رحمۃ اللہ علیہ نے نظر ثانی کے فرائض سرانجام دیئے ہیں، صاحب تعلیق نے اس کی سند کے متعلق لکھا ہے ''کہ ضعیف ہے اگرچہ حافظ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔''

[مسند امام احمد: ج۹،ص۱۴۴]

تاہم مذکورہ بالا حقائق کے پیش نظر ہمیں اس کی صحت تسلیم کرنے میں تردد ہے اس کی صحت تسلیم کرنے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ ھدی کا جانور اگر متعین ہو جائے تو اسے تبدیل کرنا درست نہیں لیکن یہ پابندی قربانی کے جانور پر عائد کرنا کسی صورت میں درست نہیں ہے مقصد کے اشتراک سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ان دونوں کے احکام بھی ایک جیسے ہوں، ہمارے نزدیک ھدی اور قربانی کے جانور میں درج ذیل کئی ایک وجوہ سے فرق ہے۔

① ھدی کے لیے جگہ کا تعین ہے یعنی وہ جانور جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے بیت اللہ کی طرف بطور ھدیہ روانہ کیا جائے جبکہ قربانی کا جانور ان مکانی حدود و قیود کا پابند نہیں ہے۔

② ھدی کے لیے اشعار اور تقلید ضروری ہے جبکہ قربانی کے جانور میں یہ پابندی نہیں ہے۔

③ ھدی صرف ایک آدمی کی طرف سے ہو سکتی ہے جبکہ قربانی میں تمام اہل خانہ شریک ہوتے ہیں خواہ ان کی تعداد کتنی ہو۔

④ بعض حالات میں انسان ھدی کا گوشت خود نہیں کھا سکتا اور نہ ہی اپنے رفقا کو کھلا سکتا ہے جبکہ قربانی کا جانور خود بھی کھایا جاسکتا ہے اور دوسروں کو کھلانے میں بھی چنداں حرج نہیں ہے۔

⑤ ھدی کے اونٹ میں سات شریک ہو سکتے ہیں جبکہ قربانی کے اونٹ میں دس تک شراکت جائز ہے۔

⑥ ھدی کے لیے وقت کی کوئی پابندی نہیں جبکہ قربانی کے لیے مخصوص ایام ہیں۔

⑦ قربانی کرنے والے کے لیے حکم ہے کہ وہ ذوالحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد ذبح کے وقت تک اپنی حجامت وغیرہ نہ بنائے جبکہ بعض حالات میں ھدی بھیجنے والے پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

⑧ علامہ ابن حزم کے نزدیک ھدی کا جانور عیوب سے پاک ہونا ضروری نہیں جبکہ قربانی کے جانور میں عیوب کا ہونا جائز نہیں ہے۔

⑨ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ھ میں ھدی کے جانور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ روانہ کیے جبکہ مدینہ میں آپ نے قربانی بھی دی، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔

⑩ ھدی کا جانور تبدیل کرنا درست نہیں جبکہ قربانی میں ایسا کیا جا سکتا ہے۔[تلک عشرة کاملة]

محدثین کرام نے کتب حدیث میں ھدی کے متعلق اس طرح کے عنوانات قائم کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ھدی کا جانور تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔(منتقی الاخبار) لیکن کسی محدث نے قربانی کے متعلق اس کا باب قائم نہیں کیا جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے احکام میں بہت فرق ہے اور ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ حدیث پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک عمدہ بختی اونٹ خرید اجب اس کی تین سو دینار قیمت لگی تو آپ نے اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کے عوض ایک عام اونٹ خریدنے کا پروگرام بنایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع فرمایا کہ وہ عمدہ اونٹ اللہ کی راہ میں ذبح کرو، بہترین اونٹ کے بدلے عام اونٹ ھدی کے لیے لینا درست نہیں چنانچہ محدث ابن خزیمہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے"۔زیادہ قیمت کی عمدہ ھدی دینے کا بیان"۔

یہ معنی کرنے سے مذکورہ حدیث مانعین کے لیے دلیل نہیں بن سکتی مختصر یہ ہے کہ قربانی کے تبادلہ کی چار صورتیں ممکن ہیں۔

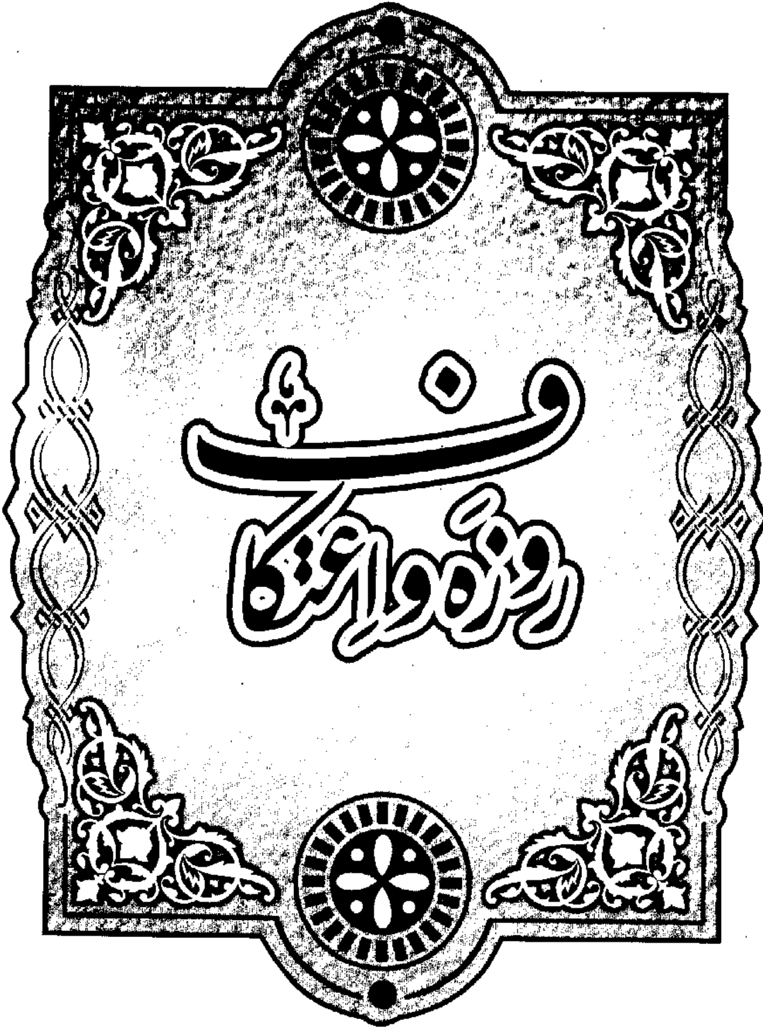
① صاحب حیثیت وہ جانور بھی ذبح کرے جو اس نے پہلے سے خرید کیا ہے اور بہترین عمدہ جانور اپنی گرہ سے بھی خرید کر ذبح کرے۔

② اسے فروخت کر کے اس میں اپنی طرف سے کچھ رقم ملا کر بہترین جانور خرید کر ذبح کر دیا جائے۔

③ عدم استطاعت کی صورت میں خریدے ہوئے جانور کو ہی ذبح کر دے۔

④ یہ جائز نہیں ہے کہ اسے بیچ کر کچھ رقم پس انداز کرے اور اس سے کم قیمت کے عوض کوئی معمولی جانور خرید کر ذبح کرے، اس قسم کی سودے بازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ [ھذا ماعندی واللہ اعلم بالصواب]




روزہ واعتکاف

روزہ و اعتکاف

سوال احمد آباد سے عبدالرحمٰن دریافت کرتے ہیں کہ روزے کے لیے نیت کرنے سے کیا مراد ہے؟ کیا اس نیت کے لیے کوئی مخصوص الفاظ حدیث سے ثابت ہیں؟

جواب نیت دل کا فعل ہے۔ رمضان المبارک کے روزوں کے لیے ہر رات طلوع فجر سے پہلے پہلے نیت کرنا ضروری ہے، اس نیت سے ایک مسلمان اپنے نفس کو یہ بات بتلاتا ہے کہ تجھے کل روزہ رکھنا ہے، بشرطیکہ کوئی شرعی عذر حائل نہ ہو اس نیت کی بنا پر وہ سحری کھانے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے اور اس نیت کے لیے کوئی مخصوص الفاظ نہیں جن کا ادا کرنا ضروری ہو کیونکہ اس کا اصل مقام دل ہے، نیز اس نیت کو دن بھر بھی قائم رکھنا ضروری ہے کہ روزہ دار نہ تو اپنے روزے کو مقررہ وقت سے پہلے افطار کرے گا اور نہ ہی اس روزے کو خراب کرے گا، حدیث میں ہے ''جس نے طلوع فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں ہے۔''

[صحیح ابن خزیمہ: ج۳' ص۲۱۲]

واضح رہے کہ طلوع فجر سے پہلے نیت کرنے کی پابندی صرف فرض روزے کے لیے ہے نفلی روزے کے لیے موقع پر بھی نیت کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرماتے: ''کہ تمہارے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ ہے اگر جواب نفی میں ہوتا تو آپ فرماتے کہ میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔'' [جامع ترمذی]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابوطلحہ، ابوہریرہ، ابن عباس اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہم کے فعل کا بھی حوالہ دیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں کے لیے طلوع فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری ہے۔ البتہ نفلی روزوں کے لیے یہ پابندی نہیں ہے۔

سوال میاں چنوں سے حاجی عبدالواحد سوال کرتے ہیں کہ رمضان کے کیلنڈروں میں روزہ رکھنے کی دعا ''وَبِصَوْمِ غَدٍ نَّوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ'' ہوتی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔؟

جواب فرض روزہ کے لیے طلوع فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری ہے، حدیث میں ہے ''کہ جو طلوع فجر سے پہلے روزہ رکھنے کی نیت نہیں کرتا وہ روزہ نہ رکھے۔'' [بخاری: الصوم' ۲۳۳۵]

بعض روایات میں ہے کہ اگر نیت کے بغیر روزہ رکھ لیتا ہے تو اس کا روزہ نہیں ہے، نیت دل کا فعل ہے، اس کے لیے کوئی مخصوص الفاظ نہیں ہیں، اس بنا پر نیت کی دعا ایجاد بندہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس خود ساختہ دعا کے بنانے والے کی جہالت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ دعا کا معنی یہ ہے کہ میں کل کے روزے کی نیت کر رہا ہوں جبکہ روزہ آج کا رکھا جا رہا ہے۔ پھر یہ نیت ہر روزہ کے لیے انفرادی ہونی چاہیے۔ چاند نظر آنے کے بعد تمام روزوں کی اجتماعی نیت بھی صحیح نہیں ہے۔ نفلی روزہ کے لیے بھی نیت ضروری ہے لیکن اس کے لیے طلوع فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری نہیں بلکہ جب بھی روزہ رکھنے کا پروگرام ہو اسی وقت نیت کی جا سکتی ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال پتوکی سے بشیر احمد سوال کرتے ہیں کہ اگر کسی کو غسل کرنے کی ضرورت ہو اور وقت تھوڑا ہونے کی وجہ سے نہائے بغیر

سحری کرے تو ایسی حالت میں روزہ صحیح ہوگا یا نہیں؟

جواب جنابت کی حالت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بحالت جنابت روزہ رکھ لیتے تھے۔ [صحیح مسلم: کتاب الصوم]

اگرچہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا فتویٰ تھا کہ جنبی آدمی غسل کیے بغیر روزہ نہ رکھے۔ لیکن ان کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ کا عمل آیا تو انہوں نے فوراً اپنے فتویٰ سے رجوع کر لیا۔ [صحیح مسلم: کتاب الصوم]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنبی ہوتے پھر آپ نہائے بغیر روزہ رکھ لیتے، سحری کھانے کے بعد غسل کر کے نماز فجر ادا کرتے۔ [صحیح مسلم]

اسی طرح احتلام سے بھی روزہ خراب نہیں ہوتا۔ اذان فجر سے قبل صحبت کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ہاں اگر اذان کے بعد ہمبستری کرتا رہا تو پھر روزہ ٹوٹ جائے گا اسے کفارہ بھی دینا ہوگا اور اس روزہ کی قضا بھی ضروری ہے۔

سوال لاہور سے محمد اکرم لکھتے ہیں کہ بعض اسلامی کتابوں میں روزہ رکھنے کی نیت لکھی ہوئی ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب فرض روزہ کے لیے طلوع فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو طلوع فجر سے پہلے روزہ رکھنے کی نیت نہیں کرتا وہ روزہ نہ رکھے۔ [سنن نسائی: کتاب الصوم]

بعض روایات میں ہے کہ اگر نیت کے بغیر روزہ رکھ لیتا ہے تو اس کا روزہ نہیں ہے، لیکن نیت دل کا فعل ہے۔ اس کے لیے کوئی مخصوص الفاظ نہیں ہیں جیسا کہ بعض کتابوں میں لکھا ہوتا ہے۔ زبان سے نماز یا روزہ کی نیت کرنا بدعت ہے۔ جس کا حدیث سے ثبوت نہیں ملتا۔ صرف اللہ سے ثواب لینے کے لیے دل سے عزم کر لینا ہی نیت ہے۔ پھر یہ نیت ہر روزہ کے لیے انفرادی ہونی چاہیے۔ چاند نظر آنے کے بعد سارے رمضان کے روزوں کی اجتماعی نیت بھی صحیح نہیں ہے۔ نفل روزہ کے لیے بھی نیت ضروری ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کے لیے طلوع فجر سے پہلے نیت کی جائے بلکہ جب بھی روزہ رکھنے کا پروگرام ہو اسی وقت نیت کی جا سکتی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھ سے کسی کھانے کی چیز کے متعلق دریافت فرماتے، اگر موجود ہوتی تو تناول فرما لیتے اگر موجود نہ ہوتی تو فرماتے: "کہ میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔" [سنن ابوداؤد]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نفلی روزہ کے لیے طلوع فجر سے پہلے نیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ اس کے بعد بھی نیت کی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ساہیوال سے عبدالقدوس لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر غروب آفتاب کے بعد احتیاطاً دو، تین، منٹ روزہ افطار کرنے میں انتظار کیا جاتا ہے اس "احتیاط" کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب حدیث کے مطابق افطاری کا وقت غروب آفتاب ہے، اگر کسی شرعی عذر کی بنا پر کبھی کبھار ایک دو منٹ تاخیر ہو جائے تو چنداں حرج نہیں، البتہ احتیاط کے پیش نظر ہمیشہ تاخیر کرنا مکروہ بلکہ ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "جب ادھر رات آ جائے اور ادھر دن چلا جائے اور سورج بھی غروب ہو جائے تو روزے دار کو روزہ افطار کر دینا چاہیے۔" [صحیح مسلم: الصیام ۱۱۰۰]

حضرت ابوعطیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت مسروق ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو ایسے ہیں کہ ایک جلدی روزہ افطار کرتے ہیں اور جلدی نماز پڑھتے ہیں، جبکہ دوسرا تاخیر سے روزہ کھولتے ہیں اور نماز بھی دیر سے پڑھتے ہیں (ان میں کون سنت کے مطابق عمل کرتا ہے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا کہ جلدی کرنے والا کون ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح عمل کرتے تھے، یعنی ان کا عمل سنت کے عین مطابق ہے، دوسرے صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہیں۔ [صحیح مسلم: الصیام ۱۰۹۹]

افطاری جلدی کرنے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کہ لوگ اس وقت تک خیر و برکت میں رہیں گے جب تک وہ افطاری کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔'' [صحیح بخاری: الصوم ۱۹۵۷]

ابن حبان کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غروب آفتاب کے بعد احتیاط کا بہانہ بنا کر دیر کرنا یہود و نصاریٰ کا شیوہ ہے۔ چنانچہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ یہود و نصاریٰ تاخیر سے افطار کرتے ہیں، تم روزہ جلد افطار کیا کرو۔'' [صحیح ابن حبان: ۶/۲۰۹]

بلکہ ایک روایت میں مزید وضاحت ہے کہ میری امت کے لوگ اس وقت تک میرے طریقے پر گامزن رہیں گے جب تک وہ روزہ افطار کرنے کے لیے ستاروں کے چمکنے کا انتظار نہیں کریں گے۔ [بیہقی: ۴/۲۳۸]

احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا ایک امتیازی وصف بایں الفاظ بیان ہوا ہے کہ وہ افطاری جلدی کرتے اور سحری دیر سے تناول فرماتے تھے۔ [جامع ترمذی: کتاب الصوم]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روزہ کے متعلق افطار کا عمل اس قدر جلدی ہوتا کہ آپ دوسروں کے احتیاطی رویہ کو مسترد فرما دیتے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ماہِ رمضان میں سفر کر رہے تھے، جب سورج غروب ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ سواری سے اتر کر ستو تیار کرو'' عرض کیا گیا کہ ابھی تو دن کی روشنی نظر آرہی ہے، ذرا تاخیر کر لی جائے تو بہتر ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ سواری سے اتر کر ستو تیار کرو'' چنانچہ آپ کے لیے ستو تیار کیے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نوش فرمایا، اس کے بعد وہی الفاظ استعمال کیے جو پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ [صحیح مسلم: الصیام ۱۱۰۱]

ان احادیث کے پیش نظر ہمیں چاہیے کہ جب سورج غروب ہونے کا اطمینان ہو جائے تو روزہ افطار کر دینا چاہیے۔ احتیاط کے پیش نظر دیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسے یہود و نصاریٰ کی علامت بتایا گیا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال جھنگ سے اللہ دتہ دریافت کرتے ہیں کہ مندرجہ ذیل حدیث کا حوالہ درکار ہے:

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بادل کی وجہ سے غروب آفتاب سے پہلے ہی روزہ افطار کیا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم عید کے بعد اس روزہ کی قضا دیں گے۔''

جواب مطلع ابر آلود ہونے کی وجہ سے غروب آفتاب سے قبل روزہ افطار کرنے کا ذکر مندرجہ ذیل حدیث میں ہے:

''حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایک دن جبکہ بادل چھائے

ہوئے تھے ہم نے روزہ افطار کیا پھر سورج نکل آیا۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصوم]

حدیث کے الفاظ اسی قدر ہیں اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور عید کے بعد قضا دینے کا ذکر خود ساختہ ہے۔ اس طرح روزہ افطار کر لینے کے بعد اس کی قضا دینے کے متعلق علما کا اختلاف ہے، مذکورہ بالا روایت کا کوئی راوی ایک دوسرے راوی سے پوچھتا ہے کہ کیا انہیں قضا دینے کا حکم دیا گیا تھا تو اس نے جواب دیا کہ قضا دینا تو ضروری ہے۔ قضا دینے کے متعلق یہ فیصلہ ان کا اپنا ذاتی رجحان ہے حدیث کا حصہ نہیں ہے۔ چنانچہ محدث ابن خزیمہ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''حدیث میں یہ بات نہیں ہے کہ انہیں قضا دینے کا حکم دیا گیا تھا بلکہ یہ ہشام راوی کا اپنا قول ہے۔ میرے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے کہ ایسی صورتِ حال کے پیش نظر انہیں قضا دینا پڑے گی جب انہوں نے افطار کیا تو ان کے یقین کے مطابق سورج غروب ہو چکا تھا اگر انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ سورج غروب نہیں ہوا تھا تو اس صورت حال کے متعلق ہمارے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان مشعل راہ ہے کہ ہم قضا نہیں دیں گے۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے''۔ [صحیح ابن خزیمہ: ۳/۲۳۹]

اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس کے برعکس روایات بھی ملتی ہیں لیکن وہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں تاہم ہمارے نزدیک اس قسم کے روزہ کی قضا ضروری نہیں ہے کیونکہ اس میں انسان کے ارادہ اور اختیار کو دخل نہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے عطاء اللہ خاں دریافت کرتے ہیں کہ میری بیٹی عورتوں کو نماز تراویح پڑھاتی ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کا جماعت کرانا صحیح نہیں ہے اس کے متعلق ہماری رہنمائی فرمائیں۔

جواب امت کے اکثر علمائے سلف اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کا جماعت کرانا صحیح ہے اگرچہ کچھ حضرات نے اس موقف سے اختلاف کیا ہے تاہم عورت کا جماعت کرانا احادیث سے ثابت ہے محدثین کرام نے اپنی کتب حدیث میں اس کے متعلق باقاعدہ عنوان بھی قائم کیے ہیں۔ چنانچہ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے ''باب امامۃ النساء'' عورتوں کی امامت کا بیان۔ پھر انہوں نے شہیدہ فی سبیل اللہ ام ورقہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حکم دیا تھا ''کہ وہ اپنے اہل خانہ کی نماز باجماعت کے لیے امامت کے فرائض سرانجام دے۔''
[سنن ابی داؤد: کتاب الصلوٰۃ]

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مولانا شمس الحق عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے عورتوں کی امامت اور ان کی نماز باجماعت کے اہتمام کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ [عون المعبود: ج۱ص۲۳۰]

☆ امام بیہقی نے بھی ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے ''باب اثبات امامۃ المرأۃ'' یعنی عورتوں کی امامت کے اثبات کا بیان، پھر انہوں نے صدیقہ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ فرض نماز کے لیے عورتوں کے درمیان کھڑی ہو کر ان کی امامت کرائی تھی۔'' [بیہقی: ج۳ص۱۳۰]

☆ ام حسن کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو عورتوں کی امامت کراتے دیکھا کہ آپ ان کے درمیان کھڑی تھیں۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ج۲ص۵۳۶]

☆ حجیرہ نامی ایک عورت کا بیان ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نماز کے لیے ہماری امامت کرائی اور وہ عورتوں کے درمیان کھڑی ہوئیں۔ [بیہقی: ج۳،ص۱۳۱]

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ عورت دیگر عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے لیکن وہ آگے کھڑے ہونے کے بجائے عورتوں کے درمیان کھڑی ہو۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ: ج۱،ص۵۳۶]

☆ حضرت حمید بن عبدالرحمٰن اور امام شعبی کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ج۱،ص۵۳۶]

ان احادیث وآثار کے پیش نظر عورت دوسری عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے لیکن جماعت کراتے وقت اسے عورتوں کے درمیان کھڑا ہونا چاہیے۔ بعض روایات میں اس بات کی بھی صراحت ہے کہ رمضان المبارک میں عورتوں کی جماعت کرا سکتی ہے جیسا کہ امام شعبی سے منقول ہے۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ج۱،ص۵۳۶]

سوال ہڑپہ سے امت الرشید دریافت کرتی ہیں کہ ایک روزہ دار خاتون کو عصر کے بعد ماہواری آگئی اب وہ اپنے روزے کو مکمل کرے یا ترک کر دے؟

جواب خون حیض یا نفاس ایسا خون ہے جو روزے کو ختم کر دیتا ہے، اس خون کے آجانے سے روزہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جس روزہ دار خاتون کو عصر کے بعد یا مغرب سے چند منٹ پہلے حیض آگیا اس کا روزہ ٹوٹ گیا، اسے چاہیے کہ مخصوص ایام میں رہ جانے والے روزوں کی رمضان کے بعد قضا دے، ان ایام میں رہ جانے والی نمازوں کی قضا نہیں۔ ان ایام میں جو روزے رہ گئے ہوں آئندہ رمضان سے پہلے پہلے انہیں رکھ لینا چاہیے۔ دانستہ دیر کرنا شرعاً ناپسندیدہ عمل ہے۔ نیز اگر طلوع فجر سے پہلے خون حیض کی بندش کا یقین ہو گیا تو اس دن کا روزہ رکھنا چاہیے اس حالت میں روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ غسل نہ کیا ہو، غسل وغیرہ روزہ رکھنے کے بعد نماز سے پہلے کر لینا چاہیے، روزہ کے لیے خون کا بند ہونا ضروری ہے غسل کرنا روزہ کے لیے شرط نہیں ہے۔

سوال ملتان ہی سے محمد اکرم سوال کرتے ہیں کہ میرے بھائی کا ایک گردہ خرابی کی وجہ سے نکال دیا گیا ہے۔ اب ایک ہی گردہ کام کرتا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹروں کی ہدایت ہے کہ وقفے وقفے سے پانی پیا جائے۔ بصورت دیگر اس کے خراب ہونا کا اندیشہ ہے۔ روزہ کی صورت میں کیا کیا جائے، قرآن وحدیث کی رو سے اس کا کیا حل ہے؟

جواب شریعت نے ہمیں احکام و فرائض بروقت ادا کرنے کی تلقین کی ہے۔ لیکن اگر شرعی عذر ہو تو انہیں مقررہ وقت کے بعد بھی ادا کیا جا سکتا ہے، کسی فرض کو اس کے وقت کے بعد بجالانا قضا کہلاتا ہے۔ روزہ کے متعلق بعض عذر ایسے ہیں جو قضا کا باعث ہیں اور بعض فدیہ کا موجب ہیں۔ ان میں سے ایک بیماری بھی ہے اگر بیماری اس قسم کی ہے کہ روزہ رکھنے میں کوئی وقت نہیں جیسا کہ معمولی نزلہ وزکام وغیرہ ہو تو روزہ رکھنا چاہیے۔ اگر روزہ رکھنے سے مشقت ہوتی ہو یا بیماری کے بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایسی حالت میں روزہ چھوڑا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اجازت دی ہے کہ دوران مرض جتنے روزے رہ جائیں انہیں بعد میں رکھ لیا جائے۔

صورت مسئولہ میں اگر تجربہ کار اور سمجھ دار ڈاکٹر کی ہدایت یہی ہے کہ اسے بار بار پانی پینا چاہیے تاکہ گردہ صاف ہو کر اپنی کارکردگی سرانجام دیتا رہے تو ایسے شخص کو اجازت ہے کہ وہ بطور فدیہ کسی مسکین کو روزے رکھوا دے کیونکہ یہ شخص اگرچہ بظاہر

تندرست لیکن درحقیقت یہ ایک دائمی مریض ہے جسے مستقبل میں شفایاب ہونے کی امید نہیں ہے، ایسی حالت میں اس بوڑھے کی طرح ہے جو روزہ نہیں رکھ سکتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اس قسم کے بوڑھے کے متعلق یہی فتویٰ ہے کہ وہ ہر دن ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا دے دے۔ [مستدرک حاکم: ۱/۴۴]

سوال محمد علی خریداری نمبر 5383 لکھتے ہیں کہ جو شخص کسی عذر کی بنا پر رمضان المبارک کے روزے نہ رکھ سکے، وہ تو رمضان کے بعد روزوں کی گنتی پوری کرے گا، لیکن جو شخص دائمی مریض ہو اور وہ ایک روزہ بھی نہیں رکھ سکتا، اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب شریعت نے ہمیں احکام و فرائض بروقت ادا کرنے کی تلقین کی ہے، لیکن اگر کوئی شرعی عذر ہو تو مقررہ وقت کے بعد بھی ادا کر سکتے ہیں۔ کسی فرض کو بروقت بجالانا، ادا اور وقت گزرنے کے بعد ادا کرنا قضا کہلاتا ہے، روزہ کے متعلق بعض عذر ایسے ہیں جو قضا کا باعث ہیں، اگر قضا کی طاقت یا فرصت نہیں تو بعض عذر فدیہ کا موجب ہیں، دورانِ سفر روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے لیکن جتنے روزے دورانِ سفر نہ رکھے جا سکیں وہ بعد میں رکھ لیے جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو اسے دوسرے ایام میں گنتی کو پورا کرنا ہوگا۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۴]

لیکن اگر دورانِ سفر روزہ رکھنے میں مشقت نہیں ہے تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے، اسی طرح اگر معمولی بیماری ہے اور روزہ رکھنے میں کوئی دقت نہیں تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے اور اگر روزہ رکھنے سے مشقت ہوتی ہے یا بیماری بگڑنے کا اندیشہ ہے تو افطار کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے اجازت دی ہے کہ دورانِ بیماری جتنے روزے رہ جائیں انہیں بعد میں رکھ لیا جائے۔ صورت مسئولہ کے مطابق اگر کوئی دائمی مریض ہے اور روزہ رکھنے کی ہمت نہیں ہے تو قضا کے بجائے وہ فدیہ ادا کر دے، یعنی کسی دوسرے شخص کو روزے رکھوا دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ کے طور پر ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۴]

لہٰذا شوگر وغیرہ کے مریض جو روزہ رکھنے کی ہمت نہیں رکھتے انہیں ایک ماہ تک کسی غریب اور نادار کو فدیہ ادا کرنا ہوگا، یعنی روزانہ اوسط درجے کا حساب لگا کر ایک ماہ کا خرچہ اس کے حوالے کر دیا جائے، یہ بھی یاد رہے کہ غریب اور نادار کئی ایک لوگوں سے فدیہ لے سکتا ہے، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں۔ اگر کوئی شخص اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا تو وہ بھی فدیہ دے گا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ بہت بوڑھے کے لیے رخصت ہے کہ وہ خود روزہ رکھنے کی بجائے ہر دن ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا دے دے اور اس پر قضا نہیں ہے۔'' [مستدرک حاکم: ۱/۴۴]

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو اگر روزہ رکھنے سے اپنی یا بچے کی صحت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو اسے بھی روزہ افطار کرنے کی اجازت ہے۔ عذر ختم ہونے کے بعد قضا دینا ضروری ہے، اگر آیندہ رمضان تک قضا دینے کی فرصت نہ ہو تو اسے چاہیے کہ فدیہ دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسافر کو روزہ اور نصف نماز معاف کر دی ہے۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی کو بھی روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے۔ [ابوداوٗد: الصیام ۲۴۰۸]

واضح رہے کہ صحت خراب ہونے کا اندیشہ کسی امانت دار، تجربہ کار، اور سمجھ دار ڈاکٹر کی رپورٹ پر موقوف ہے۔ اپنی صوابدید

کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔ [واللہ اعلم]

سوال کمالیہ سے محمد علی دریافت کرتے ہیں کہ روزہ کی حالت میں خوشبو استعمال کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ نیز کیا بحالت روزہ ٹوتھ پیسٹ استعمال کیا جا سکتا ہے؟

جواب روزہ کی حالت میں خوشبو کے استعمال اور اسے سونگھنے سے روزہ خراب نہیں ہوتا، لیکن عود کی دھونی کو استعمال نہ کرے کیونکہ اس کا دھواں معدے میں پہنچتا ہے اس کے علاوہ دیگر خوشبوئیں استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح روزہ رکھنے کے بعد مسواک یا برش استعمال کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگرچہ بعض علما نے زوال کے بعد مسواک کے استعمال کو مکروہ خیال کیا ہے مگر راجح یہی ہے کہ مسواک یا برش کا استعمال دن کے پہلے یا آخری حصے میں کوئی مضائقہ نہیں رکھتا۔ پھر تازہ اور خشک مسواک میں کوئی فرق نہیں۔ ٹوتھ پیسٹ کا استعمال اگر ضروری ہو تو اسے استعمال کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے، البتہ یہ احتیاط ضروری ہے کہ اس میں کچھ مٹھاس ہوتی ہے جو لعاب دھن میں شامل ہو جاتی ہے جس سے بچا نہیں جا سکتا۔ اگر اس سے بچ سکے تو ضرورت کے پیش نظر اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعض اوقات وضو کرتے ہوئے، برش یا مسواک کے استعمال سے معمولی مقدار میں خون نکل آتا ہے اس سے بھی روزہ خراب نہیں ہوتا۔

سوال میاں چنوں سے حمود الرحمٰن دریافت کرتے ہیں کہ روزہ کی حالت میں بالوں کو مہندی لگانا یا آنکھوں میں سرمہ لگانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب روزہ کے دوران بالوں کو مہندی لگانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور نہ آنکھوں میں سرمہ یا دوائی ڈالنے سے روزہ خراب ہوتا ہے اور نہ ہی روزے کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ سرمہ کی اجازت کے متعلق جو مرفوع حدیث بیان کی جاتی ہے وہ ایک راوی (ابو عاتکہ) کی وجہ سے ضعیف ہے البتہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا دوران روزہ سرمہ لگانے کا عمل صحیح سند سے ثابت ہے۔

[ابوداؤد: کتاب الصیام]

اسی طرح طبرانی اوسط میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سرمہ کے استعمال کے متعلق احادیث مروی ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال حیدر آباد سے رابعہ خاتون لکھتی ہیں کہ بعض اوقات کھانا پکاتے وقت اس کا ذائقہ معلوم کرنے کے لیے معمولی مقدار میں چکھا جاتا ہے کیا ایسا کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب کھانا پکانے والے کے لیے یہ جائز ہے کہ زبان کے ایک کنارے سے کھانے میں مٹھاس، نمک یا دوسرے ذائقے معلوم کرنے کے لیے تھوڑا سا چکھ لے۔ لیکن وہ یہ احتیاط کرے کہ چکھی ہوئی چیز کو حلق سے نیچے نہ اترنے دے۔ بلکہ وہ ذائقہ معلوم کرنے کے بعد فوراً باہر نکال دے اور کلی کرے، اس طریقہ سے اس کے روزے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

سوال سیالکوٹ سے محمد عمر پوچھتے ہیں کہ حالت روزہ میں بخار وغیرہ کی وجہ سے ٹیکہ لگوانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب روزہ کی حالت میں ٹیکہ لگوانا کچھ تفصیل کا متقاضی ہے اگر ٹیکہ کی حیثیت جسم کو غذا اور طاقت فراہم کرنے کی ہے تو یہ

ٹیکہ تو کسی صورت میں جائز نہیں، کیونکہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس طرح وید یعنی رگ میں لگایا جائے یا جسم کے کسی اور حصہ میں، اگر بطور دوا ٹیکہ لگوانا ہے یا کسی جگہ بہت درد ہے اسے آرام دینے کے لیے ٹیکہ لگوانے کی ضرورت ہے یا جسم کے کسی حصہ کو بے حس کرنا ہے جیسا کہ دانت وغیرہ نکلواتے وقت کیا جاتا ہے۔ ان صورتوں میں ٹیکہ لگانے کے لیے گنجائش ہے، بعض دفعہ شدید بخار ہوتا ہے اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے ٹیکہ لگوایا جاسکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر دین کے متعلق کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔''

سوال لیہ سے محمد امین دریافت کرتے ہیں کہ بحالت روزہ کسی مریض کو خون کا عطیہ دینا جائز ہے؟

جواب بحالت روزہ کسی مریض کی جان بچانے کے لیے خون کا عطیہ جائز ہے لیکن خون دینے والے کو بعد میں روزہ رکھنا ہو گا۔ کیونکہ جسم سے کافی خون نکالنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسے سینگی لگوانے کے عمل پر قیاس کیا جائے گا اگر قلیل مقدار میں خون نکالا جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے جیسا کہ کسی مرض کی تشخیص کے لیے سرنج کے ذریعے خون کی کچھ مقدار نکالی جاتی ہے نیز نکسیر یا مسواک یا دانت نکلواتے وقت خون آجانے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔

سوال چیچہ وطنی سے محمد اقبال پوچھتے ہیں کہ مریض کے لیے قضا یا فدیہ کی کیا حد ہے یعنی وہ کونسی مرض ہے جب فدیہ دینا ہوتا ہے اور کس مرض کی وجہ سے قضا دینا پڑتی ہے؟

جواب اگر کسی کو ایسا مرض لاحق ہو جو مستقل ہو اور اس سے شفایابی کی امید نہ ہو تو ایسے مریض کے لیے فدیہ دینا ضروری ہے، یعنی ایک روزہ کے بدلہ میں ایک مسکین کو کھانا کھلا دے یا گھر میں اوسط درجے کا جو کھانا تیار ہوتا ہے اس حساب سے اس کی قیمت ادا کر دے اگر ایسی بیماری ہے جس سے زود یا بدیر شفایابی کی امید ہے اور ایسے مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے میں دقت ہے تو روزہ چھوڑ دے رمضان کے بعد جب بھی فرصت ملے تو قضا شدہ روزوں کو گنتی کے حساب سے پورا کرے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو کوئی بیمار ہو یا بحالت سفر ہو تو اسے چاہیے کہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔'' (یعنی اس دوران جتنے روزے رہ گئے ہیں انہیں رمضان کے بعد پورا کرے)

سوال خانیوال سے ابو بکر پوچھتے ہیں کہ دوا کے ساتھ غرارے کرنے سے کیا روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے روزے دار کو بوقت وضو مبالغہ کے ساتھ ناک میں پانی چڑھانے سے منع کیا ہے، حدیث میں ہے: ''کہ وضو کرتے وقت ناک میں مبالغہ کے ساتھ پانی چڑھاؤ، الا یہ کہ تم بحالت روزہ ہو۔'' [سنن ابی داؤد: الطہارۃ ۱۴۲]

رسول اللہ ﷺ نے روزے دار کے لیے یہ پابندی اس لیے لگائی ہے کہ مبادا پانی پیٹ میں چلا جائے اور اس کا روزہ خراب ہو جائے، غرارے کرنے کو بھی اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر اس کے بغیر چارہ کار نہ ہو تو احتیاط کے ساتھ غرارے کیے جائیں، تا کہ پانی حلق کے نیچے نہ اترے، ایسا کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، مگر یاد رہے کہ انتہائی شدید ضرورت کے پیش نظر ایسا کرنا چاہیے، گلے میں معمولی سی خراش کے لیے نمک یا کوئی اور محلول پانی میں ملا کر غرارے کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سوال ام کلثوم بذریعہ ای میل سوال کرتی ہیں کہ روزے رکھنے کے لیے مانع حیض ادویات کا استعمال شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب: خون حیض ایک فاسد مادہ ہے، جسے روکنا اچھا نہیں ہے، اگر کسی عورت کا صرف ارادہ ہو کہ میں رمضان میں ہی اپنے روزے مکمل کرلوں تاکہ میرے ذمے ان کا قرض باقی نہ رہے تو یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں ہے، اس کے علاوہ اطبا کی رپورٹ ہے کہ مانع حیض ادویات کا استعمال عورت کے رحم، اعصاب اور نظام خون کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے، ان کے استعمال سے مہینے کی عادت بھی بگڑ جاتی ہے اور جسم نحیف اور کمزور پڑ جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارا مشورہ ہے کہ عورتوں کو ان کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے، اگرچہ ان کے استعمال کے بعد جو روزے رکھے جائیں گے ان کا فرض تو بہر حال ادا ہو جائے گا، البتہ علما نے ایسی ادویات کے استعمال کو چند شرائط کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

① ان کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اگر نقصان کا خطرہ ہے تو پرہیز کیا جائے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔'' [۲/البقرہ:۱۹۵]

نیز فرمایا: ''کہ اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔'' [۴/النسآء:۲۹]

رسول اللہ ﷺ نے ہر غیر ضروری چیز کے استعمال سے منع فرمایا، حدیث میں ہے ''کہ نقصان اٹھانا اور نقصان پہنچانا دونوں کسی صورت میں جائز نہیں ہیں۔'' [مسند امام احمد:۱/۳۱۳]

② خاوند سے اجازت لی جائے اگر خاوند موجود ہو کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ عورت عدت کے ایام میں ہوتی ہے وہ مانع حیض ادویات کے استعمال سے ایام عدت کو طویل کرنا چاہتی ہے تاکہ دیر تک اس سے نان ونفقہ وصول کیا جائے۔ ایسے حالات میں اس سے اجازت لینا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ثابت ہو جائے کہ ایسی ادویات کے استعمال سے حمل میں رکاوٹ ہو سکتی ہے، ایسی حالت میں بھی عورت کا خاوند سے اجازت لینا ضروری ہے۔ ایسی ادویات کا استعمال اگرچہ جائز ہے، تاہم بہتر ہے کہ فطرت سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے، البتہ اگر کوئی مجبوری ہو تو الگ بات ہے، ہمارے نزدیک رمضان میں اپنے روزے مکمل کرنے کی نیت سے ایسی ادویات استعمال کرنا کوئی معقول عذر نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال: ملتان سے عبدالاحد سوال کرتے ہیں کہ بحالت روزہ کھانے، پینے اور تعلقات زن شوئی کے علاوہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے روزہ دار کو پرہیز کرنا چاہیے۔

جواب: روزے کے ادب واحترام کا تقاضا یہ ہے کہ روزے دار ہر اس کام سے پرہیز کرے جو اس کے روزہ میں رخنہ اندازی کا باعث ہے۔ ان میں بعض امور ایسے ہیں جو روزے کو باطل تو نہیں کرتے البتہ انسان ان کے ارتکاب کے بعد اس کے ثواب سے ضرور محروم ہو جاتا ہے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

غیبت و چغلی

غیبت کرنے سے روزہ کارآمد نہیں رہتا بلکہ اس ڈھال کی طرح ہو جاتا ہے جس میں شگاف پڑ چکے ہوں اور لڑائی میں بچاؤ کا کام نہ دے سکتی ہو چنانچہ حدیث میں ہے: ''روزہ ڈھال کا کام دیتا ہے جب تک اس میں غیبت کرنے سے شگاف نہ

پڑ جائے''۔ [دارمی:۲۹/۴۳۷]

فحش گوئی و بدکلامی

روزے دار کے لیے بدکلامی سے بھی اجتناب کرنا ضروری ہے کیونکہ ایسا کرنے سے روزہ دار اس کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''روزہ ڈھال ہے (اس لیے) روزہ دار کو چاہیے کہ وہ فحش گوئی اور جہالت و نادانی سے اجتناب کرے۔''
[صحیح ابن حبان:۶/۱۸۳]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب تم میں سے کوئی بحالت روزہ ہو تو اسے بدزبانی، جہالت اور نادانی سے پرہیز کرنا چاہیے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصوم]

گالی گلوچ اور سب و شتم

روزے دار کو اس حد تک احتیاط کرنا چاہیے کہ اگر کوئی اسے گالی دیتا ہے تو اسے جوابی کاروائی کی اجازت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ اگر کوئی روزے دار کو گالی دے کر جہالت کا ثبوت دیتا ہے تو اسے چاہیے کہ خاموش رہے۔ اسے گالی نہ دے۔''
[صحیح بخاری: کتاب الصوم]

بلکہ بعض روایات میں ہے ''کہ گالی دینے والے کو شائستگی سے جواب دے کہ بھائی میں روزے کی حالت سے ہوں۔''
[صحیح بخاری: کتاب الصوم]

فضول کام اور جھوٹی کلام

روزے دار کو جھوٹی باتوں اور فضول کاموں سے بھی بچنا چاہیے ان کے ارتکاب پر بھی سنگین وعید وارد ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''کہ جو انسان روزے کے باوجود کذب بیانی جھوٹی باتوں اور غلط کاموں سے باز نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے روزے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ خواہ مخواہ بھوک اور پیاس برداشت کرتا ہے۔'' [صحیح بخاری]

بیوی سے بوس و کنار کرنا

جو روزہ دار اپنی شہوت پر قابو نہ رکھتا ہو اس کے لیے اپنی بیوی سے بغلگیر ہونا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے بحالت روزہ اپنی بیوی سے بغلگیر ہونے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی ایک دوسرے شخص نے یہی سوال کیا تو آپ ﷺ نے اسے منع فرما دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''کہ جس شخص کو آپ نے اجازت دی وہ بوڑھا تھا اور جسے منع کیا وہ جوان تھا۔'' [ابوداؤد: کتاب الصوم]

اس کی وضاحت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بایں الفاظ فرماتی ہیں: ''کہ رسول اللہ ﷺ بحالت روزہ مجھ سے بغلگیر ہوتے اور بوسہ لیتے، لیکن وہ اپنی شہوت پر سب سے زیادہ قابو پانے والے تھے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصوم]

روزے دار کو ناک میں پانی ڈالتے وقت مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہیے۔ مبادا پانی حلق میں اتر جائے۔ حضرت لقیط بن صبرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وضو کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وضو پورا کرو، انگلیوں کے درمیان خلال کرو اور ناک میں اچھی طرح پانی ڈالو لیکن اگر روزہ کی حالت میں ہو تو پھر ایسا نہ کرو۔'' [ابوداؤد: کتاب الصوم]

سوال نوشہرہ سے ام عمارہ لکھتی ہیں کہ میرے شوہر نے رمضان المبارک میں بحالت روزہ مجھ سے ہم بستری کر لی جبکہ میں نے اسے یاد دلایا کہ روزہ کی حالت میں جماع کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن غلبہ شہوت کی وجہ سے وہ باز نہ آیا اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہم دونوں اس سلسلہ میں پریشان ہیں۔

جواب واضح رہے کہ شریعت کی اصطلاح میں عبادت کی نیت سے طلوع فجر تا غروب آفتاب تک کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے باز رہنے کا نام روزہ ہے، لیکن اگر کوئی بھول کر بے خیالی میں بحالت روزہ کھا پی لے یا اپنی بیوی سے ہم بستر ہو جائے تو اس صورت میں نہ فدیہ لازم آتا ہے اور نہ ہی کفارہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس کا روزہ صحیح ہے حدیث میں ہے: ''کہ اگر کسی نے بھول کر کھا لیا یا کچھ پی لیا تو روزہ پورا کرنا چاہیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کھلایا اور پلایا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصوم]

لیکن اگر کسی نے دیدہ دانستہ روزے کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ انزال ہو یا نہ ہو اس روزہ کی قضا بھی ہے یعنی رمضان کے بعد ایک روزہ رکھنا ہو گا اور اس پر کفارہ بھی ضروری ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ دو ماہ کے مسلسل روزے رکھے جائیں گے یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلایا جائے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے ایک شخص نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں تباہ و برباد ہو گیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''کہ کیسے؟'' اس نے عرض کیا کہ میں نے بحالت روزہ اپنی بیوی سے صحبت کر لی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہارے پاس بطور کفارہ آزاد کرنے کے لیے کوئی غلام ہے؟'' عرض کیا: نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم دو ماہ کے مسلسل روزے رکھ سکتے ہو۔'' اس نے کہا: یہ بھی ناممکن ہے۔ فرمایا: ''ساٹھ مساکین کو کھانا کھلاؤ۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصوم' حدیث نمبر ۱۹۳۶]

روزہ کی حالت میں بیوی سے ہم بستری کرتے وقت اگر بیوی کا بھی روزہ تھا اور وہ اس پر راضی تھی تو بیوی کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بھی کفارہ ادا کرے اور رمضان کے بعد اس روزہ کی قضا بھی دے۔ اگر بیوی اس صحبت پر راضی نہ تھی جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے اور مرد نے زبردستی اس سے صحبت کی تو عورت پر کفارہ نہیں ہو گا۔ البتہ اسے اس دن کی رمضان کے بعد قضا دینا ہو گی، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ''کہ اس صورت میں عورت پر روزے کی قضا بھی ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ مرد نے زبردستی کی ہے۔'' لیکن بہتر یہی ہے کہ عورت بھی اس روزہ کی قضا دے۔ یاد رہے کہ بیوی کو اس وقت معذور خیال کیا جائے گا کہ جب شوہر بزور طاقت زبردست بیوی پر حاوی ہو جائے یا اسے مارنے پیٹنے پر اتر آئے یا اسے طلاق کی دھمکی دے دے۔ ایسی صورت میں اسے مجبور سمجھا جائے گا۔ اس کے باوجود بھی عورت کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے شوہر کو سختی کے ساتھ اس عمل سے روکے، البتہ روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے بوس و کنار کیا جا سکتا ہے اور اس سے بغلگیر ہونا بھی جائز ہے۔ بشرطیکہ خاوند کو اپنے آپ پر کنٹرول ہو۔ بصورت دیگر بحالت روزہ اپنی بیوی سے بوس و کنار کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال جھنگ سے عبدالحمید سوال کرتے ہیں کہ اگر رمضان میں کسی شرعی عذر کی بنا پر چند روزے رہ جائیں تو کیا شوال میں چھ روزے بطور قضا شمار کیے جاسکتے ہیں یا انہیں علیحدہ رکھنا ہوگا؟

جواب شوال کے چھ روزے رمضان میں رہ جانے والے روزوں کی قضا میں شمار ہو سکتے ہیں۔لیکن وہ شوال کے چھ روزے نفلی روزوں میں شمار نہیں ہوں گے۔ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے پھر اس کے بعد شوال کے چھ روزے رکھے تو گویا وہ ہمیشہ حالت روزہ رہا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رمضان المبارک کے فرض روزے رکھنا ضروری ہیں۔پھر ان کے بعد شوال میں چھ نفلی روزوں کا اضافہ کیا جائے تا کہ یہ عمل ہمیشہ روزے رکھنے کی طرح ہو جائے۔لہٰذا جس مسلمان کے روزے رہ گئے ہوں اسے چاہیے کہ نفلی روزے رکھنے سے پہلے رمضان میں رہ جانے والے روزوں کی قضا مکمل کرلے پھر شوال کے روزے مکمل کرلے۔قضا کے طور پر رکھے ہوئے روزے نفلی روزوں کے قائم مقام نہیں ہوسکتے۔

سوال شورکوٹ سے محمد خلیل سوال کرتے ہیں کہ شوال کے روزوں کی کیا فضیلت ہے؟ کیا عید کے فوراً بعد شوال کے روزے رکھے جائیں یا انہیں بعد میں بھی رکھا جاسکتا ہے؟

جواب دورِ حاضر کے بعض ''روشن خیال'' مجتہدین ماہِ شوال کے چھ روزوں کو مکروہ کہتے ہیں، نیز امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کی کراہت منقول ہے۔اگرچہ متاخرین نے ان سے اتفاق نہیں کیا تاہم ان مفروط، کا جائزہ لینا ضروری ہے جن کی بنا پر ان چھ روزوں کو مکروہ کہا جاتا ہے۔کتاب وسنت کی رو سے عید الفطر کے بعد ماہِ شوال کے چھ روزے رکھنا مستحب ہیں احادیث میں ان روزوں کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے۔رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جس نے ماہِ رمضان روزوں سے گزارا پھر شوال کے چھ روزے رکھے اسے سال بھر کے روزے رکھنے کا ثواب ہوگا۔ [صحیح مسلم: کتاب الصوم]

بروایت طبرانی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ ایک روزہ دس دنوں کے برابر حیثیت رکھتا ہے تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا ''ہاں ایسا ہی ہے۔'' [ترغیب: ۲/۱۱۱]

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مزید وضاحت مروی ہے کہ ماہِ رمضان کے روزے دس ماہ کے برابر ہیں۔اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے دو ماہ کے مساوی ثواب رکھتے ہیں۔اس طرح یہ سال بھر کے روزے ہوئے۔ [صحیح ابن خزیمہ: ۲/۲۹۸]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ماہِ رمضان کے مکمل اور ان کے بعد ماہِ شوال کے چھ روزے رکھے اس نے گویا پورے سال کے روزے رکھے۔'' [مسند امام احمد: ۳/۳۲۴]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ان روزوں کی فضیلت ایک دوسرے انداز سے بیان ہوئی ہے۔ارشاد نبوی ﷺ ہے ''کہ جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے،اس کے بعد ماہِ شوال کے بھی چھ روزے پورے کیے وہ گناہوں سے یوں پاک ہو جاتا ہے گویا آج ہی شکم مادر سے پیدا ہوا ہے۔'' [ترغیب: ۲/۱۱۱]

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے بھی ماہِ شوال کے چھ روزوں کی ترغیب و

فضیلت کے متعلق احادیث مروی ہیں۔ بہتر ہے کہ عید الفطر کے متصل بعد چھ روزے مسلسل رکھ لیے جائیں تاہم اگر ماہ شوال میں متفرق طور پر بھی رکھ لیے جائیں تو بھی جائز ہے۔ [ترغیب]

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے متعلق کراہت منقول ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے کسی اہل علم کو یہ روزے رکھتے نہیں دیکھا اور نہ مجھے ان کے متعلق اسلاف کا طرز عمل پہنچا ہے بلکہ اہل علم انہیں مکروہ خیال کرتے ہیں اور ان کے بدعت ہونے کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ مزید یہ بھی اندیشہ ہے کہ نادان لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے رمضان کے ساتھ ایک ایسی چیز کا الحاق کر دیں گے جو اس سے نہیں ہے۔'' [مؤطا امام مالک]

جہاں تک ان کے بدعت ہونے کا تعلق ہے تو یہ ایک بے بنیاد شوشہ ہے کیونکہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان روزوں کی مشروعیت مروی ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔ باقی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کہنا کہ میں نے کسی اہل علم کو یہ روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا تو اس کے متعلق علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''مخفی نہ ہے کہ اگر لوگ سنت پر عمل کرنا ترک کر دیں تو ان کا یہ عمل ترکِ سنت کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔'' [نیل الاوطار: ۳۲۲/۴]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح مسلم میں لکھتے ہیں: ''جب سنت ثابت ہو جائے تو اسے بایں وجہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' [شرح مسلم: ۳۲۹/۱]

عین ممکن ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تک مذکورہ احادیث نہ پہنچی ہوں یا وہ انہیں صحیح نہ سمجھتے ہوں۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے چند ایک وجوہ کے پیش نظر اسے قابل عمل نہیں سمجھا۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ شوال کے روزوں کو ماہِ رمضان کے روزوں کے ساتھ ملا کر رکھنے کو زمانہ بھر کے روزوں سے تشبیہ دی گئی ہے حالانکہ ہمیشہ روزہ رکھنے سے متعلق حکم امتناعی متعدد احادیث میں مروی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ جو ہمیشہ روزے رکھتا ہے اس کی کیا حیثیت ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ اس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا۔'' [صحیح مسلم: کتاب الصوم]

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے روزوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

یہ اعتراض اس لیے بے بنیاد ہے کہ حدیث میں صرف ثواب کو تشبیہ دی گئی ہے، بلاشبہ ہمیشہ کے روزے رکھنا منع ہے لیکن ماہِ شوال کے روزوں کو حقیقت کے اعتبار سے نہیں بلکہ اجر و ثواب کے لحاظ سے انہیں صیام الدھر کہا گیا ہے۔ لہٰذا یہ حکم امتناعی میں شامل نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہر ماہ کے تین روزے رکھنے کے متعلق حدیث ہے: ''کہ اس نے گویا زمانہ بھر کے روزے رکھے۔'' [سنن نسائی: کتاب الصوم]

☆ ان پر مداومت کرنے سے عوام الناس میں یہ اعتقاد ابھرنے کا اندیشہ ہے کہ شاید یہ بھی ضروری ہیں حالانکہ اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کے اندیشہ ہائے دور دراز کی وجہ سے کس کس سنت کا خون کیا جائے گا۔ عاشورہ اور یوم عرفہ کے روزے بھی اس ضابطہ کی زد میں آتے ہیں۔ اگرچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ماہ شوال کے ان چھ روزوں کے متعلق کراہت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن متاخرین احناف نے امام ابوحنیفہ کے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا۔ چنانچہ لکھا ہے: ''امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ماہِ

شوال کے چھ روزے مکروہ ہیں خواہ مسلسل رکھے جائیں یا متفرق طور پر۔ البتہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ مسلسل رکھنے کو مکروہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ متفرق طور پر رکھنے کو جائز کہتے ہیں۔ لیکن متاخرین احناف نے ان دونوں حضرات سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کے نزدیک یہ چھ روزے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور صحیح مذہب بھی یہی ہے کہ ان روزوں کے رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

[فتاویٰ عالمگیری: ۱/۲۸۰]

مختصر یہ ہے کہ ماہِ شوال کے چھ روزے بڑی فضیلت کے حامل ہیں۔ تکفیر سیئات اور رفع درجات کا ذریعہ ہے۔ (اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے) آمین

سوال کوہاٹ سے عبدالعلام دریافت کرتے ہیں کہ شوال کے چھ روزوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا انہیں عیدالفطر کے فوراً بعد رکھنا چاہیے یا متفرق طور پر بھی رکھے جاسکتے ہیں؟

جواب عیدالفطر کے بعد ماہِ شوال کے چھ روزے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ احادیث میں ان کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ جس کا ماہ رمضان روزے سے گزرا پھر شوال کے چھ روزے رکھے اسے سال بھر کے روزے رکھنے کا ثواب ہوگا۔'' [صحیح مسلم: کتاب الصیام]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ فضیلت ایک دوسرے انداز میں بیان ہوئی ہے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے اس کے بعد ماہِ شوال کے بھی چھ روزے پورے کیے وہ گناہوں سے یوں پاک ہوجاتا ہے گویا آج ہی شکم مادر سے پیدا ہوا ہے۔''

اسی طرح حضرت ثوبان، حضرت ایوب انصاری، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس اور حضرت عازب رضی اللہ عنہم سے بھی ماہِ شوال کے چھ روزوں کے متعلق احادیث مروی ہیں۔ اکثر محدثین نے چھ روزوں کے استحباب اور مشروعیت سے اتفاق کیا ہے البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے متعلق کراہت منقول ہے۔ جو بلا دلیل ہے۔ بہتر ہے کہ عیدالفطر کے متصل بعد چھ روزے مسلسل رکھ لیے جائیں تاہم اگر ماہ شوال میں متفرق طور پر پورے کر لیے جائیں تو بھی جائز ہے۔

سوال سیف الرحمٰن صدیقی بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ عرفہ کا روزہ نویں ذوالحجہ کو رکھنا چاہیے یا جس دن سعودیہ میں عرفہ کا دن ہوتا ہے خواہ ہمارے ہاں ذوالحجہ کی سات یا آٹھ تاریخ ہو؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ یوم عرفہ کا روزہ رکھنے سے گزشتہ اور آئندہ سال کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔'' [صحیح مسلم]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول رحمت ہیں اور آسان دین لے کر آئے ہیں، اس رحمت اور آسانی کا تقاضا یہ ہے کہ عرفہ کا روزہ نویں ذوالحجہ کو رکھا جائے۔ سعودیہ میں یوم عرفہ کے ساتھ اس کا مطابق ہونا ضروری نہیں، اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

☆ میں نے علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں خود اس روایت کو دیکھا ہے لیکن اب اس کا حوالہ مستحضر نہیں، اس روایت میں یوم عرفہ کے بعد الیوم التاسع کے الفاظ ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ نویں ذوالحجہ کو روزہ رکھا جائے۔

☆ تیسیر اور رحمت کا تقاضا اس طرح ہے کہ اس امت کو عبادت کی بجا آوری میں اپنے احوال وظروف سے وابستہ کیا گیا ہے اگرچہ آج' ہم سائنسی دور سے گزر رہے ہیں لیکن آج سے چند سال قبل معلومات کے یہ ذرائع میسر نہ تھے۔ جن سے سعودیہ میں یوم عرفہ کا پتہ لگایا جا سکتا، اب بھی دیہاتوں اور دور دراز کے باشندوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ سعودیہ میں یوم عرفہ کب ہے تاکہ اس دن روزے کا اہتمام کریں لہٰذا اپنے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے نویں ذوالحجہ کا تعین کر کے عرفہ کا روزہ رکھ لیا جائے۔

☆ روئے زمین پر ایسے خطے موجود ہیں کہ سعودیہ کے لحاظ سے یوم عرفہ کے وقت وہاں رات ہوتی ہے، ان کے لیے روزہ رکھنے کا کیا اصول ہوگا؟ اگر انہیں عرفہ کے وقت روزہ رکھنے کا پابند کیا جائے تو وہ رات کا روزہ رکھیں گے حالانکہ رات کا روزہ شرعاً ممنوع ہے اور اگر وہ اپنے حساب سے روزہ رکھیں گے تو عرفہ کا وقت ختم ہو چکا ہوگا۔ اس لیے آسانی اسی میں ہے کہ اپنے حالات وظروف کے اعتبار سے روزہ رکھ لیا جائے۔

☆ ہمارے ہاں پاکستان میں یوم عرفہ کو سات یا آٹھ ذوالحجہ ہوتی ہے کچھ مغربی ممالک ایسے بھی ہیں کہ وہاں یوم عرفہ کو ذوالحجہ کی دس تاریخ ہوتی ہے اگر سعودیہ کے اعتبار سے انہیں عرفہ کے دن کا روزہ رکھنے کا مکلف قرار دیا جائے تو وہ اپنے لحاظ سے دس ذوالحجہ کا روزہ رکھیں گے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اس دن روزہ رکھنے سے منع کیا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے حساب سے نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھیں۔

☆ ہمارے اور سعودیہ کے طلوع وغروب میں دو گھنٹے کا فرق ہے اگر عرفہ کے روزہ کو سعودیہ میں یوم عرفہ سے وابستہ کر دیا جائے تو جب ہم روزہ رکھیں گے تو اس وقت سعودیہ میں یوم عرفہ کا آغاز نہیں ہوا ہوگا۔ اسی طرح جب ہم روزہ افطار کریں گے تو سعودیہ کے لحاظ سے یوم عرفہ ابھی باقی ہوگا، یہ الجھنیں صرف اس صورت میں دور ہو سکتی ہیں کہ ہم اپنے روزے کو سعودیہ سے وابستہ نہ کریں بلکہ اپنے حساب سے نویں ذوالحجہ کا تعین کر کے روزہ رکھ لیں۔

ان وجوہات کا تقاضا ہے کہ عرفہ کا روزہ ہم اپنے لحاظ سے نویں ذوالحجہ کو رکھ لیں خواہ اس وقت سعودیہ میں یوم عرفہ ہو یا نہ ہو۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال لاہور سے عبدالقہار لکھتے ہیں کہ معتکف بحالت اعتکاف کون کون سے کام کر سکتا ہے اور کون کون سے کام اسے نہیں کرنے چاہئیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں تفصیل سے لکھیں۔

جواب لغوی طور پر اعتکاف کا معنی روک لینا اور بند رکھنا ہے اور شرعی اصطلاح میں معتکف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی عبادت کے لیے رمضان المبارک کے آخری دس دن عبادت میں گزارے اور اپنے شب وروز کو ذکر الٰہی کے لیے مختص کر دے۔ اس انداز سے جو انسان اعتکاف کرے گا اس کے لیے فضیلت حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ''جو انسان اللہ کی رضا جوئی کے لیے صرف ایک دن کا اعتکاف کرتا ہے اللہ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقوں کو حائل کر دیں گے اور ایک خندق کے دونوں کناروں کا فاصلہ مشرق سے مغرب تک ہوگا۔'' [طبرانی باسناد حسن]

معتکف مندرجہ ذیل کام بحالت اعتکاف کرسکتا ہے

☆ حوائج ضروریہ کے لیے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اگر مسجد میں قضائے حاجت کا انتظام نہیں تو باہر جاسکتا ہے یا کھانے وغیرہ کا بندوبست نہیں یا گھر سے لانے والا کوئی نہیں تو کھانے کے لیے گھر جاسکتا ہے۔

☆ غسل کرنا بھی جائز ہے خواہ وہ فرض ہو یا نظافت وصفائی کے حصول کے لیے ہو۔

☆ سر میں کنگھی کرنا اور ناخن کاٹنا بھی جائز ہے۔

☆ آرام کے لیے مسجد میں چارپائی بچھانا بھی مباح ہے۔

☆ بوقت ضرورت معتکف سے بات بھی کی جاسکتی ہے اور معتکف سے ملاقات کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج مطہرات سے گفتگو فرماتے اور انہیں مشورہ دیتے تھے۔ نیز ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن رسول اللہ ﷺ کے پاس بحالت اعتکاف مسجد میں ملاقات کے لیے آجاتی تھیں۔

معتکف کے لیے مندرجہ ذیل امور بحالت اعتکاف ناجائز ہیں

☆ معتکف چونکہ اللہ کی رضاجوئی کے لیے خود کو مسجد میں روکتا ہے اس لیے اسے فضول باتوں اور لایعنی گفتگو سے پرہیز کرنا چاہیے اور معتکف کو اپنے قول وکردار میں عام انسانوں سے ممتاز ہونا چاہیے۔

☆ دوران اعتکاف کسی بیمار کی تیمارداری بھی نہیں کی جاسکتی ہاں اگر گزرتے ہوئے بلاتوقف کسی بیمار سے حال چال پوچھ لے تو جائز ہے۔ [سنن ابی داؤد: کتاب الصوم]

☆ معتکف کو جنازہ میں بھی شریک نہیں ہونا چاہیے اور اسے ضروری حاجت کے بغیر مسجد سے باہر نہیں نکلنا چاہیے اگر مسجد میں کوئی جنازہ آجائے تو اس کے پڑھنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ [سنن ابی داؤد: کتاب الصیام]

☆ اختتام اعتکاف کے موقع پر دھوم دھام سے نکلنا یا فوٹو اتروانا بھی ناجائز اور حرام ہے۔

سوال جیکب آباد سے عبدالغفار سوال کرتے ہیں کہ مستورات کا مسجد میں اعتکاف کرنا شرعاً کیسا ہے؟ محرم کے بغیر عورت اکیلی سفر نہیں کرسکتی تو مسجد میں دس یوم تک اکیلی اعتکاف کیسے کرسکتی ہے؟ اگر کرسکتی ہے تو اس کے لیے کیا لوازم ہیں، نیز کیا نابالغ بچی اعتکاف کرسکتی ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ دنیاوی علائق سے الگ تھلگ ہو کر تقرب الٰہی کی نیت سے کچھ وقت مسجد میں قیام کرنے کو شرعاً اعتکاف کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر اگر تقرب الٰہی کی نیت نہ ہو یا تقرب الٰہی کی نیت تو ہے لیکن مسجد میں قیام نہیں ہے تو ان دونوں صورتوں کو شرعی اعتکاف نہیں کہا جائے گا۔ مسجد کی شرط اس لیے ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم مساجد میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان (بیویوں) سے مباشرت نہ کرو۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۷]

آیت کریمہ میں مساجد کا بطور خاص ذکر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری ہے اس بنا پر

عورتوں کا گھروں میں اعتکاف کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ انہیں بھی اعتکاف مسجد میں بیٹھنا چاہیے۔ البتہ انہیں مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔

☆ عورت کے لیے مردوں سے بایں طور پر الگ انتظام ہو کہ مردوں کے ساتھ اختلاط کا قطعاً کوئی امکان باقی نہ رہے کیونکہ اختلاط کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے پسند نہیں کیا ہے۔

☆ خاوند سے اعتکاف بیٹھنے کی اجازت حاصل کی جائے بصورت دیگر اعتکاف صحیح نہیں ہوگا۔

☆ بحالت اعتکاف مخصوص ایام کے آجانے کا بھی اندیشہ نہ ہو۔

☆ کسی قسم کے فتنہ وفساد کا خطرہ بھی نہ ہو۔

☆ خورد ونوش اور دیگر لوازم کا باقاعدہ انتظام ہو تاکہ باہر جانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اگر یہ شرائط پوری نہ ہوں تو عورتوں کے لیے اعتکاف سے اجتناب زیادہ بہتر ہے۔ ایسے حالات میں گھر کے کسی گوشہ میں شوق عبادت پورا کر لینا چاہیے، لیکن اسے شرعی اعتکاف نہیں کہا جائے گا اور نہ ہی اعتکاف کی پابندیاں اس پر عائد ہوں گی، بعض حضرات کی طرف سے عورتوں کے لیے اعتکاف کو غیر مشروع کہا جا رہا ہے لیکن اس کی کوئی دلیل پیش نہیں کی جاتی، چونکہ ازواج مطہرات کا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اعتکاف کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ [صحیح بخاری] اس لیے شرائط بالا کو ملحوظ رکھتے ہوئے عورت مسجد میں اعتکاف کر سکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں جو حدیث اس کے عدم جواز پر پیش کی گئی ہے وہ سفر سے تعلق رکھتی ہے، اس کا اعتکاف سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

نابالغ بچی شرعی احکام کی پابند نہیں ہے اس لیے اعتکاف جیسی پاکیزہ اور مقدس عبادت کو بازیچہ اطفال نہیں بنانا چاہیے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال لاہور سے ثریا لکھتی ہیں کہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا بہت بڑی فضیلت ہے، اس کے متعلق عورتوں کو کیا حکم ہے؟ کیا وہ مسجد میں اعتکاف بیٹھیں یا گھر میں رہتے ہوئے اس فضیلت کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔؟

جواب شرعی اصطلاح میں اعتکاف کا مطلب یہ ہے کہ رمضان المبارک کے آخری دس دن مسجد کے اندر عبادت میں گزارے جائیں، اور یہ دن اللہ کے ذکر کے لیے مختص ہوں اور اس کے لیے بنیادی طور پر شرط یہ ہے کہ اعتکاف مسجد میں ہونا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ جب تم مساجد میں معتکف ہو تو اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو'' [۲/البقرہ:۱۸۷]

مسجد بھی ایسی ہونی چاہیے جس میں نماز با جماعت کا اہتمام ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''کہ جس مسجد میں نماز با جماعت ادا کرنے کا بندوبست ہو، وہاں اعتکاف ہوتا ہے۔'' [سنن ابی داود: الصیام ۲۴۷۳]

پھر اس مسجد میں جمعہ کی ادائیگی کا بھی انتظام ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں: ''کہ اعتکاف اس مسجد میں ہونا چاہیے جہاں جمعہ ادا ہوتا ہے۔'' [سنن بیہقی]

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اعتکاف کیا اور آپ کا اعتکاف مسجد میں ہوتا تھا۔ حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ مسجد میں

اعتکاف کرتے تھے۔ [صحیح بخاری: الاعتکاف ۲۰۲۸]

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے کہ اعتکاف کہاں ہو۔؟ پھر مسجد میں اعتکاف کرنے کی احادیث پیش کی ہیں۔ [ابوداؤد: الصیام ۲۴۶۵]

اعتکاف کے متعلق مردوں اور عورتوں کے احکام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کیا ہے۔ حتی کہ ایک زوجہ محترمہ کو استحاضہ کا عارضہ تھا وہ آپ کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کرتی تھیں۔ [صحیح بخاری: الحیض ۳۰]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اعتکاف کا پروگرام بنایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مسجد میں ایک خیمہ کا بندوبست کیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے لیے مسجد میں خیمہ لگایا۔ اس طرح دیکھا دیکھی حضرت حفصہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما نے بھی خیمے لگا دیئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اتنے خیمے دیکھے تو آپ نے تمام خیموں کو اکھاڑ دینے کا حکم دیا اور فرمایا: ''کہ اسی انداز سے تم نیکی تلاش کرنا چاہتی ہو'' اگر گھر میں اعتکاف جائز ہوتا۔ تو آپ انہیں اپنے گھروں میں اعتکاف کرنے کا حکم دے دیتے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنے اعتکاف کا پروگرام بھی ختم کر دیا حتیٰ کہ ماہ شوال میں اس کی قضا دی اور دس دنوں کا اعتکاف کیا۔
[صحیح بخاری: الاعتکاف ۲۰۳۴]

اس سلسلہ میں جمہور محدثین کا یہی موقف ہے کہ عورتوں کا گھروں میں اعتکاف کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اعتکاف کو مسجد کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ اور گھروں میں اعتکاف کرنا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی ازواج مطہرات نے مسجد میں ہی اعتکاف کیا ہے۔ عورتوں کے لیے اعتکاف کرنا جائز ہے۔ لیکن وہ اپنے خاوند یا کسی دوسرے محرم کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کرے۔ اگر اکیلی اعتکاف کرنا چاہتی ہے تو خاوند یا سرپرست کی اجازت سے ایسا ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ یا دیگر آدمیوں سے خلوت کا خطرہ نہ ہو۔ اس پرفتن دور میں بہتر ہے کہ عورت گھر میں رہتے ہوئے اللہ کی عبادت کرے۔ لیکن گھر میں بیٹھ کر عبادت کرنا شرعی اعتکاف نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس کے لیے مسجد کا ہونا ضروری ہے۔

سوال ملتان سے عطیہ سعید پوچھتی ہیں کہ عورت کو گھر میں اعتکاف کرنا شرعاً کیسا ہے، نیز اعتکاف کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب واضح رہے کہ اعتکاف کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ مسجد میں ہونا چاہیے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ شرعی اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا عورت کو چاہیے کہ اگر وہ اعتکاف کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنے خاوند یا کسی دوسرے محرم کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کرے اگر اکیلی اعتکاف کرنا چاہتی ہے تو خاوند یا سرپرست کی اجازت لینا ضروری ہے اس کے علاوہ کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ یا دیگر آدمیوں سے خلوت کا خطرہ بھی نہ ہو۔ جیسا کہ ازواج مطہرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مسجد میں اعتکاف کرتی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہوں نے مسجد میں ہی اعتکاف کیا ہے۔ اس پرفتن دور میں بہتر ہے کہ عورت گھر میں بیٹھ کر اللہ کی عبادت کرے لیکن گھر میں بیٹھ کر عبادت کرنا شرعی

اعتکاف نہیں ہوگا۔ کیونکہ شرعی اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری ہے۔ اعتکاف کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ رمضان المبارک کی بیس تاریخ کو مغرب کی نماز مسجد میں ادا کرے اور رات مسجد میں ہی قیام کرے مغرب کے بعد اعتکاف کا آغاز ہو جاتا ہے البتہ اعتکاف گاہ میں اکیس رمضان کو نماز فجر کے بعد داخل ہو۔

سوال میلسی سے حبیب اللہ لکھتے ہیں کہ صدقہ الفطر کس چیز سے ادا کرنا چاہیے، نیز اس کی مقدار کتنی ہے۔ اگر قیمت ادا کر دی جائے تو کیا یہ درست ہے یا نہیں اور یہ بھی بتائیں کہ موجودہ اعشاری نظام کے مطابق اس کا کتنا وزن بنتا ہے؟

جواب علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے کہ فطرانہ میں صرف کھجور یا جو ہی دیئے جائیں، اس کے علاوہ دوسری اشیاء سے صدقہ فطر جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ موقف صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اجناس کو انسان بطور غذا استعمال کرتا ہے ان سے صدقہ فطر ادا کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں عموماً جو، کھجور، منقی اور پنیر وغیرہ بطور خوراک استعمال ہوتے تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو انہی اجناس خوردنی سے صدقہ فطر ادا کرنے کا حکم دیا چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اپنی خوراک میں سے ایک صاع بطور فطرانہ ادا کرتے تھے اور ہماری خوراک جو، منقی پنیر اور کھجور ہوا کرتی تھی اس لیے فطرانہ ہر اس چیز سے ادا کیا جا سکتا ہے، جو سال کے بیشتر حصہ میں بطور خوراک استعمال ہوتی ہے۔ [صحیح بخاری]

مقدار: گھر کے ہر فرد کی طرف سے صدقہ فطر ایک صاع ادا کیا جائے، البتہ گندم سے نصف صاع ادا کرنے کی روایات بھی منقول ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں گندم سے دو مد یعنی نصف صاع بطور فطرانہ ادا کرتے تھے۔ [مسند امام احمد: ۶/۳۵۰]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ فطرانہ کی مقدار کھجور اور جو سے ایک صاع اور گندم سے نصف صاع ادا کیا جا سکتا ہے۔'' [اختیارات: ۱۰۶]

ان کے تلمیذ رشید امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ [زاد المعاد: ہدیہ فی صدقۃ الفطر]

عرب میں دوسری اشیائے خوردنی کے مقابلہ میں گندم چونکہ مہنگی ہوتی تھی اس لیے نصف صاع کا اعتبار کیا گیا ہے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کے باوجود گندم سے بھی ایک صاع دینے کے قائل اور فاعل تھے۔ تاہم ہمارے ہاں گندم عام دستیاب ہے اس لیے گندم سے ایک صاع ہی ادا کرنا چاہیے۔ صریح نصوص کا یہی تقاضا ہے۔

قیمت ادا کرنا: ہمارے ہاں عام طور پر غربا کی ضرورت کے پیش نظر صدقہ فطر میں نقدی دی جاتی ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قیمت ادا کرنا ثابت نہیں ہے بلکہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دور خلافت راشدہ میں فطرانہ اجناس خوردنی سے ادا کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرانہ کا مقصد ''مساکین کی خوراک'' ٹھہرایا ہے، اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ فطرانہ میں اشیائے خوردنی ہی ادا کی جائیں، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہم) صرف جنس ہی ادا کرنے کے قائل ہیں، محدثین کرام میں سے کسی نے بھی اس بات کی صراحت نہیں کی کہ فطرانہ میں قیمت دی جا سکتی ہے۔ بلکہ محدث ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان

یوں قائم کیا ہے۔

''اس باب میں صدقہ فطر کے طور پر ہر قسم کی اشیائے خوردنی ادا کرنے کا بیان ہے نیز اس شخص کے خلاف دلیل ہے جو صدقہ فطر میں پیسے اور نقدی ادا کرنے کو جائز خیال کرتا ہے۔'' [صحیح ابن خزیمہ]

اس کے بعد انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ رمضان کا فطرانہ ایک صاع طعام سے ادا کیا جائے۔ جو گندم سے قبول کی جائے گی، نیز جو، کھجور، منقیٰ وغیرہ کو بھی قبول کیا جائے گا۔ حتیٰ کہ انہوں نے آٹے، ستو کا بھی ذکر فرمایا ہے لیکن اس میں قیمت کا کوئی ذکر نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ فطرانہ میں قیمت ادا کرنے سے بالکل نا آشنا تھے۔ [صحیح ابن خزیمہ]

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ فطرانہ میں قیمت ادا کرنا بالکل ناجائز ہے کیونکہ قیمت کا ادا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے نیز حقوق العباد میں فریقین کی رضا مندی سے قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔ جب زکوٰۃ کے وقت کوئی مالک نہیں ہوتا جس کی اجازت کا اعتبار کیا جائے۔'' [محلی ابن حزم:۶/۱۳۷]

محدث العصر علامہ عبید اللہ مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ صدقہ فطر میں قیمت نہ دی جائے بلکہ جنس ادا کی جائے البتہ کسی عذر کے پیش نظر قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔'' [مرعاۃ المفاتیح:۴/۱۰۰]

عذر کی صورت یوں ہو سکتی ہے کہ ایک شخص روزانہ بازار سے آٹا خرید کر استعمال کرتا ہے تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ بازار سے غلہ خرید کر صدقہ فطر ادا کرے بلکہ وہ بازار کے نرخ کے مطابق اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔

صاع کا وزن: صاع، وزن کا پیمانہ نہیں بلکہ ماپ کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں وزن کے پیمانے موجود تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کے لیے وزن کے بجائے ماپ کے پیمانہ کا انتخاب کیا اس لیے بہتر ہے کہ اس سنت کا احیا کیا جائے۔ ویسے صاع کا وزن مختلف اجناس کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے صاع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدار 5.33 رطل تھی۔ [فتح الباری:۱/۳۰۵]

مختلف فقہا کی تصریح کے مطابق ایک رطل نوے مثقال کا ہوتا ہے اس حساب سے 5.33 رطل (صاع نبوی صلی اللہ علیہ وسلم) کے 480 مثقال بنتے ہیں۔ ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے 480 مثقال کے دو ہزار ایک سو ساٹھ (2160) ماشے ہوئے۔ چونکہ ایک تولہ میں بارہ ماشے ہوتے ہیں، لہٰذا بارہ پر تقسیم کرنے سے ایک سو اسی (180) تولہ وزن بنتا ہے۔ جدید اعشاری نظام کے مطابق تین تولہ کے 35 گرام ہوتے ہیں۔ اس حساب سے 2100 گرام یعنی دو کلو سو گرام ہے پرانے حساب کے مطابق 180 تولہ کا وزن دو سیر چار چھٹانک ہے۔ ہمارے اس موقف کی تائید اس پیمانہ صاع سے بھی ہوتی ہے جو مولانا احمد اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ سے لائے تھے۔ جس کی مقدار دو سیر چار چھٹانک تھی نیز وہ مدینہ سے ایک مد بھی لائے تھے جس کی باقاعدہ سند تھی، اس کی مقدار نو چھٹانک تھی۔ واضح رہے کہ ایک صاع میں چار مد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا عبد الجبار رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب مد کا پیمانہ لائے تھے جس کا وزن کیا گیا تو نو چھٹانک کا تھا۔ [فتاویٰ اہلحدیث:۲/۴۷]

اگرچہ کچھ اہل حدیث حضرات صاع کا وزن پونے تین سیر موجودہ اعشاری نظام کے مطابق اڑھائی کلو بتاتے ہیں، ہم نے اپنی تحقیق نقل کر دی ہے اگر اس سے کسی کو اتفاق نہ ہو تو وہ اپنی تحقیق کے مطابق فطرانہ ادا کرتا رہے۔ ضروری نہیں کہ وہ ہماری پیش

کردہ تحقیق سے متفق ہو۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتا وہ کیا کرے۔(حاجی عبدالرحیم، پنڈی گھیپ، خریداری نمبر ۱۴۹۷)

جواب اگر کوئی بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکتا تو اس کی دو صورتیں ہیں اگر آیندہ تندرست ہونے کی امید نہ ہو تو قضا کے بجائے وہ فدیہ ادا کرے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔''اور جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے وہ فدیہ کے طور ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔'' [۲/البقرہ:۱۸۴]

اگر کوئی اتنا بوڑھا ہو گیا ہو کہ روزہ رکھنے کی ہمت نہیں رہی تو وہ بھی فدیہ دے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ ہے فرماتے ہیں کہ بہت بوڑھے کے لیے رخصت ہے کہ وہ خود رکھنے کے بجائے ہر دن کسی ایک مسکین کو دو وقت کا کھانا دے دے اور اس پر روزہ کی قضا نہیں ہے۔[مستدرک حاکم: ج۱ص۴۴۰] اگر بیماری سے تندرست ہونے کی امید ہے تو اسے چاہیے کہ بعد میں فوت شدہ روزوں کو دوبارہ رکھے۔

سوال ایک آدمی رمضان المبارک میں بلا عذر شرعی بے روزہ رہتا ہے جبکہ اس کی بیوی پابندی سے روزے رکھتی ہے، خاوند بیوی سے اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے، بیوی کے بار بار انکار کرنے کے باوجود وہ باز نہیں آتا، اب عورت مجبور ہے، اس کا روزہ ٹوٹنے پر اسے گناہ ہوگا یا نہیں، نیز خاوند کا کردار شریعت کی نظر میں کیسا ہے؟ کیا اس پر کوئی حد یا تعزیر لگائی جا سکتی ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں جواب دیں۔(محمد افضل......ڈسکہ)

جواب واضح رہے کہ گھر میں رہتے ہوئے رمضان المبارک میں ہر عاقل و بالغ کے لیے روزہ رکھنا فرض ہے بشرطیکہ وہ تندرست ہو، بلا وجہ روزہ ترک کرنا بہت سنگین جرم ہے۔حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ایسا انسان ہر قسم کی خیر و برکت سے محروم کر دیا جاتا ہے اور قیامت کے دن وہ بڑی المناک سزا سے دوچار ہوگا اور جو انسان کسی دوسرے کے روزے کو خراب کرنے کا باعث ہے وہ بھی اسی قسم کی سزا کا حقدار ہے۔رمضان المبارک میں روزہ توڑنے کا کفارہ یا تاوان اس صورت میں پڑتا ہے جب پہلے روزہ رکھا ہوا ہو پھر اسے خراب کر دیا جائے۔صورت مسئولہ میں خاوند نے ایک سنگین قسم کی غلطی کا ارتکاب کیا ہے جو شرعاً قابل تعزیر ہے لیکن قابل حد نہیں ہے اسے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا چاہیے۔البتہ بیوی مجبور اور بے بس ہے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، چونکہ اس کا روزہ ٹوٹ چکا ہے اس لیے رمضان کے لیے اس روزہ کی قضا دینا ہوگی، جب بھی موقع ملے، اپنے خاوند کے علم میں لا کر روزہ رکھ لے۔ [واللہ اعلم]

سوال میرا ایک دوست سعودیہ میں ایک روزہ رکھ کر رمضان کو پاکستان آیا، اب اگر وہ مسلسل روزہ رکھتا رہے تو تیس رمضان کو اس کے اکتیس روزے ہو جائیں گے، اب اسے کیا کرنا چاہیے۔(عبدالواحد......فیصل آباد)

جواب رمضان المبارک کے متعلق شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اگر انتیس کو چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے پورے کیے جائیں، اس کے بعد عید کی جائے، صورت مسئولہ میں متعلقہ شخص کے ہمارے ہاں انتیس رمضان کو تیس روزے ہو جائیں گے، اسے مزید روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ہمارے ہاں تیس تاریخ کو روزہ نہ رکھے البتہ احترام رمضان کے پیش نظر وہ برسر عام کھانے پینے سے اجتناب کرے، اسی طرح اگر کوئی پاکستان سے سعودیہ جاتا ہے تو اس کے روزے کم ہوں گے، اسے چاہیے کہ وہاں لوگوں کے ساتھ

عید منانے کے بعد اپنے روزہ کی کمی کو پورا کرے یعنی عید کے بعد قضا کرے، اگر کسی کے تیس سے زیادہ روزے بنتے ہیں تو اسے تیس سے زائد رکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ عید لوگوں کے ساتھ کرنا ہوگی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''روزے کم ہونے کی صورت میں انہیں عید کے بعد پورے کرے۔'' [واللہ اعلم]




خرید و
فروخت

خرید و فروخت

سوال فاروق آباد سے سعید ساجد لکھتے ہیں کہ آج کل قسطوں کا کاروبار تقریباً ۷۵ فیصد لوگ کر رہے ہیں، جس کی صورت یہ ہے کہ ایک آدمی کوئی گاڑی نقد خرید تا ہے تو وہ پانچ لاکھ روپے کی ہے لیکن قسطوں میں وہی گاڑی آٹھ لاکھ روپے میں ملتی ہے کیا یہ صورت سود کے زمرے میں تو نہیں آتی ؟

جواب واضح رہے کہ صورت مسئولہ کا تعلق مالی معاملات سے ہے، مالی معاملات کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ مگر یہ کہ کوئی مال رضامندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے''۔ [۴/النسآء:۲۹]

باطل طریقہ سے مراد لین دین، کاروبار اور تجارت کے وہ طریقے ہیں جن میں فریقین کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں ایک فریق کا تو مفاد محفوظ رہتا ہے جبکہ دوسرا غرر یا ضرر کا ہدف بنتا ہے۔ اگر کسی معاملہ میں دھوکہ پایا گیا یا اس میں ایک فریق کی بے بسی اور مجبوری کو دخل ہو تو اگر چہ وہ بظاہر اس پر راضی بھی ہوں تاہم شریعت کی رو سے یہ باطل طریقے ہیں۔ جنہیں شریعت نے ناجائز ٹھہرایا ہے اس لیے لین دین اور باہمی تجارت نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ ہی اس میں فریب اور ضرر کو دخل ہو اگر چہ خرید و فروخت کی حلت قرآنی نص سے ثابت ہے۔ [۲/البقرہ:۲۷۵] لیکن ہر قسم کی خرید و فروخت حلال نہیں ہے۔ بلکہ مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔

① فریقین باہمی رضامندی سے سودا کریں۔

② خرید کردہ اشیاء اور ان کا معاوضہ مجہول نہ ہو۔

③ قابل فروخت چیز فروخت کنندہ کی ملکیت ہو اور وہ اسے خریدار کے حوالے کرنے پر قادر ہو۔

④ فروخت کردہ چیز میں کسی قسم کا عیب چھپا ہوا نہ ہو،

⑤ خرید و فروخت کسی حرام چیز کی نہ ہو اور نہ ہی اس میں سود وغیرہ کو بطور حیلہ جائز قرار دیا گیا ہو۔

⑥ اس خرید و فروخت میں کسی فریق کو دھوکہ دینا مقصود نہ ہو۔

⑦ اس تجارتی لین دین میں حق رجوع کو برقرار رکھا گیا ہو۔

کتب حدیث میں خرید و فروخت کی تقریباً 30 اقسام کو انہی وجہ سے حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ پھر عام طور پر خرید و فروخت کی دو قسمیں ہیں:

(الف) نقد۔ (ب) ادھار۔

نقد یہ ہے کہ چیز اور اس کا معاوضہ فوراً حوالے کر دیا جائے پھر معاوضہ کے لحاظ سے اس کی مزید دو اقسام ہیں:

① معاوضہ نقدی کی صورت میں ہو۔

② معاوضہ جنس کی صورت میں ہو۔

جہاں معاوضہ جنس کی صورت میں ہو اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) حرام۔ (ب) جائز۔

حرام یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی خرید وفروخت میں ایک طرف سے کچھ اضافہ ہو جیسا کہ ایک تولہ سونا دے کر دو تولے سونا لینا ایک کلو کھجور کے بدلے دو کلو کھجور لینا وغیرہ۔

جائز یہ ہے کہ مختلف اجناس کی خرید وفروخت کرتے وقت کسی ایک طرف سے کچھ اضافہ کے ساتھ وصولی کرنا مثلاً ایک من گندم کے عوض دو من جو لینا، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ سودا نقد ہو۔

خرید وفروخت کے ادھار ہونے کی صورت میں بھی اس کی کئی اقسام ہیں: مثلاً

① چیز اور اس کا معاوضہ دونوں ہی ادھار ہوں، ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ فقہی اصطلاح میں اسے بیع الکالی کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے۔

② اگر دونوں میں سے ایک نقد اور دوسری ادھار ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں:

① معاوضہ نقدی کی صورت میں پہلے ادا کر دیا جائے لیکن بیع یعنی فروخت کردہ جنس بعد میں حوالہ کرنا ہو اسے بیع سلم یا سلف کہا جاتا ہے اس کی شرعاً اجازت ہے بشرطیکہ: (الف) جنس کی مقدار اور اس کا بھاؤ پہلے سے طے شدہ ہو (ب) جنس کی ادائیگی کا وقت بھی متعین ہو۔

② بیع یعنی فروخت کردہ چیز پہلے وصولی کر لی جائے لیکن معاوضہ کی ادائیگی ادھار ہو، یہ بھی جائز ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر کے آخری دور میں ایک یہودی سے آیندہ قیمت کی ادائیگی پر کچھ جو لیے تھے اسے بیع نسیہ کہتے ہیں اس بیع کی دو صورتیں ہیں۔

① فروخت کردہ چیز کا بھاؤ ایک ہو خواہ نقد یا ادھار، اس کے جواز میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

② فروخت شدہ چیز کے نقد اور ادھار کے دو بھاؤ ہوں اس کے جواز یا عدم جواز کے متعلق علما کا اختلاف ہے، صورت مسئولہ میں بھی اسی کو بیان کیا گیا ہے، اس کے متعلق ہم نے کچھ گزارشات پیش کرنی ہیں لیکن ان گزارشات سے پہلے دو اصولی باتیں گوش گزار کرنا ضروری خیال کرتے ہیں:

① معاملات اور عبادات میں فرق یہ ہے کہ عبادات میں اصل حرمت ہے الا یہ کہ شریعت نے اس کی بجا آوری کا حکم دیا ہو جبکہ معاملات میں اصل اباحت ہے الا یہ کہ شریعت نے کسی کے متعلق حکم امتناعی دیا ہو۔ صورت مسئولہ کا تعلق معاملات سے ہے اس کے متعلق ہم نے حکم امتناعی تلاش کرنا ہے۔ بصورت دیگر یہ حلال اور جائز ہے۔

② کسی چیز کا بھاؤ متعین کر دینا شرعاً جائز نہیں ہے رسول اللہ ﷺ کو اہل مدینہ نے اشیاء کے بھاؤ متعین کر دینے کے متعلق عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق اور اتار چڑھاؤ کا مالک ہے نیز وہ تمام مخلوق کا رازق ہے میں نہیں چاہتا کہ

قیامت کے دن میرے ذمے کسی کا کوئی حق ہو"۔ [مسند امام احمد:۳/۱۵۶]

اس بنا پر اشیاء کی قیمتیں توقیفی نہیں ہیں کہ ان میں کمی بیشی نہ ہوسکتی ہو نیز کسی چیز کا نفع لینے کی شرح کیا ہو؟اس کے متعلق بھی شریعت کا کوئی ضابطہ نہیں ہے بعض صحابہ کرام سے ایسے واقعات بھی منقول ہیں کہ انہوں نے قیمت خرید پر دوگنا نفع وصول کیا۔[صحیح بخاری]

صورت مسئولہ یوں ہے کہ ایک دکاندار اپنی اشیاء بایں طور فروخت کرتا ہے کہ نقد ادائیگی کی شکل میں ایک چیز کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے لیکن وہی چیز ایک سال کے ادھار پر ۴۰۰ میں اور دوسال کے ادھار پر ۵۰۰ روپے میں فروخت کرتا ہے۔ادھار کی شکل میں خریدار کو اختیار ہے کہ وہ سال کے اختتام پر واجب الادا رقم یکمشت ادا کردے یا حسب معاہدہ اس رقم کو بالاقساط ادا کرے،موجودہ دور میں قسطوں پر اشیائے ضرورت بیچنے کا رواج تمام اسلامی ممالک میں عام ہو چکا ہے اور بہت سے لوگ اپنی ضرورت کی اشیاء صرف قسطوں پر خرید سکتے ہیں اور نقد خریدنا ان کی طاقت سے باہر ہوتا ہے واضح رہے کہ قسطوں کی صورت میں ایک چیز کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے بعض علما اس زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں کیوں کہ ثمن کی یہ زیادتی "مدت" کے عوض میں ہے اور جو ثمن "مدت" کے عوض میں ہو وہ سود ہے جسے شریعت نے حرام کہا ہے۔علامہ شوکانی نے زین العابدین علی بن حسین،ناصر،ہادویہ کا یہی مسلک نقل کیا ہے لیکن ائمہ اربعہ،جمہور فقہا اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ خرید وفروخت کے عمومی دلائل کے پیش نظر ادھار بیع میں نقد کے مقابلہ میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے۔بشرطیکہ خریدار اور فروخت کنندہ ادھار یا نقد قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک قیمت پر متفق ہو جائیں۔ [نیل الاوطار:۵/۱۷۲]

لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ میں یہ چیز نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں فروخت کرتا ہوں،اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کئے بغیر دونوں جدا ہو جائیں جہالت ثمن کی وجہ سے یہ بیع ناجائز ہے لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کرلیں تو بیع جائز ہوجائے گی چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جامع ترمذی میں لکھتے ہیں:

"بعض اہل علم نے حدیث ((بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ)) کی تشریح بایں الفاظ کی کہ "بائع مشتری سے کہے کہ میں یہ کپڑا تمہیں نقد دس اور ادھار بیس روپے میں فروخت کرتا ہوں اور پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کر کے جدائی نہیں ہوئی لیکن اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدائی ہوئی تو اس میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ معاملہ ایک پر طے ہوگیا ہے"۔ [جامع ترمذی:کتاب البیوع]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ ((بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ)) کے ناجائز ہونے کی علت یہ ہے کہ عقد کے وقت کسی ایک صورت کی عدم تعیین سے ثمن دو حالتوں میں متردد ہو جائے گی اور یہ تردد جہالتِ ثمن کو مستلزم ہے جس کی بنا پر ناجائز ہوئی،مدت کے مقابلہ میں ثمن زیادتی ممانعت کا سبب نہیں لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین ہو جائے اور جہالت ثمن کی خرابی دور کردی جائے تو پھر اس کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں رہے گی،کیوں کہ قرآن وحدیث میں اس بیع کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں،علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ معاملات کے متعلق فرماتے ہیں:"جو معاملات انسان کو ضرورت کے طور پر پیش آتے ہیں وہ سب حلال اور جائز ہیں الا یہ کہ اس کی حرمت پر قرآن وحدیث میں کوئی واضح دلیل موجود ہو"۔ [مجموع الفتاویٰ:۲۸/۳۸۶]

ہم نے آغاز میں جو ایک اصول بیان کیا تھا اسے ایک مرتبہ پھر بنظر غائر دیکھ لیا جائے اور اس بیع میں جو ثمن کی زیادتی ہے اس

پر ربا کی تعریف بھی صادق نہیں آتی کیوں کہ وہ قرض نہیں اور نہ ہی اموال ربویہ کی خرید وفروخت ہو رہی ہے بلکہ یہ عام بیع ہے اور اس عام بیع میں فروخت کنندہ کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت میں چاہے فروخت کرے اور اس کے لیے شرعاً یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی چیز کو بازار کے بھاؤ سے فروخت کرے اور قیمت کی تعیین میں ہر تاجر کا اپنا ایک اصول اور انداز ہوتا ہے اس پر پابندی نہیں ہے کہ وہ ایک متعین ریٹ پر اپنی اشیاء کو فروخت کرے اس سلسلہ میں ہمارا بیان کردہ دوسرا اصول پیش نظر رہنا چاہیے کہ بعض اوقات ایک ہی چیز کی قیمت حالات کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے اگر کوئی بائع اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں کچھ مقرر کرے اور دوسری حالت میں کوئی دوسری قیمت مقرر کر دے تو شریعت میں اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی چیز نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں فروخت کرتا ہے تو اس شخص کے لیے بالاتفاق یہ جائز ہے کہ وہ اسی چیز کو نقد دس روپے میں فروخت کر دے بشرطیکہ اس میں ضرر یا غرر نہ ہو اور جب دس روپے میں نقد فروخت کرنا جائز ہے تو ادھار دس روپے میں فروخت کرنا کیوں ناجائز ہوا''۔ (فتدبر)

اب ہم قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ زیر نظر مسئلہ میں نقد کی نسبت سے ادھار قیمت میں یہ تفاوت کیا ادھار کا عوض ہے یا ادھار کی وجہ سے ہے؟ ان دونوں کے درمیان مابہ الامتیاز کیا ہے تاکہ بذریعہ نص حرام اور ناجائز سود سے اس کا فرق ہو سکے، واضح رہے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت میں یہ تفاوت ادھار کا معاوضہ نہیں ہے کیوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس ادھار کی قیمت میں کچھ قیمت تو بیع کی ہو اور کچھ قیمت اس اجل کی ہو جو عاقدین نے قیمت کی ادائیگی کے لیے طے کی ہے۔ بلکہ معاشرتی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ادھار میں جو سہولت میسر آتی ہے اس کی وجہ سے کچھ اضافہ ہوا ہے۔ ہم آسانی کے پیش نظر اسے یوں تعبیر کرتے ہیں۔ ''ان الزیاد ھٰھنا لاجل الاجل لا لعوض الاجل'' یہاں پر قیمت میں اضافہ ادھار کی وجہ سے ہے ادھار کے عوض میں نہیں ہے۔ قرآن وحدیث میں اس قسم کی متعدد نظائر پائی جاتی ہیں جس میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں زیادتی آتی ہے جنہیں ہم آئندہ بیان کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجل ایک وصف ہے اور وصف کا معاوضہ نہیں ہوتا لیکن وصف کے مرغوب ہونے کی وجہ سے قیمت بڑھ سکتی ہے اور وصف کے ناپسند ہونے کی وجہ سے قیمت کم ہو جاتی ہے اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو صاع کھجور کے عوض ایک صاع کھجور لینے کو ناجائز ٹھہرایا ہے، آپ نے اس کے متعلق مزید تاکید کی ہے کہ عمدہ کھجور کا بھی مقابلہ ہو تو برابر برابر لینا ہو گا۔ اس کے عمدہ ہونے کی صورت میں اضافہ نہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی لے سکتے ہیں۔ بہترین کھجور کے ایک سیر کے بدلہ میں معمولی کھجور کے دو سیر دینے سے منع فرما دیا کیوں کہ اس میں سیر کے بدلے میں آ جاتا ہے اور دوسرا سیر اس کے وصف جودت (عمدگی) کے عوض میں لیا جاتا ہے جو کہ ناجائز ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کی تدبیر یوں فرمائی کہ ردی کھجور کو کم قیمت میں فروخت کر دو پھر حاصل ہونے والے زر ثمن سے بہتر کھجور کو زیادہ قیمت خرید سے خرید لو اس معاملہ میں بہتر کھجور کی قیمت میں اضافہ اس کے وصف مرغوب کی وجہ سے ہے۔ اس عقلی اور فطری بات سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ مرغوب چیز کی قیمت بمقابلہ نامرغوب کے زیادہ ہو گی۔ لیکن یہ صورت ناجائز ہے کہ ایک سیر بہتر کھجور کے بدلہ میں دو سیر معمولی کھجور دی جائے اس طرح یہ بھی ناجائز ہے کہ بہتر کھجور والے کو معمولی کھجور کا ایک سیر اور اس کے ساتھ ایک روپیہ دیا جائے کیوں کہ اس

صورت یہ روپیہ یا دوسرا سیر وصف جودت کا عوض ثابت ہوگا اور وصف کا عوض لینا جائز نہیں ہے۔ لیکن بہتر کھجور کو عام نرخ سے زیادہ قیمت پر خریدنا بالکل جائز ہے کیوں کہ یہاں قیمت کا اضافہ اس کے وصف (عمدگی) کی وجہ سے اس وصف کا عوضانہ نہیں ہے۔ آپ نے ملتان سے لاہور جانے کا پروگرام بنایا ہے اس کے لیے عام گاڑی، اے سی اور ہوائی جہاز تین ذرائع ہیں، ان تینوں ذرائع کا کرایہ الگ الگ ہے یہ تفاوت ان ذرائع میں دی گئی سہولتوں کے پیش نظر ہے ایسا نہیں ہوتا کہ اصل کرایہ تو عام گاڑی کا ہے تو باقی جو کرایوں میں تفاوت ہے وہ ان سہولتوں کا عوض ہے۔ جو آپ کو دی گئی ہیں اب آپ ادھار پر فروخت کی گئی چیز کی مدت پر غور کریں کہ نفس اجل کا عوض لینا ناجائز ہے لیکن اس کی وجہ قیمت کا بڑھ جانا فطری اور عقلی بات ہے اور شریعت نے اس سے منع نہیں کیا، اسی کو فقہائے اسلام نے یوں تعبیر کیا ہے: "ان الاجل لایقابله الثمن ان الثمن یزاد لاجل الاجل" ثمن، اجل کا عوض نہیں ہوتی البتہ اجل کی وجہ سے اس میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

نفس اجل پر عوض لینے کی صورت یوں ہوسکتی ہے کہ ایک ماہ پر کسی چیز کا ادھار سودا ہوا کہ اس کی قیمت ایک ہزار روپیہ ایک ماہ پر ادا ہوگی، جب خریدار نے ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا نہ کی تو اسے کہا جائے کہ آپ دوسرے ماہ کے اختتام پر اس کی قیمت ادا کر دیں لیکن ساتھ پچاس روپے اضافی طور پر دیں۔ یہ صورت ناجائز ہے۔ کیوں کہ اس میں اجل کو فروخت کیا گیا ہے اور پچاس روپے اس اجل کا عوض ہیں اس کے برعکس اجل ایک وصف مرغوب ہے کہ مشتری کو فوری طور پر رقم ادا نہیں کرنا پڑتی، آسانی سے کام چلا لیتا ہے۔ اس لیے وہ چیز ادھار پر دینے کی وجہ سے اس کی قیمت میں اضافہ ہوگیا۔ اس بیع مؤجل اور معاملہ سود میں فرق یہ ہے کہ سودی معاملہ میں اصل دین (قرض) پر مہلت کے عوض اضافہ ہوتا ہے جبکہ بیع مؤجل میں مہلت کی وجہ سے بوقت عقد زیادہ قیمت طے کی جاتی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ سودی معاملہ میں مدت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس زیادتی میں اضافہ ہو جاتا ہے جبکہ بیع مؤجل میں ایک ہی دفعہ قیمت زیادہ لگائی جاتی ہے، بار بار ایسا نہیں کیا جاتا، ہم اسے ایک مثال سے سمجھاتے ہیں:

اگر مشتری نے کوئی چیز دس روپے میں اس شرط پر خریدی کہ ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرے گا اگر وہ ایک ماہ کے بجائے دو ماہ میں قیمت ادا کرے تو بھی وہ دس روپے ہی ادا کرے گا۔ اب مدت کی زیادتی کی وجہ سے قیمت میں زیادتی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر بائع معاملہ طے ہونے کے بعد ایک ماہ کی تاخیر پر دو، پھر دو ماہ کی تاخیر پر چار اور اسی طرح تین ماہ کی تاخیر پر چھ روپے اصل طے شدہ رقم سے زیادہ وصول کرے تو یہ سود ہے جو کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

قارئین کرام! جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ زیر نظر مسئلہ یعنی نقد اور ادھار کے بھاؤ میں کمی بیشی کرنا شرعاً جائز ہے۔ کیوں کہ یہ ادھار خرید و فروخت کی ہی ایک صورت ہے۔ جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ اور اس کے متعلق صریح نصوص موجود ہیں۔ تاہم ادھار کی بنا پر قیمت زیادہ وصول کرنا فکر و نظر اور غور و خوض کا متقاضی ہے کیوں کہ خرید و فروخت کی بعض صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں ادھار جائز نہیں ہے جیسا کہ سونے کے بدلے سونا یا گندم کے عوض جو لینا اسی طرح بعض صورتیں ایسی ہیں کہ کسی طرف سے اضافہ حرام ہے جیسا کہ چاندی کے بدلے چاندی کا کاروبار کرنا، نیز ادھار کی وجہ سے قیمت بڑھا دینا کسی صریح نص سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ قرائن و شواہد اور استنباط و استخراج سے اس کا جواز ملتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

''ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم ایک وقت مقررہ تک ادھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو''۔

[۲/البقرہ ۲۸۲]

اس آیت کو آیت مداینہ کہا جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک کیے ہوئے عقد سلم کے معاملہ کو اپنی کتاب میں آیت مداینہ کی رو سے حلال قرار دے کر اس کی اجازت دی ہے''۔ [مستدرک حاکم: ۲/۲۸۶]

عقد سلم کی تعریف محدثین اور فقہا نے بایں الفاظ کی ہے: ''بیع اجل بعاجل'' نقد پیشگی قیمت دے کر آئندہ خرید کردہ چیز وصول کرنے کا عقد، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی مشتری مقررہ شرائط کی رعایت کرتے ہوئے کسی شخص کو ایک ہزار روپیہ دے اور یہ معاہدہ کرے کہ تم یہ رقم پیشگی وصول کر کے فلاں وقت مجھے اتنی گندم اس بھاؤ سے دینے کے پابند ہو اور بائع بھی مقرر شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے رقم وصول کر کے معاہدہ کرے تو اسے عقد سلم کہا جاتا ہے، اس عقد کی ماہیت پر غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مشتری وقتی طور پر یکمشت زر سلم کی ادائیگی پر تیار ہو کر مہینوں تک خرید کردہ چیز کی وصولی کا انتظار کرتا ہے ایسا کیوں ہے؟ کیا اس میں فریق ثانی کی خیر خواہی اور ہمدردی مقصود ہے؟ ہرگز نہیں اگر ایسی بات ہوتی تو اسے قرضہ حسنہ دیتا جو مشکل کے وقت اس کے کام آتا۔ متعدد شرائط کی رعایت کر کے پیشگی رقم دے کر مہینوں تک خرید کردہ چیز کی وصولی کا انتظار کرنے سے اس کا بنیادی مقصد یہ ہوتا کہ اسے مقررہ وقت پر خرید کردہ چیز ارزاں قیمت میسر ہو کیوں کہ عقد سلم میں خرید کردہ چیز بائع کو بازار کی قیمت سے سستی پڑتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ عقد سلم میں قیمت کی پیشگی ادائیگی اور خرید کردہ چیز کی تاخیر سے اس چیز کی قیمت متاثر ہوتی ہے۔ عقد سلم میں ادھار شرط ہے جیسا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس پر ایک عنوان بھی قائم کیا ہے اگر اس میں ادھار نہ ہو تو عقد سلم کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب بیع آجل بعاجل میں ادھار کی وجہ سے قیمت میں تفاوت کا آنا ممنوع نہیں تو زیر نظر مسئلہ جو دراصل بیع عاجل بآجل ہے۔ اس میں قیمت کا تفاوت کیوں ممنوع قرار دیا جائے۔ بلکہ نقد ادھار کی وجہ سے خرید کردہ چیز اور اس کی قیمت کا متاثر ہونا یعنی کم یا زیادہ ہونا غیر مشروع نہیں اور نہ ہی سود کے زمرے میں آتا ہے۔ (فتدبر)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالشحم نامی ایک یہودی سے تیس صاع جو ادھار پر لیے اور اپنی زرہ اس کے ہاں گروی رکھی''۔ [بخاری کتاب: البیوع باب شراء النبی بالنسیہ]

ہم یہودی کے اس معاملہ کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ایک متعصب دشمن اسلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اور اس کے بعد روزمرہ ضروریات میں کام آنے والی چیز زرہ کو رہن رکھنے کے پس پردہ واقعات کا جائزہ لینے سے جو صورت سامنے آتی ہے اس میں زیر نظر مسئلہ کے جواز پر قوی شواہد موجود ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرہ میں جب کسی چیز کی مانگ زیادہ ہو تو اس کے خریدار بھی بڑھ جاتے ہیں اور جب خریدار زیادہ ہوں تو اس چیز کے نقد فروخت ہونے کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں ایسے موقع پر بائع ادھار کی نسبت نقد کو زیادہ ترجیح دیتا ہے۔ ہاں اگر اسے ادھار فروخت کرنے میں مالی منفعت زیادہ نظر آئے تو پھر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملہ کے وقت مدینہ منورہ کی معاشی حالت یہ تھی کہ غلہ کی ضرورت بہت زیادہ تھی عموماً

لوگوں کو بیرونی قافلوں کے آنے کا انتظار کرنا پڑتا اور جب بھی قافلہ آنے کی خوشخبری سنائی جاتی تو فاقہ زدہ معاشرہ کی حالت بسا اوقات غیر ہو جاتی۔ چنانچہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ خطبہ جمعہ دے رہے تھے کہ قافلہ آنے کی خبر ملی، خبر سنتے ہی صحابہ کرام کی کثیر تعداد رسول اللہ ﷺ کو خطبہ کی حالت میں اکیلے چھوڑ کر قافلہ کی طرف دوڑ پڑی اور اس وقت خرید وفروخت کی مارکیٹ پر یہود کا قبضہ تھا۔ وہ قافلہ سے غلہ خرید کر بعد میں اپنی مرضی کی قیمت پر اسے فروخت کرتے تھے۔ ایسی ضرورت کی اشیاء میں انہیں نقد کا گاہک بسہولت میسر تھا۔ یہ لوگ نقد کی بجائے ادھار کو ترجیح کسی شوق یا جذبہ ہمدردی کی وجہ سے نہ دیتے تھے بلکہ مالی منفعت کی خاطر ادھار کا معاملہ کرتے تھے۔ ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ کے ادھار کے معاملہ میں غالب گمان یہی ہے کہ نقد کی نسبت سے ادھار میں قیمت کا تفاوت لازمی طور پر اختیار کیا گیا ہوگا، مالی منفعت اور زیادہ قیمت کی وصولی کے سوا یہودی کے اس اقدام کے لیے اور کوئی دوسرا محرک نظر نہیں آتا تھا۔

آخر میں ہم شیخ عبدالعزیز ابن باز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ درج کئے دیتے ہیں کیوں کہ اس فتویٰ سے مزید کئی پہلو روشن ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب سے کسی نے بایں الفاظ سوال کیا:

''بیع میں اگر نقد کی نسبت ادھار یا قسطوں پر قیمت زیادہ ہو تو اس کا حکم کیا ہے؟''

اس پر آپ نے حسب ذیل جواب دیا:

''معلوم مدت والی بیع جائز ہے جبکہ اس بیع میں معتبر شرائط پائی جاتی ہوں، اس طرح قیمت کی قسطیں کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں جبکہ یہ اقساط معروف اور مدت معلوم پر مشتمل ہوں چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! جب تم ایک مقررہ مدت کے ادھار پر لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو''۔ [۲/البقرہ:۲۸۲]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب کوئی شخص کسی چیز میں بیع سلم کرے تو ناپ تول اور مدت معین کر کے کرے۔'' [صحیح بخاری]

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے متعلق احادیث میں ہے کہ انہوں نے خود کو اپنے مالکوں سے اوقیہ چاندی میں خرید لیا کہ ہر سال ایک اوقیہ چاندی ادا کرنا ہوگی۔ [صحیح بخاری]

یہی قسطوں والی بیع ہے رسول اللہ ﷺ نے اس بیع کو معیوب خیال نہیں کیا بلکہ آپ خاموش رہے اس سے منع نہیں فرمایا اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ قسطوں میں قیمت نقد کے برابر ہو یا مدت کی وجہ سے زیادہ ہو۔ [فتاویٰ شیخ عبدالعزیز ابن باز:۱۴۲]

ایک اور فتویٰ میں آپ نے اس روایت سے بھی اس کے جواز پر استدلال کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ وہ ایک لشکر ترتیب دیں اور اس کے لیے لوگوں سے حاضر اونٹ اس شرط پر خرید لیں کہ جب زکوٰۃ کے اونٹ آئیں گے تو ایک اونٹ کے عوض دو اونٹ دیئے جائیں گے''۔ [مستدرک حاکم وبیہقی]

ان قرائن وشواہد کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کیا جاسکتا ہے اور ادھار کی اقساط بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ معاملہ غلط ہے کہ اگر کسی ایک قسط میں دیر ہو جائے تو اس کی باقی اقساط ضبط کر لی جائیں یا مدت بڑھا کر ان میں مزید اضافہ کر دیا جائے ایسا کرنا سراسر زیادتی اور ظلم کے ساتھ ساتھ صریح سود ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایمن آباد سے عبدالرحمٰن بھٹی لکھتے ہیں کہ بعض دکاندار نئے نوٹوں پر مشتمل/۵۰۰ روپے والی کاپی ۔/۵۵۰ روپے میں فروخت کرتے ہیں اسی طرح کنڈیکٹر حضرات ۔/۱۰ روپے کے عوض ۹ روپے کے سکے لیتے ہیں، اس کاروبار کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟ نیز نئے نوٹوں کے ہار بنانے پر جو محنت کی جاتی ہے اس کے عوض ۵۰۰ روپے کے ہار پر پچاس روپے اضافی لیے جاتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب صورتِ مسئولہ میں نوٹوں کا نوٹوں سے تبادلہ کی دو صورتیں ممکن ہیں۔

① ایک ہی ملک کی کرنسی کا مختلف مقدار کے نوٹوں کا باہمی تبادلہ۔

② ایک ملک کی کرنسی کا دوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ، ایک ہی ملک کے کرنسی نوٹوں کا تبادلہ مساوات اور برابری کے ساتھ جائز ہے۔اس میں نئے اور پرانے نوٹوں کی حیثیت ایک ہوگی، اس کے برعکس اگر نئے نوٹوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کیا جائے مثلاً: ۱۱۰ روپے کے عوض ۱۰۰ روپے کے نئے نوٹ لینا یہ ناجائز ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنا صریح سود ہے۔ جسے شریعت نے حرام ٹھہرایا ہے چونکہ ان کی قیمت خرید ایک جیسی ہے اور جہاں مقدار کا اعتبار ہوتا ہے وہاں اوراوصاف (نئے اور پرانے ہونا) کو کسی مقدار کے مقابلہ میں نہیں لایا جاسکتا کیوں کہ جو چیز شرعی طور پر یا عرف عام میں ثمن بن گئی ہو اس میں اوصاف کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔لہٰذا ایک روپیہ کا سکہ یا نوٹ خواہ وہ کتنا ہی نیا اور چمکدار ہو، اس کی قیمت ایک ہی روپیہ رہے گی۔اسی طرح وہ سکہ یا نوٹ خواہ کتنا ہی پرانا اور میلا کچیلا ہو جائے اس کی قیمت بھی ایک روپیہ ہی ہوگی۔ حالانکہ ان دونوں کے اوصاف میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔لیکن بازاری اصطلاح میں یہ فرق کالعدم ہو چکا ہے۔اس بنا پر اگر ایک روپیہ کو دو روپیہ کے عوض فروخت کیا جائے تو ناجائز ہوگا۔یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک روپے کے مقابلہ میں ایک روپیہ ہے اور دوسرا روپیہ جو زائد ہے وہ دوسری طرف کے روپے کے کسی وصف (نئے ہونے) کے مقابلہ میں ہے یہ تعبیر سرے سے غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دوسرے روپے کے مقابلہ میں کوئی عوض موجود نہیں ہے۔لہٰذا یہ سود ہے۔

پھر یہ برابری اور مساوات کرنسی نوٹوں کی مقدار اور گنتی کے لحاظ سے نہیں ہوگی۔ بلکہ مساوات میں ان نوٹوں کی ظاہری قیمت کا اعتبار کیا جائے گا جو اس پر لکھی ہوئی ہے لہٰذا سو روپے کے ایک نوٹ کا تبادلہ پچاس روپے کے دو نوٹوں سے جائز ہے۔اس تبادلہ میں اگرچہ ایک طرف ایک نوٹ ہے اور دوسری طرف دو ہیں لیکن ظاہری قیمت کے لحاظ سے پچاس روپے کے دو نوٹوں کی قیمت سو روپے کے ایک نوٹ کے برابر ہے۔لہٰذا مساوات گنتی میں نہیں بلکہ اس قیمت میں ہونی چاہیے۔جس کی وہ نوٹ نمائندگی کر رہا ہے۔ہاں اگر نوٹ بذات خود بحیثیت مادہ مقصود ہوں تو ان کی ظاہری قیمت مقصود نہ ہوگی جیسا کہ بعض لوگ مختلف ممالک کے سکے اور کرنسی نوٹ تاریخی یادگار کے طور پر جمع کرتے ہیں۔ان کا مقصد تبادلہ یا بیع یا ان کے ذریعے منافع حاصل کرنا نہیں تو بظاہر اس قسم کے تبادلہ میں کمی وبیشی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔لیکن سدباب کے طور پر اس سے بھی گریز کرنا چاہیے۔مختلف ممالک کی کرنسیاں مختلف اجناس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ان کے درمیان کمی وبیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا بالاتفاق جائز ہے۔لہٰذا ایک ریال کا تبادلہ پاکستانی سولہ روپے سے کیا جاسکتا ہے۔اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نئے نوٹوں کے ۔/۵۰۰ روپے والا بنڈل ۔/۵۵۰ روپے میں فروخت کرنا، اسی طرح کنڈیکٹر حضرات کا دس روپے کے عوض نو روپے کے سکے خریدنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

نئے نوٹوں کے ہار بنا کر زیادہ قیمت سے فروخت کرنا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ جب یہ کاروبار ہی جائز نہیں تو اس کا حق محنت کے ناجائز ہونے میں کیا شک ہوگا، اس میں مندرجہ ذیل قباحتیں پائی جاتی ہیں۔

① جب۔/۵۰۰ روپے کا ہار۔/۵۵۰ روپے میں خرید ا جاتا ہے تو زائد پچاس روپے حق محنت نہیں بلکہ سود کو جائز قرار دینے کا ایک چور دروازہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس ہار کو واپس کیا جاتا ہے تو اسے قیمت فروخت سے کم قیمت پر خرید ا جاتا ہے۔ اسے واپس کرنے پر محنت کا معاوضہ ختم کر دینا اس بات کی دلیل ہے کہ حق محنت کو بطور بہانہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اصل اعتبار ان پچاس روپے کا ہے جو اس تبادلہ میں بطور سود لیے گئے ہیں۔

② دین اسلام میں ضروریات زندگی کے لیے دولت خرچ کرنا جائز اور مباح ہے۔ لیکن فضولیات زندگی پر سرمایہ برباد کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے مال ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ [صحیح بخاری]

نوٹوں کے ہار پہننا انسانی ضرورت نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دولت کی نمائش اور اس پر فخر و مباہات کیا جاتا ہے۔ اسلام اس قسم کی فضول حرکات کی اجازت نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ قیامت کے دن اس جرم کی پاداش میں اسے دھر لیا جائے لہٰذا بندہ مؤمن کو اس قسم کے کاروبار اور نمائشی اعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ پھر قرآن کریم نے اس قسم کے مصرف پر دولت خرچ کرنے کو اسراف و تبذیر کا نام دیا ہے۔ جو اخوانِ شیاطین کا وطیرہ تو ہو سکتا ہے۔ ایک پاک طینت انسان کے لیے اس کی گنجائش نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال عرصہ ہوا محترم شیخ محمد سعید ملتانی نے اپنے کاروبار کے متعلق لکھا تھا کہ میں کپڑے کا کاروبار کرتا ہوں، ہمارا کاروبار خرید و فروخت میں نقد اور ادھار پر منحصر ہوتا ہے، اس سلسلہ میں چند ایک سوالات ہیں، جن کی وضاحت درکار ہے، آج بھی اس وضاحت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اس بنا پر یہ سوالات مع جوابات پیش خدمت ہیں:

○ ہمارے پاس گاہک آیا، اس نے ہم سے ریٹ پوچھا اور نقد رقم کی ادائیگی پر ہم سے مال لیا اور چلا گیا، اس سودے بازی میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ نفع کمایا جائے اور گاہک کی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ رعایت لی جائے، اس سلسلہ میں شرعی طور پر ہم کس شرح سے نفع لے سکتے ہیں؟

جواب اسلام میں خرید و فروخت کے جائز ہونے کی چند ایک شرائط حسب ذیل ہیں:

① فریقین باہمی رضامندی سے سودا کریں۔

② فروخت کردہ اشیاء اور ان کا معاوضہ مجہول نہ ہو۔

③ قابلِ فروخت چیز فروخت کنندہ کی ملکیت ہو اور وہ اسے خریدار کے حوالے کرنے پر قادر ہو۔

④ فروخت کردہ چیز میں کسی قسم کا کوئی عیب چھپا ہوا نہ ہو۔

⑤ کسی حرام چیز کی خرید و فروخت نہ ہو۔

⑥ کاروبار میں سودی لین دین بطورِ حیلہ جائز نہ قرار دیا گیا ہو۔

⑦ اس خرید و فروخت میں کسی فریق کو دھوکہ دینا مقصود نہ ہو۔

⑧ تجارتی لین دین میں حق رجوع کو برقرار رکھا گیا ہو۔

اگر مذکورہ بالا شرائط کسی خرید وفروخت میں پائی جاتی ہیں تو وہ جائز اور حلال ہے۔لیکن اسلام میں کوئی شرح منافع مقرر نہیں ہے۔البتہ کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے بلکہ ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور ایثار کے جذبات ہونے چاہئیں۔ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ۱۰۰٪ نفع کمایا رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف اسے برقرار رکھا بلکہ ان کے لیے خیر وبرکت کی دعا فرمائی۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کو ایک دینار دیا تا کہ وہ آپ کے لیے ایک بکری خرید کر لائے،اس نے منڈی سے ایک دینار کی دو بکریاں خریدیں،پھر ان میں سے ایک کو ایک دینار کے عوض فروخت کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس نفع کا ایک دینار اور خرید کردہ بکری پیش کر دی،رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے خیر وبرکت کی دعا فرمائی۔اس دعا کا یہ اثر تھا کہ اگر وہ مٹی بھی خرید لیتے تو اس سے نفع کماتے۔ [صحیح بخاری:مناقب ۳۶۴۲]

اسی طرح حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے ایک دینار دیا تا کہ وہ اس سے قربانی کا جانور خرید لائے،انہوں نے ایک بکری ایک دینار کے عوض خریدی،راستہ میں انہیں گاہک ملا اسے وہ دو دینار کے عوض فروخت کر دی،وہ دوبارہ منڈی گئے وہاں سے ایک دینار کے عوض ایک اور بکری خریدی اور حاصل کردہ نفع اور خرید کردہ بکری رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دی۔رسول اللہ ﷺ نے حاصل کردہ نفع ایک دینار بھی صدقہ کر دینے کا حکم فرمایا۔ [ابوداؤد:البیوع ۳۳۸۶]

ان روایات سے معلوم ہوا کہ شرح منافع کا شریعت نے کوئی تعین نہیں کیا ہے۔فریقین باہمی رضامندی سے خرید وفروخت کرنے کے مجاز ہیں۔

سوال بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ گاہک آیا اس نے ہم سے ریٹ پوچھا،طے کر کے ہم سے سودا لیا،ہمیں سودے بازی کرتے وقت یہ پتہ نہیں ہوتا کہ گاہک ادھار سودا لے گا یا نقد؟ وہ کبھی نقد رقم دے جاتا ہے اور کبھی ادھار پر مال لے جاتا ہے،کیا اس طرح سودا کرنے میں کوئی قباحت ہے؟

جواب اس سودے بازی میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے،رسول اللہ ﷺ نے نقد قیمت ادا کر کے چیزیں بھی خریدی ہیں اور ادھار پر بھی اشیائے صرف لی ہیں،چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک اونٹ خریدا اور اس کی قیمت نقد ادا کر دی۔ [صحیح بخاری:البیوع ۲۷۱۸]

نیز رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے ادھار رقم کی ادائیگی پر کچھ جو خریدے اور بطور اعتماد اس کے پاس اپنی زرہ گروی رکھ دی۔ [صحیح بخاری:الاستقراض ۲۳۸۶]

اس لیے نقد وادھار خرید وفروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سوال ہم سے گاہک نے مال دیکھا اور ریٹ طے کیا،ہمیں پتہ ہے کہ یہ گاہک ادھار رقم کی ادائیگی پر مال خریدے گا،اس بنا پر ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ادھار لینے والے گاہک سے عام گاہک کی نسبت زیادہ نفع کمایا جائے کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب ایسا کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔کیوں کہ فروخت کار کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ اپنی چیز کی جو چاہے

قیمت لگائے یہی وجہ ہے کہ کسی چیز کا بھاؤ متعین کر دینا شرعاً جائز نہیں ہے۔کیوں کہ ایسا کرنے سے فروخت کار کی حق تلفی ہوتی ہے،ایک دفعہ اہل مدینہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ اشیاء کے بھاؤ متعین کر دیں تو آپ ﷺ نے فرمایا:''کہ اللہ تعالیٰ ہی ان اشیاء کا خالق اور ان کے اتار چڑھاؤ کا مالک ہے، نیز وہ تمام مخلوق کا رازق بھی ہے، میں یہ نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن میرے ذمے کسی کا کوئی حق ہو۔'' [مسند امام احمد:۳/۱۵۶]

اس حدیث کے پیش نظر اشیاء کی قیمتیں توقیفی نہیں کہ ان میں کمی بیشی نہ ہوسکتی ہو۔یہی وجہ ہے کہ شریعت نے ریٹ طے کرنے کا اختیار فروخت کار کو دیا ہے۔چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ ذکر کیا ہے۔''چیز کا مالک بھاؤ لگانے کا زیادہ حق دار ہے''۔پھر آپ نے اس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے بنونجار کو کہا تھا کہ اس احاطہ کا بھاؤ لگاؤ جس میں کھنڈرات اور کھجوریں وغیرہ تھیں اور آپ مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ [صحیح بخاری: البیوع'۲۱۰۶]

پھر نقد اور ادھار کی قیمت کی مالیت میں نمایاں فرق ہے۔شریعت نے اس فرق کو برقرار رکھا ہے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا:''کہ وہ ایک لشکر ترتیب دیں اور اس کے لیے لوگوں سے حاضر اونٹ اس شرط پر خرید لیں کہ جب زکوۃ کے اونٹ آئیں گے تو ایک اونٹ کے عوض دو اونٹ دیئے جائیں گے۔'' [مستدرک حاکم: البیوع'۲۳۴۰]

لہٰذا فروخت کار کا حق ہے کہ ادھار لے جانے والے سے اگر چاہے تو عام گاہک سے اپنے مال کی زیادہ قیمت وصول کرے،اس میں بظاہر شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال ایک صورت بازار میں یہ بھی رائج ہے کہ اگر نقد ادائیگی ہوگی تو ریٹ یہ ہوگا اگر ادھار لوگے تو اتنے دام زیادہ ہوں گے،کیا نقد و ادھار کی قیمت میں فرق کرنا شرعاً جائز ہے؟

جواب شرعی لحاظ سے نقد اور ادھار کی صورت میں کسی چیز کی قیمت کو کم وبیش کرنا جائز ہے۔بشرطیکہ مجلس عقد میں چیز کی مقدار اور ادائے قیمت کی میعاد مقرر کر لی جائے۔اگر چہ ادھار دینے کی صورت میں مختلف مدتوں کے مقابلہ میں مختلف قیمتیں مقرر کر لی جائیں لیکن عاقدین کے درمیان عقد بیع کے وقت مختلف مدتوں اور قیمتوں کے درمیان کسی ایک مدت اور قیمت کا تعین ہونا ضروری ہے۔علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے ائمہ اربعہ، جمہور فقہا اور محدثین کا مسلک بایں الفاظ بیان کیا ہے''کہ خرید وفروخت کے عمومی دلائل کے پیش نظر ادھار بیع میں نقد کی نسبت قیمت زیادہ وصول کرنا جائز ہے۔بشرطیکہ خریدار اور فروختکار ادھار یا نقد کا قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک قیمت پر متفق ہو جائیں۔'' [نیل الاوطار:۵/۱۷۲]

اس بنا پر اگر کہے کہ میں یہ چیز نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں فروخت کرتا ہوں اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو جہالت ثمن کی وجہ سے یہ بیع ناجائز ہوگی لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کر لیں تو بیع جائز ہوگی۔چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''بعض اہل علم حدیث نے ((بَيْعَتَيْنِ فِي بَيْعَةٍ)) تشریح بایں الفاظ کی ہے کہ فروختکار خریدار سے کہے کہ میں یہ کپڑا تجھے نقد دس اور ادھار بیس روپے میں فروخت کرتا ہوں پھر اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدائی ہوئی تو اس میں

کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ ایک معاملہ طے ہو گیا۔ [جامع ترمذی: کتاب البیوع]

نقد اور ادھار قیمت میں فرق کرنے کے متعلق ہمارا مفصل فتویٰ اہل حدیث مجریہ ۷ جون ۲۰۰۲ء، شمارہ ۲۲ میں شائع ہو چکا ہے۔

نوٹ: ہمارے ہاں بعض علما ادھار کی وجہ سے قیمت میں اضافے کو نا جائز کہتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ قیمت میں یہ اضافہ مدت کے عوض میں ہے اور جو اضافہ مدت کے عوض میں ہو وہ سود ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے، لیکن یہ اضافہ مدت کا عوض نہیں بلکہ مدت کی وجہ سے ہوتا ہے کیوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اس ادھار کی قیمت میں کچھ قیمت تو بیع کی ہو اور کچھ قیمت اس مدت کی ہو جو عاقدین نے قیمت کی ادائیگی کے لیے طے کی ہے بلکہ بعض مخصوص معاشرتی حالات کے پیش نظر ادھار میں جو سہولت میسر آتی ہے اس کی وجہ سے کچھ اضافہ ہوا ہے۔ آسانی کے پیش نظر یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ یہاں پر قیمت میں اضافہ ادھار کی وجہ سے ہے ادھار کے عوض میں نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے ہمارے فتویٰ کا مطالعہ کیجیے جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے۔

سوال اب خریداری کی وضاحت پیش خدمت ہے کہ بعض اوقات ہمارے پاس بیوپاری آتے ہیں ان کے پاس مال کے نمونے ہوتے ہیں، فریقین باہمی رضامندی سے ریٹ طے کر لیتے ہیں، ہمیں علم ہوتا ہے کہ یہ سودا مہنگا ہے۔ کیوں کہ ادھار لے رہے ہیں۔ لیکن باہمی رضامندی سے یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ ہفتہ وار کل رقم کا ۴/ ا یا ۸/ ا ادا ہو گا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب اس معاملہ کی دو صورتیں ممکن ہیں: پہلی یہ کہ جب سودا ہو رہا تھا فروختکار کے پاس مال موجود تھا، اگر چہ اس کے سٹور میں ہو۔ وہ معاملہ طے ہونے کے بعد مال مہیا کر دیتا ہے، اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ معاملہ طے کرتے وقت اس کے پاس صرف نمونہ ہی تھا، اس کے پاس مال موجود نہ تھا، اس نے آگے کسی سے خرید کر یا خود تیار کر کے مال مہیا کرنا ہے۔ یہ صورت نا جائز ہے۔ کیوں کہ کسی کو ایسی چیز فروخت کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے جو سودا طے کرتے وقت اس کی ملکیت نہ ہو یا وہ اس وقت مہیا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ ایسی چیز مت فروخت کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔'' یہ حکم امتناعی اس وقت جاری فرمایا جب حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک آدمی آتا ہے اور وہ مجھ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے جو میرے پاس نہیں میں سودا طے کرنے کے بعد بازار سے خرید کر اسے مہیا کرتا ہوں تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ [ابوداود: البیوع ۳۵۰۳]

سوال بعض اوقات ہم پورا مال نقد بازار ریٹ پر خرید لیتے ہیں لیکن ادھار خریدنے کے لیے یہ ہوتا ہے کہ اگر پندرہ دن کا ادھار ہے تو ۵۰ پیسے اور اگر ایک ماہ کا ادھار ہے تو ایک روپیہ فی میٹر ریٹ زیادہ ہوتا ہے۔ مزید مدت بڑھ جائے تو ریٹ بھی بڑھتا جائے گا۔

جواب اس کی پہلے وضاحت ہو چکی ہے کہ نقد اور ادھار ریٹ میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ایک بھاؤ طے کر لیا جائے۔ طے ہو جانے کے بعد مدت کے بڑھنے سے ریٹ کا بڑھانا صریح سود ہے، معاملہ کرتے وقت جو ریٹ طے ہوا ہے اس کے مطابق ادائیگی ہونی چاہیے۔

سوال کوئی کپڑا بازار میں موجود نہیں ہم کسی کارخانہ دار کو اس کا نمونہ دے دیتے ہیں اور اس سے مال فراہم کرنے کی مدت طے

کر لیتے ہیں، اور ریٹ بھی طے ہو جاتا ہے اس مال کی فراہمی میں نقد ادائیگی پر ریٹ علیحدہ اور ادھار پر علیحدہ ہوتا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب شرعی اصطلاح میں اسے بیع سلم کہا جاتا ہے، اس میں رقم پیشگی ادا کی جاتی ہے جبکہ مال بعد میں فراہم کرنا ہوتا ہے، اس میں بھاؤ، وقت فراہمی، جنس، وصف اور پیائش وغیرہ پہلے سے طے کرنا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جو شخص کسی چیز کے متعلق بیع سلم یا سلف کرتا ہے اسے چاہیے کہ متعلقہ چیز کی پیائش یا وزن اور وقت ادائیگی طے کرے۔'' [صحیح بخاری: سلم ۲۲۴۰]

اگر مدت میں مال مہیا نہ کیا جائے تو تاجروں کے عرف میں اسے جرمانہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن ریٹ وغیرہ میں کمی کرنے کا دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا، اس میں رقم پیشگی ہی ادا کرنا پڑتی ہے۔ بصورت دیگر طرفین سے ادھار سے ہوگا جو شرعاً درست نہیں ہے۔

سوال ایک اور صورت جو بازار میں رائج ہے کہ ایک آدمی ایک ماہ کے ادھار پر مال لیتا ہے، پھر معینہ مدت میں ادائیگی نہیں کر سکتا تو فروخت کار تقاضا کرتا ہے کہ جتنی رقم اس کے ذمے بنتی ہے نئی متوقع مدت کے مطابق اتنی رقم کے مال کا نیا بل بنوا لے پھر یہ بل زائد رقم کا بنایا جاتا ہے جبکہ حقیقت میں نہ خریدار کوئی مال لیتا ہے اور نہ ہی فروخت کار کوئی مال دیتا ہے۔ جتنی مدت خریدار بڑھا لے اتنا نفع فروخت کار بڑھا لیتا ہے، اس کے متعلق شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب اگر مجلس عقد میں پہلے سے بھاؤ اور ادائے قیمت کی معیاد طے کر لی گئی تھی تو پھر اگر خریدار بروقت رقم مہیا نہ کر سکے تو ازسر نو اضافہ کے ساتھ قیمت کا تعین کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں وضاحت کی گئی ہے اگر ایسا کیا گیا تو یہ واضح طور پر سود ہے۔ جس سے شریعت نے منع کیا ہے، فروخت کار کو ایسے موقع پر رواداری سے کام لینا چاہیے کہ ادائیگی کی مدت قیمت میں اضافہ کے بغیر بڑھا دی جائے، حدیث میں اس طرح کے تنگ دست کے ساتھ نرمی اور مزید مہلت دینے پر بہت فضیلت آئی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو صرف اس لیے معاف کر دیا تھا کہ وہ مفلوک الحال اور تنگ لوگوں کو مزید مہلت دیا کرتا تھا؟ اگر خریدار رقم دیر سے ادا کرنے کا عادی مجرم ہے تو اس کے سدباب کے لیے جرمانہ وغیرہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ازسر نو سابقہ رقم کو بڑھا کر نیا بل بنانا شرعاً حرام ہے۔ ایسا کرنا اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی کسی دوسرے کو دو لاکھ پاکستانی روپے دے کر پانچ ہزار ڈالر کا سودا کر لیتا ہے باقی رقم کی ادائیگی کے لیے آٹھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے، اب چار دن بعد اس کے پاس ایک آدمی آتا ہے اور پیش کش کرتا ہے کہ تم اپنا بیعانہ مجھ سے لے لو اور مزید پچیس ہزار روپے نفع بھی لے لو اور مذکورہ سودے سے دستبردار ہو جاؤ، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے کیوں کہ:

① کرنسی کے کاروبار میں تبادلہ نقد بنقد ہونا چاہیے۔ جبکہ مذکورہ صورت میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس نے بقایا رقم ادا کر کے پھر ڈالر لینے ہیں، یہ قرض کی قرض کے ساتھ خرید و فروخت ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔

② یہ کاروبار اس لیے ناجائز ہے کہ ابھی مال اس کے ہاتھ میں نہیں آیا یعنی اس نے اس پر قبضہ نہیں کیا اور اسے آگے فروخت کر دیا ہے، جس مال پر انسان کا قبضہ نہ ہو اسے فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ''اس چیز کو مت فروخت کرو جو تیرے

پاس نہیں ہے''۔ [ابوداود: کتاب البیوع]

لہٰذا پچیس ہزار روپے نفع سے دوسرے کے حق میں دستبردار ہونا جائز نہیں ہے بلکہ اسے چاہیے کہ نقد بنقد سودا کر کے اسے اپنے قبضے میں کرے پھر وہ آگے فروخت کرے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال منڈی راجووال سے حاجی عارف اور عزیز احمد لکھتے ہیں کہ کسی نے ایک سومن گندم بحساب -/۳۶۰ روپے فی من فروخت کی ہے اور طے پایا ہے کہ اس کی قیمت دو ماہ بعد وصول کی جائے گی، جبکہ مارکیٹ کا موجودہ ریٹ -/۳۲۵ روپے فی من ہے، کیا ایسا کرنا درست ہے، نیز ایک آدمی ایک سومن گندم کا بھاؤ طے کیے بغیر فروخت کرتا ہے اور یہ طے کرتا ہے کہ دو ماہ بعد جو مارکیٹ کا ریٹ ہوگا اس کے مطابق قیمت وصول کرے گا، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب پہلی صورت جائز ہے، کیوں کہ نقد اور ادھار کے بھاؤ میں فرق کرنا شرعاً جائز ہے، اس کے لیے دو شرطیں ہیں:

① پہلے دن بھاؤ طے ہو جانا چاہیے۔

② اگر وقت مقررہ پر قیمت ادا نہ کر سکے تو اسے مزید مہلت کی وجہ سے بھاؤ میں اضافہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ بیع کی دوسری صورت ناجائز ہے کیوں کہ اس میں بھاؤ طے نہیں ہوا۔ خرید وفروخت کرتے وقت قیمت کا طے ہونا ضروری ہے، قیمت کا مجہول ہونا آیندہ کسی لڑائی جھگڑا کا باعث ہوسکتا ہے۔ لہٰذا شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال منکیرہ سے پروفیسر مجتبیٰ سعیدی لکھتے ہیں کہ چند آدمی مل کر کمیٹی ڈالتے ہیں پھر ایک مقررہ تاریخ پر اس جمع شدہ رقم کی بولی لگائی جاتی ہے جو ممبر سب سے کم بولی لگائے اسے جمع شدہ کمیٹی کی رقم دے دی جاتی ہے، باقی ماندہ رقم تمام ممبران آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اس بولی والی کمیٹی کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب کمیٹی سسٹم کی بعض صورتیں امداد باہمی کا ذریعہ ہیں مثلاً: چند احباب مل کر اپنی اپنی تھوڑی تھوڑی پس انداز رقم کو ماہ بماہ کسی کے پاس جمع کرتے رہتے ہیں۔ پھر ہر مہینے پہلے سے طے شدہ پروگرام یا قرعہ اندازی کے ذریعے تمام جمع شدہ ممبران میں سے کوئی ایک لے لیتا ہے۔ جسے رقم مل جاتی ہے اس کا نام آیندہ طے شدہ پروگرام یا قرعہ اندازی میں شامل نہیں کیا جاتا البتہ اپنی پس انداز رقم ہر ماہ ادا کرتا رہتا ہے اس کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن صورت مسئولہ میں کمیٹی کی جو صورت بیان کی گئی ہے اس کے ناجائز اور حرام ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک کاروبار ہے امداد باہمی کا ذریعہ نہیں ہے اور اس کاروبار کی بنیاد ناجائز ذرائع سے مال کھانے پر ہے جس کی حرمت اللہ تعالیٰ نے بایں الفاظ بیان فرمائی ہے: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ، مگر یہ کہ کوئی مال باہمی رضا مندانہ تجارت کی راہ سے حاصل ہو جائے۔'' [۴/النسآء:۲۹]

باطل طریقوں سے مراد وہ تمام طریقے ہیں جو خلاف حق ہوں اور شرعاً واخلاقاً ناجائز ہوں، آپس کی رضا مندی سے مراد حقیقی باہمی رضا مندی ہے اور یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جس میں ناجائز دباؤ اور فریب ودغا نہ ہو، رشوت اور سود میں بظاہر رضا مندی ہوتی ہے لیکن یہ رضا مندی مجبورانہ ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے، صورتِ مسئولہ اس لیے ناجائز ہے کہ نقد تھوڑی رقم وصول کر کے آیندہ زیادہ رقم ادا کرنا ہے، سود بھی یہی ہے کہ ایک آدمی تھوڑی رقم نقد وصول کر کے آیندہ معین مدت پر زیادہ رقم ادا کرتا ہے، اگرچہ

لین دین باہمی رضامندی سے ہوتا ہے لیکن اس کی بنیاد ''اکل المال بالباطل'' پر ہے، چونکہ یہ ایک کاروبار ہے اور کاروبار میں جب کرنسی کا تبادلہ ہوتا ہے تو مساویانہ طور پر ہونا چاہیے، کمی وبیشی کے ساتھ ایک ہی جنس کا تبادلہ شرعاً حرام ہے جس کی حرمت صریح اور واضح نصوص سے ثابت ہے، لہٰذا اس قسم کے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہیے دراصل رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا مصداق حقیقت کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آرہا ہے حدیث میں ہے کہ ''میری امت پر ایک وقت آئے گا کہ لوگوں کے درمیان حلال وحرام کی تمیز اٹھ جائے گی۔ انسان بڑی لاپرواہی اور ڈھٹائی کے ساتھ حرام مال کھانے کی جرأت کرے گا''۔ [صحیح بخاری: کتاب البیوع]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''کہ ایک وقت آئے گا کہ لوگ سودخواری میں مبتلا ہوں گے۔'' عرض کیا گیا کہ سب لوگ اس میں مبتلا ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو بچنے کی کوشش کریں گے انہیں بھی سود کی گرد وغبار اور دھواں پہنچے گا۔'' [مسند امام احمد]

اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

سوال لاہور سے محمد عمر فاروق لکھتے ہیں ایک آدمی کرنسی کی خرید وفروخت کرتا ہے کیا یہ کاروبار جائز ہے، نیز شیئرز کی خرید وفروخت اور اس کا نفع لینا جائز ہے مثلاً ایک فیکٹری ایک کروڑ روپے کی ہے اس کے پچاس شیئرز مالک اپنے پاس رکھتا ہے اور باقی پچاس لوگوں میں فروخت کر دیتا ہے، یہ حصص خریدنے والے بھی کاروبار میں شریک ہو جاتے ہیں، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب کرنسی کے کاروبار کی دوصورتیں ہیں:

① ایک ہی ملک کے مختلف مقدار کے نوٹوں کا آپس میں تبادلہ کرنا۔

② ایک ملک کے کرنسی نوٹوں کا دوسرے ملک کے کرنسی نوٹوں سے تبادلہ کرنا۔

ویسے تو ان کاغذی نوٹوں کی اپنی ذاتی کوئی قیمت نہیں ہے صرف کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے البتہ حکومت وقت کے اعلان کے بعد یہ ثمن بن گئے ہیں اگرچہ یہ عرفی ثمن کے حامل ہیں تاہم ان کے ذریعے کاروبار کرنا قانونی حیثیت اختیار کر گیا ہے اب اگر ایک ہی ملک کے نوٹوں کا باہمی تبادلہ کرنا ہو تو اس کی دو شرطیں ہیں۔

① مجلس عقد میں فریقین نقد بنقد تبادلہ کریں۔

② اس تبادلے میں برابری کو ملحوظ رکھا جائے۔

اگر کوئی ۱۰۰ روپے کے نئے نوٹ ۱۰۵ روپے میں فروخت کرتا ہے تو شرعاً درست نہیں بلکہ ایسا کرنا صریح سود ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ برابری کرنسی نوٹوں کی تعداد اور گنتی کے لحاظ سے نہیں ہوگی بلکہ ان نوٹوں کی ظاہری قیمت کا لحاظ رکھا جائے گا لہٰذا سو روپے کے ایک نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے دس نوٹوں سے جائز ہے۔ اس تبادلہ میں اگرچہ ایک طرف ایک نوٹ ہے اور دوسری طرف دس نوٹ ہیں لیکن ظاہری قیمت کے لحاظ سے ان دس نوٹوں کے مجموعہ کی قیمت سو روپے کے ایک نوٹ کے برابر ہے اس عقد میں بذات خود وہ نوٹ یا ان کی تعداد مقصود نہیں بلکہ ان کی ظاہری قیمت مقصود ہے جو ان پر لکھی ہوتی ہے اور جس کی یہ نوٹ نمائندگی کرتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ایک ملک میں رائج نوٹوں کے تبادلہ میں کمی وبیشی جائز نہیں ہے کیوں کہ ایک ملک کے مختلف کرنسی نوٹ ایک ہی جنس شمار ہوتی ہے اور ایک ہی جنس کے باہمی تبادلہ میں ادھار اور کمی بیشی منع ہے جیسا کہ اس کے متعلق متعدد احادیث

وارد ہیں۔

مختلف ممالک کی کرنسی مختلف اجناس شمار ہوتی ہے۔ان میں کمی وبیشی تو جائز ہے لہٰذا ایک ریال کا تبادلہ پانچ، دس اور پندرہ روپوں سے کرنا جائز ہے لیکن اس میں ادھار جائز نہیں ۔ یہ تبادلہ نقد بنقد ہونا چاہیے۔اس لیے کرنسی کا کاروبار جائز ہے اور اس میں کمی بیشی کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ۔البتہ اس میں ادھار درست نہیں ہے بلکہ نقد بنقد ہونا چاہیے۔ یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات حکومت مختلف کرنسیوں کی قیمت مقرر کردیتی ہے۔مثلاً حکومت پاکستان ریال کی قیمت ۱۶ روپے اور ڈالر کی قیمت ۶۰ روپے مقرر کردے تو کیا اس صورت میں حکومت کی مقرر کردہ قیمت کی مخالفت کرکے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے یا نہیں یعنی اوپن مارکیٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

ہماری ناقص رائے کے مطابق حکومت کے مقرر ریٹ کی مخالفت کرتے ہوئے کمی وبیشی کے ساتھ تبادلہ کرنے میں سود لازم نہیں آتا کیوں کہ دونوں کرنسیاں جنس کے لحاظ سے مختلف ہیں اور مختلف اجناس کا کمی وبیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے اور اس کی دبیشی کی شرعاً کوئی حد نہیں ہے بلکہ یہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے اور حکومت کی اجازت سے اوپن مارکیٹ میں کاروبار ہوتا ہے تاکہ حکومت کے ہاں زرمبادلہ کے ذخائر میں اضافہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال کا دوسرا جز شیئرز سے متعلق ہے۔شیئرز کی حقیقت یہ ہے کہ ایک کمپنی اپنا کاروبار چلانے کے لیے اپنا لائحہ عمل اور خاکہ شائع کرتی ہے اور اپنے شیئرز جاری کرتی ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کمپنی لوگوں کو اپنے کاروبار میں حصے دار بننے کی دعوت دیتی ہے،اس وقت کمپنی سے جو شخص بھی شیئرز خریدتا ہے وہ شخص درحقیقت اس کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن رہا ہوتا ہے اور کمپنی کے ساتھ شراکت کا معاملہ کرتا ہے اگرچہ عرف عام میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے شیئرز خریدے لیکن شرعی لحاظ سے یہ خرید وفروخت نہیں کیوں کہ پیسے ادا کرنے سے اسے کوئی سامان وغیرہ نہیں ملتا ابتدائی طور پر شیئرز خریدنے کے لیے یہ شرط ہے کہ خریدنے والا اس بات کا پتہ لگائے کہ یہ کمپنی کوئی حرام کاروبار تو شروع نہیں کررہی مثلاً: شراب کشید کرنے کی فیکٹری لگائی جارہی ہو یا سودی کاروبار کے لیے کوئی بینک کھولا جارہا ہو اگر ایسا ہے تو ابتدا اس کمپنی کے حصص خریدنا جائز نہیں ہیں۔لیکن اگر بنیادی طور پر حرام کاروبار نہیں بلکہ کسی جائز کاروبار کے لیے کسی کمپنی نے شیئرز جاری کیے ہیں مثلاً: ٹیکسٹائل مل لگانا ہے تو اس صورت میں اس کمپنی کے شیئرز خریدنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔اب ان شیئرز کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے کہ جب ایک آدمی نے کمپنی کے جاری کردہ حصص خرید لیے اور وہ اب کمپنی میں حصہ دار بن گیا تو پھر یہ شیئرز ہولڈر وقتاً فوقتاً اپنے شیئرز اسٹاک مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کردیتا ہے اس اسٹاک مارکیٹ سے شیئرز خریدنے کے لیے بھی چند ایک شرائط ہیں:

① یہ شیئرز کسی حرام کاروبار میں ملوث کمپنی کے نہ ہوں،ایسی کمپنی کے حصص خریدنا کسی حال میں جائز نہیں نہ ابتدائی طور پر جاری ہونے کے وقت اور نہ ہی بعد اسٹاک مارکیٹ سے ان کا خریدنا جائز ہے۔

② دوسری شرط یہ ہے کہ اس کمپنی کے تمام اثاثے نقد رقم کی شکل میں نہ ہوں بلکہ اس کمپنی نے جمع شدہ سرمایہ سے زمین خریدی ہو یا بلڈنگ بنالی ہو،اگر اس کمپنی کا اثاثہ ابھی نقدی کی شکل میں ہے تو ان حصص کو کمی وبیشی کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں بلکہ اس کی

اصل قیمت کے برابر برابر خریدنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں دس روپے کا شیئرز دس روپے ہی کی نمائندگی کر رہا ہے جیسا کہ دس روپے کا نوٹ دس روپے کی نمائندگی کرتا ہے لہٰذا جب دس روپے شیئرز دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے تو اس صورت میں اسے گیارہ یا نو روپے میں خریدنا یا فروخت کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر کمپنی کے کچھ اثاثے منجمد شکل میں ہیں مثلاً اس رقم سے کمپنی نے خام مال خرید لیا یا بلڈنگ بنالی یا مشینری خرید لی تو اس صورت میں دس روپے کے شیئرز کو کمی وبیشی سے فروخت کرنا جائز ہو گا۔ [واللہ اعلم]

سوال لاہور سے محمد رفیق لکھتے ہیں کہ حکومت اپنے ملازمین کی تنخواہ سے جی پی فنڈ کی جبراً کٹوتی کرتی ہے پھر ریٹائرمنٹ کے وقت کٹوتی مع سود ملازم کو دی جاتی ہے، اب اس سود کی رقم کو حکومت سے وصول کیا جائے یا حکومت کے پاس یعنی بینک میں ہی چھوڑ دیا جائے، اگر وصول کیا جائے تو اس کا مصرف کیا ہوگا۔؟

جواب ہم اس کا جواب دینے سے پہلے اپنے قارئین کے لیے جی پی فنڈ کے متعلق کچھ معلومات درج کرنا چاہتے ہیں تاکہ جواب دیتے وقت اس کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے، یہ لفظ جنرل پراویڈنٹ فنڈ کا مخفف ہے جس کا معنی عمومی بچت فنڈ ہے یہ حکومت کی بظاہر رفاہی سکیم ہے جو اپنے ملازمین کو فراہم کرتی ہے اس کا باقاعدہ ایک طریق کار ہے جس کی وضاحت کچھ یوں ہے۔

☆ جو ملازمین اس اسکیم میں شامل ہونا چاہیں حکومت متعلقہ محکمہ کی وساطت سے انہیں دو فارم فراہم کرتی ہے ایک فارم پر ملازم کے کوائف ہوتے ہیں جبکہ دوسرا نامزدگی کا ہوتا ہے کہ ملازمت کے دوران ملازم کے مرنے یا کسی حادثے کا شکار ہونے کی صورت میں یہ واجبات کون وصول کرے گا۔

☆ فارم پر کرنے کے بعد اکاؤنٹس آفس کی طرف سے ملازم کے لیے ایک نمبر الاٹ ہوتا ہے جسے اکاؤنٹ نمبر کہا جاتا ہے آئندہ ملازم سے متعلقہ رقوم کا حساب اسی نمبر کے حوالہ سے کیا جاتا ہے

☆ تنخواہ کے سکیل کے لحاظ سے ملازم کی تنخواہ سے ہر ماہ کٹوتی ہوتی ہے جو بینک میں جمع ہوتی رہتی ہے، حکومت کے اس کے متعلق جو ضوابط ہیں ہمیں تلاش بسیار کے باوجود کوئی ایسا ضابطہ نہیں ملا جس کی رو سے یہ کٹوتی ضروری ہو البتہ عملاً ایسا ضروری ہے بصورت دیگر ملازم کو کچھ مراعات سے محروم ہونا پڑتا ہے یا کم از کم ہر ماہ تنخواہ کی ادائیگی ناممکن تو نہیں البتہ مشکل ہو جاتی ہے۔

☆ فارم کے خانہ نمبر ۱۴ کے مطابق ملازم کو اختیار ہوتا ہے کہ فراغت کے وقت وہ اصل کٹوتی لے گا یا اس کے ساتھ فراہم ہونے والا سود بھی وصول کرے گا۔

☆ اگر ملازم مجوزہ کٹوتی سے زیادہ رقم جمع کرانا چاہے تو اس کی سہولت دی جاتی ہے لیکن اس کے لیے الگ درخواست محکمہ کو دینا ہو گی۔

☆ اگر ملازم کی سروس دس سال سے کم ہے تو وہ صرف جی پی فنڈ لینے کا مجاز ہے۔ اگر دس سال سے زائد سروس ہے تو دیگر مراعات (پنشن، گریجویٹی) کا حقدار ہوگا۔

☆ ملازم کو یہ سہولت دی جاتی ہے کہ وہ دوران سروس کسی ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ۸۰% جی پی فنڈ لے سکتا ہے۔ اس کے بعد

اگر سروس تین سال یا عمر پچپن سال ہے تو یہ فنڈ نا قابل واپسی بصورت دیگر اسے چھتیس اقساط میں ماہ بماہ اپنی تنخواہ سے محکمہ کو واپس کرنا ہوگا۔اصل کٹوتی بدستور جاری رہے گی۔

☆ اس فنڈ کا ملازم کی پنشن اور گریجویٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ملازم کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنی پنشن کا ۴۰% یکمشت وصول کر لے جسے گریجویٹی کہا جاتا ہے اور باقی ۶۰% ماہ بماہ وصول کرتا رہے یا یکمشت لینے کی بجائے وہ ماہ بماہ وصول کرے، اس صورت میں پنشن کی مقدار زیادہ ہوگی۔

☆ اس کٹوتی پر ملنے والے سود کی شرح متعین نہیں ہوتی بلکہ ۱۵% سے ۲۰% کے درمیان رہتی ہے البتہ جتنا سود ہوتا ہے اس پر مزید حکومت ۳۰% کے حساب سے بونس جمع کرتی ہے، آیندہ سال کٹوتی +سود+ بونس کی مجموعی رقم پر سود لگایا جاتا ہے یعنی یہ سود مرکب کی ایک صورت ہے۔

☆ چند سالوں کے بعد اس کٹوتی کی رقم میں حیران کن اضافہ ہوجاتا ہے، یہ اضافہ ایسی برق رفتاری سے ہوتا ہے کہ اصل کٹوتی سے سود کہیں زیادہ ہوجاتا ہے۔

مندرجہ ذیل دس سالوں کے گوشوارہ سے ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

سال	کٹوتی	سود20%	بونس30%	میزان
1990	-/6000 روپے سالانہ	1200.00	360.00	7560.00 روپے
1991	13560.00 = 6000.00+7560.00	2712.00	814.00	17086.00
1992	23086.00 = 6000.00+17086.00	4617.00	1385.00	29088.00
1993	35088.00 = 6000.00+29088.00	7018.00	2105.00	44211.00
1994	50211.00 = 6000.00+214211.00	10042.00	3013.00	63266.00
1995	69266.00 = 6000.00+63266.00	13853.00	4156.00	87275.00
1996	93275.00 = 6000.00+87275.00	18655.00	5597.00	117527.00
1997	123527.00 = 6000.00+117527.00	24705.00	7412.00	155644.00
1998	161644.00 = 6000.00+155644.00	32329.00	9699.00	203672.00
1999	209672.00 = 6000.00+23672.00	41934.00	12580.00	264186.00

واضح رہے کہ دس سال کی کٹوتی -/6000 روپے ہے جبکہ جی پی فنڈ دس سال میں 264186 روپے ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل کٹوتی میں 204186 روپے سود کے ہیں۔دیکھیں آپ کہ سود کس رفتار سے بڑھ رہا ہے یہ تو دس سالہ سروس کے اعداد وشمار ہیں۔بعض اوقات ملازمین کی سروس بیس اور پچیس سال بھی ہوجاتی ہے۔کچھ ملازمین یہ کہتے ہیں کہ سود کے علاوہ حکومت اس میں اپنی طرف سے کچھ رقم شامل کرتی ہے۔حالانکہ یہ مفروضہ صحیح نہیں ہے۔بلکہ یہ سود مرکب کا کرشمہ ہے۔

☆ ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس اس بات کا پابند ہے کہ وہ سال کے اختتام پر ملازم کو ایک سلپ جاری کرے جس میں اصل کٹوتی، سود اور بونس کی وضاحت ہو، لیکن وہ ہجوم مشاغل کا بہانہ بنا کر ایسا نہیں کرتا اگر ملازم ہر سال یا فراغت کے وقت کے لیے درخواست دے تو محکمہ کی طرف سے یہ اعداد وشمار فراہم کردیئے جاتے ہیں۔

☆ اس جمع شدہ جی پی فنڈ پر ہر سال زکوٰۃ بھی کاٹی جاتی ہے، لیکن اس زکوٰۃ کی شرعی حیثیت انتہائی مخدوش ہے، بینک کے سیونگ اکاؤنٹس میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے لہٰذا بینک میں جمع شدہ رقم کی از خود زکوٰۃ دینا چاہیے۔جی پی فنڈ کے متعلق یہ وہ تفصیلات تھیں جو ہم

نے متعلقہ اشخاص سے حاصل کیں۔اب اس کی شرعی حیثیت کو بیان کرتے ہیں۔

☆ یہ بات تو واضح ہے کہ جی پی فنڈ میں اصل کٹوتی سے جو زائد رقم دی جاتی ہے وہ سود ہے چنانچہ خود گورنمنٹ اس کی معترف ہے جیسا کہ اس کے متعلقہ فارم کے خانہ نمبر 14 میں ہے۔

''کیا ملازم اپنی تمام جمع شدہ رقم پر سود کا خواہش مند ہے یا نہیں''؟۔

اور سود کو قرآن مجید میں بڑی صراحت اور شدت کے ساتھ حرام قرار دیا گیا ہے اور سود خوروں کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے گیے ہیں ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سود کا وجود روح اسلام کے بالکل منافی ہے قرآن مجید میں ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں نہیں کھڑے ہوں مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے۔ایسا شخص جس کو شیطان لپٹ کر خبطی بنا دے''۔ [۲/البقرہ:۲۷۵]

قرآن مجید میں جا بجا برے افعال اور گندے کردار کی مذمت کی گئی ہے اور اہل ایمان کو اس امر سے سختی کے ساتھ روکا گیا ہے کہ وہ اخلاقی برائیوں میں ملوث ہوں یا گناہوں اور بدکاری کی زندگی بسر کریں،اسی طرح جو لوگ اللہ کی قائم کردہ حدوں کو توڑیں انہیں بھی شدید ترین عذاب کی دھمکی دی گئی ہے لیکن قرآن مجید نے کفر اور شرک کے بعد جس شدت سے سودی لین دین کی مذمت کی ہے،اس کی مثال کسی اور برائی کے ضمن میں نہیں ملتی چنانچہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے:''اگر کوئی آدمی ایک مرتبہ دانستہ طور پر ایک درہم سود کھائے تو وہ چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ سخت ہے۔'' [دارقطنی:۳/۱۶]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس قوم میں سود خوری عام ہو جائے انہیں اللہ کی طرف سے قحط سالی میں پکڑ لیا جاتا ہے،اور جو قوم رشوت ستانی میں گرفتار ہو اس پر اغیار کا رعب اور دبدبہ مسلط کر دیا جاتا ہے''۔ [مسند امام احمد:۴/۲۰۵]

حدیث میں ہے کہ عرب کے قبیلہ بنو مغیرہ کے لوگ سود پر لوگوں کو قرض دیتے تھے،رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ان کا پورا سود منسوخ کر دیا اور مکہ میں اپنے عامل کو ہدایت کی کہ اگر یہ لوگ سودی لین دین سے باز نہ آئیں تو ان کے خلاف جنگ کر کے انہیں اس قبیح فعل سے روک دیا جائے۔''

خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو دورِ جاہلیت کے بہت بڑے مہاجن اور سود لے کر لوگوں کو قرضہ دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی حجۃ الوداع میں صاف صاف اعلان کر دیا:''دورِ جاہلیت کا پورا سود کالعدم ہو گیا ہے اور سب سے پہلے میں اس سود کو منسوخ ٹھہراتا ہوں جو میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کا لوگوں کی طرف نکلتا ہے''۔ [مسند امام احمد:۵/۷۳]

رسول اللہ ﷺ نے سود کے متعلق اپنے اندیشے کا بایں الفاظ اظہار فرمایا:

''مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ جس خطرناک کردار کا اندیشہ ہے وہ سود خوری ہے''۔ [مسند امام احمد:۵/۷۳]

سود خوری ایک ایسا سنگین جرم ہے کہ اس کی زد میں نہ صرف کھانے والا بلکہ کھلانے والا،لکھنے والا اور گواہی دینے والا بھی آتا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو ملعون قرار دیا ہے۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے، کھلانے اور گواہی دینے والے پر لعنت کی ہے اور فرمایا:''کہ یہ سب لعنت زدگی میں برابر ہیں''۔ [صحیح بخاری:کتاب البیوع]

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے اس جرم کو بایں الفاظ بیان فرمایا: ''کہ سود کے ستر حصے ہیں ان میں سے کم تر حصہ اپنی حقیقی ماں سے جماع کرنا ہے''۔ [ابن ماجہ]

اگرچہ اس کی سند میں ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن راوی ضعیف ہے تاہم دیگر شواہد کی وجہ سے علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے''۔ [صحیح ابن ماجہ:۲/۲۷]

اب تک قابل غور بات یہ ہے کہ ملازم کو جو سودی رقم ملتی ہے اس کا مالک کون ہے، ملازم تو اس کا مالک نہیں کیوں کہ یہ تو اسی رقم کا مالک ہے جو ماہ بماہ اس کی تنخواہ سے کٹوتی کی صورت میں جمع ہوتی رہی اور جو زائد رقم سود کی شکل میں ہے ملازم اس کا قطعاً مالک نہیں ہے، اصل رقم کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارا اصل مال ہے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے''۔ [۲/البقرہ:۲۷۹]

سودی رقم کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے اگر تم مؤمن ہو تو اسے چھوڑ دو''۔ [۲/البقرہ:۲۷۸]

اگر اس رقم کی وصولی پر اصرار ہے تو اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ جنگ قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''پھر اگر تم اس پر عمل نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ''۔ [۲/البقرہ:۲۷۹]

ان قرآنی آیات اور احادیث کا خلاصہ یہ ہے۔

☆ سود مطلق طور پر حرام ہے اس کے متعلق کوئی استثنائی صورت نہیں ہے۔

☆ سود وصول کرنے والا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔

☆ سود لینا اپنے ایمان کو خیر باد کہہ دینے کے مترادف ہے۔

☆ سود خوری رسول اللہ ﷺ کی لعنت اور پھٹکار کی باعث ہے۔

☆ سود کا ایک ایک روپیہ چھتیس چھتیس دفعہ زنا کے برابر ہے۔

☆ سود کا استعمال گویا اپنی ماں سے زنا کرنا ہے۔

☆ سود لینے سے اللہ کا عذاب، قحط سالی میں آتا ہے۔

ایسے حالات میں کیا ایک غیرت مند صاحب ایمان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اصل رقم کے ساتھ سودی رقم کو بھی وصول کرے گا اگرچہ ایسے موقع پر انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ ایک طرف تھوڑی سی رقم اور دوسری طرف ڈھیروں مال ہے لیکن جس شخص کو اپنے ایمان کی فکر ہے وہ اس گندگی کے ڈھیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے میرے حبیب ﷺ! ان سے کہہ دیجیے کہ پاک اور ناپاک یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی کثرت تمہیں کتنا ہی فریفتہ کرنے والی ہو''۔ [۵/المائدہ:۱۰۰]

اس آیت پر غور کرنے سے قدر و قیمت کا ایک دوسرا معیار سامنے آتا ہے جو ظاہر بین اور دنیا پرست انسان کے معیار سے

بالکل مختلف ہے بظاہر اصل کٹوتی کے مقابلہ میں سودی رقم زیادہ قیمتی ہے لیکن آیت میں بیان کردہ معیار کے مطابق یہ سودی رقم ناپاک ہے اور ملازم کی اصل کٹوتی پاک ہے، ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو بہر حال وہ پاک کے برابر کسی طرح نہیں ہوسکتا۔ سودی رقم مقدار میں زیادہ ہے معیار میں اعلیٰ نہیں ہے۔ اصل کٹوتی مقدار میں بہت کم ہے لیکن معیار کے لحاظ سے بہت برتر ہے، یہ تو ہمارے مشاہدہ کی بات ہے کہ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے۔ پیشاب کے ایک لبریز جوہڑ سے پانی کا ایک چلو زیادہ وزنی ہے لہٰذا ایک دانا اور سچے صاحب ایمان کو حلال ہی پر قناعت کرنا چاہیے۔ خواہ وہ کتنا ہی حقیر وقلیل ہو اور حرام کی طرف کسی حال میں بھی ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی زیادہ اور شاندار ہو۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سود اخلاقی، روحانی اور تمدنی ترقی میں نہ صرف رکاوٹ بنتا ہے بلکہ تنزل کا باعث ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے''۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سود کا انجام غربت اور ذلت ورسوائی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''سود کی مقدار خواہ کتنی زیادہ ہو آخر یہ غربت اور افلاس کی طرف لے جاتا ہے''۔ [مسند امام احمد: ۱/۳۹۵]

ان حقائق کے پیش نظر ہمارا یہ موقف ہے کہ سودی رقم کو کسی صورت میں وصول نہ کیا جائے، سود خوروں کے گھر صاف رکھنے کے لیے اپنے گھر کو اس گندگی سے ملوث کرنا کوئی دانشمندانہ بات نہیں۔ قرآن وحدیث میں سود کے متعلق کسی قسم کا استثنا نہیں ہے۔ اس کے متعلق خود استثنائی صورتیں پیدا کر لینا شریعت سازی ہے۔ جس کے ہم مجاز نہیں ہیں، سود کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہماری ذمہ داری یہ بیان کی ہے کہ ہم اسے وصول ہی نہ کریں، حرام خوروں کے لیے یہ حرام چھوڑ دیا جائے۔

عذر ہائے لنگ: اصل کٹوتی کے ساتھ سودی رقم لینے کے لیے کچھ مجبوریاں اور مصلحتیں بیان کی جاتی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ:

☆ ملازم کی مرضی کے بغیر ماہ بماہ تنخواہ سے کٹوتی ہوتی رہی، جب یہ کٹوتی شروع ہوئی تھی اس وقت روپے کی مالیت اور موجودہ مالیت میں بہت تفاوت ہے لہٰذا اس نقصان کی تلافی کے لیے سودی رقم لینے میں کیا حرج ہے۔؟

☆ ملازم کو جی پی فنڈ حاصل کرنے کے لیے دفتری عملے کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے لہٰذا یہ سودی رقم لے کر دفتری عملے کو دے دی جائے تاکہ ''مال حرام بود جائے حرام رفت'' کا مصداق بن جائے۔

☆ سودی رقم لے کر خود استعمال نہ کرے بلکہ ثواب کی نیت کرے بغیر کسی لاچار یا غیر مسلم کو دے دی جائے بصورت دیگر دفتری عملہ اس رقم کو ہڑپ کر جائے گا۔

☆ سود وہ ہوتا ہے جو فریقین کی رضامندی سے طے ہو، اس ''سودی رقم'' میں ملازم کی رضامندی شامل نہیں ہے اور نہ ہی اس کے ارادہ واختیار کو دخل ہے لہٰذا اس رقم کو اپنے استعمال میں لایا جاسکتا ہے...... وغیرہ۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلامی نظام عدل کے منافی جو دھاندلیاں ہم نے سینے سے لگا رکھی ہیں وہ ''خود ساختہ بہانوں'' کے سہارے لگا رکھی ہیں ورنہ درحقیقت وہ شرعی معذرتیں نہیں ہیں بلکہ عذر ہائے لنگ ہیں جسے ہم ''خوئے بدرا بہانہ بسیار'' سے تعبیر کر

سکتے ہیں۔ دورِ حاضر میں ''مجبوری'' ایک ایسی مکروہ کیفیت کا نام رہ گیا ہے جس کا اسلام میں قطعاً کوئی وجود نہیں ہے، وقت اور حالات کو بدلنے کے بجائے ہم نے ایسی معذرتوں سے سازگاری پیدا کرلی ہے جس کے بعد مجبوری، مجبوری نہیں رہتی بلکہ معصیت اور مجرمانہ غفلت بن جاتی ہے۔ لہٰذا ایسی مجبوریوں کے سہارے جو بھی خلاف شرع کام کیا جائے گا اسے شرعی معذرت کے نام پر حلال یا جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، مجبوریاں ناسازگار حالات اور نامساعد ظروف کا حاصل ہوتی ہیں جو لوگ ناسازگار فضاؤں کو بدلنے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اسلام میں ایسے افراد کی معذرتوں کو تا تبدیلی حالات قبول کیا جاتا ہے جہاں ایسی بات نہیں ہوتی وہاں اسلام ایسی مجبوریوں اور معذرتوں سے استفادہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ بہانہ سازی کی وہ مکروہ صورت ہے جسے اسلام دشمنی سے تعبیر کیا جائے گا ہاں اگر قرآن کی بیان کردہ اضطراری حالت پیدا ہوجائے تو سود جیسی خبیث اور پلید چیز کو استعمال کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے ارشاد باری ہے:

''البتہ جو شخص بھوک کے ہاتھوں مجبور ہوکر ان (حرام اشیاء) میں سے کوئی چیز استعمال کرلے بغیر اس کے کہ گناہ کی طرف اس کا میلان ہو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔ [۵/المآئدہ:۳]

دوسرے مقام پر اس اضطراری اور اس کی حد بندی کی مزید وضاحت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ہاں جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور وہ ان (حرام اشیاء) میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں''۔ [۲/البقرہ:۱۷۳]

ان آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیز استعمال کرنے کی اجازت چار شرطوں سے دی گئی ہے۔

① واقعی مجبوری کی حالت میں مبتلا ہو مثلاً: بھوک پیاس سے جان پر بن گئی ہو یا بیماری کی وجہ سے جان خطرہ میں ہو اور اس حالت میں حرام چیز کے علاوہ اور کوئی میسر نہ ہو۔

② اللہ کے قانون کو توڑنے کی خواہش دل کے نہاں خانہ میں پوشیدہ نہ ہو۔

③ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے مثلاً تھوڑی مقدار میں حرام چیز سے اگر جان بچ سکتی ہے اس سے زیادہ مقدار استعمال نہ کی جائے۔

④ حرام کے استعمال سے کسی نافرمانی یا معصیت کے ارتکاب کا ارادہ نہ ہو۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر بہانے باز لوگوں کا تذکرہ بایں الفاظ ہوا ہے۔

''جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کررہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے، انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے، فرشتوں نے کہا: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم اور بہت برا ٹھکانہ ہے۔'' [۴/النسآء:۹۷]

اللہ تعالیٰ نے بہانہ ساز لوگوں کی معذرت کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے، آج کل ہمارا بھی یہی حال ہے کہ ہم رخصتوں کا دامن تھامنے میں کوئی سستی نہیں کرتے لیکن اپنی ذمہ داریوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ اگر سوئی کے سوراخ جتنی رخصت ہو تو اس سے اونٹ گزارنے کی کوشش کرتے ہیں، العیاذ باللہ۔ ایسا کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

اب ان حیلوں اور بہانوں کا جائزہ لیتے ہیں جو جی پی فنڈ کی سودی رقم لینے کے لیے بطور سند پیش کیے جاتے ہیں، لیکن ہم قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ رزق حلال خیر و برکت سے معمور ہوتا ہے جبکہ حرام مال کئی ایک مصیبتوں اور آفتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، بعض اوقات حرام کی نحوست حلال مال کو بھی لے ڈوبتی ہے، اگرچہ سودی رقم ہمارے پیش کردہ دس سالہ گوشوارہ کے مطابق اصل کٹوتی سے چار گنا زائد ہے تاہم ایک بندہ مؤمن کے لیے اس سے کنارہ کش رہنے میں ہی عافیت ہے، رزق حلال کی برکت اور مال حرام کی نحوست کا اندازہ اس حقیقت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک بکری جو حلال جانور ہے اور سال میں ایک دفعہ یا دو دفعہ بچے جنم دیتی ہے جبکہ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ ان کو ذبح کیا جاتا ہے اس کے باوجود باہر میدانوں میں ان کے ریوڑ چرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کتیا چھ ماہ بعد کئی بچے جنم دیتی ہے اور حرام ہونے کی وجہ سے کوئی ذبح بھی نہیں کرتا لیکن کتوں کے کبھی میدانی علاقوں میں ریوڑ نظر نہیں آتے۔ اب حیلوں کے متعلق گزارشات پیش خدمت ہیں:

☆ نقد کی مالیت کا اتار چڑھاؤ ہر دور میں رہا ہے لیکن یہ مادہ پرستانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ اسے بنیاد بنا کر سود کو جائز قرار دیا جائے، رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے چچا عباس بن مطلب رضی اللہ عنہ کا سود ختم کیا تھا تو کیا آپ نے اس کی مالیت کے نشیب و فراز کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی تھی؟ پھر کیا مالیت کے فرق سے سودی رقم کی اصل کٹوتی سے چار گنا زیادہ ہو سکتی ہے؟

☆ جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ سودی رقم ملازم کی نہیں بلکہ اس کی رقم صرف اصل کٹوتی ہے تو پھر کیا دفتری عملہ کو رشوت دینے کے لیے دوسروں کی دولت پر شبخون مارنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ اگر اپنی رقم لینے کے لیے رشوت دینا ضروری ہو تو اس کا کوئی اور حل سوچیں نہ کہ اس مال سے دیں جو آپ کا نہیں ہے۔

☆ ہمارے نزدیک یہ سودی رقم وصول کرنا ہی جرم ہے کیوں کہ صریح نص قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن کی خلاف ورزی کر کے اسے وصول کرنا پھر ثواب کی نیت کیے بغیر کسی کو دینا اسے ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

☆ جب ملازم جی پی فنڈ کا فارم پر کرتا ہے تو خانہ نمبر ۱۴ میں اپنی رضا مندی کا اظہار نہیں کرتا تو بھی اس رقم کے سود ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بہر حال اصل کٹوتی کے علاوہ دوسری رقم ہے تو سود، جسے کسی صورت میں لینا جائز نہیں ہے، باقی رہی یہ بات کہ وہ رقم جو ملازم کے کھاتے میں پڑی ہے اس کا مصرف کیا ہو؟ اس کی ذمہ داری ملازم پر نہیں ہے کہ وہ اس کے متعلق دردسر اپنے ذمہ لے وہ خود بخود جہاں سے آئی تھی وہاں پہنچ جائے گی آخر بینک میں سروس چارجز ایک کھاتہ ہوتا ہے، اس کھاتہ میں جمع شدہ رقم تحلیل ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔

پس چہ باید کرد؟ ہمیں مختلف احباب کی طرف سے زمینی حقائق پر نظر رکھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اگر اس سے مراد باطل سے سمجھوتہ کرنا ہے تو ایسا کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے تاہم ہمارے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ محکمہ جب اپنے ملازم کا جی پی فنڈ کا کھاتہ بناتا ہے تو اسے ایک فارم مہیا کیا جاتا ہے اور اسے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کٹوتی کی جمع شدہ رقم پر سود لینا چاہتا ہے یا نہیں؟ اگر ملازم لکھوا دے کہ میں سود نہیں لینا چاہتا تو اس کی جمع شدہ رقم پر سود نہیں لگایا جاتا اگر اس کے باوجود اس کی کٹوتی میں سود شامل کر دیا گیا ہے تو ایک سادہ کاغذ پر درخواست دے کر اپنی جمع شدہ رقم پر سودی اضافہ ختم کرایا جاسکتا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق بعض احباب نے ایسا کیا ہے اور انہیں صرف اصل کٹوتی کی رقم ہی ملی ہے۔ فارم کا عکس حسب ذیل ہے:

Application for admission to the Provident fund (to be submitted in duplicate)

Account number to be allotted by the Accounts Officer	Name of applicant	Whether European, Anglo-Pakistani or Pakistani	Official designation	Office to which attached	Whether post is permanent or temporary of whether applicant is on probation to a permanent post	If in temporary of afficiating service Whether he is likely to become permanent	Rate of emoluments permensem	Rate of subcription permensem (Rule G.P.F. Rules)	Whether compulsory of optional subscriber	If subscriber desires any other Fund, the name of such Fund	Whether the applicant has a family or not	Whether joining the Starling of Rupee branch of the Fund.	Whether applicant desires interest on his accumulations or not	Date of Birth	Date of Entry in Government Service
1	2	3	4	5	6	7	8	9	10	11	12	13	14	15	16

Station ____________________

Date ____________________ 19 Signature of the head of the officer Designation

____________________ Office of the

No. __________ dated __________ the __________ 19

Returned with account number allotted. This number should be quoted in all correspondences connected there with. A form of Nomination and contingent notice of cancellation duly filled in should be sent to the Office as soon as possible.

(Signature) (Designation)

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ خانہ نمبر۱۴ کے مندرجات کا بغور مطالعہ کریں۔حرف آخر: جی پی فنڈ کے متعلق ہماری آخری گزارش یہ ہے کہ صرف اپنی اصل کٹوتی پر اکتفا کیا جائے،سود وغیرہ لینے کالالچ نہ کرے کیوں کہ اس کے متعلق قرآن وحدیث میں بہت سخت وعید آئی ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''کہ میری امت پر ایسا براوقت آئے گا کہ لوگ سود کو استعمال کریں گے عرض کیا گیا کہ سب لوگ اس میں مبتلا ہوں گے؟فرمایا:کہ جولوگ سود سے اپنے دامن کو بچانے کی کوشش کریں گے انہیں بھی اس کی غبار ضرور آلودہ کردے گی''۔ [مسند امام احمد:۲/۴۹۴]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:کہ سود کو بھی ترک کردو اور جس کے متعلق تمہیں شبہ پڑجائے اس سے بھی اجتناب کرو''۔

[مسند امام احمد:۱/۳۶]

اس سلسلہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آیندہ کے لیے سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ وہ پہلے کھاچکا سو کھا چکا اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس حکم کے بعد پھر اس حرکت کا اعادہ کرے وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا''۔

[۲/البقرہ:۲۷۵]

ہم نے قارئین کو اپنے رب کی نصیحت پہنچادی ہے،اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔(آمین)

سوال تھنہ ضلع اٹک سے مولانا محمد اسحاق سلفی (خریداری نمبر۳۱۱۸) لکھتے ہیں کہ ہمارے علاقہ میں لوگ کئی کئی سال کے لیے قرضہ لے کر اپنی زمین گروی رکھتے ہیں،پھر قرضہ دینے والا اس عرصہ میں بلاشرکت غیرے اس زمین سے پیداوار لیتا ہے،کیا ایسا کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے؟مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہے،آپ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی فرمائیں کہ گروی رکھی ہوئی چیز سے کس حد تک فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے؟۔

جواب قرض دینے کے بعد اس کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے مقروض کی کوئی چیز اپنے پاس رکھنا گروی کہلاتا ہے،قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ دوران سفر اگر قرض کی دستاویز تیار کرنے والا کوئی کاتب نہ ملے تو گروی کا معاملہ کیا جاسکتا ہے،البتہ احادیث سے سفر کے علاوہ حضر واقامت میں بھی اپنی کوئی چیز کسی دوسرے کے پاس گروی رکھ کر قرض وغیرہ لیا جاسکتا ہے،اس گروی شدہ زمین سے فائدہ لینے کے متعلق علما حضرات کی مختلف آراء ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① مطلق طور پر گروی شدہ چیز سے فائدہ لیا جاسکتا ہے،یہ جائز اور مباح ہے۔

② گروی چیز کی بنیاد قرض ہے اور جس نفع کی بنیاد قرض ہو وہ سود ہوتا ہے،لہٰذا گروی شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا سود کی ایک قسم ہے اور ایسا کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

③ حقیقت کے اعتبار سے گروی شدہ چیز چونکہ اصل مالک کی ہے اس لیے اس کی حفاظت ونگہداشت کرنا،اس کی ذمہ داری ہے اگر ایسا کرنا ناممکن یا دشوار ہو یا وہ از خود اس ذمے داری سے دستبردار ہوجائے تو جس کے پاس گروی رکھی ہے وہ بقدر حفاظت ونگہداشت اس سے فائدہ اٹھانے کا مجاز ہے۔

ہمارے نزدیک یہ آخری موقف کچھ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے کہ اگر گروی شدہ چیز دودھ دینے والا یا سواری کے قابل کوئی جانور ہے تو اس کی حفاظت ونگہداشت پر اٹھنے والے اخراجات کے بقدر اس سے فائدہ بھی لیا جا سکتا ہے، اس صورت میں اصل مالک کے ذمہ اس کی حفاظت ونگہداشت کا بوجھ ڈالنا فریقین کے لیے باعث تکلیف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کہ سواری کا جانور اگر گروی ہے تو اس پر اٹھنے والے اخراجات کی وجہ سے سواری کی جاسکتی ہے اور اگر دودھ دینے والا جانور ہے تو اخراجات کی وجہ سے اس کا دودھ پیا جاسکتا ہے اور جو سواری کرتا ہے یا دودھ پیتا ہے اس کے ذمہ اس جانور کی حفاظت ونگہداشت کے اخراجات ہیں۔'' [صحیح بخاری: الرھن ۲۵۱۲]

واضح رہے کہ سواری کرنے یا دودھ پینے کی منفعت اس پر اٹھنے والے اخراجات کی وجہ سے ہے اور اس سے مراد اصل مالک نہیں بلکہ وہ آدمی ہے جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے، کیوں کہ بعض روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔

[دار قطنی: البیوع ۲۹۰۶]

نیز اخراجات برداشت کرنے کے بدلے وہی شخص فائدہ لے سکتا ہے جس کے پاس گروی رکھی گئی ہے، کیوں کہ اصل مالک کا انتفاع تو اخراجات برداشت کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے مالک ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ نیز یہ فائدہ بھی اپنے استعمال کی حد تک ہے، اس دودھ کو بیچنا یا سواری کے جانور کو کرایہ پر دینا درست نہیں ہے، بعض حضرات اس حد تک احتیاط کی تلقین کرتے ہیں کہ اخراجات سے زائد فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے، چنانچہ ابراہیم نخعی کہتے ہیں ''کہ اگر سواری کا جانور گروی رکھا گیا ہے تو اس پر اخراجات کے بقدر سواری کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح دودھ کے جانور سے چارے کے بمقدار دودھ حاصل کیا جاسکتا ہے'' ایک روایت میں ہے کہ چارے کی قیمت سے زائد دودھ حاصل کرنا سود ہے۔ [فتح الباری: ۱۷۸/۵]

لیکن اس قدر باریک حساب وکتاب محض تکلف ہے، اگر گروی شدہ چیز ایسی ہے کہ اس کی حفاظت ونگہداشت پر کچھ خرچ نہیں ہوتا، مثلاً زیورات یا قیمتی دستاویزات وغیرہ تو ایسی چیز سے فائدہ لینا درست نہیں ہے، کیوں کہ ایسا کرنا گویا اپنے قرض کے عوض فائدہ اٹھانا ہے، جس میں سود کا واضح شائبہ ہے، اگر گروی شدہ چیز زمین کی صورت میں ہے جیسا کہ صورتِ مسئولہ میں ہے تو اس کے متعلق ہمارے برصغیر کے علما میں اختلاف ہے، مولانا محمد حسین بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی ذکر کردہ حدیث پر قیاس کرتے ہوئے گروی شدہ زمین سے فائدہ اٹھانے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ ثنائیہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (۴۰۹/۱) فتاویٰ ثنائیہ میں ہی مولانا شرف الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا مفصل جواب دیا ہے کہ دعویٰ عام کے لیے دلیل بھی عام ہی درکار ہوتی ہے۔ پھر یہاں عام یا غیر مخصوص کو منصوص مخصوص پر قیاس کیا گیا ہے اور یہ بھی قاعدہ ہے کہ جو حکم خلاف قیاس ہو وہ مورد نص پر منحصر رہتا ہے، کیوں کہ اصل اموال میں حرمت قطعی ہے، اس لیے جب تک صحیح دلیل سے حلت کی تصریح نہ ہو قیاس سے اس کی حلت ثابت نہ ہوگی۔ خصوصاً جو حکم خلاف قیاس ہو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، فتاویٰ ثنائیہ میں یہ بحث طویل اور لائق مطالعہ ہے۔

سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، مولانا عبدالوہاب، مولانا سید عبدالجبار بن عبداللہ غزنوی، اور مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہم عدم جواز کے قائل ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ حدیث بخاری پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں'' کہ یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہے جو مرہونہ چیز سے فائدہ لینے کے قائل ہیں، جبکہ اس کی نگہداشت کی جائے اگر چہ اصل مالک اجازت نہ دے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ مرتہن کو اٹھنے والے اخراجات کے مقابلہ میں صرف سواری کرنے اور دودھ لینے کا حق ہے، اس کے علاوہ اور کسی قسم کا فائدہ نہیں لیا جا سکتا۔ جیسا کہ حدیث کے مفہوم سے متبادر ہے، البتہ جمہور اہل علم کا موقف ہے کہ جس کے پاس کوئی چیز گروی رکھی ہوئی ہے وہ اس چیز سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھا سکتا مذکورہ حدیث کے متعلق ان کا یہ موقف ہے کہ اس میں فائدہ اٹھانے کا ذکر ہے اور ایسا کرنا خلاف قیاس ہے، لہٰذا مورد نص پر منحصر رہے گا، لہٰذا اس پر مزید قیاس کر کے انتفاع کا دروازہ کھولنا صحیح نہیں ہے، خلاف قیاس اس لیے ہے کہ اس میں اصل مالک کی اجازت کے بغیر سواری کرنے اور دودھ لینے کی اجازت دی گئی ہے حدیث میں ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی جانور کا دودھ نہ حاصل کیا جائے۔ [صحیح بخاری: اللقطہ ۲۴۳۵]

پھر اس میں استفادہ کا حق صرف اخراجات برداشت کرنے کی وجہ سے ہے، قرضے کے عوض فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔ [فتح الباری: ۵/۱۷۸]

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ مع سوال درج کر دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے زمین رہن رکھی تو مرتہن کو اس سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ نیز زمین مرہونہ کا قیاس سواری اور دودھ کے جانور پر صحیح ہے یا نہیں؟۔

اس کا جواب بایں الفاظ دیا گیا ہے کہ شی مرہون سے اس پر اٹھنے والے اخراجات کی وجہ سے مرتہن کا نفع اٹھانا جائز ہے۔ یعنی جب سواری یا دودھ کا کوئی جانور مرہون ہو اور اس کے دانہ اور گھاس وغیرہ کا خرچہ مرتہن کے ذمے ہو تو مرتہن کو جائز ہے کہ اپنے اخراجات کے بقدر جانور مرہون پر سواری کرے اور دودھ پیئے اور اسے اپنے اخراجات سے زیادہ نفع اٹھانا جائز نہیں۔ مثلاً گائے مرہون پر مرتہن کا روزانہ خرچہ دو روپیہ ہوتا ہے اور گائے روزانہ چار روپیہ کا دودھ دیتی ہو تو اسے صرف دو روپیہ کے بقدر دودھ پینا جائز ہے اور باقی دو روپیہ کا دودھ راہن کا ہے اور مرتہن کو باقی دودھ پینا جائز نہیں ہے۔ اگر اسے پیئے گا تو سود میں داخل ہوگا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' کہ اگر سواری کا جانور رہن ہو تو اخراجات کے معاوضہ میں اس پر سواری کی جائے گی اور دودھ والے جانور کا دودھ خرچہ کے معاوضہ میں پیا جائے گا اور جو سواری کرے گا اور دودھ پیئے گا وہی خرچہ برداشت کرے گا۔'' [صحیح بخاری]

نیز بخاری میں ابراہیم نخعی سے مروی ہے کہ گم شدہ جانور پر سواری بھی چارہ کے عوض کی جائے گی اور دودھ والے جانور کا دودھ بھی چارہ کے عوض پیا جائے گا اور رہن کا بھی یہی حکم ہے۔

فتح الباری میں اس کی مزید وضاحت ہے کہ اگر کوئی مرتہن کے پاس دودھ دینے والا جانور رہن رکھے تو مرتہن کو چارہ کی قیمت کے برابر دودھ لینا جائز ہوگا اگر زیادہ لے گا تو سود ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سواری اور دودھ کے جانور کے علاوہ دوسری کسی مرہون چیز کا نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی ممانعت ہے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' گروی شدہ چیز کو راہن سے روکا نہیں جا سکتا، اس

کے نفع اور نقصان کا مالک گروی رکھنے والا ہے۔''

اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند اور امام دار قطنی نے اپنی سنن میں بیان کیا ہے اور کہا کہ اس کی سند حسن متصل ہے، علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نیل الاوطار میں لکھتے ہیں کہ شی مرہون کا نفع ونقصان راہن کا ہے، اس میں جمہور کے مذہب کی دلیل ہے۔ امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام مالک اور جمہور علما نے کہا کہ مرتہن، گروی شدہ چیز سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ہر قسم کا نفع ونقصان گروی رکھنے والے کا ہے اس لیے کہ شریعت نے نفع ونقصان کا ذمہ دار گروی رکھنے والے کو ٹھہرایا ہے۔ جب احادیث سے یہ دونوں باتیں ثابت نہیں تو معلوم ہوا کہ زمین مرہونہ سے مرتہن کو نفع اٹھانا جائز نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین مرہونہ کا قیاس سواری کے جانور پر صحیح نہیں ہے۔

[فتاویٰ نذیریہ ص۲۵۹ ج۲۔ واللہ اعلم بالصواب]

واضح رہے کہ فتویٰ میں مذکورہ حدیث کہ گروی شدہ چیز کو راہن سے روکا نہیں جا سکتا، اس کے نفع ونقصان کا مالک گروی رکھنے والا ہے۔ اسے امام حاکم نے بیان کیا ہے۔ [مستدرک حاکم:۲/۵۱]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آخری الفاظ مدرج ہیں جو حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ نے بطور تفسیر کہے ہیں، تاہم امام شافعی کی تحقیق ہے کہ آخری الفاظ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی دوسرے کے پاس کوئی چیز گروی رکھی ہے تو اسے اس چیز سے فائدہ لینے کا پورا پورا حق ہے، گروی قبول کرنے والے کو اس میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اگر وہ قرض دار یا قرض خواہ سے ہلاک ہو جائے تو اس سے قرض لینے والے کا حق ساقط نہیں ہو گا، کیوں کہ یہ نقصان مقروض کا ہوا ہے۔ جس نے اپنی کوئی چیز قرض وصول کرنے والے کے پاس بطور گروی رکھی تھی، لیکن بعض دوسرے فقہا اس حدیث کا مفہوم بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ اگر وقت مقررہ تک مقروض اپنے ذمے سے قرض نہ اتار سکے تو مرتہن کو گروی شدہ چیز ضبط کر لینے کا حق نہیں بلکہ اسے قرض کی ادائیگی کے لیے فروخت کیا جائے گا اگر اس کی قیمت قرض کی رقم سے زیادہ ہے تو اس کا فائدہ گروی رکھنے والے کو ہو گا، یعنی زائد رقم مقروض کو واپس کر دی جائے گی اور اگر اس کی قیمت قرض سے کم ہے تو مقروض کے ذمے ہے کہ وہ اس کی تلافی کرے۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا مفہوم ہی درست ہے کیوں کہ قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرض کی ادائیگی تک گروی شدہ چیز پر قرض لینے والے کا قبضہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ حق ملکیت تو مقروض کا ہے، لیکن حق وثیقہ قرض لینے والے کا تسلیم شدہ ہے، مقروض کو اپنی چیز سے انتفاع کا حق دینا اس کے قبضہ کے منافی ہے جو قرآن کریم نے اسے دیا ہے پھر یہ تفسیر ابراہیم نخعی، حضرت طاؤس، سفیان ثوری اور امام زہری سے منقول ہے۔

حافظ عبداللہ روپڑی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے عدم جواز پر ایک عجیب استدلال پیش کیا ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے ایک لونڈی خریدی، بیوی نے یہ شرط لگائی کہ اگر آپ اسے کسی دوسرے کو فروخت کریں تو جتنی قیمت سے فروخت کرنا طے ہوا تنی ہی قیمت سے یہ میری ہو گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: ''کہ ایسے حال میں آپ لونڈی کے قریب نہ جائیں، جبکہ اس میں کسی کے لیے کوئی شرط موجود ہو۔''

[موطا امام مالک، باب ما یفعل فی الولیدۃ اذ بیعت والشرط فیہا]

اس حدیث سے گروی شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا ناجائز ثابت ہوا، کیوں کہ جب بیع میں صرف ایک شرط ہونے کی صورت میں فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے تو گروی شدہ چیز جس میں اصل مالک کا پورا پورا حق ہوتا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا کس طرح جائز ہوگا۔

[فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۲۷۱]

اس کے عدم جواز پر بعض ضعیف احادیث بھی بطور تائید پیش کی جاسکتی ہیں، چنانچہ مولانا عبداللہ بن عبدالجبار غزنوی اپنے فتویٰ میں لکھتے ہیں کہ:

''اللہ کے فضل سے قاعدہ کلیہ کے علاوہ خاص مسئلہ میں دو حدیثیں مل گئی ہیں جو اس باب میں نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حدیث اول: ''حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی قرض کے بدلے اپنی زمین کو کسی کے پاس رہن رکھے تو زمین کی پیداوار میں سے بعد وضع اخراجات جو باقی بچے وہ قرض میں محسوب کیا جائے، مزدوری اور خرچ جو کچھ ہوا ہو، اسے بھی انصاف کے ساتھ لگائے'' اس حدیث کو مصنف عبدالرزاق میں روایت کیا گیا ہے۔

حدیث دوم: طاؤس تابعی کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی کتاب میں لکھا ہوا تھا'' کہ جو کوئی کسی کی زمین گروی رکھے تو اس کی پیداوار قرض میں محسوب کرے اور یہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دنوں دیا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا تھا۔''

[مصنف عبدالرزاق]

یہ احادیث صورت مسئولہ کے عدم جواز پر نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن ان کی صحت کے متعلق ہمیں مکمل یقین نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک زمین کا اصل مالک قرض لینے والا ہے۔ اس لیے اس کا حق ہے کہ وہ اسے خود کاشت کر کے اس سے نفع حاصل کرے البتہ قرض کی واپسی یقینی بنانے کے لیے اپنی زمین سے متعلقہ کاغذات رجسٹری اور دیگر دستاویزی ثبوت دائن اپنے پاس رکھے اگر کسی وجہ سے ایسا ناممکن ہو تو جس کے پاس زمین گروی رکھی گئی ہے وہ خود اسے کاشت کرے اور اس پر اٹھنے والے اخراجات کو منہا کر کے نفع وغیرہ کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے ایک حصہ اپنی محنت کے عوض خود رکھ لے اور دوسرا حصہ زمین کے اصل مالک کو دے دیا جائے یا حصہ دینے کے بجائے اس کے قرض سے اتنی رقم منہا کر دے یا رائج الوقت اس زمین کا جتنا ٹھیکہ ہو سالانہ شرح کے حساب سے اس کے قرض سے منہا کر دیا جائے، اس طرح قرض کی رقم جب پوری ہو جائے گی تو زمین اصل مالک کو واپس کر دی جائے، اس سلسلہ میں رائج الوقت مندرجہ ذیل دو صورتیں بالکل ناجائز اور حرام ہیں۔

① جس کے پاس زمین گروی رکھی جائے وہ اسے خود کاشت کرے اور اس کی پیداوار خود ہی استعمال کرتا رہے، اصل مالک کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔

② اگر وقت مقررہ پر قرض وصول نہ ہو تو گروی شدہ زمین کو بحق قرض ضبط کر لیا جائے یہ دونوں صورتیں صریح ظلم اور زیادتی کا باعث ہیں۔ لہٰذا ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال: میاں چنوں سے محمد انور دریافت کرتے ہیں کہ گروی شدہ زمین سے فائدہ لینے کی شرعی حیثیت کیا ہے کیا اسے سود قرار دیا جاسکتا ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب قرض دینے کے بعد اس کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے مقروض کی کوئی چیز اپنے پاس رکھنا گروی کہلاتا ہے اس سے فائدہ لینے کے متعلق علما حضرات کی مختلف آراء ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① مطلق طور پر گروی چیز سے فائدہ لیا جا سکتا ہے اور یہ جائز اور مباح ہے۔

② گروی چیز کی بنیاد قرض ہے اور جس نفع کی بنیاد قرض ہو وہ سود ہوتا ہے لہٰذا گروی چیز سے فائدہ لینا سود کی ایک قسم ہے اور یہ ناجائز اور حرام ہے۔

③ گروی چیز کی حفاظت ونگہداشت پر محنت واخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں لہٰذا بقدر محنت واخراجات فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اس سے زائد فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

④ حقیقت کے اعتبار سے گروی چیز چونکہ اصل مالک کی ہے اس لیے اس کی حفاظت ونگہداشت کا وہ خود ذمہ دار ہے اگر وہ اس سے دست بردار ہو جائے تو جس کے پاس گروی رکھی ہے اسے بقدرِ حفاظت ونگہداشت فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے، ہمارے نزدیک یہ آخری موقف کچھ زیادہ قرینِ قیاس ہے البتہ اس میں کچھ تفصیل ہے کہ اگر گروی شدہ چیز دودھ دینے والا جانور یا سواری کے قابل کوئی جانور ہے تو اس کی حفاظت ونگہداشت پر اٹھنے والے اخراجات کے بقدر اس سے فائدہ لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں اصل مالک کے ذمہ اس کی حفاظت ونگہداشت کا بوجھ ڈالنا فریقین کے لیے باعث تکلیف ہے حدیث میں ہے:

> ''سواری کا جانور اگر گروی ہے تو اس پر اٹھنے والے اخرجات کی وجہ سے سواری کی جا سکتی ہے اور اگر دودھ دینے والا جانور ہے تو اخراجات کی وجہ سے اس کا دودھ پیا جا سکتا ہے اور جو سواری کرتا ہے یا دودھ پیتا ہے اس کے ذمہ اس جانور کے اخراجات ہیں۔'' [صحیح بخاری: کتاب الرھن]

یہ فائدہ بھی اپنے استعمال کی حد تک ہے، اگر گروی شدہ چیز ایسی ہے کہ اس کی حفاظت پر اخراجات نہیں اٹھانا پڑتے ہیں مثلاً زیورات یا قیمتی دستاویزات وغیرہ تو ایسی چیز سے فائدہ لینا درست نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنا گویا اپنے قرض سے فائدہ اٹھانا ہے جس سے سود کا واضح شائبہ ہے، اگر گروی شدہ چیز زمین کی صورت میں ہے جیسا کہ صورت مسئولہ میں ہے تو چونکہ اس کا حقیقی مالک قرض لینے والا ہے اس لیے اس کا حق ہے کہ وہ خود کاشت کر کے اس سے نفع حاصل کرے۔ البتہ قرض کی واپسی یقینی بنانے کے لیے زمین سے متعلق کاغذات رجسٹری اور فرد ملکیت وغیرہ قرض دینے والا اپنے پاس رکھے اگر کسی وجہ سے ایسا ناممکن ہو تو جس کے پاس زمین گروی رکھی گئی ہے وہ خود اسے کاشت کرے اور اس پر اٹھنے والے اخراجات کو منہا کر کے نفع وغیرہ کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا جائے نصف یعنی ایک حصہ اپنی محنت کے عوض خود رکھ لے اور باقی دوسرا حصہ اس کے اصل مالک کی زمین کی وجہ سے اسے دے دے یا اس کے قرض سے اتنی رقم منہا کر دے۔ اس طرح قرض کی رقم جب پوری ہو جائے گی تو زمین اصل مالک کو واپس کر دی جائے گی اس سلسلہ میں رائج الوقت مندرجہ ذیل صورتیں بالکل ناجائز اور حرام ہیں۔

① جس کے پاس زمین گروی رکھی ہے وہ اسے خود کاشت کرے اور اس کی پیداوار خود ہی استعمال کرتا رہے اصل مالک کو بالکل نظر انداز کر دے۔

② اگر وقت مقررہ پر قرض وصول نہ ہو تو گروی شدہ زمین بحق قرض ضبط کر لی جائے، یہ دونوں صورتیں صریح ظلم اور زیادتی کا باعث ہیں لہٰذا ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال اکرام اللہ بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص کسی سے دکان کرایہ پر لیتا ہے، ماہانہ کرایہ کے علاوہ مالک دکان کرایہ دار سے پگڑی کی رقم وصول کرتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز بعض اوقات کرایہ دار اس دکان کو کچھ وقت استعمال کر کے کسی دوسرے شخص کو کرایہ پر دے دیتا ہے اور اس شخص سے منہ مانگی پگڑی وصول کرتا ہے، جبکہ مالک دکان کو اس سے کچھ نہیں ملتا کیا شرعاً ایسا کرنا درست ہے؟

جواب مالی معاملات کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے ''کہ ایمان والو! تم ایک دوسرے کے مال باطل ذرائع سے مت حاصل کرو ہاں اگر تجارت باہمی رضامندی سے ہو تو ٹھیک ہے۔ [۴/النسآء:۲۹]

اس ارشاد باری تعالیٰ کے پیش نظر مروجہ پگڑی کا کاروبار ناجائز اور حرام ہے، اگر مالک دکان پیشگی وصول کی ہوئی رقم ماہ بماہ کرایہ میں وضع کرتا رہے تو جائز ہے۔ کیوں کہ اس میں کرایہ دار کی طرف سے مالک دکان کی خیر خواہی ہے کہ وہ یکمشت لی ہوئی رقم کو اپنے مصروف میں لے آتا ہے، اگر وصول کی ہوئی رقم کرایہ کا حصہ نہیں بنتی تو مالک کا اس طرح پیشگی رقم وصول کرنا ناجائز اور حرام ہے کیوں کہ مالک اس رقم کے معاوضہ میں کرایہ دار کو کچھ نہیں دیتا۔ اس طرح کرایہ دار کا اس دکان کو آگے پگڑی پر دینا بھی جائز نہیں۔ کیوں کہ یہ مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرنا ہے، اگر مالک راضی بھی ہو جائے تو بھی ناجائز ہے کیوں کہ یہ مال بلا معاوضہ حاصل کیا گیا ہے، اگر تجارت کا کوئی اڈا یا مکان کا محل وقوع کوئی قدر و قیمت رکھتے ہیں تو وہ اصل مالک کا حق ہے، کرایہ دار صرف اس کو اپنے استعمال میں لانے کا روادار ہے اسے آگے فروخت کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔ آخر یہ کرایہ دار دوسرے کرایہ کو مزید رقم کے معاوضہ میں کیا چیز دیتا ہے، ایسے کاروبار کو تجارت تو نہیں کہا جا سکتا جس میں معاوضہ ضروری ہوتا ہے پھر حدیث میں ہے ''کہ نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچاؤ'' پگڑی کا کاروبار اس حدیث کے بھی خلاف ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے مالک دکان کو نقصان ہوتا ہے، اگر کرایہ دار کو دکان کی ضرورت نہیں تو اسے چاہیے کہ اسے خالی کر کے مالک کے حوالے کر دے۔ اگر مالک نے پیشگی کرایہ وصول کیا ہے تو اسے چاہیے کہ اجارہ کی باقی ماندہ مدت کے مقابل میں یکمشت رقم کا جتنا حصہ آ رہا ہے اسے واپس کر دے، نیز اگر دکان متعین مدت کے لیے کرایہ پر بھی دی تو مالک دکان کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ کسی شرعی عذر کے بغیر اس معاملہ کو ختم کرے۔ اور نہ ہی کرایہ دار پر دکان خالی کرنے کا دباؤ ڈالے۔ اگر مالک ایسا کرتا ہے تو کرایہ دار کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے اس حق کرایہ داری سے دستبرداری کے عوض مال کا مطالبہ کرے، یہ عوض اس کے علاوہ پر ہوگا جس کا کرایہ دار اپنی یکمشت دی ہوئی رقم میں سے اجارہ کی باقی مدت کے حساب سے حق دار ہوگا، ہمارے ہاں بعض شہروں میں پگڑی کی ایک بدترین صورت بھی رائج ہے وہ اس طرح کہ مالک دکان، دکان کی پوری رقم وصول کر لیتا ہے، لیکن خریدار کو مالکانہ حقوق نہیں دیتا بلکہ اس سے ماہ بماہ طے شدہ کرایہ وصول کرتا ہے، کرایہ دار اس دکان میں کسی دوسرے شخص کو بٹھا دیتا ہے اور اس سے کچھ رقم بھی وصول کرتا ہے۔ مالک دکان نئے کرایہ دار سے پگڑی کی رقم کا بیس یا پچیس فیصد وصول کرتا ہے تا کہ اس کے نام پر کرایہ کی رسید جاری

کرے،شرعی طور پر مالک اوراپنے کرایہ دار کا یہ کاروبار نا جائز ہے،ایک مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال راولپنڈی سے عرفان علی کہتے ہیں کہ آپ کے فتویٰ کے مطابق بینک میں ملازمت کرنا منع ہے لیکن اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کے پاس ملازمت کرتا ہے اگر مالک اپنے ملازم کو بنک کے کسی کام کے لیے بھیجتا ہے تو ملازم پر کوئی بوجھ تونہیں ہوگا۔

جواب دورِ حاضر میں دو ایسے فتنے ہیں کہ ایک باغیرت مسلمان اجتناب کی کوشش کے باوجود اضطراری حالات میں ملوث ہو جاتا ہے،ایک فتنہ تصویر کشی اور دوسرا سود خوری،اسلامی حکومت میں سودی کاروبار نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ ایک فوجداری جرم ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمال کے ذریعے اسلامی مملکت میں رہنے والے قبائل عرب کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر وہ سودی لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے،رسول اللہ ﷺ نے اس کی سنگینی کو بایں الفاظ واضح فرمایا:''کہ اس کا ہلکا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقی ماں کے ساتھ منہ کالا کرے۔''اس لیے ایک مسلمان کو اختیاری حالات میں اس سے گریز کرنا چاہیے اگر کبھی کبھار کسی مجبوری کے پیش نظر بینک میں جانا پڑے تو امید ہے کہ مواخذہ نہیں ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال سعودیہ سے محمد عاصم لکھتے ہیں کہ ایک بینک ملازم بظاہر صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے ایسے بینک ملازم کے گھر کھانا پینا شرعاً کیسا ہے؟

جواب واضح ہو کہ سود نہ صرف ناپسندیدہ عمل اور حرام کام ہے بلکہ اسلامی حکومت کے دائرہ میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم ہے اللہ تعالیٰ نے ایسا کاروبار نہ چھوڑنے والوں کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اگر تم اس(سودی کاروبار)سے باز نہ آئے تو آگاہ رہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔'' [۲/البقرہ:۲۷۹]

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''کہ سود کھانے،کھلانے،لکھنے اور اس کی گواہی دینے والا ملعون ہے۔'' [صحیح مسلم]

لہٰذا سودی کاروبار حرام اور اس کی ملازمت بھی ناجائز ہے پھر عبادت کی قبولیت کے لیے اکل حلال ایک بنیادی شرط ہے حرام کھانے سے کوئی عبادت قبول نہیں ہوتی لہٰذا جب بینک کی ملازمت ناجائز اور حرام ہے تو اس کی کمائی بھی حرام ہے،ایک بندہ مؤمن کو اختیاری حالات میں اس کا استعمال درست نہیں بالخصوص ایک داعی اسلام کو تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے البتہ دعوتی نقطۂ نظر سے ایسے انسان کی دعوت قبول کرنے میں گنجائش ہے بشرطیکہ بینک ملازم کو اس کے انجام بد سے خبردار کرنے کی نیت ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کی دعوتوں کو بعض اوقات قبول کیا ہے،لیکن دعوتی نقطہ سے ہٹ کر از خود سود خوار کے گھر کھانا جائز نہیں ہے اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو یا سود خوار کسی اور ذرائع سے دعوت کا اہتمام کرتا ہے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں اس قسم کی دعوت قبول کر لینے میں مواخذہ نہیں ہوگا۔

سوال سمہ سٹہ سے محمد اکرم دریافت کرتے ہیں کہ ایک آدمی خون اور مردار خرید کر مرغیوں کی خوراک تیار کرتا ہے،پھر اسے فروخت کرتا ہے اس کے کاروبار کی کیا شرعی حیثیت ہے؟ واضح فرمائیں۔

جواب شریعت اسلامیہ نے خون اور مردار کو حرام قرار دیا ہے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق حرام چیزوں کی خرید وفروخت بھی حرام اور ناجائز ہوتی ہے۔چنانچہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت اعلان فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب،خنزیر اور

بتوں کی خرید وفروخت کو حرام کر دیا ہے، لوگوں نے دریافت کیا کہ مردار کی چربی سے کشتیوں کو روغن اور چمڑے کو نرم کیا جاتا ہے نیز لوگ روشنی کے لیے بھی اسے استعمال کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اس کا استعمال بھی حرام ہے اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں کو غارت کرے ان پر مردار کی چربی حرام تھی انہوں نے اسے گرم کرنے کے بعد فروخت کرنا شروع کر دیا اور اس کی قیمت لگانے لگے۔'' [صحیح بخاری]

بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جب اللہ کسی قوم پر کوئی چیز حرام کر دیتے ہیں تو اس کی خرید وفروخت اور اس کی قیمت وغیرہ بھی حرام ہو جاتی ہے۔ [ابوداود]

خون اور مردار چونکہ نص قرآن سے حرام ہیں لہٰذا ان کی خرید وفروخت بھی حرام ہے۔ اس بنا پر مرغیوں کی خوراک بنانے کے لیے خون اور مردار کی خرید وفروخت درست نہیں یہ کوئی مجبوری یا اضطراری حالت نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بے شمار ذرائع معاش پیدا کر رکھے ہیں لہٰذا اس حرام کاروبار کے بجائے کوئی اور ذریعہ معاش کر لیا جائے چونکہ کسب حلال کو عبادت کی قبولیت میں بڑا دخل ہے نیز ایک مسلمان کی شان کے بھی خلاف ہے کہ وہ ذریعہ معاش کا بہانہ بنا کر ایک حرام کو اختیار کیے رکھے البتہ خریدے بغیر اگر کہیں سے خون وغیرہ مل جائے تو مرغیوں کی خوراک تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس تیار شدہ خوراک کی خرید وفروخت پھر بھی حرام ہی رہے گی صرف مرغیوں کو یہ خوراک کھلائی جا سکتی ہے اسے بطور کاروبار اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر ہے کہ کوئی اور کاروبار تلاش کر لیا جائے تا کہ اس حرام اور ناجائز کمائی سے دور رہا جا سکے اور عبادت کے طور پر کی ہوئی محنت بے سود ثابت نہ ہو۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال پنڈی گھیب سے عبدالرحیم لکھتے ہیں کہ ایک آدمی جوانی میں تجارت کرتا تھا، زیادہ نفع کمانے کے لیے مال فروخت کرتے وقت ہیرا پھیری سے کام لیتا تھا۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور اپنے اس فعل پر نادم ہے اس کی مغفرت کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب مال فروخت کرتے وقت ہیرا پھیری سے کام لینا ناجائز ذرائع سے مال کمانا ہے، جس کی ممانعت قرآن مجید میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ''۔ [۴/النسآء:۲۹]

''بالباطل'' میں دھوکہ، فریب، جعل سازی، ملاوٹ جیسے وہ تمام کاروبار ہیں جن سے شریعت نے منع فرمایا ہے، اسی طرح ممنوع چیزوں کا کاروبار کرنا بھی باطل میں شامل ہے۔ مثلاً بلا ضرورت فوٹو گرافی، ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو فلمیں اور فحش کیسٹیں وغیرہ ان کا بنانا، فروخت کرنا اور حرمت سب ناجائز کاروبار ہیں، صورت مسؤلہ میں جس طرح مال کمایا گیا ہے، وہ حقوق العباد ہڑپ کرنے کے ضمن میں آتا ہے، غنیمت ہے کہ بڑھاپے میں اس کی سنگینی کا احساس ہوا ہے۔ اب اس کی بخشش کی صرف صورت یہی ہے کہ:

① اللہ کے حضور آنسو ندامت بہاتے ہوئے توبہ کرے اور آیندہ ایسا نہ کرنے کا عزم بالجزم کرے۔

② کثرت سے صدقہ وخیرات کرے، نیت یہ ہو کہ جن لوگوں کی حق تلفی ہوئی ہے انہیں اس کا ثواب ملے۔

③ اپنی بخشش کی دعا کرتے وقت جن کا حق کھایا ہے ان کے لیے دعا کرتا رہے۔ ایسا کرنے سے شاید اللہ کے ہاں حقوق العباد کی

معافی ہو جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فیصل آباد سے حافظ اکرام الٰہی سوال کرتے ہیں کہ ہمارے گھر سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر ٹیوب ویل واقع ہے، ہم اس کے میٹر سے تار لا کر گھر میں بجلی استعمال کرتے ہیں اور صرف شدہ بجلی کا کمرشل بل بھی ادا کرتے ہیں جو گھریلو عام ریٹ سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ کیا ایسا کرنا از روئے شریعت جائز ہے؟

جواب یہ ایک اصولی بات ہے کہ معاشرہ میں رائج قوانین اگر شریعت کے خلاف نہ ہوں تو ان کی پابندی ضروری ہے، محکمہ واپڈا کا یہ قانون ہے کہ ہر صارف کو بجلی استعمال کرنے کے لیے ایک الگ میٹر مہیا کیا جاتا ہے، جو اس محکمہ کے مفاد میں ہے، ایک ہی میٹر سے دوسرے صارف کو بجلی سپلائی کرنا واپڈا کے قوانین کے خلاف ہے، کیوں کہ ایسا کرنے سے خود محکمہ کے مفادات مجروح ہوتے ہیں، اگر کسی اہل کار نے اس کی اجازت دی ہے تو اسے قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا ٹیوب ویل کے میٹر سے ایک کلو میٹر کے فاصلہ پر تار لے جا کر بجلی استعمال کرنا شرعاً و قانوناً درست نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنا محکمہ کے قوانین کے خلاف ہے۔ اگرچہ صارف اس کی ہر ماہ مقررہ رقم ادا کرتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ محکمہ سے اجازت لے کر گھر کے لیے الگ میٹر نصب کرایا جائے تا کہ کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔ اسی طرح گھریلو میٹر کو کمرشل بنیادوں پر استعمال کرنا بھی شرعاً درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال لاہور سے محمد ہاشم لکھتے ہیں کہ میں نے دو دفعہ لاہور سے ملتان ریلوے پر ٹکٹ کے بغیر سفر کیا ہے، اب اپنے اس فعل پر نادم ہوں، میرے لیے شرع میں کیا حکم ہے؟

جواب کسی دوسرے کا مال بلا استحقاق استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ قرآن کریم میں ہے: ''اے ایمان والو! تم کسی دوسرے کا مال باطل طریقہ سے مت کھاؤ'' [۴/النسآء:۲۹]

ٹکٹ کے بغیر سفر کرنا بلا استحقاق کسی دوسرے کا مال کھانا ہے، اس کی تلافی کے لیے دو کام کرنا ہوں گے۔

① اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جائے اور آیندہ اس سے باز رہنے کا عزم کیا جائے۔

② محکمہ ریلوے سے لاہور سے ملتان کے دو ٹکٹ خرید کر انہیں استعمال کیے بغیر ضائع کر دیئے جائیں اس طرح مالی حقوق کی تلافی ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ محکمہ سے جو ٹکٹ خریدے جائیں انہیں نہ تو خود استعمال کیا جائے اور نہ ہی کسی کو استعمال کے لیے دیئے جائیں بلکہ کسی طرح بھی انہیں مصرف میں نہیں لانا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فیصل آباد سے محمد شریف لکھتے ہیں کہ میں محکمہ واپڈا میں بطور میٹر ریڈر تعینات ہوں، میرا کام دفتر سے باہر جا کر بجلی کے میٹر چیک کرنا ہے محکمہ اس کے عوض مخصوص شرائط کے ساتھ T.A ادا کرتا ہے۔ یہ الاؤنس حاصل کرنے کے لیے مجھے مندرجہ ذیل بیان حلفی دینا پڑتا ہے:

① میں جہاں گیا ہوں وہ قطعی طور پر دفتر سے 16 کلومیٹر دور ہے، حالانکہ وہ فاصلہ اس سے کم ہوتا ہے۔

② اس ڈیوٹی پر میرے آٹھ گھنٹے صرف ہوئے ہیں، حالانکہ میرا اتنا وقت صرف نہیں ہوتا۔

③ میرا قطعی طور پر T.A کے مطابق خرچہ ہو چکا ہے۔ حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہوتا ہے، میرا اتنا خرچہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ T.A کا بل پاس کروانے کے لیے مجھے اصل رقم کا 10 فیصد افسران بالا کو بطور رشوت دینا پڑتا ہے۔ اب کیا اس طریقہ سے حاصل کیا ہوا پیسہ میرے لیے حلال ہے؟

جواب مالی معاملات کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقہ سے مت کھاؤ''۔ [۲/البقرہ:۱۸۸]

حدیث میں ہے ''کہ جو انسان جھوٹی قسم اٹھا کر کچھ مال ہتھیا لیتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر انتہائی ناراض ہوں گے اور وہ شخص اللہ کی نظر رحمت سے بھی محروم رہے گا، بعض روایات میں ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام کر دیا ہے''۔ [ابوداود، سنن نسائی]

مذکورہ بالا ارشاد ربانی اور فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر ناجائز طور پر مال کمانا اور اس کا استعمال کرنا حرام ہے، اس بنا پر صورتِ مسئولہ میں مذکورہ T.A لینے کا کوئی جواز نہیں ہے اور نہ ہی اس کا یہ حق ہے کہ رشوت دے کر اسے حاصل کیا جائے بلکہ رشوت کے بغیر بھی اگر ملتا ہے تو اس رقم کا لینا جائز نہیں ہے۔ چہ جائیکہ رشوت جیسے گھناؤنے جرم کا بھی ارتکاب کیا جائے۔ رشوت کے کاروبار کے متعلق فرمانِ نبوی ہے: ''رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنمی ہیں''۔ بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں کے درمیان جو واسطہ بنتا ہے وہ بھی جرم میں برابر کا شریک ہے۔ باعث افسوس تو یہ معاملہ ہے کہ محکمہ کی زیر نگرانی ایسے کام سرانجام پاتے ہیں، کیوں کہ افسران بالا کو علم ہوتا ہے کہ اہل کار کا فاصلہ کتنا ہے؟ اور وہ کتنا وقت اس پر صرف کرتا ہے، چونکہ اس خود ساختہ T.A کا دس فیصد ان کی جیب میں آنا ہوتا ہے اس لیے اہل کار کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ اس طرح حرام ذرائع سے مال کمائے اور اپنی عاقبت کو برباد کرے۔ [واللہ اعلم]

سوال رحیم یار خاں سے محمد عثمان دریافت کرتے ہیں کہ حکومت کی طرف سے جاری کردہ انعامی سکیموں (انعامی بانڈز وغیرہ) کی شرعی حقیقت کیا ہے؟ بعض علما اسے جوا کی ایک قسم بتاتے ہیں۔

جواب حکومت کی طرف سے جاری کردہ انعامی سکیمیں شرعاً ناجائز اور حرام ہیں کیوں کہ یہ جوئے کی مختلف اقسام ہیں جسے قرآن نے حرام پلید اور شیطانی عمل قرار دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''بلاشبہ شراب، جوا، بتوں کے نام کی چیزیں اور تیروں کے ذریعہ قسمت آزمائی پلید اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو''۔ [۵/المائدہ:۹۰]

دورِ جاہلیت میں جوئے کی متعدد صورتیں تھیں جن میں ایک یہ تھی کہ کعبہ میں رکھے ہوئے چند مخصوص تیروں کے ذریعے مشترکہ مال تقسیم کیا جاتا تھا اس طرح کہ قرعہ اندازی کے ذریعے جو تیر جس کے نام نکل آیا اور اس پر جتنا حصہ لکھا ہوتا وہ اسے مل جاتا بعض خالی تیر نکلنے کی صورت میں وہ شخص بالکل محروم رہتا ایسا کرنے سے کچھ لوگ حصہ پاتے اور کچھ بالکل تہی دست رہتے۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں اس قسم کے تمام کام حرام ہیں جن میں تقسیم کا دارومدار کسی ایسے امر پر رکھا جائے جس کے ذریعے دوسروں کا مال کسی ایک شخص یا چند اشخاص کی جیبوں میں چلا جائے دریافت کردہ انعامی سکیموں میں یہ خرابی بدرجہ اتم موجود ہے۔ لہٰذا ان کے حرام اور ناجائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں، امام ابوبکر جصاص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول نقل کرتے ہوئے

لکھتے ہیں کہ ''مخاطرہ جوا ہے۔'' [احکام القرآن: ص ۱/۳۲۹]

دوسرے مقام پر جوئے کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جوئے کی حقیقت یہ ہے کہ کسی کو فکر اور اندیشے کی بنا پر مال کا مالک بنا دیا جائے۔ [احکام القرآن: ج ۱۱، ۴۶۵]

یعنی نتائج سے قبل کسی موہوم خطرہ کے پیش نظر فکر اور اندیشے میں مبتلا ہونا ہے کہ اسے کیا ملے گا کم یا زیادہ یا محروم رہے گا۔ جوئے میں جو رقم ملتی ہے وہ محنت یا کسی خدمت کا صلہ نہیں ہوتی بلکہ محض اتفاقی امور پر اس کی بنیاد رکھی جاتی ہے بعینہٖ یہ صورت حال انعامی سکیموں میں پائی جاتی ہے۔ بعض لوگ اسے انعام کہہ کر جائز سمجھتے ہیں حالانکہ اس طرح کسی کو دی جانے والی رقم کو کسی صورت میں انعام نہیں کہا جا سکتا کیونکہ:

① انعام حسن کارکردگی یا اعلیٰ خدمات کا صلہ ہوتا ہے جبکہ اس میں ایسا نہیں ہوتا۔

② انعام حاصل کرنے والے سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا جبکہ انعامی سکیموں میں شمولیت کے لیے کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔

③ انعام میں کچھ وجوہ ترجیح ہوتی ہے جبکہ ان سکیموں میں کامیابی کی بنیاد محض ''اتفاق'' ہے۔

اس کاروبار کے حرام ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اس میں جمع شدہ رقم سے کچھ حصہ تقسیم کرکے باقی رقم ہڑپ کر جانا لوگوں کا مال ناجائز ذرائع سے کھانا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے مت کھاؤ۔'' [۴/النسآء:۲۹]

لہٰذا جن حضرات نے اسے جوئے کی قسم قرار دیتے ہوئے حرام اور ناجائز کہا ہے وہ برحق اور ان کا موقف بالکل صحیح اور درست ہے۔ قسمت آزمائی کا سہارا لے کر اسے درست کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ وہ قسمت آزمائی جس کی بنیاد محض وہم وگمان اور اتفاقی امر پر ہو وہ ناجائز ہے جیسا کہ قرآن کریم میں تیروں کے ذریعے قسمت آزمائی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے فرمانِ ربانی ہے: ''تمہارے لیے یہ بھی حرام ہے کہ تم پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔'' [۵/المآئدہ:۳]

اس کے علاوہ اسلام میں قرعہ اندازی کی وہ سادہ سی صورت کو جائز کہا گیا ہے جس میں دو مساویانہ حقوق رکھنے والوں کے درمیان فیصلہ کیا جاتا ہے لہٰذا ایسی قرعہ اندازی جس میں قرعہ ڈالنے والوں کے حقوق مساوی نہ ہوں۔ بلکہ صرف سکیم میں شمولیت کی وجہ سے ان کا حق تسلیم کیا جائے اسے قمار اور جوا کہا جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے ان سے بچنا ضروری ہے۔

سوال صوبہ بلوچستان سے عبدالرحمٰن کھوسہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ایک دوست نے اپنی دکان کے لیے انعامی پیکٹ خریدا جس میں چند پرچیاں ہوتی ہیں فی پرچی ایک روپیہ کے حساب سے اسے فروخت کیا جاتا ہے، کچھ پرچیاں خالی ہوتی ہیں اور کچھ میں ایک روپیہ کے برابر مالیت کا انعام ہوتا ہے اور بعض میں ایک روپیہ سے زیادہ بھی انعام لکھا ہوتا ہے اگر یہ پیکٹ فروخت ہو جائے تو بیس پچیس روپے نفع ہوتا ہے، آیا شرعاً یہ کاروبار جائز ہے......؟

جواب یہ کاروبار شرعاً ناجائز ہے کیوں کہ اس میں محض اتفاق سے قسمت آزمائی کی جاتی ہے، اس قسم کی لاٹری دورِ جاہلیت میں بھی رائج تھی جسے قرآن کریم نے حرام کیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب، جوا، تھان اور قسمت

آزمائی کے یہ تیر سب گندے اور شیطانی کام ہیں، ان سب سے اجتناب کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ''۔ [٦/الانعام:٩٠]

دورِ جاہلیت میں کامیابی یا ناکامی کے لیے تیروں کے ذریعہ فال نکالی جاتی تھی اور صورت مسئولہ میں انعامی پرچی کے ذریعے قسمت آزمائی کی جاتی ہے بنیادی طور پر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، پھر کاروبار کے لحاظ سے بھی منع ہے کیوں کہ اس میں ایک طرف جہالت پائی جاتی ہے وہ اس طرح کہ خریدار کو کوئی پتہ نہیں ہے کہ اس کی خریدی ہوئی پرچی میں کیا لکھا ہے شریعت کی نظر میں ہر وہ کاروبار ناجائز ہے جس میں جہالت یا دھوکہ پایا جاتا ہو لہٰذا اس قسم کی قسمت آزمائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

سوال لاہور سے بلال حماد لکھتے ہیں کہ ''اہل حدیث'' مجریہ یکم فروری ایک اشتہار بعنوان ''اپنی لائبریری مفت بنائیں'' شائع ہوا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ مبلغ دو ہزار روپے مکتبہ اصحاب الحدیث کے ہاں جمع کرانے کے بعد ہر تین ماہ بعد جو مکتبہ کی طرف سے کتاب شائع ہو گی وہ رقم جمع کرانے والوں کو مفت پیش کی جائے گی۔ اور یہ جمع شدہ رقم بھی عندالطلب واپس کر دی جائے گی، اس اسکیم کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں۔

جواب اس سوال کے جواب سے پہلے ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے '' کہ قرب قیامت کے وقت سودی کاروبار اس قدر عام ہو جائے گا کہ محتاط قسم کے لوگ بھی اس کی گرد و غبار سے محفوظ نہیں رہ سکیں گے''۔ [مسند امام احمد:٤/٤٩٤]

ہمارے نزدیک مکتبہ اصحاب الحدیث کی طرف سے ''لائبریری مفت بنائیں'' کا اشتہار ایک سودی سکیم کا حصہ ہے کیوں کہ اس میں تین باتیں بینک کے معاملہ سے گہری مماثلت رکھتی ہیں، وہ یہ ہیں:

① مکتبہ کے ہاں جمع شدہ رقم بطور قرض ہے جو عندالطلب قابل واپسی ہوگی۔

② مفت کتاب دینے کی رعایت ایک خالص ہمدردی کی بنیاد پر نہیں بلکہ یہ رعایت دو ہزار قرض دینے والوں کو حاصل ہوگی۔

③ یہ ایک خاص مدت کے ساتھ طے شدہ ہے کہ تین ماہ بعد شائع ہونے والی کتاب مفت دی جائے گی۔

بینک کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔

(الف) لوگوں سے قرض لیتا ہے جو عندالطلب قابل واپسی ہوتا ہے۔

(ب) سود دینے کی ''رعایت'' صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو بینک میں خاص رقم جمع کراتے ہیں۔

(ج) اس قرض پر ایک طے شدہ مدت اور شرح کے مطابق سود دیا جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ ہر وہ قرض سودی معاملہ ہے جو کسی قسم کے مادی نفع کا باعث ہو، مذکورہ صورت مسئولہ میں تین ماہ بعد شائع ہونے والی کتاب مفت دینے کا مادی نفع صرف اس شخص کے لیے ہے جو دو ہزار روپے مکتبہ کو بطور قرض دے گا۔ عام آدمی اس رعایت سے محروم ہوگا، قرض دینے والا بھی کم از کم تین ماہ تک اپنی رقم واپس نہیں لے گا، اگر جمع شدہ رقم ناقابل واپسی ہو تو بھی جائز نہیں ہے، اگر اسے مضاربت کی شکل دی جائے اور نفع و نقصان میں اسے شریک کیا جائے تو جائز ہے۔ بصورت دیگر جائز نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ایسے معاملے سے محفوظ رکھے۔ آمین

سوال خلیل احمد بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنی حلال کمائی سے دنیاوی لالچ کی بنا پر انعامی بانڈ خرید لیتا

ہے حالانکہ یہ کاروبار شرعاً جائز نہیں ہے۔اب سوال یہ ہے کہ بانڈز کی رقم پر بھی زکوٰۃ دینا ہوگی یا نہیں؟ حالانکہ اس کی رقم کاروبار میں مصروف ہو چکی ہے اگرچہ غیر شرعی کاروبار ہے۔

جواب بلاشبہ پرائز بانڈز کا کاروبار نہ صرف سود ہے بلکہ اس میں جوا کا عنصر بھی پایا جاتا ہے،سود اس لحاظ سے ہے کہ حکومت ایک متعین شرح کے حساب سے سود کی رقم کا حساب کر کے اسے انعام کی شکل میں دیتی ہے،اس طرح یہ بانڈز حکومت کے لیے سودی قرضہ کی ہی حیثیت رکھتے ہیں اور بانڈز خرید کر رکھنے والا انعامی رقم کو حاصل کرنے کی توقع کی وجہ سے اس گناہ میں برابر کا شریک ہے اور جوا اس لیے ہے کہ بانڈز ہولڈر صرف اتفاقی طور پر نمبر نکل آنے سے بغیر کسی فعال سرمایہ کاری کے نفع حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔جوا میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔اس لیے جو شخص بانڈز خرید کر اپنے پاس رکھے ہوئے ہے اسے چاہیے کہ اس کی حرمت کے پیش نظر انہیں واپس کر کے اپنی رقم لے اور کسی مناسب کاروبار میں لگائے۔صورت مسئولہ میں ان بانڈز کی مالیت پر زکوٰۃ دینا ہوگی۔بشرطیکہ یہ مالیت نصاب کو پہنچ جائے۔پھر اس پر سال گزر جائے اور وہ رقم ضروریات زندگی سے بھی فاضل ہو،کیوں کہ یہ ایک قرض کی صورت ہے اگر یہ رقم کسی کو قرض دی ہوتی تو بھی اس سے زکوٰۃ ادا کرنا مالک کی ذمہ داری ہے لہٰذا ان بانڈز سے زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے۔البتہ اس بات کا خیال رکھے کہ زکوٰۃ میں یہ بانڈز وغیرہ نہ دیئے جائیں بلکہ نقدی کی صورت میں ادا کی جائے کیوں کہ بانڈز دینے سے سودی کاروبار کے پھیلنے کا اندیشہ ہے اور مسلمان کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

سوال وزیر آباد سے محمد داؤد سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں بیمہ کاری کے متعلق کچھ اختلاف ہو گیا ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ نظام بیمہ اسلام سے متصادم نہیں ہے۔لہٰذا یہ جائز ہے اور ان کے بقول بہت سے علما بھی اس کے حق میں فتویٰ دے چکے ہیں۔جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں؟

جواب بلاشبہ بیمہ کی خشت اول تعاون محض اور امداد باہمی تھی لیکن جب یہ نظام یہودیانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھا تو اسے خالص کاروباری شکل دے دی گئی پھر سود، دھوکہ اور جوئے جیسے بدترین عناصر کو اس میں شامل کر کے اس پر سے تعاون محض کی چھاپ کو اتار دیا گیا اس میں موجود مفاسد کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① سود: طالب بیمہ جو رقم اقساط کی صورت میں کمپنی کو ادا کرتا ہے اگر حادثہ کے وقت اس کے مساوی رقم واپس ملے تو یہ ایک جائز صورت ہے۔لیکن اسے ادا کردہ رقم سے کہیں زیادہ رقم ملتی ہے۔یہ زائد رقم سود ہے۔جس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔کیوں کہ یہ زائد رقم اس کی ادا کردہ رقم کے عوض ملتی ہے سود بھی اسی کا نام ہے کہ ایک آدمی کچھ رقم دیتا ہے پھر ایک خاص مدت کے بعد اس رقم کے عوض کچھ زائد وصول کرتا ہے۔جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''کہ تم صرف اپنی رقم کے حقدار ہو۔''

② جوا: اس کاروبار میں جوا کا عنصر بھی پایا جاتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس میں فریقین اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ وہ دوسرے کو ایک مقررہ رقم جب متعین حادثہ پیش آئے گا تو ادا کرے گا اس لحاظ سے بیمہ کے جوا ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔کیوں کہ جو آدمی ایک قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو اس کے نامزد کردہ وارث کو اس کی ادا کردہ رقم سے کئی گناہ زیادہ رقم ملتی ہے تھوڑی سی محنت کرنے سے اتفاقی طور پر بہت زیادہ ہتھیا لینے کو میسر کہتے ہیں جو قرآن کریم کی نظر میں ایک شیطانی عمل ہے۔

③ دھوکہ: بیمہ کرتے وقت نہ تو طالب بیمہ کو علم ہوتا ہے کہ وہ کتنی اقساط ادا کرے گا اور نہ بیمہ کمپنی جانتی ہے کہ وہ کیا وصول کرے گی اور اسے کیا کچھ ادا کرنا ہو گا لہٰذا یہ سب ''اندھا سودا'' ہے جس میں غرر یعنی دھوکے کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہے اور اس دھوکہ دہی سے شریعت نے منع فرمایا ہے، مذکورہ تین خرابیوں کے علاوہ بھی بے شمار قباحتیں پائی جاتی ہیں جن کے بیان کرنے کی فتویٰ میں گنجائش نہیں، سوال میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتویٰ کا بھی حوالہ دیا گیا ہے حالانکہ ان کے فتویٰ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے موجودہ بیمہ کاری کے جواز کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔ تفصیل کے لیے فتاویٰ ثنائیہ صفحہ ۱۷ ۳ ج ۲ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اس میں مولانا محمد داؤد راز رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے توضیحی اشارات بھی ہیں۔ اس بنا پر مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت سے جواز بیمہ کا مسئلہ کشید کرنا درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عارف والا سے محمد اجمل خان لکھتے ہیں کہ ایک پرائیویٹ کمپنی کی زرعی ادویات فروخت کرنے کے لیے چار یا پانچ سو ڈیلر ہیں، اس کمپنی نے زرعی ادویات کی خرید بڑھانے کے لیے ایک انعامی سکیم تیار کی ہے کہ ہر ڈیلر سے ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس لے کر انہیں زرعی ادویات مہیا کی جائیں پھر ہر ڈیلر کو ایک کلر T.V اور اسلام آباد ہوٹل میں ایک دن کا قیام مع طعام پیش کیا جائے گا نیز 10 عدد موٹر سائیکل بذریعہ قرعہ اندازی دیئے جائیں گے کیا اس طرح ''انعام'' بذریعہ قرعہ اندازی دینا جائز ہے؟

جواب واضح رہے کہ اس طرح کی انعامی اسکیمیں کسی انسانی ہمدردی کے پیش نظر نہیں ہوتیں بلکہ مختلف کمپنیاں اپنی مصنوعات کو فروغ دینے اور مارکیٹ میں ان کی خرید وفروخت بڑھانے کے لیے ایسا کرتی ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی دوسری کمپنی کو ناکام کرنے کے لیے انعامی اسکیموں کا اجراء کر دیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کا رجحان کمپنی کی مصنوعات کی طرف زیادہ ہو جائے، اس میں منافع کی شرح اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس سے انعامات وغیرہ نکال کر ڈھیروں بچت ہوتی ہے، صورت مسئولہ میں اگر کمپنی کسی دوسری کمپنی کو ناکام نہیں کرنا چاہتی اور اپنے تمام ڈیلروں سے مساویانہ سلوک کرتے ہوئے اور T.V کی بیماری کو اس انعامی سکیم سے نکال کرتے ہوئے برابر مراعات تقسیم کرتی ہے تو کسی حد تک جواز کی گنجائش ہے۔ لیکن قرعہ اندازی کے ذریعے ان کی تقسیم محل نظر ہے کیوں کہ شریعت میں قرعہ اندازی کو وہاں برقرار رکھا گیا ہے جہاں استحقاق میں سب برابر ہوں لیکن تمام کو حق دینے کے لیے فیصلہ ناممکن یا مشکل ہو جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں بذریعہ قرعہ اندازی کسی ایک زوجہ محترمہ کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ سفر میں اپنے خاوند کے ہمراہ جانے میں تمام ازواج برابر استحقاق رکھتی ہیں، لیکن اس پر عمل ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے بنا بریں قرعہ اندازی سے فیصلہ کیا جاتا۔ صورت مسئولہ میں ایسا نہیں ہے۔ کیوں کہ 10 عدد موٹر سائیکل لینے میں تمام ڈیلر استحقاق نہیں رکھتے نیز کمپنی کے لیے ان کے متعلق فیصلہ کرنا ناممکن یا مشکل نہیں ہے بلکہ وہ اتنی مالیت کی کوئی ایسی چیزیں اپنے ڈیلروں کو دے سکتی ہے جو قرعہ اندازی کے بغیر تمام کو برابر تقسیم ہو سکتی ہوں، ہمارے نزدیک تو انہیں انعام قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ انعام میں مندرجہ ذیل چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

① انعام حسن کارکردگی یا اعلیٰ خدمات کا صلہ ہوتا ہے جبکہ اس طرح کی انعامی اسکیموں میں کوئی کارکردگی یا خدمات نہیں دیکھی جاتیں۔

② انعام حاصل کرنے والے سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا جبکہ اس انعامی اسکیم میں شمولیت کے لیے ایک لاکھ روپیہ ایڈوانس برائے ادویات جمع کرانا ضروری ہے۔

③ انعام میں کچھ وجوہ ترجیح ہوتی ہیں جبکہ مذکورہ اسکیم کی بنیاد محض اتفاق ہے۔اس بنا پر اس قسم کی شمولیت میں گریز کیا جائے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال پھول نگر سے خورشیدہ بی بی سوال کرتی ہیں کہ میرے دو بیٹے ہیں اور مجھے بذریعہ قرعہ اندازی حکومت کی طرف سے ایک پلاٹ الاٹ ہوا۔جس کی قیمت اور اس کی تعمیر پر اٹھنے والے جملہ اخرجات میرے بڑے بیٹے اور چھوٹی بیٹی نے برداشت کیے اب میرا چھوٹا بھائی فوت ہو چکا ہے میں چاہتی ہوں کہ مذکورہ تعمیر شدہ پلاٹ جس کی پرچی میرے نام ہے اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کو دے دوں،میرا بڑا بیٹا بھی ان کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہے کیا میں شرعی طور پر وہ مکان اپنے یتیم بھتیجوں کو دے سکتی ہوں؟

جواب واضح رہے کہ صورتِ مسئولہ میں پلاٹ میں تعمیر شدہ مکان کا مالک وہی ہے جس کو حکومت نے الاٹ کیا ہے اگر کسی دوسرے نے اس کی قیمت ادا کی ہے اور اس کی تعمیر پر اٹھنے والے اخراجات برداشت کیے ہیں تو ایسا کرنے سے کوئی دوسرا اس کا مالک نہیں بن سکے گا اسے حسن سلوک اور ایثار و ہمدردی کا نام تو دیا جا سکتا ہے لیکن انتقال ملکیت کی وجہ نہیں بن سکتا اس کی وضاحت کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خود مختار بنا کر بھیجا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اللہ کی نعمتوں کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے،مال وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس میں بھی تصرف کرنے کا اسے پورا پورا حق ہے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:"ہر مالک اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔وہ اس حق کو جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے"۔ [بیہقی:۶/۱۷۸]

لیکن اس تصرف کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے:

☆ یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے نہ ہو۔

☆ جائز تصرف کرتے وقت کسی شرعی وارث کو محروم کرنا مقصود نہ ہو۔

☆ اگر یہ تصرف بطور ہبہ اولاد کے لیے ہے تو نرینہ اور مادینہ اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک پر مبنی ہو۔

☆ اگر یہ تصرف بطور وصیت عمل میں آئے تو کل جائیداد کے ۱/۳ سے یہ تصرف زائد نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی کسی شرعی وارث کے لیے وصیت کی گئی ہو۔ان مذکورہ شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے سائلہ اپنی زندگی میں بقائمی ہوش و حواس مذکورہ مکان اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کو دے سکتی ہے تاہم آیندہ پیدا ہونے والی کشیدگی کے پیش نظر اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے تاکہ باہمی اختلاف و ناچاقی کے تمام راستے مسدود ہو جائیں اور یہ نیکی کا کام بخیر و خوبی سرانجام پا سکے۔

سوال ملتان سے عبدالکریم آصف سوال کرتے ہیں کہ ہمارے پڑوس میں ایک مدرسہ ہے وہاں بکثرت گوشت آتا ہے۔اہل مدرسہ ضرورت سے زائد گوشت کو بازار سے کم قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں جب کہ وہ گوشت صدقہ و خیرات کے طور پر مدرسہ میں لایا جاتا ہے کیا اس طرح ضرورت سے فاضل گوشت کی خرید و فروخت جائز ہے؟

جواب مخیّر حضرات جو مدرسہ کے لیے اشیائے خوردنی دیتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ علم دین حاصل کرنے والے طلبا اسے استعمال کریں اور خود کھائیں، ان کی نیت اور نیک مقصد کے پیش نظر فاضل گوشت کی خرید وفروخت سے پرہیز کرنا چاہیے، اگر گوشت وغیرہ کسی مدرسہ کی ضرورت سے زائد ہے تو اہل مدرسہ کو فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی دوسرے مدرسہ کو دے دینا چاہیے یا اہل مدرسہ گوشت دینے والے کو کہہ دیں کہ ہمیں اب اس کی ضرورت نہیں، آپ اس کے متبادل اور چیز دے دیں یا آپ کسی اور مدرسہ کو دے دیں گوشت کو فروخت کرنے سے عامۃ الناس میں علما کے متعلق یہ بدگمانی بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ حق داروں کو کھلانے کے بجائے اشیائے خوردنی آگے بیچ دیتے ہیں پھر ایسی باتوں کو بنیاد بنا کر ان کے خلاف نفرت وحقارت کے جذبات کو ابھارا جا سکتا ہے اس کے علاوہ ضرورت سے زائد گوشت فروخت کرنے سے دینے والے کی نیت پوری نہیں ہوتی، ان اسباب کے پیش نظر اس کی خرید وفروخت سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ بلکہ کسی دوسرے مدرسہ کو دے دینا بہتر ہے، البتہ اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ حق دار کے پاس پہنچ جانے کے بعد صدقہ وخیرات کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے پاس آنے والا صدقہ کا گوشت تناول کر لیتے تھے اس کے متعلق آپ ﷺ فرماتے تھے: ''کہ یہ گوشت بریرہ کے لیے صدقہ ہے اور ہمارے لیے ہدیہ ہے۔'' [صحیح بخاری: الزکوٰۃ ۱۴۹۳]

اس پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''جب صدقہ کی حیثیت بدل جائے'' (تو وہ صدقہ نہیں رہتا)

اس لیے عشر وغیرہ کی گندم جو مدرسہ کی ضرورت سے زائد ہو اسے آگے فروخت کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے کیوں کہ مدرسہ میں پہنچنے کے بعد اس کی صدقہ وغیرہ کی حیثیت ختم ہو چکی ہے تاہم گوشت اور سبزی وغیرہ کو فروخت کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے امان اللہ خان دریافت کرتے ہیں کہ گندم، چاول اور چنا وغیرہ کم قیمت کے موسم میں جمع کر کے سردیوں میں زیادہ قیمت پر فروخت کرنا شرعاً کیسا ہے کیا یہ ذخیرہ اندوزی تو نہیں جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

جواب شریعت اسلامیہ میں ممنوع ذخیرہ اندوزی یہ ہے کہ ایسی اشیاء جو عام لوگوں کی ضروریات کے لیے ہوں انہیں اس غرض سے سٹاک کیا جائے کہ ان کے متعلق مصنوعی قلت پیدا کر کے بوقت ضرورت مہنگے داموں فروخت کیا جائے۔ ایسا کرنا جرم ہے کیوں کہ ایثار اور ہمدردی کے جذبات کو کچلتے ہوئے لوگوں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ شریعت نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والا انتہائی غلط انسان ہے۔'' [صحیح مسلم: کتاب البیوع]

مندرجہ ذیل اشیاء ذخیرہ اندوزی کے حکم میں شامل نہیں ہیں۔

☆ جو اشیاء سٹاک نہیں ہو سکتیں مثلاً چارہ وغیرہ۔

☆ جو اشیاء گھریلو ضروریات کے لیے جمع کی گئی ہوں۔

☆ جو اشیاء کاروباری نقطۂ نظر کے پیش نظر خریدی گئی ہوں لیکن بازار میں کھلے بھاؤ عام دستیاب ہوں البتہ اگر بازار میں ضروریات زندگی سے متعلق اشیاء دستیاب نہ ہوں اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا بھاؤ تیز ہونے کے انتظار میں انہیں دبا کر بیٹھا رہے تو ایسا کرنا

شرعاً اور قانوناً ایک سنگین جرم ہے۔

صورت مسؤلہ میں گندم، چاول اور چنا وغیرہ کو سٹاک کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ مصنوعی قلت پیدا کرنے کی نیت نہ ہو اور اگر بازار میں اشیاء بسہولت دستیاب نہ ہوں تو انہیں دبا کر نہ رکھا جائے بلکہ کھلے بازار فروخت کے لیے لانا چاہیے اگر بازار میں یہ چیزیں عام دستیاب ہیں تو ایسی چیزوں کا ذخیرہ کرنا شرعاً ناجائز نہیں۔

سوال ایک انشورنس کمپنی E.F.U کا دعویٰ ہے کہ ہم رقم کو بزنس میں لگاتے ہیں اور منافع یا نقصان سرمایہ لگانے والوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، ہم بینک یا دوسری سیونگ کمپنیوں کی طرح منافع کی شرح فکس نہیں کرتے، اس کے متعلق واضح کریں کہ ایسی کمپنی میں سرمایہ کاری کرنا شرعاً درست ہے۔ (پروفیسر عبد الماجد، منڈی بہاول الدین بذریعہ ای میل)

جواب انشورنس جسے بیمہ کہا جاتا ہے ایک جدید کاروباری معاملہ ہے، جس کا اسلامی فقہ کے ابتدائی دور میں کوئی وجود نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے جن ماہرین علم نے اس پر بحث کی ہے، ان کی آراء مختلف ہیں، بعض اس کے جائز ہونے کی طرف رجحان رکھتے ہیں جبکہ بعض دوررس اور باریک بین حضرات نے اس کے برعکس اس کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے لہٰذا اس کے متعلق شرعی حکم معلوم کرنے سے پہلے اس معاملہ کی اصل حقیقت جاننا انتہائی ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بیمہ نظریہ کے اعتبار سے باہمی تعاون اور امداد محض پر قائم ہے، نظریے کی حد تک یہ ایسا امر ہے جس پر شریعت نے بھی ابھارا ہے۔ دین اسلام نے ہمیں باہمی تعاون، ایک دوسرے کی مدد، ایثار و قربانی دینے کی ترغیب دی ہے۔ جس کی عملی صورت معاملات عطیات اور صدقات وخیرات ہیں۔ شریعت اسلامیہ نے جہاں اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں وہاں ان ذرائع و وسائل کو بھی بیان کیا ہے۔ جو ان مقاصد کے حصول کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں۔ بیمہ نظریے اور نظام کے اعتبار سے تو تعاون محض پر قائم تھا لیکن عملی طور پر جو ذرائع استعمال کیے گئے ہیں وہ خود اس نظریہ کی نفی کرتے ہیں جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، دراصل امداد باہمی پر مبنی یہ نظام جب یہودیانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھا تو اسے پہلے تو کاروباری شکل دے دی گئی پھر سود، دھوکہ اور جوئے جیسے بدترین عوامل وعناصر کو اس میں شامل کر کے اس پر سے تعاون محض کی چھاپ کو اتار دیا گیا۔ یہ بیمہ اشخاص اور کمپنیوں کے درمیان ایک خاص عقد کا نام ہے جس میں افراد اور کمپنیوں کے درمیان مندرجہ ذیل امور طے پاتے ہیں۔

① طالب بیمہ ایک معین رقم معینہ مدت تک بالاقساط ادا کرتا ہے، اس کے عوض بیمہ کمپنیاں اسے خطرات سے تحفظ اور گراں قدر سالانہ منافع پیش کرتی ہیں۔

② یہ کمپنیاں اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہیں اس رقم کو صرف کریں، طالب بیمہ اس سے قطعی طور پر لاتعلق ہوتا ہے۔ یہ رقم جائز و ناجائز کاموں پر صرف کی جاتی ہے جیسے عمارات کی تعمیر اور بھاری شرح سود پر آگے بڑی کمپنیوں کو قرض دینا وغیرہ۔

③ طالب بیمہ اگر معینہ مدت تک زندہ رہے اور پوری رقم بالاقساط ادا کر دے تو وہ کمپنی سے ادا کردہ رقم سے زائد وصول کرنے کا حقدار ہو جاتا ہے، اگر اس مدت سے پہلے مر جائے تو اس کی طرف سے نامزد شخص زر بیمہ کا مستحق ہوتا ہے۔

④ اگر طالب بیمہ معینہ مدت سے پہلے اپنی اقساط بند کر کے معاہدہ بیمہ کو ختم کرنا چاہے تو جمع شدہ رقم کمپنی ضبط کر لیتی ہے۔

بیمہ کی تعریف مختصر طور پر یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے تحفظ دھندہ یعنی بیمہ کمپنی پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس شخص کو جس نے بیمہ پالیسی خریدی ہے حادثہ یا نقصان پہنچنے کی صورت میں ایک مخصوص رقم ادا کرے۔ اس تعریف سے بیمہ کے تین عناصر کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہیں:

① بیمہ کی قسط۔ ② خطرہ۔ ③ بیمہ کی رقم۔

خطرہ سے مراد وہ امکانی حادثہ ہے جو مستقبل میں کسی وقت بھی پیش آ سکتا ہے۔ یہ خطرہ اور حادثہ ہی اس کاروبار بیمہ میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے اور باقی دوسرے عناصر کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس کاروبار کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ معاہدہ کی رو سے فریقین ذمہ دار بن جاتے ہیں۔ اس میں ایک فریق خطرات سے تحفظ فراہم کرنے والا ہوتا ہے اور دوسرا وہ جسے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے جسے طالب بیمہ کہتے ہیں، اس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ اقساط بیمہ کی ادائیگی کا بروقت بندوبست کرے یہ ذمہ داری معاہدہ کی تکمیل کے وقت ہی شروع ہو جاتی ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں بیمہ کمپنی کی ذمہ داری غیر یقینی اور احتمالی ہوتی ہے کیوں کہ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حادثہ پیش آنے کی صورت میں بیمہ کی رقم ادا کرے اس ذمہ داری کے وجود کا تصور اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ کوئی حادثہ پیش آئے اس وجہ سے دھوکہ اور احتمال اس کاروبار کا بنیادی رکن اور لازمی عنصر ہے کیوں کہ بیمہ کا کاروبار اس کے بغیر ناممکن ہے اور یہ دھوکہ اپنی نوعیت اور قسم کے لحاظ سے انتہائی سنگین ہے کیوں کہ یہ حصول معاوضہ کے سلسلہ میں، اس کی مقدار اور اس کی مدت کے بارے میں پایا جاتا ہے جبکہ شریعت نے کاروباری معاملات میں دھوکہ کی معمولی قسم کو بھی حرام ٹھہرایا ہے۔ دھوکہ عربی زبان میں غرر کو کہتے ہیں جس کی تعریف یہ ہے کہ ''غیر طبعی، غیر معمولی اور غیر یقینی صورت حال جس کے پیش نظر کسی معاملہ یا لین دین کے ضروری پہلو متعین نہ کیے جا سکیں اور فریقین آخر وقت تک اس معاملہ میں غیر یقینی صورتحال کا شکار رہیں کہ ان کے معاملہ کی اصل صورت بالآخر کیا ہوگی''۔

غرر کی متعدد تعریفات سے اس کے جو اہم عناصر سامنے آئے ہیں وہ شک وشبہ، غیر یقینی کیفیت اور معاملہ کے بنیادی اجزاء کا غیر معلوم اور غیر معین ہونا ہے، جس معاملہ میں یہ عناصر پائے جائیں وہ معاملہ مبنی بر دھوکہ سمجھا جائے گا اور شریعت میں ایسا معاملہ ناجائز اور حرام ہے۔ ہم اس مقام پر یہ وضاحت کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ بیمہ کے متعلق محل اختلاف اس کا نظریہ اور نظام ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ محل اختلاف وہ طریق کار اور ذریعہ ہے جو اس کے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے طریق کار کے پیش نظر یہ کاروبار غیر یقینی اور سنگین دھوکے والا معاملہ ہے، اس کے غیر یقینی ہونے سے یہ مراد ہے کہ اس میں فریقین میں سے ہر ایک کو معاہدہ کی تکمیل کے وقت معاوضہ کی اس مقدار کا علم نہیں ہوتا جو وہ ادا کرے گا یا وصول کرے گا۔ اس لیے کہ وہ تو اس خطرہ کے وقوع یا عدم وقوع پر موقوف ہوتا ہے، جس سے تحفظ دیا گیا ہے اور یہ بات اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ حادثہ پیش آئے گا یا نہیں؟ اگر آئے گا تو کب آئے گا؟ بعض اوقات طالب بیمہ ایک ہی قسط ادا کرنے کے بعد حادثہ سے دوچار ہو جاتا ہے اور رقم بیمہ کا حقدار بن جاتا ہے جبکہ بعض اوقات پوری اقساط ادا کرنے کے باوجود حادثہ پیش نہیں آتا اس طرح تحفظ فراہم کرنے والی بیمہ کمپنی کو معاہدہ کے وقت علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا وصول کرے گی اور کیا ادا کرے گی کیوں کہ بعض اوقات ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد حادثہ پیش آ جاتا ہے اور اسے بیمہ کی رقم طالب بیمہ کو ادا کرنا پڑتی ہے اور بعض اوقات پوری اقساط وصول کر لیتی ہے لیکن حادثہ

پیش ہی نہیں آتا، اس طرح یہ معاملہ سراسر ایک ''اندھا سودا'' ہے جس میں دھوکے کا پہلو نمایاں طور پر موجود ہے جس کی مزید وضاحت حسب ذیل ہے۔

مالی معاملات میں دھوکہ چار طرح سے ہو سکتا ہے

① خود کسی چیز کے وجود میں دھوکہ ہو۔ جیسا کہ گم شدہ اونٹ کی خرید وفروخت۔

② کسی چیز کے حصول میں دھوکہ ہو۔ جیسا اڑتے ہوئے پرندوں کی خرید وفروخت۔

③ کسی چیز کی مقدار میں دھوکہ ہو۔ جیسے پتھر پھینکنے کی جگہ تک زمین کی خرید وفروخت۔

④ مدت حصول میں دھوکہ جیسا کہ حمل کے جنم تک قیمت ادا کرنا وغیرہ کاروبار بیمہ میں دھوکہ کی یہ چاروں اقسام پائی جاتی ہیں۔

☆ کسی چیز کے وجود میں دھوکہ کا پایا جانا۔ یہ دھوکہ کی شدید ترین قسم ہے یہی وجہ ہے کہ فقہا نے صرف معدوم چیز کے معاوضہ پر ہی بطلان کا حکم نہیں لگایا بلکہ وہ اس حکم کے تحت ہر اس چیز کو شامل کرتے ہیں جس کے وجود اور عدم دونوں کا احتمال ہو، دھوکہ کی یہ قسم کاروبار بیمہ میں پوری طرح دیکھی جاسکتی ہے کیوں کہ بیمہ کی جو رقم کمپنی کے ذمے ہوتی ہے اس کا وجود غیر یقینی ہے کیوں کہ اس کا وجود حادثہ پر موقوف ہوتا ہے اور وہ خود غیر یقینی ہے۔

☆ کسی چیز کے حصول میں دھوکہ پایا جانا اس کے معاوضہ کو باطل کر دیتا ہے جیسا کہ دریا میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی قیمت ادا کرنا کیوں کہ جو شخص ان کی قیمت ادا کرتا ہے وہ گویا ان کے حصول کو داؤ پر لگا رہا ہے۔ وہ معاملہ کرتے وقت یہ نہیں جانتا کہ اس نے جس چیز کی قیمت ادا کی ہے وہ اسے حاصل بھی کر سکے گا یا نہیں جبکہ اس نے معاوضہ صرف اس چیز کو حاصل کرنے کے لیے ادا کیا ہے۔ بیمہ کے کاروبار میں بھی یہ دھوکہ پایا جاتا ہے کیوں کہ طالب بیمہ معاہدہ کرتے وقت یہ نہیں جانتا کہ آیا بیمہ کی جس رقم کے بدلے اس نے اقساط ادا کی ہیں وہ اسے حاصل کر سکے گا یا نہیں کیوں کہ اس کا حصول تو اس حادثہ پر موقوف ہے جس کا واقع ہونا یقینی نہیں ہے۔

☆ معاوضہ کی مقدار کا دھوکہ بھی وجود اور حصول کی طرح معاوضہ کو باطل کر دیتا ہے جیسا کہ مٹھی بند روپوں کے عوض کوئی چیز خریدنا شرعاً باطل ہے، اس طرح نقصانات کے بیمہ میں طالب بیمہ کو معاہدہ کرتے وقت اس معاوضہ کی مقدار کا علم نہیں ہوتا جو بیمہ کمپنی حادثہ پیش آنے کی صورت میں ادا کرے گی، اس طرح بیمہ کمپنی بھی معاہدہ طے ہوتے وقت اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ طالب بیمہ سے جو کچھ حاصل کرے گی اس کی مقدار کیا ہوگی کیوں کہ بعض اوقات ایک ہی قسط وصول کرنے کے بعد حادثہ پیش آجاتا ہے جبکہ بعض اوقات تمام اقساط وصول کرنے کے باوجود حادثہ پیش نہیں آتا۔

☆ معاوضہ والے معاملات میں اگر مدت معلوم نہ ہو تو بھی معاملہ باطل ہو جاتا ہے جیسا کہ حمل کی خرید وفروخت اس لیے منع ہے کہ اس کی معیاد غیر متعین ہوتی ہے اسی طرح تاحیات بیمہ پالیسی میں بیمہ کمپنی، بیمہ کی رقم طالب بیمہ کے مرنے کی صورت میں ادا کرنے کا عہد کرتی ہے جبکہ یہ معیار یعنی اس کے مرنے کا وقت نامعلوم اور غیر متعین ہے۔

بیمہ کا معاملہ جوا پر مشتمل ہے۔

بیمہ کا کاروبار اس لیے بھی حرام اور ناجائز ہے کہ اس میں جوا پایا جاتا ہے جو قرآن کی نظر میں ایک شیطانی عمل ہے۔ حصول زر کی ہر وہ شکل جوا ہے جس میں اسے حاصل کرنے کا دارومدار محض اتفاق پر ہو اور دوسرے یکساں حق رکھنے والوں کے مقابلہ میں ایک شخص کسی لاٹری، قرعہ اندازی یا محض کسی اور اتفاق کے نتیجہ میں رقم کو حاصل کر لے۔ یہ تمام جوا کی اقسام ہیں۔ جوا کی تعریف کاروبار بیمہ پر اس طرح صادق آتی ہے کہ جوا میں فریقین اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ وہ دوسرے کو ایک مقررہ رقم کوئی حادثہ پیش آنے پر ادا کرے گا، کاروبار بیمہ میں بھی یہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات طالب بیمہ ایک قسط ادا کرنے کے بعد مر جاتا ہے تو اس کے نامزد کردہ وارث کو ادا کردہ رقم سے کئی گنا زیادہ رقم ملتی ہے، اس کا اس طرح مرنا ایک اتفاقی حادثہ ہے جو نامزد وارث کے لیے کثیر رقم ملنے کا باعث بنا ہے، تھوڑی سی محنت کر کے اتفاقی طور پر بہت زیادہ رقم ہتھیا لینا میسر کہلاتا ہے جس سے قرآن کریم نے منع فرمایا ہے، اس طرح طالب بیمہ اگر معینہ مدت سے پہلے اپنے عقد کو فسخ کرنا چاہے اور بقیہ اقساط کی ادائیگی روک لے تو اس صورت میں کمپنی جمع شدہ رقم کی مالک بن جاتی ہے یہ بھی قمار کی ایک قسم ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

اس کاروبار میں سود کی دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں

طالب بیمہ جو رقم اقساط کی صورت میں کمپنی کو ادا کرتا ہے اگر حادثہ کے وقت اس کے مساوی رقم واپس ملے تو ایک طرف سے نقد ادائیگی اور دوسری طرف سے ادھار ہونے کی بنا پر یہ ادھار کا سود ہے جسے شریعت کی اصطلاح میں ربا النسیہ کہتے ہیں اور اگر ادا کردہ رقم سے زیادہ ہے تو یہ اضافے کا سود ہے جسے ربا الفضل کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ زائد رقم اس کی ادا کردہ رقم کے عوض ملتی ہے، سود یہی ہوتا ہے کہ ایک آدمی کچھ رقم کسی دوسرے کو دیتا ہے پھر ایک خاص مدت کے بعد اس رقم کے عوض کچھ زائد رقم وصول کرتا ہے جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اگر تم توبہ کر لو تو صرف اپنی رقم کے حقدار ہو۔'' [۲/البقرة:۲۷۹]

نیز معینہ مدت تک زندہ رہنے اور تمام اقساط ادا کرنے کی صورت میں طالب بیمہ مجموعی رقم سے زائد زر بیمہ لینے کا مستحق ہوتا ہے، یہ اضافہ کے ساتھ خطیر رقم یکمشت یا بالاقساط لے سکتا ہے، یہ سود کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

کاروبار بیمہ ضابطۂ وراثت سے متصادم ہے۔

یہ کاروبار اس لیے بھی ناجائز ہے کہ اس پر عمل کرنے سے ضابطۂ وراثت مجروح ہوتا ہے کیوں کہ مرنے کی صورت میں زر بیمہ کا مالک وہ نامزد شخص بن جاتا ہے جو طالب بیمہ نے اپنی زندگی میں مقرر کیا ہوتا ہے، باقی ورثاء اس سے محروم ہوتے ہیں حالانکہ اس کے ترکہ میں تمام شرعی ورثاء شریک ہوتے ہیں۔

دور جدید میں فلمی اداکارہ کے حسن و جمال اور ایک مغنیہ اور گلوکارہ کی آواز کا بیمہ بھی ہوتا ہے اس نے ایسے نام نہاد مفادات کو جنم دیا ہے جنہیں شریعت سرے سے کوئی مفاد ہی تسلیم نہیں کرتی۔ اس طرح اس کاروبار میں تعاون علی الاثم والعدوان بھی پایا جاتا ہے لہٰذا اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

سوال میں اس پہلو کو بھی اٹھایا گیا ہے کہ کاروبار بیمہ میں جو رقم جمع ہوتی ہے اسے کاروبار میں لگایا جاتا ہے پھر اس کے منافع یا نقصانات کو سرمایہ لگانے والوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، یعنی یہ مضاربت کی ایک قسم ہے، اس کاروبار کو مضاربت قرار دینا درج ذیل

وجوہات کی بنا پر محل نظر ہے۔

☆ مضاربت کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس میں منافع کی شرح نسبت کی بنیاد پر ہو مثلاً ایک آدمی محنت کرتا ہے اور دوسرا رقم دیتا ہے تو اخراجات کے بعد جو منافع ہوگا وہ ایک خاص شرح کے مطابق تقسیم ہوگا مثلاً 50% محنت کرنے والا اور 50% رقم خرچ کرنے والا یا اور کوئی شرح مقرر کر لی جاتی ہے لیکن صرف رقم پر معین منافع عقد مضاربت کے لیے مفسد قرار دیا گیا ہے جیسا کہ بیمہ زندگی میں ہوتا ہے۔ مثلاً جمع شدہ رقم پر 10% نفع دیا جائے گا، اس لیے دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ بادی النظر دونوں میں مشابہت پائی جاتی ہے۔

☆ اگر مضاربت میں نقصان ہو تو اس نقصان کو صرف سرمایہ لگانے والا برداشت کرتا ہے، مضارب کی محنت تو ضائع ہوتی ہے اس کے علاوہ مالی نقصان میں وہ شریک نہیں ہوتا جبکہ بیمہ کے کاروبار میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہوتی، اس کاروبار میں سرمایہ کار کو ہر صورت منافع ہی ملتا ہے نقصان کی صورت میں کمپنی ذمہ دار ہوتی ہے۔

☆ مضاربت میں سرمایہ کار کو علم ہوتا ہے کہ میری رقم کس قسم کے کاروبار میں صرف ہو رہی ہے جبکہ بیمہ میں سرمایہ کار کو اس قسم کے معاملات سے بالکل لاتعلق رکھا جاتا ہے۔

☆ مضاربت میں اگر سرمایہ کار مر جائے تو اس کی رقم ورثاء کو ملتی ہے جبکہ بیمہ کے کاروبار میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ موت کی صورت میں اس کا حقدار اس کا نامزد کردہ ہوتا ہے، شرعی ورثاء اس کے حقدار نہیں ہوتے۔ اس میں قانونِ وراثت کی صریح خلاف ورزی ہے۔ ہماری بیان کردہ وجوہات کی بنا پر بیمہ کا کاروبار مضاربت سے مشابہت نہیں رکھتا۔

بیمہ کی جائز صورتیں

بیمہ عملی طور پر جن صورتوں پر مشتمل ہے، اس کی تین اقسام ہیں:

① اجتماعی بیمہ: اسے حکومت یا اس کا نامزد کردہ کوئی ادارہ چلاتا ہے، عام طور پر محنت مزدوری کرنے والوں کو اس میں شامل کیا جاتا ہے، مزدوری کرتے وقت جو حوادث یا امراض لاحق ہوتے ہیں جن کی وجہ سے مزدور معذور ہو جاتے ہیں یا وہ بڑھاپے میں پہنچ کر ناکارہ ہو جاتے ہیں تو ان کا بیمہ کیا جاتا ہے، اس کے لیے آجر، اجیر اور حکومت اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہیں واضح رہے کہ یہ کاروبار نہیں بلکہ ایک خدمت ہے جسے شریعت نے پسند کیا ہے اور ایسا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

② باہمی بیمہ: یہ کاروبار امداد باہمی کی انجمنیں چلاتی ہیں جو ایسے ارکان سے مل کر تشکیل پاتی ہیں جنہیں ایک ہی طرح کے خطرات کا سامنا ہوتا ہے اگر کسی کو حادثہ پیش آ جائے تو جمع شدہ رقم سے اس کی تلافی کر دی جاتی ہے، اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

③ مقررہ اقساط والا بیمہ: بیمہ کی یہی صورت تھی جسے سابقہ سطور میں زیر بحث لایا گیا ہے، ہمارے نزدیک بیمہ کی یہ صورت حرام اور ناجائز ہے کیوں کہ اس میں دھوکہ، جوا، سود جیسے عناصر شامل ہیں، بعض لوگ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک فتویٰ کا حوالہ بھی دیتے ہیں کہ انہوں نے اسے جائز لکھا ہے حالانکہ ان کے فتویٰ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے موجودہ بیمہ کاری کا جواز کشید کیا جائے تفصیل کے لیے فتاویٰ ثنائیہ ص ۷۱ ج ۲ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ اس پر مولانا محمد

داؤد راز رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شرف الدین محدث دہلوی کے توضیحی اشارات بھی ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی نے دولاکھ روپے بینک میں رکھے، اسے ایک سال دس ہزار سود ملا، اگر سود نہیں لیتا تو بینک کا عملہ اسے بانٹ لے گا لہٰذا وہ آدمی اپنی سود کی رقم کسی ایسے شخص کو دے دیتا ہے جس کے لیے مردار اور خنزیر کھانا بھی حلال ہے۔ کیا ایسا کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ وہ آدمی سود کی رقم لینے کو بہت بڑا گناہ سمجھتا ہے۔ (حافظ محمد ارشد کسووال خریداری نمبر ۵۳۳۳)

جواب ہمارے نزدیک سود ایک ایسی غلاظت ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہر ممکن طریقے سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے، اسلام ہر پہلو سے اس نظام کا استیصال چاہتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی سنگینی کو بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''اگر تم اس سے باز نہیں آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلان جنگ ہے۔'' [۲/البقرہ:۲۷۸]

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس گندے نظام سے نفرت دلائی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سود لینے والا، دینے والا، اسے لکھنے والا، اس پر گواہی دینے والا سب ملعون ہیں اور یہ سب گناہ میں برابر ہیں۔'' [صحیح مسلم: البیوع ۱۵۹۸]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اگر اس جرم عظیم کے ستر حصے کیے جائیں تو اس کا کم تر حصہ بھی اپنی ماں سے زنا کے برابر ہے۔''

[ابن ماجہ: التجارات ۲۲۷۴]

بلکہ آپ نے سود کھانے کو چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ (مسند امام احمد) لیکن ہم لوگ اس کے متعلق نرم گوشہ رکھے ہوئے ہیں کہ اسے بینک سے وصول کر لینا چاہیے پھر

① ثواب کی نیت کیے بغیر کسی محتاج یا رفاہ عامہ میں خرچ کر دیا جائے۔

② بینک سے قرضہ لینے کی ضرورت پڑے تو سود کی جگہ اس رقم کو صرف کر دیا جائے۔

③ ناجائز ٹیکسوں پر اسے صرف کر دیا جائے۔

مگر جب اس سلسلہ میں شریعت کے احکام دیکھتے ہیں تو مصلحتوں کا یہ تعمیر کردہ بلند و بالا محل دھڑام سے نیچے آگرتا ہے کیوں کہ انسان فطرتاً حریص واقع ہوا ہے لہٰذا اسے مال کسی راہ سے بھی آتا نظر آئے تو اسے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا جب اسے سود وصول کرنے کی اجازت مل جائے گی تو وہ اس گندگی سے خود پاک وصاف نہیں رہ سکے گا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نظریہ میں لچک آنا شروع ہو جائے گی پھر خود اسے استعمال کرنے کی راہیں تلاش کرے گا، شریعت اسے مال تسلیم نہیں کرتی کہ اسے وصول کر کے دوسری جگہ پر صرف کیا جائے قرآن کریم کی واضح ہدایت ہے۔ ''اور اگر تم سود سے توبہ کر لو تو تم صرف اپنے اصل سرمایہ کے حقدار ہو۔'' [۲/البقرہ:۲۷۹]

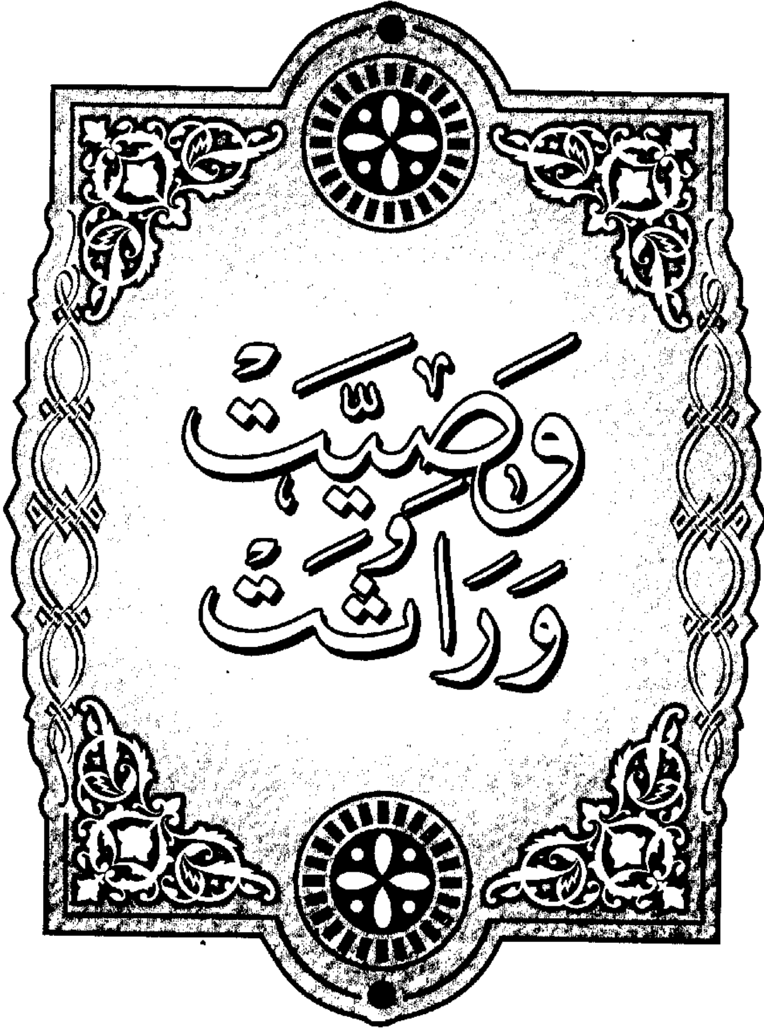
جب سود کی رقم ہماری نہیں ہے تو ہمیں اس کی فکر نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا مصرف کیا ہونا چاہیے، بینک کا عملہ ملی بھگت کر کے اسے ہڑپ نہیں کر سکے گا۔ یہ ایک مفروضہ ہے، یہ رقم کسی عرصہ تک اس کے اکاؤنٹ میں پڑی رہے گی پھر رفتہ رفتہ سروس چارج جیسے چور دروازہ سے نکلنا شروع ہو جائے گی۔ صورت مسؤلہ میں ہم اس قسم کی غلاظت وصول کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے کیونکہ:

① کوئی آدمی ان دنوں ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوسکتا کہ اسے مردار اور خنزیر کھانے تک نوبت آجائے۔

② جو آدمی دو لاکھ کا مالک ہے۔اسے چاہیے کہ اپنے دوسرے بھائی کو گندگی کھلانے کے بجائے وہ اپنی حلال پاکیزہ کمائی سے اس کا تعاون کرے یا کم از کم دو لاکھ سے پانچ ہزار زکوٰۃ ہی اسے دے دے۔

③ ہماری جماعت ابھی تک ایسی خود غرضی کی شکار نہیں ہوئی کہ اس میں ایسے اہل خیر کا فقدان ہو جو آڑے وقت کسی کے کام نہ آسکتے ہوں،اس طرح کا مجبور انسان راقم الحروف سے رابطہ کرے اللہ کی توفیق سے ہم اسے اس قسم کی گندگی کے پاس نہیں جانے دیں گے۔ان شاء اللہ۔




وصیت و وراثت

وصیت و وراثت

سوال ہمارا ایک عزیز فوت ہوگیا ہے پسماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹیاں اور ایک پوتا ہے اس نے وصیت کی ہے کہ میری جائیداد میں سے 1/8 بیوہ کو اور باقی 7/8 میں سے نصف میری دونوں بیٹیوں کو اور نصف میرے پوتے کو دیا جائے اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا ایسا کرنا جائز ہے؟ اگر یہ وصیت جائز نہیں ہے تو صحیح تقسیم کیسے ہوگی؟ (سائل: بشیر احمد مجاہد، ملتانی)

جواب واضح ہو کہ وصیت کے ذریعہ جو تقسیم کی گئی ہے وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے۔ شرعی تقسیم حسب ذیل ہے: بیوہ کو اولاد کی موجودگی میں 1/8 دیا جائے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کی اولاد ہو تو ان (بیویوں) کا آٹھواں حصہ ہے۔''

[۴/النسآء:۱۲]

بیٹیوں کو 2/3 ملتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کی صرف لڑکیاں ہوں تو (دو یا) دو سے زیادہ کو 2/3 دیا جائے۔

[۴/النسآء:۱۱]

پوتا عصبہ ہے جو مقررہ حصہ پانے والوں سے بچا ہوا ترکہ لیتا ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے: ''مقررہ حصہ داروں کو حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے قریب تر رشتہ دار کے لیے ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الفرائض]

سوال میانوالی سے ضیاء الرحمٰن سوال کرتے ہیں کہ آپ نے شمارہ نمبر 16 میں ایک حدیث بایں الفاظ نقل کی ہے۔ ''جو کسی کی وراثت کو ختم کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہے، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت کو ختم کردیں گے۔''

[شعب الایمان:۱۴/۱۱۵]

اس کی سند کے متعلق مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ از حد کمزور ہے، اس میں دو راوی ضعیف ہیں اور ایک کذاب ہے، سوید بن سعید اور زید عجمی دونوں ضعیف ہیں اور عبد الرحیم بن زید کذاب ہے۔'' آپ اس بات کی وضاحت کریں کہ آپ نے اس ضعیف حدیث کو دلیل کیونکر بنایا ہے؟

نیز میری بڑی ہمشیرہ جس نے شادی نہیں کی بلکہ اپنی عمر والدین کی خدمت میں گزار دی ہے، والد کی زمین کا تمام حساب اس کے پاس رہتا تھا، والد مرحوم کی وفات کے بعد زمین کی پیداوار سے حاصل شدہ رقم کے حساب میں ٹال مٹول کرتی ہیں، اس کا کہنا کہ کچھ رقم خرچ ہو چکی ہے اور بقیہ والد مرحوم میرے نام کر گئے ہیں۔ لیکن کوئی تحریری ثبوت یا گواہ نہیں ہے، کیا اس کا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟

جواب توجہ دلانے پر آپ کا شکر گزار ہوں، تاہم قارئین اہل حدیث اس حیثیت سے مطمئن رہیں کہ ضعیف حدیث کے متعلق ہمارے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں ہے، مولانا اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے جس سند کے متعلق گفتگو فرمائی ہے وہ ابن ماجہ میں مروی حدیث سے متعلق ہے۔ جبکہ ہمارا استدلال ابن ماجہ کی حدیث نہیں اور نہ ہی ہم نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ بلکہ ہمارے موقف کی بنیاد شعب الایمان کی حدیث ہے جس کا فتویٰ میں حوالہ دیا گیا تھا، اس روایت میں کوئی مجروح راوی نہیں، اس سند کے راوی

حسب ذیل ہیں: ابو بکر محمد بن الحسین القطان، احمد بن یوسف السلمی، سلم بن سلیمان، خزرج بن عثمان، ابوایوب، مولیٰ عثمان بن عفان، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم۔

واضح رہے کہ ابن ماجہ میں مروی حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں جسے بطور استشہاد تو پیش کیا جاسکتا ہے، لیکن وہ استدلال کے قابل نہیں ہے۔ اسی طرح ایک روایت علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف ابن ابی شیبہ اور سعید بن منصور کے حوالہ سے بھی نقل کی ہے۔ جس کے راوی سلیمان بن موسیٰ ہیں۔ [درمنثور:۲/۱۲۸]

لیکن یہ مرسل ہے، جو محدثین کے ہاں قابلِ حجت نہیں ہے، بہر حال شعب الایمان کے حوالہ سے پیش کردہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پر کوئی کلام نہیں ہے اور محدثین کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری اترتی ہے۔ اس سوال کے دوسرے جز کے متعلق عرض ہے کہ والد اپنے معذور بچے یا کسی کو خدمت گزاری کے صلہ میں کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی والد کی وفات کے بعد دعویٰ کرتا ہے کہ مجھے والد نے یہ دیا تھا تو اس کے لیے گواہ یا تحریر کی ضرورت ہے۔ جبکہ مدعیہ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، اس بنا پر ہم اسے نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا کا مال ومتاع دنیا میں رہ جائے گا، اس کی خاطر اپنی آخرت کو برباد نہ کیا جائے۔ حقوق العباد کا معاملہ بڑی نزاکت کا حامل ہے، اس کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

سوال ایک شخص فوت ہوگیا، اس کے ورثاء میں سے ایک بیٹا اور چھ بیٹیاں ہیں، بعض رشتہ دار صرف لڑکے کو ہی اس کی وراثت کا حقدار سمجھتے ہیں اور متروکہ جائیداد لڑکے کے نام منتقل کرانا چاہتے ہیں کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے۔ السائل: مسعود الرحمٰن جانباز، مانسہرہ۔

جواب کسی وارث کو محروم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اگر کوئی مانع ہو تو الگ بات ہے، تقسیم جائیداد کا طریق کار خود اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے اس میں کسی طرح بھی ترمیم یا اضافہ نہیں ہوسکتا، وراثت سے محرومی کے اسباب قتل یا ارتداد وغیرہ ہیں جو صورت مسئولہ میں نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا جائیداد سے کسی کو بلاوجہ محروم نہیں کیا جاسکتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"آدمیوں کے لیے حصہ ہے جو چھوڑا ہے والدین اور رشتہ داروں نے اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے جو چھوڑا ہے والدین اور رشتہ داروں نے، جائیداد تھوڑی ہو یا زیادہ۔"

اس آیت کے پیش نظر کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی وارث کو بلاوجہ جائیداد سے محروم کرے۔ اس کی تقسیم یوں ہوگی کہ مرنے والے کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو اصحاب الفروض (اگر ہیں) کو دینے کے بعد آٹھ حصوں میں تقسیم کیا جائے دو حصے لڑکے کو اور ایک ایک حصہ چھ لڑکیوں کو دیا جائے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ [۴/النسآء:۱۱]

"اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولادوں کے متعلق حکم دیتے ہیں کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے۔"

لہٰذا کسی جائز وارث کو بلاوجہ جائیداد سے محروم نہ کیا جائے اور حقدار کو مذکورہ تقسیم کے مطابق حصے دیئے جائیں۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال علی اکبر بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ہمارے والد گرامی فوت ہو گئے ہیں۔ پسماندگان میں ہم دو بھائی، چار بہنیں اور ہماری والدہ ہیں۔ والد کی جائیداد کی منقولہ اور غیر منقولہ کیسے تقسیم ہو گی۔؟

جواب تجہیز و تکفین پر اٹھنے والے اخراجات، قرض کی ادائیگی اور وصیت کے اجراء کے بعد باقی جائیداد اس طرح تقسیم ہو گی کہ ان کی بیوی کو 1/8 حصہ دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کو آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیوی کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی 7/8 اس طرح تقسیم ہو گی کہ ہر بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے 64 حصے کر لیے جائیں، ان میں 1/8 یعنی آٹھ حصے مرحوم کی بیوی کو، پھر 14، 14 حصے فی لڑکا اور 7، 7 حصے فی لڑکی کو دیئے جائیں۔ میت (64/8) = بیوی (8)۔ بیٹا (14) بیٹا (14) بیٹی (7)۔ بیٹی (7)۔ بیٹی (7)۔ بیٹی (7) = 64

سوال لاہور سے محمد اقبال خریداری نمبر 3094 لکھتے ہیں کہ ہمارے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں جو تھوڑی سی زرعی اراضی چھوڑ گئے تھے۔ پسماندگان میں سے ہماری والدہ، ہم دو بھائی اور دو بہنیں زندہ ہیں۔ تقسیم جائیداد کیسے ہو گی نیز ہماری ایک بہن والد مرحوم کی زندگی میں فوت ہو گئی تھی۔ کیا اسے بھی ہمارے والد کی جائیداد سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

جواب قرآن کریم کی وضاحت کے مطابق صورت مسئولہ میں بیوہ کو آٹھواں حصہ اور باقی جائیداد بہن بھائی اس طرح تقسیم کریں کہ بھائی کو ایک بہن سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے 48 حصے کر لیے جائیں۔ ان میں سے آٹھواں یعنی 6 حصے مرحوم کی بیوہ کو ملیں گے اور باقی 42 حصوں میں سے ہر ایک بھائی کو 14، 14 اور ہر ایک بہن کو 7، 7 حصے دیئے جائیں۔

میت/۴۸

بیوہ	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
6	14	14	7	7

کسی کی وفات کے وقت جو شرعی ورثاء زندہ موجود ہوں انہیں ترکہ سے حصہ ملتا ہے بشرطیکہ وہاں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چونکہ مرحوم کی ایک بیٹی اس کی زندگی میں فوت ہو چکی تھی لہٰذا مرحوم کی جائیداد سے اس فوت شدہ بیٹی کو کچھ نہیں ملے گا اور نہ ہی اس کی اولاد یا اس کے داماد کا اس میں کوئی حق ہے، جائیداد میں صرف وہ ورثاء شریک ہوتے ہیں جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں۔

سوال چیچہ وطنی سے محمد غفران لکھتے ہیں کہ ایک عورت فوت ہوئی ہے پسماندگان میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں موجود ہیں، اس عورت نے کچھ رقم اپنے داماد کے پاس رکھی تھی، اب ایک لڑکا اور دو لڑکیاں رضامند ہیں کہ اس رقم کو کسی مسجد یا مدرسہ میں صرف کر دیا جائے جبکہ دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کو اس رقم کا علم نہیں ہے، اس رقم کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ نیز ایک لڑکے کے پاس اس سے بھی زیادہ باپ کی رقم موجود ہے اور باپ فوت ہو چکا ہے لڑکا باپ کی رقم کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں، مذکورہ وارثوں کے علاوہ ایک پدری

بھائی بھی موجود ہے، اس رقم کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب واضح رہے کہ مرنے کے بعد انسان جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑتا ہے اس کے حقدار شرعی ورثاء ہوتے ہیں، کسی دوسرے کو اس میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے اگر شرعی ورثاء برضا و رغبت میت کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنے پر آمادہ ہوں تو اسے خیراتی کاموں پر خرچ کیا جاسکتا ہے، ان کی مرضی کے بغیر میت کی متروکہ جائیداد کو کسی اور مقام پر خرچ نہیں کیا جاسکتا، صورت مسئولہ میں جو رقم داماد کے پاس پڑی ہے اس کے آٹھ حصے کر لیے جائیں دو حصے فی لڑکا اور ایک حصہ فی لڑکی کے حساب سے اسے تقسیم کر دیا جائے، داماد کو چاہیے کہ جن ورثاء کو اس رقم کا علم نہیں ہے انہیں اس کی اطلاع دے بلکہ ان کا حق ان کے حوالہ کر دے اگر وہ اپنی مرضی سے صدقہ وخیرات کرنا چاہیں تو ایسا کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی مرضی کے بغیر تمام رقم صدقہ کرنا درست نہیں ہے صرف ایک لڑکے اور لڑکی کا حصہ صدقہ کیا جائے جو اس کے صدقہ کرنے پر راضی ہیں، باقی رقم ورثاء کو واپس کر دی جائے۔ سوال کی دوسری صورت کہ لڑکے کے پاس بھی باپ کی رقم موجود ہے اور اس کا پدری بھائی بھی زندہ ہے اس میں پدری بھائی بھی شریک ہے لہٰذا باپ کی رقم کے دس حصے کر لیے جائیں دو دو حصے تینوں لڑکوں کو اور ایک، ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے، جس لڑکے کے پاس باپ کی رقم موجود ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنا حصہ رکھ کر باقی رقم دوسرے بہن بھائیوں کے حوالے کر دے ساری رقم پر قبضہ جمائے رکھنا حرام اور ناجائز ہے حقوق العباد کے معاملہ میں انسان کو خاص احتیاط کرنا چاہیے۔

سوال بدوملہی سے بشیر احمد سوال کرتے ہیں کہ ایک آدمی کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے میاں بیوی خود بھی حیات ہیں، شرعی اعتبار سے جائیداد کی تقسیم کیسے ہوگی؟

جواب سوال میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ کس جائیداد کو تقسیم کرنا ہے پھر زندگی میں یا مرنے کے بعد جائیداد تقسیم کرنے کا مسئلہ درپیش ہے قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ وراثت کے سوالات خوب واضح کر کے لکھا کریں، زندگی میں انسان اپنی جائیداد کے متعلق خود مختار رہے، اپنی ضروریات کے لیے جتنی جائیداد چاہے صرف کر دے اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی البتہ اپنی اولاد میں تقسیم کرنے کے لیے مساوات کو پیش نظر رکھنا ہوگا، اس مساوات میں مرد و زن کی بھی تفریق نہیں ہے یعنی لڑکوں اور لڑکیوں میں برابر، برابر تقسیم ہوگی، صورت مسئولہ میں بیوی کو صوابدیدی حصہ دے کر باقی جائیداد کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، تین لڑکوں اور ایک لڑکی کو ایک ایک حصہ دے دیا جائے، اگر بعد از موت تقسیم جائیداد کا مسئلہ ہے تو اسکی دو صورتیں ہیں۔

① باپ کی وفات کے وقت اگر مذکورہ اولاد زندہ ہو تو ان میں جائیداد کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ بیوی کا آٹھواں حصہ نکالنے کے بعد بقیہ سات حصے اولاد میں یوں تقسیم کر دیئے جائیں کہ لڑکے کو دو دو حصے اور لڑکی کو ایک حصہ دیا جائے، یعنی کل جائیداد کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر لیا جائے ایک حصہ بیوہ کے لیے، دو دو حصے فی لڑکا، ایک حصہ لڑکی کو دے دیا جائے۔

② ماں کی وفات کے وقت اگر مذکورہ اولاد زندہ ہو تو جائیداد تقسیم اس طرح ہوگی خاوند کا چوتھا حصہ نکالنے کے بعد باقی تین حصے اولاد میں اس طرح تقسیم کر دیئے جائیں کہ لڑکے کو لڑکی کے حصہ سے دوگنا ملے، صورت مسئولہ میں سہولت کے پیش نظر جائیداد کے کل 28 حصے کر لیے جائیں ان کا 1/4 یعنی سات حصے خاوند کو پھر چھ چھ حصے ہر لڑکے کو اور تین حصے لڑکی کو دیئے جائیں۔

پہلی تقسیم:۔ 8/ بیوہ(1) لڑکا(2) لڑکا(2) لڑکا(2) لڑکی(1) = 8

دوسری تقسیم:۔28/ خاوند(7) لڑکا(6) لڑکا(6) لڑکا(6) لڑکی(3) =28

هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

سوال لاہور سے چوہدری محمد اقبال خریداری نمبر 3094 لکھتے ہیں کہ ہمارے والدِ محترم اکتوبر 1993ء میں وفات پا چکے تھے اور ان کے چار بچے یعنی دو بیٹے اور دو بیٹیاں بقید حیات ہیں، جبکہ ایک بیٹی ان کی وفات سے پہلے 1973ء میں فوت ہو چکی تھی، ان کی اولاد میں سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں شادی شدہ موجود ہیں کیا مرحوم کے ترکہ سے فوت شدہ بہن یا اس کی موجود اولاد کو کچھ حصہ ملے گا یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب وراثت کا ایک ضابطہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور والا رشتہ دار محروم ہوتا ہے۔ مثلاً بیٹے کی موجودگی میں پوتا یا بیٹی کی موجودگی میں نواسہ یا نواسی محروم ہوگی۔ صورت مسئولہ میں مرحوم کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہی وارث ہوں گی۔ ان کی موجودگی میں والد کی وفات سے پہلے فوت ہونے والی بیٹی یا اس کی موجودہ اولاد وارث نہیں ہوگی، ہاں مرحوم وصیت کے ذریعے اپنے نواسے یا نواسیوں کو دے سکتا تھا اور وہ بھی کل جائیداد سے 1/3 تک جائز ہے، اس کے علاوہ کسی صورت میں مرحوم کی جائیداد سے انہیں حصہ نہیں مل سکتا۔ مرحوم کی اولاد اگر چاہے تو انہیں کچھ دے سکتی ہے، یہ ان کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے، واضح رہے کہ موجودہ پسماندگان اس طرح جائیداد تقسیم کریں کہ لڑکے کو لڑکی سے دو گنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر جائیداد کے کل چھ حصے کر لیے جائیں، دو دو حصے فی لڑکا اور ایک ایک فی لڑکی تقسیم کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''پوتے کو وراثت اس وقت ملتی ہے جب بیٹا موجود نہ ہو'' پھر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ پوتا بیٹے کی موجودگی میں وارث نہیں ہوتا۔

[صحیح بخاری: کتاب الفرائض]

اسی طرح بیٹوں اور بیٹیوں کی موجودگی میں کسی بھی بیٹی کی اولاد محروم ہوتی ہے۔ خواہ وہ بیٹی زندہ ہو یا مرحوم سے پہلے فوت ہو چکی ہو۔ لہٰذا نواسیاں نواسے اپنے نانا کی جائیداد کے کسی صورت میں حقدار نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال چیچہ وطنی سے قاری محمد اکرم ربانی دریافت کرتے ہیں کہ ایک آدمی فوت ہوا پسماندگان میں سے بیوہ، دو لڑکے اور تین لڑکیاں موجود ہیں مرحوم کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی۔

جواب کفن ودفن اور قرضہ ووصیت کی رقم منہا کر کے جو باقی بچے خواہ جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ ہو مندرجہ ذیل طریقہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

''بیوہ کو آٹھواں حصہ دیا جائے گا کیونکہ مرحوم کی اولاد موجود ہے اور باقی سات حصے، بہن بھائی بایں طور پر تقسیم کریں کہ بھائی کو بہن سے دو گنا ملے صورت مسئلہ یوں ہوگی کہ کل جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں ایک حصہ بیوہ کو دے دیا جائے اور باقی سات حصوں میں سے دو، دو دونوں بیٹوں کو اور ایک، ایک تینوں بیٹیوں کو دے دیا جائے۔''

سوال میاں چنوں سے عبد المنان لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک آدمی فوت ہوا پسماندگان میں دو بیوہ، چھ لڑکے اور سات

لڑکیاں موجود ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے ایک بیٹے کے نام کچھ جائیداد لگوادی جبکہ کچھ بیٹے اس کی زندگی میں برسر روزگار تھے۔ انہیں کچھ نہیں دیا، باضابطہ طور پر انہیں الگ نہیں کیا گیا تھا، برسر روزگار بیٹوں نے کچھ جائیداد ذاتی طور پر بنائی ہے ان حالات کے پیش نظر چند ایک سوالات کے جواب مطلوب ہیں۔

☆ مرحوم کی دونوں بیویوں اور اولاد کے اس کے ترکہ سے کیا حصص ہوں گے؟

☆ کیا باپ کو اپنی زندگی میں کسی بیٹے کو کچھ دینے کا اختیار ہے اگر ہے تو اسکا ضابطہ کیا ہے؟

☆ کیا باپ اپنے کسی نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے عاق کر سکتا ہے؟

☆ کیا باپ کے فیصلے کو اس کے مرنے کے بعد کالعدم کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

☆ اگر باپ کی زندگی میں اس کے بچے کاروبار کرتے ہیں تو ان کی کمائی سے حاصل شدہ جائیداد کی کیا حیثیت ہوگی، کیا اسے باپ کے ترکہ میں شمار کیا جائے گا یا اسے اس کے ترکہ سے الگ رکھا جائے گا۔ کتاب وسنت کی روشنی میں ان کا جواب مطلوب ہے۔

جواب مندرجہ بالا سوالات کے جوابات بالترتیب حسب ذیل ہیں۔

☆ دونوں بیویوں کو اس کی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے آٹھواں حصہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اگر اولاد ہو تو بیویوں کے لیے اس کے ترکہ سے 1/8 ہے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیویوں کو حصہ دے کر جو باقی بچے اسے اولاد میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ملے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اللہ تعالیٰ اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہوگا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

سہولت کے پیش نظر مرحوم کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے 152 حصے کر لیے جائیں، ان میں سے 152 کا 1/8 یعنی 19 حصے دونوں بیویوں میں تقسیم کر دیئے جائیں اور باقی 133 حصے اس طرح تقسیم ہوں گے کہ 14، 14 حصے فی لڑکا اور 7، 7 حصے فی لڑکی کو دیئے جائیں، یعنی ایک لڑکے کو ایک لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے۔

دونوں بیویوں کے حصے: 19

چھ لڑکوں کے حصے 14x6: 84

سات لڑکیوں کے حصے 7x7: 49

میزان: 152 کل جائیداد

☆ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خود مختار بنا کر بھیجا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اللہ کی نعمتوں کو جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ مال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے اس میں بھی تصرف کرنے کا اسے پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''کہ ہر مالک اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ وہ اس حق کو جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔'' [بیہقی: ج۶، ص۱۷۸]

اس تصرف کا ضابطہ یہ ہے کہ:

① یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے نہ ہو۔
② جائز تصرف کرتے وقت کسی شرعی وارث کو محروم کرنا مقصود نہ ہو۔
③ اگر یہ تصرف بطور ھبہ ہے تو نرینہ اور مادینہ اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک پر مبنی ہو۔
④ اگر یہ تصرف بطور وصیت عمل میں آئے تو کسی صورت میں 1/3 سے زیادہ نہ ہو اور نہ ہی کسی شرعی وارث کے لیے وصیت کی گئی ہو۔

صورت مسئولہ میں باپ کو چاہیے تھا کہ جائیداد دیتے وقت تمام اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کو برابر برابر جائیداد دیتا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کو اس کے والد نے ایک غلام بطور عطیہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر گواہ بنانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ کیا تو نے دوسرے بیٹوں کو بھی اس قدر عطیات دیے ہیں۔'' اس نے عرض کیا نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس عطیہ سے رجوع کر لو اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اولاد میں عدل و انصاف کیا کرو۔'' [صحیح بخاری: کتاب الھبہ' ۲۵۸۶]

ایک روایت میں ہے ''کہ اگر میں عطیہ کے سلسلہ میں برتری دینا چاہتا تو عورتوں کو برتری دیتا۔'' [بیہقی: ج۶' ص۱۷۷]

اس لیے ان احادیث کے پیش نظر باپ کا یہ اقدام غلط ہے کہ وہ کسی ایک بیٹے کے نام جائیداد لگوا دے اور دوسروں کو اس سے محروم کر دے۔

☆ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ قانون وراثت کو پامال کرتے ہوئے کسی نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کر دے، اخبارات میں ''عاق نامہ'' کے اشتہارات اللہ تعالیٰ کے ضابطہ وراثت کے خلاف کھلی بغاوت ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو خواہ وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ لیکن اس میں یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔''

[۴/النسآء: ۷]

اس آیت کے پیش نظر کسی وارث کو بلا وجہ شرعی وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: ''کہ جو کسی کی وراثت ختم کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت ختم کر دیں گے۔'' [شعب الایمان بیہقی: ج۱۴' ص۱۱۵]

اگر بیٹا نافرمان ہے تو وہ اس نافرمانی کی سزا قیامت کے دن اللہ کے ہاں ضرور پائے گا لیکن والد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے جائیداد سے محروم کر دے۔ ایسا کرنے سے انسان کی عاقبت کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

☆ اگر باپ نے اپنی زندگی میں کوئی غلط فیصلہ کیا ہے تو اسے مرنے کے بعد توڑا جا سکتا ہے بلکہ اسے کالعدم کر کے اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، یہ کوئی پختہ لکیر نہیں جسے مٹانا کبیرہ گناہ ہو ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ رکھتا ہو اگر وہ آپس میں ان کی اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' [۲/البقرۃ: ۱۸۲]

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے غلط فیصلوں کی ان کے مرنے کے بعد اصلاح فرمائی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ کی کل جائیداد چھ غلام تھے۔ اس نے وصیت کے ذریعے ان سب کو آزاد کر دیا، اس کے مرنے

اور کفن و دفن کے بعد اس کے شرعی ورثاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حقیقت حال سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ نے مرنے والے کو سخت برا بھلا کہا پھر اس کی وصیت کو کالعدم کرتے ہوئے ان چھ غلاموں کے متعلق قرعہ اندازی کی جنہیں بذریعہ وصیت آزاد کر دیا تھا۔ 6 کا 1/3 یعنی دو غلام آزاد کر دیئے اور باقی چار ورثاء کے حوالے کر کے ان کے نقصان کی تلافی کر دی۔

[صحیح مسلم: الایمان' ۱۶۶۸]

دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے متعلق فرمایا: ''کہ اگر ہمیں اس کی حرکت کا پہلے علم ہو جاتا تو ہم اس کی نماز جنازہ ہی نہ پڑھتے۔'' [مسند امام احمد: ج۴' ص۴۴۳]

بلکہ ایک روایت میں ہے: ''کہ ہم اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرتے۔'' [ابوداؤد: العتق' ۳۹۵۸]

ان احادیث کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ باپ نے اگر زندگی میں حقوق العباد کے سلسلہ میں کوئی غلط اقدام کیا تھا تو مرنے کے بعد کالعدم کیا جا سکتا ہے اور اس میں مناسب ترمیم کر کے کتاب و سنت کے مطابق کرنا ضروری ہے مرحوم کے ساتھ ہمدردی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اس کے غلط اقدام کو برقرار رکھ کر اس کے بوجھ کو زیادہ وزنی نہ بنائیں بلکہ اس کی اصلاح کر کے اس کی عاقبت سنوارنے کی فکر کی جائے۔

☆ اولاد کی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ ہے کہ وہ باپ کے ساتھ ہی کاروبار میں شریک ہوتی اور اس کے ساتھ ہی ایام زندگی گزارتی ہے اس صورت میں باپ کے پاس رہنے والی اولاد کی کمائی باپ کی ہی شمار ہوتی ہے کیونکہ حدیث میں ہے: ''کہ تو اور تیرا مال سب تیرے باپ کے لیے ہے۔'' [سنن النسائی]

ایسے حالات میں کسی بیٹے کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ چالو کاروبار سے کچھ رقم قبضہ میں کر کے اپنی الگ جائیداد بنالے، اگر ایسا کیا گیا ہے تو ایسی جائیداد کو باپ کی جائیداد سمجھتے ہوئے اس کے ترکہ میں شمار کرنا ہوگا۔ ہاں اگر اولاد کا حق ملکیت تسلیم کر لیا جائے تو اولاد میں سے کسی کو الگ جائیداد بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے یا کوئی ملازمت پیشہ بیٹا اپنے باپ سے کہہ دے کہ میری اس رقم سے آپ نے میرے لیے کوئی پلاٹ یا مکان خریدنا ہے، ایسے حالات میں اس کی خریدی ہوئی جائیداد کو بیٹے کی جائیداد سمجھا جائے گا۔ اسے باپ کے ترکہ میں شامل نہ کیا جائے گا اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر کسی بیٹے نے قرض وغیرہ لے کر پراپرٹی خریدی ہے یا مکان بنایا ہے تو مکان یا پلاٹ کو باپ کے ترکہ میں شامل کرتے وقت اس قرضہ کو مشترکہ جائیداد سے منہا کرنا ہوگا۔

اولاد کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ کوئی بیٹا شادی شدہ ہے باپ نے باضابطہ طور پر اسے الگ کر دیا ہے، اب وہ خود محنت کرتا ہے اور اپنے گھر کا نظام بھی خود چلاتا ہے، باپ کے ذمے اس کا کوئی بوجھ نہیں ہے ایسی صورت میں اگر وہ بیٹا کوئی مکان یا پلاٹ یا جائیداد بناتا ہے تو اسے باپ کے ترکہ میں شمار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کا الگ حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا ہے، ایسے حالات میں باپ اس کے لین دین کا بھی ذمہ دار نہیں ہے۔

آخر میں ہم اس بات کی وضاحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ حقوق العباد کا معاملہ بہت ہی نازک ہے۔ قیامت کے دن اس کی معافی نہیں ہوگی۔ اپنی نیکیاں دے کر اور دوسروں کی برائیاں اپنے کھاتے میں ڈال کر اس کی تلافی کی جائے گی ارشاد باری

تعالیٰ ہے۔ ''ہم قیامت کے دن انصاف پر مبنی ترازو قائم کریں گے اس بنا پر کسی کی کچھ بھی حق تلفی نہ ہوگی اور اگر کسی کا رائی کے دانے کے برابر بھی ظلم ہوا تو وہ بھی سامنے لایا جائے گا اور حساب لینے کے لیے ہم کافی ہیں۔'' [۲۱/الانبیآء:۴۷]

یہ دنیا کا مال و متاع دنیا میں رہ جائے گا، اس کی خاطر اپنی آخرت کو برباد نہ کیا جائے۔ هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

سوال محمد مصطفیٰ بذریعہ ای میل لکھتے ہیں کہ ایک آدمی کے دولڑکے اور دولڑکیاں ہیں، اس نے اپنی ایک لڑکی کے نام اپنی 88 ایکڑ زمین میں سے 10 ایکڑ زمین الاٹ کردی، اس کے بعد اس لڑکی نے اپنی اور اپنے لڑکے کی رضامندی سے باپ سے ملنے والی زمین اپنے پوتے کے نام منتقل کردی، اب لڑکی کا بھتیجا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ زمین واپس لی جائے اور جس کے نام زمین باہمی رضامندی سے الاٹ کی گئی تھی وہ واپس نہیں کرتا، قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا کیا حل ہے؟

جواب جو زمین لڑکی کو اپنے والد کی طرف سے ملی ہے وہ اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرسکتی ہے، کیونکہ وہ اب اس کی ملکیت ہے۔ اگر اس نے اپنے قریبی وارث بیٹے کی موجودگی میں اس کی رضامندی سے اپنے پوتے کے نام منتقل کردی ہے تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ ہبہ کی ایک صورت ہے، اب بھائی کے لڑکے یعنی بھتیجے کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے، جب ہبہ برضا ورغبت بلا جبر و اکراہ ہوا ہو تو اسے واپس نہیں لیا جاسکتا۔ حدیث میں ہے: ''کہ جو ہبہ دے کر واپسی کا مطالبہ کرتا ہے وہ کتے کی طرح جو قے کرنے کے بعد اسے چاٹتا ہے۔'' [سنن ابی داؤد: البیوع، ۳۵۴۰]

لہٰذا اس کا حل یہی ہے پوتے کے نام الاٹ شدہ زمین واپس نہ لی جائے اور کسی دوسرے کو اس عطیہ پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ اچھے اور خوشگوار ماحول میں سرانجام پایا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فیصل آباد سے محمد رمضان لکھتے ہیں کہ ایک عورت فوت ہوئی اس نے اپنی زندگی میں تمام جائیداد اپنی بیٹی عزیزہ کو دے دی تھی جبکہ اس کی بیٹی کے علاوہ اس کے پدری بہن بھائی اور حقیقی بھائی کی اولاد بھی موجود تھی، کیا شریعت کی رو سے ایسا کیا جاسکتا ہے؟

جواب واضح رہے کہ ہر انسان جائز طور پر اپنی جائیداد میں تصرف کرنے کا حقدار ہے، صورت مسئولہ میں اگر والدہ نے اپنی صحت و سلامتی کی حالت میں اپنی جائیداد دی تھی تو یہ ہبہ کی صورت ہے اور ایسا کرنے کا اسے شرعاً حق ہے، اگر اس نے دیگر ورثاء کو محروم کرنے کے لیے یہ اقدام کیا ہے تو وہ اس جرم میں اللہ کے ہاں جواب دہ ہے، اگر لڑکی اپنی والدہ کی آخرت میں رہائی چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ جن ورثاء کو محروم کیا گیا ہے انہیں ان کا حق واپس کردے اس صورت میں لڑکی کا نصف اور باقی جائیداد کے پدری بہن بھائی وارث ہیں۔ ان کی موجودگی میں حقیقی بھائی کی اولاد محروم ہوگی۔ معاملہ حقوق العباد کا ہے اس لیے بیٹی کو چاہیے کہ وہ اپنے حق پر اکتفا کرے، دوسروں کے حق پر قبضہ جمائے رکھنا زیادتی ہے، جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

سوال سیالکوٹ سے محمد اکرم سوال کرتے ہیں کہ ہماری ایک عزیزہ فوت ہوچکی ہے۔ اس کے ورثاء میں سے خاوند، تین بیٹیاں اور اس کے چچا کی نرینہ اولاد موجود ہے، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی۔

جواب قرآنی ضابطہ وراثت کے مطابق خاوند کو 1/4 کیونکہ مرحومہ کی اولاد موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اگر بیویوں کی اولاد ہو تو تمہیں ان کے ترکہ سے چوتھا حصہ ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۲]

تین بیٹیوں کو کل جائیداد کا 2/3 حصہ ملے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو انہیں ترکہ کا دو تہائی حصہ ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

ان حقداروں کا حصہ دینے کے بعد اگر کچھ بچے تو چچا کی نرینہ اولاد کو دے دیا جائے۔حدیث میں ہے: ''مقررہ حصہ لینے والوں کو ان کا حق دے دیا جائے اگر ان سے کچھ باقی رہے تو وہ میت کے قریبی تر رشتہ داروں کا ہے۔'' [صحیح بخاری]

سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے 36 حصے کر لیے جائیں۔ان میں سے 9 حصے خاوند کو 8,8 حصے تینوں بیٹیوں کو اور تین حصے چچا کی نرینہ اولاد کو دے دیئے جائیں۔صورت مسئولہ یوں ہوگی۔

میت/36= خاوند 9 ...... بیٹی 8 ...... بیٹی 8 ...... بیٹی 8 ...... چچا کی نرینہ اولاد 3۔

سوال وزیر آباد سے محمد علی دریافت کرتے ہیں کہ ایک شخص کی بیوی، تین لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں، اس نے اپنی زندگی میں دو لڑکوں اور بیوی کو اپنی جائیداد کا وارث ٹھہرا دیا اور باقی ورثاء کو محروم رکھا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا اس شخص کے مرنے کے بعد محروم ورثاء اپنا حصہ طلب کر سکتے ہیں یا اس کے محروم کرنے سے وہ محروم ہی رہیں گے۔نیز مندرجہ بالا ورثاء کے درمیان جائیداد کی شرعی تقسیم کیا ہوگی۔؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ورثاء میں جائیداد تقسیم کرنے کے متعلق ایک تفصیلی ضابطہ بیان فرمایا ہے، جس میں کسی کو ترمیم و اضافہ کرنے کی اجازت نہیں ہے کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے جسے چاہے وارث بنا دے اور جسے چاہے محروم ٹھہرا دے، رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے متعلق فرمایا ہے: ''جو شخص اپنے وارث کو وراثت سے محروم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن جنت کی وراثت سے محروم کر دیں گے۔'' [ابن ماجہ: کتاب الوصایا]

مذکورہ شخص نے اپنی زندگی میں تقسیم جائیداد کا جو طریق کار اپنایا ہے وہ بالکل غلط اور خلاف شرع ہے اس کے محروم کر دینے سے کوئی شرعی وارث محروم نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ مذکورہ بالا وعید کا سزاوار ہوگا۔اس بنا پر جن ورثاء کو محروم ٹھہرایا گیا ہے وہ باقاعدہ اس کی جائیداد کے حق دار ہیں، بشرطیکہ اس کی موت کے وقت وہ زندہ موجود ہوں اور انہیں اپنی وراثت کے مطالبے کا پورا پورا حق ہے، ورثاء کے حصص بایں طور ہوں گے کہ بیوی کو کل جائیداد کا 1/8 دینے کے بعد باقی جائیداد کے حقدار اس کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔وہ آپس میں باقی 7/8 جائیداد اس طرح تقسیم کریں کہ ایک لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دو گنا حصہ ملے۔سہولت کے پیش نظر اس کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کے 88 حصے کر لیے جائیں۔جن میں 1/8 یعنی گیارہ حصے بیوی کو دے دیئے جائیں اور باقی 77 حصے اولاد میں 2:1 کی نسبت سے تقسیم کر دیئے جائیں۔ایک لڑکے کو 14 حصے اور لڑکی کو 7 حصے دیئے جائیں۔اس طرح لڑکوں کے کل حصص 42 اور لڑکیوں کے 35 حصے ہوں گے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال منکیرہ سے پروفیسر سعید مجتبیٰ سعیدی لکھتے ہیں کہ ایک شخص فوت ہو گیا پسماندگان میں سے صرف دو بھتیجے اور ایک بھتیجی بقید حیات (یہ آپس میں حقیقی بہن بھائی ہیں) مرحوم کی جائیداد تینوں میں تقسیم ہوگی یا صرف بھتیجے حق دار ہوں گے۔

جواب واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں مرحوم کی جائیداد کے حقدار صرف بھتیجے ہوں گے۔بھتیجی کو کچھ نہیں ملے گا، میت کے ورثاء

میں کوئی ایسا رشتہ دار زندہ نہیں ہے جو ذوی الفروض یعنی مقررہ حصہ لینے والوں سے ہو، اس صورت میں عصبہ تمام جائیداد کے وارث ہوتے ہیں، بھتیجے اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ اپنی بہن کو عصبہ بغیرہ بنا سکیں کیونکہ اس کے لیے تین شرائط کا ہونا ضروری ہے جو حسب ذیل ہیں۔

① وہ مؤنث مقررہ حصہ لینے والی ہو ذوی الارحام سے نہ ہو جیسا کہ حقیقی پھوپھی کو حقیقی چچا عصبہ نہیں بنائے گا۔ کیونکہ پھوپھی مقررہ حصہ لینے والوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ذوی الارحام سے ہے، بیٹا، بیٹی کو اور حقیقی یا پدری بھائی اپنی بہن کو عصبہ بنائے گا کیونکہ بیٹی اور بہن مقررہ حصہ لینے والوں سے ہیں۔

② مؤنث کو عصبہ بنانے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مؤنث کے ساتھ درجہ میں مساوی ہو جیسا کہ بیٹا میت کی پوتی کو عصبہ نہیں بنائے گا بلکہ وہ بیٹے کی موجودگی میں محروم ہوگی اسی طرح حقیقی بھتیجا میت کی حقیقی بہن کو عصبہ نہیں بنائے گا کیونکہ وہ درجہ میں اس کے مساوی نہیں ہے اس صورت میں بھتیجا محروم ہوگا اور بہن کو حصہ ملے گا۔

③ مؤنث کو عصبہ بنانے والا رشتہ کی مضبوطی اور قوت میں بھی مؤنث کے برابر ہو یہی وجہ ہے کہ پدری بھائی، میت کی حقیقی بہن کو عصبہ نہیں بنائے گا کیونکہ حقیقی بہن کا رشتہ پدری بھائی کے مقابلہ میں زیادہ قوی اور مضبوط ہے۔ علمائے وراثت کا کہنا ہے کہ صرف چار رشتہ دار ہی اپنی بہنوں کو عصبہ بناتے ہیں بیٹا پوتا، حقیقی بھائی اور پدری بھائی ان کے علاوہ کوئی رشتہ داری اپنی بہنوں کو عصبہ نہیں بنا سکیں گے بلکہ علما کا یہ قول بھی بہت مشہور ہے کہ چار ورثاء اپنی بہنوں کو عصبہ نہیں بنا سکیں گے۔ چچا مطلق طور پر خواہ حقیقی ہو یا پدری، چچا زاد بھائی، حقیقی بھائی کا بیٹا اور پدری بھائی کا بیٹا، اس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ رشتہ داروں کی تمام بہنیں ذوی الارحام سے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں بھتیجے اپنی بہن کو عصبہ بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، وہ دونوں ہی اپنے چچا کی جائیداد کے حقدار ہوں گے۔ مرحوم کی بھتیجی وراثت سے محروم ہوگی۔ [واللہ اعلم]

سوال بھکر سے پروفیسر محمد مبشر لکھتے ہیں کہ ایک عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہے اور اس کے ہاں کوئی اولاد بھی نہیں اس نے کسی لاوارث بچے کو لے کر پالا، اس عورت کا ذاتی مکان ہے جو اس نے اپنی کمائی سے خریدا تھا، وہ اس نے اپنے لاوارث لے پالک کے نام لگوا دیا ہے کیا شرعاً ایسا کرنا جائز ہے واضح رہے کہ عورت کے بھائیوں نے والد کی جائیداد میں سے اسے کوئی حصہ نہیں دیا ہے۔

جواب اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لے پالک اولاد کو اپنی حقیقی اولا کا درجہ دیا جائے کیونکہ اس مصنوعی رشتے کے رسمی تقدس پر بھروسہ کر کے جب حقیقی رشتہ داروں جیسا خلا ملا ہوتا ہے تو وہ برے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے شریعت اسلامیہ نے لے پالک کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیل کی بڑی سختی سے حوصلہ شکنی کی ہے سورت احزاب کی آیت نمبر 5,4 میں اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہے اس کے علاوہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیوی نے حضرت سالم کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے لے پالک کے متعلق ضابطہ نازل فرمایا کہ اسے حقیقی اولاد کا درجہ نہ دیا جائے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا سالم کو میں نے اپنا بیٹا بنایا ہے اب اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ تم اسے پانچ مرتبہ

دودھ پلا دو اس طرح وہ تمہارا رضاعی بیٹا بن جائے گا۔" [صحیح مسلم: کتاب الرضاع]

اس لیے بیوہ کو چاہیے کہ جب لے پالک جوان ہو جائے تو اس سے پردہ کرے باقی رہا اس کے نام اپنا ذاتی مکان لکھوا دینے کا مسئلہ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اگر اپنے بھائیوں کو محروم کرنے کی نیت سے ایسا کیا گیا ہے تو شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے: "کہ جو کوئی اپنے وارث کو اس کے شرعی حصے سے محروم کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جنت میں ملنے والے حصے سے محروم کر دیں گے۔" [بیہقی: فی شعب الایمان]

قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس بیوہ نے لے پالک کے نام اپنا ذاتی مکان اس بنا پر لکھوا دیا ہے کہ اس کے بھائیوں نے والد کی جائیداد سے اسے کوئی حصہ نہیں دیا ہے، بھائیوں کا اسے باپ کی جائیداد سے محروم کرنا اگرچہ بہت بڑا جرم ہے لیکن اس آڑ میں اسے اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ اپنے بھائیوں کو اپنی جائیداد سے محروم کر دے، کسی کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت خراب کرنا کوئی عقل مندی نہیں ہے، اس کے علاوہ حدیث میں ہے "کہ ہر مال دار اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے۔" [بیہقی: ۱۷۵/۶]

اس حدیث کے پیش نظر صورت مسئولہ میں بیوہ بحالت تندرستی اپنا مکان جسے چاہے دے سکتی ہے، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ جائز تصرف کرتے وقت کسی شرعی وارث کو اس حق وراثت سے محروم کرنا مقصود نہ ہو۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال احمد پور سے رابعہ خاتون لکھتی ہیں کہ میری کوئی اولاد نہیں ہے صرف خاوند اور بھائی بہنیں بقید حیات ہیں میری جائیداد صرف ایک مکان ہے میں نے اپنی بھانجی کو بیٹی بنایا ہوا ہے جو میری خدمت بھی کرتی ہے کیا میری جائیداد سے اس بھانجی کا کوئی حصہ بنتا ہے، قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب بہن بھائیوں کی موجودگی میں بھانجی شرعاً حقدار نہیں ہے۔ وفات کے وقت اگر سوال میں ذکر کردہ رشتہ دار زندہ رہے تو مکان کے وارث ہوں گے، تقسیم یوں ہوگی کہ خاوند کو نصف اور باقی نصف بہن بھائی اس طرح تقسیم کریں کہ بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے۔ سوال میں بہن بھائیوں کی تعداد ظاہر نہیں کی گئی اس لیے حصوں کا تعین نہیں ہو سکتا۔ بھانجی کو وراثت کے طور پر کوئی حصہ نہیں ملے گا چونکہ وہ خدمت گار ہے اس لیے اس کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے۔ جس کا ضابطہ حسب ذیل ہے۔

① وصیت کی صورت میں 1/3 سے زائد نہ ہو بہتر ہے کہ اس سے کم حصہ کی وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے وصیت میں ایک تہائی کو بہت زیادہ قرار دیا ہے۔

② وصیت شرعی وارث کے لیے نہ کی جائے یعنی جن ورثاء کو بطور وراثت حصہ ملنا ہے ان کے لیے وصیت ناجائز ہے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا: "اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب وارث کے لیے وصیت درست نہیں۔"

③ وصیت کسی ناجائز کام کے لیے نہ ہو اگر کسی ناجائز کام کے لیے وصیت کی یا کسی جائز وارث کے لیے وصیت کر دی تو اسے نافذ العمل نہیں قرار دیا جائے گا بلکہ ایسی ناجائز وصیت کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

مذکورہ وبالا شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھانجی کے حق میں وصیت تو کی جاسکتی ہے لیکن وراثت کے طور پر اسے کچھ نہیں ملے گا۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں اور دونوں ہی صاحب اولاد ہیں۔ پہلی بیوی کے بطن سے پانچ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں جبکہ دوسری سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ دوسری بیوی عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہے۔ اب مذکورہ شخص بھی فوت ہو گیا ہے اس کی جائیداد پسماندگان میں کیسے تقسیم ہو گی۔ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔ (السائل: محمد شریف، مظفر گڑھ)

جواب واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں مرحوم کے ورثاء ایک بیوہ، چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں قرآن مجید کے بیان کردہ ضابطہ میراث کے مطابق اولاد کی موجودگی میں بیوہ کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم﴾ [۴/النسآء:۱۲]

''اگر تمہاری اولاد ہو تو ان (بیویوں) کا آٹھواں حصہ ہے اس جائیداد سے جو تم چھوڑ چکے ہو۔''

بیوہ کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے اسے اولاد میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ [۴/النسآء:۱۱]

''اللہ تمہیں اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے۔''

مذکورہ تصریحات کی روشنی میں متوفی کی جائیداد کے کل 144 حصے کیے جائیں ان میں سے 1/8 یعنی 18 حصص بیوہ کے لیے باقی 126 حصص 1:2 کی نسبت سے 14 حصص فی لڑکا اور 7 حصص فی لڑکی تقسیم کر دیئے جائیں اس طرح لڑکوں کے کل حصے 84 اور لڑکیوں کے 42 ہوں گے۔ هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.

سوال ساہیوال سے الٰہی بخش لکھتے ہیں کہ میرے بھائی نے ایک رہائشی سکیم میں بذریعہ قرعہ اندازی میرے لیے پلاٹ آلاٹ کرایا پھر اس پر اپنی گرہ سے مکان تعمیر کیا اور بارہا اپنے دیگر رشتہ داروں کے سامنے کہا کہ یہ پلاٹ اور مکان میرے بھائی کے لیے ہے۔ وفات سے چند دن قبل بھی اس بات کو دہرایا کہ میرا ترکہ بحصہ شرعی تقسیم کر لیا جائے لیکن مکان میں نے جسے دیا ہے اس کے متعلق جھگڑا نہ کرنا اب دوسرے ورثاء اس مکان سے حصہ طلب کرتے ہیں کیا ان کا شرعی حصہ مکان سے بنتا ہے یا نہیں۔

جواب واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خود مختار بنا کر بھیجا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے، مال وجائیداد بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے اس میں بھی جائز طور پر اسے تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ ہر مال دار اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے وہ جیسے چاہے استعمال کرے۔'' [بیہقی:۶/۱۷۸]

صورت مسئولہ میں مرحوم نے اپنے بھائی کے نام پلاٹ آلاٹ کرایا پھر اس پر تعمیر بھی کرائی یہ ہبہ کی ایک شکل ہے جس کا اسے شرعاً حق ہے پھر وفات سے قبل اپنے ورثاء کو اس کی تاکید بھی کر دی تاکہ وفات کے بعد کسی قسم کے جھگڑے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی کو ہبہ کرتا ہے یا اس کا وعدہ کرتا ہے لیکن عملی شکل دینے سے

پہلے وفات پا جاتا ہے تو ہبہ، موہوب لہ یعنی جس کے لیے ہبہ کیا گیا ہے اسے ملنا چاہیے۔ انہوں نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: "بَابُ اِذَا وَهَبَ اَوْ وَعَدَثُمَّ مَاتَ قَبْلَ اَنْ تَصِلَ اِلَيْهِ" اسی طرح حضرت قاضی شریح کے متعلق بھی امام بخاری نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے ورثاء کو کہا تھا "کہ میں جو اپنی بیوی فزاریہ نامی کو دے چکا ہوں اسے واپس نہ لیا جائے۔"

[صحیح بخاری: کتاب الوصایا]

صورت مسئولہ میں وصیت کی شکل نہیں بلکہ ہبہ کی صورت ہے جو متوفی نے اپنی زندگی میں بقائمی ہوش وحواس اپنے بھائی کو دیا ہے پھر قبل از موت اس کی تاکید بھی کر دی، اس لیے اسے نافذ ہونا چاہیے۔ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ورثاء کو اس کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ بطیب خاطر اسے قبول کرنا چاہیے پھر وہ انہیں جاتے وقت اس کے نفاذ کی تاکید بھی کر گیا ہے اس بنا پر اس مکان کو باہمی جھگڑے کا باعث بنانا درست نہیں ہے البتہ جو حضرات دوسرے ورثاء کو محروم کرنے کی نیت سے اپنی جائیداد زندگی میں ہی کسی ایک وارث کے نام لگوا جاتے ہیں ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں ہے اگر کوئی ایسا کر جائے تو اس کی اصلاح کرتے ہوئے شرعی ورثاء کو ان کا حق دے دینا چاہیے۔ هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب.

سوال لاہور سے عبدالمجید خاں دریافت کرتے ہیں کہ ایک شخص فوت ہوا اس کے دو نواسے اور ایک نواسی اور ایک بہو بقید حیات ہیں، مرحوم کا ترکہ قرآن وحدیث کی روشنی میں کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب میت کے قرابت داروں کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، سب سے پہلے ذوی الفروض کا درجہ ہے، ان سے مراد وہ رشتہ دار ہیں جن کا حصہ مقرر ہے، ان کے بعد عصبات ہیں، ان سے مراد میت کے وہ اقارب ہیں جو ذوی الفروض کے دینے کے بعد بقیہ ترکہ کے مستحق ہوتے ہیں اور اگر مقررہ حصہ لینے والے نہ ہوں تو وہ کل ترکہ لینے کے حق دار ہوتے ہیں۔ ذوی الفروض اور عصبات کے بعد تیسرا درجہ ذوی الارحام کا ہے ان سے مراد وہ تمام خونی رشتہ دار ہیں جو نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات، صورت مسئولہ میں دونوں نواسوں اور ایک نواسی کا تعلق اس آخری درجے ذوی الارحام سے ہے، ان کی توریث کے متعلق متقدمین علما میں اختلاف ہے، جمہور صحابہ۔ مثلاً: حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبیدہ بن الجراح، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم ذوی الارحام کی توریث کے قائل ہیں، احناف اور حنابلہ کا بھی یہی موقف ہے۔ جبکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ذوی الارحام کی میراث کے قائل نہیں ہیں، مالکیہ اور شوافع کا بھی یہی رجحان ہے، ان کے نزدیک اصحاب فرائض اور عصبات کے نہ ہونے کی صورت میں میت کا ترکہ بیت المال میں رکھا جائے گا۔ بشرطیکہ بیت المال منتظم ہو۔ اگر بیت المال کا باضابطہ نظام نہ ہو تو ذوی الفروض یا عصبات کے نہ ہونے کی صورت میں ذوی الارحام ہی حقدار ہوں گے، بہر حال انسب نقطۂ نظر یہی ہے کہ ذوی الفروض اور عصبات کے بعد ذوی الارحام ترکہ کے حقدار ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس موقف کی تائید میں متعدد اشارے ملتے ہیں۔ پھر ذوی الارحام کی توریث کے طریقہ میں بھی اختلاف ہے عام طور پر اس میں تین مذہب ہیں۔

① مذہب اہل رحم: ان کے نزدیک ترکہ پانے کا سبب اہل رحم ہونا ہے اور اس میں سب برابر ہیں اس لیے جو زندہ موجود ہوں ان کے درمیان ترکہ برابر تقسیم کر دیا جائے خواہ مرد ہو یا عورت، قریبی ہو یا دور کا رشتہ دار، یہ مذہب متروک ہے کیونکہ کتاب وسنت سے

اس کی تائید نہیں ہوتی۔

② مذہب اہل قرابت: ان کے نزدیک قرب اور بعد کا لحاظ رکھا جائے جو میت کے زیادہ قریب ہوگا وہ حقدار ہوگا۔ جیسا کہ عصبات میں ہوتا ہے۔ نیز مذکر کو مؤنث کے مقابلہ میں دوگناہ حصہ دیا جائے گا۔ احناف اسی کے قائل ہیں۔

③ اہل تنزیل: ان کے نزدیک ذوی الارحام خود وارث نہیں ہیں، بلکہ اپنے اصل وارث کی وجہ سے انہیں حصہ ملتا ہے مثلاً نواسی کو بیٹی کے قائم مقام کر کے اس کا حصہ دیا جاتا ہے، جمہور اسی کے قائل ہیں صورت مسئولہ میں نواسے اور نواسی بیٹی کی وجہ سے وارث ہیں تو گویا میت اور ذوی الارحام کے درمیان عورت کا واسطہ ہو اور عورت کا واسطہ برابری کو چاہتا ہے۔ جیسا کہ مادری بھائی بہنوں میں ہوتا ہے اس لیے ترکہ تین حصوں میں تقسیم کر کے دو حصے دونوں نواسوں کو ایک حصہ نواسی کو دیا جائے۔ بھاوج کا اس میں کوئی حصہ نہیں وہ ترکہ سے محروم ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال محمد اقبال بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ میں ایک بیٹے کو علیحدہ کرنا چاہتا ہوں لیکن وہ علیحدہ ہونے سے پہلے میری جائیداد سے اپنا شرعی حصہ مانگتا ہے میں بھی اسے حصہ دینے پر رضامند ہوں میرے وارث یہ ہیں میں خود، میری بیوی، پانچ بچے اور دو بیٹیاں، اس کے متعلق راہنمائی درکار ہے۔ واضح رہے کہ ایک بچے کی شادی کرنا اور کچھ قرضہ کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔

جواب شریعت اسلامیہ کی انتقال ملکیت کی دو صورتیں ہیں:

(الف) اختیاری۔

(ب) غیر اختیاری۔

اختیاری طور پر انتقال ملکیت اگر بلا معاوضہ ہے تو ایسا زندگی میں ہبہ اور زندگی کے بعد وصیت کی صورت میں ممکن ہے اور اگر انتقال ملکیت بالمعاوضہ ہے تو اسے بیع وغیرہ کا نام دیا جاتا ہے، انتقال ملکیت کی دوسری صورت میں جو غیر اختیاری ہے وہ ملکیت کو خود بخود مورث کی طرف سے ورثاء کی جانب منتقل کر دیتی ہے جس میں مورث کے ارادہ، نیت یا اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس قسم کے انتقال ملکیت کو ''وراثت'' کہا جاتا ہے۔ صورت مسئولہ میں ''شرعی حصہ'' لینے دینے پر اظہار رضامندی انتقال ملکیت کی یہ آخری صورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سائل کا منشا یہ ہے کہ میں اس غیر اختیاری انتقال ملکیت کو اپنے ارادہ اختیار سے اپنے ورثاء کی طرف منتقل کر دوں لیکن ایسا کرنا وراثت کے طور پر جائز نہیں ہے کیونکہ انتقال ملکیت کی اس آخری صورت میں وراثت کا استحقاق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کی موت حقیقتاً یا حکماً واقع ہو چکی ہو، اپنی زندگی میں جیتے جی کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی جائیداد کو بطور وراثت اپنے ورثاء کی طرف منتقل کرے، کیونکہ ایسا کرنے سے ورثاء پر زیادتی کا امکان باقی رہتا ہے۔ جو شرعاً جائز نہیں ہے جیسا کہ تقسیم جائیداد کے بعد اگر کوئی وارث اس کی زندگی میں فوت ہو گیا تو اسے جو حصہ دیا گیا تھا وہ اس کا وارث نہ تھا کیوں کہ وراثت میں مورث کی موت کے ساتھ ہی وارث کی حیات کا تعین بھی ضروری ہے اس بنا پر بیٹے کا والد سے اس کی زندگی میں اپنے شرعی حصہ کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے البتہ ہبہ یا عطیہ کی صورت میں ایسا ہو سکتا ہے لیکن اسے شرعی حصہ قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ یہ تو سراسر والد کی مرضی پر موقوف ہے نیز ہبہ میں دوسری اولاد خواہ نرینہ ہو یا مادینہ انہیں مساویانہ طور پر شامل کرنا ہوگا۔ وہ بیٹا اگر والد کے ساتھ

کاروبار میں شریک ہے تو علیحدگی کے وقت اس کا حصہ الگ کیا جاسکتا ہے، بطور وراثت والد کی جائیداد سے والد کی زندگی میں کسی قسم کے شرعی حصہ کا بیٹا حقدار نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال شاہدرہ سے محمد علی سوال کرتے ہیں کہ میرا ایک بھائی جس کا ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں میرے والد کی زندگی میں فوت ہوگیا، اس کے دو سال بعد ہمارے والدِ محترم بھی انتقال کر گئے۔ اب ہم دو بھائی اور چار بہنیں زندہ ہیں، ہم اپنے باپ کے ترکہ کو کیسے تقسیم کریں۔ کیا مرحوم بھائی کے بچے ہمارے باپ کی جائیداد میں شریک ہیں یا نہیں اگر ہیں تو کس قدر؟

جواب واضح رہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کے مطابق دور کے رشتے دار قریبی رشتے دار کی موجودگی میں محروم ہوتے ہیں، اس قاعدہ کی رو سے بیٹوں کی موجودگی میں پوتا محروم ہوتا ہے۔ ہاں اگر مرنے والا اپنے پوتے کے حق میں وصیت کر گیا ہو تو 1/3 کی حد تک وصیت کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ یا تمام بیٹے باہمی رضا مندی سے اسے کچھ دے سکتے ہیں۔ البتہ قانونی طور پر بیٹوں کی موجودگی میں پوتا حقدار نہیں ہوتا۔ لیکن مرحوم بھائی کی بیوی انہی کے رحم وکرم پر بیٹھی ہو تو بھائیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے یتیم بھتیجوں کو کچھ نہ کچھ ضرور دیں۔ جہاں تک جائیداد کی تقسیم کا تعلق ہے تو اس کا ضابطہ یہ ہے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگناہ حصہ دیا جائے۔ صورت مسئولہ میں کل منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے آٹھ حصے کر لیے جائیں، دو، دو حصے فی لڑکا اور ایک ایک حصہ فی لڑکی کے حساب سے جائیداد کو تقسیم کر دیا جائے اگر مرحوم بھائی کی اولاد کو باہمی رضا مندی سے کچھ دینا چاہیں تو تقسیم جائیداد سے پہلے ان کا حصہ الگ کر دیں۔ اس کے بعد جائیداد تقسیم کریں۔ تقسیم کی صورت حسب ذیل ہے:

میت:8= بیٹا 2- بیٹا 2- بیٹی 1- بیٹی 1- بیٹی 1- بیٹی 1-

سوال لاہور سے محمد اشرف لکھتے ہیں کہ ایک شخص کی وفات کے وقت اس کی بیوی، دو بیٹیاں، تین بیٹے اور ایک یتیم پوتا زندہ تھے، ایک بیٹے نے تحصیل دار کے سامنے بیان دیا کہ مرحوم کے صرف تین بیٹے اور ایک یتیم پوتا زندہ ہیں اس طرح بیوہ اور اس کی دونوں بیٹیوں کو محروم کر کے مرحوم کی جائیداد چار حصوں میں مساویانہ تقسیم ہوگئی۔ اب سوال یہ ہے کہ یتیم پوتا بیٹیوں کی موجودگی میں اپنے دادا کی وراثت لے سکتا ہے، جبکہ پوتے کا موقف یہ ہے کہ مجھے اپنے دادا کی طرف سے خیرات ملی ہے۔

جواب صورت مسئولہ میں شرعی تقسیم یہ ہے کہ بیوہ کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی جائیداد حقیقی اولاد میں اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ بیٹے کو بیٹی کے مقابلہ میں دوگناہ حصہ ملے جس کی صورت یہ ہے کہ کل جائیداد کے 64 حصے کیے جائیں بیوہ کو 8 حصے دینے کے بعد باقی 56 حصے لڑکوں اور لڑکیوں میں 1:2 کی نسبت سے تقسیم کر دیئے جائیں۔ یعنی لڑکوں کو چودہ، چودہ اور لڑکیوں کو سات، سات حصے مل جائیں۔ اولاد کی موجودگی میں پوتا محروم رہتا ہے اس کی حوصلہ افزائی دو طرح سے کی جاسکتی تھی۔

① مرحوم وصیت کے ذریعے اسے کچھ دے سکتا تھا۔ بشرطیکہ وصیت 1/3 سے زائد نہ ہوتی۔

② ورثاء اپنی مرضی سے اسے کچھ نہ کچھ دے دیں لیکن وہ اس کے پابند نہیں ہیں۔ اب درج بالا سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جائیداد کی تقسیم شریعت کے مطابق نہیں ہوئی، ورثاء کو چاہیے کہ جس کسی نے دوسرے کا حق دانستہ یا نادانستہ طور پر دبایا ہے وہ حقدار کو اس کا حصہ واپس کر دے وگرنہ قیامت کے دن اس کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اس سلسلہ میں یتیم پوتے کا موقف صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال لیاقت پور سے ضیاء الحق بن محمد سرور سلفی لکھتے ہیں کہ ایک عورت جو بیوہ ہے اس کی صرف ایک لڑکی ہے اور اس کے مرحوم خاوند کی دوسری بیوی کی اولاد دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ ہیں، بیوہ کے فوت ہونے کے بعد اس کی لڑکی وارث ہوگی یا مرحوم خاوند کی دوسری بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد بھی وارث بنے گی؟

جواب بیوہ کی وفات کے بعد صرف اس کی لڑکی وارث بنے گی۔ سوکن کی اولاد اس کی حقدار نہیں ہوگی۔ کیونکہ متوفیہ سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جو مال، ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ مریں تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی۔'' [۴/النسآء:۷]

اس لڑکی کو نصف بحیثیت ذوی الفروض ملے گا اور باقی نصف بھی اس پر واپس کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اور کوئی حق دار موجود نہیں ہے۔ سوتیلے بہن بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

سوال ایک سائلہ بذریعہ ای میل سوال کرتی ہیں کہ میری بہن نے مجھے کچھ رقم اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے لیے دی تھی۔ اب وہ فوت ہو چکی ہے، اس کی ساس کا مطالبہ ہے کہ وہ رقم ہمارے حوالے کی جائے جبکہ مرحومہ کی دونوں بیٹیاں میرے پاس ہیں، کیا بہن کی جائیداد سے ساس کو حصہ ملتا ہے یا نہیں، اگر نہیں تو میرے پاس جو امانت ہے اسے کیا کروں، وراثت کے طور پر تقسیم کر دوں یا بیٹیوں کی شادی پر لگا دوں؟

جواب صورت مسئولہ میں دی گئی رقم کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

① وہ رقم بطور وصیت ہو یعنی مرحومہ نے وصیت کے طور پر وہ رقم اپنی بہن کو دی، لیکن یہ اس لیے ناجائز ہے کہ وصیت ایسے شخص کے لیے کی جاسکتی ہے جو شرعی طور پر جائیداد کا وارث نہ بن سکتا ہو۔ بیٹیاں چونکہ اپنی والدہ کی متروکہ جائیداد سے حصہ پاتی ہیں اس لیے ان کے حق میں وصیت ناجائز ہے۔

② وہ رقم بطور عطیہ کے ہو۔ یہ صورت بھی صحیح نہیں، کیونکہ جس شخص کو عطیہ دیا جائے اسے چاہیے کہ عطیہ دینے والے کی موت سے پہلے پہلے اس پر قبضہ کرے مذکورہ صورت میں بیٹیوں کا اس رقم پر قبضہ نہیں ہوا بلکہ وہ تو ان کی خالہ کے پاس ہے۔

③ تیسری صورت یہ ہے کہ مرحومہ نے بطور امانت کچھ رقم اپنی ہمشیرہ کے پاس رکھی تاکہ وہ بیٹیوں کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات اس رقم سے پورے کرے لیکن وہ ان کی شادی سے پہلے فوت ہو چکی ہے، اب یہ رقم اس کی متروکہ جائیداد شمار ہوگی اور اس میں ضابطہ میراث جاری ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ آخری صورت ہی ہے کہ اس رقم کو ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(الف) دو تہائی اس کی دونوں بیٹیوں کا حق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر مرنے والے کی صرف لڑکیاں ہی ہوں اور وہ دو سے زیادہ ہوں تو انہیں متروکہ کا دو تہائی حصہ ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

اس آیت کریمہ میں اگرچہ دو سے زائد لڑکیوں کا حکم بیان ہوا ہے تاہم دو لڑکیوں کا بھی یہی حکم ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔ حضرت سعد بن ربیع غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تو اس کی تمام جائیداد پر اس کے بھائی نے قبضہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں لڑکیوں کو ان کے چچا سے دو ثلث مال دلوایا۔ [ترمذی: الفرائض ۲۰۹۲]

(ب) بیٹیوں کو دو تہائی دینے کے بعد جو باقی بچے وہ بہن کا ہے، کیونکہ وہ بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ ہوتی ہے اور عصبہ وارث ،مقررہ حصہ لینے والوں کا بچا ہوا لیتا ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے'' کہ بہنیں، بیٹیوں کی موجودگی میں بطور عصبہ وراثت پاتی ہیں۔''اگر مرحومہ کی بہن اپنا حصہ لڑکیوں پر خرچ کرنا چاہتی ہے تو یہ اس کی صوابدید پر موقوف ہے۔

(ج) مرحومہ کی ساس کا رقم کے متعلق مطالبہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ وہ کسی صورت میں وارث نہیں بن سکتی، اسے چاہیے کہ وہ اپنے مطالبہ سے دستبردار ہو لہٰذا ہمارا مشورہ ہے کہ لڑکیاں اگر بالغ ہو چکی ہیں تو موجودہ رقم ان کے ہاتھ پیلے کرنے پر صرف کر دی جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال مظفر آباد سے عبدالغفور سوال کرتے ہیں کہ ایک آدمی فوت ہو گیا ہے پسماندگان میں سے بیوی، بھائی اور ایک بہن زندہ ہے متوفی کی جائیداد کیسے تقسیم ہو گی۔

جواب اسلامی ضابطہ میراث کے مطابق میت کی اگر اولاد نہ ہو تو بیوی کو کل جائیداد کا 1/4 ملتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری عورتوں کا جائیداد میں چوتھا حصہ ہے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیوی کا حصہ ادا کرنے کے بعد جو باقی بچے وہ بہن بھائی کو مل جائے گا، تقسیم کی صورت میں بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ دیا جائے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:'' کہ اگر بہن بھائی یعنی مرد عورتیں ملے جلے وارث ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔''علم فرائض میں ایسے ورثاء کو عصبات کہا جاتا ہے جو مقررہ حصہ لینے والوں سے بچا ہوا ترکہ لیتے ہیں صورت مسئولہ میں بیوی کو دینے کے بعد جو باقی بچتا ہے اس کے وارث بہن بھائی ہیں اس لیے کل جائیداد کو چار حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ایک حصہ بیوی کو دینے کے بعد باقی تین حصوں میں دو حصے بھائی کو اور ایک حصہ بہن کو مل جائے گا۔واضح رہے کہ میت کی کل منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کو اسی ضابطہ کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

سوال میاں چنوں سے شریفاں بی بی سوال کرتی ہیں کہ میرے والد محترم فوت ہوئے، ان کے پسماندگان میں سے ہم دو بیٹیاں، بیوہ اور ان کا ایک بھائی اور بہن زندہ ہیں۔ان کا زرعی رقبہ 72 کنال ہے۔اسے کیسے تقسیم کیا جائے؟

جواب صورت مسئولہ میں بیوہ کو کل جائیداد کا 1/8 اور دونوں بیٹیوں کو 2/3 دیا جائے جو باقی بچے اسے بھائی اور بہن اس طرح تقسیم کریں کہ بھائی کو بہن سے دوگنا حصہ ملے۔یعنی بیوہ کو 72 کا 1/8=9 کنال۔دو بیٹیوں کو 72 کا 2/3=48 کنال، 24,24 کنال ہر ایک بیٹی کو ملے گی اور باقی پندرہ کنال سے بھائی کو 10 کنال اور بہن کو 5 کنال دی جائیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کو 1/8 کل ترکہ سے دیا جائے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

نیز''اگر بیٹیاں (دو یا) دو سے زیادہ ہیں تو انہیں ترکہ سے 2/3 ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

حدیث میں ہے:'' کہ مقررہ حصہ لینے والوں سے جو بچے وہ عصبہ کو دیا جائے۔''چونکہ عصبہ کے ساتھ اس کی بہن بھی ہے، جس کے متعلق ضابطہ الٰہی ہے:'' کہ اگر میت کے متعدد بہن، بھائی ہیں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ دیا جائے۔'' [۴/النسآء:۱۷۶]

اس لیے مقررہ حصہ لینے والوں کے بعد بہن بھائیوں کو اسی نسبت سے دیا جائے گا۔

سوال ٹنڈو آدم سے شیخ مصطفیٰ لکھتے ہیں کہ ہمارے والد محترم عرصہ ایک سال سے فوت ہو چکے ہیں۔ پسماندگان میں ہماری والدہ، پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں ترکہ کیسے تقسیم ہوگا نیز والد محترم نے اپنی زندگی میں چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کی شادی کردی تھی اب کیا تقسیم جائیداد سے پہلے پہلے بیٹے اور بیٹی کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات منہا کیے جاسکتے ہیں یا کل جائیداد کو ورثاء میں تقسیم کرنا ہوگا؟

جواب قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق قانون وراثت فوت ہونے والے کے ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری ہوتا ہے اس کا ترکہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، زرعی ہو یا صنعتی الغرض ہر قسم کی جائیداد ورثاء میں تقسیم ہوگی۔ البتہ تقسیم سے پہلے میت کے کفن ودفن پر اٹھنے والے اخراجات جائیداد سے منہا کیے جاسکتے ہیں، اگر میت کے ذمے قرض ہے تو اسے بھی اس جائیداد سے ادا کیا جائے گا، پھر وصیت پوری کی جائے گی جو کل مال کے 1/3 حصہ کی حد تک ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد ترکہ تقسیم ہوگا۔ صورت مسئولہ میں والدہ یعنی مرحوم کی بیوہ کو آٹھواں حصہ دے کر باقی سات حصے اولاد میں تقسیم ہوں گے۔ آسانی کے لیے کل جائیداد کے 104 حصے کر لیے جائیں بیوہ کو 13 حصے دے کر باقی 91 حصے اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ ملے یعنی ہر ایک بیٹے کو 14 حصے اور ہر ایک بیٹی کو 7 حصے دیئے جائیں۔

صورت مسئولہ: بیوہ 5 بیٹے 3 بیٹیاں.....(بیوہ:13 حصے) (5 بیٹے:70 حصے۔ فی بیٹا:14 حصے) (3 بیٹیاں:21 حصے۔ فی بیٹی:7 حصے)

مرحوم نے جن بچوں اور بچیوں کی شادیاں کی ہیں، ان پر جو مال خرچ ہوا ہے وہ ان کا مقدر تھا، یہ دوسرے بچوں کی شادی کے لیے ترکہ سے خرچہ وغیرہ منہا کرنے کا پیش خیمہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے قرض کی ادائیگی اور وصیت کے اجراء کے بعد جو ترکہ باقی ہے اس پر ضابطہ وراثت جاری ہوگا۔ جس کی اوپر تفصیل بتادی گئی ہے۔ البتہ باپ کی جائیداد سے حصہ لینے والے برسر روزگار لڑکے اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اپنی والدہ کے کہنے پر بیٹے اور بیٹی کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کا بندوبست کریں۔ مرحوم کی جائیداد سے کسی مقدار کا حصہ کم کرنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ والدہ کو اختیار ہے کہ جائیداد تقسیم ہوجانے کے بعد اپنے لڑکوں کو حکماً کہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کی شادی کے انتظامات کریں اگر بڑے لڑکے ماں کے اس حکم سے سرعدولی کرتے ہیں تو اللہ کے ہاں سنگین جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

[صحیح بخاری: کتاب الادب]

قرآن پاک میں ایک واضح ارشاد ملتا ہے کہ اگرچہ اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی خدمت کرنا چاہیے۔ لیکن ماں کا حق اس بنیاد پر زیادہ ہے کہ وہ اولاد کے لیے زیادہ تکلیفیں اٹھاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ والدین میں سے کس کا حق خدمت مجھ پر زیادہ ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں کا۔'' تین دفعہ پوچھنے پر آپ ﷺ نے یہی جواب دیا۔ اس نے چوتھی دفعہ پوچھا کہ اس کے بعد کون؟ فرمایا: ''تیرا باپ''۔ [صحیح بخاری کتاب الادب]

اس لیے مرحوم کے بڑے صاحبزدگان جو برسر روزگار ہوں، شرعاً واخلاقاً اس بات کے پابند ہیں کہ اپنی والدہ کے فرمان کی بجا آوری کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی شادی کا بندوبست کریں۔ [واللہ اعلم]

سوال علی پور سے محمد اکرم پوچھتے ہیں کہ ہم تین بھائیوں نے والد کے ساتھ مل کر ایک قطعہ زمین خریدا تھا۔ ہمارا چوتھا بھائی عرصہ دراز سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے۔ اور اس نے مذکورہ زمین کی خریداری کے وقت کوئی پیسہ پائی بھی نہیں دیا۔ اب والد کی وفات کے بعد اس قطعہ زمین میں شرعی طور پر اس کا حصہ بنتا ہے یا نہیں نیز ہماری دو بہنوں اور والدہ کا حصہ بھی بتادیں؟

جواب باپ کے پاس رہنے والی اولاد کی کمائی باپ کی شمار ہوتی ہے۔ الا یہ کہ اولاد کا حق ملکیت تسلیم کرلیا جائے۔ صورت مسئولہ میں معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ زمین خریدتے وقت لڑکے اپنے باپ کے ساتھ شراکت کے طور پر حصہ دار بنے ہیں یعنی ان کا الگ حق ملکیت تسلیم کرلیا گیا ہے ایسی صورت حال کے پیش نظر باپ کو اگر ذاتی ضرورت ہو تو زمین اپنے لیے رکھ سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ''تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لیے ہے۔'' [نسائی]

لیکن باپ کی طرف سے اس قسم کا اظہار نہیں ہوا اس لیے الگ تھلگ رہنے والے بھائی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذکورہ حدیث کی آڑ لے کر پورے قطعہ زمین سے اپنا حق لینے کا دعویٰ کرے۔ وہ صرف اتنے حصے میں شریک ہوگا جو باپ کا بطور شریک کے لیے ہے۔ مثلاً اگر زمین خریدتے وقت باپ کا چوتھا حصہ تھا تو اس کا وہ بیٹا جو زمین خریدنے میں شریک نہیں ہوا صرف چوتھائی حصہ میں دوسرے ورثاء کے ساتھ شریک ہوگا۔ اب باپ کی وفات کے وقت پسماندگان سے اس کی بیوی، دو بیٹیاں اور چار بیٹے بقید حیات ہیں اس لیے باپ کی کل جائیداد سے بیوہ کو 1/8 بیٹے اور بیٹیاں اس طرح تقسیم کریں کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے۔ سہولت کے پیش نظر جائیداد کے 80 حصے کرلیے جائیں ان میں آٹھواں یعنی 10 حصے بیوی کو اور باقی 70 حصے اس طرح تقسیم کیے جائیں کہ چودہ حصے فی لڑکا اور سات حصے فی لڑکی ادا کردیے جائیں صورت نقشہ یہ ہے۔

میت/80

بیوی	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکا	لڑکی	لڑکی
10	14	14	14	14	7	7

سوال ڈجکوٹ سے عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ ایک شخص کی دو بیویاں ہیں اور دونوں صاحب اولاد ہیں۔ ایک بیوی کے بطن سے پانچ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں جبکہ دوسری بیوی سے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا ہے، مذکورہ آدمی فوت ہوچکا ہے، اس کی کل جائیداد ایک مکان، ایک دکان اور پانچ ایکڑ زرعی زمین ہے اس کی مذکورہ جائیداد پسماندگان میں کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب صورتِ مسئولہ میں متوفی کے ورثاء، دو بیوگان، چھ لڑکے اور چھ لڑکیاں ہیں، قرآن مجید کے بیان کردہ ضابطہ میراث کے مطابق اولاد کی موجودگی میں بیوہ یا بیوگان کو جائیداد سے آٹھواں حصہ ملتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ اگر تمہاری اولاد ہو تو ان (بیویوں) کو تمہاری متروکہ جائیداد سے آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیوگان کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد باقی 7/8 متوفی کی اولاد کے لیے ہے اسے بایں طور پر تقسیم کیا جائے گا: لڑکے کو لڑکی کے

مقابلہ میں دوگنا حصہ ملے گا۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

مذکورہ تصریحات کے مطابق متوفی کی کل جائیداد کے 144 حصے کردیئے جائیں،ان میں سے 18 حصص بیوگان کے لیے جو 9,9 حصے فی بیوہ کے حساب سے تقسیم ہوں گے،84 حصے لڑکوں کے لیے جو 14,14 حصص فی لڑکا کے حساب سے تقسیم ہوں گے۔ اسی طرح 42 حصے لڑکیوں کے لیے جو 7 حصص فی لڑکی کے حساب سے تقسیم کردیئے جائیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فتح پور سے عبدالسلام بھٹی لکھتے ہیں کہ ایک آدمی مبلغ ساڑھے سات لاکھ روپیہ ترکہ چھوڑ کر فوت ہوا، پسماندگان میں سے ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں،اس جائیداد کو کیسے تقسیم کیا جائے؟

جواب قرآنی ضابطہ میراث کے مطابق بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ دیا جائے گا،صورت مسئولہ میں چونکہ ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں اس لیے کل جائیداد کے پانچ حصے کرلیے جائیں، پھر ایک حصہ بیٹی کے لیے اور دو، دو حصے دونوں بیٹیوں کو دے دیئے جائیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری اولاد کے متعلق حکم دیتا ہے، کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصے کے برابر ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

اس آیت کی روشنی میں مذکورہ جائیداد کو درج ذیل نقشہ کے مطابق تقسیم کردیا جائے:

لڑکا=2 لڑکا=2 لڑکی=1

چونکہ جائیداد ساڑھے سات لاکھ روپیہ ہے اس لیے تین، تین لاکھ دونوں لڑکوں کے لیے اور ڈیڑھ لاکھ لڑکی کو مل جائے گا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فیصل آباد سے محمد سردار لکھتے ہیں کہ ایک آدمی فوت ہوا، پسماندگان میں سے بیوہ، ایک بیٹی اور دو بھائی موجود تھے، اس وقت کے مروجہ قانون کے مطابق میت کی زمین دوسرے ورثاء کے بجائے صرف اس کی بیوہ کے نام منتقل ہوگئی، بیوہ نے اپنے خاوند کی اس زمین کو اپنی بیٹی کے نام انتقال کرادیا۔جبکہ بیوہ کے دو حقیقی بھتیجے بھی موجود ہیں جب بیوہ فوت ہوگئی۔تو اس کی بیٹی کے چچازاد بھائیوں نے اس کے خلاف موجودہ زمین پر دعویٰ استقرار حق دائر کردیا۔اب دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ مذکورہ لڑکی کو ملنے والی زمین سے اس کے چچازاد بھائیوں کو شرعاً کچھ مل سکتا ہے یا نہیں؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ مذکورہ زمین ابتدا ہی سے غلط تقسیم ہوئی ہے، تقسیم کی صحیح صورت یہ تھی کہ متوفی کی جائیداد کے آٹھ حصے کرلیے جاتے ایک حصہ بیوہ کو، چار حصے لڑکی کو اور باقی حصے اس کے دونوں بھائیوں کو دے دیئے جاتے ،لیکن صورت مسئولہ میں تمام جائیداد بیٹی کے نام منتقل کردی گئی ہے جو شرعاً وقانوناً جائز نہیں ہے۔وہ صرف اپنے باپ کی نصف جائیداد اور ماں کو ملنے والے حصے سے نصف کی مالکہ ہے، باقی جائیداد پر جو اس کا ناجائز قبضہ ہے، اسے واگزار کرنے کے لیے اس کے چچازاد بھائی اس کے خلاف دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں، انہیں اپنے اپنے باپ (جو میت کے حقیقی بھائی تھے) کا حصہ ملنا چاہیے، اور وہ بیوہ کا 1/8 اور بیٹی کا 1/2 نکال کر باقی 3/8 ہے، یہاں اس بات کی وضاحت کردینا بھی ضروری ہے کہ بیوہ کے فوت ہوجانے کے بعد

اس کے حصہ اسلامی 1/8 سے لڑکی کے چچازاد بھائیوں کو کچھ نہیں ملے گا، وہ صرف پہلی تقسیم میں 3/8 کے حقدار ہیں اور اسی حصہ کو لینے کے لیے وہ عدالتی چارہ جوئی کرنے کے مجاز ہیں۔ اس سے زیادہ کے وہ حق دار نہیں ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال لالہ موسیٰ سے بواسطہ ذیشان خریداری نمبر 5695 قاضی محمد خاں لکھتے ہیں کہ میری بیوی فوت ہوگئی ہے۔ اس کے نہ والدین زندہ ہیں اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے، صرف اس کا خاوند اور تین حقیقی بہنیں زندہ ہیں، اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی۔؟

جواب صورت مسئلہ کلالہ کی ایک صورت ہے، چونکہ اولاد نہیں ہے اس لیے خاوند کو اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے نصف ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہیں اس مال کا نصف ملے گا جو تمہاری بیویاں چھوڑ مریں بشرطیکہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو۔'' [۴/النسآء:۱۲]

اور تین حقیقی بہنوں کو کل جائیداد سے دو تہائی یعنی 2/3 ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر میت کی دو بہنیں (یا دو سے زیادہ) ہوں تو انہیں میت کے ترکہ سے دو تہائی ملے گا۔'' تقسیم میں سہولت کے لیے بنیادی طور پر کل جائیداد کے چھ حصے کر لیے جائیں، نصف یعنی تین حصے خاوند کو اور دو تہائی یعنی چار حصے تین بہنوں کو دیے جائیں۔ اس صورت مسئلہ میں دو باتوں کو پیش نظر رکھا جائے:

① جس صورت مسئلہ میں کل حصوں سے ورثاء کو ملنے والے سہام زیادہ ہو جائیں وہاں عول ہوتا ہے۔ جیسا کہ موجودہ صورت مسئلہ میں ہے کیونکہ جائیداد کے کل حصے چھ ہیں۔ لیکن جب خاوند کے تین اور تین بہنوں کے چار حصوں کو جمع کیا تو یہ سات سہام بنتے ہیں۔ اس لیے تقسیم کے عمل کو پورا کرنے کے لیے کل جائیداد کے چھ کے بجائے سات حصے کر لیے جائیں گے، ان سات حصوں میں سے تین خاوند کو اور باقی چار بہنوں کو مل جائیں گے۔

② بہنوں کی تعداد تین ہے اور ان کے حصے چار ہیں، انہیں تقسیم کرنے کے لیے کسر کا سہارا لینا پڑے گا۔ جو فرائض میں نہیں چلتا۔ لہٰذا انہیں پورا پورا تقسیم کرنے کے لیے جائیداد کے سات حصوں کو ایک خاص نسبت سے بڑھانا ہوگا، جسے وراثت کی اصطلاح میں تصحیح مسئلہ کہا جاتا ہے، تقسیم میں یکسانیت کے لیے کل جائیداد کے اکیس حصے کر لیے جائیں گے۔ یعنی بہنوں کی تعداد کے مساوی عدد کو جائیداد کے بنیادی حصوں سے ضرب دی جائے گی، اب 3x7=21 حصے بن گئے، ان میں 3x3=9 حصے خاوند کے لیے اور 3x4=12 حصے تین بہنوں کے لیے اب وہ 12 حصوں سے چار چار حصوں کی مالک ہوں گی۔ واضح رہے کہ جائیداد کی تفصیلی تقسیم محکمہ مال یعنی پٹواری وغیرہ کے ذمے ہیں۔ وراثت کے فتویٰ میں صرف حصوں کا تعین کیا جاتا ہے، تقسیم کا عمل ہمارے ذمے نہیں ہے۔ **واللہ اعلم بالصواب**

سوال لالہ موسیٰ سے بواسطہ ذیشان خریداری نمبر 5695، قاضی محمد خاں کا ایک سوال اہل حدیث مجریہ 5 ستمبر 2003ء، شمارہ نمبر 36 میں شائع ہوا تھا کہ میری بیوی فوت ہوگئی ہے اس کے نہ والدین زندہ ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے، صرف اس کا خاوند اور تین حقیقی بہنیں زندہ ہیں اس کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی، ہم نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ صورت مسئولہ کلالہ کی ایک صورت ہے چونکہ اولاد نہیں، اس لیے خاوند کو اس کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے نصف ملے گا اور تین حقیقی بہنوں کو کل جائیداد سے 2/3 دیا

جائے گا، تقسیم میں سہولت کے پیش نظر ہم نے لکھا تھا کہ کل جائیداد کے چھ حصے کر لیے جائیں، نصف یعنی تین حصے خاوند کو اور دو تہائی یعنی چار حصے تینوں بہنوں کو دیئے جائیں، چونکہ چھ حصوں سے ورثاء کو ملنے والے سہام زیادہ ہیں اس لیے یہاں عول ہوگا، اس لیے کل جائیداد کے چھ کے بجائے سات حصے کر لیے جائیں، ان سات حصوں میں سے تین خاوند کو اور باقی چار بہنوں کو مل جائیں گے۔ آخر میں یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ جائیداد کی تفصیلی تقسیم محکمہ مال یعنی پٹواری کے ذمے ہے، وراثت کے فتویٰ میں صرف حصوں کا تعین کیا جاتا ہے، تقسیم کا عمل مفتی کے ذمے نہیں ہے۔ ادارہ ''اہلحدیث'' کی وساطت سے ہمیں ایک خط موصول ہوا جس میں قاضی محمد خاں لکھتے ہیں کہ ''میرے حق وراثت کے سوال پر جو مشورہ دیا گیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی مخالفت کرتا ہے، نیز یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس میں بڑی محنت درکار ہے۔ اسے عول یا پٹواریوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ [الی آخرہ]

جواب ہم نے سوال کا جواب قرآن کریم کی آیات کے حوالہ سے دیا تھا، ہمارے نزدیک ہر مسئلہ ہی بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس لیے سوالات کے جواب میں محنت بھی کی جاتی ہے اور احساس ذمہ داری بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک مفتی کا منصب یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نیابت میں رہتے ہوئے سوالات کے جواب دیتا ہے، اس مختصر وضاحت کے بعد کچھ ملاحظات پیش خدمت ہیں:

① پرچہ ''اہل حدیث'' کوئی کاروباری میگزین نہیں ہے کہ اس سے دنیاوی منفعت ہوتی ہو، بلکہ دنیاوی لحاظ سے دینی جرائد خسارے میں رہتے ہیں، البتہ دینی لحاظ سے یہ مفاد ضرور ہوتا ہے کہ ان سے دین اسلام کی سربلندی اور اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت مقصود ہوتی ہے۔ شاید سوالات کے جواب کے لیے خریداری نمبر کی پابندی بھی اس لیے ہے کہ اس کے خریدار زیادہ ہوں، لیکن یہ بات اخلاقی لحاظ سے صحیح نہیں ہے کہ دوسروں کے خریداری نمبر کا سہارا لے کر سوالات پوچھے جائیں۔ ویسے بھی سوال و جواب کے کالم میں خریدار یا غیر خریدار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے جواب دیئے جاتے ہیں۔

② عول کا سہارا مجبوراً لیا جاتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے عول کا حکم دیا تھا۔ ان کے زمانے میں ایک ایسی صورت واقع ہوئی کہ اصحاب فرائض سے سہام ترکہ کی اکائی سے زیادہ تھے۔ جیسا کہ موجودہ صورت مسئولہ میں ہے۔ آپ نے کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے عول کا مشورہ دیا، جس سے تمام صحابہ نے اتفاق فرمایا، ان میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے مجتہدین صحابہ کرام شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عول کے مسئلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متفقہ مسئلہ میں اختلاف رائے کیا۔ اگر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مخالفت مشہور نہ ہو جاتی تو عول کے مسئلہ پر اجماع قطعی کا حکم لگا دینا یقینی ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عول کی ضرورت کو بایں الفاظ بیان فرمایا: ''کہ مجھے قرآن کریم سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مقررہ حصہ لینے والوں میں سے کون قابل تقدیم ہے اور کون قابلِ تاخیر تا کہ مقدم کو پہلے اور مؤخر کو بعد میں کر دیا جائے۔ اس لیے انہوں نے سب اصحاب فرائض کے درمیان یکسانیت پیدا کرنے کے لیے عول کا طریقہ جاری فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک خاوند قوی حقدار ہے، اس لیے اسے پورا پورا حصہ دیا جائے اور بہنیں کمزور حصہ دار ہیں، ان کے حصوں میں کمی کی جائے۔ صورت مسئولہ میں مسئلہ چھ سے بنتا ہے، لیکن سہام سات ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک خاوند کو کل جائیداد

سے نصف یعنی 1/2 دے دیا جائے۔ اور بہنوں کے چار حصوں سے ایک حصہ کم کر کے انہیں صرف تین حصے دیئے جائیں۔ اس طرح عول کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف اس لیے درست نہیں ہے کہ تمام مقررہ حصہ لینے والے حقدار جو کسی درجہ میں جمع ہوں از روئے استحقاق برابر ہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی، چونکہ سب کا استحقاق بذریعہ نصِ قرآن قائم ہوا ہے۔ لہٰذا سب کا استحقاق برابر ہوگا اور ہر شخص اپنا اپنا پورا پورا حصہ لے گا اور اگر ترکہ حسب حصص موجود نہ ہو جیسا کہ موجودہ صورت میں ہے تو سب کے حصوں میں برابر کمی کی جائے گی اور عول کے ذریعے سے جو مخرج بڑھایا جاتا ہے اس کی وجہ سے جو نقصان عائد ہو وہ تمام مستحقین پر بقدر تناسب پھیلا دیا جائے۔ یہی راجح ہے اور اسی پر امت کا عمل ہے۔ البتہ شیعہ حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے موقف سے اتفاق کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، ان کے نزدیک اگر جملہ حصص کی میزان جائیداد کی اکائی سے متجاوز کر جائے تو اس اضافہ کو بیٹیوں اور بہنوں کے حصص سے منہا کر دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں قاضی محمد خاں کو بھی اس لیے اختلاف ہے کہ خاوند ہونے کی حیثیت سے ان کے حصہ میں عول کی وجہ سے معمولی سی کمی واقع ہوئی ہے، دلوں کے حالات تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بظاہر قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ باقی پٹواریوں کا حوالہ اس لیے دیا گیا تھا کہ جائیداد اگر زمین کی شکل میں ہو تو ہر وارث کو کتنی کنال یا مرلے یا کتنی سرسائیاں ملیں گی، اس تقسیم کی ذمہ داری مفتی پر نہیں ہے کیونکہ اس نے علم وراثت پڑھا ہے محکمہ مال کے کورس نہیں کیے ہیں۔ لہٰذا ہم نے فتویٰ میں جو مشورہ دیا ہے اس میں اللہ کی کسی حد کو نہیں توڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ حق سمجھنے اور اس پر عمل کی توفیق دے۔

سوال بصیر پور سے سرداراں زوجہ سلطان لکھتی ہیں کہ میرے ماموں جب فوت ہوئے تو اس کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں زندہ تھیں، دونوں بیٹوں نے اپنی بہنوں سے پوچھے بغیر غیر منقولہ جائیداد یعنی زمین آپس میں بانٹ لی، بعد میں ایک بیٹے نے اللہ سے ڈرتے ہوئے اپنی بہنوں کو ان کا حصہ واپس کرنے کی پیش کش کر دی، بہنوں نے اسے اپنا حصہ معاف کر دیا، دوسرا بیٹا جب بیمار ہوا تو بہنوں نے اس سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا، اس نے حصہ دینے کا وعدہ کر لیا، لیکن وہ وعدہ پورا کیے بغیر مر گیا۔ چونکہ بات پہلے چلی ہوئی تھی۔ اس لیے بہنوں نے اس کی اولاد سے مطالبہ کیا کہ تمہارے باپ کے سر پر ہمارے حصے کا بوجھ ہے وہ ادا کریں لیکن انہوں نے ان کا حق دینے سے انکار کر دیا، اب کیا بہنوں کو اپنے بھائی کی اولاد سے اپنے حق کا مطالبہ کرنے کا شرعاً جواز ہے یا نہیں؟ کیا اولاد بھی پابند ہے کہ وہ اپنے باپ کا قرض ادا کرے، اگر اولاد دینا چاہے تو اس بھائی کی جائیداد سے اب بہنوں کو کتنا حصہ ملنا چاہیے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں شرعی تقسیم اسی طرح تھی کہ کل جائیداد کو چھ حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا۔ دو دو حصے بیٹوں کو اور ایک ایک حصہ بیٹیوں کو دیا جاتا، لیکن بیٹوں نے اپنی بہنوں کو محروم کر کے خود ہی غیر منقولہ جائیداد پر قبضہ کر لیا، اس طرح بہنوں کو ملنے والا الکل غیر منقولہ جائیداد کا 1/3 بھی بھائیوں کے پاس چلا گیا، اب چونکہ بہنیں ایک بھائی کے پاس والے حصے (1/6) سے دستبردار ہو گئی ہیں اور دوسرے بھائی سے اپنے باقی حصہ (1/6) کا مطالبہ کیا تھا اور وہ وعدہ ادائیگی کے باوجود ادا کیے بغیر فوت ہو گیا ہے، اب بہنوں کا باقی حصہ 1/6 ان کے بھائی کی اولاد کو منتقل ہو چکا ہے۔ اس لیے انہیں شرعاً یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے باپ سے ملنے والے باقی 1/6 حصہ کا مرنے والے بھائی کی اولاد سے مطالبہ کریں، اولاد کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی پھوپھیوں کو ان کا

حق واپس کر کے اپنے باپ کو اس بوجھ سے سبکدوش کریں، قرآن مجید نے جو میراث کا ضابطہ بیان کیا ہے اس کے مطابق میت کے ذمے قرض کی ادائیگی اور اس کی جائز وصیت کے اجراء کے بعد جو باقی بچے اس میں ورثاء کے لیے وراثت جاری ہوتی ہے۔ اسلام کی رو سے اولاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے باپ کے ذمے جو مالی واجبات ہیں وہ انہیں ادا کریں، حدیث میں ہے: ''کہ مؤمن کی روح قرض کی وجہ سے ادائیگی تک کے لیے اللہ کے حضور معلق رہتی ہے، یعنی اللہ کی عدالت میں گرفتار رہتی ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ انسان کے ذمے ایسے حقوق باقی رہتے ہیں جو واجب الاداہوں، جن کی ادائیگی نہ کی گئی ہو۔ [مسند امام احمد: ۵/۸]

بہنوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنا حق لینے کے لیے اپنے بھائی کی اولاد سے مطالبہ کریں، اور فرمانبردار اولاد کو چاہیے کہ وہ اس کی ادائیگی میں پس وپیش نہ کریں، یاد رہے کہ قیامت کے دن انسان کی نیکیاں اور برائیاں زرمبادلہ کے طور پر بھی استعمال ہوں گی۔ اس لیے مالی حقوق کی ادائیگی اس دنیا میں ہو جانی چاہیے، بصورت دیگر اس دن پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ قیامت کے دن مالی حقوق کے عوض اپنی نیکیوں سے ہاتھ دھونے پڑیں اور حق داروں کی برائیاں اپنے کھاتے میں ڈال کر جہنم کا راستہ اختیار کرنا پڑے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ بہنوں کو صرف اپنے اسی حصے کے مطالبہ کا حق ہے جو باپ کی طرف سے انہیں ملنا تھا، بھائیوں کی دوسری جائیداد سے ان کی اولاد کی موجودگی میں یہ حق دار نہیں ہیں۔ باپ کی غیر منقولہ جائیداد سے صرف 1/3 کی حقدار تھیں، اس میں آدھا یعنی 1/6 اپنے بھائی کو معاف کر چکی ہیں۔ اب صرف باقی 1/6 کا مطالبہ کر سکتی ہیں، جو ان کے بھائی نے ادا کرنا تھا۔ لیکن ادائیگی کے بغیر وہ فوت ہو گیا۔

سوال مانگا منڈی سے حافظ عبدالغفور لکھتے ہیں کہ میرے والدِ محترم وفات پا گئے ہیں، پسماندگان میں سے ایک بیٹا یعنی سائل، ایک پوتا، ایک پوتی اور بیوہ موجود ہیں، انہوں نے اپنی وفات سے تین دن قبل اپنے پوتے اور پوتی کے حق میں وصیت کی تھی کہ انہیں میری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا 1/4 حصہ دیا جائے تو کیا والدِ محترم کی وصیت پر عمل کیا جائے یا قرآن وحدیث کی رو سے ان کا کوئی خاص حصہ مقرر ہے۔ نیز یہ بھی بتایا جائے کہ والدِ محترم کی جائیداد سے کس کو کتنا حصہ دیا جائے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ قانونِ وراثت کے مطابق قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم رہتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں قریبی رشتہ دار بیٹا موجود ہے، اس کے ہوتے ہوئے دور کے رشتہ دار، پوتا اور پوتی شرعی طور پر اپنے دادا کی جائیداد کے حصہ دار نہیں ہیں، لیکن مرحوم نے ان کے حق میں اپنی جائیداد کے 1/4 کی وصیت کی ہے جو جائز ہے۔ اور شریعت نے اس کی اجازت دی ہے کیونکہ وصیت کی تین شرائط ہیں:

① وصیت شرعی وارث کے لیے نہ ہو۔

② 1/3 سے زائد نہ ہو۔

③ ناجائز کام کے لیے نہ ہو۔

اس صورت میں تینوں شرائط پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس وصیت کا نافذ کرنا ضروری ہے، جس کی صورت یہ ہو گی کہ تقسیم جائیداد سے پہلے 1/4 الگ کر دیا جائے اور وہ مرحوم کے پوتے اور پوتی کو دے دیا جائے۔ باقی 3/4 میں وراثت کا قانون جاری

ہوگا۔جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

حسب وصیت پوتے، پوتی کا حصہ:1/4۔باقی جائیداد:3/4۔بیوہ کا حصہ 3/4 کا1/8= 3/32۔بیٹے کا حصہ:3/4۔-21/32=3/32۔

کل حصص: بیٹا=21/32 بیوہ=3/32 پوتا پوتی=1/4=8,3,21

یعنی کل جائیداد کے 32 حصے ہوں گے،جن میں سے 1/4 حصے پوتے اور پوتی کو بلحاظ وصیت دیئے جائیں گے۔باقی 24 حصوں سے 1/8 یعنی 3 حصے بیوہ کو اس کے بعد باقی ماندہ 21 حصص لڑکے کو مل جائیں گے،مرحوم کی جائیداد اس طرح تقسیم ہوگی۔پوتے اور پوتی کو بحیثیت وارث تو کچھ نہیں ملے گا البتہ وصیت کے مطابق وہ دادا کی جائیداد سے حسبِ وصیت حقدار ہیں۔وصیت کا اجراء تقسیم وراثت سے پہلے ہوگا،پھر باقی جائیداد کو حسبِ تفصیل بالا تقسیم کیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے محمد حسین لکھتے ہیں کہ عرصہ ہوا،حکومت نے ہمارے والد محترم کو ایک پلاٹ دیا تھا جسے ہمارے والد تعمیر کرکے اس میں رہائش پذیر ہوگئے۔کچھ عرصہ بعد حکومت نے ہمارے والد محترم سے پلاٹ کی قیمت کا مطالبہ کیا تاکہ مستقل طور پر مذکورہ پلاٹ ان کے نام منتقل ہوجائے اس وقت ان کے پاس کوئی رقم نہ تھی،ہمارے بڑے بھائی نے اپنی کمائی سے اس پلاٹ کی رقم ادا کر دی،ادائیگی کے بعد وہ پلاٹ ہمارے والد کے نام رجسٹری ہوگیا،ان کی وفات کے بعد وہ پلاٹ دونوں بھائیوں کے درمیان وجہ نزاع بن گیا،بڑے بھائی کا موقف ہے کہ میں اس نے اس کی قیمت ادا کی تھی،اس لیے میں اس کا مالک ہوں۔اس میں اور کوئی شریک نہیں ہے۔جبکہ میرا موقف ہے کہ اس پلاٹ کی رجسٹری والد محترم کے نام تھی اس لیے وہی اس کے مالک تھے۔ان کی وفات کے بعد بطور وراثت میں بھی اس کا حقدار ہوں۔واضح رہے کہ والد مرحوم کے ورثاء میں سے ہم دونوں زندہ ہیں۔

جواب واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں مذکورہ پلاٹ کا مالک وہی ہے جس کو حکومت نے الاٹ کیا ہے،جس شخص نے اس پلاٹ کی قیمت ادا کی ہے وہ صرف اس بنا پر اس کا مالک نہیں ہوسکتا کہ اس نے اس کی رقم ادا کی ہے۔کیونکہ حکومت کا مطالبہ جس شخص سے تھا وہی اس کا مالک ہوگا،بیٹے نے اگر وہ رقم باپ کو دی ہے تو حسنِ سلوک اور باپ سے خیر خواہی تو قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اسے بیٹے کی ملکیت کی وجہ نہیں بنایا جاسکتا۔لہٰذا باپ کے فوت ہونے کے بعد ہر قسم کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد میں دونوں بیٹے برابر کے شریک ہیں۔اگر باپ زندگی میں کسی ایک کے نام رجسٹری کراگیا ہے تو اس کا یہ اقدام بھی شرعاً درست نہیں ہے۔دونوں بیٹے اس کے غلط اقدام کی درستگی کے شرعاً پابند ہیں۔لیکن چونکہ ایک بیٹے نے پلاٹ کی پوری رقم ادا کی ہے۔اس لیے اس کی دادرسی بھی ہونی چاہیے،جس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پلاٹ کی رجسٹری کے وقت جتنی رقم ادا کی گئی تھی اس وقت کے حساب سے اس کی مالیت معلوم کی جائے،اس وقت سونے کا کیا نرخ تھا،اس کے مطابق رقم کا جتنا سونا آسکتا تھا اس کا نصف یا موجودہ بھاؤ کے مطابق اس سونے کی قیمت کا نصف ادا کرکے دوسرا بھائی اس پلاٹ میں شریک ہوسکتا ہے۔پرانی کرنسی کی ادائیگی پر اس پلاٹ میں شریک نہیں ہوسکے گا،پھر پلاٹ کی موجودہ بازاری قیمت لگا کر باہمی تصفیہ کرلیا جائے یعنی ایک بھائی دوسرے کو اس کی نصف قیمت ادا کرکے تمام پلاٹ کا مالک بن سکتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال میاں چنوں سے نیامت اللہ پوچھتے ہیں کہ ایک عورت فوت ہوگئی پسماندگان میں دو بیٹیاں، تین نواسے، چار بہنیں اور چار بھتیجے بقید حیات ہیں مرحومہ کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب صورت مسئولہ میں دو بیٹیوں کو دو تہائی اور باقی ایک تہائی چار بہنوں کو ملے گا، نواسے اور بھتیجے محروم ہیں۔ قرآن کریم میں ہے: ''اگر عورتیں (بیٹیاں دو یا دو سے زائد) ہوں تو انہیں دو تہائی ملے گا۔'' [۴/النسآء:۱۱]

حدیث میں ہے: ''بیٹیوں کی موجودگی میں بہنوں کو عصبہ بنایا جائے۔'' [صحیح بخاری]

عصبہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ بیٹیوں کا حصہ نکال کر باقی ورثہ بہنوں کو دے دیا جائے، جب بہنیں عصبہ مع الغیر بنتی ہیں تو وہ بھائی کی طرح بن جاتی ہیں یعنی ان کی موجودگی میں بھائی کی اولاد بھتیجے وغیرہ محروم ہوں گے، باقی رہے نواسے تو وہ ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے محروم ہیں، سہولت کے پیش نظر کل منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے بارہ حصے کر لیے جائیں۔ چار، چار دونوں بیٹیوں کو اور ایک ایک حصہ چار بہنوں کو دے دیا جائے۔

میت/۳/۱۲

دو بیٹیاں	چار بہنیں	چار بھتیجے	تین نواسے
8/2	4/1	محروم	محروم

سوال گوجرانوالہ سے عمران صدیق لکھتے ہیں کہ ہمارے والد محترم کا انتقال ہوگیا پسماندگان میں سے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں اور بیوہ موجود ہے۔ جائیداد کی صورت حسب ذیل ہے:

والد محترم کا تعمیر کردہ پانچ مرلے کا مکان جس کی زمین والد صاحب نے خریدی اور تعمیر بڑے بیٹے نے اپنی کمائی سے کی، جبکہ وہ والد محترم کے ساتھ ہی رہتا تھا، بعد میں وہ الگ ہوگیا پھر ایک ملازم لڑکے نے کوشش کر کے آٹھ مرلے کا ایک پلاٹ خریدا۔ اس پر اٹھنے والے زیادہ تر اخراجات اسی ملازم بیٹے نے برداشت کیے۔ البتہ دو بیٹوں نے بھی ہمت کے مطابق اس میں کچھ حصہ ڈالا، چھوٹے بیٹے نے اس میں کوئی حصہ نہیں ڈالا۔ کیونکہ وہ ابھی چھوٹا تھا۔ پلاٹ کی رجسٹری کے وقت ملازم بیٹے نے والد محترم سے کہا کہ اس پلاٹ میں چاروں بھائیوں کو برابر، برابر شریک نہ کریں بلکہ صرف شدہ رقم کے تناسب سے کم وبیش حصہ ہونا چاہیے لیکن والد محترم نے اس پلاٹ کو فروخت کر کے اس کی رقم چاروں بیٹوں میں برابر تقسیم کردی۔ اب وضاحت طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ 5 مرلے پر بنا ہوا مکان جس کی تعمیر پر صرف بڑے بیٹے کی رقم خرچ ہوئی ہے وہ تمام ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا یا بڑے بیٹے کو کچھ زیادہ حصہ ملے گا؟ نیز جو پلاٹ والدِ محترم نے اپنی زندگی میں چاروں بیٹوں کو برابر برابر دے دیا تھا، ان کا یہ طرز عمل صحیح تھا یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں تو اب اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے۔ نیز کیا پانچوں بیٹے اور تین بیٹیاں والدِ محترم کی زندگی میں کیے گئے اس تصرف پر شرعاً اعتراض کرنے کا حق رکھتے ہیں؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں بیان کردہ دو چیزیں فیصلہ طلب ہیں۔

① والدِ محترم کے خرید کردہ پانچ مرلہ پلاٹ پر بڑے بیٹے کی کمائی سے تعمیر کردہ مکان۔

② ملازم بیٹے کی کوشش سے خریدا ہوا آٹھ مرلے کا پلاٹ جسے والدِ محترم نے اپنی زندگی میں فروخت کر کے اس کی رقم چاروں بیٹوں میں مساویانہ تقسیم کر دی۔

جہاں تک پانچ مرلے پلاٹ پر تعمیر کردہ مکان کا تعلق ہے۔ وہ سب والد کی ملکیت تصور ہوگا۔ اگر چہ اس کی تعمیر پر بڑے بیٹے نے رقم خرچ کی ہے۔ چونکہ وہ اپنے والد کے ساتھ ہی رہتا تھا اور ایسے حالات میں بڑے لڑکے والدین کو ہی اپنی کمائی دیتے ہیں۔ ہاں اگر والد کو کوئی چیز دیتے وقت وضاحت کر دی جائے کہ میں بطور امانت آپ کے سپرد کر رہا ہوں اس پر ملکیت کا حق میرا ہی ہوگا۔ اس صورت میں لڑکے کا حق ملکیت بدستور قائم رہے گا۔ جبکہ صورت مسئولہ میں مکان کے متعلق اس قسم کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے لہٰذا وہ مکان والد کی ملکیت ہے جو اس کی وفات کے بعد ورثاء میں شرعی حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا اور بڑے بیٹے کو تعمیر کی وجہ سے کوئی زیادہ حصہ نہیں دیا جائے گا۔

دوسری چیز جو آٹھ مرلہ پلاٹ کی شکل میں ہے اور باپ نے اسے فروخت کر کے اس کی رقم چاروں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی ہے۔ اس میں کچھ تفصیل ہے چونکہ سوال میں اس کے متعلق وضاحت نہیں ہے لہٰذا امکانی حد تک اس کی صورت مندرجہ ذیل ہو سکتی ہے۔

(الف) ملازم بیٹے نے اپنے لیے ہی اپنے نام وہ پلاٹ خریدا اور اس کے دو بھائیوں نے تعاون کے طور پر اسے کچھ رقم دی۔

(ب) تینوں بیٹوں نے مشترکہ طور پر وہ پلاٹ خریدا اور خریدتے وقت بطور شراکت رقم خرچ کی گئی۔

(ج) پلاٹ والد کے نام خریدا گیا اور خریدتے وقت رقم صرف کرنے والوں نے وضاحت کر دی تھی کہ خرید کردہ پلاٹ ہماری ملکیت ہوگا اور اس میں دوسرے ورثاء شریک نہیں ہوں گے اور وضاحت کا ان کے پاس کوئی دستاویزی یا گواہوں کی شکل میں کوئی ثبوت موجود ہو۔

(د) زمین والد کے نام خریدی گئی اور خریدتے وقت رقم صرف کرنے والوں نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ پلاٹ ہماری ملکیت ہوگا اگر کی ہے تو ان کے پاس اس کا کوئی تحریری یا زبانی ثبوت نہیں ہے۔

پہلی تین صورتوں میں مرحوم کو اس پلاٹ میں اپنی طرف سے تصرف کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ کیونکہ وہ پلاٹ کا مالک نہ تھا۔ البتہ فرق یہ ہوگا کہ پہلی صورت میں پلاٹ کی تمام مد رقم ملازم بیٹے کو ملے گی۔ اور دوسرے شریک بیٹوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ انہوں نے بطور تعاون اس کی خرید میں حصہ ڈالا تھا۔ البتہ دوسری اور تیسری صورت میں فروخت کردہ پلاٹ کی رقم کو صرف کردہ رقم کے تناسب سے تینوں بیٹوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

چوتھی صورت میں وہ پلاٹ والد کی ملکیت تصور ہوگا جس میں اسے تصرف کا حق ہے۔ لیکن زندگی میں اسے فروخت کر کے اس کی رقم اولاد میں تقسیم کرتے وقت تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو مساویانہ طور پر اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ بلکہ بڑے بیٹے اور تینوں بیٹیوں کو اس سے محروم رکھا گیا ہے۔ جو شرعاً درست نہ تھا۔ کیونکہ یہ ایک عطیہ کی شکل ہے جس میں نرینہ اور مادینہ کا فرق کیے بغیر تمام اولاد کو برابر، برابر حصہ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس تقسیم کو پنچائتی یا اپنے طور پر درست کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس رقم کو لڑکیوں سمیت تمام

اولاد میں برابر برابر تقسیم کر دیا جائے۔ البتہ اگر والد کی تقسیم کے وقت کسی وارث نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا بلکہ علم ہونے کے باوجود والد کی تقسیم کو برضا ورغبت قبول کر لیا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حقوق سے دستبرداری کا اظہار کر دیا ہے، اس صورت میں اب کسی وارث کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن سوال میں بعض ورثاء کی طرف سے والد محترم پر اعتراض کی صراحت موجود ہے۔ لہٰذا والد کی اس تقسیم کو کسی صورت میں برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔ بلکہ اس کی اصلاح ضروری ہے۔ جیسا کہ غلط وصیت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ محسوس کرے تو ان کی آپس میں اصلاح کر دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے''۔ [۲/البقرہ:۱۸۲]

اللہ تعالیٰ مرحوم کو معاف فرمائے اور اس کے بیٹوں کو غلطی کی تلافی کرنے کی توفیق دے۔ آمین

سوال چونیاں سے عبدالغفور لکھتے ہیں کہ ہم تین بھائیوں کی اراضی تقریباً پچاس کنال ہے، ہمارا ایک بھائی عرصہ چھ سال سے مخبوط الحواس ہونے کی بنا پر لاپتہ ہے، اس کی نرینہ اولاد کوئی نہیں صرف ایک لڑکی زندہ ہے، لاپتہ شخص کی بیوی بھی چند ماہ قبل انتقال کر گئی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ لاپتہ شخص کی زرعی اراضی کیسے تقسیم کی جائے۔ جبکہ اس کے فوت ہونے کے شواہد نہیں ہیں۔ ایسے حالات میں اس کی لڑکی پوری جائیداد کی حقدار ہوگی یا صرف اپنے حصہ کی؟ نیز اگر اسے فوت شدہ قرار دیا جائے تو اس کی چند ماہ پیشتر فوت ہونے والی بیوی کو اس کی جائیداد سے حصہ دیا جائے گا؟ اس صورت میں لڑکی کو کیا ملے گا؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ فقہی اصطلاح میں لاپتہ شخص کو مفقود الخبر کہتے ہیں یعنی ایسا گم شدہ شخص جس کی زندگی اور موت کا تلاش کے باوجود کوئی سراغ نہ مل سکے آیا وہ زندہ موجود ہے یا دنیا سے چل بسا ہے۔ ایسے شخص کی وراثت کے متعلق فقہی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال کے بارے میں زندہ تصور کیا جاتا ہے یعنی اس کے مال میں سے اس وقت تک کوئی تصرف نہ کیا جائے جب تک اس کی زندگی یا موت کا یقینی علم نہ ہو سکے اگر اس کی زندگی ثابت ہو جائے اور وہ زندہ واپس آجائے تو اپنی جائیداد کا خود مالک ہوگا اور اگر اس کی موت کی تصدیق ہو جائے یا عدالت اسے مردہ قرار دے دے تو لاپتہ شخص کی جائیداد اس کے موجودہ شرعی ورثاء میں تقسیم کر دی جائے جو فیصلہ موت کے وقت زندہ ہوں اس سے پہلے جن رشتہ داروں کا انتقال ہو چکا ہے انہیں لاپتہ شخص کی جائیداد سے کچھ نہیں دیا جاتا۔

صورت مسئولہ میں تین بھائیوں کی مشترکہ جائیداد 50 کنال ہے۔ لاپتہ شخص کا تیسرا حصہ الگ کر کے اس کی لڑکی کے سپرد کر دیا جائے، پھر اس کی موت کا فیصلہ کرنے کے لیے عدالت کی طرف رجوع کیا جائے یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے لاپتہ شہری کا کھوج لگانے کے لیے پوری سرگرمی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے نشر و اشاعت کے ذرائع و وسائل کو استعمال کرے پوری تحقیق کرنے کے بعد عدالت فیصلہ دے کہ وہ مردہ ہے یا زندہ! اگر اس کے زندہ ہونے کا ثبوت مل جائے تو لڑکی کو دی ہوئی پوری جائیداد اس کے حوالے کر دی جائے اور اگر عدالت کی طرف سے اس کی موت کی تصدیق ہو جائے اور اس کے مرنے کا فیصلہ دے دیا جائے تو تاریخ فیصلہ کے وقت جو شرعی ورثاء زندہ ہوں ان میں اس کا ترکہ تقسیم کر دیا جائے۔ اب اس کے ورثاء میں صرف ایک لڑکی اور دو بھائی ہیں اگر تاریخ فیصلہ تک یہ زندہ ہیں تو لاپتہ شخص کی نصف جائیداد اس کی لڑکی کو مل جائے گی اور باقی نصف کے دونوں بھائی

مالک ہوں گے۔ تاریخ فیصلہ سے پہلے جو ورثاء فوت ہو چکے ہیں انہیں اس کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔ جیسا کہ صورت مسئولہ میں مفقود کی بیوی کے متعلق پوچھا گیا ہے۔ مرحومہ کو اس کے خاوند کے زندہ یا مردہ ہونے کی دونوں صورتوں میں کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ میت کی جائیداد سے صرف زندہ ورثاء کو حصہ دیا جاتا ہے۔ ایک تیسری صورت کا بھی امکان ہے جسے موجودہ حالات کے پیش نظر، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہ یہ کہ اگر عدالت کے فیصلہ کے بعد جائیداد تقسیم ہوگئی پھر وہ زندہ ظاہر ہوا تو جتنا ترکہ ورثاء کے پاس موجود ہے، حاصل کرلے گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ تمام باتیں ورثاء سے لکھوالی جائیں تاکہ بعد میں کسی قسم کے جھگڑے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

سوال ملتان سے ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ ایک عورت فوت ہوگئی، اس کے پسماندگان میں سے خاوند، والد، والدہ اور ایک بھائی اور دو بہنیں زندہ ہیں، اس کا ترکہ (حق مہر اور جہیز وغیرہ) کیسے تقسیم ہوگا، نیز کیا خاوند کو یہ حق ہے کہ متوفیہ کی بیماری پر اٹھنے والے اخراجات اپنی بیوی کے حق مہر اور سامان جہیز سے پورے کرے یا اس کا علاج معالجہ اس کے ذمے ہے اس کے علاوہ متوفیہ کی شادی وٹہ سٹہ کی بنیاد پر ہوئی تھی، اس کی وفات کے بعد دوسری لڑکی والوں سے طلاق کا مطالبہ کردیا ہے جبکہ خاوند اسے آباد کرنا اور اسے بسانا چاہتا ہے کیا ایسا مطالبہ کرنا شرعاً صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو کیا حق مہر اور سامانِ جہیز وغیرہ واپس لینا درست ہے یا نہیں؟

جواب فوت ہونے والی عورت کا ترکہ (حق مہر اور سامانِ جہیز وغیرہ) بایں طور تقسیم کیا جائے گا، کہ خاوند کو نصف، والدہ کو چھٹا حصہ اور باقی والد کو ملے گا، جبکہ اس کے بہن بھائی محروم ہیں، کیونکہ والدہ موجود ہے دلائل یہ ہیں:

(الف) قرآن میں ہے: ''کہ جو مال تمہاری عورتیں چھوڑ مریں اگر ان کی اولاد نہ ہو تو اس میں نصف حصہ تمہارا ہے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

(ب) ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ اگر اولاد نہ ہو اور والدین اس کے وارث ہوں تو والدہ کے لیے ایک تہائی اور اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو والدہ کو چھٹا حصہ ملتا ہے'' [۴/النسآء:۱۱]

(ج) باپ محض عصبہ ہے لہٰذا مقررہ حصہ لینے والوں سے جو مال بچے گا اس کا حقدار باپ ہے۔

(د) والد کی موجودگی میں بہن بھائی بحیثیت عصبہ محروم ہوتے ہیں کیونکہ باپ کا تعلق زیادہ قوی اور قریب ہے، جائیداد کے کل چھ حصے کرلیے جائیں ان سے تین خاوند کو، ایک والدہ کو اور باقی دو والد کو دے دیئے جائیں، خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ دستور کے مطابق اپنی بیوی کے کھانے، پینے، لباس اور رہائش و دیگر ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کرے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق باپ کے ذمہ ہوگا۔'' [۲/البقرہ:۲۳۳]

نیز اللہ تعالیٰ نے جو مردوں کو عورتوں پر برتری عنایت فرمائی ہے اس کی ایک وجہ بایں الفاظ بیان کی ''کہ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔'' [۴/النسآء:۳۴]

نیز حدیث میں ہے: ''کہ خاوند جو خود کھاتا ہے اس سے بیوی کو کھلائے اور جو پہنتا ہے اس سے اپنی رفیقہ حیات کو پہنائے۔'' [مسند امام احمد:۵/۳،۷]

لہٰذا خاوند کو عورت کے ترکہ سے اپنے حصہ سے زیادہ لینے کی شرعاً اجازت نہیں ہے، بیماری پر اٹھنے والے اخراجات کا وہ خود

ذمہ دار ہے۔

اسلام میں وٹہ سٹہ ناجائز ہے، جہالت کی وجہ سے اگر ایسا ہو چکا ہے اور اولاد وغیرہ بھی اللہ نے دے رکھی ہے تو نکاح کو برقرار رکھنے کی علما نے گنجائش رکھی ہے، لیکن اگر اتفاق سے ایک لڑکی فوت ہوگئی ہے تو دوسری لڑکی والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی بیٹی کا گھر اجاڑنے کے لیے طلاق کا مطالبہ کریں اگر لڑکی از خود نہیں رہنا چاہتی تو اسے خلع لینے کی اجازت ہے لیکن اس صورت میں حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے گا نیز خلع بھی بذریعہ عدالت ہوگا سامان جہیز لڑکی کا ہے وہ اس کی واپسی کا مطالبہ کرسکتی ہے۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ باہمی اتفاق سے جہیز کی جو چیزیں استعمال ہو چکی ہیں ان کی واپسی کا مطالبہ شرعاً واخلاقاً درست نہیں ہے۔

سوال حیدر آباد سے شیر محمد لکھتے ہیں کہ زید کے ہاں اولاد نہ ہونے کی بنا پر اس نے کسی کے بچے کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا، اس کی پرورش کرنے کے بعد اس کی شادی بھی کی، نیز اس کے نام ایک 5 مرلہ پلاٹ بھی لگوادیا، شادی کے بعد وہ اپنے منہ بولے باپ کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا، جاتے وقت اسے بہت سمجھایا گیا لیکن وہ نہ مانا بالآخر زید نے مایوس ہو کر وہ پلاٹ جو اپنے منہ بولے بیٹے کو دیا تھا، اپنے بھائی کے بیٹے کو فروخت کر دیا، پھر وہ فوت ہوگیا، اس کے مرنے کے بعد اس کے منہ بولے بیٹے کا دعویٰ ہے کہ میرا پلاٹ مجھے دیا جائے مرنے والا زندگی میں مجھے دے گیا تھا، آپ بتائیں کہ واقعی وہ اپنے پلاٹ کا حقدار ہے یا جسے فروخت کر دیا گیا ہے وہ اس کا مالک ہے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ حقیقی والد اگر اپنی اولاد کو کوئی عطیہ دیتا ہے تو مناسب سمجھے تو کسی وقت بھی اسے واپس لے سکتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ کسی آدمی کے لیے جائز نہیں کہ وہ عطیہ دے کر واپس لے البتہ والد ایسا کرسکتا ہے۔'' [سنن ابی داوٗد: کتاب العصبات]

صورت مسئولہ میں زید نے اپنے منہ بولے بیٹے کو جو پلاٹ دیا تھا وہ واپس لینے کا مجاز نہ تھا، کیونکہ واپس لینے کا حق صرف حقیقی باپ کو ہے، جبکہ زید اس کا حقیقی باپ نہ تھا اور نہ ہی زید نے پلاٹ دیتے وقت یہ شرط لگائی تھی کہ اگر تو میرے پاس نہ رہا تو پلاٹ واپس لے لیا جائے گا، اس بنا پر زید کا اپنے بھتیجے کے ہاتھ زمین فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، ممکن ہے کہ قیامت کے دن اس سے باز پرس ہو، لیکن جب اس نے اسے فروخت کر دیا اور خریدنے والوں نے اس کی قیمت بھی ادا کر دی ہے تو اب خریدار اسے واپس کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اب پنچائتی طور پر افہام وتفہیم کے ذریعے معاملہ کو حل کیا جائے، کیونکہ زید تو فوت ہو چکا ہے، عدالتی چارہ جوئی سے فریقین کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جس نے قیمت ادا کر کے پلاٹ خریدا ہے اسے پلاٹ واپس کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال آزاد کشمیر سے ابوبکر لکھتے ہیں کہ ایک عورت مسماۃ رشیدہ خاتون فوت ہوگئی، پسماندگان میں سے اس کا شوہر جمیل، دو بیٹیاں جمیلہ اور حمیدہ، والد عبدالرشید اور والدہ رحمت خاتون موجود ہیں۔ پھر ایک ماہ بعد اس کی بیٹی جمیلہ بھی فوت ہوگئی، اب ان کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟ نیز مسماۃ رشیدہ جب بیمار ہوئی تو اس کا علاج والدین نے قرض لے کر کرایا، اس کے شوہر جمیل نے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات ادا کروں گا۔ لیکن وہ اب اپنے وعدے سے منحرف ہے، کیونکہ مسماۃ رشیدہ کی جائیداد سے شوہر کا

حصہ اس کی بیوی کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات کے عوض رکھا جا سکتا ہے، اس کا علاج مرحومہ کے والدین نے کروایا تھا کہ ہمیں اس کی جائیداد سے جو حصہ ملے گا وہ ہم کسی یتیم بچی کی شادی پر خرچ کر دیں گے اس کے شوہر نے بھی یہی کہا تھا کہ میں بھی اپنے حصہ کا سب کچھ اللہ کی راہ میں دیتا ہوں لیکن اب اس نے تمام ساز وسامان اپنے والدین کے گھر پہنچا دیا ہے، کیا اس سے اللہ کے ہاں اس عہد شکنی کا موخذاہ ہوگا۔؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب یہ دراصل تین سوالات ہیں۔ترتیب داران کا جواب حسب ذیل ہے:

① علم فرائض کی اصطلاح میں اس طرح کی تقسیم در تقسیم کو مناسخہ کہا جاتا ہے۔صورت مسئولہ میں دو دفعہ تقسیم کا عمل کرنا ہوگا۔ پہلے فوت ہونے والی مسماۃ رشیدہ کا ترکہ تقسیم ہوگا پھر اس کے بعد فوت ہونے والی اس کی بیٹی جمیلہ کو ملنے والا حصہ موجود ورثاء پر تقسیم کیا جائے گا۔

پہلی تقسیم کے مطابق خاوند جمیل کو 1/4 ، والد عبدالرشید کو 1/6 ، والدہ رحمت خاتون کو بھی 1/6 اور دونوں بیٹیوں کو 2/3 یعنی بیٹی جمیلہ کو 1/3 اور بیٹی حمیدہ کو بھی 1/3 ملے گا۔

دوسری تقسیم کے مطابق بیٹی جمیلہ کو ملنے والا حصہ 1/3 موجود ورثاء پر تقسیم ہوگا، جس کی صورت یہ ہے کہ جمیلہ کی نانی رحمت خاتون کو 1/3 کا 1/6 اور باقی اس کے باپ جمیل کو عصبہ ہونے کی حیثیت سے 1/3 کا 5/6 ملے گا، اس کی بہن حمیدہ اور نانا عبد الرشید کو اس دوسری تقسیم سے کچھ نہیں ملے گا اور انہیں محروم قرار دیا جائے گا، اب نانی رحمت خاتون کا 1/3 کا 1/6=1/18 ملتا ہے اسے اپنی رشیدہ کے ترکہ سے 1/6 ملا تھا۔لہٰذا اس کا مجموعی حصہ 1/6+1/18=4/18 ہے، اس طرح جمیل کو 1/3 کا 5/6=5/18 نیز اسے اپنی بیوی مسماۃ رشیدہ سے بھی 1/4 ملا تھا۔لہٰذا اس کا مجموعی حصہ 1/4+5/18=19/36 ہے۔اب موجودہ ورثاء کے حصوں کی نسبتیں حسب ذیل ہیں۔

جمیل	حمیدہ	عبدالرشید	رحمت خاتون
19/36	1/3	1/6	4/18
19	12	6	8

45/36

اب درج بالا تفصیل کے مطابق مرحومہ کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا حساب لگا کر اس کے 45 حصے کر لیے جائیں۔ان میں 19 جمیل کو 12 حمیدہ کو 6 عبدالرشید کو اور 8 رحمت خاتون کو دے دیے جائیں۔

② نکاح کے بعد بیوی کا نان ونفقہ اور دیگر اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔''عورتوں کا حق (مردوں پر) ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔'' [۲/البقرۃ:۲۲۸]

نیز حدیث میں خاوند کے ذمہ کھانا، لباس اور دیگر اخراجات ہیں، بیوی کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ جب بیوی بیمار ہو جائے تو اس کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات خاوند ادا کرے گا۔خاص طور پر صورت مسئولہ میں جب خاوند نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ میں اس پر اٹھنے والے اخراجات ادا کروں گا۔اگر وہ اس عہد وپیمان کے بعد اس کی ادائیگی میں پس وپیش کرتا ہے

تو والدین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کی بیوی کی جائیداد سے ملنے والا حصہ اخراجات کے بدلے رکھ لیں اور اسے کچھ نہ دیں بشرطیکہ اس کا حصہ اٹھنے والے اخراجات سے زائد نہ ہو، بیوی کے والدین ایسا کرنے سے عنداللہ ماخوذ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ اپنا حق لینے کے لیے مجبوراً یہ اقدام کررہے ہیں۔

③ والدین کی یہ سوچ بڑی دانشمندانہ ہے کہ ہم اپنی بچی سے ملنے والے حصہ کو کسی یتیم بچی کی شادی پر خرچ کردیں گے اور شوہر کا عہد کرنا بھی قابلِ تحسین تھا کہ وہ بھی اپنے حصے کی تمام رقم فی سبیل اللہ خرچ کردے گا لیکن یہ وعدہ کرنے کے بعد اس نے جو کردار ادا کیا ہے وہ انتہائی قابل مذمت اور لائق نفرت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اپنے وعدے کو پورا کرو، کیونکہ عہد کے متعلق ضرور پوچھا جائے گا۔'' [۱۷/بنی اسرآءیل:۳۴]

اس آیت کے پیش نظر خاوند نے جو عہد شکنی کا ارتکاب کیا ہے وہ عنداللہ قابل مواخذہ ہے۔ والدین کو چاہیے کہ وہ خاوند کی اس زیادتی پر صبر کریں اور اپنی بچی کے ایصال ثواب کے لیے حسب وعدہ اپنے پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے خاوند کی اس عہد شکنی کو آڑے نہ آنے دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی آخرت ثمر آور بنائے۔

سوال سمندری سے حاجی محمد رمضان لکھتے ہیں کہ ایک عورت جس کا خاوند فوت ہوچکا ہے اور اس کے بطن سے اس کی اولاد بھی ہے، بیوہ اپنے خاوند کی متروکہ جائیداد کی تقسیم سے پہلے ہی آگے نکاح کرلیتی ہے، کیا ایسی عورت کو پہلے خاوند کی جائیداد سے کچھ ملے گا یا اسے نکاح کرنے کی وجہ سے سابقہ خاوند کی جائیداد سے محروم ہونا پڑے گا؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ مذکورہ عورت اپنے خاوند کی جائیداد سے 1/8 لینے کا حق رکھتی ہے، کیونکہ خاوند کی اولاد بھی موجود ہے اور یہ حق اسے شریعت نے دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد ہو تو ان بیویوں کو آٹھواں حصہ دیا جائے اس جائیداد سے جو تم نے چھوڑی ہے۔'' [۴/النسآء:۱۲]

بیوہ کے لیے آگے نکاح کرلینا اس کا حق ہے اور یہ حق اس کے حق وراثت پر اثر انداز نہیں ہوتا وہ سوگواری کے ایام گزار کر آگے نکاح کرسکتی ہے۔ اگر اس دوران پہلے خاوند کی جائیداد تقسیم نہیں ہوئی تو الگ بات ہے لیکن اسے اپنے حصے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ یہ ایک جاہلانہ رسم ہے کہ اگر بیوی آگے نکاح کرے تو اسے پہلے خاوند کی جائیداد سے محروم کردیا جائے۔ شریعت میں اس قسم کی رسوم کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ واضح رہے کہ بیوی کو آٹھواں حصہ دینے کے بعد جو باقی جائیداد ہے اس کی حقدار مرحوم کی اولاد ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بدوملہی سے چوہدری بشیر احمد ملہی لکھتے ہیں کہ ایک آدمی صاحب جائیداد ہے، اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، خود میاں بیوی بھی موجود ہیں، وہ اپنی غیر منقولہ (زرعی رقبہ) جائیداد زندگی میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی وضاحت کریں کہ کتنا حصہ کس کو ملے گا، نیز ایک باپ اپنی اولاد کی لاپروائی اور آوارگی سے تنگ آکر روپوش ہوجائے تو کیا وہ عنداللہ مجرم ہوگا، جبکہ اپنے بچوں اور بیوی کو بار بار وارننگ دے چکا ہو۔

جواب زندگی میں کسی کو اجازت نہیں کہ وہ ضابطہ میراث کے مطابق اپنی جائیداد تقسیم کرے، کیونکہ وراثت اس حق کو کہا جاتا

ہے جو غیر اختیاری طور پر بلاعوض دوسروں کو منتقل ہو جائے، جبکہ زندگی میں تقسیم کرنے والا اپنے اختیار سے تقسیم کرتا ہے، نیز وراثت کے حقدار وہ ہوتے ہیں جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں، زندگی میں تقسیم کرنے کی صورت میں یہ اندیشہ بدستور قائم رہتا ہے کہ وراثت کا حق کسی ایسے شخص کو بھی مل جائے جو اس کی زندگی میں فوت ہو گیا ہو۔ لہٰذا ضابطہ میراث کے مطابق اپنی جائیداد تقسیم کرنا شرعاً درست نہیں ہے، ہاں وصیت کی جا سکتی ہے جو تیسرے حصہ سے زائد نہ ہو اور نہ ہی ایسے رشتہ دار کے لیے ہو جس کو وراثت سے حصہ ملنا ہے، اسی طرح بطور عطیہ بھی اپنی جائیداد اولاد کو دی جا سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ نرینہ و مادینہ اولاد کا لحاظ کیے بغیر برابر برابر عطیہ دیا جائے، یعنی لڑکوں اور لڑکیوں میں مساوات کی جائے، اس عطیہ کے پس منظر میں کسی کو جائیداد سے محروم کرنے کے جذبات بھی نہ ہوں، کسی کو حیلے بہانے سے اپنی جائیداد سے محروم کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

سوال کے دوسرے حصہ کا جواب یہ ہے کہ اپنے اہل خانہ کی لاپروائی سے تنگ آ کر روپوش ہو جانا بھی جائز نہیں کیونکہ حدیث میں ہے: ''کہ وہ مؤمن جو لوگوں سے میل ملاپ رکھتا ہے اور ان کی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے، اس مؤمن سے کہیں بہتر ہے جو لوگوں سے میل ملاپ نہیں رکھتا اور نہ ہی ان کی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے۔'' [مسند امام احمد: ۵/۳۶۵]

والد کو چاہیے کہ وہ اپنے اہل خانہ میں رہتے ہوئے انہیں وعظ و نصیحت کرتا رہے اور انہیں بے لگام نہ چھوڑے، اس کے روپوش ہو جانے سے ان کی آوارگی میں اور اضافہ ہو گا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے: ''اپنے اہل خانہ کو نماز کے متعلق کہتے رہو اور اس پر ہمیشگی کرو۔'' [۲۰/طٰہٰ:۱۳۲]

اگر گھر میں رہتے ہوئے خود اپنے ایمان کو خطرہ ہے یا اس کے بگڑنے کا اندیشہ ہے تو علیحدگی اختیار کی جا سکتی ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ مسلمان کا بہترین مال اس کی بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور بارش کے مقامات کی طرف نکل جائے گا، اور فتنوں سے راہ فرار اختیار کر کے اپنے دین کو بچا لے گا۔'' [صحیح بخاری: کتاب الایمان، ۱۹]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''گوشہ نشینی اختیار کرنے میں بری سوسائٹی سے آرام مل جاتا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الرقاق]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے دین کو بچانے کے لیے علیحدگی اختیار کرنا اچھا عمل ہے۔ اس کے باوجود اگر انسان میں فتنوں کا مقابلہ کرنے کی علمی، عملی اور اخلاقی ہمت ہے تو معاشرہ میں رہتے ہوئے ان کی روک تھام میں کوشاں رہنا افضل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے پرفتن دور میں پہلے مکہ مکرمہ میں اس کے بعد مدینہ منورہ میں اقامت اختیار فرمائی، لیکن اہل خانہ کو چھوڑ کر روپوش ہو جانا ایک ایسی پسپائی ہے جو ایک مرد کی مردانگی کے خلاف اور اس کی جرأت و ہمت کے منافی اقدام ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے تنگ آ کر گھر نہیں چھوڑا، لیکن جب والد نے جان سے مار دینے کی دھمکی دی اور گھر سے نکل جانے کو کہا تو پھر اپنے گھر کو خیر باد کہا۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا نافرمان تھے، جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے، لیکن حضرت نوح علیہ السلام ان سے تنگ آ کر روپوش نہیں ہوئے۔ ان حقائق کی روشنی میں ہم گھر کے سرپرست سے گزارش کریں گے کہ وہ ان سے تنگ آ کر روپوش ہونے کی بجائے انہیں وعظ و نصیحت کرتا رہے اور ان سے علیحدگی اختیار کر کے ان کی مزید آوارگی کا

باعث نہ بنے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال قصور سے عبدالحق لکھتے ہیں کہ وراثت کے متعلق چند ایک صورتیں حسب ذیل ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کا حل مطلوب ہے۔

① متوفیہ کی دادی، والدہ، بہن اور خاوند زندہ ہیں۔

② مرحوم کی بیوی، دو بھائی، ایک لڑکا اور چار لڑکیاں موجود ہیں۔

③ میت کی والدہ، چار بہنیں، دو لڑکیاں، دو چچا اور بیوی بقید حیات ہیں۔

جواب بشرط صحت سوالات واضح ہو کہ

① پہلی صورت میں دادی محروم ہے، اسے مرحومہ کی جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ والدہ زندہ ہے، فرائض کا قاعدہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور والے رشتہ دار محروم رہتے ہیں۔ میت سے والدہ کا رشتہ دادی کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے، والدہ کو کل جائیداد سے چھٹا حصہ ملے گا اور خاوند کو کل جائیداد سے نصف اور بہن کو بھی نصف ملے گا، اصل مسئلہ 6 سے ہونا تھا، لیکن ایسا کرنے سے حصص حقداروں سے کم رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا کل جائیداد سے سات حصے کر لیے جائیں، ان سے تین حصے بہن، تین حصے خاوند اور ایک حصہ والدہ کو مل جائے گا، حصوں کی تعداد بڑھانے کے عمل کو علم فرائض کی اصطلاح میں ''عول'' کہا جاتا ہے۔ وراثت کی بعض صورتوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ صورت مسئلہ یوں ہوگی:

میت:۔ 7/6=دادی : محروم(x)۔ والدہ : 1/6(1)۔ بہن : 1/2(3)۔ خاوند : 1/2(3) = (کل حصص:7)

② دوسری صورت میں دونوں بھائی محروم ہیں، کیونکہ اولاد زندہ ہے، اور اولاد کی موجودگی میں بھائی محروم رہتے ہیں۔ بیوی کو کل جائیداد سے آٹھواں حصہ دے کر باقی 7/8 کو اولاد میں اس طرح تقسیم کیا جائے: لڑکے کو لڑکی کے مقابلہ میں دوگناہ حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کو 48 حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان میں 1/8 یعنی چھ حصے بیوی کو دے دیئے جائیں، باقی 42 حصے اولاد میں اس طرح تقسیم کریں کہ ہر لڑکا چودہ چودہ اور لڑکی سات سات حصوں کی مالک بن جائے۔ صورت مسئلہ حسب ذیل ہے:

میت:۔ 48/8 = دو بھائی : محروم(x)۔ بیوی : 1/8(6)۔ لڑکا+چار لڑکیاں: (باقی جائیداد کے مالک) لڑکا : 14

چار لڑکیاں : 7+7+7+7= (کل حصص:48)

③ تیسری صورت میں دونوں چچا محروم ہیں، دو لڑکیاں دو تہائی (2/3) بیوی آٹھواں حصہ (1/8) والدہ چھٹا حصہ (1/6) اور بہنیں مقررہ حصہ لینے والوں سے بچا ہوا ترکہ لیں گی۔ کل جائیداد کو چوبیس حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، ان سے سولہ حصے (8+8) دونوں لڑکیوں کو دیئے جائیں، تین حصوں کی مالک بیوی ہے، اور چار حصے والدہ لے لے گی۔ ان حصص کو جمع کرنے سے ایک حصہ باقی بچے گا وہ بہنوں کو دے دیا جائے۔ صورت مسئلہ اس طرح ہے:

میت:۔ 24 = دو چچا : محروم(x)۔ دو لڑکیاں : 2/3(16)۔ والدہ : 1/16(4)۔ بیوی : 1/8(3)۔ چار بہنیں : عصبہ (1) = (کل حصص:24)

اختصار کے پیش نظر ان کے دلائل کو ذکر نہیں کیا گیا صرف صورت مسئلہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کویت سے شیخ عبدالخالق سوال کرتے ہیں کہ عبداللہ فوت ہوا، پسماندگان میں اسماء بیوی، ساجد، ماجد، خالد اور زاہد چار لڑکے۔ رشیدہ، حمیدہ دو لڑکیاں موجود ہیں، فوت ہونے والے کا کل ترکہ تیس لاکھ روپے ہے۔ تقسیم سے پہلے بیٹی رشیدہ اپنے انس نامی خاوند، اسماء والدہ اور اولاد کو سوگوار کر کے فوت ہوگئی، ابھی جائیداد تقسیم نہ ہوئی تھی کہ اسماء بھی اپنے چار بیٹوں اور ایک بیٹی کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملی۔ اب موجود ترکہ مبلغ تیس لاکھ روپے کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب ترکہ کی شرعی تقسیم سے پہلے اگر کوئی وارث ہو جائے تو ہر وارث کا حصہ اسلامی نکالنے کے لیے تقسیم در تقسیم کے عمل کو ''علم میراث'' میں ''مناسخہ'' کہا جاتا ہے۔ جو خاصہ پیچیدہ اور مشکل ہوتا ہے، تاہم اللہ کے فضل و کرم سے اس کا حل حسب ذیل ہے:

پہلی تقسیم: بیوی کا آٹھواں حصہ مبلغ 3,75,000 روپے ہے باقی ترکہ اس طرح اولاد میں تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگناہ ملے، چنانچہ فی لڑکا 5,25,000 روپے اور فی لڑکی 2,62,500 روپے دیا جائے گا۔

دوسری تقسیم: بیٹی رشیدہ جب فوت ہوئی تو وہ اپنے باپ کی جائیداد سے مبلغ 2,62,500 روپے کی حقدار بن چکی تھی، اب یہی ترکہ اس کی والدہ اسماء، اس کے خاوند انس اور اس کی اولاد میں تقسیم ہوگا۔ چنانچہ والدہ اسماء کو 43,750 روپے جو چھٹا حصہ ہے اور خاوند انس کو چوتھا حصہ مبلغ 65,625 روپے اور باقی اولاد کو ملے جو مبلغ 1,53,125 روپے ہے۔

تیسری تقسیم: اسماء کو اپنے خاوند سے مبلغ 3,75,000 روپے ملا تھا، پھر بیٹی رشیدہ سے مبلغ 43,750 روپے ملا، فوت ہوتے وقت اس کے پاس مجموعی رقم 4,18,750 روپے تھی، اب اس مبلغ کو چار بیٹوں اور ایک بیٹی میں اس طرح تقسیم کیا جائے گا کہ بیٹی کو ایک بیٹے کے مقابلہ میں نصف ملے، اس طرح بیٹی کو 46,527.77 روپے اور ہر ایک لڑکے کو مبلغ 93,055.55 روپے ملیں گے۔

اب ہر لڑکے کو باپ کے ترکہ سے مبلغ 5,25,000 روپے اور ماں کے ترکہ سے 93,055.55 روپے گویا ایک لڑکے کا مجموعی حصہ مبلغ 6,18,055.55 روپے، اس طرح لڑکی کو باپ کے ترکہ سے مبلغ 2,62,500 روپے اور ماں کے ترکہ سے مبلغ 46,527.77 روپے گویا اس کا مجموعی حصہ مبلغ 3,090,27.77 روپے ہے۔ ملنے والے حصص کی تفصیل یوں ہوگی:

ساجد: 6,18,055.55۔ ماجد: 6,18,055.55۔ زاہد: 6,18,055.55۔ حمیدہ: 3,09,027.77۔ انس 65,625۔ رشیدہ کی اولاد: 1,53,125۔

ان تمام حصص کا مجموعہ: 29,99,999.9 روپے ہے۔ جو مرحوم عبداللہ کا ترکہ ہے۔

نوٹ: رشیدہ کے حصہ سے اس کے بہن بھائی محروم ہیں کیونکہ اولاد موجود ہے، اسی طرح والدہ اسماء کے حصے سے داماد انس اور اس کے نواسوں اور نواسیوں کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ اس کی اولاد کی موجودگی میں ان کو کچھ نہیں ملتا ہے۔ نیز اس کا تعلق اولوالارحام سے ہے جو اصحاب الفرائض اور عصبات کی موجودگی میں محروم ہوتے ہیں۔

سوال مظفر گڑھ سے مظہر نواز سوال کرتے ہیں احمد بخش فوت ہوا پسماندگان میں سے اس کی بیوی مائی جیون، بیٹا اللہ بخش، دختر منظور مائی اور ایک اور بیٹی فیض الٰہی موجود تھے۔ پھر احمد بخش کا ترکہ تقسیم ہونے سے پہلے اس کا بیٹا اللہ بخش فوت ہو گیا اور وہ ایک لڑکا

فضل ربی عرف اللہ دتہ اور بیوی ہاجرہ چھوڑ گیا۔ بعد ازاں فیض الٰہی بھی فوت ہوگئی اور اس کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں بعد ازاں مائی جیون پھر فضل ربی عرف اللہ دتہ کا انتقال ہوگیا۔ قرآن وحدیث کے مطابق احمد بخش کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب علم میراث میں تقسیم در تقسیم کے معاملے کو مناسخہ کہا جاتا ہے اور یہ خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے تاہم اللہ کی توفیق سے اس کا حل پیش خدمت ہے۔

تقسیم اول: میت احمد بخش (ورثاء: بیوی مائی جیون، بیٹا اللہ بخش، بیٹی منظور مائی، بیٹی فیض الٰہی)

فرض کیا کہ کل جائیداد: بیوی مائی جیون کا حصہ 1/8 باقی 7/8 اس طرح تقسیم ہوگا کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگنا ملے لہٰذا:

اللہ بخش کا حصہ: 7/16، بیٹی منظور مائی کا حصہ 7/32، بیٹی فیض الٰہی کا حصہ 7/32۔

تقسیم ثانی: میت اللہ بخش (ورثاء: بیوی ہاجرہ، بیٹا فضل ربی، والدہ مائی جیون، بہن منظور مائی، بہن فیض الٰہی)

قابلِ تقسیم ترکہ 7/16: ہاجرہ بیوی کا حصہ 7/16 کا 1/8=7/128 والدہ مائی جیون کا حصہ 7/16 کا 1/6=7/96

باقی ماندہ ترکہ اس کے بیٹے فضل ربی کا ہے یعنی 7/16 کا 17/24=119/384 دونوں بہنیں منظور مائی اور فیض الٰہی محروم ہیں۔

تقسیم ثالث: میت فیض الٰہی (ورثاء: والدہ مائی جیون، اس کی اولاد، بہن منظور مائی اور بیٹا فیض الٰہی)

فیض الٰہی کا قابل تقسیم ترکہ: 7/32 کا 1/6=7/192 باقی اولاد کے لیے یعنی 7/32 کا 5/6=35/192

بہن منظور مائی اور بھتیجا (ورثاء: بیٹی منظور مائی اور پوتا فضل ربی عرف اللہ دتہ)

مائی جیون کا قابل تقسیم ترکہ (خاوند سے ملا 1/8 بیٹے سے ملا 7/96 بیٹی سے ملا 7/192) 45/192

بیٹی منظور مائی کا حصہ نصف یعنی 45/192 کا 1/2=45/384 باقی پوتے فضل ربی کا حصہ 45/192 کا 1/2: 45/84۔45

تقسیم خامس: میت فضل ربی عرف اللہ دتہ (ورثاء: پھوپھی منظور مائی...... پھوپھی زاد سات بہن بھائی۔)

قریبی رشتہ داروں سے صرف پھوپھی منظور مائی موجود ہے۔ تمام ترکہ اسے ملے گا پھوپھی زاد محروم ہیں۔

منظور مائی کا کل ورثہ (باپ سے ملا: 7/32 والدہ سے ملا 45/384 بھتیجا فضل ربی سے ملا 164/384) 293/384

حصہ لینے والے ورثاء: ہاجرہ زوجہ اللہ بخش 7/128 فیض الٰہی کی اولاد 35/192 منظور مائی 293/384

مساویانہ حصص: 7/128 ، 35/192 ، 293/384

293 ، 70 ، 21/384

ہاجرہ زوجہ اللہ بخش: 384 سے 21، فیض الٰہی کی اولاد: 384 سے 70 اور منظور مائی: 384 سے 293

نوٹ: فیض الٰہی کے تین لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں 70 حصص میں سے 14،14 فی لڑکا اور 7،7 فی لڑکی تقسیم کیے جائیں۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال لاہور سے مرزا عبدالمجید لکھتے ہیں کہ ایک متوفی کے ترکہ میں دیگر جائیداد کے علاوہ لاکھوں کے سیونگ سرٹیفکیٹس بھی

شامل ہیں اور اس نے ان کی رقم وصول کرنے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو قانونی طور پر نامزد کیا ہے، اب اس بیٹے کا دعویٰ یہ ہے کہ ان سرٹیفکیٹس کا صرف وہی مالک ہے دیگر ورثاء یعنی بہنوں وغیرہ کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہے، اندریں حالات واضح کریں کہ شرعی طور پر ان کی رقم صرف بیٹے کو ملے گی یا جملہ ورثاء میں تقسیم ہوگی۔

جواب واضح رہے کہ اس قسم کے سیونگ سرٹیفکیٹ حکومت کے ایک ادارہ نیشنل سیونگ سینٹر کی طرف سے جاری کیے جاتے ہیں جسے عرف عام میں مرکز قومی بچت کہا جاتا ہے، یہ ادارہ عوام الناس کے سامنے حالات کے مطابق بچت کی مختلف سکیمیں پیش کرتا ہے اور ان کے متعلق اپنے قواعد وضوابط جاری کرتا ہے جن میں ایک نامزدگی کا ضابطہ بھی ہے جو ہمارے معاشرہ میں باہمی منافرت کا باعث ہے، صورت مسئلہ میں بھی اسی الجھن کو پیش کیا گیا ہے، اس ضابطہ نامزدگی کی مختصر وضاحت کچھ یوں ہے کہ:

☆ مرکز قومی بچت کی کسی بھی بچت سکیم میں شمولیت کرنے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی وارث یا غیر وارث کو نامزد کرے جو حادثاتی یا طبعی موت کی صورت میں اس کی نمائندگی کرے۔

☆ نامزد کنندہ کسی نابالغ کو بھی نامزد کر سکتا ہے لیکن اس نابالغ نمائندہ کو اپنے حقوق نمائندگی استعمال کرنے کے لیے بالغ ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔

☆ ایک سے زیادہ نمائندہ گان کو بھی نامزد کیا جا سکتا ہے، پھر ان کے حصص بھی متعین کیے جا سکتے ہیں مثلاً: باپ تیس فیصد اور بیٹا پچاس فیصد وغیرہ۔

☆ مالیاتی ادارہ اپنے قواعد وضوابط کے مطابق اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ مرنے والے کے جملہ مالی حقوق صرف نامزد کردہ نمائندہ کے حوالے کرے، ان قواعد میں یہ وضاحت نہیں ہوتی ہے کہ وصول کرنے والا نمائندہ ان میں مالکانہ تصرف کا حق رکھتا ہے یا اسے صرف وصول کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

میت کے شرعی ورثاء کے لیے یہ ضابطہ نامزدگی بہت الجھاؤ اور پیچیدگی کا باعث تھا اس لیے دیگر مالیاتی اداروں (بینکوں) نے اس میں یہ ترمیم کی ہے کہ یہ نامزدگی صرف اس لیے ہے کہ اصل شخص کی بیماری یا عدم موجودگی کی صورت میں نامزد کردہ سے رابطہ کیا جا سکے نیز وفات کی صورت میں یہ نامزدگی خود بخود ختم ہو جاتی ہے، البتہ مرکز قومی بچت ابھی تک اپنے پہلے ضابطے پر قائم ہے کہ وفات کی صورت میں وہ جملہ مالی حقوق صرف اس کے نامزد کردہ کے حوالے کرے گا۔ بشرطیکہ وہ اصل شخص کی وفات کا مصدقہ سرٹیفکیٹ پیش کرے پھر وہ ان حقوق کے وصول کرنے کا اہل بھی ہو لیکن حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے اس میں یہ سہولت پیدا کر دی گئی ہے کہ اگر مرنے والے کے مالیاتی اثاثوں سے متعلق نامزد کردہ اور دیگر شرعی ورثاء کے درمیان کوئی الجھاؤ پیدا ہو جائے تو شرعی ورثاء عدالت کی طرف رجوع کریں پھر اگر وہ عدالت مجاز سے نامزد کردہ کے خلاف حکم امتناعی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو مرکز قومی بچت عدالت کی طرف سے حتمی فیصلہ آنے تک اس حکم امتناعی پر عمل کرنے کا پابند ہے بصورت دیگر وہ اپنے ضابطہ کے مطابق متوفی کے جملہ مالی حقوق نامزد کردہ کے حوالے کرنے کا مجاز ہے، صورت مسئولہ کی قانونی وضاحت کے بعد اب اس کی شرعی وضاحت پیش خدمت ہے:

نامزدگی کی دوصورتیں ممکن ہیں: ① قانونی ضرورت۔ ② مالکانہ حقوق۔

① قانونی ضرورت کا مطلب یہ ہے کہ نمائندہ کوصرف رقم وصول کرنے کے لیے نامزد کیا گیا ہے، اس سے زیادہ اسے کوئی اختیار نہیں ہے، اگر نامزد کردہ اس قانونی ضرورت سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو عدالتی چارہ جوئی سے اس کا سدباب ممکن ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

② مالکانہ تصرف کا مطلب یہ ہے کہ نمائندہ کوصرف رقم وصول کرنے کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے بحیثیت مالک کے نامزد کیا گیا ہے۔ وہ وصول کردہ رقم میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرے، یہ مالکانہ تصرف تین طرح سے ممکن ہے۔

☆ وراثت: یہ ایک غیر اختیاری انتقال ملکیت کا نام ہے جس کے ذریعے ایک متوفی کا ترکہ اس کے ورثاء کے حق میں بطریق جانشینی منتقل ہوجاتا ہے، اس میں متوفی کے ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن نامزدگی کی صورت میں ایک شخص اپنے دیگر حقیقی ورثاء کو نظر انداز کرکے صرف ایک وارث یا غیر وارث کو نامزد کردیا جاتا ہے۔ حالانکہ علم میراث کی اصطلاح میں چند ورثاء ایسے ہیں جنہیں کسی صورت میں بھی محروم نہیں کیا جاسکتا مثلاً: اَبَوَیْنِ (ماں، باپ) وَلَدَیْن (بیٹا، بیٹی) زوجین (خاوند، بیوی) لیکن مرنے والے نے اپنے تصرفات کو ناجائز استعمال کرتے ہوئے دیگر ورثاء کو محروم کرکے صرف ایک کو وارث و مالک بنا کر نامزد کیا ہے جو شرعاً ناجائز ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''جو شخص کسی وارث کے مقررہ حصہ کو ختم کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے جنت میں ملنے والے حصے سے محروم کردیں گے۔'' [شعب الایمان بیہقی: ۱۴/۱۱۵]

اس طرح کی ایک روایت ابن ماجہ (حدیث نمبر 2703) میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ناجائز نامزدگی قطع رحمی بھی ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حصص کو خود مقرر فرمایا ہے، کسی دوسرے کو ان میں ترمیم و اضافہ کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اگر کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ایسا کرتا ہے تو شرعی طور پر وہ کالعدم ہے جس کا کوئی اعتبار نہیں۔

☆ وصیت: زندگی میں وصیت کے ذریعے بھی کسی کو اپنی جائیداد کا وارث بنایا جاسکتا ہے، لیکن شریعت نے اس کا ایک ضابطہ مقرر کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ وصیت کسی وارث کے لیے نہ ہو، یعنی اگر شریعت کی رو سے اسے جائیداد سے حصہ ملتا ہے تو اس کے حق میں وصیت جائز نہیں۔ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ لہٰذا کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔'' [سنن ابی داؤد: کتاب الوصیۃ]

☆ وصیت کل جائیداد کے 1/3 سے زائد نہ ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: ''کہ تم اپنے مال سے زیادہ سے زیادہ 1/3 کی وصیت کرسکتے ہو اور یہ بھی بہت زیادہ ہے۔'' [صحیح بخاری]

اس حدیث کے مطابق اگر کوئی 1/3 سے زیادہ کی وصیت کرتا ہے تو یہ بھی کالعدم ہے۔

☆ وصیت کسی ناجائز کام کے لیے نہ ہو، اگر کوئی شخص غیر شرعی کام کی وصیت کرتا ہے یا اپنا مال کسی غیر شرعی کام میں لگانے کی وصیت کرتا ہے تو ایسی وصیت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ اس ضابطہ وصیت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اگر کسی نے وارث کے حق میں وصیت

کی ہے یا غیر وارث کے لیے 1/3 سے زیادہ کی وصیت ہے یا کسی ناجائز کام میں مال خرچ کرنے کی وصیت کی ہے تو اس کی اصلاح ضروری ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کی وصیت کر دینے سے ڈرے تو آپس میں اصلاح کرا دے ایسی صورت میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۲]

☆ عطیہ: عطیہ کے ذریعے بھی کسی دوسرے کو جائیداد دی جا سکتی ہے لیکن اس کا بھی قاعدہ ہے کہ اگر اولاد میں سے کسی کو عطیہ دینا ہو تو باقی اولاد کو بھی اتنا ہی دینا ہوگا، اس میں نر و مادہ کی تفریق بھی جائز نہیں ہے۔تمام بیٹوں اور بیٹیوں کو برابر برابر عطیہ دینا ہوگا، حدیث میں ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے لیے اس کے باپ نے کچھ عطیہ دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر گواہ بنانا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:''کہ باقی اولاد کو بھی اتنا دیا ہے۔''عرض کیا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''میں ایسے ظلم پر گواہی نہیں دیتا اپنی اولاد کے درمیان عدل کیا کرو۔'' [صحیح بخاری]

اس حدیث کی رو سے اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو عطیہ دینا ناجائز ہے۔

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ صورت مسئولہ میں اکلوتے بیٹے کے لیے والد کے متروکہ سیونگ سرٹیفکیٹس پر مالکانہ تصرف ناجائز اور غیر شرعی ہے کیونکہ وراثت، وصیت اور عطیہ ہر سہ صورتیں اس کے لیے درست نہیں ہیں لہٰذا اسے چاہیے کہ وہ ان کی رقم میں دوسرے شرعی ورثاء کو بھی شامل کرے، ان پر اس اکیلے کا حق قانونی اور شرعی طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا،

ضرورت تنبیہ:۔ مسئلہ کی وضاحت کے بعد ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ سیونگ سرٹیفکیٹس کی شرعی حیثیت بھی بیان کر دی جائے کیونکہ مال کی محبت انسان کو اکل حرام پر مجبور کر دیتی ہے جو اس کی اخروی بربادی کا باعث ہے، واضح رہے کہ مرکز قومی بچت دو قسم کے سیونگ سرٹیفکیٹس جاری کرنے کا مجاز ہے اور دونوں پر سود دیتا ہے۔

① سپیشل سیونگ سرٹیفکیٹ: اس کے ساتھ چھ عدد کوپن ہوتے ہیں اور ہر کوپن پر ایک متعین شرح کے مطابق سودی رقم کا اندراج ہوتا ہے جو اصل رقم سے زائد ہوتی ہے، صارف ہر ششماہی کے بعد وہ رقم وصول کرتا ہے، پہلے چار کوپن برابر رقم کے حامل ہوتے ہیں اور آخری دو کوپن پر زیادہ رقم لکھی ہوتی ہے تاکہ صارف کے لیے کشش باقی رہے۔

② ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ: اس کے ساتھ کوپن نہیں ہوتے بلکہ دس سالہ سکیم کے تحت اس کے ریٹ مقرر ہوتے ہیں آج کل ریٹ درج ذیل ہیں:

ایک لاکھ روپے مالیت کے سرٹیفکیٹ لینے پر:

☆ ماہانہ سود:.......-/792 روپے

☆ ششماہی سود:.......-/5150 روپے

☆ پانچ سالہ سود:.......-/149000 روپے

☆ دس سالہ سود:.......-/369000 روپے

یہ سود اصل رقم کے علاوہ ہے، دیکھا آپ نے کس قدر پرکشش پیشکش ہے کہ دس سال بعد 1 لاکھ روپے بھی محفوظ ہیں اور ان

پر 369% سود بھی دیا جا رہا ہے، جبکہ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم اہل ایمان ہو اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، اور اگر تم توبہ کر لو تو تم صرف اصل مال کے مالک ہو۔'' [۲/البقرۃ:۲۷۹]

نیز فرمایا: ''کہ جو شخص اپنے پاس آئی ہوئی اللہ کی نصیحت سن کر باز آ گیا اس کے لیے جو گزر چکا سو گزر چکا اور جو پھر دوبارہ اس حرام کی طرف لوٹا، وہ جہنمی ہے۔ ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' [۲/البقرۃ:۱۷۵]

اس لیے متوفی کے ورثاء کو ہم نصیحت کرتے ہیں کہ وہ ان سرٹیفکیٹس سے حاصل ہونے والی اصل رقم ہی وصول کریں اس پر ملنے والا سود آپ کا نہیں ہے اسے ہرگز وصول نہ کریں، یہ سود آپ کے دوسرے مال کو بھی خراب کر دے گا اگرچہ لوگ اسے ''منافع'' کا خوبصورت نام دیتے ہیں لیکن یہ سود ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال بدوملہی سے چوہدری بشیر احمد بشر ملہی سوال کرتے ہیں کہ ایک آدمی کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے جو مؤثر ہو چکی ہے عورت کے پاس ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے، آدمی نے انہیں حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کیا تو عدالت نے موجودہ صورتحال کو بحال رکھا ہے کہ آدمی، عورت سے بیٹی اور بیٹا نہیں لے سکتا، اب سوال یہ ہے کہ:

(الف) جو بیٹی اور بیٹا عورت کے پاس ہے ان کے اخراجات کس کے ذمے ہیں؟

(ب) بیٹی کے نکاح کے موقع پر باپ اس کی ولایت کا حق دار ہو گا یا نہیں؟

(ج) کیا بیٹی اور بیٹا والد کی جائیداد کے وارث بن سکتے ہیں؟ جبکہ عدالت نے بچی اور بچہ عورت کو دے دیا ہے۔

جواب شریعت اسلامیہ نے بچے کی پرورش کا حقدار ماں کو ٹھہرایا ہے، اس طرح چھوٹے بچوں کی پرورش کرنے کو شرعی اصطلاح میں حضانت کہا جاتا ہے والدہ کا یہ حق حضانت متعدد روایات سے ثابت ہے کیوں کہ بچے کے حق میں ماں انتہائی مہربان ہوتی ہے اور پرورش و نگرانی میں وہ مرد کی نسبت زیادہ قدرت رکھتی ہے چونکہ اولاد کی نسبت باپ کی طرف ہوتی ہے اور وہ ہی ان کا حق دار ہوتا ہے۔ اس لیے دوران حضانت، اٹھنے والے اخراجات کا ذمہ دار بھی وہی ہے، واضح رہے کہ ماں کو جو حق حضانت دیا گیا ہے اس کی کچھ حدود و قیود ہیں، مثلاً:

① بچے بلوغت تک ماں کے پاس رہ سکتے ہیں، اس کے بعد باپ انہیں واپس لینے کا قانونی اور شرعی حق رکھتا ہے۔

② اگر ماں آگے نکاح کر لیتی ہے تو بھی اس کا حق حضانت ختم ہو جاتا ہے، حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب تک وہ نکاح ثانی نہ کرے بچے کی پرورش کی حقدار ہے۔'' [مسند امام احمد:۱/۱۸۲]

③ اگر ماں کے پاس رہنے سے ان کی ذہنیت خراب ہونے کا اندیشہ ہو یا جسمانی پرورش صحیح طور پر نہ ہو سکتی ہو تو بھی باپ کو اپنی اولاد واپس لینے کا حق ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ اگر ماں کسی غیر محفوظ جگہ پر رہائش رکھے ہوئے ہے یا اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے تو باپ کو اپنی اولاد واپس لینے کا حق ہے۔'' [فتاویٰ ابن تیمیہ:۳۴/۱۳۱]

صورت مسئولہ میں اگر باپ نے عدالت کے فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے اور وہ اپنی اولاد کو واپس لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس پر اولاد

ی پرورش کے اخراجات نہیں ڈالے جائیں گے۔ کیونکہ وہ انہیں واپس لینے کے حق سے دستبردار ہو چکا ہے، اگر وہ بلوغ کے بعد انہیں واپس لینا چاہتا ہے تو ان پر اٹھنے والے اخراجات کا پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

(ب) اگر والد مستقل طور پر بچی اپنی مطلقہ بیوی کے حوالے کر چکا ہے اور آیندہ لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تو وہ حق ولایت سے محروم ہے، شادی کے موقع پر کسی بھی ہمدرد اور عقلمند رشتہ دار کو ولی مقرر کیا جا سکتا ہے، ماں کو حق ولایت کسی صورت میں نہیں مل سکتا، اگر رشتہ داروں میں کوئی اس قابل نہ ہو تو محلے کے دانا اور عقلمند آدمی پنچایتی طور پر حق ولایت کو نبھائیں۔

(ج) وہ اولاد جو مستقل طور پر باپ اپنی مطلقہ بیوی کو دے چکا ہے وہ باپ کی وراثت سے محروم نہیں ہوگی، وراثت سے محرومی کے اسباب شریعت نے مقرر فرمائے ہیں کہ اولاد مرتد ہو جائے، یا باپ کو قتل کر دے تو حق وراثت سے خود بخود محروم ہو جاتی ہے، صورت مسئولہ میں کوئی ایسا سبب موجود نہیں جس کی بنا پر اسے باپ کی جائیداد سے محروم کیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال علی پور سے مختاراں مائی لکھتی ہیں کہ مجھے باپ کی طرف سے 6-ایکڑ زمین ملی تھی، میں نے اسے فروخت کر کے کچھ رقم فریضہ حج کے لیے رکھ لی ہے اور کچھ رقم اپنے تین بے روزگار بیٹوں کو دینا چاہتی ہوں، اب مجھے بتایا جائے کہ مجھے یہ رقم تمام بیٹوں میں مساویانہ تقسیم کرنی چاہیے یا اسے تقسیم کرنے میں مجھے اختیار ہے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں خود مختار بنا کر بھیجا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ مال و جائیداد بھی اللہ کی ایک نعمت ہے اس میں بھی شرعی حدود کا خیال رکھتے ہوئے جائز تصرف کرنے کی اجازت ہے۔ اس بنا پر اپنی کسی ضرورت کے لیے اسے فروخت بھی کیا جا سکتا ہے اور کسی کو اس کی ضرورت کے پیش نظر کچھ حصہ دیا بھی جا سکتا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''ہر صاحب جائیداد اپنی جائیداد میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے، وہ جسے چاہے استعمال کر سکتا ہے۔'' [سنن بیہقی: ۱۷۸/۶]

البتہ اس تصرف کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے:

☆ یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کے لیے نہ ہو۔

☆ جائز تصرف کرتے وقت کسی وارث کو محروم کرنا مقصود نہ ہو۔

☆ اگر یہ تصرف بطور ہبہ اولاد کے لیے ہے تو نرینہ اور مادینہ اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے۔

☆ اگر یہ تصرف بطور وصیت عمل میں آئے تو کل جائیداد کے 1/3 سے زائد نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی یہ وصیت کسی شرعی وارث کے لیے ہو۔

شرائط بالا کو سامنے رکھتے ہوئے والدین اپنی جائیداد کو ضروریات کے لیے فروخت بھی کر سکتے ہیں اور ضرورت مند اولاد کو بھی دے سکتے ہیں، البتہ بطور عطیہ اگر اولاد کو کچھ دینا چاہیں تو اس میں لڑکی اور لڑکے کی تمیز کیے بغیر تمام سے مساویانہ برتاؤ کرنا ہوگا، جیسا کہ حدیث میں اس مسئلہ کو بڑی تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر سائلہ نے اپنی جائیداد فروخت کر کے کچھ رقم حج کی ادائیگی کے لیے رکھ لی ہے تو وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے۔ اس طرح اگر اسی نے کچھ رقم اپنے بے روزگار بچوں کو

دی ہے۔ تاکہ وہ باعزت طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ اس کا یہ اقدام بھی درست ہے۔ البتہ برسر روزگار اولاد کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے تاکہ باہمی نفرت و کدورت کی فضا پیدا نہ ہو۔ انہیں بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیا جائے تاکہ ماں کی اولاد کے متعلق محبت پر کوئی آنچ نہ آئے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ہارون آباد سے عبدالرشید لکھتے ہیں کہ عباد اللہ لاولد فوت ہوا، پسماندگان میں سے صرف ایک پدری بھائی اور بیوہ بقید حیات ہیں، شریعت کے مطابق متوفی کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب شریعت اسلامیہ کی رو سے اگر فوت ہونے والا لاولد ہے تو اس کی جائیداد سے چوتھا حصہ اس کی بیوی کا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد نہ ہو تو تمہاری عورتوں کا تمہارے ترکہ سے چوتھا حصہ ہے۔''

بیوہ کو مقرر حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے گا وہ پدری بھائی کو مل جائے گا۔ فرمان نبوی ﷺ ہے: ''مقررہ حصے حقداروں کو دینے کے بعد جو باقی بچے وہ میت کے اس قریبی رشتہ دار کے لیے ہے جو مذکر ہو۔'' [صحیح بخاری: کتاب الفرائض حدیث نمبر ۶۷۳]

صورت مسئولہ میں قریبی رشتہ دار پدری بھائی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا بیوہ کو 1/4 دینے کے بعد 3/4 باقی بچتا ہے۔ وہ متوفی کے پدری بھائی کا حصہ ہے۔ اس بنا پر متوفی کی کل جائیداد کو چار حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ (جو کل جائیداد کا 1/4 ہے) بیوہ کو دے دیا جائے۔ اور باقی 3 حصے (جو کل جائیداد کا 3/4 ہے) اس کے پدری بھائی کا حق ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ضیاء الرحمٰن گوہر میانوالی (خریداری نمبر ۱۵۴۰) لکھتے ہیں کہ میرے والد کی دو بیویاں تھیں، ایک سے تین لڑکے اور ایک لڑکی، جبکہ دوسری سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ بڑا بیٹا باپ کی زندگی میں فوت ہو گیا، اس کے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں بقید حیات ہیں، گویا میرے والد جب فوت ہوئے تو ان کے تین لڑکے، تین لڑکیاں اور پانچ پوتے اور دو پوتیاں موجود تھیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرے والد کی جائیداد کیسے تقسیم ہوگی، نیز بڑے بھائی کی اولاد کو اس سے حصہ ملے گا یا نہیں، جبکہ ہمارے ملک میں رائج الوقت عائلی قوانین کی رو سے دادا کی جائیداد سے مرحوم بیٹے کی اولاد کو حصہ ملتا ہے، اس کے متعلق فتویٰ درکار ہے۔

جواب مرنے والا مرتے وقت جس منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کا مالک تھا اسے بقدر حصہ شرعی ورثاء میں تقسیم کر دینا چاہیے۔ ہمارے ہاں یہ غلط مشہور ہو چکا ہے کہ صرف موروثی جائیداد ہی ورثاء میں تقسیم ہوتی ہے اور جو انسان نے خود کمائی ہو یا کسی طرف سے بطور ہدیہ ملی ہو اسے قابل تقسیم خیال نہیں کیا جاتا، بلکہ اگر زندگی میں کسی جائیداد کا سبب قائم ہو چکا ہو اور جائیداد مرنے کے بعد ملے وہ بھی ورثاء میں قابل تقسیم ہے اس تمہیدی گفتگو کے بعد چونکہ والد کا بڑا بیٹا والد کی زندگی میں فوت ہوا ہے اس لیے اولاد کی موجودگی میں اس کی جائیداد سے والد کو چھٹا حصہ ملتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے اس کے چھوڑے ہوئے مال کا چھٹا حصہ ہے، بشرطیکہ مرنے والے کی اولاد ہو۔'' [۴/النساء:۱۱]

صورت مسئولہ میں بڑے بیٹے کی اولاد موجود ہے، لہٰذا والد کو اس کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے چھٹا حصہ دیا جائے گا، والد کی اپنی ذاتی جائیداد اور بڑے بیٹے کی طرف سے ملنے والا چھٹا حصہ دونوں کو ملا کر ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ چونکہ شرعی ورثاء میں تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں اس لیے جائیداد کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ لڑکے کو لڑکی سے دوگناہ حصہ ملے۔ ارشاد باری تعالیٰ

ہے: ''اللہ تعالیٰ نے تمہاری اولاد کے متعلق فیصلہ کیا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔'' [۴/النساء:۱۱]

سہولت کے پیش نظر مرحوم کی منقولہ اور غیر منقولہ اور موروثی وغیر موروثی جائیداد کے نو حصے کر لیے جائیں۔ دو، دو حصے تمام لڑکوں کو اور ایک، ایک حصہ سب لڑکیوں میں تقسیم کر دیا جائے، اس کی تفصیلی تقسیم محکمہ مال کی ذمہ داری ہے۔

مرحوم کی جائیداد سے یتیم پوتوں اور پوتیوں کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ شریعت کا ضابطہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم رہتے ہیں، پوتوں اور پوتیوں کی نسبت بیٹے اور بیٹیاں زیادہ قریب ہیں، لہٰذا حقیقی اولاد کی موجودگی میں بیٹے کی اولاد محروم رہتی ہے۔ ہاں یتیم پوتوں کو وصیت کے ذریعہ کچھ دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وصیت کسی صورت میں ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو، اگر دیگر ورثاء انہیں وصیت کے بغیر کچھ دینے پر راضی ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، رائج الوقت عائلی قوانین کے سہارے دادا کی جائیداد سے حصہ لینا یا اس کا مطالبہ کرنا شرعاً جائز نہیں، اگر ایسا کیا تو دوسروں کا حق غصب کرنے کے مترادف ہے۔

سوال محمد ابراہیم بذریعہ ای میل پوچھتے ہیں کہ میری ایک مادری بہن فوت ہوگئی اور وہ لاولد تھی، اس کے ورثاء میں ہم دو بھائی اور اس کے چچازاد بھائی زندہ ہیں، متوفیہ کا ترکہ کیسے تقسیم ہوگا؟

جواب اسلامی ضابطہ میراث کے مطابق اگر مرنے والا لاولد ہو تو اس کی جائیداد میں سے مادری بہن بھائی متعدد ہونے کی صورت میں ایک تہائی کے حقدار ہیں اور اس حصے کو میت کے بہن بھائی برابر تقسیم کریں گے۔ جیسا کہ [۴/النساء:۱۲] میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ پھر یہ مقررہ لینے والوں سے جو باقی بچے گا وہ میت کے ان قریبی رشتہ داروں کے لیے ہے جو مذکر ہو، اس کی وضاحت صحیح بخاری میں حدیث نمبر 6732 میں ہے۔ سہولت کے پیش نظر متوفیہ کی جائیداد کو چھ حصوں میں تقسیم کر لیا جائے۔ دو حصے دونوں بھائیوں کو جو ماں کی طرف سے ہیں اور وہ آپس میں ایک ایک حصہ بانٹ لیں گے۔ اور باقی چار حصے چچازاد بھائیوں کو مل جائیں گے۔ کیونکہ مقررہ حصہ لینے والوں کے بعد چچازاد بھائیوں کے علاوہ اور کوئی قریبی مذکر رشتہ دار نہیں ہے۔ جسے باقی حصہ دیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال جیمس آباد خانیوال سے میاں ممتاز احمد لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی زندگی میں اپنے بیٹے کو نقدی اور مشینری وغیرہ بطور عطیہ بقیہ اولاد کی نسبت زیادہ دے جاتا ہے اب کیا اس کی بقیہ اولاد عطیہ نقدی اور مشینری وغیرہ سے بطور وراثت حصہ وصول کر سکتے ہیں جبکہ وہ شخص خود فوت ہو چکا ہے۔

جواب اولاد کو عطیہ دینے کے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''کہ اگر کوئی اپنی اولاد میں سے کسی کو عطیہ دیتا ہے، دوسرے کو کچھ نہیں دیتا یہ جائز نہیں۔ اسے چاہیے کہ اولاد کے معاملہ میں عدل وانصاف کرے دوسرے کو بھی اتنا ہی دے۔'' یہ ہدایت کرنے کے بعد حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے بیٹے کو ایک غلام بطور عطیہ دیا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تاکہ آپ کو اس پر گواہ بناؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ کیا سب بیٹوں کو اس طرح کا عطیہ دیا ہے؟'' عرض کیا: نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان مساوات کرو گویا آپ نے اس عطیہ کو مسترد کر دیا۔'' [صحیح بخاری: کتاب الھبہ]

اس سے معلوم ہوا کہ باپ کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بیٹے کو عطیہ دے اور کسی کو نہ دے بلکہ عطیہ کے متعلق بیٹے اور بیٹی کی تفریق بھی درست نہیں ہے تمام اولاد کو برابر برابر عطیہ دینا چاہیے۔ صورت مسئولہ میں متوفی نے جو ایک بیٹے کو نقدی اور مشینری دوسری اولاد کی نسبت زیادہ دی ہے، اس کا یہ فعل ناجائز اور غیر شرعی ہے اب اس کا حل یہ ہے:

① اس سے عطیہ واپس لیا جائے اور اسے مال متروکہ میں شامل کر کے تمام ورثاء اسے بقدر حصہ تقسیم کر لیں تاکہ کسی حق دار کی حق تلفی نہ ہو۔

② جس قدر نقدی اور مشینری ایک بیٹے کو دوسروں کی نسبت زیادہ ملی ہے اتنی نقدی اور مشینری بقیہ اولاد میں سے ہر ایک اس کے متروکہ مال سے لے کر بقیہ مال کو بطور وراثت تقسیم کر لیں کیونکہ قرآن مجید میں ناجائز وصیت کرنے کے متعلق فرمایا ہے کہ ''ہاں اگر کوئی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانبداری یا حق تلفی کا خطرہ محسوس کرے تو اسے چاہیے کہ وہ رشتہ داروں کے درمیان صلح کروا دے، ایسا کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۲]

مرنے والے کے غلط اقدام کی اصلاح کی جا سکتی ہے بلکہ اخروی معاملات اور حقوق العباد کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال شجاع آباد سے مختار احمد لکھتے ہیں کہ ایک عورت نے فوت ہونے سے کچھ عرصہ قبل مبلغ پچاس ہزار روپے کسی کے پاس بطور امانت رکھے اور وصیت کی کہ اس رقم میں سے مبلغ بیس ہزار روپے میرے چھوٹے بیٹے کو دے دینا تاکہ اس کے ہاں رہنے سہنے، کھانے پینے اور میری دیکھ بھال کرنے کا احسان مجھ پر نہ رہے۔ باقی تم کسی مسجد یا مدرسے کو بطور صدقہ جاریہ دے دینا جبکہ اس کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں زندہ ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس رقم کو کیسے تقسیم کیا جائے؟ نیز جو رقم مسجد یا مدرسہ کے لیے مختص ہے اس سے کچھ حصہ متوفیہ کی پوتی کو دیا جا سکتا ہے؟

جواب واضح رہے کہ اسلامی ضابطہ وصیت کے مطابق اپنے وارث کو وصیت نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنا درست ہے۔ اسی طرح کسی ناجائز کام کے لیے وصیت کرنا بھی جائز نہیں، صورت مسئولہ میں تین باتیں ناجائز ہیں:

① اپنے بیٹے کے لیے وصیت کی گئی ہے جبکہ وہ اس کا شرعی وارث ہے۔

② ایک تہائی سے زائد وصیت کی گئی ہے۔

③ دوسرے ورثاء کو محروم کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق اس قسم کی وصیت نافذ العمل نہیں ہو سکتی جب تک اس کی اصلاح نہ کر دی جائے اس کا حل یہ ہے کہ مبلغ پچاس ہزار میں سے ایک تہائی نکال کر باقی رقم اس کی اولاد میں تقسیم کر دی جائے قانون وراثت کے مطابق باقی رقم کے پندرہ حصے بنا کر دو حصے فی لڑکا اور ایک حصہ فی لڑکی کے حساب سے بقیہ رقم تقسیم ہو گی، شرعی وصیت کے مطابق ایک تہائی رقم مسجد یا مدرسہ کو ہی دی جائے اگر ورثاء رضامند ہوں تو اپنے حصوں سے یتیم پوتی کا تعاون کریں مسجد یا مدرسہ کی رقم سے غریب پوتی کو دینا درست نہیں ہے۔ نیز جو کچھ اس نے کھایا پیا ہے وہ بیٹے کا ماں پر احسان نہیں جس کا بدلہ رقم کی صورت میں دیا جانا ضروری ہو بلکہ یہ اس

کی ذمہ داری تھی جو اس نے ادا کی ہے اگر چہ یہ ذمے داری دوسرے بیٹوں پر بھی عائد ہوتی تھی جس کی ادائیگی میں انہوں نے کوتاہی کی ہے واضح رہے کہ یہ تمام معاملات وہی شخص سرانجام دے گا جس کے پاس رقم بطور امانت پڑی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال قصور سے محمد یحییٰ لکھتے ہیں کہ ایک شخص فوت ہونے سے قبل بیماری کی حالت میں وصیت کرتا ہے کہ میری کل جائیداد مسجد کو وقف کردی جائے، جبکہ اس کی حقیقی بہن، حقیقی چچا، حقیقی پھوپھی اور چچازاد بہن بھائی موجود ہیں، قرآن وحدیث کی رو سے کیا یہ وصیت جائز ہے؟ اگر جائز نہیں ہے تو ورثاء میں مذکورہ جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟

جواب واضح رہے کہ دین اسلام میں وصیت کے متعلق ضابطہ حسب ذیل ہے:

① وصیت کرنے والا صحت وتندرستی میں وصیت کرے، مرض الموت میں کی ہوئی وصیت کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

② شرعی وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جاسکتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت کے ذریعے مقررہ حصوں میں کمی بیشی یا کسی وارث سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔

③ زیادہ سے زیادہ کل جائیداد سے ایک تہائی (1/3) کی وصیت کرنے کی اجازت ہے۔

صورت مسئولہ میں اگر وصیت مرض الموت میں کی گئی ہے تو سرے سے کالعدم ہے، اسے نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وصیت مرض الموت کے وقت نہ تھی بلکہ عام بیماری کی حالت میں کی گئی تو اس صورت میں بھی صرف ایک تہائی (1/3) کی وصیت قابل اجراء ہوگی، تمام جائیداد کی وصیت کسی صورت میں جائز نہیں ہے، قرآن کریم نے اس قسم کی ناروا وصیت کو درست کرنے پر زور دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرف داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں اصلاح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔'' [۲/البقرہ:۱۸۲]

اس بنا پر اگر وصیت مرض الموت سے پہلے ہوئی تو جسے اجراء وصیت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اسے چاہیے کہ رضا کارانہ طور پر مسجد کے لیے ایک تہائی (1/3) نکال کر باقی جائیداد متوفی کے شرعی ورثاء کے حوالے کر کے خود سبکدوش ہو جائے تاکہ ایسا کرنے سے متوفی کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے بصورت دیگر متوفی اور وصیت کا ذمہ دار ورثاء کی حق تلفی کے جواب دہ ہوں گے۔ حدیث میں ہے: ''کہ اگر کوئی شرعی وارث کو اس کے حق وراثت سے محروم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت کو ختم کردیں گے۔'' [شعب الایمان:۱۴/۱۱۵]

اب وصیت کالعدم ہونے کی صورت میں نصف جائیداد کی حق دار اس کی حقیقی ہمشیرہ اور باقی نصف اس کے حقیقی چچا کو مل جائے گی اور وصیت کے اجراء کی صورت میں جائیداد کے تین حصے کرلیے جائیں ایک حصہ مسجد کو، ایک حقیقی بہن کو اور ایک حصہ حقیقی چچا کو مل جائے گا، دیگر ورثاء یعنی پھوپھی اور چچازاد بہن بھائی شرعاً محروم ہیں، کیونکہ چچا کی موجودگی میں چچازاد محروم ہوتے ہیں۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال تحصیل دینہ سے چوہدری محمد غیاث خریداری نمبر 6117 لکھتے ہیں کہ اگر والدین اپنی اولاد کو کسی جائیداد کے متعلق وصیت کر جائیں اور اس میں بے انصافی اور حق تلفی کی گئی ہو، اولاد نافرمانی سے بچنے کے لیے اسے قبول کرلے تو کیا جن بچوں پر

زیادتی ہوئی ہے وہ بذریعہ عدالت یا پنچائت اس کی تلافی کا مطالبہ کرسکتے ہیں قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

جواب ہمارے ہاں عام طور پر وصیت کے متعلق افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے۔اس سلسلہ میں بیشتر اوقات یہ کوتاہی دیکھنے میں آتی ہے کہ جو چیزیں وصیت کے قابل ہوتی ہیں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ ایک مسلمان کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی قابل وصیت کام کے متعلق وصیت کرنا چاہتا ہو پھر دو رات بھی اس کے بغیر گزار دے یعنی اس کے پاس ہر وقت وصیت لکھی ہونا چاہیے۔'' [صحیح بخاری:الوصیۃ'۲۷۳۸]

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر وقت اپنی تحریری وصیت اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔اور وصیت کے متعلق افراط بایں طور کیا جاتا ہے کہ جن ورثاء کے لیے وصیت ناجائز ہوتی ہے۔ان کے لیے وصیت کا بندوبست کر دیا جاتا ہے یا جن کے لیے وصیت کرنا جائز ہے ان کے لیے شریعت کی قائم کردہ حد سے زیادہ وصیت کر دی جاتی ہے یا پھر وصیت بے انصافی اور ظلم پر مبنی ہوتی ہے۔پھر لواحقین اس قسم کی ظلم پر مبنی وصیت کو ایسی پختہ لکیر خیال کرتے ہیں جسے مٹانا یا اس میں ترمیم کرنا ان کے ہاں کبیرہ گناہ ہے۔حالانکہ اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ رکھتا ہو اگر وہ آپس میں ان کی اصلاح کر دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' [۲/البقرۃ:۱۸۲]

خود رسول اللہ ﷺ نے بعض غلط وصایا کی اصلاح فرمائی ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک انصاری کی کل جائیداد چھ غلام تھے۔اس نے وصیت کے ذریعہ انہیں آزاد کر دیا۔اس کے مرنے اور کفن و دفن کے بعد اس کے ورثاء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حقیقت حال سے آپ کو آگاہ کیا تو آپ نے مرنے والے کو سخت برا بھلا کہا پھر اس کی وصیت کو کالعدم کرتے ہوئے ان چھ غلاموں کے متعلق قرعہ اندازی کی چھ کا ایک تہائی یعنی دو غلام آزاد کر دیئے اور باقی چار ورثاء کے حوالے فرما کر ان کے نقصان کی تلافی کر دی۔ [صحیح مسلم:الایمان'۱۶۶۸]

دیگر روایات میں اس کے متعلق قول شدید کی وضاحت بھی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اگر ہمیں اس کی حرکت کا پہلے علم ہوتا تو ہم اس کی نماز جنازہ نہ پڑھتے۔'' [مسند امام احمد:ج۴'ص۴۴۳]

بلکہ ایک روایت میں ہے: ''کہ ہم اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرتے۔'' [سنن ابی داود:العتق'۳۹۵۸]

ان احادیث کے پیش نظر ہمیں وصیت کے معاملہ میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔صورت مسئولہ میں وصیت کے متعلق جو کوتاہی کی گئی ہے لواحقین کو چاہیے کہ پنچائتی سطح پر اس کی اصلاح کی جائے،تاکہ مرحوم کو اخروی باز پرس سے نجات ملے۔ناجائز وصیت کی اصلاح کرنا ضروری ہے اور یہ قرآن کریم کا ایک اہم ضابطہ ہے جس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

سوال ڈھاکے سے حافظ انوار لکھتے ہیں کہ میرے ماموں 1996ء میں فوت ہوئے۔اس وقت تین بیٹیاں،تین حقیقی بہنیں، بیوی اور بھتیجے بھتیجیاں موجود تھے مرحوم نے اپنی تمام جائیداد زندگی میں ہی اپنی بیٹیوں کے نام لگوادی تھی۔پسماندگان کو مرحوم کی جائیداد سے کیا حصہ ملتا ہے، نیز ان کا بیٹیوں کے نام جائیداد لگوانا صحیح اقدام ہے۔؟

جواب زندگی میں اپنے ورثاء کو نظر انداز کر کے کسی ایک وارث کے نام جائیداد لگوا دینا درست نہیں ہے۔حدیث میں ہے: ''کہ

جو کسی کی وراثت کو ختم کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت کو ختم کر دیں گے۔'' [شعب الایمان، امام بیہقی: ۱۴/۱۱۵]

اس حدیث کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا کہ اس کے بیان کردہ ضابطہ وراثت کی خلاف ورزی کر کے صرف ایک وارث کے نام اپنی تمام جائیداد لگوا دے، بیٹیوں کو چاہیے کہ وہ محکمہ مال کے ہاں پیش ہو کر اپنے نام جائیداد کے انتقال کو ختم کرائیں پھر مندرجہ ذیل وضاحت کے مطابق ازسرِ نو تقسیم کریں۔ چونکہ متوفی کی اولاد موجود ہے، اس لیے بیوی کو تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے آٹھواں حصہ ملے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اگر تمہاری اولاد ہے تو بیویوں کو تمہارے مال متروکہ میں سے آٹھواں حصہ ملے گا۔'' [۴/النسآء: ۱۲]

بیٹیوں کو متوفی کی جائیداد سے دو تہائی ملتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو انہیں ترکہ کی دو تہائی ملتی ہے۔'' [۴/النسآء: ۱۱]

بہنیں، بیٹیوں کی موجودگی میں عصبہ بن جاتی ہیں اور انہیں مقررہ حصہ لینے والوں سے بچا ہوا حصہ ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ ہے کہ آپ نے بیٹی کو نصف، پوتی کو چھٹا اور باقی ایک تہائی بہن کو دیا۔ [صحیح بخاری: ۶۷۴۲]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس فیصلہ پر بایں طور پر عنوان بندی کی ہے: ''بیٹیوں کے ساتھ بہنوں کی وراثت بطور عصبہ ہے۔''

بہنیں، بھائی کی طرح ہیں، لہٰذا ان کی موجودگی میں بھتیجے، بھتیجیاں محروم ہیں، کل جائیداد کے چوبیس حصے کیے جائیں، جن میں سولہ تین بیٹیوں کو تین بیوی کو اور باقی پانچ تین بہنوں کو دے دیے جائیں۔

سہولت کے پیش نظر جائیداد کو 72 حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ان سے سولہ، سولہ حصے فی لڑکی، نو حصے بیوی اور پانچ پانچ حصے فی بہن دے دیے جائیں۔ یعنی اڑتالیس حصے بیٹیوں کے، نو حصے بیوی کے اور پندرہ حصے بہنوں کے ہوں گے، بھتیجے اور بھتیجیاں متوفی کی جائیداد سے محروم ہیں، اسی طرح متوفی کو بھی اخروی نجات مل سکتی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کسی نامعلوم شخص نے سوال بھیجا ہے کہ ہم تین بھائیوں نے اپنے والد محترم کے ساتھ مل کر ایک قطعہ زمین خریدا تھا، ہمارا چوتھا بھائی عرصہ سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے اور اس نے مذکورہ زمین کی خریداری میں کوئی پائی پیسہ بھی نہیں دیا تھا۔ وہ بھی اس قطعہ زمین سے حصہ لینے کا دعویدار ہے۔ وفات کے بعد شرعی طور پر اس زمین میں اس کا کتنا حصہ بنتا ہے۔ نیز ہماری دو بہنوں اور والدہ کا حصہ بھی بتا دیں۔

جواب باپ کے پاس رہنے والی اولاد کی کمائی باپ کی ہی شمار ہوتی ہے۔ الا یہ کہ اولاد کا الگ حق ملکیت تسلیم کر لیا جائے۔ صورت مسؤلہ میں قطعہ زمین خریدتے وقت تینوں بیٹے باپ کے ساتھ شراکت کے طور پر حصہ دار بنے ہیں۔ یعنی ان کا الگ حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر اگر باپ کو ضرورت ہو تو وہ قطعہ زمین اپنے لیے رکھ سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ''تو اور تیرا مال باپ کے لیے ہے'' لیکن باپ کی طرف سے اس قسم کی ضرورت کا اظہار کیے بغیر بھائی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس حدیث کی آڑ میں پورے قطعہ زمین میں سے اپنا حق لینے کا دعویٰ کرے۔ وہ صرف اتنے حصے میں شریک ہوگا جو باپ کا حصہ

رسدی ہے۔ مثلاً اگر زمین خریدتے وقت باپ کا چوتھا حصہ تھا تو اس کا وہ بیٹا جو زمین خریدنے میں شریک نہیں ہوا صرف باپ کے چوتھے حصے میں دوسرے ورثاء کے ساتھ شریک ہوگا۔ اب باپ کی وفات کے بعد پسماندگان میں اس کی بیوہ، دو بیٹیاں، اور چار بیٹے ہیں۔ اس لیے باپ کی کل جائیداد سے بیوہ کو 1/8 اور باقی 7/8 بیٹے اور بیٹیاں اس طرح تقسیم کریں کہ ایک بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ ملے۔ سہولت کے پیش نظر متوفی کی کل جائیداد کے 80 حصے کر لیے جائیں ان میں آٹھواں حصہ یعنی 10 حصے بیوہ کو دیئے جائیں اور باقی 70 حصوں کو چودہ حصے فی لڑکا اور سات حصے فی لڑکی کے حساب سے تقسیم کر دیئے جائیں۔

متوفی: 80= بیوہ 10 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکا 14 لڑکی 7 لڑکی 7

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال کیلیانوالہ ضلع گوجرانوالہ سید نور حسین دریافت کرتے ہیں ایک آدمی فوت ہوگیا، اس کے پسماندگان میں دو بیٹیاں اور دو بھائی اور ایک بہن ہے اس کی وراثت سے ورثاء کو کتنا کتنا حصہ ملے گا؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں دونوں بیٹیوں کو 2/3 ملے گا باقی 1/3 بہن بھائی اس طرح تقسیم کریں گے کہ ایک بھائی کو بہن سے دوگنا ملے ارشاد ربانی ہے۔ ''اگر اولاد میت لڑکیاں ہی ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ تو کل ترکہ میں سے ان کا دو تہائی ہے۔'' [۴/النسآء:۱۱]

بہن بھائیوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور اگر بھائی اور بہن یعنی مرد اور عورتیں ملے جلے وارث ہوں تو مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصے کے برابر ہے۔''

[۴/النسآء:۱۷۶]

سہولت کے پیش نظر کل منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کے پندرہ حصے کر لیے جائیں 2/3 یعنی دس حصے دونوں بیٹیوں کو اور باقی میں سے دو، دو حصے دونوں بھائیوں کو اور ایک حصہ بہن کو دے دیا جائے۔ وهو الموفق للصواب.

میت 15/3

دو بیٹیاں	دو بھائی	ایک بہن
10(5+5)	2+2	1

سوال پیراں غائب سے حافظ عبدالرحمٰن سوال کرتے ہیں کہ اخبارات میں جو عاق نامہ دیا جاتا ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا والد کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے نافرمان بیٹے کو وراثت سے محروم کر سکے؟

جواب انسان کے مرنے کے بعد اس کی جائیداد کو تقسیم کرنے کا طریقہ کار خود اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے۔ اس میں کسی کو ترمیم و اضافہ کا حق نہیں ہے جو حضرات قانون وراثت کو پامال کرتے ہوئے آئے دن اخبارات میں اپنی اولاد میں سے کسی کے متعلق ''عاق نامہ'' کے اشتہارات دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑے خوفناک عذاب کی دھمکی دی ہے ہمارے معاشرے میں کہیں تو عورتوں کو وراثت سے مستقل طور پر محروم کر دیا جاتا ہے اور کہیں دوسرے بچوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف بڑے لڑکے کو ہی وراثت کا حق دار

ٹھہرایا جاتا ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کے وضع کردہ ضابطہ میراث کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ وہ مال تھوڑا یا بہت ہو اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔'' [۴/النسآء:۷]

اس آیت کے پیش نظر کسی وارث کو بلا وجہ شرعی وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ماہرین وراثت نے ان وجوہات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جو وراثت سے محرومی کا باعث ہیں۔ عام طور پر اس کی دو اقسام ہیں۔ پہلی قسم میں وہ موانع شامل ہیں جو فی نفسہٖ وراثت سے محرومی کا باعث بنتے ہیں، ان میں غلامی، قتل ناحق اور اختلاف ملت یعنی کفر وارتداد وغیرہ ہیں۔ دوسری قسم میں وہ موانع ہیں جو فی نفسہٖ تو رکاوٹ کا باعث نہیں البتہ بالتبع محرومی کا ذریعہ ہوتے ہیں، ان میں وارث اور مورث کا اشتباہ برسر فہرست ہے جیسے ایک ساتھ غرق ہونے والے، آگ میں جل کر اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں، اگر ان کے درمیان وراثت کا رشتہ قائم ہو تو ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے۔ بشرطیکہ پتہ نہ چل سکے کہ ان میں پہلے اور بعد کون فوت ہوا ہے۔ احادیث میں بھی اس کی وضاحت ملتی ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جو کسی کی وراثت کو ختم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کی ہے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی وراثت کو ختم کر دیں گے۔'' [شعب الایمان للبیہقی:ص۱۴/۱۱۵]

اس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اپنے وارث کو حصہ دینے سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا حصہ جنت سے ختم کر دیں گے۔'' [ابن ماجہ: کتاب الوصایا]

اگرچہ مؤخر الذکر روایت میں ایک راوی زید العمی ضعیف ہے تاہم اس قسم کی روایت بطور تائید پیش کی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر بیٹا نافرمان ہے تو وہ اپنی سزا اللہ کے ہاں پائے گا۔ لیکن والد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اسے جائیداد سے محروم کر دے، بعض لوگ محض ڈرانے کے لیے ایسا کرتے ہیں لیکن ایسا کرنا بھی کئی ایک قباحتوں کا پیش خیمہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا رائج الوقت ''عاق نامہ'' کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

سوال فیصل آباد سے محمد دین لکھتے ہیں ہماری ایک عزیزہ فوت ہو گئی ہے، اس کی تین لڑکیاں اور چچا کی اولاد (لڑکے اور لڑکیاں) موجود ہے۔ متوفیہ کی جائیداد سے کس کو کتنا حصہ ملے گا۔؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں مرحومہ کی جائیداد سے دو تہائی کی حقدار اس کی بیٹیاں ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اگر اولاد صرف لڑکیاں ہوں (یعنی دو یا) دو سے زیادہ تو کل ترکہ میں ان کا 2/3 ہے۔ [۴/النسآء:۱۱]

لڑکیوں کو ان کا حصہ دینے کے بعد جو ایک تہائی 1/3 باقی ہے اس کی حقدار چچا کی نرینہ اولاد ہے حدیث میں ہے: ''کہ مقررہ حصہ لینے والے ورثاء سے جو ترکہ بچ جائے وہ میت کے قریبی مذکر رشتہ داروں کے لیے ہے۔'' [صحیح بخاری: الفرائض ۶۷۳۲]

سوال میں ذکر کردہ ورثاء میں چچا کی نرینہ اولاد ہی مذکر قریبی رشتہ دار ہے لہٰذا بیٹیوں کو دینے کے بعد جو ترکہ باقی بچتا ہے وہ انہیں دیا جائے۔ سہولت کے پیش نظر میت کی کل منقولہ جائیداد کے نو حصے کر لیے جائیں، ان میں دو، دو حصے تینوں بیٹیوں کو اور باقی تین حصے چچا کی نرینہ اولاد کے لیے ہیں، چچا کی مادینہ اولاد یعنی لڑکیوں کو اس سے کچھ نہیں ملے گا۔

واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں ضابطہ وراثت اس وقت جاری ہوگا جب میت کی تجہیز و تکفین اور دفن کے اخراجات نیز قرض کی ادائیگی ہو جائے اور اگر کوئی وصیت وغیرہ ہے تو اسے بھی کل جائیداد کے 1/3 سے پورا کر دیا جائے، صورت مسئلہ بایں طور ہے۔

میت/9

چچازاد مادینہ اولاد	چچازاد نرینہ اولاد	بیٹی	بیٹی	بیٹی
محروم	3	2	2	2

سوال ایک آدمی فوت ہوا جس کی شادی نہیں ہوئی تھی، اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں ہے، صرف ایک سوتیلی والدہ زندہ ہے اور تین پدری بہنیں بقید حیات ہیں، اس کی جائیداد تقسیم کیسے ہوگی۔ (مقبول حسین، بہاولپور)

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ کلالہ کی ہے، اس کی سوتیلی ماں جائیداد سے محروم ہے، کیوں کہ اس کا فوت ہونے والے کے ساتھ کوئی نسبی رشتہ نہیں ہے، البتہ پدری بہنیں اس کی شرعی وارث ہیں قرآن کریم نے اس قسم کی بہنوں کا حصہ متعین کیا ہے، ذوی الفروض ہونے کی حیثیت سے انہیں ۲/۳ ملتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اگر دو بہنیں ہیں تو انہیں میت کی جائیداد سے دو تہائی ملے گا'' [۴/النسآء:۱۷۶]

دو سے زائد بہنوں کا بھی یہی حکم ہے۔ صورت مسئولہ میں تینوں بہنوں کو کل جائیداد سے دو تہائی ذوی الفروض کی حیثیت سے ملے گا اور باقی ایک تہائی بھی انہی پر رد کر دیا جائے گا کیوں کہ اور کوئی وارث موجود نہیں ہے سہولت کے پیش نظر کل جائیداد کے ۳ حصے کر لیے جائیں پھر ہر ایک بہن کو ایک ایک حصہ دے دیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال جدہ سے کسی سائل نے ایک طویل سوال بذریعہ ای میل ارسال کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ میں اپنی زندگی میں ان تمام کی شادیاں کر کے ان کے حقوق سے فارغ ہو چکا ہوں، اب بڑے لڑکے نے میرے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی ہے، میری بیوی بھی اس گستاخ اور نافرمان بیٹے کی ہم نوا ہے اور میری خدمت سے انکاری ہے، چھوٹا بیٹا میرے ساتھ ہے، میرے پاس کچھ جائیداد باقی ہے، بچیاں اپنی خوشی سے میرے چھوٹے بیٹے کے حق میں دستبردار ہو چکی ہیں، اب میں اپنے نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کرنا چاہتا ہوں کیا میں شرعاً ایسا کر سکتا ہوں نیز ان حالات میں جبکہ میری بیوی نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے کیا میں اسے طلاق دے سکتا ہوں، مجھے قیامت کے دن مواخذہ تو نہیں ہوگا، کتاب وسنت کی روشنی میں میری راہنمائی فرمائیں۔

جواب واضح ہو کہ بلاشبہ اولاد کا والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا اور ان کا گستاخ و نافرمان ہونا کبیرہ گناہ ہے۔ حدیث کے مطابق قیامت کے دن اس قسم کے نافرمان اور گستاخ بچے اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت سے محروم ہوں گے اور انہیں کسی بھی صورت میں پاکیزہ قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ انہیں اس جرم کی پاداش میں اللہ کے ہاں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن ان حالات کے باوجود والد کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی جائیداد سے محض نافرمان اور گستاخ ہونے کی وجہ سے کسی کو محروم کر دے، جائیداد سے محرومی کے اسباب شریعت نے متعین کر دیے ہیں مثلاً کفر، قتل، ارتداد وغیرہ، ان میں اولاد کا نافرمان یا

گستاخ ہونا کوئی ایسا سبب نہیں ہے جسے بنیاد بنا کر اسے اپنی جائیداد سے محروم کیا جا سکے۔ قرآن کریم نے "﴿یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فِیٓ اَوۡلَادِکُمۡ﴾" فرما کر ہر قسم کی اولاد کو ضابطہ میراث میں شامل کیا ہے۔ البتہ جو اولاد نص قطعی سے اس ضابطہ سے متصادم ہوگی اسے خارج قرار دیا جائے گا، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ ضابطہ میراث بیان کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "(ضابطہ میراث پر عمل کیا جائے) جبکہ وصیت جو کر دی گئی ہے اسے پورا کیا جائے اور قرض جو میت کے ذمے ہے اس کی بھی ادائیگی کر دی جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔" [۴/النسآء:۱۲]

اس مقام پر مفسرین نے لکھا ہے کہ وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں یا کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود اصل حقداروں کو محروم کرنا ہو، حدیث میں ہے: "کہ کسی کو بلاوجہ اپنی جائیداد سے محروم کرنا اس قدر سنگین جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ملنے والے حصے سے محروم کر دیں گے۔" (بیہقی)۔ اس بنا پر نافرمانی اور گستاخی جیسے انتہائی سنگین جرم کے باوجود اولاد کو اپنی جائیداد سے محروم نہیں کیا جا سکتا، ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے اپنے کسی بچے کو ایک غلام عطیہ کے طور پر دیا، اس پر رسول اللہ ﷺ کو گواہ بنانا چاہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "تو نے سب بچوں کو ایک ایک غلام دیا ہے۔" صحابی نے عرض کیا کہ نہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لو۔" [صحیح بخاری: الھبۃ ۲۵۸۷]

بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اپنی اولاد کے درمیان مساوات کیا کرو۔" [بیہقی: کتاب الھبات]

اگرچہ بعض علما نے یہ گنجائش نکالی ہے کہ باپ، اولاد کے مخصوص حالات کے پیش نظر تقسیم میں تفاوت کر سکتا ہے مثلاً ایک لڑکا معذور، اپاہج یا بیمار ہے یا وہ طلب علم میں مصروف ہے، لیکن انہوں نے ایسے حالات میں بھی دوسرے بھائیوں کی رضا مندی کو ضروری قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "کہ باپ کوئی ایسا اقدام نہ کرے جو بھائیوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کا باعث ہو اور وہ اس کے کسی اقدام سے اس کی نافرمانی کا باعث بنیں۔" صورت مسئولہ میں بھی حالات کچھ اس قسم کے ہیں، خرابی کی اصل وجہ یہی ہے کہ والد بڑے لڑکے کو محروم کرنا چاہتا ہے اگر اس نے بڑے لڑکے کو کلیۃً محروم کر دیا تو اس سے مزید بگاڑ ہوگا، ممکن ہے کہ یہ بگاڑ چھوٹے بیٹے اور خود باپ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جائے، حالات کا تقاضا یہی ہے کہ باپ فرمانبردار اور نافرمان کی تمیز کیے بغیر اپنی اولاد میں مساوات قائم رکھے، شاید ایسا کرنے سے نفرت وکدورت کی آگ بھسم ہو جائے اور باپ کی طرف سے عدل وانصاف پر مبنی فراخ دلی آپس میں دلوں کے ملا دینے کا باعث ہو، ممکن ہے کہ اس انصاف پسندی کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کوئی اتفاق کی صورت پیدا کر دے۔

سوال کا دوسرا حصہ نافرمان بیوی کو طلاق دینے سے متعلق ہے، ہمارے نزدیک ایسے معاملات میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ طلاق دینا اگرچہ مباح ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ناپسندیدہ عمل بھی ہے۔ اگر حالات ایسے ہوں کہ نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے خاوند کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی نافرمان بیوی کو طلاق دے کر اپنی زوجیت سے الگ کر دے تاکہ اسے ذہنی کوفت سے نجات مل جائے، عین ممکن ہے کہ بیوی اس لیے خدمت سے راہ فرار اختیار کر چکی ہو کہ وہ اولاد کے درمیان مساوات اور برابری

دیکھنا چاہتی ہو لیکن خاوند گستاخ اور نافرمان اولاد کو محروم کر دینے پر تلا ہوا ہو، امید ہے کہ اولاد کے درمیان برابری کی تقسیم کرنے پر بیوی بھی فرمانبردار اور خدمت گزار بن جائے، بہرحال ہمیں اولاد کے معاملہ میں اپنے رویے پر نظر ثانی کرنا ہوگی اور اس سلسلہ میں روا رکھی جانے والی زیادتی اور ناہمواری کو ختم کرنا ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ڈیرہ غازیخاں سے محمد صدیق لکھتے ہیں کہ میرے مندرجہ ذیل چار سوالات ہیں براہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیا جائے۔

☆ میری اولاد تین لڑکوں اور تین لڑکیوں پر مشتمل ہے۔ میری زرعی جائیداد 140 ایکڑ ہے جسے میرا ایک بیٹا کاشت کرتا ہے جس کی محنت اور کارکردگی سے ہمارا سارا کنبہ مستفید ہو رہا ہے، میں نے اپنی بیوی اور اولاد کی تحریری رضامندی سے اس کاشت کار بیٹے کے نام حق الخدمت کے طور پر اپنی اراضی سے تین ایکڑ لگوا دیئے ہیں باقی زمین مشترکہ ہے کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے۔؟

☆ میرا بڑا بیٹا شادی کے بعد گھر سے الگ ہو گیا، اس نے الگ ہونے کے بعد اپنی کمائی سے کچھ جائیداد خریدی ہے باقی دونوں بیٹوں نے بھی جو میرے ساتھ ہیں اپنی کمائی سے اپنے نام گاؤں میں زرعی اراضی خریدی ہے، بڑا بیٹا ہمیں اپنی کمائی سے کچھ نہیں دیتا بلکہ بے ادب گستاخ ہے اور وہ دونوں بیٹوں کی خرید کردہ اراضی سے حصہ مانگتا ہے کیا وہ اس قسم کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے۔

☆ میری زرعی اراضی کی ہر قسم کی پیداوار سے بڑے لڑکے کو ہر سال اس کا حصہ دیا جاتا ہے لیکن اس کا مطالبہ ہے کہ جائیداد کو تقسیم کر کے اس کا حصہ دیا جائے جبکہ میرے ذمے ایک لڑکے کی شادی کے علاوہ اور بہت سے گھریلو کام ہیں، بڑا لڑکا ویسے بھی ہمارے گھر آنے میں عار محسوس کرتا ہے کیا زندگی میں ایسے نافرمان لڑکے کو اس کا حصہ دینا درست ہے یا وہ میرے مرنے کے بعد اپنا حصہ وصول کرے گا؟

جواب ترتیب وار جواب حسب ذیل ہیں۔

☆ آدمی جب تک زندہ ہے اسے شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے مال وجائیداد میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق ہے لیکن اس تصرف میں اولاد کے درمیان برابری اور مساوات ضروری ہے صورت مسئولہ میں باپ نے جو اپنے کاشت کار بیٹے کو تین ایکڑ دیئے ہیں یہ بطور حق الخدمت عطیہ کی شکل ہے چونکہ تمام ورثاء نے اپنی رضامندی سے بلا جبر واکراہ اس تصرف کو قبول کیا ہے اور اسے برقرار رکھتے ہوئے اپنے دستخط ثبت کیے ہیں اس بنا پر شرعاً کوئی قباحت نہیں اور یہ جائز ہے البتہ کاشت کار بیٹے کو یہ عطیہ ملنے کے بعد باقی مشترکہ زمین سے بھی بطور وراثت حصہ ملے گا ایسا کرنے سے اس کا وراثتی حصہ ختم نہیں ہوگا بشرطیکہ باپ کی وفات کے وقت وہ زندہ ہو۔

☆ الگ ہونے والے لڑکے نے اپنی کمائی سے جو جائیداد بنائی ہے وہ اس کا حق ہے اور باقی دونوں لڑکوں نے جو زرعی اراضی خریدی ہے یہ ان کا حق ہے، لہٰذا طمع اور لالچ کے پیش نظر ایک دوسرے کے حق پر ڈاکہ ڈالنا شرعاً درست نہیں ہے، باپ کی زرعی اراضی سے جو حصہ اسے مل رہا ہے وہ اس کی بے ادبی اور گستاخی کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا اور نہ ہی دونوں بیٹوں کی کمائی سے خرید کردہ زرعی اراضی سے حصہ لینے کا مطالبہ کرنا اس کے لیے جائز ہے کیوں کہ یہ ان کی اپنی کمائی سے خرید کردہ ہے اور وہ باپ کی ملکیت

نہیں ہے۔

☆ بڑے بیٹے کا اپنے والد کو مجبور کرنا کہ اپنی زندگی میں مجھے میرا حصہ دیا جائے، درست نہیں کیوں کہ وراثت کا اجراء مرنے کے بعد ہوتا ہے، اپنی زندگی میں جو کسی کو کچھ دیا جاتا ہے وہ عطیہ ہے جس میں بیٹے اور بیٹیاں مساویانہ طور پر حقدار ہوتے ہیں۔ باپ کو زندگی میں مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی جائیداد خود ورثاء میں تقسیم کر دے۔ خاص طور پر جبکہ باپ کی بے شمار ضروریات زندگی اور دیگر حقوق کی ادائیگی اس کے ذمے باقی ہے ہاں اگر والد اپنی مرضی سے کچھ دینا چاہے تو مساوات کے ساتھ دے سکتا ہے لیکن اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اس کی وفات کے بعد اولاد کو ان کا حصہ شرعی مل ہی جائے گا۔ [واللہ اعلم]

سوال منڈی یزمان سے عبدالشکور پوچھتے ہیں کہ لڑکی کے فوت ہونے کی صورت میں والدین اس کا جہیز واپس لے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب شرعی حدود میں رہتے ہوئے جو والدین اپنی بچی کو جہیز دیتے ہیں وہ لڑکی کی ملکیت ہوتا ہے اس کے مرنے کے بعد اس کا ترکہ بن جائے گا۔ جسے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ والدین کو صرف اپنا حصہ لینے کی اجازت ہے، ان کے حصے کا تعین دیگر ورثاء کے تعین کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اگر اس کا خاوند اور اولاد موجود ہیں تو ان کا حصہ بھی اس جہیز سے نکالا جائے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور دیگر رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے''۔

[۴/النسآء:۷]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں یا غیر منقولہ، زرعی ہوں یا صنعتی یا کسی اور صنف مال میں شمار ہوتے ہوں۔

سوال گوجرانوالہ سے فاخرہ سوال کرتی ہیں کہ ایک عورت فوت ہوئی۔ پسماندگان میں دو چچا اور نانا، نانی زندہ ہیں۔ چونکہ یہ غیر شادی شدہ تھی اس لیے کوئی اولاد وغیرہ نہیں ہے۔ مرحومہ کے ننھیال چاہتے ہیں کہ جو زمین ان کی طرف سے مرحومہ کی والدہ کو ملی تھی پھر ماں کی وفات کے بعد مرحومہ کو منتقل ہوگئی۔ وہ واپس انہی کو مل جائے کیا ننھیال کا یہ مطالبہ درست ہے اگر نہیں تو ورثاء میں مرحومہ کے ترکہ کو کیسے تقسیم کیا جائے؟

جواب انسان کی موت کے وقت جو کچھ جائز طور پر اس کی ملک میں ہو مرنے کے بعد وہ ترکہ کہلاتا ہے خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، اسی طرح وہ چیزیں بھی اس کے ترکہ میں شامل ہوں گی جس کا سبب ملک اس کی زندگی میں قائم ہو چکا تھا۔

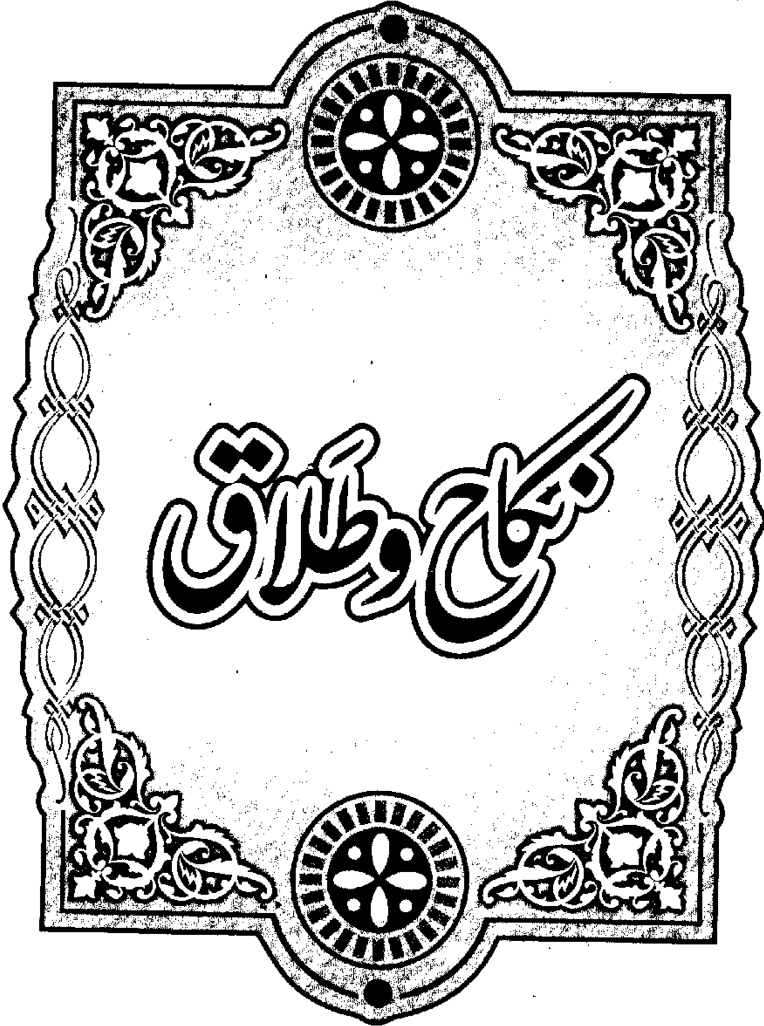
صورت مسئولہ میں مرحومہ کو ماں کی طرف سے جو کچھ ملا تھا وہ اس کا ترکہ شمار ہوگا۔ ننھیال کو واپس لینے یا اس کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ شرعی طور پر اس کے حق دار دونوں چچا اور نانی اماں ہیں۔ ان شرعی حق داروں کی موجودگی میں نانا محروم ہے، اسے اپنی نواسی کے ترکہ سے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اس کا تعلق اولوالارحام سے ہے، حقداروں میں شرعی تقسیم یوں ہوگی کہ نانی کو کل جائیداد کا 1/6 یعنی چھٹا حصہ دیا جائے گا باقی 5/6 جائیداد کے حقدار مرحومہ کے دونوں چچا ہیں۔ جس کی صورت یہ ہوگی

کہ اس کی جائیداد کے کل بارہ حصے کر لیے جائیں جن میں چھٹا یعنی دو حصے نانی اور باقی دس حصے دونوں چچا آپس میں پانچ پانچ حصے تقسیم کر لیں۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نانی کو چھٹا حصہ دیا تھا اور یہ بھی ارشادِ نبوی ﷺ ہے: ''کہ مقررہ حصہ لینے والوں کے بعد جو ترکہ بچ جائے وہ میت کے مذکر رشتہ داروں کو دیا جائے جو میت سے قریبی تعلق رکھنے والے ہوں۔'' اور وہ چچا ہیں۔

[واللہ اعلم بالصواب]




نکاح وطلاق

نکاح وطلاق

سوال قلعہ دیدار سنگھ سے خالد محمود نتوی دریافت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح کتنی عمر میں ہوا تھا، حدیث کا حوالہ ضرور دیں؟

جواب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح چھ سال کی عمر میں ہوا تھا اور جب آپ کی رخصتی عمل میں آئی تو اس وقت آپ کی عمر نو سال تھی جیسا کہ وہ خود فرماتی ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھ سے نکاح کیا تو میری عمر چھ سال تھی اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔'' [صحیح بخاری: حدیث ۵۱۳۴]

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے بھی یہ روایت ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نو سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں رہیں۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۵۱۵۸]

سوال محمد علی بدین سندھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ایک لڑکی کا بچپن میں نکاح ہوا جوان ہونے کے بعد لڑکی اس نکاح کو تسلیم نہیں کرتی کیا ایسے حالات میں اس نکاح کو فسخ قرار دے کر دوسری جگہ نکاح کیا جا سکتا ہے؟

جواب واضح رہے کہ بچپن کا نکاح شرعاً جائز اور صحیح ہے صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح صغر سنی میں ہوا تھا البتہ نابالغ بچی کو بلوغ کے بعد برقرار رکھنے یا رد کر دینے کا اختیار ہے چونکہ دور حاضر میں اس اختیار کو غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس لیے درج ذیل شرائط کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کے والدین یا اس کا سرپرست اپنی برادری کی مجبوری یا باہمی ناچاقی کی وجہ سے اپنی لڑکی کو وہاں بسانا نہیں چاہتے۔ جہاں بچپن میں اس کا نکاح ہوا تھا لیکن وہ اپنی عزت کو بھی داغدار نہیں کرنا چاہتے اس بنا پر وہ اپنی لڑکی کو ''خیار بلوغ'' کا سبق پڑھا دیتے ہیں اگرچہ لڑکی وہاں رضامندی ہی کیوں نہ ہو، اس حیلے کے سدباب کے لیے ہم کہتے ہیں کہ خیار بلوغ عرصہ دراز تک قائم نہیں رہتا بلکہ اگر کوئی نابالغ بچی اپنے سرپرست کے کئے ہوئے نکاح کو ناپسند سمجھتی ہے تو اسے چاہیے کہ سن تمیز وشعور کے بعد اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دے اگر پہلے سے اسے علم نہ تھا جب بھی بالغ ہونے کے بعد اسے علم ہو تو فوراً اپنے خیار بلوغ کو استعمال کرتے ہوئے اپنی رائے کو ظاہر کر دے بصورت دیگر طرفین کی خاموشی سے رضامندی ہی سمجھی جائے گی اور خیار بلوغ ساقط ہو جائے گی۔

② صرف خیار بلوغ کے استعمال سے نکاح فسخ نہیں ہوگا بلکہ اس سلسلہ میں عدالت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے اگر عدالت تک رسائی نہ ہو تو سرکردہ آدمیوں پر مشتمل پنچایت میں اپنا معاملہ پیش کر دیا جائے جب تک اپنی ناپسندیدگی کے اظہار کے بعد عدالت یا پنچایت فیصلہ نہ کرے نکاح فسخ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کے حق کو لازم کرنے اور فریق ثانی کو اس کے حق سے محروم کر دینے کا اختیار صرف عدالت کو ہے صورت مسئولہ میں اگر نابالغہ نے سن شعور وتمیز کو پہنچتے ہی اظہار ناگواری کر دیا ہے تو عدالت یا پنچایت کے فیصلے کے بعد مناسب جگہ پر اس کا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال مظفر گڑھ سے عمر فاروق دریافت کرتے ہیں کہ بچی کی شادی کب کرنا چاہیے ہم نے سنا ہے کہ اگر بروقت شادی نہ کی جائے تو جتنے مخصوص ایام اپنے والد کے گھر گزارے گی اتنے ہی قتل ناحق والد کے نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے۔

جواب جب بچی بالغ ہو جائے تو مناسب رشتہ ملنے پر اس کا نکاح کر دینا چاہیے اس کے متعلق دانستہ طور پر تاخیر کرنا شرعاً درست نہیں، رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا: ''کہ تین چیزوں کے متعلق دیر نہ کرنا۔

① جب نماز کا وقت ہو جائے تو اس کی ادائیگی کا فکر ہونا چاہیے۔

② جب جنازہ تیار ہو جائے تو اس میں بھی دیر نہیں لگانا چاہیے۔

③ جب بچی کا ہم پلہ مل جائے تو اس کے نکاح میں لیت ولعل نہیں کرنا چاہیے۔'' [ترمذی]

نیز حدیث میں ہے: ''کہ جب رشتہ کے متعلق تم سے کوئی ایسا آدمی رابطہ کرتا ہے جس کا دین اور اخلاق تمہیں پسند ہے تو اپنی بچی کا اس سے نکاح کر دو اگر ایسا نہیں کرو گے تو بہت بڑا فساد اور عظیم فتنہ برپا ہو گا۔'' [ترمذی]

ان احادیث کے پیش نظر کوئی بھی باعزت سرپرست اپنی جوان بچی کو گھر بٹھانا گوارا نہیں کرتا بعض اوقات حالات اجازت نہیں دیتے یا مناسب رشتہ نہیں ملتا یا مالی طور پر کچھ کمزوری ہوتی ہے ایسے حالات میں اگر تاخیر ہو جائے تو امید ہے مواخذہ نہیں ہو گا لیکن اگر حالات سازگار ہوں، مناسب رشتہ بھی ملتا ہے اور شرائط پر پورا اترتا ہے تو ایسے حالات میں بچی کی شادی نہ کرنا جرم ہے اگر بچی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو والد یا سرپرست سے ضرور مواخذہ ہو گا۔ باقی سوال میں ذکر کردہ ہمارے ہاں رائج روایت کہ مخصوص ایام گزرنے کا خود ساختہ مفروضہ جہلا کا مسئلہ ہے کہ اتنے ہی قتل والد کے کھاتہ میں لکھے جاتے ہیں۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، بہرحال ایک عزت دار مسلمان کو چاہیے کہ جب بھی بچی جوان ہو جائے تو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کا بہانہ بنا کر دانستہ ٹال مٹول نہ کرے بلکہ جلدی اس کا نکاح کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے محمد ابراہیم دریافت کرتے ہیں کہ مجھے ایک محفل نکاح میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر ایجاب وقبول کی رسم اس کے باپ نے ادا کی کیا اس طرح نکاح ہو جاتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب نکاح زندگی کا ایک ایسا بندھن ہے جو انتہائی غور وغوض، سنجیدگی اور متانت کا متقاضی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس معاشرتی معاملہ کو طے کرتے وقت فریقین کا عاقل وبالغ ہونے کی صورت میں خود مختار ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اگر کسی موقع پر ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے جہاں عقل وبلوغ کے بغیر ہی نکاح ناگریز ہو تو شریعت اسلامیہ نے عاقل وبالغ ہونے کے بعد ایسی سہولتیں دی ہیں جن سے ان کی خود مختاری کو پورا پورا تحفظ ملتا ہے۔ صورت مسئولہ میں اگر لڑکا نابالغ ہے تو اس کا باپ اس کی طرف سے نیابتاً ایجاب وقبول کر سکتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی صغر سنی میں ہوا تھا اور ان کے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف سے ایجاب کا فریضہ سرانجام دیا تھا، لیکن بالغ ہونے کے بعد لڑکا یا لڑکی صغر سنی یا زمانہ نابالغی میں کیے ہوئے نکاح کو ناپسند کریں تو شریعت نے لڑکی کو خیار بلوغ اور لڑکے کو طلاق کی صورت میں حق ''خلاصی'' دیا ہے۔ اگر لڑکا بالغ ہے تو والد اپنے لڑکے کی طرف سے صرف اس صورت میں ''قبول'' کر سکتا ہے۔ جب لڑکے نے اسے اپنا وکیل مقرر کیا ہو باپ کے علاوہ کوئی دوسرا بھی

وکیل بن سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بعض اوقات لڑکے اور لڑکی دونوں کی طرف سے وکالۃً از خود رسم ''قبول'' ادا کی ہے۔ اگر لڑکے نے والد کو اپنا وکیل نہیں بنایا اور والد نے از خود رسم ''قبول'' ادا کی ہے تو اس صورت میں نکاح نہیں ہوگا کیوں کہ اس سے مقاصد نکاح فوت ہونے کا اندیشہ ہے۔ جسے شریعت کسی صورت میں پسند نہیں کرتی۔ واضح رہے کہ اگر لڑکا نابالغ ہے لیکن صاحب شعور اور صاحب تمیز ہے تو اس کا حکم بھی بالغ جیسا ہے یعنی اسے خود ہی ایجاب وقبول کرنا چاہیے یا کسی کو اپنی طرف سے وکیل بنا کر اس فریضہ سے عہدہ براہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال حافظ آباد سے ضیاء اللہ سوال کرتے ہیں کہ جو شخص اپنے بیٹے یا بیٹی کی منگنی کر کے کچھ عرصے بعد اسے توڑ دیتا ہے، اس کے متعلق شریعت کیا حکم دیتی ہے؟

جواب منگنی کرنا وعدۂ نکاح ہے، اس سے نکاح نہیں ہوتا، ایک مسلمان کے لیے اس کا ایفا ضروری ہے، بلا وجہ خلاف ورزی کرنا منافقانہ روش ہے، تاہم اگر کوئی شرعی عذر ہو تو اس وعدے کو ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن جھوٹی عزت اور انانیت کی خاطر وعدہ خلافی کرنا جرم ہے، شرعی مجبوری کی بنا پر وعدہ خلافی کرنے کی مثال ہمیں ملتی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس گھر میں آنے کا وعدہ کیا لیکن وہ حسب وعدہ نہ پہنچے جس سے آپ ﷺ کو بہت قلق ہوا، جب رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، آپ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے گھر نہ آنے کا شکوہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم ایسے گھر نہیں جاتے جس میں کتا اور تصویر ہو۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس، ۵۹۶۰]

اس کی تفصیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی آپ نے اسے پھینکتے ہوئے فرمایا: ''کہ اللہ اور اس کے فرستادہ وعدہ خلافی نہیں کرتے، ضرور کوئی بات ہے'' اچانک آپ کی نظر کتے کے بچے پر پڑی جو چارپائی کے نیچے چھپا بیٹھا تھا، آپ ﷺ نے اسے نکالنے کا حکم دیا، تب حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے، آپ نے تاخیر کا سبب پوچھا تو جواب دیا کہ آپ کے گھر میں کتے کی موجودگی میرے آنے میں رکاوٹ کا باعث ہوئی، کیوں کہ ہم اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا یا تصویر ہو۔

[صحیح مسلم: اللباس ۵۵۱۱]

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ معقول شرعی عذر کی وجہ سے اگر وعدہ پورا نہ ہو سکے تو اس پر مواخذہ نہیں ہوگا ممکن ہے کہ جس نے اپنی بیٹی دینے کا وعدہ کیا ہے اسے لڑکے میں کوئی دینی عیب یا کوئی خرابی نظر آئی ہو، جس کی بنا پر وہ وعدہ خلافی کرنے پر مجبور ہوا ہے، ہمیں اسے الزام دینے کے بجائے اپنے آپ پر غور کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال ساہیوال سے مدیحہ لکھتی ہیں کہ انگوٹھی شرعاً کیا حیثیت رکھتی ہے، آیندہ ہونے والا خاوند اپنا نام لکھ کر اپنی منگیتر کو پہناتا ہے، اسی طرح لڑکی بھی سونے کی انگوٹھی پر اپنا نام کندہ کروا کر اپنے ہونے والے خاوند کو بطور تحفہ دیتی ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

جواب ملکی یا قومی روایات اگر کتاب وسنت کے خلاف نہ ہوں تو انہیں عمل میں لایا جا سکتا ہے، کیوں کہ ان کا تعلق معاملات سے ہے، جن میں اصل جواز ہوتا ہے، الا یہ کہ کتاب وسنت میں حکم امتناعی آجائے جبکہ عبادات میں اصل تحریم ہے الا یہ کہ کتاب

وسنت میں اس کے کرنے کا ثبوت پایا جائے، منگنی کے مواقع پر انگوٹھی وغیرہ کے تحائف کا تبادلہ کرنا جائز ہے، لیکن اس میں درج ذیل تفصیل کو مدنظر رکھنا ہوگا۔

① مرد کے لیے سونے کا استعمال شرعاً ناجائز اور حرام ہے خواہ انگوٹھی کی شکل میں ہے، خواہ کسی دوسری صورت میں۔ رسول اللہ ﷺ نے سونے کو اپنی امت کے مردوں کے لیے حرام قرار دیا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی آدمی آگ کی چنگاری کا ارادہ کرتا ہے پھر اسے اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہے''۔

[ابوداؤد: کتاب اللباس]

اس بنا پر مردوں کے لیے سونے کی انگوٹھی پہننا جائز نہیں ہے، لہٰذا اس قسم کے تحفہ سے اجتناب کیا جائے، البتہ سونے کے علاوہ چاندی یا دوسری معدنی اشیاء کی انگوٹھی خواہ وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو، اس کا پہننا مرد کے لیے جائز ہے۔

② اس قسم کی انگوٹھی کے پہننے اور پہنانے میں یہ عقیدہ کارفرما ہوتا ہے کہ یہ عمل آیندہ ازدواجی زندگی میں الفت ومحبت کو مستحکم کرنے کا باعث ہے، اگر یہ اعتقاد رکھا جائے تو ایسا کرنا شرک ہے، جو ایک مسلمان کی شان کے شایان نہیں ہے۔ اس عقیدہ کے ساتھ کسی کو بھی انگوٹھی پہننے کی اجازت نہیں ہے۔

③ اگر کفار ومشرکین کے ہاں اس قسم کے تحائف بطور امتیاز وعلامت استعمال ہوں تب بھی ان کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ جو کسی کی نقالی کرتے ہوئے عمل کرتا ہے قیامت کے دن وہ انہیں میں اٹھایا جائے گا۔'' [سنن ابی داود]

④ اس طرح یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اس انگوٹھی کو ہونے والا خاوند از خود اپنی منگیتر کو پہنائے کیوں کہ وہ ابھی اس کی بیوی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے وہ ایک اجنبی عورت ہے، بیوی تو عقد نکاح کے بعد بنتی ہے۔

مذکورہ بالا شرائط اور گزارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے خاوند کی طرف سے اپنی منگیتر کو انگوٹھی بطور تحفہ پیش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لڑکی کی طرف سے انگوٹھی وغیرہ بطور تحفہ دی جاسکتی ہے لیکن اگر وہ سونے کی ہے تو پہننے کی اجازت نہیں بلکہ اسے دوسرے مصرف میں استعمال کرلیا جائے اور اگر سونے کے علاوہ کسی اور دھات کی ہے تو اس کے پہننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ذوالفقار بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک لڑکے نے کسی لڑکی سے ناجائز تعلقات استوار کیے جس کے نتیجہ میں ناجائز حمل قرار پا گیا، ان کے والدین کو اس حرکت کا علم تھا۔ اب حمل ضائع کر کے لڑکے اور لڑکی کے اصرار پر ان کا نکاح کر دیا گیا ہے تاکہ عدالت کی گرفت میں نہ آسکیں واضح رہے کہ نکاح دونوں کے والدین کی اجازت اور رضامندی سے ہوا ہے۔ کیا ایسا نکاح شرعاً جائز ہے؟

جواب قرآن مجید میں جہاں والدین کے حقوق بیان کیے گئے ہیں وہاں ان کے فرائض وواجبات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے انہیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ اپنی اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کا بندوبست کریں، اپنا گھریلو ماحول صاف وستھرا اور پاکیزہ رکھیں، معاشرتی برائیوں کے سلسلہ میں اپنی اولاد کی کڑی نگرانی کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے ''دیوث'' پر لعنت فرمائی ہے اور اس پر

جنت کے حرام ہونے کی وعید سنائی ہے جو اپنے گھر میں برائی دیکھ کر اسے ٹھنڈے پیٹ برداشت کر لیتا ہے، لڑکیوں کے متعلق تو خاص ہدایت ہے کہ جونہی مناسب رشتہ ملے ان کا نکاح کرنے میں دیر نہ کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ وصیت فرمائی تھی'' کہ تین کاموں میں دیر نہ کرنا، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب لڑکی کے لیے مناسب رشتہ مل جائے تو اس کا نکاح کرنے میں لیت ولعل سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' حدیث میں یہ بھی ہے:'' کہ اخلاقی اور دینی طور پر مناسب رشتہ ملنے کے باوجود اگر کوئی ''بلند معیار'' کی تلاش میں دیر کرتا ہے تو وہاں ضرور فتنہ وفساد رونما ہوگا'' صورت مسئولہ میں ہم اس حقیقت کا نمایاں طور پر مشاہدہ کرتے ہیں کہ والدین کو اولاد کی اس حرکت شنیعہ کا علم تھا اس کے باوجود خاموش تماشائی کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ آخر اس بدکاری پر نوبت یکبار نہیں پہنچ جاتی۔ بلکہ اس سے پہلے کچھ مقدمات اور ابتدائی محرکات ہوتے ہیں جو بدکاری کے راستہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس مقام پر ہمارا سوال یہ ہے کہ بدکاری کے مقدمات، محرکات اور اسباب کے سدباب کے لیے والدین نے کیا کردار سرانجام دیا ہے۔ قرآن پاک نے نہ صرف زنا سے روکا ہے، بلکہ اس کے ابتدائی محرکات کا بھی راستہ بند کیا ہے اور ان تمام شرمناک افعال سے منع کیا ہے جو بدکاری کا سبب بن سکتے ہیں۔ ان ابتدائی گزارشات کے بعد ہم صورتِ مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ صفائی کے بعد والدین کی رضامندی سے جو نکاح ہوا ہے وہ شرعاً درست اور جائز ہے۔ اب انہیں چاہیے کہ اللہ کے حضور نہایت عاجزی اور ندامت کے جذبات سے توبہ کریں اور آیندہ اس قسم کی نازیبا حرکات سے اجتناب کرنے کا عزم کریں وگرنہ قرآن مجید کی رو سے یہ بھی صحیح ہے کہ ''بدکار مرد، نانہجار عورت سے ہی نکاح کرتا ہے''۔ [۲۴/النور:۳]

پھر اس سلسلہ میں جن مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑے گا وہ بہت سنگین ہیں اس لیے بہتر ہے کہ توبہ کر کے اپنی آیندہ زندگی کو پاکیزہ کریں اور خوش اسلوبی سے بقیہ ایام گزارنے کا عزم رکھیں، توبہ کرنے سے سابقہ گناہ نہ صرف معاف ہو جاتے ہیں بلکہ اگر اخلاص ہو تو یہ پہلے گناہ نیکیوں میں بدل جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ [۲۵/الفرقان:۷۰]

سوال نور پور تھل سے پروفیسر نواب دین کلیرا لکھتے ہیں کہ ایک مرد کے کسی عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے اس نے اس فعل بد سے توبہ کرنے کے بعد اس عورت کی لڑکی سے نکاح کر لیا، قرآن وحدیث کی رو سے آیا یہ نکاح صحیح ہے؟۔

جواب صورت مسئولہ کے متعلق علمائے امت کا اختلاف ہے اکثر اہل علم کی رائے کے مطابق وہ صنفی تعلقات حرمت کا باعث ہوتے ہیں جو شرعی نکاح کے بعد قائم کیے جائیں گے جبکہ کچھ علما کا خیال ہے کہ شرعی، غیر شرعی سے قطع نظر مطلق طور پر کسی عورت سے صنفی تعلقات قائم کرنا اس عورت کی ماں اور بیٹی سے نکاح کرنے میں رکاوٹ کا باعث ہیں، احناف نے مؤخر الذکر موقف کو اختیار کیا ہے، لیکن جمہور علما نے ان سے اتفاق نہیں کیا بلکہ ان کے ہاں ناجائز تعلقات کسی قسم کی حرمت کا باعث نہیں بنتے۔ مثلاً دو بہنوں سے بیک وقت نکاح کرنا ناجائز ہے کیا کسی عورت سے نکاح کرنے کے بعد اس کی بہن سے بدکاری کرنا رشتہ ازدواج کے انقطاع کا باعث ہو سکتا ہے، ہرگز نہیں چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:'' کہ جب کوئی اپنی سالی سے زنا کرتا ہے تو اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہوگی۔'' [صحیح بخاری تعلیقاً]

اسی طرح کوئی آدمی اپنی بیوی کی والدہ سے ناجائز تعلقات استوار کر لیتا ہے تو اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہوگی، اس کے

متعلق بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ یہ ہے ''کہ اس شخص نے بیک وقت دو حرمتوں کو پامال ضرور کیا ہے، لیکن اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہوگی۔'' [بیہقی:۷/۶۸]

اس کی سند کے متعلق علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ شیخین کی شرط کے مطابق ہے۔ [ارواء الغلیل:۶/۲۸۸]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے برعکس بھی فتویٰ منقول ہے جس کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرنے والے راوی ابونصر کا سماع حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب النکاح]

اس مسئلہ کے متعلق ایک روایت بھی بیان کی جاتی ہے کہ جس نے کسی عورت کی شرمگاہ کو دیکھ لیا، اس عورت کی ماں اور بیٹی دیکھنے والے پر حرام ہو جاتی ہے۔ [تفہیم القرآن:۱/۳۳۷]

لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے جس کی بنا پر یہ روایت قابل قبول نہیں ہے۔ [فتح الباری:۹/۱۵۶]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں انقطاع جہالت اور ضعف ہے۔ [بیہقی:۷/۱۷۰]

قرآن کریم نے جس حرمت مصاہرت کا ذکر کیا ہے اس سے وہ رشتہ مراد ہے جو نکاح صحیح کے بعد عمل میں آتا ہے، محض زنا سے مصاہرت (سسرالی رشتہ) ثابت کرنا سینہ زوری ہے، کیوں کہ اس قسم کی بدکاری سے حق مہر، عدت اور وراثت وغیرہ کا اجراء اگر نہیں ہوتا، تو اس سے رشتہ مصاہرت کیسے ثابت ہو سکتا ہے جو حرمت کا باعث ہو۔ بلا شبہ زنا بہت بڑا فوجداری جرم ہے لیکن حرام جرم کسی حلال رشتہ پر اثر انداز نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے آدمی کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے بدکاری کی تھی کیا وہ اس عورت کی ماں سے نکاح کر سکتا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ حرام جرم کسی حلال کو حرام نہیں کر سکتا۔ [فتح الباری:۹/۱۵۷]

اسی طرح امام زہری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی آدمی کسی عورت سے بدکاری کرتا ہے تو کیا اس عورت کی لڑکی سے نکاح ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے بعض اہل علم کے حوالہ سے فرمایا ''کہ اللہ تعالیٰ کسی حرام جرم کی بنا پر حلال کو خراب نہیں کرتا۔'' [بیہقی:۷/۱۶۹]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان تینوں بزرگوں کے متعلق فرماتے ہیں ''کہ انہوں نے (بدکاری کے بعد) عورت کی ماں سے اور بیٹی سے نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب النکاح]

قرآن کریم کے مطالعہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے اندیشہ ہائے دور دراز بے کار ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے نسبی، سسرالی اور رضاعی محرمات بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ان کے علاوہ تمام رشتے تمہارے لیے حلال ہیں۔ جب قرآن کریم نے اس زنا کو مصاہرت میں شامل نہیں کیا ہے تو ہمیں اس تکلف میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں آدمی کا نکاح صحیح ہے۔ البتہ اسے اللہ تعالیٰ سے اپنے جرم شنیع کی معافی مانگنا اور صدق دل سے توبہ و استغفار کرنا انتہائی ضروری ہے۔

[واللہ اعلم]

سوال لاہور سے محمد اسحاق لکھتے ہیں کہ زید کا نکاح کسی عورت سے ہوا، تین ماہ بعد اس نے ایک بچہ جنم دیا، جبکہ زید کو نکاح کے

وقت کوئی علم نہ تھا، ایسے حالات میں نکاح کے متعلق کیا حکم ہے؟۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں جب عورت کا نکاح ہوا ہے تو وہ کم از کم چھ ماہ کی حاملہ تھی اور یہ ناممکن ہے کہ چھ ماہ کے حمل کا کسی کو پتہ نہ چل سکے، زید کو اگر نکاح کے وقت اس کا علم نہ تھا تو اس کے عزیز واقارب اور خواتین کو یقیناً اس کا علم ہوگا، بہر حال یہ مسئلہ ایک ایسی عورت سے متعلق ہے جو بوقت نکاح حاملہ تھی، اس کے متعلق متفقہ فیصلہ ہے کہ اس قسم کا نکاح سرے سے ہوتا ہی نہیں، بلکہ باطل اور بے بنیاد ہے۔ البتہ خاوند نے چونکہ اس سے وظیفہ زوجیت ادا کیا ہے اس لیے حق مہر کی ادائیگی اس کے ذمے ہے بیوی اور خاوند کے درمیان فوراً تفریق کرادی جائے اب انہیں بیوی اور خاوند کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اس قسم کا مسئلہ دریافت کیا کہ میں نے (بظاہر) ایک کنواری سے شادی کی جب میں اس کے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو حاملہ ہے۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اس کی شرمگاہ کو تو نے اپنے لیے حلال سمجھا اس بنا پر اسے حق مہر دینا ہوگا۔'' [ابوداود: کتاب النکاح]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان فوراً تفریق کرادی۔ (حوالہ مذکورہ) حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے چار مسائل کا استنباط کیا ہے۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ زنا سے حاملہ کا بحالت حمل نکاح حرام ہے۔ [تہذیب السنن: ۳/۶۱]

زاد المعاد میں بھی اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''کہ زنا سے حاملہ عورت کا نکاح باطل ہے۔ حدیث سے بھی یہ حکم ثابت ہوتا ہے۔'' [زاد المعاد: ۴/۷]

البتہ زنا سے پیدا ہونے والا بچہ اگر وہ رکھنا چاہے تو خدمت گزاری کے طور پر اسے رکھا جا سکتا ہے، اس صورت میں اس کے جملہ مصارف اس کے ذمہ ہوں گے۔ جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ واضح رہے کہ زنا سے حاملہ عورت کے نکاح کا باطل ہونا حدیث سے ثابت ہے۔ قطع نظر کہ نکاح کے وقت خاوند کو اس کا علم تھا یا وہ اس سے بے خبر تھا، اس موقع پر وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ جرم دوسرے لوگوں کے نکاح پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ جو بوقت نکاح مجلس میں موجود تھے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال جہانیاں منڈی سے محمد جمال لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے؟

(الف) دولہا کے گلے میں روپوں اور پھولوں کا ہار ڈالنا شرعاً کیسا ہے؟ اگر دولہا اسے پسند نہ کرے لیکن دوست واحباب زبردستی ڈال دیں تو اس میں کیا حرج ہے؟

(ب) کیا ولیمہ کے لیے بیوی سے مقاربت شرط ہے؟ بعض علما فرماتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب دین اسلام ہمیں سادگی، اعتدال پسندی کی تعلیم دیتا ہے، ایسے اخراجات جو انسان کی حقیقی ضروریات کے علاوہ اٹھتے ہوں، نیز اپنی دولت کو مفید کاموں کے بجائے غلط کاموں پر صرف کرنا کفران نعمت ہے، جس کے متعلق قیامت کے دن باز پرس ہو گی، قرآن کریم نے اس طرح اسراف وتبذیر کرنے والوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''فضول خرچی نہ کرو کیوں کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں''۔ [۱۷/بنی اسرائیل: ۲۷]

دولہا کے گلے میں روپوں اور پھولوں کے ہار پہنانا بھی اسی قسم سے ہے، اس کے علاوہ فخر ومباہات اور نمائش وریاکاری بھی

ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ریا کاری کو شرک خفی اور شرک اصغر قرار دیا ہے، اس بنا پر عقل مند انسان ایسے خوشی کے موقع پر بھی اعتدال کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، خود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس قسم کے نمائشی کاموں سے نفرت کرتے تھے، دولہا کو چاہیے کہ وہ اپنے دوست واحباب کو ایسے کاموں سے اجتناب کی تلقین کرے۔ اگر کچھ جنونی اور جذباتی دوست اس کے گلے میں ہار ڈال دیتے ہیں تو اسے چاہیے کہ انہیں اتار دے، کیوں کہ ان کو اتار دینا تو اس کے اختیار میں ہے، ویسے بھی نوٹوں کے ہار خریدنا شرعی طور پر جائز نہیں ہیں۔ لہٰذا شناخت وانتیاز کا بہانہ بنا کر احکام شریعت کا خون نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر دولت دی ہے تو اسے غلط مصرف پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

② حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ولیمہ کے وقت کے متعلق سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ مقاربت سے پہلے یا بعد۔ مالکی حضرات مقاربت کے بعد ولیمہ کرنا مستحب قرار دیتے ہیں۔ [فتح الباری:۹/۲۴۱]

ہمارا رجحان بھی یہی ہے، لیکن اسے ولیمہ کے لیے شرط قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ولیمہ، مقاربت کے بعد کرنا چاہیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد مقاربت کر چکے تو دعوت ولیمہ کے لیے لوگوں کو اپنے گھر بلایا۔ [صحیح بخاری: کتاب النکاح' باب الولیمہ حق]

حضرت امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے: ''باب وقت الولیمہ'' [بیہقی:۷/۲۶۰]

اگر رخصتی کے بعد خاوند بیوی کے جمع ہونے سے پہلے بلا ضرورت ومجبوری ولیمہ کر دیا جائے تو یہ غیر مسنون طور پر ولیمہ کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال بہاولپور سے عبدالغفور دریافت کرتے ہیں کہ ایک عورت کا نکاح کسی شخص سے ہوا جو اسے ناپسند کرتی ہے۔ ابھی رخصتی عمل میں نہیں آئی اور نکاح کا باقاعدہ اندراج بھی نہیں ہوا اب وہ عورت وہاں آباد نہیں ہونا چاہتی۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل مطلوب ہے؟۔

جواب واضح رہے کہ نکاح کے وقت لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ اگر عین نکاح کے وقت لڑکی کی طرف سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا تھا اور اس نے ایجاب سے انکار کر دیا تھا تو اس صورت میں سرے سے نکاح منعقد نہیں ہوا۔ اس قسم کے جبری نکاح کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر نکاح کے وقت اظہار ناپسندیدگی نہیں ہوا تو یہ نکاح صحیح ہے۔ اب اگر وہ اپنے خاوند کے گھر آباد نہیں ہونا چاہتی تو عدالت کی طرف رجوع کرے اور درخواست دے کہ میں اپنے خاوند کے گھر آباد نہیں ہونا چاہتی۔ عدالت اس امر کا پتہ کرے گی کہ نفرت کی وجوہات کیا ہیں؟ اس کے بعد تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کرے گی۔ صرف فتویٰ فسخ نکاح کے لیے کافی نہیں ہوگا۔ یہ عدالت کا کام ہے چونکہ ابھی تک رخصتی عمل میں نہیں آئی اس کے لیے عدت گزارنے کی بھی پابندی نہیں ہے عدالت کی طرف سے تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری ہونے کے بعد فوراً نکاح ثانی کیا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ نکاح صرف ایجاب وقبول کا نام ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ اندراج شرط نہیں ہے۔ اگرچہ معاشرتی برائیوں کی روک تھام کے لیے رجسٹریشن ضروری ہے لیکن انعقاد نکاح کے لیے شرط نہیں ہے۔

سوال شجاع آباد سے ہدایت اللہ سوال کرتے ہیں کہ ایک لڑکی کا نکاح ہوا۔ایک سال کے بعد اس کا خاوند پاگل ہوگیا وہ عرصہ پانچ سال سے پاگل خانہ میں ہے۔ایسے حالات میں لڑکی کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا اسے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے؟اس سلسلہ میں شرعی فتویٰ درکار ہے۔

جواب قرآن کریم نے شوہر کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''عورتوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو''۔ [۴/النسآء:۱۹]

یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کو پامال کرتے ہوئے انہیں تکلیف دینے کی غرض سے روکے رکھنا صریح ظلم ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''کہ محض ستانے کے لیے انہیں مت روکو کیوں کہ یہ زیادتی اور ظلم ہے۔'' [۲/البقرہ:۲۳۱]

صورت مسئولہ میں عرصہ پانچ سال سے بیوی کے حقوق پامال کیے جارہے ہیں۔اس لیے بیوی کو شرعاً یہ حق ہے کہ وہ شوہر کے دیوانہ ہونے کی بنا پر بذریعہ عدالت تفریق حاصل کرسکتی ہے تاکہ وہ کسی مناسب جگہ پر آباد ہوسکے۔اگرچہ بعض ائمہ کرام نے بیوی کے متعلق یہ گنجائش نہیں رکھی کہ وہ شوہر کے پاگل ہونے کی وجہ سے تفریق کا مطالبہ کرے تاہم ائمہ ثلاثہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک عورت کو یہ حق ہے کہ وہ قاضی کی عدالت میں درخواست دے کر تفریق کا مطالبہ کرے اور پاگل شوہر کی زوجیت سے علیحدگی حاصل کرے۔بشرطیکہ دیوانگی اس درجہ کی ہو کہ اس کی موجودگی میں بیوی کا شوہر کے ساتھ رہن سہن ناممکن ہو،فقہائے کرام نے جنون کے متعلق کچھ تفصیل بیان کی ہے کہ اگر جنون مسلسل اپنی اصل حالت پر قائم رہتا ہے اور مریض کو کسی وقت بھی افاقہ نہیں ہوتا اس صورت میں عدالت کو بلا مہلت تفریق کا حکم دے دینا چاہیے اور اگر جنون کی یہ حالت نہیں یعنی دیوانگی ہمیشہ طاری نہیں رہتی بلکہ کبھی کبھی افاقہ بھی ہوجاتا ہے تو اس صورت میں علاج کے لیے ایک سال تک مہلت دی جائے اگر اس مدت میں شفایاب نہ ہوسکے تو عدالت کو خاوند بیوی کے درمیان علیحدگی کرادینی چاہیے تاکہ بیوی کی زندگی مزید برباد نہ ہو۔اس سلسلہ میں یہ وضاحت کرنا بھی مناسب ہے کہ جنون جب ظاہر ہو تو عورت کو تفریق طلب کرنے کا حق ہوگا۔صورت مسئولہ میں خاوند عرصہ پانچ سال سے پاگل خانہ میں ہے لہٰذا بیوی کو مزید تنگ نہیں کیا جاسکتا۔بلکہ اسے فوراً خاوند کی زوجیت سے الگ کردیا جائے تاکہ وہ زندگی کے بقیہ ایام آرام اور سکون سے گزار سکے،بیوی کو چاہیے کہ وہ عدالت کی طرف رجوع کرے جب عدالت کی طرف سے علیحدگی کی ڈگری جاری ہوجائے تو عدت پوری کرنا ہوگی،عدت کے بعد اسے نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے۔

سوال ضلع قصور سے حافظ زکریا دریافت کرتے ہیں کہ باپ کی عدم موجودگی میں اس کی رضا کے بغیر عدالتی نکاح کی شرعاً کیا حیثیت ہے؟

جواب واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ میں عورت کو بذات خود اپنا نکاح کرنے کی اجازت نہیں بلکہ مرد عورت کے درمیان زندگی بسر کرنے کے معاہدہ (نکاح) میں ولی کا ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔سرپرست کا اولین فریضہ یہ ہے کہ پہلے وہ لڑکی کی رضامندی حاصل کرلے پھر کسی مرد سے اس کی شادی کے متعلق بات چیت شروع کرے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''کہ سرپرست کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہوتا'' [ترمذی،ابوداؤد:کتاب النکاح]

اس حدیث کا واضح مطلب ہے کہ جو نکاح سرپرست کی مرضی کے بغیر ہو اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے یعنی ایسا نکاح سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرنے والے تمام عمر بدکاری کرتے ہیں اگر سرپرست غلط جگہ پر اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے تو حق ولایت خود بخود دوسرے قریبی رشتے دار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر تمام سرپرست کسی غلط جگہ پر شادی کے لیے اتفاق کر لیں (اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے) تو عدالتی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ اگر عدالت اس نتیجہ پر پہنچے کہ واقعی تمام سرپرست نکاح کے لیے کسی غلط کار کا انتخاب کیے ہوئے ہیں تو جج کی سرپرستی میں عدالتی نکاح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر باپ یا کوئی دوسرا سرپرست صحیح جگہ پر رشتہ کرنا چاہتا ہے اور لڑکی وہاں آمادہ نہیں یا غلط کار ہونے کی وجہ سے کسی ایسی جگہ رشتہ کرنا چاہتی ہے جو خاندان کے لیے باعث ننگ و عار ہے تو ان حالات میں عدالتی نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

سوال ٹیکسلا سے ڈاکٹر محمود لکھتے ہیں کہ ایک امام مسجد پیسے کے لالچ میں آکر ایک نکاح شدہ لڑکی کا آگے نکاح پڑھا دیتا ہے۔ حالانکہ اسے بتا دیا گیا تھا کہ اس کا نکاح پہلے ہو چکا ہے اور وہاں سے طلاق نہیں لی ہے۔ آپ کسی دوسرے شخص سے اس کا نکاح نہ پڑھیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس طرح نکاح پڑھا دینا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ایسا کرنے سے امام کا اپنا نکاح برقرار رہتا ہے یا نہیں؟۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ ایک شادی شدہ عورت کا نکاح کسی دوسرے سے نہیں ہو سکتا جبکہ اس کے خاوند نے اسے طلاق نہ دی ہو قرآن پاک میں واضح طور پر یہ ہدایت موجود ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''شوہر والی عورتیں بھی تم پر حرام ہیں''۔ [۴/النسآء:۲۴]

اس واضح ہدایت کے باوجود اگر کوئی فرد دانستہ طور پر ایک شادی شدہ عورت کا آگے نکاح پڑھا دیتا ہے تو وہ شریعت اسلامیہ کی حرمت کو پامال کرتا ہے۔ اس طرح وہ شخص بھی مجرم ہے جو جانتے بوجھتے ہوئے ایسی عورت سے نکاح کرتا ہے۔ اگر نکاح خواں نے نادانستہ طور پر ایسا کیا ہے تو پھر بھی اس نے انتہائی بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ بہرحال یہ نکاح نہیں ہوا۔ اسلامی ضابطے کے مطابق ان میں فوراً تفریق کرا دی جائے۔ صورتِ مسئولہ میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ نکاح خواں کو پہلے بتا دیا گیا تھا، اس کے باوجود اس نے نکاح پڑھا کر بڑی نازیبا حرکت کا ثبوت دیا ہے۔ جس پر اللہ کے حضور اس کا ضرور مواخذہ ہوگا۔ لیکن اس کا یہ جرم اس کے نکاح پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے امام کسی ایسے شخص کو مقرر کرنا چاہیے جو معاشرہ میں بہترین مقام اور نیک شہرت کا حامل ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ اپنے میں سے بہتر افراد کو امامت کے لیے منتخب کرو۔'' [بیہقی:۳/۹۰]

لہٰذا اس قسم کے امام کو توبہ کی تلقین کرنی چاہیے اگر توبہ کر لے اور وہ خود معقول اور شریف ہو تو اس سے درگزر کرتے ہوئے اسے امامت پر بحال رکھا جائے۔ لیکن اگر وہ اپنے جرم پر اصرار کرتا ہے اور اللہ کے حضور اپنی توبہ کا نذرانہ پیش نہیں کرتا تو ایسے شخص کو امامت سے فوراً معزول کر دینا چاہیے تاکہ منصب امامت کی توہین نہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال چھانگا مانگا سے ملک عبدالجبار لکھتے ہیں کہ میرا ایک لڑکا جو شادی شدہ ہے اور صاحب اولاد ہے، اس نے ایک لڑکی کو اغوا کر کے اس کے ساتھ نکاح کر لیا ہے۔ نکاح کے وقت لڑکی کی طرف سے کوئی حقیقی ولی موجود نہ تھا۔ قرآن وحدیث کی رو سے اس

نکاح کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ میں کسی عورت کو بذات خود نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ نکاح کے وقت سر پرست کی اجازت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''کہ سر پرست کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہوتا۔'' [جامع ترمذی، کتاب النکاح، حدیث نمبر ۱۱۰۱]

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا: ''کہ جو عورت اپنے سر پرست کی اجازت کے بغیر نکاح کرے اس کا نکاح باطل ہے۔''

[مسند امام احمد: ۶/۱۶۶]

باطل نکاح وہ ہوتا ہے کہ جو سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے۔ لہٰذا صورتِ مسئولہ میں یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوا۔ اس طرح نکاح کرنے والا جوڑا گناہ کی زندگی بسر کرتا ہے انہیں توبہ کر کے والدین کو اعتماد میں لا کر از سرِ نو نکاح کرنا ہوگا، اس مسئلہ کی مزید وضاحت بایں طور ہے کہ سر پرست وہ ہوتا ہے جو زیر سر پرست کا کسی عورت کے رشتہ کے بغیر قرابت دار ہو۔ یعنی اس سر پرستی کی بنیاد قرابت پر ہے، اس لیے قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار سر پرست نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جو سر پرست باعتبار رشتہ جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اس کے دل میں اپنے زیر سر پرست کے لیے شفقت و ہمدردی زیادہ ہوگی۔ اور وہ اس کے مفادات کا تحفظ زیادہ کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ باپ کو اس معاملہ میں اولیت حاصل ہے۔ اگر باپ کے متعلق باوثوق ذرائع سے پتہ چل جائے کہ وہ اپنے زیر سر پرست کے لیے مہر و وفا کے جذبات سے عاری ہے یا اس کے مفادات کا محافظ نہیں ہے تو وہ خود بخود حق ولایت سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ حق ولایت اس کے بعد کے رشتہ داروں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر رشتہ داروں میں کوئی بھی مفادات کے تحفظ کی ضمانت نہ دے تو حق ولایت حاکم وقت کو منتقل ہو جاتا ہے۔ حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ چنانچہ بعض احادیث میں ''ولی مرشد'' کے الفاظ ملتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ولی جو ہمدردی کے جذبات سے سرشار ہو وہ فریضہ نکاح کی اجازت کا حق دار ہے۔ درج بالا وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ ولی کو کھلے اختیارات نہیں دیئے گئے کہ وہ جہاں چاہے اپنی بچی کا نکاح کر دے اور نہ ہی بچی کو کھلی آزادی ہے کہ وہ جہاں چاہے اس کی مرضی کے بغیر نکاح کرے۔ بلکہ ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ہمدردی اور شفقت کی فضا میں نکاح ہونا چاہیے۔ بہر حال آج کل جو لڑکیاں اپنے گھروں سے فرار ہو کر عدالت میں از خود نکاح کر لیتی ہیں شریعت کی نظر میں ایسا نکاح سرے سے منعقد نہیں ہوتا ہے۔ صورت مسئولہ میں اسی طرح کا نکاح معلوم ہوتا ہے لہٰذا یہ نکاح نہیں ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال میاں چنوں سے ع، م خریداری نمبر ۱۴۴۲ لکھتے ہیں کہ مسماۃ ''ف'' کا اپنے خاوند سے کسی بات پر جھگڑا ہوا تو وہ اپنے بیٹے اور دو بیٹیوں کو لے کر گھر سے فرار ہوگئی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو ولی بنا کر بھتیجے سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا جبکہ حقیقی ولی لڑکی کا باپ موجود ہے، اس نکاح کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

جواب بیوی کا گھریلو جھگڑے کی وجہ سے اپنے بچوں کو لے کر گھر سے فرار ہو جانا انتہائی باغیانہ اقدام ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ اگر کسی عورت سے اس کا خاوند ناراض ہے تو اس کے راضی ہونے تک فرشتے عورت پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔'' [صحیح مسلم: النکاح، ۱۴۳۶]

ایک حدیث میں ہے: ''کہ رسول اللہ ﷺ نے بیوی کے لیے اس کے خاوند کو جنت یا جہنم قرار دیا ہے'' یعنی اس کی اطاعت باعث جنت اور نافرمانی موجب جہنم ہے۔ [مسند امام احمد: ج ۴ ص ۳۴۱]

رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی بایں الفاظ وضاحت فرمائی ہے کہ جب عورت نماز پنجگانہ ادا کرتی ہے اور اپنے خاوند کی اطاعت کے ساتھ ساتھ عفت و پاکدامنی اختیار کرتی ہے تو قیامت کے دن اسے اختیار دیا جائے گا کہ جنت میں جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔'' [مسند امام احمد: حدیث نمبر ۱۶۶۱]

ان احادیث کے پیش نظر ہم اس عورت کو نصیحت کرنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے گھر چلی آئے تا کہ دنیا کے ساتھ اس کی آخرت برباد نہ ہو، اس تمہیدی گزارش کے بعد مسئلہ کی وضاحت بایں طور پر ہے کہ قرآن وحدیث میں نکاح کے لیے جو اصول وضوابط بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح نہ کرے اور سرپرست کی بنیاد قرابت ورشتہ داری پر ہے، جیسے باپ اور بھائی وغیرہ نیز قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کا رشتہ دار سرپرست نہیں ہوسکتا کیوں کہ جو سرپرست باعتبار رشتہ جتنا قریب ہوگا اتنا ہی اس کے دل میں اپنے زیر سرپرست کے لیے شفقت وہمدردی زیادہ ہوگی اور وہ اس کے مفادات کا زیادہ تحفظ کرے گا، باپ کو اس معاملہ میں اولیت اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس کی موجودگی میں دوسرا کوئی رشتہ دار سرپرست نہیں ہوسکتا، اس والد کی اجازت کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے: ''کہ جس عورت نے بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا وہ نکاح باطل ہے بے بنیاد اور بے سروپا ہے' ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔'' [مسند امام احمد: ۶/۱۴۵]

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہے۔'' [مسند امام احمد: ۴/۳۹۴]

امام حاکم اس حدیث کو اپنی مستدرک میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ مذکورہ روایت حضرت علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، معاذ بن جبل، عبداللہ بن عمر، ابو ذر غفاری، مقداد بن اسود، عبداللہ بن مسعود، جابر بن عبداللہ، ابو ہریرۃ، عمران بن حصین عبداللہ بن عمرو بن العاص، مسور بن مخرمہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے اسی طرح ازواج مطہرات حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہن سے بھی اس مضمون کی روایات صحت کے ساتھ موجود ہیں۔ [مستدرک: ج ۲ ص ۱۷۲]

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں'' کہ جس روایت کو دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کریں وہ مختار مذہب کے مطابق متواتر شمار ہوتی ہے۔'' [تدریب الراوی: ج ۲ ص ۱۱۷]

ان روایات کے مطابق صورت مسئولہ میں جو نکاح ہوا ہے وہ باطل ہے، اس طرح نکاح کرنے والا جوڑا گناہ کی زندگی بسر کرتا ہے انہیں اللہ کے حضور صدق دل سے توبہ کرنے کے بعد اپنے والد کو اعتماد میں لے کر از سر نو نکاح کرنا ہوگا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں، ان کی مصالح عباد پر بڑی گہری نظر ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ استدلال میں وہ نصوص کا پہلو بھی انتہائی مضبوط رکھتے ہیں انہوں نے زیر بحث کے متعلق ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

''جس شخص کا یہ موقف ہے کہ ولی کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔''

پھر ایک دوسرا باب قائم کرتے ہیں۔ ''کوئی باپ یا رشتہ دار کسی کنواری یا شوہر دیدہ کا نکاح اس کی رضا کے بغیر نہ کرے۔''

ان دونوں ابواب کا منشا یہ ہے کہ نہ تو عورت مطلق العنان ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کرے اور نہ ہی وہ اس قدر مقہور و مجبور ہے کہ اس کا سرپرست جہاں چاہے جس سے چاہے عقد کردے بلکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک عنوان اس طرح قائم کیا ہے ''اگر کسی نے اپنی بیٹی کا نکاح اس کی رضا مندی کے بغیر کر دیا تو یہ نکاح مردود ہے''۔ درحقیقت شریعت اعتدال کو قائم رکھنا چاہتی ہے نہ تو سرپرست کو اتنے وسیع اختیارات حاصل ہیں کہ وہ اپنی بہن یا بیٹی کی مرضی کے بغیر جہاں چاہے اس کا نکاح کردے اور نہ ہی عورت کو اس قدر کھلی آزادی دی ہے کہ وہ از خود سرپرست کی اجازت کے بغیر نکاح کرکے اپنے خاندان کی عزت وآبرو کو خاک میں ملا دے ہاں اگر باپ کے متعلق باوثوق ذرائع سے پتہ چل جائے کہ وہ اپنے زیر سرپرست کے لیے مہر و وفا کے جذبات سے عاری ہے یا اس کے مفادات کا محافظ نہیں ہے تو وہ خود بخود حق ولایت سے محروم ہو جاتا ہے حدیث میں اس کی وضاحت موجود ہے چنانچہ بعض روایات میں ''ولی مرشد'' کے الفاظ ملتے ہیں۔ [بیہقی: ج۷، ص۱۲۴]

جس کا مطلب یہ ہے کہ جو سرپرست ہمدردی کے جذبات سے سرشار ہو وہی فریضہ نکاح کی اجازت کا حقدار ہے۔ بہرحال صورت مسئولہ میں بیان کردہ نکاح سرے سے منعقد نہیں ہوا کیوں کہ حقیقی سرپرست کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اور وہ اپنی بچی کے متعلق ہمدردی کے جذبات بھی رکھتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال گوجرہ سے محمد ابرار لکھتے ہیں کہ ایک آدمی شادی کا خواہش مند ہے تلاش بسیار کے باوجود مناسب رشتہ نہیں مل رہا جہاں بات چلتی ہے ان کا پہلا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے داڑھی کٹاؤ پھر لڑکی دیں گے ایسے حالات میں کس سنت پر عمل کیا جائے جبکہ دونوں سنتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

جواب حالات کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک طرف تو دیندار اور مذہبی گھرانے صدائے احتجاج بلند کیے ہوئے ہیں کہ ہمیں اپنی لڑکیوں کے لیے مناسب رشتے نہیں مل رہے، دوسری طرف اس ماحول میں دیندار نوجوان کہہ رہے ہیں کہ ہمیں رشتہ کی خاطر ایک سنت کا خون کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے، دراصل ہمارے اجتماعی دینی نظام کے فقدان نے ہمیں ان ناگفتہ بہ حالات سے دوچار کر دیا ہے، ہم انفرادی طور پر کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کے دعویدار ضرور ہیں لیکن اجتماعی طور پر ہم ماحول، برادری، قوم، دوست واحباب اور خواہشات نفس کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں اگر ان بتوں کو پاش پاش کر دیں تو پیش آمدہ الجھنیں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ مسلمان کے لیے داڑھی رکھنا ایک شناختی علامت اور امتیازی نشان ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو۔'' [صحیح بخاری]

آپ ﷺ کے پاس ایک دفعہ ایرانی مجوسیوں کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ یہ لوگ اپنی مونچھیں بڑھاتے ہیں اور داڑھی منڈواتے ہیں تم ان کی مخالفت کرو اپنی داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو۔'' [ابن حبان: ۴/۴۰۸]

اسی طرح آپ ﷺ نے یہود ونصاریٰ کی مخالفت کرنے کے متعلق فرمایا ہے: ''کہ تم اپنی داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں کٹواؤ۔''

[مسند امام احمد: ۵/۲۶۵]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں داڑھی بڑھانے اور مونچھیں پست کرانے کا حکم دیتے تھے۔ [صحیح مسلم]

اس عمل کو جو سنت کہا جاتا ہے وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ اگر کوئی عمل کرے تو ثواب کا حق دار اور نہ عمل کرنے سے گناہ نہیں ہوگا بلکہ اسے سنت اس لیے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ایک ایسا طرز عمل ہے جس کی آپ نے کبھی عمر بھر بھی مخالفت نہیں کی بلکہ تمام انبیا علیہم السلام اس امتیازی نشانی کے حامل تھے۔ صورت مسئولہ میں ایک نوجوان نے جو الجھنیں پیش کی ہیں اس کا حل یہ ہے کہ اگر اسے اللہ تعالیٰ پر پورا پورا یقین ہے کہ وہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا اور اسے کسی صورت میں ضائع نہیں کرے گا تو اسے اپنے موقف پر ڈٹ جانا چاہیے، ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ضرور کوئی دروازہ کھولے گا، انسان کو مشکلات آتی رہتی ہیں، ہمارے نزدیک عزیمت کا تقاضا یہی ہے کہ دینی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے اس شناختی علامت کی حفاظت کرے تا کہ اس سنت کو ہلکا سمجھنے والوں کی امنگیں خاک آلود ہوں اور آیندہ انہیں اس قسم کے ناروا مطالبات کرنے کی جرأت نہ ہو، ہمارے دینی اداروں اور مدارس کو نوجوانوں کی اس ضرورت پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)

سوال پشاور سے گل ریز خان دریافت کرتے ہیں کہ اہل سنت کے ساتھ شیعہ حضرات کے اصولی اختلافات کیا ہیں کیا انہیں اہل کتاب میں شمار کیا جاسکتا ہے نیز اہل سنت لڑکی کو شیعہ مرد کے نکاح میں دیا جاسکتا ہے؟

جواب شیعہ حضرات کا روز اول ہی سے یہ مقصد رہا ہے کہ اسلام کے نام پر اسلام اور اہل اسلام کو جہاں تک ممکن ہو ذلیل ورسوا کیا جائے، انہوں نے عقائد وعبادات اور معاملات واخلاقیات سے متعلق ایک ایسا متوازی دین ایجاد کر رکھا ہے جو دین اسلام کے بالکل متصادم ہے الغرض وضو، اذان، نماز، روزہ، زکوٰۃ بلکہ ہر دینی شعار عام مسلمانوں سے ہٹ کر علیحدہ قائم کر رکھا ہے ان کے ساتھ اہل سنت کے اصولی اختلاف حسب ذیل ہیں۔

① ان کے نزدیک ائمہ اہل بیت خدائی تصرفات کے مالک ہیں اور حضرات انبیا علیہم السلام سے بھی بلند مقام کے حامل ہیں۔

② ان کے نزدیک موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے، اس مزعومہ ردوبدل کی وجہ سے یہ صحیفہ آسمانی ان کے ہاں ناقابل عمل ہے۔

③ وحی الٰہی کے اولین مخاطب اور اصلی حاملین اسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سوائے چند اشخاص کے ان کے ہاں کافر، مرتد، منافق، ایمان سے قطعی محروم اور خالص دنیا پرست کہا جاتا ہے بلکہ انہیں سب وشتم کرنا ان حضرات کا جزو ایمان ہے۔

④ تقیہ کے نام سے ان کے نزدیک ہر قسم کی مکاری، فریب کاری اور جھوٹ جائز ہے۔

⑤ اخلاق وکردار کی بربادی کے لیے متعہ جیسی حیا سوز بدکاری کو نہ صرف عام کیا جاتا ہے بلکہ خود ساختہ احادیث کے ذریعے اس کے فضائل ومناقب بھی بیان کیے جاتے ہیں۔

یہ چند ایک اصولی اختلافات نمونے کے طور پر ہیں ان کی موجودگی میں خود انہوں نے اپنے آپ کو اہل سنت سے الگ کر لیا ہے جبکہ ان عقائد ونظریات کی وجہ سے انہیں اہل کتاب میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا ایسے حالات کے پیش نظر ایک باغیرت مسلمان

کے شایان شان نہیں کہ وہ ان کے ساتھ رشتہ ناطہ کرے اس بنیاد پر ان کے ساتھ اہل سنت لڑکی کا رشتہ بھی ناجائز ہے اگر رشتہ ہو جاتا ہے تو دانستہ طور پر گناہ کی زندگی گزارنے کے مترادف ہے ایسا نکاح ہو جانے کے بعد سب سے بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ سرے سے یہ نکاح ہی نہیں ہوا۔ اسلام سے متصادم نظریات کے حامل انسان کے ساتھ ایک مسلمان لڑکی کا نکاح کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے، برادری اور ماحول کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگر کوئی اس ناجائز نکاح کو نبھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو مسلمان لڑکی کو اپنے دین سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور اسی طرح کی زندگی گزارنا ہوگی جس طرح یہ حضرات گزار رہے ہیں، متعہ اور تقیہ جیسے حیا سوز مناظر دیکھنے اور عمل میں لانے کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض وعناد رکھنے اور انہیں سب وشتم کرنے کے لیے بھی اپنے اندر نرم گوشہ پیدا کرنا ہوگا الغرض مذکورہ عقائد کے حامل انسان کے ساتھ ایک مسلمان لڑکی کا نکاح ناجائز ہے ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا رشتہ اور تعلق نہ رکھا جائے البتہ دعوت وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے عین ممکن ہے کہ ان کوششوں سے اللہ تعالیٰ انہیں راہ راست پر لے آئے۔

سوال بدین سندھ سے محمد نواز سومرو سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح کسی سے کر دیا بوقت نکاح حق مہر کا تعین نہ ہوا۔ چند روز کے بعد لڑکے کے والدین نے خود ہی حق مہر کی رقم مقرر کر دی۔ نکاح نامہ میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا۔ نکاح کے بعد چند وجوہات کے پیش نظر لڑکی اپنے سسرال نہیں گئی۔ اب شرعی لحاظ سے ایسے نکاح کی کیا حیثیت ہے۔ اگر نکاح صحیح ہے تو حق مہر کی ادائیگی ضروری ہے یا نہیں؟ اگر لڑکا حق مہر ادا کرنے سے انکار کر دے تو اس کا کیا حل ہے۔ واضح رہے کہ لڑکے نے اب طلاق دے دی ہے۔

جواب مہر اس مال کا نام ہے جو عورت کو نکاح کے بعد اس سے ازدواجی تعلقات کے عوض دیا جاتا ہے۔ لیکن اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مہر کا ذکر کئے بغیر اگر نکاح ہو جائے تو وہ شرعاً صحیح اور درست ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم طلاق دو اپنی بیویوں کو جنہیں تم نے چھوا تک نہیں اور نہ ہی ان کا حق مہر مقرر کیا ہے''۔ [۲/البقرۃ:۲۳۶]

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسے نکاح کے بعد طلاق دینا جس میں حق مہر مقرر نہ ہوا ہو کوئی گناہ نہیں ہے۔ چونکہ طلاق، نکاح کے بعد دی جاتی ہے اس لیے یہ آیت مہر مقرر کیے بغیر نکاح کے جواز کی دلیل ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں نکاح کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب اگر نکاح کے بعد رخصتی (تعلقات زن وشوئی یا خلوت صحیحہ) کے مراحل بخیر وخوبی سرانجام پا چکے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہیں۔

① نکاح سے پہلے جو حق مہر طے پا چکا ہے اگر اس پر فریقین کا اتفاق ہے تو خاوند کے ذمہ یہی واجب الادا ہوگا۔

② اگر اس پر اتفاق نہیں ہوا۔ محض یکطرفہ تجویز تھی تو اسے مہر مثل ادا کرنا ہوگا۔ مہر مثل سے مراد امثال واقران (حقیقی بہنوں، پھوپھیوں یا چچا زاد بہنوں وغیرہ) کا مہر ہے۔ جو اس عورت کے مثل دوسری عورت کا مقرر ہوا ہو۔ اس کے تعین کے لیے ہم مثل عورتوں کی عمر، حسن وجمال، علم وعقل، دینداری اور اخلاق وکردار کا لحاظ بھی رکھا جائے گا۔ اگر نکاح کے بعد رخصتی (تعلقات زن وشوئی یا خلوت صحیحہ) کے مراحل ابھی تک طے نہیں ہوئے تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

① نکاح سے پہلے طے ہونے والے حق مہر پر اگر اتفاق ہے تو طلاق کے بعد اس کا نصف خاوند کے ذمہ واجب الادا ہوگا۔

[۲/البقرہ:۲۳۷]

② اگر حق مہر پر اتفاق نہیں ہوا تو چونکہ رشتہ جوڑنے کے بعد توڑ دینے کی شکل میں عورت کا کچھ نقصان تو ہوا ہے۔اس لیے خاوند کی حیثیت کے مطابق عورت کے اس ''نفسیاتی نقصان'' کی تلافی ہونا ضروری ہے۔ [۲/البقرہ:۲۳۶]

واضح رہے کہ خاوند شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً مذکورہ حقوق کی ادائیگی کا پابند ہے۔

سوال گوجرانوالہ سے عبدالحمید لکھتے ہیں کہ ایک لڑکے کی شادی کے وقت عمر۱۲ سال تھی، جبکہ بیوی کی عمر تقریباً ۲۴ سال تھی صرف ایک رات کے لیے رخصتی ہوئی بعد ازاں طلاق ہوگئی، پھر خاوند نے اس کے بعد کسی دوسری عورت سے شادی کر لی اور مطلقہ بیوی کا نکاح بھی کسی دوسری جگہ کر دیا گیا، دوسرے خاوند سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، اب پہلا خاوند اپنی سابقہ مطلقہ بیوی کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو دوسرے خاوند سے پیدا ہوئی ہے اور دوسرا خاوند اس کے عوض طلاق دہندہ کی لڑکی سے شادی رچانے کا پروگرام رکھتا ہے ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟۔

جواب طلاق دہندہ کے لیے اپنی مطلقہ بیوی کی لڑکی سے نکاح کرنے کے متعلق ہم نے متعدد اہل علم سے رابطہ کیا اور انتہائی غور وخوض کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کوئی شخص کسی ایسی لڑکی سے نکاح نہیں کرسکتا جس کی ماں کے ساتھ تعلقات زن وشوئی قائم کر چکا ہے، قطع نظر کہ وہ لڑکی نکاح کے وقت موجود ہو یا طلاق دینے کے بعد کسی اور خاوند سے ہو۔ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تمہارے لیے تمہاری ان بیویوں کی لڑکیاں حرام ہیں جن سے تم وظیفہ زوجیت ادا کر چکے ہو''۔ [۴/النسآء: آیت ۲۳]

اس قسم کی لڑکی کو شرعی اصطلاح میں ''رَبیبہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ رَبیبہ اپنے سوتیلے باپ کے لیے اجنبی ہوتی ہے۔ ماں سے نکاح کے بعد باہمی مقاربت سے اس لڑکی کی اجنبیت ختم ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنے سوتیلے باپ کے عقد میں نہیں آسکتی۔ اس ربیبہ کے حرام ہونے میں اس کی ماں سے نکاح کے بعد دخول کرنے کا اعتبار کیا گیا ہے۔ عام طور پر ربیبہ اس لڑکی کو کہا جاتا ہے جو ماں سے نکاح کے وقت موجود ہو لیکن بیشتر فقہا نے اس کی تعریف ''بنت الموطوءۃ'' کے الفاظ سے کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی لڑکی جس کے ساتھ ملاپ ہو چکا ہے' احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مطلقہ کی ہر قسم کی لڑکیاں طلاق دہندہ کے لیے حرام قرار دی جائیں خواہ وہ نکاح کرتے وقت موجود ہوں یا طلاق دینے کے بعد اس کے بطن سے پیدا ہوئی۔ اس بنا پر صورت مسئولہ میں اگر ۱۲ سالہ لڑکے نے اپنی بیوی سے دوران رخصتی ملاپ کرلیا ہے تو طلاق دینے کے بعد اس مطلقہ کی جملہ لڑکیاں اس کے لیے حرام ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی لڑکیوں کو خاوند پر حرام قرار دینے کے لیے ماں سے دخول کا اعتبار کیا ہے اگر اس وقت ملاپ نہیں ہوا تو اس صورت میں مطلقہ بیوی کی لڑکی سے نکاح ہوسکتا ہے۔ لیکن اس نکاح میں ایک اور قباحت بھی ہے جو نکاح کے لیے رکاوٹ کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ آپس میں مشروط طور پر تبادلہ نکاح جسے ''شغار'' کہا جاتا ہے شریعت نے اس قسم کے نکاح کے متعلق حکم امتناعی جاری کیا ہے۔ اس لیے شریعت کے ضابطوں کو اپنی خواہشات نفس پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔ نکاح کے معاملات بہت غور وخوض کے متقاضی ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے تمام پہلوؤں سے جانچ پڑتال کرنا ضروری ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال محمد سعید بن عبدالعزیز فیصل آباد سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی بہن کا نکاح اس کی صغرسنی میں کسی سے کر دیا لیکن

ہماری بہن نے بلوغ کے بعد وہاں رہنے سے انکار کر دیا ہم نے مقامی مصالحتی کونسل سے تنسیخ نکاح کے احکام حاصل کر لیے پھر سول جج سے بھی ڈگری لی نیز ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے بھی سول جج کے فیصلہ کو برقرار رکھا۔اب ہم اپنی بہن کی رضامندی سے اس کی شادی کسی دوسری جگہ کرنا چاہتے ہیں،اس کے لیے شرعی فتویٰ درکار ہے۔

جواب شریعت اسلامیہ نے نکاح جیسے اہم معاملہ میں فریقین کی اجازت اور رضامندی کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔پھر صغرسنی میں ہونے والا نکاح صرف اس صورت میں برقرار رہ سکتا ہے کہ لڑکی سن شعور کو پہنچنے کے بعد اپنی رضامندی کا اظہار کر دے اگر وہ بلوغ اور سن تمیز کے بعد اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتی ہے تو اسے اپنا نکاح ختم کرنے کا اختیار ہے۔اگر لڑکا طلاق نہ دے تو عدالتی چارہ جوئی سے تنسیخ نکاح کا فیصلہ لینا چاہیے۔صورت مسئولہ میں مقامی مصالحتی عدالت اور سول جج سے تنسیخ نکاح کا فیصلہ ہو چکا ہے پھر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ نے بھی اس فیصلے کی توثیق کر دی ہے اب لڑکی کا نکاح اس کی رضامندی سے کسی مناسب جگہ پر کیا جا سکتا ہے۔تاکہ لڑکی اپنی زندگی کے باقی ایام باعزت طور پر گزار سکے۔آخر میں ہم یہ کہنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ نکاح کے معاملات جلد بازی اور جذباتی انداز سے طے نہیں کرنے چاہئیں۔بلکہ زندگی کے اس بندھن کو نہایت سنجیدگی اور پوری چھان پھٹک کے بعد سرانجام دینا چاہیے تاکہ نکاح کے بعد آنے والی زندگی خوش اسلوبی اور باہمی محبت واتفاق سے گزرے اصل معاملات تو اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں تاہم ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم ایسے معاملات انتہائی غور وخوض کے بعد سرانجام دیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال مظفر گڑھ سے محمد اکبر لکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی نابالغ بیٹی کا نکاح کر دے تو کیا ایسا نکاح درست ہے۔اگر بالغ ہو کر لڑکی اس نکاح کو تسلیم نہ کرے تو شرعی طور پر اس کا کیا حل ہے؟

جواب شریعت کی رو سے بچپن کی حالت میں کیا ہوا نکاح صحیح اور درست ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی بچپن کی حالت میں ہوا تھا۔جیسا کہ احادیث میں اس کا ذکر موجود ہے۔قرآن مجید نے بھی اس کے متعلق واضح اشارہ دیا ہے۔البتہ نابالغہ کو یہ حق دیا گیا ہے کہ بالغ ہو جانے کے بعد اسے اختیار ہے چاہے تو سرپرست کے نکاح کو برقرار رکھے یا اسے مسترد کر دے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چند ایک لڑکیوں کو ایسے نکاح رد کر دینے کا اختیار دیا تھا جو ان کی مرضی کے خلاف کر دیئے گئے تھے۔چنانچہ حدیث میں ہے:''ایک کنواری لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ میرے باپ نے میری شادی ایسی جگہ پر کر دی ہے جسے میں پسند نہیں کرتی ہوں۔اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دیا کہ چاہے تو اسے برقرار رکھے یا فسخ کر دے''۔ [ابوداود: کتاب النکاح]

اسی طرح خنساء بنت خذام رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میرے باپ نے میری شادی کر دی جو مجھے ناپسند تھی،میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نکاح فسخ کر دیا''۔ [بخاری: کتاب النکاح]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر سرپرست کسی نابالغہ کا نکاح اپنی مرضی سے کر دے اور بلوغت کے بعد وہ لڑکی اسے پسند نہ کرے تو اسے پورا پورا اختیار حاصل ہے۔چونکہ اس دور میں اس اختیار کو غلط طور پر استعمال کیا جاتا ہے اس لیے ناجائز مطلب برآری کی روک تھام کے لیے چند ایک شرائط بیان کی جاتی ہے۔

☆ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کے والدین یا سرپرست اپنی برادری کی مجبوری یا باہمی ناچاقی کی وجہ سے اپنی لڑکی وہاں آباد نہیں

کرنا چاہتے۔ جہاں بچپن میں اس کا نکاح ہوا تھا لیکن وہ اپنی عزت کو بھی داغدار نہیں کرنا چاہتے۔ اس بنا پر وہ لڑکی کو ''خیار بلوغ'' کا فرما دیتے ہیں یہ حیلہ اس لیے کارگر نہیں ہے کہ خیار بلوغ عرصہ دراز تک قائم نہیں رہتا۔ بلوغ کے عرصہ دراز کے بعد یہ اختیار غیر مؤثر ہوگا لڑکی کو چاہیے کہ اگر وہ اس نکاح کو ناپسند کرتی ہے تو سن شعور وتمیز کے بعد اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دے۔ اگر پہلے سے اسے علم نہ تھا تو جب بھی بالغ ہونے کے بعد اسے علم ہو تو فوراً اپنے خیار بلوغ کو استعمال کرتے ہوئے اپنی رائے کو ظاہر کر دے۔ بصورت دیگر طرفین کی خاموشی سے رضامندی سمجھی جائے گی جس سے خیار بلوغ ساقط ہو جائے گا۔

☆ صرف خیار بلوغ کے استعمال سے نکاح فسخ نہیں ہوگا بلکہ اس سلسلہ میں عدالت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ یا اپنے گاؤں کے سرکردہ آدمیوں پر مشتمل پنچایت میں اپنا معاملہ پیش کر دیا جائے۔ جب تک اپنی پسندیدگی کے اظہار کے بعد عدالت یا پنچایت فیصلہ نہ کرے، نکاح فسخ نہیں ہوگا۔ [واللہ اعلم]

سوال وہاڑی سے رضوان اللہ لکھتے ہیں کہ ایک آدمی کا کسی ٹیچر لڑکی سے نکاح ہوا وہ اس وقت اس کی تنخواہ وصول کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ عورت کی آمدنی صرف شوہر کے لیے ہے عورت کو جائیداد بنانے کا شریعت نے حق نہیں دیا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد بھی عورتوں کے حق ملکیت کو برقرار رکھا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''عورتوں کو ان کے حق مہر خوشی سے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے انہیں چھوڑ دیں تو اسے ذوق وشوق سے کھالو''۔ [۴/النسآء:۴]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہر کے متعلق عورت کا حق ملکیت ثابت کیا ہے، اسی طرح وراثت وغیرہ کے کئی ایک مسائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو جائیداد بنانے کا شرعی حق ہے بلکہ بعض احادیث سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مالدار صحابیات اپنے شوہروں کو زکوٰۃ بھی دیتی تھی۔ چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنے خاوند حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر مال زکوٰۃ صرف کروں تو کیا یہ جائز ہے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! اس کے لیے دو اجر ہیں ایک رشتہ سے حسنِ سلوک کرنے کا اور دوسرا صدقہ کرنے کا''۔

[صحیح بخاری: کتاب الزکوٰۃ' باب الزکوٰۃ علی الزوج]

اسی طرح حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے بچوں پر مال زکوٰۃ خرچ کرتی تھیں۔

[صحیح بخاری حوالہ مذکورہ]

اندریں حالات بیوی کو شریعت نے یہ حق دیا ہے اگر وہ اپنی تنخواہ الگ رکھنا چاہتی ہے تو اسے یہ حق پہنچتا ہے۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں زیادتی کا مرتکب نہ ہو۔ البتہ خاوند کو یہ حق بھی شریعت نے دیا ہے کہ بیوی کی ملازمت اگر حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث ہے تو بیوی کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کر سکتا ہے اور بیوی کے لیے اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال لودھراں سے قاری عمر فاروق ثاقب (خریداری نمبر ۵۱۸۸) لکھتے ہیں کہ میں نے دوسری شادی کی ہے، میری پہلی

بیوی کا بیٹا دوسری بیوی نے پالا، لیکن دودھ نہیں پلایا، میرا بیٹا گویا اس کا بیٹا ہوا، ایسے حالات میں میری سالی یا خوش دامن اس بیٹے سے پردہ کرے گی یا نہیں؟

جواب سوال میں ''میرا بیٹا گویا اس کا بیٹا ہوا'' بڑا خطرناک جملہ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف دو عورتوں کو ماں کا مقام دیا ہے چنانچہ ایک وہ ماں ہے جس نے اسے جنم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے ہیں''۔ [۵۸/المجادلہ:۲]

دوسری وہ ماں ہے جس نے جنم تو نہیں دیا لیکن بچے کو ابتدائی دو سال کی مدت میں کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پلایا ہے، اس کے متعلق ارشادی باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہاری وہ مائیں بھی حرام ہیں جنہوں نے دودھ پلایا ہو''۔ [۴/النسآء:۲۳]

پہلی ماں کو حقیقی اور دوسری کو رضاعی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ کسی تیسری عورت کو ماں نہیں کہا جاتا اور نہ ہی اس کی طرف بیٹا ہونے کی نسبت کی جا سکتی ہے۔ دوسری بیوی نے صرف پہلی بیوی کے بچے کی پرورش کی ہے پرورش کرنے سے وہ بیٹا نہیں بن جائے گا، البتہ اس سے پردہ نہ کرنے کی دیگر وجوہات ہیں، ان میں پرورش کرنا یا نہ کرنا اس کو کوئی دخل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو جن محارم کے سامنے اظہار زینت کی اجازت دی ہے، ان میں سے خاوند کا وہ بیٹا بھی ہے جو اس کے بطن سے نہ ہو، بلکہ کسی دوسری بیوی سے پیدا ہوا ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے خاوندوں ...... یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے......''۔ [۲۴/النور:۳۱]

یہی وجہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح نہیں کر سکتا، لیکن دوسری بیوی کی بہن (سالی) اور اس کی ماں (خوش دامن) سے ذکر کردہ لڑکے کا کوئی دودھ یا سسرالی رشتہ نہیں ہے، لہٰذا انہیں اس سے پردہ کرنا ہوگا، پردہ نہ کرنے کی رعایت صرف دوسری بیوی کے لیے ہے، بیوی کی بہنیں اور ماں اس کے لیے غیر محرم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سوال غریب آباد جہانیاں سے حافظ محمد شفیع لکھتے ہیں کہ ایک لڑکی کی اس کے بہنوئی نے پرورش کی اور اس کی شادی کا فریضہ بھی اپنے ہاتھوں سرانجام دیا۔ اب کیا وہ اپنے بہنوئی سے پردہ کرے گی جبکہ اس کی بہن، بہنوئی کے نکاح میں موجود ہے......؟

جواب پردے کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''نبی ﷺ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو''۔ [۳۳/الاحزاب:۵۳]

روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کر چکے تھے کہ آپ کے ہاں بھلے اور برے لوگ آتے ہیں کاش! آپ اپنی ازواجِ مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دیں، لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے اس لیے آپ اللہ کی طرف سے اشارہ کے منتظر رہے آخر کار یہ حکم آگیا کہ محرم مردوں کے علاوہ کوئی مرد آپ کے گھر نہ آئے اور جس غیر محرم کو خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے، اگلی آیت میں ان محرم رشتہ داروں کی فہرست ہے جن سے پردہ ضروری نہیں ہے چنانچہ فرمایا: ''ازواج مطہرات کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں''۔

[۳۳/الاحزاب:۵۵]

اس فہرست میں بہنوئی کا ذکر نہیں ہے لہٰذا اس سے پردہ کرنا ضروری ہے، اس آیت میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلہ والدین ہیں یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا ہے کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آ جانے کے بعد ان کے ذکر کی حاجت نہیں ہے کیوں کہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے، بہر حال بہنوئی ان محرم رشتہ داروں میں شامل نہیں ہے جس سے پردہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ پردہ کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ جس سے عورت کا نکاح کسی وقت بھی ہو سکتا ہو اس سے پردہ کرنا ضروری ہے، بہنوئی اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی بیوی فوت ہو جائے یا اسے طلاق مل جائے۔ پردے کے متعلق یہ ابتدائی احکام تھے سورۂ نور میں احکام ستر بیان کیے گئے ہیں وہاں بھی جن لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ان میں بہنوئی شامل نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ وہ (عورتیں) اپنا بناؤ سنگار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے (شوہروں کے بھائی، اپنے بیٹے، بھائی، شوہروں کے بیٹے، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے......)

 [۲۴/النور:۳۱]

صورت مسئولہ میں اگرچہ بہنوئی نے اپنی سالی کی پرورش کی اور اس کی شادی کا فریضہ بھی اپنے ہاتھوں سے سر انجام دیا ہے تاہم وہ اس کے لیے محرم نہیں ہے جس سے پردہ اٹھا دیا گیا ہو، بلکہ وہ اس کے لیے غیر محرم ہے جس سے پردہ ضروری ہے۔

سوال میاں چنوں سے عبدالحنان سوال کرتے ہیں کہ آیا اپنے دادا کی بھتیجی سے نکاح ہو سکتا ہے؟

جواب قرآن کریم نے جن خونی رشتوں کی حرمت کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں: مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھانجیاں، ان کے علاوہ دیگر خونی رشتوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ان کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انہیں اپنے اموال کے ذریعے سے حاصل کرنا تمہارے لیے حلال کر دیا گیا۔ بشرطیکہ حصار نکاح میں ان کو محفوظ کرو نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔'' [۴/النساء:۲۴]

صورت مسئولہ میں جس خونی رشتے کا ذکر ہے وہ باپ کی چچا زاد بہن ہے، اس کا محرمات میں کوئی ذکر نہیں، لہٰذا یہ حلال اور جائز ہے اگر باپ کی حقیقی بہن ہوتی تو یہ رشتہ بنص قرآن حرام تھا لیکن مذکورہ رشتہ اس کے علاوہ ہے چونکہ حقیقی پھوپھی نہیں ہے اس لیے اسے نکاح میں لایا جا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ بیٹیوں میں نواسیاں، پوتیاں اور پڑپوتیاں تمام شامل ہیں، اسی طرح بہنوں میں حقیقی، مادری اور پدری بہنیں، سب حرام ہیں۔ نیز باپ اور ماں کی بہن خواہ حقیقی ہو، خواہ مادری یا باپ شریک بہر حال وہ بیٹے پر حرام ہے۔ اسی طرح بھائی اور بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یا باپ شریک ان کی بیٹیاں ایک شخص کے لیے اپنی بیٹی کی طرح حرام ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے محمد سلیم قریشی سوال کرتے ہیں کہ بیوہ اور اس کی لڑکی کا نکاح دو بھائیوں سے ہو جاتا ہے یعنی ایک بھائی سے والدہ اور دوسرے بھائی سے اس کی لڑکی کا نکاح ہو جاتا ہے کیا ان بھائیوں کی اولاد کا باہمی رشتہ ہو سکے گا یا نہیں؟

جواب اس رشتہ ازدواج کے دو پہلو ہیں ایک خاوند کی طرف سے اور دوسرا بیوی کی طرف سے، اگر خاوندوں کی طرف سے

دیکھا جائے تو وہ دونوں بھائی ہیں اور بھائیوں کی اولاد کا باہمی رشتہ ہوسکتا ہے۔لیکن بیویوں کی طرف سے دیکھا جائے تو ان کی اولاد کا باہمی رشتہ نہیں ہوسکے گا۔کیوں کہ ایک بھائی کے گھر والدہ اور دوسرے بھائی کے گھر اس کی بیٹی ہے والدہ کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد بیٹی کے بہن بھائی ہوں گے،ان بہن بھائیوں کا رشتہ بیٹی کی اولاد سے نہیں ہوسکے گا۔کیوں کہ خالہ بھانجے اور ماموں بھانجی کا رشتہ نہیں ہوسکتا۔البتہ والدہ کے پوتوں، پوتیوں اور نواسوں،نواسیوں سے بیٹی کی اولاد سے نکاح ہوسکتا ہے۔ان کے رشتے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال دیپال پور سے محمد حسین لکھتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی،ابھی چھ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے اپنی مطلقہ بیوی کی بھانجی سے شادی کر لی،قرآن وحدیث کی رو سے اس نکاح کی کیا حیثیت ہے؟

جواب بشرط صحت سوال وصحت نکاح واضح ہو کہ مسئلہ درپیش کی دو صورتیں ہیں:

① اگر فیصلہ کن طلاق دی ہے یعنی ایسی طلاق جس کے بعد رجوع ناممکن ہوتا ہے جیسا کہ تیسری طلاق دینے کے بعد حق رجوع ساقط ہو جاتا ہے۔اس صورت میں طلاق دینے کے فوراً بعد ایسی عورت سے نکاح کیا جاسکتا ہے جو پہلی بیوی کی موجودگی میں حرام تھی۔مثلاً بیوی کی بھانجی، بھتیجی یا ہمشیرہ وغیرہ۔

② اگر طلاق رجعی ہے یعنی ایسی طلاق جس کے بعد دورانِ عدت رجوع کیا جاسکتا ہے تو اس صورت میں دورانِ عدت کسی ایسی عورت سے نکاح نہیں کیا جاسکتا جو مطلقہ بیوی کی موجودگی میں حرام تھی۔کیوں کہ مطلقہ عورت جس سے رجوع ممکن ہے من وجہ بیوی ہی رہتی ہے جب تک اس کی عدت ختم نہیں ہوگی۔اگر دورانِ عدت خاوند فوت ہو جاتا ہے تو اس قسم کی مطلقہ بیوی کو خاوند کی جائیداد سے حصہ ملتا ہے۔البتہ عدت ختم ہو جانے کے بعد مکمل طور پر رشتہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور مطلقہ عورت ہر لحاظ سے سابقہ خاوند کے لیے اجنبی بن جاتی ہے۔اس صورت میں بھانجی وغیرہ سے نکاح ہوسکتا ہے،صورت مسئولہ میں اگر بھانجی سے نکاح کرتے وقت پہلی بیوی طلاق رجعی کی عدت گزار رہی تھی تو سرے سے یہ نکاح نہیں ہوا ہے،اسے کالعدم سمجھتے ہوئے مزعومہ بیوی خاوند کے درمیان فوراً تفریق کرادی جائے اور پہلی بیوی کی عدت کے اختتام کا انتظار کیا جائے۔اس کے ساتھ ساتھ اگر دوسری منکوحہ یعنی بیوی کی بھانجی سے مقاربت ہو چکی ہے تو استبرائے رحم کے لیے ایک حیض آنے کے بعد ہی اس سے نکاح ہوسکے گا اب گویا خاوند کو دو طرح سے انتظار کرنا ہوگا۔

① مطلقہ بیوی کے اختتام عدت تک جو تین حیض ہے۔

② دوسری کالعدم منکوحہ کی عدت استبرائے رحم جو ایک حیض ہے،بشرطیکہ اس سے مقاربت ہو چکی ہو۔

حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: جس کے پاس چار بیویاں ہیں ان میں سے کسی ایک کو اس نے تیسری طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے تو طلاق کے فوراً بعد کسی دوسری عورت کو بحیثیت چوتھی بیوی اپنے عقد میں لاسکتا ہے اس طرح اس کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی سے بھی نکاح کر سکتا ہے اور اگر رجعی طلاق دی ہے تو دورانِ عدت مذکورہ عورتوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح نہیں ہوسکے گا۔جب تک اس کی عدت پوری نہ ہو جائے۔ [محلیٰ ابن حزم: کتاب الطلاق]

اگر کوئی اجنبی عورت ہوتی تو صورت مسئولہ کے فوراً بعد نکاح ہوسکتا تھا، لیکن بھانجی وغیرہ سے دورانِ عدت نکاح جائز نہیں ہے۔

سوال کراچی سے آمنہ خاتون لکھتی ہیں کہ اسلام میں وٹہ سٹہ کی شادی کی کیا حیثیت ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ اسلام میں وٹہ سٹہ کی شادی ناجائز اور حرام ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ اسلام میں نکاح شغار (وٹہ سٹہ) کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔'' [صحیح مسلم، کتاب النکاح]

شغار کی تعریف یہ ہے کہ آپس میں یوں کہا جائے، تو اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے اس شرط پر کر دے کہ میں اپنی لڑکی تیرے نکاح میں دے دیتا ہوں، بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ اس شرط کے ساتھ ساتھ دونوں لڑکیوں کا کوئی الگ حق مہر مقرر نہ کیا جائے۔

واضح رہے کہ مہر ہونے یا نہ ہونے سے نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ نتائج وعواقب کے لحاظ سے دونوں صورتیں یکساں حکم رکھتی ہیں، اگر ایک لڑکی کا گھر برباد ہوتا ہے تو دوسری بھی ظلم وستم کا نشانہ بن جاتی ہے، قطع نظر کہ نکاح کے وقت ان کا الگ الگ مہر مقرر کیا گیا تھا یا نہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس طرح کے ایک نکاح کو باطل قرار دیا تھا حالانکہ ان کے درمیان مہر بھی مقرر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہی وہ شغار ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے ہمیں منع فرمایا تھا۔ [ابوداود: کتاب النکاح، باب فی الشغار]

ہمارے نزدیک اس قسم کے نکاح کی تین صورتیں ممکن ہیں:

① نکاح کا معاملہ کرتے وقت ہی رشتہ لینے دینے کی شرط کر لی جائے۔ یہ صورت بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

② نکاح کے وقت شرط تو نہیں کی البتہ آثار وقرائن ایسے ہیں کہ شرط کا سا معاملہ ہے انجام کے لحاظ سے یہ بھی شغار ہے اور ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

③ نکاح کے وقت شرط بھی نہیں اور نہ ہی آثار وقرائن شرط جیسے ہیں، اس صورت کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ یہ تبادلہ نکاح محض اتفاقی ہے، اس طرح کے نکاح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں متعدد مرتبہ ہوئے ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بہاولنگر سے رحمت اللہ رحیق لکھتے ہیں کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں نکاح شغار کی شرعی حیثیت بیان کریں، ہم اس مسئلہ میں بہت پریشان ہیں اور کئی گھرانوں کا سکون برباد کر رکھا ہے۔

جواب ہمارے ہاں شریعت سے ناواقفی کی بنا پر اکثر لوگ آبائی رسم ورواج کے پابند ہیں جن میں سے بعض رسوم شریعت کے سراسر خلاف ہیں ان میں سے ایک رسم نکاح وٹہ سٹہ بھی ہے، اس قسم کے نکاح کو عربی زبان میں نکاح شغار کہا جاتا ہے، جس کے متعلق اسلام نے حکم امتناعی جاری کیا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ دین اسلام میں نکاح وٹہ سٹہ کا کوئی وجود نہیں''۔ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۳۴۶۸]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے نکاح سے منع فرمایا ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب النکاح]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم میں ان احادیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔ ''نکاح شغار اور اس کا بطلان''۔ کتب حدیث میں بعض روایان حدیث سے اس کی تفسیر بھی منقول ہے حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''کہ نکاح شغار بایں طور ہے کہ آدمی اپنی بیٹی کا نکاح

کسی دوسرے شخص سے اس شرط پر کرے کہ وہ بھی اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کرے گا۔ درمیان میں حق مہر بھی نہ ہو۔''

[صحیح مسلم: حدیث نمبر ۳۴۶۵]

حضرت ابن نمیر کی تعریف میں حق مہر وغیرہ کا ذکر نہیں ہے مطلق طور پر مشروط نکاح کرنا شغار ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح شغار میں مہر کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے جس کے ہونے یا نہ ہونے سے حرمت نکاح شغار متاثر نہیں ہوتی، اگرچہ بعض اہل علم کی طرف سے یہ نکتہ اٹھایا جاتا ہے کہ اگر درمیان میں مہر رکھ دیا جائے تو اس قسم کا نکاح ''شغار'' کی تعریف میں نہیں آتا حالانکہ اس نکاح کے حرام ہونے کی وجہ وہ منفی اور انتقامی جذبات ہیں جو غیر شعوری طور پر اختلافات کے وقت طرفین میں سرایت کر جاتے ہیں جیسا کہ معاشرتی طور پر اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے چونکہ انجام اور نتیجہ دونوں کا ایک ہوتا ہے، لہٰذا مہر ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کے علاوہ کتب حدیث میں ایک واقعہ منقول ہے کہ عباس بن عبداللہ بن عباس نے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمٰن بن حکم سے کر دیا اور عبدالرحمٰن بن حکم نے اپنی بیٹی عباس کے عقد میں دے دی اور فریقین نے حق مہر بھی رکھا جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مدینہ کے گورنر حضرت مروان کو لکھا کہ ان دونوں کے نکاح کو کالعدم قرار دے کر ان کے درمیان تفریق کرا دی جائے یہ وہی شغار ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا۔ [ابوداؤد: کتاب النکاح، حدیث نمبر ۲۰۷۵]

بعض اہل علم نے یہاں نکتہ اٹھایا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس نکاح کو اس لیے کالعدم قرار دیا تھا کہ فریقین نے اس نکاح کو ہی ایک دوسرے کے لیے حق مہر قرار دیا تھا اور اس کے لیے ابوداؤد کی اس روایت میں ایک ضمیر کا سہارا لیتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں جتنے بھی ابوداؤد کے متداول نسخے ہیں ان میں اس ضمیر کا وجود نہیں ملتا، بہرحال اس نکاح وٹہ سٹہ (شغار) کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب کرنا ہی مؤمن کی شان ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال لیہ سے محمد حنیف لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے کسی سے رشتہ طلب کیا اس نے مشروط طور پر رشتہ دیا کہ اس کے بدلے میں ہمیں بھی رشتہ دو، میں نے اپنی چھوٹی بیٹی جس کی عمر دو سال تھی اس کا رشتہ طے کر دیا۔ انہوں نے رسم کے طور پر پانی پر دم کر کے بچی کو پلا دینے کے متعلق کہا جسے میں نے ضائع کر دیا بعد میں علما نے بتایا کہ یہ تو وٹہ سٹہ ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ یہ وضاحت سننے کے بعد میں نے اپنی بیٹی کی منگنی ختم کر دی اور فریقِ ثانی کو اس کی اطلاع کر دی۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارا بچی کو وعدہ نکاح کے وقت پانی پلانا رسم نکاح تھی، لہٰذا آپ طلاق کے بغیر اس کا آگے نکاح نہیں کر سکتے، اس سلسلہ میں میں پریشان ہوں، بچی جوان ہے، اس کا آگے نکاح کرنا چاہتا ہوں، براہِ کرم راہنمائی فرمائیں۔

جواب واضح ہو کہ سوال میں ذکر کردہ صورت ایک وٹہ سٹہ کی شکل تھی جس کو ختم کرنا ضروری تھا، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''کہ اسلام میں وٹہ سٹہ کا وجود نہیں ہے۔'' [صحیح بخاری]

اس بنا پر منگنی ختم کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ ضروری تھا، اس میں شک نہیں کہ منگنی ایک وعدہ ہوتا ہے کہ میں اپنی لڑکی کا نکاح فلاں سے کر دوں گا، اس وعدے کو پورا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو صورت مسئولہ میں منگنی کے بعد پتہ چلا کہ یہ تو وٹہ سٹہ کی صورت ہے جو اسلام میں جائز نہیں۔ لہٰذا اس وعدہ نکاح کو توڑنا ضروری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کے متعلق

فرمایا ہے’’کہ اگر کوئی قسم اٹھائے کہ فلاں کام نہیں کروں گا بعد میں پتہ چلا کہ اس سے باز رہنا خلاف شرع ہے تو اسے چاہیے کہ قسم کا کفارہ دے اور وہ کام کرے جس کے نہ کرنے کی قسم اٹھائی تھی۔‘‘ چونکہ منگنی صرف ایک وعدہ ہے، قسم نہیں ہے، جس کے ختم کرنے پر اسے کوئی کفارہ ادا کرنا پڑے۔ اسے خلاف شرع سمجھتے ہوئے ختم کر دیا گیا ہے، اس قسم کے خلاف شرع وعدے کرنا بھی شریعت میں درست نہیں ہیں، مگر دین سے ناواقف غرض مند لوگ ایسے وعدے کر لیتے ہیں پھر مصیبت میں پڑ جاتے ہیں، ہمیں چاہیے کہ بچیوں کو اللہ کی امانت سمجھتے ہوئے ان کے حقوق میں ناجائز تصرف نہ کریں، منگنی کے وقت پانی وغیرہ پلانے کو رسم نکاح قرار دینا بھی ایک جاہلانہ رسم ہے، جس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں جو منگنیاں ہوئیں انہیں نکاح نہیں قرار دیا گیا، بلکہ منگنی کے بعد باقاعدہ نکاح سے انہیں رشتہ ازواج میں منسلک کیا گیا ہے۔ حضرت جلیبیب رضی اللہ عنہ نے پہلے منگنی کی اور بعد میں نکاح ہوا۔ [مسند امام احمد]

احادیث میں اس حد تک صراحت ہے کہ اگر منگنی کے وقت لفظ نکاح بھی استعمال کیا گیا ہے تو بھی اسے منگنی ہی سمجھا جائے کیوں کہ نکاح تو ایجاب وقبول کا نام ہے، جو یہاں مفقود ہے۔ فریق ثانی کا ردعمل درست نہیں ہے کہ وہ محض ایک رسم کو نکاح قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، ان حقائق کے پیش نظر فتویٰ دیا جاتا ہے کہ منگنی صرف ایک وعدہ ہے جو خلاف شرع ہونے کی صورت میں توڑا بھی جا سکتا ہے، لہٰذا اس بچی کا نکاح آگے کیا جا سکتا ہے۔ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عارف والا سے محمد شفیق لکھتے ہیں کہ دو بھائی جو صاحب اولاد ہیں، دونوں کسی سابقہ شرط کے بغیر شرعی طور پر آپس میں اولاد کی شادیاں کرنا چاہیں یعنی ایک بھائی دوسرے کو رشتہ دے گا اور دوسرا بھائی بھی پہلے کو رشتہ دے گا، لیکن اس کے لیے پہلے کوئی معاہدہ نہیں ہے کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟۔

جواب واضح رہے کہ دو بھائیوں کا کسی قسم کی سابقہ شرط کے بغیر شرعی طور پر آپس میں اولاد کی شادیاں کرنا کوئی جرم نہیں ہے، بلکہ صلہ رحمی کی ایک بہترین صورت ہے، لیکن عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ آبائی رسم ورواج کی پابندی کے لیے ظاہری طور پر کسی مسئلہ کے جواز کا سہارا لے لیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے، ہمارے ہاں بے شمار ایسی رسوم ہیں جو شریعت اسلامیہ کے سراسر منافی ہیں، ان میں سے ایک رسم نکاح وٹہ سٹہ بھی ہے، جسے عربی زبان میں ’’نکاح شغار‘‘ کہا جاتا ہے۔ دین اسلام میں ناجائز اور حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق حکم امتناعی جاری فرمایا۔ ارشاد نبوی ہے: ’’کہ اسلام میں نکاح وٹہ سٹہ کا کوئی وجود نہیں ہے۔‘‘ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۳۴۶۹]

مذکورہ روایت میں ہی شغار کی بایں الفاظ تعریف کی گئی ہے کہ ایک آدمی دوسرے سے کہے کہ تم اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کر دو میں اپنی بچی کا نکاح تجھ سے کرتا ہوں، یہ تعریف ہمارے ہاں رائج نکاح وٹہ سٹہ پر صادق آتی ہے۔ بعض اہل علم کی طرف سے اس قسم کے نکاح کو سند جواز مہیا کی جاتی ہے کہ وہ وٹہ سٹہ کے نکاح میں اگر مہر رکھ دیا جائے تو صرف شرط رکھنے سے اس قسم کا نکاح ’’شغار‘‘ کی تعریف میں نہیں آتا۔ کیوں کہ محدثین کرام نے اس کی تعریف کرتے وقت ’’ان کے درمیان مہر نہ ہو‘‘ کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔ حالانکہ اس قسم کے نکاح کے حرام ہونے کا باعث مہر کا ہونا یا نہ ہونا نہیں ہے بلکہ وہ منفی اور انتقامی جذبات ہیں۔ جو غیر شعوری

طور پر اختلافات کے وقت فریقین میں سرایت کر جاتے ہیں۔ چونکہ انجام اور نتیجہ کے لحاظ سے اس طرح کا تبادلہ کوئی مفید چیز نہیں ہے جیسا کہ تجربات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ صورت مسئولہ میں ظاہری طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن اس کا بھی نتیجہ شغار جیسا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اسے حیلہ اور بہانہ سے جائز قرار دے لیا ہو اور اختلاف کے وقت انتقامی جذبات بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہو۔ اصل دارومدار نیت پر ہے اگر اس میں کوئی فتور نہیں تو یقیناً اس طرح کا نکاح باعث خیر و برکت ہے۔ کیوں کہ دونوں بھائی آپس میں مل بیٹھنے کا پروگرام رکھتے ہیں۔ اگر نیت صرف جواز کا حیلہ تلاش کرنا ہے تو اس غیر مشروط تبادلہ نکاح سے پرہیز کیا جائے۔ کیوں کہ مستقبل میں یہ ثمر آور ثابت نہیں ہوگا۔ نکاح کے معاملہ میں انسان کو انتہائی دور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔ کیوں کہ زندگی کا یہ بندھن صرف ایک مرتبہ ہوتا ہے یہ کوئی بجلی کا بلب نہیں ہے جب ضرورت پڑے تو لگا لیا جائے اور ضرورت پوری ہو جائے تو اتار دیا جائے، لہٰذا ہم لوگوں کو ایسے معاملات نہایت غور وخوض کے بعد پایہ تکمیل تک پہنچانے چاہئیں اپنی طرف سے اخلاص کے ساتھ کوشش کر کے پھر معاملات اللہ کے حوالے کر دیئے جائیں۔ [واللہ اعلم]

سوال ڈجکوٹ سے عبدالقدوس لکھتے ہیں کہ میری آج سے پانچ سال قبل شادی اپنی خالہ زاد سے ہوئی تھی اور اب ہمارے دو بچے بھی ہیں۔ مجھے والدہ نے کئی مرتبہ بتایا کہ تیری نانی نے کئی مرتبہ تجھے دودھ پلایا تھا، اب میں پریشان ہوں کہ اگر رضاعت ثابت ہو جائے تو تعلقات کیسے ختم کئے جائیں اور بچوں کا کیا بنے گا۔ کتاب وسنت کی روشنی میں میری اس الجھن کو دور فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ شریعت اسلامیہ میں خونی تعلق کی بنا پر جو رشتے حرام ہیں دودھ پینے سے بھی وہ حرام ہو جاتے ہیں۔ خونی رشتہ کی وجہ سے حرام ہونے والوں میں بھانجی بھی شامل ہے، نانی کا دودھ پینے سے خالہ زاد بہن، رضاعی بھانجی بن جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''دودھ پینے سے وہ تمام رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو ولادت یعنی خون سے حرام ہوتے ہیں''۔ [صحیح بخاری: کتاب النکاح]

صورتِ مسئولہ میں اگر سائل نے واقعی اپنی نانی کا دودھ پیا ہے تو اس کی خالہ زاد بیوی رضاعی طور پر اس کی بھانجی بن جاتی ہے، جس سے نکاح جائز نہیں، اس لیے فوراً اسے الگ کر دیا جائے اور بچے وغیرہ والدہ کے ہیں اور وہ اس کے پاس رہیں گے۔ البتہ والد سے بھی اس اولاد کے تعلقات استوار رہنے چاہئیں، اس قسم کا ایک واقعہ خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بھی پیش آیا تھا۔ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ام یحییٰ بن اہاب سے شادی کر لی، شادی کے بعد ایک سیاہ فام عورت نے کہا کہ میں نے تم دونوں میاں بیوی کو دودھ پلایا ہے، میں نے اسے کہا کہ مجھے اس کا علم نہیں اور نہ تو نے پہلے ہمیں اس قسم کی خبر دی ہے۔ چنانچہ میں نے سواری لی اور فوراً مدینہ منورہ رسول اللہ ﷺ کے پاس چلا آیا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جب وہ عورت اس بات کا دعویٰ کرتی ہے تو اسے صحیح تسلیم کیا جائے، لہٰذا تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔'' چنانچہ اس کے بعد میں نے مکہ آتے ہی اپنی بیوی کو چھوڑ دیا اور اس نے آگے نکاح کر لیا۔ [صحیح بخاری: کتاب النکاح]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ پھر اس عورت نے خاوند کے بھائی ظریب بن حارث سے نکاح کر لیا تھا۔ [مقدمہ فتح الباری]

سوال میں ایک الجھن ضرور ہے کہ والدہ کو اگر اس بات کا علم تھا تو اس نے بوقت نکاح اس کا اظہار کیوں نہ کیا؟ لہٰذا اس بات

کی اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیے یا پھر نانی اماں سے اس کی تصدیق کرالی جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال امامیہ کالونی لاہور سے عبدالبصیر سوال کرتے ہیں کہ ایک لڑکے نے کسی لڑکی کے ساتھ ایک دفعہ کسی عورت کا دودھ پیا' اب لڑکے کے والد نے اس کی رضاعی بہن کی حقیقی ہمشیرہ سے نکاح کر لیا ہے۔قرآن وحدیث کی روشنی میں فتویٰ دیں کہ کیا اس قسم کا نکاح جائز ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح رہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر دودھ پینے اور پلانے کے معاملہ میں بڑی لاپرواہی سے کام لیا جاتا ہے۔حالانکہ رشتہ داری اور تعلقات کے لحاظ سے یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے۔

☆ کسی لڑکے یا لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو وہ ان کے لیے ماں، اس کا شوہر باپ اور اس کی اولاد بہن بھائیوں کے حکم میں ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ جو رشتے حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں، دودھ پینے سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں۔ارشاد نبوی ہے:''دودھ پینے سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کے لحاظ سے حرام ہوتے ہیں''۔ [صحیح مسلم]

واضح رہے کہ دودھ کی وجہ سے جو رشتوں کے متعلق پابندی ہے وہ صرف پینے والے کی حد تک ہے۔اس کے بہن بھائیوں اور والدین پر اس دودھ کی وجہ سے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔یعنی یہ پابندی دودھ پینے اور پلانے والے سے آگے تجاوز نہیں کرتی۔

☆ ایک یا دو دفعہ دودھ پینے سے دودھ کا رشتہ قائم نہیں ہوتا بلکہ کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینے سے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے۔کیوں کہ حدیث میں ہے کہ کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوگی۔ایک یا دو دفعہ پینے سے کوئی اثر نہیں ہوگا۔

☆ حرمت کے لیے دودھ پینے کا اعتبار اس زمانہ میں ہوگا جب شیر خوارگی پر ہی اس کی غذا کا انحصار ہو وہ مدت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے۔اگر کسی نے ایسے وقت میں دودھ پیا جب غذا کا انحصار دودھ پر نہ تھا تو اس سے حرمت ثابت نہ ہوگی۔حدیث میں اس بات کی بھی وضاحت ہے کہ حرمت کے لیے اس دودھ کا اعتبار کیا جائے گا جو جسم کی نشوونما کا باعث ہو۔

اس وضاحت کے بعد صورت مسئولہ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔اس میں کوئی تفصیل نہیں ملتی کہ لڑکے اور لڑکی نے کس عورت کا دودھ پیا ہے۔اس کی تین صورتیں ہیں:

① ان دونوں نے لڑکے کی ماں کا دودھ پیا ہے۔

② ان دونوں نے لڑکی کی ماں کا دودھ پیا ہے۔

③ ان دونوں نے کسی اجنبی عورت کا دودھ پیا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں شرعی لحاظ سے لڑکی کی حقیقی بہن کا لڑکے کے باپ سے کوئی رضاعی تعلق قائم نہیں ہوا اور نہ ہی بہن کا دودھ پینا اس کی حرمت پر اثر انداز ہوگا لہٰذا اس سے نکاح کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کیوں کہ رضاعت صرف پینے اور پلانے کی حد تک قائم رہتی ہے۔جبکہ پیش آمدہ صورت میں ایسا نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال پیرووال سے محمد ارشد کا بیان ہے کہ میری بہن کا نکاح عرصہ دس سال پہلے میرے ماموں زاد سے ہوا، اب گھریلو

حالات کشیدہ ہیں تو ہماری نانی نے کہہ دیا کہ میں نے اپنے پوتے کو دو دفعہ دودھ پلایا جو ہمارا بہنوئی ہے، اب ہم پریشان ہیں کہ کیا کیا جائے جبکہ ہماری بہن کے بطن سے اولاد بھی ہے۔

جواب دودھ پلانے والی کی گواہی کو شریعت نے قبول کیا ہے بشرطیکہ وہ صداقت وعدالت میں معروف ہو چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے نکاح کیا، ایک سیاہ فام عورت نے دعویٰ کیا کہ میں نے تم دونوں کو دودھ پلایا ہے، حضرت عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ اسی وقت مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی اس مشکل کو پیش کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ جب اس نے دعویٰ کیا ہے تو اس کی بات قابل تسلیم ہے تم اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔ [صحیح بخاری، باب شہادۃ المرضعۃ]

بعض روایات میں ہے کہ اس نے واپس آکر اپنی بیوی کو فارغ کر دیا پھر اس نے اس کے بھائی ظریف بن حارث سے نکاح کر لیا، اس روایت کے مطابق نانی کی بات قبول کی جائے گی کہ اس نے اپنے پوتے کو دودھ پلایا ہے۔ اگرچہ اس میں شکوک وشبہات ضرور ہیں، لیکن نانی کے اس بیان کے باوجود نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ کیوں کہ دودھ کے مؤثر ہونے کے لیے چند ایک شرائط ہیں۔

① بچے نے کم از کم پانچ مرتبہ سیر ہو کر دودھ پیا ہو، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ایک یا دو دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ [صحیح مسلم]

بلکہ بعض روایات میں وضاحت ہے کہ پانچ دفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ [صحیح مسلم]

آپ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بیوی کو حکم دیا تھا کہ تو حضرت سالم مولیٰ حذیفہ کو پانچ مرتبہ پلا دے ایسا کرنے سے تو اس پر حرام ہو جائے گی۔

② دوسری شرط یہ ہے کہ دو سال کی مدت میں دودھ پلایا گیا ہو، دودھ پلانے کی مدت دو سال کے بعد اگر دودھ پیا جائے تو اس سے بھی حرمت ثابت نہیں ہوتی، صورت مسئولہ میں مذکورہ عورت نے دعویٰ کیا ہے کہ میں نے اس کے خاوند کو دو دفعہ دودھ پلایا ہے، دو دفعہ دودھ پلانے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا آپ کی بہن کا نکاح برقرار ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ملتان سے سید ہاشم انصاری پوچھتے ہیں کہ ایک بچے نے صرف ایک مرتبہ اپنی خالہ کا دودھ پیا کیا اس بچے کا نکاح خالہ زاد لڑکی سے ہو سکتا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب رضاعت خونی رشتے کی طرح ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو رشتے خونی تعلق کی وجہ سے حرام ہیں دودھ کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتے ہیں، لیکن دودھ کی حرمت کے لیے دو شرطیں ہیں۔

① دودھ ایسی مدت میں پیا جائے جب وہ بچے کی نشوونما کا باعث ہو اور یہ مدت دو سال ہے۔

② کم از کم پانچ مرتبہ سیر ہو کر دودھ پیا جائے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ پہلے دس مرتبہ دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی تھی اب صرف پانچ مرتبہ پینے سے حرمت ثابت ہو گی۔ [صحیح مسلم عن عائشہ]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سہلہ بنت سہل رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ سالم مولیٰ ابی حذیفہ کو پانچ مرتبہ دودھ پلا دو اس سے تم اس

پرحرام ہوجاؤ گی۔ [مسند امام احمد:۶/۲۰۱]

صورت مسئولہ میں بچے نے چونکہ ایک دفعہ اپنی خالہ کا دودھ پیا ہے اس سے حرمت ثابت نہیں ہوتی کیوں کہ حدیث میں صراحت ہے کہ ایک دودفعہ دودھ پینے سے حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ [صحیح مسلم: کتاب النکاح]

لہٰذا اس بچے کا نکاح اپنی خالہ زاد لڑکی سے ہوسکتا ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا یہی موقف ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال فیصل آباد سے سیف الرحمٰن دریافت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے بلاوجہ اپنی بیوی کو طلاق دے دی جبکہ اس کی بیوی اس کے گھر آباد رہنا چاہتی تھی۔ اس کا مہر ایک طلائی انگوٹھی تھی جس کے ادا کرنے کی وہ استطاعت رکھتا ہے لیکن اس نے اہل حدیث حضرات سے چندہ اکٹھا کر کے مہر ادا کیا ہے یہ شخص موجودہ امام کے پیچھے نماز بھی نہیں پڑھتا بلکہ وہ دورانِ جماعت بیٹھا رہتا ہے۔ جب جماعت ہوجاتی ہے تو اپنی الگ نماز پڑھتا ہے ایسے شخص کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب اسلامی قانون کی رو سے عورت کو بلاوجہ یا اپنی خودغرضی کی خاطر طلاق دینا جائز نہیں ہے بلکہ فرمانِ نبوی ہے: ''کہ اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق دینا ہے۔'' [ابوداؤد]

کیوں کہ بلاوجہ طلاق دینے سے شیطان اور اس کے کارندوں کو ہی خوشی ہوسکتی ہے جو میاں بیوی کے درمیان پھوٹ ڈال کر خاندانوں کو توڑتے ہیں اور ان میں دشمنی وعداوت پیدا کرتے ہیں۔ شریعت اسلامیہ میں طلاق صرف شدید مجبوری کے پیش نظر ہی دی جاسکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں اگرچہ طلاق بلاوجہ دی گئی ہے تاہم واقع ہوچکی ہے، اگر عورت واقعی بے گناہ اور بے قصور ہے تو طلاق دھندہ نے بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے عورت کو چاہیے کہ وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرے اللہ کے ہاں اس کے اجروثواب کو ضائع نہیں کیا جائے گا پھر حق مہر کے متعلق جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے وہ بھی انتہائی قابلِ مذمت ہے اس کی ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہوئے اہل جماعت کے سامنے دست سوال دراز کیا گیا ہے شریعت کی رو سے ایسا کرنا جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ جو انسان بلاوجہ کسی سے سوال کرتا ہے قیامت کے دن اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔'' اہل جماعت کو اگر اس کی ڈھٹائی کا علم تھا تو اس کا چندہ اکٹھا کرنا بھی باعث تعجب ہے؟ موجود امام کے پیچھے اس کا نماز نہ پڑھنا اپنی نماز کو ضائع کرنا ہے کیوں کہ جماعت کے وقت بلاعذر بیٹھے رہنا اور بعد میں اکیلے نماز پڑھنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ ایسے آدمی کو حکمت ودانائی کے ساتھ سمجھایا جائے اور جو عیوب اس میں پائے جاتے ہیں ان کی احسن انداز سے اصلاح کی جائے اگر باز آجائے تو بہتر بصورت دیگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اللہ اس کے احوال کی اصلاح فرمائے گا۔

سوال فتح پور سے ابوبکر صدیق دریافت کرتے ہیں کہ ایک آدمی کا کسی لڑکی سے صرف نکاح ہوا۔ اس نے قبل از رخصتی اسے طلاق دے دی، تحریر میں یہ بھی لکھا کہ آئندہ ہمارا آپ سے اور تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہ ہے۔ اب وہ صلح کرنا چاہتے ہیں جبکہ طلاق پر چھ ماہ گزر چکے ہیں۔

جواب واضح رہے کہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر صرف دو صورتیں ایسی ہیں کہ عام حالات میں وہ دوبارہ

اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

① خاوند زندگی میں وقفہ وقفہ بعد تین طلاقیں دے ڈالے۔ایسی صورت میں مطلقہ عورت سابقہ خاوند کے لیے حرام ہو جاتی ہے البتہ تحلیل شرعی کے بعد اکٹھا ہونے کی گنجائش ہے۔(مروجہ حلالہ اس سے مراد نہیں کیوں کہ یہ باعث لعنت ہے)

② لعان کے بعد میاں بیوی کے درمیان جو جدائی عمل میں آتی ہے اس کی وجہ سے وہ آیندہ اکٹھے نہیں ہو سکتے، کسی صورت میں ان کا باہمی نکاح نہیں ہو سکتا۔

ان دو صورتوں کے علاوہ اور کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے ازدواجی تعلقات ختم ہونے پر دوبارہ میاں بیوی کا آپس میں نکاح نہ ہو سکتا ہو۔صورت مسئولہ میں چونکہ نکاح کے بعد قبل از رخصتی طلاق ہوئی ہے۔لہٰذا ایسی صورت میں عدت وغیرہ نہیں ہوتی طلاق ملتے ہی نکاح ختم ہو جاتا ہے۔آیندہ جب بھی حالات سازگار ہو جائیں تو شرعی نکاح کرنے کے بعد میاں بیوی کے طور پر زندگی گزارنے میں شرعاً قباحت نہیں ہے، اس نئے نکاح کے لیے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

① عورت کی رضامندی۔

② سرپرست کی اجازت۔

③ حق مہر کا تعین

④ گواہوں کی موجودگی۔واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب آیت نمبر ۴۹ میں اس قسم کی طلاق کا ذکر فرمایا ہے۔

سوال بدوملہی سے چوہدری بشیر احمد بشر ملہی لکھتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو مؤرخہ ۱۹۸۶/ ۸/ ۱۲ کو طلاق لکھی، معززین نے مؤرخہ ۸۶/ ۱۱/ ۱۳ کو صلح کرادی، پھر ناراضی کی وجہ سے مؤرخہ ۸۸/ ۱۱/ ۲۹ کو طلاق دے دی، اس وقت عورت حاملہ تھی۔مؤرخہ ۸۸/ ۱۲/ ۳۱ کو یونین کونسل کی طرف سے طلاق کا نوٹس دے دیا گیا۔مؤرخہ ۸۹/ ۳/ ۸ کو وضع حمل ہوا، اس کے بعد ۸۹/ ۳/ ۲۷ کو یونین کونسل کی طرف سے طلاق کے مؤثر ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیا گیا، اب فریقین صلح کرنا چاہتے ہیں، قرآن وحدیث کی رو سے کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟

جواب قارئین کرام سے گزارش ہے کہ طلاق کے متعلق مسائل دریافت کرنے کے لیے یہ وضاحت ضرور کیا کریں کہ طلاق دیتے وقت عورت کس حالت میں تھی، آیا رخصتی ہو چکی تھی یا نہیں؟ ماہواری ایام کے متعلق بھی وضاحت درکار ہوتی ہے کہ اگر بندش ہے تو کیا صغرسنی، بڑھاپا یا حمل کی وجہ ہے، رجوع کے متعلق بھی تفصیل لکھیں کہ تجدید نکاح سے رجوع ہوا ہے یا دورانِ عدت رجوع نکاح کے بغیر ہوا ہے؟ صورت مسئولہ میں اس قسم کی کوئی وضاحت نہیں ہے جبکہ پہلی طلاق کے تین ماہ بعد معززین نے صلح کرائی ہے، تحریر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد عدت ختم ہو چکی تھی، کیوں کہ طلاق میں قمری مہینوں کا اعتبار ہوتا ہے، ان تین ماہ میں تین دفعہ حیض آنے کا دورانیہ بھی پورا ہو جاتا ہے، اب معززین نے اس وقت صلح کرائی ہے جب نکاح ٹوٹ چکا تھا، تجدید نکاح سے صلح ہو سکتی تھی، اگر دوبارہ نکاح کے بغیر صلح ہوئی ہے تو ایسا شرعاً جائز نہ تھا، بلکہ اس کے بعد جو طلاق وغیرہ دی گئی ہے اس کے مؤثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ عدت گزرنے کے بعد عورت خاوند کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے، اسے

طلاق دینا گویا کسی اجنبی عورت کو طلاق دینا ہے، جبکہ وہ طلاق کی محل نہیں ہے، اس کے برعکس اگر دوبارہ صلح تجدید نکاح کے ساتھ ہوئی ہے تو مؤرخہ ۸۸/۱۱/۲۹ والی طلاق، دوسری طلاق شمار ہوگی، مؤرخہ ۸۸/۱۲/۳۱ کو یونین کونسل کی طرف سے دیا جانے والا نوٹس طلاق شمار نہیں ہوگا، کیوں کہ یہ حضرات اپنے ضابطے کے مطابق ہر ماہ نوٹس بھیجتے رہتے ہیں، اسے ضابطے کی کارروائی تو کہا جاسکتا ہے اسے طلاق شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر یہ نوٹس خاوند کی طرف سے اس کے دستخطوں کے ساتھ بھیجا جائے تو اسے طلاق شمار کیا جائے گا، لیکن یونین کونسل کی طرف سے جو نوٹس دیا جاتا ہے وہ خاوند کی طرف سے دی جانے والی طلاق کی فوٹو کاپی ہوتی ہے، اس پر خاوند کے نئے دستخط نہیں کرائے جاتے، اس بنا پر خاوند کو وضع حمل تک تجدید نکاح کے بغیر رجوع کا حق حاصل تھا، جو اس نے استعمال نہیں کیا، اب چونکہ طلاق کے بعد مؤرخہ ۸۹/۳/۸ کو وضع حمل ہو چکا ہے، لہٰذا بچہ جنم دیتے ہی عدت بھی ختم ہوگئی ہے، اگر فریقین صلح پر آمادہ ہیں تو ازسر نو نکاح کرنے سے ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوسکتے ہیں۔ جس کے لیے چار شرائط ہیں:

① عورت نکاح کرنے پر راضی ہو۔

② سرپرست کی اجازت ہو۔

③ حق مہر کی تعیین ہو۔

④ گواہ موجود ہوں۔

لیکن یاد رہے کہ اب خاوند کے پاس طلاق دینے کا صرف ایک اختیار باقی ہے، اس کے استعمال کے بعد بیوی ہمیشہ کے لیے حرام ہو جائے گی اور عام حالات میں اس سے رجوع بھی نہیں ہوسکے گا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال گوجرہ سے محمد صابر لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی بیٹی کا نکاح کسی سے کیا لیکن رخصتی سے پہلے اس نے طلاق دے دی، تقریباً طلاق کو پانچ ماہ گزر چکے ہیں کیا اس صورت میں پہلے خاوند سے اس کا نکاح ہوسکتا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ طلاق، اللہ کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ فعل ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''حلال کاموں میں اللہ کو ناراض کردینے والی چیز طلاق ہے''۔ [ابوداؤد: حدیث نمبر ۲۱۷۸]

لیکن بعض اوقات اس قدر مجبوری بن جاتی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا، دین اسلام میں طلاق کا ایک مستقل ضابطہ ہے، اگر انسان اس پر عمل پیرا ہو کر طلاق دے تو بعد میں ندامت اور شرمساری نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ شریعت میں طلاق کی دو اقسام ہیں:

① طلاق رجعی ② طلاق بائن۔

رجعی طلاق میں خاوند کو حق ہوتا ہے کہ وہ دوران عدت اپنی بیوی سے بلا تجدید نکاح رجوع کرے اس کے برعکس طلاق بائن میں رشتہ ازدواج ٹوٹ جاتا ہے۔ طلاق بائن کی پھر دو اقسام ہیں: (بینونت صغریٰ) عدت گزرنے کے بعد رجوع کا خیال آیا تو اس صورت میں نکاح جدید کرنا پڑتا ہے۔ (بینونت کبریٰ) اس میں طلاق دینے کے بعد نکاح جدید کا حق بھی ختم ہو جاتا ہے، بینونت کبریٰ میں صرف ایک صورت نکاح کی باقی رہتی ہے کہ وہ عورت آگے کسی آدمی کے ساتھ اپنا گھر بسانے کی نیت سے نکاح کرے اگر وہ طلاق

دے دے یا فوت ہو جائے تو عدت گزرنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے، لیکن اس نکاح کا بدنام زمانہ حلالہ جیسے سازشی نکاح سے کوئی تعلق نہ ہو، کیوں کہ اس کی شریعت میں سخت ممانعت ہے۔ صورت مسئولہ میں چونکہ خاوند نے رخصتی سے پہلے طلاق دے دی ہے، قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق ایسی عورت پر کوئی عدت نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم اہل ایمان خواتین سے نکاح کرو، پھر انہیں ہاتھ لگانے سے قبل ہی طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے۔ جس کے پورے ہونے کا تم ان سے مطالبہ کرو۔'' [۳۳/الاحزاب:۴۹]

ایسی عورت کو طلاق کے فوراً بعد نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے۔ اندریں حالات اگر خاوند کا اس مطلقہ سے رجوع کا ارادہ ہو تو تجدید نکاح سے یہ ممکن ہے کیوں کہ پہلا نکاح ختم ہو چکا ہے۔ چونکہ یہ بینونت صغریٰ ہے، اس لیے نئے نکاح کی گنجائش ہے۔ لیکن اس کے لیے چار شرائط ہیں۔

① عورت رضامند ہو۔

② سرپرست کی اجازت ہو۔

③ حق مہر کی تعیین ہو۔

④ گواہ موجود ہوں۔

فقہائے اسلام نے تصریح کی ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے بغیر ہی پہلے خاوند سے نکاح ہو سکے گا۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں نئے حق مہر کے ساتھ ازسرنو اس خاوند سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال جڑانوالہ سے ملک محمد یونس خریداری نمبر ۵۲۸۲ لکھتے ہیں کہ ایک آدمی نکاح کے بعد مقاربت کئے بغیر اسے وقفہ وقفہ سے تین طلاقیں دے دیتا ہے کیا ان کا آپس میں دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے؟

جواب نکاح کے بعد مقاربت سے پہلے تین طلاقیں دینا بے سود ہیں بلکہ ایسی عورت کے لیے صرف ایک طلاق ہے، طلاق دینے کے فوراً بعد نکاح ٹوٹ جاتا ہے اس کے بعد اسے طلاق دینا ایسا ہے گویا کسی اجنبی عورت کو طلاق دے رہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم اہل ایمان خواتین سے نکاح کرو پھر انہیں ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے طلاق دے دو تمہاری (اس طلاق کے سبب سے) ان پر کچھ عدت نہیں ہے۔'' [۳۳/الاحزاب:۴۹]

ایسی عورت سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ شریعت اسلامیہ میں دو صورتیں ہیں کہ بیوی خاوند کی تفریق کے بعد عام حالات میں دوبارہ رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکتے۔

① لعان کی صورت میں، اگر علیحدگی ہوتی تو اس کی بیوی خاوند کا دوبارہ نکاح کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔

② مقاربت کے بعد جس بیوی کو وقفہ وقفہ سے تین طلاقیں دی جائیں اس سے بھی عام حالات میں نکاح نہیں ہو سکتا، اس سے نکاح کی صرف ایک صورت ہے کہ وہ آبادی کی نیت سے کسی اور آدمی سے نکاح کرے وہ اس سے مقاربت کرے پھر اتفاقاً اسے کسی وجہ

سے طلاق ہو جائے یا اس کا خاوند فوت ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔ صورت مسئولہ میں تفریق لعان یا مقاربت کے بعد تیسری طلاق سے نہیں ہوئی، لہٰذا ایسی عورت سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اس عورت پر کوئی عدت کی پابندی بھی نہیں ہے۔

سوال ٹنڈو آدم سے محمد ایوب ولد مہر دین سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دی جبکہ وہ حاملہ تھی دورانِ عدت اسے لڑکا پیدا ہوا۔ عدت کے بعد اس عورت نے آگے شادی کر لی، لڑکے نے اپنی ماں کے پاس پرورش پائی۔ یہ لڑکا اپنے باپ کی خدمت نہیں کرتا بلکہ مطلب کے لیے اس کے پاس جاتا ہے جبکہ وہ اپنی ماں اور اس کے بطن سے پیدا ہونے والے دوسرے سوتیلے بھائیوں کی خوب دیکھ بھال کرتا ہے کیا اس قسم کا لڑکا باپ کی وراثت کا حقدار ہو سکتا ہے۔

جواب ایک مسلمان کے لیے اس کے والدین کا زندہ رہنا بہت بڑی نعمت ہے اور ان کی خدمت کرنا سعادت مندی کی علامت ہے قرآن پاک میں متعدد مقامات پر اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں اس بات کا شکوہ کیا گیا ہے کہ لڑکا والد کی خدمت نہیں کرتا، لیکن سوال یہ ہے کہ والد نے اپنے بچے کی تربیت و پرداخت کے لیے کیا کردار ادا کیا ہے جو بچہ اپنی ماں کے ہاں دوران عدت پیدا ہوا اور اپنی ماں کے ہاں پروان چڑھا ہو جبکہ باپ نے اس کا خیال تک نہ رکھا ہو کیا ایسے بچے سے والد کی خدمت کے لیے کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے چاہیے تو یہ تھا کہ والد اپنے بچے کی خود تربیت کرتا اور اس کی پرورش کر کے اس کے ہاں اپنی اہمیت واضح کرتا لیکن اسے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ جہاں وہ انتہائی نفرت و حقارت کے ماحول میں پروان چڑھا ہے۔ اب والد کا یہ شکوہ کرنا کہ وہ میری خدمت نہیں کرتا اور صرف مطلب برآری کے لیے آتا ہے۔ بالکل بے محل ہے، یہ بھی یاد رہے کہ تقسیم جائیداد کا طریق کار خود اللہ تعالیٰ کا وضع کردہ ہے۔ اس میں کسی مخلوق کی طرف سے کوئی ترمیم و اضافہ نہیں ہو سکتا۔ وراثت کے محرومی کے اسباب قتل وارتداد وغیرہ ہیں جو صورت مسئولہ میں نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا جائیداد سے کسی کو صرف اس وجہ سے محروم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نافرمان ہے یا وہ والد کا خدمت گزار نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ جو مال والدین یا رشتہ دار چھوڑ مریں وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی، یہ حصے (اللہ کے) مقرر کیے ہوئے ہیں۔'' [۴/النساء:۷]

اس آیت کے پیش نظر کسی وارث کو بلا وجہ شرعی محروم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی کو یہ حق ہے۔ اخبارات میں جو آئے دن عاق نامے شائع ہوتے ہیں ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے، موجودہ صورتِ حال میں جب لڑکا اپنی ماں کے پاس ہی رہتا ہے تو اس کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد سے اس کا اچھا برتاؤ ماں کی طرف سے اس کی ذہنی تربیت کا نتیجہ ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ والد کو چاہیے کہ وہ اسے بیٹوں کا سا پیار دے تاکہ وہ اس کی خدمت کو اپنے لیے سعادت خیال کرے۔

سوال پیر محل سے سکندر حیات سوال کرتے ہیں کہ ایک عورت کو اس کے خاوند نے طلاق دے دی جبکہ وہ حاملہ تھی۔ تقریباً طلاق کے ڈیڑھ ماہ بعد وضع حمل ہوا، کیا اب رجوع ممکن ہے؟ اگر رجوع ممکن نہیں تو دورانِ عدت اپنے اخراجات اور بچے کی پیدائش کا خرچہ لے سکتی ہے؟ نیز نوزائیدہ بچے کا ذمہ دار کون ہے جبکہ والدہ اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی، اس کے علاوہ نکاح کے وقت جو

عورت کو والدین کی طرف سے ساز وسامان دیا گیا تھا یا خاوند کو سسرال کی طرف سے جو تحائف دیئے گئے تھے۔ان کی واپسی کا مطالبہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ اگر خاوند نے اپنی بیوی کو رجعی طلاق دی ہے تو عدت کے دوران اسے رجوع کرنے کا حق ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''کہ ان کے خاوند اگر صلح کرنا چاہیں تو دورانِ عدت اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔'' [۲/البقرہ:۲۲۸]

اگر عدت گزر جائے تو ایک دوسری شکل ہوگی وہ یہ کہ اگر بیوی آنے پر آمادہ ہو تو نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح جدید ہوگا کیوں کہ عدت کے گزرنے سے نکاح ختم ہو جاتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انہیں پہلے خاوند سے نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ معروف طریقہ سے آپس میں نکاح کرنے پر راضی ہوں''۔ [۲/البقرہ:۲۳۲]

صورت مسئولہ میں عورت بوقت طلاق حاملہ تھی اور حاملہ مطلقہ کی عدت وضع حمل ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل ہے''۔ [۶۵/الطلاق:۴]

مذکورہ عورت کا طلاق کے بعد وضع حمل ہو چکا ہے،جس کے ساتھ ہی اس کی عدت بھی ختم ہو چکی ہے،چونکہ نکاح بھی ختم ہو چکا ہے اب رجوع کی صرف ایک صورت ہے کہ اگر لڑکی اپنا گھر بسانے پر آمادہ ہے تو تجدید نکاح سے ایسا ممکن ہے لیکن اس کے متعلق عورت پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا،کیوں کہ اب معاملہ عورت کی صوابدید اور رضامندی پر موقوف ہے۔

دورانِ عدت خاوند کو اپنی مطلقہ بیوی کے جملہ اخراجات بھی برداشت کرنا ہوں گے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور اگر (مطلقہ عورتیں) حمل سے ہوں تو وضع حمل تک ان کا خرچہ دیتے رہو''۔ [۶۵/الطلاق:۶]

اس کے علاوہ وضع حمل پر اٹھنے والے اخراجات کا بھی خاوند سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ عورت نے بچہ خاوند کا ہی جنم دیا ہے،بچے کی پیدائش کے بعد جب ماں بچے کو دودھ پلاتی رہے گی تو اس کے جملہ اخراجات بھی بذمہ خاوند ہوں گے اور اس سے ان اخراجات کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''پھر اگر وہ بچے کو تمہارے کہنے پر دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو''۔ [۶۵/الطلاق:۶]

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''اور دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق باپ کے ذمہ ہوگا۔'' [۲/البقرہ:۲۳۳]

اگر مطلقہ بیوی بچے کو دودھ نہیں پلانا چاہتی تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:''ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان نہ پہنچایا جائے''۔ [۲/البقرہ:۲۳۳]

اندریں حالات صورت مسئولہ میں اگر مطلقہ اس نوزائیدہ بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے تو یہ اس کا حق ہے،اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔واضح رہے کہ یہ تمام باتیں اس صورت میں ہیں جب عورت رجوع یعنی تجدید نکاح پر رضامند نہ ہو اگر وہ رجوع پر راضی ہے تو

کوئی پیچیدگی نہیں ہے، رجوع نہ ہونے کی صورت میں والدین کی طرف سے اپنی بچی کو جو ساز وسامان دیا گیا خاوند سے اس سامان کی واپسی کا مطالبہ کرنا شرعاً درست ہے۔ کیوں کہ وہ لڑکی کا ذاتی سامان ہے جو اس کے والدین نے اسے استعمال کے لیے دیا تھا، طلاق کے بعد خاوند کا اس میں کوئی حق نہیں ہے لیکن جو سامان نکاح کے بعد استعمال ہو چکا ہے یا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اس کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح سسرال کی طرف سے خاوند کو شادی کے موقع پر جو تحفہ یا ہدیہ دے کر پھر اس کی واپسی کا مطالبہ کرنا ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کو چاٹتا ہے شریعت نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''کہ ہمارے ہاں ہدیہ دے کر واپسی کا مطالبہ کرنے والے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی بری مثال نہیں ہے کہ کتا اپنی قے کو چاٹتا ہے۔'' [صحیح بخاری: الھبۃ ۲۶۲۲]

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''کہ ہم قے کو حرام جانتے ہیں یعنی ھبہ دے کر واپسی کا مطالبہ کرنا حرام ہے۔''

مختصر یہ ہے کہ حاملہ عورت کو اگر طلاق دی جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہے دورانِ عدت نکاح جدید کے بغیر رجوع ہو سکتا ہے۔ وضع حمل کے بعد عورت کی رضا مندی سے نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نیا نکاح کر کے رجوع ممکن ہے۔ دورانِ عدت خاوند کو اپنی بیوی کے جملہ اخراجات برداشت کرنا ہوں گے اور بچے کی پیدائش پر اٹھنے والے اخراجات کا بھی وہ خود ذمہ دار ہے۔ شادی کے موقع پر والدین نے جو بچی کو ساز وسامان دیا تھا اس کا مطالبہ خاوند سے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس موقع پر خاوند کو جو تحائف وغیرہ دیئے گئے ہیں ان کی واپسی کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال گوجرانوالہ سے ہارون الرشید سوال کرتے ہیں کہ میرے داماد نے میری بیٹی کو طلاق دی، پھر رجوع کر لیا، کچھ عرصہ راضی خوشی رہے، اس دوران بیٹی کو حمل ٹھہرا تو اس نے پھر طلاق دے دی اور وضع حمل سے پہلے رجوع کر لیا، وضع حمل کے بعد اس نے تیسری طلاق دے دی، اب ہمارے لیے شرعی حکم کیا ہے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ دین اسلام کے بیان کردہ ضابطہ طلاق کے مطابق خاوند کو زندگی بھر تین طلاق دینے کا اختیار ہے۔ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد حق رجوع باقی رہتا ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اگر دورانِ عدت رجوع کر لیا جائے تو نکاح جدید کی ضرورت نہیں، لیکن عدت گزرنے کے بعد نکاح جدید کے بغیر رجوع نہیں ہو سکے گا۔ تیسری طلاق کے بعد حق رجوع ختم ہو جاتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''پھر اگر شوہر (دو دفعہ طلاق دینے کے بعد تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد جب تک کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس (پہلے شوہر) پر حلال نہ ہوگی۔'' [۲/البقرۃ: ۲۳۰]

حدیث کے مطابق آیت میں مذکورہ نکاح سے مراد مباشرت ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ نکاح بھی گھر بسانے کی نیت سے کیا جائے کوئی سازشی یا مشروط نکاح نہ ہو۔ جیسا کہ ہمارے ہاں بدنام زمانہ ''حلالہ'' کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنا حرام اور باعث لعنت ہے، اس شرعی نکاح کے بعد اگر دوسرا خاوند فوت ہو جائے یا کسی وجہ سے اس عورت کو طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد وہ پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔

صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو وقتاً فوقتاً تین طلاقیں دے دی ہیں، اب عام حالات میں رجوع ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ تیسری طلاق کے بعد ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی ہے۔ لڑکی کے باپ کو اس کی اطلاع ہونا ضروری نہیں۔ کیوں کہ طلاق

دینا خاوند کا حق ہے۔ جو اس نے استعمال کرلیا ہے۔ عورت کا اسے قبول کرنا یا اس کے باپ کو اس کی اطلاع ہونا وقوع طلاق کے لیے ضروری نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ساہیوال سے بشیر احمد لکھتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کو آباد کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے والد اور سسر نے زبردستی مجھ سے طلاق پر دستخط کروا لیے ہیں حالانکہ میں نے طلاق نہیں دی اور نہ ہی طلاق دینے کا ارادہ ہے۔ کیا اس طرح طلاق ہو جاتی ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ صورت مسئولہ میں سائل اس انداز سے دی ہوئی طلاق کو جبری طلاق سمجھتا ہے جیسے فقہی اصطلاح میں ''طلاق المکرہ'' کہا جاتا ہے اس بنا پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جبر و اکراہ کی حدود کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے تاکہ اس کی روشنی میں مذکورہ طلاق کا جائزہ لیا جائے کہ وہ اس ضمن میں آتی ہے یا نہیں؟ فقہا نے اکراہ کی دو اقسام بیان کی ہیں:

① اکراہ تام: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس حد تک مجبور ہو جائے کہ اس کی رضا معدوم اور اس کے اختیارات سلب ہو جائیں مثلاً اسے یا اس کے کسی عزیز کو قتل یا جسم کے کسی عضو کو بے کار کر دینے کی دھمکی یا ایسی مار کی دھمکی دی جائے جس سے جان جانے کا اندیشہ ہو اس قسم کے اکراہ کی موجودگی میں کیا جانے والا کوئی فعل (خواہ طلاق ہو) اپنے نتائج کے لحاظ سے بے اثر رہے گا۔

② اکراہ ناقص: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کسی وقت اس حد تک مجبور ہو جائے کہ اس کی رضا تو معدوم ہو لیکن اس کے اختیارات سلب ہونے کے بجائے فاسد اور خراب ہو جائیں مثلاً: ایسی دھمکی دی جائے جس سے جان جانے یا جسم کے کسی عضو کے ضائع ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہ ہو مثلاً مار پیٹ یا قید کی دھمکی وغیرہ۔ ایسے حالات میں کیا جائے والا فعل نتائج کے لحاظ سے بے اثر نہیں ہوگا۔

اکراہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ مجبور کرنے والا شخص دھمکی کو عملی شکل دینے پر قادر بھی ہو اس طرح جس شخص کو مجبور کیا جا رہا ہے اسے بھی یقین ہو کہ دھمکی دینے والا شخص اس فعل کو کر گزرے گا جس کی اس نے دھمکی دی ہے اکراہ کی ان شرائط کی عدم موجودگی میں شرعاً اکراہ ثابت نہیں ہوگا۔ صورت مسئولہ میں ''زبردستی'' کا مفہوم اگر یہ ہے کہ سائل کو قتل ہونے کا ڈر تھا یا اسے اپنے کسی عضو کے تلف ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے طلاق نامہ پر دستخط کیے ہیں تو ایسے حالات میں طلاق واقع نہ ہو گی۔ بصورت دیگر طلاق واقع ہو چکی ہے۔ اگر طلاق رجعی ہے تو دوران عدت رجوع ہو سکتا ہے اور عدت گزرنے کے بعد بھی تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے۔ والد یا سسر کا یہ کہہ دینا جبر نہیں ہوگا، اگر اس کے پس منظر میں کوئی شرعی وجوہ نہیں تو انہیں سمجھایا جا سکتا ہے۔ واضح رہے کہ جبر صرف قتل یا عضو کے ضیاع کے اندیشہ سے ثابت ہوتا ہے اس کے علاوہ والد اور سسر دونوں ہی عام طور پر بیٹے کے خیر خواہ ہوتے ہیں وہ بیٹے سے جبری طلاق لے کر دوبارہ اس کی شادی کے اخراجات برداشت کرنے کے قطعاً خواہاں نہیں ہوتے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں طلاق کا نافذ کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ظفر اقبال بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک شخص اپنے دوستوں کے سامنے اس طرح کہتا ہے کہ میں جس عورت سے بھی شادی کروں اسے طلاق ہے۔ کیا اس طرح طلاق کہنے کی شرعاً کوئی حیثیت ہے؟

جواب قرآن پاک کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق اسی صورت میں واقعہ ہوتی ہے جبکہ پہلے نکاح ہو چکا ہو، نکاح سے پہلے طلاق بے اثر اور لغو ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جب تم مؤمن عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں ہاتھ

لگانے سے پہلے طلاق دے دو تو تمہاری طرف سے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے جس کے پورے ہونے کا تم مطالبہ کر سکو"۔ [۳۳/الاحزاب:۴۹]

اس آیت کریمہ سے متعدد قانونی احکام نکلتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نکاح سے پہلے طلاق لغو ہے اس لیے اگر کوئی شخص اس طرح کہتا ہے کہ "اگر میں فلاں عورت سے یا فلاں قبیلہ یا فلاں قوم کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے" یہ قول لغو اور بے معنیٰ ہے اس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، اس سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ اکثر اہل علم کا یہی موقف ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے، اس موقف کی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث بھی پیش کی جاتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ابن آدم جس چیز کا مالک نہیں اس کے متعلق طلاق کا اختیار استعمال کرنے کا حق نہیں رکھتا"۔ [ترمذی: الطلاق ۱۱۱۸]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اکثر اہل علم کا یہی موقف ہے، حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم حضرت سعید بن مسیّب، حسن بصری، سعید بن جبیر، علی بن حسین، قاضی شریح، جابر بن زید اور بے شمار فقہائے تابعین سے یہی منقول ہے کہ اس طرح کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ امام شافعی نے بھی یہی کہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک، امام احمد بن حنبل اور اسحاق بن راھویہ کہتے ہیں اگر اس طرح کہنے کے بعد وہ کسی عورت سے نکاح کر لیتا ہے تو ہم اسے علیحدگی کا نہیں کہہ سکتے، نیز حدیث میں ہے "کہ نکاح سے پہلے کوئی طلاق نہیں"۔ [ابن ماجہ: الطلاق ۲۰۵۹]

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قبل از نکاح طلاق دینے کا فیصلہ لغو اور بے اثر ہے۔ کچھ فقہا کا یہ خیال ہے کہ اس آیت اور پیش کردہ احادیث کا اطلاق صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو جو اس کے نکاح میں نہ ہو اس طرح کہے کہ تجھ کو طلاق ہے یا میں نے تجھے طلاق دی، ایسا کہنا بلاشبہ لغو اور باطل ہے جس پر کوئی قانونی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ یوں کہتا ہے کہ "اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے تو یہ نکاح سے پہلے طلاق دینا نہیں ہے بلکہ اس امر کا اعلان کرنا ہے کہ جب وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی تو اس پر طلاق وارد ہوگی، ایسا کہنا لغو اور بے اثر نہیں ہے بلکہ جب بھی وہ عورت اس کے نکاح میں آئے گی اسی وقت اس پر طلاق پڑ جائے گی۔ پھر قائلین وقوع طلاق کا اس امر میں اختلاف ہے کہ اس قسم کی طلاق کی وسعت کس حد تک ہے؟

کچھ حضرات کہتے ہیں کہ عورت کی تخصیص کرے یا نہ کرے بہر صورت طلاق واقع ہو جائے گی، کچھ حضرات کہتے ہیں کہ کسی قبیلے یا قوم کی تخصیص کرے تو طلاق ہوگی، بصورت دیگر نہیں، بعض کا خیال ہے کہ تخصیص کے ساتھ وہ مدت کا تعین کرے مثلاً: اگر میں اس سال یا آیندہ دس سال کے اندر فلاں عورت یا فلاں قبیلہ کی عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق ہے، تب یہ طلاق واقع ہوگی ورنہ نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اس پر مزید فرماتے ہیں "کہ اگر یہ مدت اتنی طویل ہو جس میں اس شخص کا زندہ رہنا متوقع نہ ہو تو اس کا قول بے اثر ہوگا، بصورت دیگر نکاح کرنے پر طلاق ہو جائے گی۔"

ہمارے نزدیک یہ تمام قیود وشرائط کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہیں لہٰذا اس کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ایسی طلاق لغو اور فضول ہے، نکاح کرنے کے بعد اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال سیالکوٹ سے ظفر اقبال لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی ذاتی اور خاندانی مجبوریوں کے پیش نظر یہ خواہش رکھتا ہے کہ اس کی بیوی کچھ عرصہ تک بچہ نہ جنے اور مانع حمل طریقے استعمال کرنے کے متعلق اسے آمادہ کرنے کے لیے بطور دھمکی کہتا ہے کہ اگر تو نے بچہ جنا تو تجھے طلاق دے دوں گا، اس بات کا اظہار جب اپنے کسی دوست سے کرتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ ''میری بیوی جب جنے گی تو اسے طلاق ہو جائے گی'' واضح رہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کا قطعاً ارادہ نہیں رکھتا، اب کیا بچہ جننے کی صورت میں اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی اگر ہو گی تو کیا پہلے بچے کی ولادت پر یا ہر بچے کی پیدائش پر طلاق کا مسئلہ جاری رہے گا؟ نیز کیا طلاق کے لیے دو گواہوں کا ہونا ضروری نہیں اگر نہیں تو کیوں؟ جبکہ قرآن نے اسے بیان کیا ہے۔

جواب واضح رہے کہ خاوند نے جس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنی بیوی کو جو دھمکی دی ہے عورت اس معاملہ میں بالکل مجبور اور بے بس ہے کیوں کہ بچہ جننا یا نہ جننا عورت کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے خاوند کا اپنی بیوی کو اس قسم کی فضول دھمکی دینا جائز نہیں ہے۔ نفس مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ طلاق دو طرح سے ہوتی ہے۔

① منجز: جو فی الفور نافذ ہو جائے۔ مثلاً: یوں کہا جائے کہ میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔

② معلق: جو فی الفور نافذ العمل نہ ہو بلکہ اسے کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے پر معلق کیا جائے مثلاً یوں کہا جائے کہ اگر تو نے گھر سے باہر قدم رکھا تو تجھے طلاق ہے۔ اس صورت میں جب بھی عورت گھر سے باہر قدم رکھے گی تو اسے طلاق ہو جائے گی۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات ضرور مدنظر رہنی چاہیے کہ خاوند اپنی بیوی پر جو پابندی عائد کر رہا ہے ذہنی طور پر اس وقت کی حد بندی کہاں تک ہے، بظاہر زندگی بھر کے لیے اس پر پابندی عائد کرنا اس کا مقصد نہیں اور نہ ہی ایسا کرنا کسی عقلمند شخص کو زیب دیتا ہے۔ اگر ذہن میں طے شدہ وقت کے بعد پابندی کی خلاف ورزی ہو تو طلاق غیر مؤثر ہو گی کیوں کہ اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، اس وضاحت کے بعد جب ہم صورت مسئولہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں طلاق کا تعلق دوسری قسم سے ہے کیوں کہ خاوند نے اپنے کسی عزیز کے پاس کہا ہے کہ میری بیوی جب بھی بچہ جنے گی۔ اسے طلاق ہو جائے گی۔ اب جب بھی وہ بچہ جنے گی اسے طلاق ہو جائے گی لیکن مذکورہ وضاحت کے پیش نظر یہ دیکھنا پڑے گا کہ بچہ نہ جننے کی پابندی کا وقت کہاں تک ہے یہ تو خاوند ہی جانتا ہے کہ سوال میں ''کچھ عرصہ'' سے کتنی مدت مراد ہے......؟ اس مدت کے بعد اگر بچہ پیدا ہو تو طلاق غیر مؤثر ہو گی کیوں کہ اس پابندی کا وقت ختم ہو چکا ہے خاوند کا اگرچہ طلاق دینے کا ارادہ نہیں ہے تاہم یہ تیر اس کے ترکش سے نکل چکا ہے جو مجوزہ ذہنی مدت کے دوران بچے جنتے ہی نشانے پر بیٹھ جائے گا اگر واقعی وہ اپنی بیوی کو آباد کرنے میں مخلص ہے تو بچہ جننے کے بعد عدت کے اندر اندر رجوع کرے اور آئندہ اس قسم کی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایسی لغویات سے پرہیز کرنے کا عہد کرے۔ باقی رہا طلاق کے لیے دو گواہوں کا معاملہ تو واضح رہے کہ قرآن کریم نے اگرچہ اس کا ذکر ضرور کیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الطلاق میں ہے تاہم یہ ایک حکیمانہ ہدایت ہے جس پر عمل پیرا ہونا بہتر ہے ضروری نہیں تاکہ فریقین میں سے کوئی بھی بعد میں کسی واقعہ سے انکار نہ کر سکے اور آئندہ پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا دروازہ

بھی بند ہو جائے۔صورت مسئولہ میں تو گواہی کی ضرورت نہیں کیوں کہ خاوند اس بات کا معترف ہے کہ میں نے اپنے کسی عزیز کے ہاں یہ الفاظ کہے لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ اس کی بیوی جب پہلا بچہ جنے تو خاوند عدت کے اندر اندر رجوع کرے اور آیندہ ایسی فضول حرکت نہ دھرائے۔ [واللہ اعلم]

سوال تھنہ ضلع اٹک سے مولانا محمد اسحاق سلفی خریداری نمبر ۳۱۱۸ لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سوال کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں درکار ہے: ایک آدمی بایں الفاظ قسم اٹھاتا ہے کہ اگر میں اپنے بھائیوں کی دکان میں کام کروں گا تو میری بیوی مجھ پر حرام ہے۔ اب اگر وہ اس دکان میں کام کرے گا تو کیا اس کی بیوی کو طلاق ہو جائے گی؟

جواب سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم اٹھانے والے نے بھائیوں سے کسی رنجش کی بنا پر ان کی دکان پر کام نہ کرنے کی قسم اٹھائی، لیکن الفاظ اس طرح ادا کئے کہ اگر میں اپنے بھائیوں کی دکان پر کام کروں تو میری بیوی مجھ پر حرام ہے۔ان الفاظ سے اپنی بیوی کو طلاق دینا قطعی طور پر مقصود نہ تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ اگر کوئی انسان اپنی بیوی کو خود پر حرام کر لینے کے الفاظ ادا کرتا ہے تو اس سے طلاق نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ ایک قسم اٹھانے کا انداز ہے، اسے صرف قسم کا کفارہ دینا ہوگا، جو دس مساکین کو کھانا کھلانا یا انہیں لباس دینا ہے۔عدم استطاعت کی صورت میں تین دن کے روزے رکھنے سے ہی کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اپنی کسی لونڈی یا شہد کو خود پر حرام کر لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا: ''تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قسموں کو کھول ڈالنا مقرر کر دیا ہے''۔ [۶۶/التحریم:۲]

یعنی جو چیز خود پر حرام کی گئی اسے قسم کا کفارہ دے کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب التفسیر، کتاب الطلاق]

صورت مسئولہ میں اگر بیوی کو طلاق دینے کی نیت نہیں تھی تو قسم کا کفارہ ادا کر کے اپنے بھائیوں کی دکان پر حسب سابق کام شروع کر دے، اس انداز سے بیوی کو طلاق نہیں ہوتی۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک سائل خریداری نمبر ۳۱۱۷ نے لکھا ہے کہ میری بیٹی کا اپنے خاوند سے کسی بات پر جھگڑا ہوا، میں نے بیٹی اور داماد کو سمجھایا اور صلح کرانے کی کوشش کی۔مگر میرا داماد صلح پر آمادہ نہ ہوا۔بلکہ اس نے کہا کہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ۔تم میری طرف سے فارغ ہو۔یہ یکم جنوری ۲۰۰۱ء کا واقعہ ہے اس کے بعد میرے داماد نے دوسرے شادی بھی کر لی ہے، اس کے باوجود میں نے دوبارہ صلح کے لیے رابطہ کیا لیکن وہ صلح کے لیے تیار نہیں ہے۔کیا اس طرح میری بیٹی کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟ کیا وہ آگے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب بیوی خاوند کا اگر گھر میں کسی بات پر جھگڑا ہو جائے تو اسے گھر میں رہتے ہوئے نمٹانے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن اگر داماد نے سائل کو یہ کہہ دیا ہے کہ اپنی بیٹی کو ساتھ لے جاؤ میری طرف سے فارغ ہو۔صرف اتنا کہنے سے طلاق نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ الفاظ اس نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے نہیں کہے۔اگر بیوی ہی کو کہے تب بھی یہ الفاظ طلاق کے لیے صریح نہیں ہیں، فقہا کی اصطلاح میں اسے کنایہ کہا جاتا ہے، ایسے الفاظ کہنے سے خاوند کی نیت کو دیکھا جاتا ہے اگر اس کی نیت واقعہ طلاق کی تھی تو اسے طلاق شمار کیا جائے گا۔بصورت دیگر یہ الفاظ ایک دھمکی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔داماد کا دوسری شادی کر لینا بھی طلاق کے لیے دلیل نہیں بن سکتا، کیوں کہ یہ اس کا حق ہے جو اس نے استعمال کیا ہے۔بہتر ہے کہ پنچایتی طور پر خاوند سے دریافت کیا جائے کہ اس کی

ان الفاظ سے کیا مراد تھی؟ اگر اس نے طلاق کی نیت سے یہ الفاظ کہے تھے تو اب بیوی کی عدت بھی ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا اسے شرعاً نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اگر اس نے یہ الفاظ طلاق کی نیت سے استعمال نہیں کیے بلکہ بطور دھمکی اور اصلاح احوال کے لیے کہے ہیں تو اس صورت میں طلاق نہیں ہوگی۔ سائل کی بیٹی ایسے حالات میں بدستور داماد کی بیوی ہے، برادری کے سرکردہ احباب یا مقامی معززین کے ذریعے مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے، تاکہ معاملہ زیادہ خراب نہ ہو۔

سوال ساہیوال سے غازی بشیر لکھتے ہیں کہ میری بیوی کسی وجہ سے ناراض ہو کر اپنے میکے چلی گئی ہے اور تقریباً دس ماہ سے اپنے والدین کے ہاں رہ رہی ہے، مجھے سسرال والوں سے پیغام ملا ہے کہ ہماری لڑکی کو طلاق ہو گئی ہے کیوں کہ ہمارے عقیدے کے مطابق اگر بیوی اپنے خاوند سے ناراض ہو کر اپنے والدین کے ہاں تین ماہ کا عرصہ گزار دے تو اسے خود بخود طلاق ہو جاتی ہے جبکہ میرا قطعی طور پر طلاق دینے کا ارادہ نہیں ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا واقعی بیوی کے اپنے والدین کے ہاں بیٹھے رہنے سے خود بخود طلاق ہو جاتی ہے، کیا طلاق دینا خاوند کا حق نہیں ہے؟

جواب واضح رہے کہ بیوی خاوند کے اخلاص و محبت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اس اللہ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان پیار و محبت اور مہر و وفا پیدا کر دیا ہے''۔ [۳۰/الروم:۲۱]

اس آیت کے پیش نظر میاں بیوی کے باہمی تعلقات اتنے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ ان سے اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اغراض و مقاصد پورے ہوں یعنی ان میں باہمی اخلاص، پیار و محبت اور سکون و چین ہونا چاہیے، اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ مقاصد پورے نہیں ہوتے تو اس میں دونوں یا ان میں کسی ایک کا قصور ضرور ہے۔ میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات کو اسلام نے اتنی اہمیت دی ہے کہ ان لوگوں کو سخت الفاظ سے یاد کیا ہے جو میاں بیوی کے باہمی میل جول میں رخنہ اندازی کا باعث ہوں۔ حدیث میں ہے: ''جو شخص کسی کی بیوی کو اس کے خاوند کے خلاف اکساتا ہے اور اسے خراب کرتا ہے وہ ہم سے نہیں ہے''۔ [ابوداود: النکاح ۲۱۷۵]

اس حدیث کے پیش نظر سسرال والوں کو چاہیے کہ وہ اپنی بچی کی آبادی میں خوشی محسوس کریں اور خاوند کو بھی چاہیے کہ وہ ان اسباب کی تلافی کرے جو معاملات کے بگاڑ کا موجب بنتے ہیں، صورت مسئولہ میں اگر بیوی ناراض ہو کر اپنے میکے چلی جاتی ہے تو محض اس کے وہاں بیٹھے رہنے سے طلاق نہیں ہوگی، جب تک خاوند طلاق سے متعلقہ اختیارات کو استعمال نہیں کرے گا۔ طلاق دینا خاوند کا حق ہے جسے شریعت نے تسلیم کیا ہے، بیوی اگر واقعی تنگ ہے تو اسے خلع لینے کی اجازت ہے۔ اس صورت میں اسے اپنے حق مہر سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال رشید احمد جڑانوالہ سے پوچھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کے ارادہ سے وثیقہ نویس کے پاس گیا اور اسے طلاق نامہ لکھنے کے متعلق کہا، وثیقہ نویس نے اشٹام پر تین طلاق (طلاق طلاق طلاق) لکھ دیں شوہر ان پڑھ تھا اسے کوئی پتہ نہیں کہ طلاق کس طرح لکھی جاتی ہے، اس کا مقصد صرف طلاق دینا تھا کیا اس طرح طلاق ہو جاتی ہے، نیز ایسی طلاق کے بعد رجوع کا امکان ہے یا نہیں......؟

جواب بشرط صحت سوال وصحت نکاح صورت مسئولہ میں شوہر خواندہ ہو یا ناخواندہ نفس مسئلہ طلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلاشبہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی نیت سے وثیقہ نویس کے پاس گیا اور اس نے اشٹام پر تین طلاقیں لکھ دیں اور اسے پڑھ کر سنایا اور شوہر نے اس تحریر کو بقائمی ہوش وحواس سنا اور اس پر اپنا نشان انگوٹھا یا دستخط ثبت کیے۔ایسے حالات میں طلاق کے واقع ہونے میں کوئی شک نہیں اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہی دفعہ تین طلاقیں کہہ دینے یا لکھ دینے سے تینوں واقعہ ہو جاتی ہیں؟ بلاشبہ حنفی مذہب میں اس طرح دی ہوئیں بیک وقت تین طلاقیں تینوں ہی نافذ ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے طلاق دھندہ پر اس کی بیوی حرام ہو جاتی ہے پھر اسے اس کے لیے حلال کرنے کی خاطر بدنام زمانہ حلالہ کا طریقہ رائج کیا گیا۔جو نہ صرف بے شرمی اور بے حیائی ہے بلکہ مخالفین اسلام کو اس قسم کی حیاسوز حرکات کی آڑ میں اسلام پر حملہ آور ہونے کا موقع ملتا ہے۔جبکہ احادیث کے مطابق حلالہ کرنے اور کروانے والے دونوں ہی ملعون ہیں۔

کتاب وسنت کی رو سے ایک مجلس میں دی ہوئی بیک وقت تین طلاقیں دینے سے ایک رجعی طلاق واقع ہوتی ہے۔بشرطیکہ طلاق دینے کا پہلا یا دوسرا موقع ہو،اب دوران عدت خاوند کو بلا تجدید رجوع کا حق ہے اور عدت گزرنے کے بعد بھی نئے نکاح سے رجوع ہو سکے گا،ایسے حالات میں ایک رجعی طلاق ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد نبوت،حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دوسالہ دور حکومت میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی تھی اس کے بعد لوگوں نے اس گنجائش سے غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تادیبی طور پر تین طلاق نافذ کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔

[صحیح مسلم:ج۱'ص۴۷۷؛مسند امام احمد:ج۱'ص۳۱۴]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام تعزیری تھا کیوں کہ آپ عمر کے آخری حصے میں اپنے اس فیصلے پر اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے جیسا کہ حافظ ابن قیم نے محدث ابوبکر الاسماعیلی کی تصنیف''مسند عمر''کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [اغاثۃ اللھفان:ج۱'ص۳۳۶]

② حضرت رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اس کے بعد انہیں اپنی بیوی کے فراق میں انتہائی افسوس ہوا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب معاملہ پہنچا تو آپ نے اسے بلایا اور دریافت فرمایا:''کہ تو نے طلاق کیسے دی تھی۔''عرض کیا کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے دیں تھیں اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''یہ تو ایک رجعی طلاق ہے اگر چاہو تو رجوع کر لو۔''چنانچہ اس نے رجوع کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر لیا۔ [مسند امام احمد:ج۱'ص۲۶۵]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:''کہ یہ حدیث مسئلہ طلاق ثلاثہ کے متعلق ایک فیصلہ کن نص قطعی کی حیثیت رکھتی ہے جس کی اور کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔'' [فتح الباری:ج۹'ص۳۶۲ کتاب الطلاق]

ان احادیث کی روشنی میں ایک باغیرت،کتاب وسنت پر ایمان اور ان پر عمل پیرا ہونے والے کے لیے گنجائش ہے کہ اگر اس نے ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاق دے دی ہیں تو ایام ختم ہو چکے ہیں تو مندرجہ ذیل چار شرائط کے ساتھ نکاح جدید سے رجوع ہو سکتا ہے

① نئے حق مہر کی تعیین۔

② دو گواہ موجود ہوں۔

③ سرپرست کی اجازت ہو۔

④ عورت بھی اس نکاح پر راضی ہو۔

قرآن وحدیث کا یہی فیصلہ ہے اس کے علاوہ ہمارے ہاں رائج الوقت عائلی قوانین اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہی فتویٰ دیا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ عدت عام حالات میں تین حیض ہیں، حمل کی صورت میں وضع حمل۔ اس کے علاوہ حیض نہ آنے کی صورت میں قمری تین ماہ ہیں۔ اگر نکاح کے بعد رخصتی عمل میں نہیں آئی تو کوئی عدت نہیں ہے۔ طلاق کے بعد بلا انتظار اسے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال فیصل آباد سے محمد اشرف لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے شدید غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو کئی بار طلاق کے لفظ کہے لیکن غصہ کی بنا پر اسے پتہ نہیں رہا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں البتہ ایسے شواہد ملتے ہیں کہ اس نے کہا ''میں اپنی منکوحہ کو طلاق دیتا ہوں اور کچھ شواہد اس بات پر ہیں کہ اس نے یوں کہا ''میرے گھر سے نکل جا۔ بصورت دیگر میں طلاق دے دوں گا، بہر حال غصہ اس قدر شدید تھا کہ خاوند کو ہوش نہ رہا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ براہِ کرم ہماری اس الجھن کو دور کریں۔

جواب بحالت غصہ میں دی ہوئی طلاق کے واقع ہونے یا نہ ہونے کے متعلق علمائے امت کا اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ غصہ میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیوں کہ حدیث میں ہے کہ بحالت اغلاق نہ طلاق ہوتی ہے اور نہ ہی غلام کو آزادی ملتی ہے۔ [سنن ابی داؤد: الطلاق ۲۱۹۳]

اس حدیث میں آمدہ لفظ ''اغلاق'' کا معنیٰ امام احمد بن حنبل سے غضب منقول ہے۔ یعنی بحالتِ غصہ طلاق دینا اور غلام کو آزاد کرنا شرعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اغلاق کا یہی معنیٰ کیا ہے فرماتے ہیں کہ **''الاغلاق اظنه فی الغضب''** ابوداؤد کے بعض نسخوں میں بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''**باب الطلاق علی غضب**'' یعنی بحالت غصہ طلاق دینے کا بیان۔ ان حضرات کے نزدیک غصہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق نافذ نہیں ہوتی۔ جبکہ بعض دوسرے علمائے کرام کے ہاں بحالت غصہ دی ہوئی طلاق نافذ ہو جاتی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ رضا ورغبت اور خوشی سے کوئی بھی طلاق نہیں دیتا، بلکہ حالات خراب ہونے پر غصہ کی حالت میں ہی طلاق دی جاتی ہے۔ اگر غصہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق کا اعتبار نہ کیا جائے تو کوئی بھی طلاق مؤثر نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ ہمیشہ طلاق بحالت غصہ میں ہی دی جاتی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، اور امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں: کہ غصہ کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔

① ابتدائی حالت: یہ وہ حالت ہے جس میں غصہ تو ہوتا ہے لیکن انسان کے ہوش وحواس قائم رہتے ہیں، اس حالت میں دی ہوئی طلاق بالاتفاق ہو جاتی ہے۔

② انتہائی حالت: یہ وہ حالت ہے جس میں شدت غصہ کی وجہ سے انسان کے ہوش وحواس قائم نہیں رہتے، اسے کوئی علم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں یا کیسے کرر ہا ہوں۔اس حالت میں دی ہوئی طلاق بالاتفاق نہیں ہوتی۔کیوں کہ یہ ایک جنونی کیفیت ہے اور دیوانگی کی ایک صورت ہے اور مجنون اور دیوانہ مرفوع القلم ہے۔جیسا کہ حدیث میں ہے: ''تین آدمیوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔ان میں سے ایک مجنون بھی ہے۔'' [مسند امام احمد:٦/١٠٢]

③ درمیانی حالت: یہ وہ حالت ہے کہ غصہ کی وجہ سے عقل بالکل تو زائل نہیں ہوتی۔تاہم یہ غصہ اس کی قوت فکر پر اس حد تک اثر انداز ضرور ہوتا ہے کہ اس دوران کی ہوئی کوتاہی پر بعد میں نادم ہوتا ہے۔'' [زاد المعاد: فصل الطلاق فی الاغلاق]

آخری صورت محل اختلاف ہے۔امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم ودیگر حنابلہ کے نزدیک اس درمیانی حالت میں دی ہوئی طلاق بھی واقعہ نہیں ہوتی۔ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث میں ہے جبکہ دوسرے اس درمیانی حالت میں دی ہوئی طلاق کو نافذ خیال کرتے ہیں، ہمارے نزدیک مؤخر الذکر علما کا موقف ہی صحیح ہے۔کیوں کہ طلاق عموماً غصہ میں دی جاتی ہے۔اور درمیانی حالت میں غصہ دیوانگی کی حد تک پہنچتا ہے اس حالت میں طلاق دھندہ کو مرفوع القلم قرار دیا جائے۔لہٰذا اگر غیظ وغضب اس حد تک پہنچ جائے جو انتہائی حالت میں بیان ہوا ہے کہ انسان اپنے آپ سے باہر ہو جائے اور اس کے ہوش وحواس بالکل قائم نہ رہ سکیں۔یہاں تک کہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ میرے منہ سے کیا نکلا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا۔تو ایسی حالت واقع نہیں ہوگی۔مگر غصے کی یہ انتہائی حالت شاذ ونادر ہی ہوتی ہے اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

اس تفصیل کے پیش نظر جب صورت مسئولہ کے ظاہری الفاظ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دھندہ طلاق دیتے وقت انتہائی غصے کی حالت میں تھا۔اس حالت میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔لیکن آیا وہ حقیقتہً ایسا ہی تھا یہ تو طلاق دینے والا ہی بہتر جانتا ہے۔لہٰذا اسے خود سوچنا چاہیے کہ میں طلاق دیتے وقت کس حالت میں تھا۔حقیقت حال کے خلاف الفاظ تحریر کر کے فتویٰ لے لینے سے حرام شدہ چیز حلال نہیں ہوگی۔حلال وحرام کے معاملہ میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اگر واقعی طلاق دھندہ نے غصے کی انتہائی حالت میں طلاق دی ہے اس کے ہوش وحواس قائم نہیں تھے تو اس صورت میں سرے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ اور اگر غصہ ابتدائی یا درمیانی حالت ہے تو طلاق واقع ہو جائے گی۔بالخصوص جبکہ وہ کئی بار ایسا کر چکا ہے جیسا کہ سوال میں ذکر ہے تو وہ اپنی بیوی سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔بشرطیکہ طلاق دینے کا معاملہ مختلف مواقع میں پیش آیا ہو۔اب عام حالت میں صلح کی کوئی صورت نہیں ہے اور اگر ایک ہی مجلس میں ایسا ہوا ہے تو ایک طلاق ہوگی اور عدت کے اندر اندر رجوع ہو سکے گا۔اگر دو دفعہ ایسا ہوا تو بھی رجوع کا حق باقی ہے۔لیکن تیسری دفعہ ایسا کرنے سے رجوع کا حق ختم ہو جاتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال منڈی یزمان سے رشید احمد جٹ لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کے ارادہ سے وثیقہ نویس کے پاس گیا اور اسے طلاق نامہ لکھنے کے متعلق کہا اس نے طلاق نامہ پر تین طلاق لکھ دیں کیا اس طرح طلاق سے رجوع کا امکان باقی رہتا ہے یا نہیں؟

جواب واضح ہو کہ صورتِ مسئلہ میں شوہر خواندہ ہو یا ناخواندہ نفس مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے

کی نیت سے وثیقہ نویس کے پاس گیا اور اس نے تین طلاقیں لکھ دیں پھر اسے پڑھ کر سنایا اور اس نے بقائمی ہوش وحواس اسے سنا اور اپنے دستخط یا انگوٹھا ثبت کیا اب اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک ہی دفعہ تین طلاق دینے سے تینوں ہی واقعہ ہو جاتی ہیں یا نہیں؟

رسول اللہ ﷺ نے اس انداز سے طلاق دینے پر نہ صرف اظہار ناراضگی فرمایا ہے بلکہ اسے کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنا قرار دیا ہے۔ حضرت محمود بن لبید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو کسی شخص کے متعلق بتایا گیا کہ اس نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاق دے ڈالی ہیں تو آپ یہ سن کر غصہ میں آ گئے اور فرمایا: ''کہ میری موجودگی میں ہی ان لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا ہے۔'' ایک جانثار نے آپ کی ناراضگی کو دیکھا تو عرض کیا کہ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو اسے قتل کر دوں؟ [سنن نسائی: کتاب النکاح]

اس کے برعکس اگر کوئی کتاب وسنت کے مطابق طلاق دے تو شریعت نے ایسے شخص کو متعدد مواقع فراہم کئے ہیں تاکہ وہ باعزت طور پر رجوع کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر سکے، کتاب وسنت کی روشنی میں ایک ہی مجلس میں تین طلاق ایک رجعی ہوتی ہے اگر یہ پہلا یا دوسرا واقعہ ہے تو دورانِ عدت خاوند کو اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا حق ہے اور پہلا نکاح بھی برقرار رہے گا۔ البتہ عدت گزرنے کے بعد اسی طلاق دہندہ کے ساتھ تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے، اس موقف کے حسب ذیل دلائل ہیں۔

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالہ دور میں ایک مجلس کی تین طلاق ایک رجعی ہوتی تھی۔ [صحیح مسلم]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سال کے بعد لوگوں نے اس سہولت سے غلط فائدہ اٹھانا شروع کر دیا تو آپ نے تادیبی طور پر تین طلاق نافذ کر دینے کا حکم فرمایا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آخری دور میں اس فیصلہ پر اظہار افسوس فرمایا کرتے تھے۔ جیسا کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بکر اسماعیلی کی تصنیف ''مسند عمر'' کے حوالہ سے لکھا ہے۔ [اغاثۃ اللھفان: ۱/۳۳۶]

☆ حضرت رکانہ بن عبد یزید رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دے دیں، اس کے بعد انہیں اپنی بیوی کی جدائی کا انتہائی غم ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب معاملہ پہنچا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ طلاق کیسے دی تھی، عرض کیا میں نے ایک ہی مجلس میں تین طلاق دے ڈالی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو ایک طلاق ہے اگر چاہو تو رجوع کر لو۔'' چنانچہ اس نے رجوع کر کے دوبارہ اپنا گھر آباد کر لیا۔ [مسند امام احمد: ۱/۲۶۵]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ حدیث اس مسئلہ (طلاق ثلاثہ) میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی اور کوئی تاویل نہیں ہو سکتی۔'' [فتح الباری: ۹/۳۶۲]

ان احادیث کی روشنی میں ایک باغیرت، کتاب وسنت پر ایمان اور ان پر عمل پیرا ہونے والے کے لیے گنجائش ہے کہ اگر اس نے ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاق دے دیں ہیں تو اسے رجوع کا حق ہے اگر عدت کے ایام پورے نہیں تو دو گواہوں کی موجودگی میں گھر بسانے کی سنت سے رجوع کا حق ہے اگر عدت کے ایام پورے ہو چکے ہیں تو بیوی کی رضا مندی، اس کے سرپرست کی اجازت، نئے حق مہر کے ساتھ گواہوں کی موجودگی میں نکاح جدید سے رجوع ہو سکے گا۔ قرآن وحدیث کا یہ فیصلہ ہے اس کے علاوہ ہمارے ملک میں رائج عائلی قوانین اور دیگر اسلامی ممالک میں بھی یہی فتویٰ دیا جاتا ہے۔ اس کے لیے بدنام زمانہ

حلالہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنا بے غیرتی اور بے حیائی ہے۔

سوال ضلع خانیوال سے سید محمد علی لکھتے ہیں کہ حالت حمل میں دی ہوئی طلاق کی کیا حیثیت ہے؟

جواب دوران حمل میں دی ہوئی طلاق نافذ ہو جاتی ہے۔ اگر چہ ہمارے ہاں جہلا میں یہ بات مشہور ہے کہ حالت حمل میں دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، قرآن کریم نے دوران حمل دی ہوئی طلاق پر مندرجہ ذیل احکام مرتب فرمائے ہیں۔ اگر طلاق واقع نہ ہوتی تو ان احکام کا مرتب کرنا چہ معنی دارد؟ احکام یہ ہیں:

☆ مطلقہ حاملہ کی عدت بیان کی ہے کہ اس کی عدت وضع حمل ہے۔ [۶۵/الطلاق:۴]

☆ مطلقہ حاملہ کو اسی جگہ رکھو جہاں تم خود رہتے ہو، جیسی کچھ بھی جگہ تمہیں میسر ہو۔ [۶۵/الطلاق:۶]

☆ مطلقہ حاملہ پر اس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا حمل وضع نہ ہو جائے۔ [۶۵/الطلاق:۶]

☆ مطلقہ حاملہ اگر بچے کو دودھ پلائے تو بھلے طریقے سے ان کی اجرت انہیں دی جائے۔ [۶۵/الطلاق:۶]

یہ احکام اس صورت میں قابل عمل ہوں گے جب دورانِ حمل دی ہوئی طلاق کو تسلیم کیا جائے۔

سوال قصور سے بشیر احمد لکھتے ہیں کہ ایک لڑکی کا نکاح بعوض دو ایکڑ زمین حق مہر ہوا، لڑکا دو ایکڑ دینے پر راضی نہیں ہے، اگر رخصتی سے قبل طلاق ہو جائے تو لڑکی حق مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے یا نہیں؟

جواب اگر بوقت نکاح حق مہر کو لڑکے نے بخوشی قبول کیا تھا تو اس کی ادائیگی ضروری ہے۔ قرآن کریم کا یہی حکم ہے، اس میں لیت ولعل کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ تمام شرطوں میں سب سے زیادہ حق دار وہ شرط ہے جس کے ذریعے تم نے اپنی منکوحہ کی شرمگاہ کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب النکاح]

مصالحت کی کوشش کرنا ضروری ہے۔ اگر طلاق دینا ناگزیر ہو تو لڑکی کو آدھا حق مہر ملے گا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کہ اگر تم نے مساس سے پہلے طلاق دی ہے اور حق مہر کا تعین ہو چکا ہے تو نصف حق مہر کی ادائیگی تمہارے ذمہ ہے۔'' [۲/البقرۃ:۲۳۷]

سوال حبیب رسول راولپنڈی سے لکھتے ہیں کہ نابالغ لڑکے سے طلاق لینے کی کیا صورت ہے، جبکہ اس کی بیوی بالغ ہے اور وہ طلاق کا مطالبہ بھی کرتی ہے، نیز واضح رہے کہ لڑکا بھی ۹ یا ۱۰ سال کا ہے اور اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا ہے۔

جواب والدین کو چاہیے کہ نکاح کے وقت پیش بندی کے طور پر آئندہ ہونے والے حالات کا بغور جائزہ لے لیا کریں، اس کے بعد نکاح کا فریضہ سرانجام دیا جائے کیوں کہ نکاح ایک ایسا سنجیدہ معاملہ اور زندگی کا بندھن ہے جو ہر روز نہیں کیا جاتا، یہ کوئی ریت کا گھر نہیں ہے جب چاہے بنا لے اور جب چاہے گرا دے، صورت مسئولہ میں جب بیوی طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کی رہائی کی دو صورتیں ہیں:

① لڑکا طلاق دے دے، بشرطیکہ وہ سن رشد کو پہنچ چکا ہو، اگر چہ بالغ نہ ہو، سوال میں بیان کردہ صورت کے پیش نظر لڑکا نو، دس سال کا ہے لہٰذا وہ عاقل اور صاحب تمیز ہے اور وہ خود طلاق دینے کا اہل ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طلاق کے لیے بالغ ہونا شرط نہیں، بلکہ صرف رشد و تمیز کا حاصل ہونا ضروری ہے، جسے اتنا علم ہو کہ بیوی کس غرض کے لیے ہوتی ہے، طلاق کے بعد بیوی

جدا ہو جائے گی اور اس پر عدت بھی نہیں ہوگی اور طلاق کے فوراً بعد آگے نکاح کرنے کی مجاز ہے، کیوں کہ طلاق قبل از رخصتی کا حکم قرآن کریم نے یہی بتلایا ہے۔ [۳۳/الاحزاب:۴۹]

② لڑکے کا سرپرست بھی لڑکے کی طرف سے طلاق دے سکتا ہے، جبکہ اسے معلوم ہو جائے کہ لڑکی میرے لڑکے کے گھر بسنے والی نہیں ہے، اس صورت میں وہ اپنے لڑکے کے قائم مقام ہو کر طلاق دے سکتا ہے۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ خاوند کی طرف سے کوئی دوسرا قائم مقام ہو کر طلاق دے سکتا ہے۔'' اور یہ صحیح موقف ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ ہے کہ غلام اور لڑکے کی طلاق بھی صحیح ہے اور ان کے قائم مقام ہو کر ان کے ولی کی بھی صحیح ہے، کیوں کہ یہ ایک اصولی بات ہے کہ جو عقد کا مالک ہوتا ہے وہ نسخ کا بھی مالک ہے، غلام اور لڑکے کا نکاح چونکہ ولی کراتے ہیں، اس لیے انہیں طلاق کا بھی اختیار ہے۔ [الاختیارات:۲۵۴' کتاب الطلاق]

شریعت کی دیگر تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوانے خاوند کی طرف سے اس کا ولی طلاق دے سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس قسم کی روایت ملتی ہیں۔ [دارقطنی:۴/۶۵]

اسی قسم کی ضرورت نابالغ لڑکے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ لہٰذا اس کا حکم بھی وہی ہوگا، ولی کی طلاق کے بعد عورت کو آگے نکاح کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ عدالت یا پنچایت سے توثیق کرالی جائے۔ صرف فتویٰ کو بنیاد بنا کر نکاح نہ کیا جائے۔ کیوں کہ فتویٰ میں کسی صورت حال سے متعلق شرعی حکم بتایا جاتا ہے۔ اس کی تنفیذ عدالت کا کام ہے، آخر میں ہم دوبارہ کہنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ نکاح ایک سنجیدہ معاملہ ہے اسے کھیل اور مذاق کے طور پر نہ لیا جائے، اس کے جملہ پہلوؤں پر غور کرکے سرانجام دینا چاہیے۔

[واللہ اعلم]

سوال فیصل آباد سے محمد اکرم لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی کو تین دفعہ ماں بہن کہہ دیا ہے۔ کیا ایسے کلمات کہنے سے طلاق ہو جاتی ہے، اگر ہو جاتی ہے تو رجوع کی کیا صورت ہوگی، کتاب وسنت کی روشنی میں میری مشکل حل کرنے میں مدد کریں۔

جواب عرب معاشرہ میں بسا اوقات یہ صورت پیش آتی تھی کہ جب میاں بیوی کا کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جاتا تو شوہر غصہ میں آکر کہتا ''تو میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے'' مطلب یہ ہوتا کہ تجھ سے مباشرت کرنا میرے لیے ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے مباشرت کروں، اسے شریعت کی اصطلاح میں ظہار کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی بہت نادان لوگ بیوی سے لڑ کر اسے ماں، بہن اور بیٹی سے تشبیہ دے بیٹھتے ہیں، مطلب یہ ہوتا ہے کہ گویا آدمی اب اسے بیوی نہیں بلکہ ان عورتوں کی طرح سمجھتا ہے جو اس کے لیے حرام ہیں۔ اس فعل کا نام ظہار ہے، اللہ تعالیٰ نے ایسی بات کو ناپسندیدہ اور جھوٹی بات قرار دیا ہے اور کفارہ کے طور پر اس کی کچھ سزا بھی رکھی ہے جس کی تفصیل سورۃ المجادلہ میں بیان ہوئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو ایسے کلمات کہنا ایک بہت بڑا گناہ اور حرام فعل ہے، اس کا مرتکب سزا کا حقدار ہے۔ لیکن جو شخص اپنی بیوی کو ماں یا بہن کہہ دیتا ہے تشبیہ وغیرہ نہیں دیتا کیا یہ صورت بھی ظہار ہوگی یا نہیں؟ اس میں کچھ اختلاف ہے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اپنی بیوی کو بہن کہہ کر پکار رہا تھا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور غصہ فرمایا: کہ یہ تیری بہن ہے؟ آپ نے اسے ناپسند کرتے ہوئے منع فرمایا۔

[ابوداود: الطلاق ۲۲۱۰]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو ماں یا بہن کہنے سے ظہار تو نہیں ہوتا البتہ سخت بے ہودہ بات ضرور ہے۔اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔البتہ مالکی حضرات اسے بھی ظہار قرار دیتے ہیں،حنابلہ کے ہاں اس میں کچھ تفصیل ہے کہ اگر ایسے کلمات بحالت غصہ کہے جائیں تو ظہار ہوگا اگر پیار ومحبت کی بات کرتے ہوئے ایسے کلمات کہہ دیئے جائیں تو انتہائی ناپسندیدہ حرکت ہے لیکن اسے ظہار نہیں قرار دیا جائے گا۔صورت مسئولہ میں خاوند نے اپنی بیوی کو ماں بہن کہا ہے،ہمارے نزدیک یہ ظہار نہیں ہے کیوں کہ اس نے ابدی محرمات میں سے کسی عورت کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جس پر اس کا نظر ڈالنا حرام تھا۔طلاق تو کسی صورت میں نہیں ہے چونکہ سائل نے ایک بے ہودہ اور ناپسندیدہ بات کہی ہے،اس لیے اسے چاہیے کہ اس گناہ کی تلافی کے لیے صدقہ وخیرات کرے اور آئندہ ایسی حرکت کرنے سے توبہ کرے۔کیوں کہ ایسا کرنا مؤمن کی شان کے خلاف ہے۔

سوال اگر کسی عورت کا خاوند فوت ہوجائے تو اس کی عدت کتنے دن ہے اور اس پر کیا پابندیاں ہیں؟ کیا وہ کسی کی تعزیت یا شادی کے لیے گھر سے نکل سکتی ہے؟ اگر ایک بڑی حویلی میں کئی گھر آباد ہوں اور وہ بھی اس حویلی میں رہائش رکھے ہوئے ہے تو کیا وہ دوسرے گھروں میں جاسکتی ہے،ان تمام سوالات کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دیا جائے۔

(سائل:ڈاکٹر سید محمد اقبال شاہ کوٹ شاہاں،رحیم یار خاں)

جواب جس عورت کا خاوند فوت ہوجائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے عدت وفات ان عورتوں کے لیے بھی ہے جن کا ابھی نکاح ہوا ہے رخصتی نہیں ہوئی،ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''تم میں سے جو لوگ مر جائیں،ان کے پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن تک روکے رکھیں''۔ [۲/البقرہ:۲۳۴]

البتہ حاملہ عورت اس حکم سے مستثنیٰ ہے اس کی عدت وفات وضع حمل تک ہے،خواہ وضع حمل شوہر کی وفات کے فوراً بعد ہوجائے یا اس میں کئی مہینے صرف ہوں،

اپنے آپ کو روکے رکھنے سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اس مدت میں نکاح نہ کریں بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو زینت سے بھی روکے رکھنا،چنانچہ احادیث میں بھی اس کے متعلق واضح احکام ملتے ہیں کہ زمانہ عدت میں عورت کو رنگین کپڑے جو زینت کے طور پر ہوں،زیورات پہننے سے،مہندی،،سرمہ،خوشبو،خضاب لگانے اور بالوں کی آرائش سے بھی پرہیز کرنا چاہیے،البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ زمانہ عدت میں اپنے گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں جمہور محدثین کا یہی موقف ہے کہ دوران عدت عورت کو اسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہو،دن کے وقت کسی انتہائی ضرورت کے پیش نظر وہ باہر جاسکتی ہے مگر رات کا قیام اپنے گھر ہونا چاہیے،تعزیت کرنا یا شادی میں شمولیت اس کی ذاتی ضرورت نہیں ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے بازار میں خرید وفروخت سے بھی پرہیز کرنا ہوگا،البتہ عدالت میں اگر اس کے بیان میں ضرورت ہے یا زمین کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے یا بچوں کو سکول چھوڑنے کا کوئی معقول بندوبست نہیں ہے تو ان حالات میں اسے گھر سے باہر جانا جائز ہے اگر ایک حویلی میں کئی گھر ہیں اور وہ

بھی اس حویلی میں رہائش رکھے ہوئے ہے تو بھی بلاضرورت دوسرے گھر نہ جائے مختصر یہ ہے کہ جو بھی زینت وآرائش کا سامان ہے اس سے پرہیز کرے اگر نہانے کی ضرورت ہے تو صفائی ونظافت پر شرعاً کوئی پابندی نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ① بعض سٹیکروں پر "میرے لیے اللہ اور اس کا رسول ﷺ کافی ہے" لکھا ہوتا ہے یہ لکھنا جائز ہے؟

② اصحاب کہف کا کتا جنت میں جائے گا یا نہیں؟

③ دوران نماز زیرناف ہاتھ باندھنے سے نماز ہو جائے گی یا نہیں؟

④ ایک عورت کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں ایک کے پاس بچہ اور دوسری کے ہاں بچی ہے، بعض اوقات وہ عورت اپنے نواسے اور نواسی کو دودھ پلا دیتی ہے ایسے حالات میں اس بچے اور بچی کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟ (سائل: محمد دین شاکر مقصود)

جواب ① شرک کا معاملہ بہت نزاکت کا حامل ہے معمولی شرک سے زندگی بھر کے اعمال ضائع ہونے کا اندیشہ ہے اس لیے صرف "حسبی اللہ" میرے لیے اللہ ہی کافی ہے لکھنا اور کہنا چاہیے، خود رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"اے نبی! تمہارے لیے اور تمہارے پیرو اہل ایمان کے لیے تو بس اللہ کافی ہے"۔ [۸/الانفال:۶۴]

② اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو انسانوں اور جنوں کے لیے بنایا ہے اس میں کوئی حیوان نہیں جائے گا انہیں مرنے کے بعد مٹی بنا کر ختم کر دیا جائے گا صرف میدان محشر میں وہ حیوانات ہوں گے جن کا انسانی حساب وکتاب سے تعلق ہوگا، نیز ایسے سوالات کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا ان سے اجتناب کرنا چاہیے۔

③ دوران نماز سینے پر ہاتھ باندھنے چاہئیں جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ اور دیگر کتب حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے زیرناف ہاتھ باندھنے کی احادیث صحیح نہیں ہیں حق واضح ہونے کے بعد بھی اگر ہٹ دھرمی اور ضد کی بنا پر زیرناف ہاتھ باندھتا ہے تو بلاشبہ اس کی نماز نہیں ہوتی البتہ اجتہادی غلطی صحت نماز کے لیے رکاوٹ نہیں ہوگی۔

④ مذکورہ عورت نے چونکہ اپنے نواسے اور نواسی کو دودھ پلایا ہے لہٰذا یہ دونوں دودھ شریک بہن بھائی ہیں ان کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا، قرآن میں ہے:

"تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہو اور تمہاری دودھ شریک بہنیں (بھی حرام ہیں)" [۴/النسآء:۲۳]

اور حدیث میں ہے کہ "وہ تمام رشتے جو نسب کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں دودھ شریک ہونے سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔" لہٰذا ان دونوں کا آپس میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک خاتون بذریعہ ای میل سوال کرتی ہے کہ اگر خاوند فوت ہو جائے تو بیوی ایام عدت کہاں گزارے؟ اپنے خاوند کے گھر یا جہاں وہ اپنے خاوند کے فوت ہونے کی اطلاع پائے نیز یہ بھی بتایا جائے کہ دورانِ عدت اپنے خاوند کی قبر پر جا سکتی ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حل پیش کریں۔

جواب عورت نے جس خاوند کے ساتھ زندگی کے ایام گزارے ہیں، اس کے حق رفاقت ووفاداری اور اس کے رشتہ داروں

کے ساتھ ہمدردی وغمگساری کا تقاضا یہ ہے کہ خاوند کے مرنے کے بعد اس کی بیوی عدت کے ایام اپنے خاوند کے گھر میں گزارے۔خواہ وہ مکان تنگ وتاریک اور کتنا ہی وحشت ناک ہو۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کا خاوند گھر سے باہر کسی دوسرے مقام پر قتل کر دیا گیا اور اس کا مکان انتہائی وحشتناک مقام پر واقع تھا۔ پھر وہ اس کی ملکیت بھی نہ تھا، بیوہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ مجھے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہاں منتقل ہونے کی رخصت دی جائے تا کہ عدت کے ایام امن وسکون سے وہاں گزار سکوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے اس گھر میں رہو جہاں تجھے خاوند کے فوت ہونے کی خبر ملی یہاں تک کہ عدت کے ایام پورے ہو جائیں۔'' [مسند احمد:۳/۳۷۰]

بعض روایات میں ہے کہ اپنے گھر میں بیٹھی رہو یعنی دوسری جگہ منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ [نسائی:الطلاق ۳۵۵۸]

حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اسی حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ البتہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف ہے کہ عورت عدت گزارنے کی پابند ہے خواہ وہ کہیں گزارے۔ [نسائی:الطلاق ۳۵۶۱]

واضح رہے کہ حدیث میں تو یہ صورت ہے کہ عورت اپنے گھر میں تھی جبکہ خاوند باہر گیا تھا اور وہیں فوت ہو گیا۔ اگر خاوند اپنے گھر میں فوت ہوا ہو اس کی بیوی فوتگی کے وقت گھر میں موجود نہ ہو تو اس کے متعلق الفاظ اور حدیث اور حکمت حدیث کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی عورت بھی عدت کے ایام اپنے خاوند کے گھر میں پورے کرے۔ البتہ اس حکم سے درج ذیل دو صورتیں مستثنیٰ ہیں:

① اگر عورت خانہ بدوش ہے اور کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اگر اس کا خاوند فوت ہو جائے تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ چار ماہ دس دن اسی مقام پر گزارے، بلکہ وہ جہاں قافلہ ٹھہرے گا اس کے ساتھ ہی اپنے ایام عدت گزارتی رہے گی۔

② میاں بیوی کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر تھے، خاوند کی وفات کے بعد آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے جس کی وجہ سے کرایہ کی ادائیگی طاقت سے باہر ہو تو اس صورت میں بھی وہ کم کرایہ والے مکان میں منتقل ہو سکتی ہے۔

بعض اہل علم حدیث کے الفاظ ''جہاں تجھے خاوند کے فوت ہونے کی خبر ملے'' سے عورت کو پابند کرتے ہیں کہ وہیں ایام عدت گزارے جہاں اسے اس کی خبر ملی ہے خواہ کسی کے پاس بطور مہمان ہی ٹھہری ہوئی ہو۔ اس طرح کی حرفیت پسندی اور بے جا پابندی شریعت کی منشا کے خلاف ہے۔

دوران عدت انتہائی ضروری کام کے لیے گھر سے نکلنے کی اجازت ہے لیکن اس صورت میں بھی رات گھر واپس آنا ضروری ہے۔ صورت مسئولہ عدت میں خاوند کی قبر پر جانا کوئی ضروری امر نہیں ہے جب عدت کے ایام پورے ہو جائیں تو پھر شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے خاوند کی قبر پر جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال سرگودھا سے ایک خاتون سوال کرتی ہیں کہ میرے شوہر جب فوت ہوئے تو میں اپنے بیٹے کے پاس فیصل آباد میں تھی اب میں نے عدت کے دن کہاں پورے کرنے ہیں؟ سرگودھا میں یا فیصل آباد میں۔ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب عورت نے جس خاوند کے ساتھ زندگی کے ایام گزارے ہیں اس کے حق رفاقت ووفاداری اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ ہمدردی وغمگساری کا تقاضا یہ ہے کہ خاوند کے مرنے کے بعد اس کی بیوی عدت کے ایام اپنے خاوند کے گھر میں گزارے خواہ وہ مکان تنگ

وتاریک اور کتنا ہی وحشت ناک کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضرت فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا کا خاوند گھر سے باہر کسی دوسرے مقام پر قتل کر دیا گیا اور ان کا گھر کسی ویران اور وحشت ناک مقام پر واقع تھا۔ مزید برآں وہ مکان ان کی ملکیت بھی نہ تھا، ان کی بیوی حضرت فریعہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی کہ مجھے اپنے بہن بھائیوں اور والدین کے ہاں منتقل ہونے کی رخصت دی جائے تاکہ وہاں امن وسکون سے عدت کے ایام گزار سکوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا: ''اپنے گھر میں رہو جہاں تجھے خاوند کے فوت ہونے کی خبر ملی ہے یہاں تک کہ عدت کے ایام پورے ہو جائیں۔'' [مسند امام احمد: ۶/۳۷۰]

بعض روایات کے الفاظ یہ ہیں: ''اجلسی فی بیتک'' (نسائی) اپنے گھر میں بیٹھی رہو۔ یعنی کسی دوسری جگہ منتقل ہونے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما اس حکم نبوی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے البتہ حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف یہ ہے کہ عورت صرف عدت گزارنے کی پابند ہے خواہ کسی جگہ گزارے۔

حدیث میں تو صورت یہ ہے کہ عورت اپنے گھر میں تھی جبکہ خاوند باہر گیا تھا اور وہیں قتل کر دیا گیا صورت مسئولہ میں خاوند اپنے گھر میں فوت ہوا اور اس کی بیوی فوتگی کے وقت گھر میں موجود نہ تھی اس کے متعلق حدیث کے الفاظ ''جہاں تجھے خاوند کے فوت ہونے کی خبر ملی'' عورت کو اس بات کا پابند کرتے ہیں کہ وہ وہیں عدت گزارے۔ جہاں اسے وفات کی خبر ملی خواہ وہ کسی کے پاس بطور مہمان ہی ٹھہری ہوئی ہے۔ اس طرح کی پابندی شریعت کی منشا کے خلاف اور تکلیف مالا یطاق ہے۔ بہرحال اس عورت کو اپنے خاوند کے گھر عدت کے ایام گزارنا ہوں گے البتہ اس حکم سے چند صورتیں مستثنیٰ ہیں۔

① عورت خانہ بدوش ہونے کی وجہ سے کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اگر خاوند اسی حالت میں فوت ہوا تو اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ چار ماہ دس دن اسی مقام پر گزارے۔ بلکہ وہ جہاں قافلہ ٹھہرے گا اس کے ساتھ اپنے ایام گزارتی رہے گی۔

② میاں بیوی کرایہ کے مکان میں رہائش رکھے ہوئے تھے۔ خاوند کی وفات کے بعد آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے یا مالک مکان نے مکان خالی کرنے کا نوٹس دے دیا۔ ایسی صورت میں وہاں عدت کے ایام گزارنا اس کی طاقت سے باہر ہے وہ کسی دوسرے مکان میں منتقل ہو کر عدت کے دن گزار سکتی ہے۔

③ خاوند کے فوت ہونے کے بعد خاوند کے عزیز واقارب نے اسے اتنا تنگ کیا کہ وہاں ایام پورے کرنا مشکل ہو گئے۔ ایسے حالات میں وہ اپنے والدین یا بہن بھائیوں کے پاس منتقل ہو سکتی ہے۔

④ غیر ممالک میں جہاں خاوند کی وفات کے بعد عورت کو ویزے وغیرہ کا مسئلہ ہو وہ اپنے ملک واپس آ کر عدت گزار سکتی ہے۔

سوال کمالیہ سے قاری عبدالرحیم زاہد لکھتے ہیں کہ عورت کا خاوند عرصہ پانچ سال سے لاپتہ ہے۔ تلاش بسیار کے باوجود اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ ایسی عورت کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ آگے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیا جائے۔

جواب گمشدہ شوہر کو فقہی اصطلاح میں مفقود الخبر کہا جاتا ہے زوجہ مفقود کے نکاح ثانی کے متعلق علمائے امت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ مفقود کی بیوی اس وقت تک عقد نکاح سے فارغ نہیں ہو سکتی جب

تک کہ شوہر مفقود کی موت کا یقینی علم نہ ہو جائے۔ کتب فقہ میں اس کی بایں الفاظ بھی تعبیر کی گئی ہے کہ مفقود کے ہم عمر لوگ جب تک زندہ ہوں اس وقت دوسرے مرد سے اس کا نکاح درست نہیں ہے۔ احناف کے مسلک میں یہ روایت بھی ہے کہ ہم عمر لوگوں کی موت کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں بلکہ اس کا تعین حاکم کی رائے پر ہے جبکہ بعض حضرات نے طبعی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے مدت انتظار کا وقت متعین کیا ہے جس میں مختلف اقوال ہیں بعض کے نزدیک نوے برس اور بعض کے نزدیک پچھتر یا ستر برس ہیں لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زوجہ مفقود کی مدت انتظار چار سال ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک فیصلہ ہے: ''جس عورت کا خاوند گم ہو جائے اور اس کا پتہ معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے تو وہ عورت چار سال تک انتظار کرے پھر چار ماہ دس دن عدت گزار کر چاہے تو دوسرا نکاح کرے''۔ [مؤطا امام مالک: کتاب الطلاق]

ہمارے نزدیک امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف صحیح ہے کیوں کہ اسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک فیصلے کی تائید حاصل ہے، معاشرتی حالات بھی اس کا تقاضا کرتے ہیں لیکن مدت انتظار کا تعین حالات وظروف کے تحت کیا جاسکتا ہے، موجودہ زمانہ میں ذرائع رسل ورسائل اس قدر وسیع اور سریع ہیں جن کا تصور بھی زمانہ قدیم میں محال تھا۔ آج ہم کسی شخص کے گم ہونے کی اطلاع ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے ایک دن میں ملک کے کونے کونے میں پہنچا سکتے ہیں، بلکہ انٹرنیٹ کے ذریعے چند منٹوں میں اس کی تصویر بھی دنیا کے چپہ چپہ میں پہنچائی جاسکتی ہے۔ اس لیے اس مدت کو مزید کم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ امام المحدثین حضرت امام بخاری کا رجحان ایک سال مدت انتظار کی طرف ہے۔ چنانچہ وہ اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں؟ ''مفقود الخبر کے اہل وعیال اور مال ومتاع کے متعلق کیا حکم ہے''؟

اس کے تحت لقطہ کی احادیث لائے ہیں کہ اگر کسی کا گرا پڑا سامان ملے تو وہ اس کا سال بھر اعلان کرے، ان احادیث کے پیش کرنے سے امام بخاری کے رجحان کا پتہ چلتا ہے کہ زوجہ مفقود کے انتظار کا وقت ایک سال مقرر کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ نکاح کوئی دھاگہ نہیں جسے آسانی سے توڑ دیا جائے اور یہ ایک ایسا حق ہے جو مرد کے لیے لازم ہو چکا ہے اس عقدہ نکاح کو کھولنے کا مجاز عورت کا شوہر ہے لیکن دفع ضرر کی عدالت مرد کے قائم مقام کی حیثیت سے نکاح فسخ کرسکتی ہے، جیسا کہ خلع وغیرہ میں ہوتا ہے، اس لیے گم شدہ خاوند سے خلاصی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ عورت عدالت کی طرف رجوع کرے، اس سے قبل جتنی مدت بھی گزر چکی ہوگی اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا، ہمارے ہاں بعض عورتیں مدتِ دراز انتظار کرنے کے بعد عدالت کے نوٹس میں لائے یا اس کا فیصلہ حاصل کرنے سے قبل نکاح کر لیتی ہیں ان کا یہ اقدام صحیح نہیں ہے چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی عورت عدالت کے نوٹس میں لائے بغیر اپنے مفقود شوہر کا چار سال تک انتظار کرے تو اس مدت کا اعتبار کیا جائے گا؟ امام مالک نے جواب دیا: ''کہ اگر وہ اس طرح بیس سال بھی گزار دے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا''۔
[المدونۃ الکبریٰ: ۲/۹۳]

لہٰذا مدت انتظار کی ابتدا اس وقت سے کی جائے گی جس وقت حاکم وقت (جج) خود بھی تفتیش کر کے مفقود کے بارے میں مایوس ہو جائے۔ عدالت میں پہنچنے اور اس کی تفتیش سے قبل خواہ کتنی مدت گزر چکی اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ جس

عورت کا خاوند لاپتہ ہو جائے وہ عدالت کی طرف رجوع کرے، پھر اگر عدالت بعد از ثبوت اس نتیجہ پر پہنچے کہ واقعی شوہر مفقود الخبر ہے تو اسے چاہیے کہ وہ عورت کو مزید ایک سال انتظار کرنے کا حکم دے ایک سال تک اگر شوہر نہ آئے تو عدالت ایک سال کی مدت کے اختتام پر نکاح فسخ کر دے گی۔ پھر عورت اپنے شوہر کو مردہ تصور کر کے عدت وفات یعنی چار ماہ دس دن گزارنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہوگی۔

واضح رہے کہ ایک سال انتظار کا حکم عدالت اس صورت میں دے گی جب عورت کے پاس اس مدت کے اخراجات موجود ہوں بصورت دیگر عدالت بوجہ عدم موجودگی نفقہ فی الفور نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ اب اگر دورانِ مدت یا دوران عدت اس کا خاوند آجائے تو اسے اس کی بیوی مل جائے گی اگر نکاح ثانی کر لینے کے بعد خاوند آیا تو اس بیوی سے محروم ہونا پڑے گا۔ ایسا ہونا ممکن ہے جیسا کہ چند سال قبل ایک شخص اسلم قریشی کی گمشدگی اور پھر اس کی ڈرامائی انداز میں واپسی ہوئی تھی۔

یہ بھی واضح رہے کہ تفتیش کے اخراجات عورت کے ذمہ ہیں بشرطیکہ وہ صاحب حیثیت ہو، بصورت دیگر بیت المال مصارف تفتیش برداشت کرے گا، اگر بیت المال موجود نہ ہو تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ از خود اس ستم زدہ عورت کے ساتھ تعاون کریں اور تفتیش پر اٹھنے والے اخراجات کا بندوبست کریں، اگر عدالت اس معاملہ کو بلا وجہ طول اور عورت میں مزید صبر کی ہمت نہ ہو تو مسلمانوں کی ایک جماعت تحقیق کرے اور فیصلہ کرے تو ان کا یہ فیصلہ بھی عدالت کا ہی فیصلہ ہوگا۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے احمد دین سوال کرتے ہیں کہ ایک عورت اپنے خاوند سے تنگ ہے اور طلاق چاہتی ہے لیکن خاوند طلاق دینے سے انکاری ہے، عورت نے عدالت سے تنسیخ نکاح کی ڈگری حاصل کر کے دوسری جگہ شادی کر لی ہے کیا یہ نکاح درست ہے؟ اگر درست نہیں تو اس مجلس نکاح میں شرکت کرنے والوں کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب بیوی خاوند میں اگر اس قدر منافرت اور ناچاقی پیدا ہو چکی ہو کہ آئندہ اکٹھے رہنے کی صورت میں وہ احکام الٰہی کی پابندی نہیں کر سکیں گے تو عورت کا خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنا خلع کہلاتا ہے کیوں کہ بلا وجہ خلع لینے کے بارے میں احادیث میں بہت سخت وعید آئی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: ''کہ جس عورت نے بھی اپنے شوہر سے بغیر کسی معقول عذر اور مجبوری کے خلع حاصل کیا اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔'' [جامع الترمذی: کتاب الطلاق]

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بایں الفاظ خلع کے متعلق فرمایا: ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اس لیے اگر بیوی کچھ مال (شوہر کو) بطور فدیہ دے دے تو ان دونوں کے لیے کوئی حرج کی بات نہیں ہے''۔ [۲/البقرہ:۲۲۹]

یہ آیت احکام خلع کے متعلق ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے خلع یہ ہے کہ بیوی اپنے خاوند کو تھوڑا بہت مال دے کر طلاق دینے پر راضی کر لے کیوں کہ اس کے ساتھ کسی معقول مجبوری کی وجہ سے آئندہ نباہ نہیں ہو سکتا۔ اگر خاوند طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو بذریعہ عدالت طلاق لی جا سکتی ہے۔ اس مقام پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ خاوند اپنی بیوی کو بلا وجہ تنگ نہ کرے تاکہ ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ بیوی تھوڑا بہت مال دے کر اس سے نجات حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خلع اس صورت میں جائز ہے جب عورت کا عذر معقول ہو بلا وجہ خلع لینے پر سخت ممانعت ہے جیسا کہ حدیث بالا سے واضح ہے ایک اور

حدیث میں ہے: ''کہ خلع مانگنے والی اور اپنے شوہر سے جدائی کا مطالبہ کرنے والی عورتیں منافق ہوتی ہیں۔'' [مسند امام احمد:۲/۴۱۴]

صورت مسئولہ میں بیوی نے اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے عدالتی چارہ جوئی کر کے اپنے حق اختیار کو استعمال کیا ہے اور اس میں حق بجانب معلوم ہوتی ہے، عدالت نے اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے معاشرتی حالات کے پیش نظر اس کے حق میں تنسیخ نکاح کا فیصلہ دے دیا ہے۔ سوال میں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ عورت نے عدالتی فیصلہ کے فوراً بعد نکاح کر لیا ہے یا ایک حیض آنے کے بعد دوسرا نکاح کیا ہے، امام نسائی نے اپنی کتاب میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''خلع یافتہ عورت کی عدت'' اس کے تحت وہ حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خلع یافتہ عورت سے فرمایا تھا کہ وہ ایک حیض آنے تک انتظار کرے۔ [نسائی: کتاب الطلاق، باب عدۃ المختلعۃ]

اگر حدیث کے مطابق عمل کیا ہے تو اس مجلس نکاح میں شریک ہونے والے مجرم نہیں ہیں۔ بصورت دیگر وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کی اللہ سے معافی مانگنا چاہیے لیکن ایسا کرنے سے ان کے نکاحوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ واضح رہے کہ اگر عورت نے ایک حیض آنے سے پہلے نکاح کر لیا ہے تو ایسا نکاح شرعاً درست نہیں ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال احمد پور شرقیہ سے ذوالفقار سوال کرتے ہیں کہ ایک عورت کا کسی شخص سے نکاح ہوا، کچھ مدت کے بعد عورت کو پتہ چلا کہ اس کا خاوند ناکارہ، جوئے باز اور فحش کار ہے اور بیوی کے جملہ حقوق پورا کرنے سے بھی قاصر ہے، عورت نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے غیر شرعی دھندا شروع کر دیا جس کی بنا پر بیوی اور خاوند کا ہمیشہ جھگڑا رہنے لگا، نوبت بایں جا رسید کہ ایک دن مذکورہ خاوند نے اپنی بیوی کو مار پیٹ کر اپنے گھر سے نکال دیا، چنانچہ وہ اپنے والدین کے ہاں چلی گئی والدین نے صلح کی کوشش کی لیکن ناکام رہے، بالآخر اس کی بیوی نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے عدالتی چارہ جوئی کی عدالت نے یکطرفہ کارروائی کرتے ہوئے عورت کے حق میں تنسیخ نکاح کا فیصلہ دے دیا، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ عورت عدالتی تنسیخ نکاح کے بعد آگے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ ائمہ کرام کا اس کے متعلق اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ عدالت کا فیصلہ نافذ العمل ہے۔ جبکہ کچھ حضرات کہتے ہیں کہ عدالت مصالحت تو کرا سکتی ہے لیکن طلاق چونکہ خاوند کا حق ہے، اس لیے عدالت کو یہ اختیار نہیں کہ وہ ان کے مابین تنسیخ نکاح کا فیصلہ کرے، ہماری ناقص رائے کے مطابق پہلے حضرات کا موقف صحیح معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ شریعت نے خاوند کو عورت کے متعلق معاشرت بالمعروف کا پابند کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم ان سے دستور کے مطابق زندگی بسر کرو'' ۔ [۴/النسآء:۱۹]

اخراجات کی ادائیگی اور دیگر حقوق کی بجا آوری بھی خاوند کے ذمے ہے جو صورت مسئولہ میں وہ پوری نہیں کر رہا، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو تکلیف دینے کی غرض سے گھروں میں روکے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ فرمان الٰہی ہے: ''تم انہیں تکلیف دینے کے لیے مت روکو کہ تم زیادتی کا ارتکاب کرو'' ۔ [۲/البقرۃ:۲۳۱]

ان حالات کے پیش نظر عورت اگر مجبور ہو کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے تو یہ اس کا حق ہے، خاوند کو چاہیے تھا کہ وہ عدالت

میں حاضر ہو کر اپنی صفائی پیش کرتا تا کہ عدالت کو یکطرفہ کارروائی کرنے کا موقع نہ ملتا اب دو ہی صورتیں ہیں:

① اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کو صحیح سمجھتے ہوئے وہ عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔

② وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر بسانا نہیں چاہتا۔

دونوں صورتوں میں عدالت کا فیصلہ صحیح اور نافذ العمل ہے، عدت گزارنے کے بعد عورت کسی بھی دوسرے آدمی سے نکاح کر سکتی ہے۔ یہ اس کا حق ہے جسے شریعت کسی بھی صورت میں پامال نہیں کرنا چاہتی۔ مسئلہ کی وضاحت کے ساتھ ہم اس تلخ حقیقت کا اظہار کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ بدقسمتی سے ہمارا شریعت سے تعلق صرف ذاتی مفادات کی حد تک ہے چنانچہ صورت مسئولہ میں مذکورہ عورت نے اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے جو طریقہ کار اپنایا وہ انتہائی قابلِ نفریں اور باعث لعنت ہے، ایک غیرت مند آدمی اس بے حیائی کو اپنے گھر کب گوارا کر سکتا ہے، ہمارے نزدیک خاوند کا زدوکوب کرنے کے بعد اسے گھر سے نکال دینے کا یہ اقدام اس کی غیرت کا تقاضا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ پر دیوث ہونے کا دھبہ نہیں لگنے دیا، جب سر پر مصیبت پڑی ہے تو شریعت کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ جب خاوند اخراجات پورے نہیں کرتا تھا تو اسی وقت شریعت کی طرف رجوع کیا جاتا یا عدالتی چارہ جوئی کے ذریعے اپنا حق لیا جاتا، لیکن شریعت کو نظر انداز کر کے بدکاری اور بے حیائی کا راستہ اختیار کیا گیا، اس طرح حالات مزید خراب ہو گئے۔ اب اس عورت کو سوچنا چاہیے کہ قرآن مجید کی درج ذیل آیت کہیں اس پر تو نہیں چسپاں ہو رہی: ''بدکار عورتیں بدکار مردوں کے لیے اور فحش کار مرد فحش کار عورتوں کے لیے ہیں''۔ [۲۴/النور:۲۶]

عورت کو چاہیے کہ وہ اللہ کے حضور اپنے گناہ کی معافی مانگے اور آیندہ ایسا اقدام نہ کرنے کا عزم کرے جس سے اس کی عزت وناموس مجروح ہوتی ہو تا کہ وہ کسی شریف آدمی کے لیے مزید رسوائی اور خرابی کا باعث نہ ہو۔ مختصر یہ ہے کہ عدالتی فیصلہ کے بعد وہ عدت گزارنے کی پابند ہے اس کے بعد وہ نکاح ثانی میں آزاد ہے۔

سوال عبدالرحمٰن بورے والا سے لکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کئے ہوئے ہے اور کوئی خرچہ وغیرہ بھی نہیں دیتا، اس وجہ سے عورت سخت تکلیف میں مبتلا ہے۔ کیا ایسے حالات میں عورت کو فسخ نکاح کی شرعاً اجازت ہے؟

جواب قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے متعلق خاوندوں کو حکم دیا ہے کہ ان بیویوں کے ساتھ معاشرت اور رہن سہن میں اچھا برتاؤ کریں۔'' [۴/النساء:۱۹]

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے ساتھ قول وفعل کے ذریعہ اچھا برتاؤ کرنا چاہیے۔ بسا اوقات برابرتاؤ تعلقات میں کشیدگی، غیروں سے محبت اور نافرمانی وبداخلاقی کا سبب بن جاتا ہے۔ قرآن پاک میں یہ بھی حکم ہے کہ ''اپنی بیویوں کو تکلیف دینے کے لیے مت روکو تا کہ تم حد سے تجاوز کرو''۔ [۲/البقرہ:۲۳۱]

ان آیات سے معلوم ہوا کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے اور انہیں تکلیف دینے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ عورت کو خرچہ وغیرہ نہ دینا اس سے بڑھ کر اور کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جو آدمی اپنی بیوی پر اخراجات کی طاقت نہیں رکھتا ان کے درمیان تفریق کرا دی جائے''۔ [دارقطنی]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی فوج کے سربراہوں کو لکھا تھا کہ جو آدمی اپنی عورتوں سے غائب ہیں انہیں چاہیے کہ وہ ان کے اخراجات برداشت کریں یا پھر انہیں طلاق دے کر فارغ کر دیں، طلاق دینے کی صورت میں بھی پہلی مدت کے اخراجات ادا کرنا ہوں گے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کی کسی نے بھی مخالفت نہیں کی تھی، گویا کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اس پر اجماع ہے۔

[زادالمعاد فی ہدی خیر العباد]

ان آیات اور احادیث وآثار سے معلوم ہوا کہ تنگ دست یا دانستہ خرچ نہ کرنے والے کی بیوی اخراجات کی عدم ادائیگی پر فسخ نکاح کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اس میں وہ حق بجانب ہے، لیکن اس کا طریقہ کار یہ ہو کہ حاکم وقت کے ہاں استغاثہ دائر کرے، وہ حالات کا جائزہ لے کر فسخ نکاح کا فیصلہ کرے گا۔ پھر عورت عدت گزارے اس کے بعد آگے نکاح کرنے کی اجازت ہے۔ صرف فتویٰ کو بنیاد بنا کر نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ فتویٰ کسی کا حق ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے لیکن وہ حق کسی سے لے کر دوسرے کے حوالے کرنا عدالت کا کام ہے۔ لہٰذا عدالت کے حضور درخواست دے کر اس کے متعلق فیصلہ لیا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال اقبال نگر سے محمد سلیم سوال کرتے ہیں کہ ایک عورت نے فیملی کورٹ میں اپنے خاوند کے خلاف تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا، اس کے بعد عدالت نے خاوند کو اظہار وجوہ کا نوٹس جاری کیا، اخبارات میں اس کے متعلق اشتہار بھی دیا لیکن خاوند حاضر نہ ہوا، آخر کار عدالت نے مؤرخہ ۱۲ جولائی ۲۰۰۲ء کو طلاق کے احکامات جاری کر دیئے یعنی عورت کے حق میں تنسیخ نکاح کا یک طرفہ فیصلہ کر دیا، اب عورت نکاح ثانی کے لیے کتنی عدت گزارنے کی پابند ہے؟

جواب بشرط صحت سوال صورت مسئولہ میں عورت کے مطالبہ تنسیخ نکاح پر عدالت کا یک طرفہ فیصلہ طلاق خلع کہلاتا ہے اور خلع سے نکاح فسخ ہو جاتا ہے، خلع سے چھٹکارا حاصل کرنا بیوی کا حق ہے بشرطیکہ زوجین میں اس قدر شدید منافرت اور ناچاقی پیدا ہو چکی ہو کہ آئندہ اکٹھے رہنے میں وہ احکام الٰہی کی پابندی نہیں کر سکیں گے کیوں کہ بلا وجہ خلع لینے سے بہت سخت وعید احادیث میں آتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے ''کہ جس عورت نے بھی اپنے شوہر سے بغیر کسی معقول عذر اور مجبوری کے خلع حاصل کیا اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے۔'' [جامع ترمذی: کتاب الطلاق]

چونکہ صورت مسئولہ میں عدالت نے اپنے صوابدیدی اختیارات استعمال کرتے ہوئے معاشرتی حالات کے پیش نظر عورت کے حق تنسیخ نکاح کا فیصلہ کر دیا ہے، اب نکاح ثانی کے لیے اسے ایک حیض آنے تک انتظار کرنا ہوگا تا کہ رحم کے لیے خالی ہونے کا یقین ہو جائے، اس کے بعد وہ جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ چنانچہ امام نسائی نے اپنی کتاب میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''خلع یافتہ عورت کی عدت۔'' اس کے تحت وہ ایک حدیث میں لائے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خلع یافتہ عورت سے فرمایا کہ وہ ایک حیض آنے تک انتظار کرے۔ [نسائی: کتاب الطلاق، باب عدۃ المختلعۃ]

اگر چہ عدالت نے اپنے فیصلہ میں اسے طلاق سے تعبیر کیا ہے لیکن خلع فسخ ہے، طلاق نہیں، حافظ ابن قیم نے طلاق اور خلع کے درمیان فرق کرتے ہوئے لکھا ہے ''کہ طلاق میں مرد کو رجوع کرنے کا حق ہوتا ہے جبکہ خلع میں ایسا نہیں ہوتا، دوسرا یہ کہ طلاق کی عدت تین حیض ہے جبکہ خلع کی عدت ایک حیض ہے جیسا کہ سنت نبوی اور اقوال صحابہ سے ثابت ہے۔'' [زادالمعاد فی ہدی خیر العباد]

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کی خوب وضاحت کی ہے ان کی تحقیق کے مطابق حضرت عثمان، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا یہی فیصلہ ہے کہ خلع یافتہ عورت ایک حیض آنے تک انتظار کرے۔ [فتاویٰ:۳۲/۳۲۴]

ان تصریحات کی روشنی میں عورت کے لیے ضروری ہے کہ خلع لینے کی صورت میں ایک حیض آ جانے کے بعد وہ نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ضلع مظفر گڑھ سے احمد بخش پوچھتے ہیں کہ عورت نے فسخ نکاح کے لیے مقدمہ دائر کیا، عدالت نے خاوند کی موجودگی میں فسخ نکاح کا فیصلہ سنا دیا اور مبلغ پانچ ہزار روپیہ داخل خزانہ کے لیے پابند کیا جبکہ حق مہر صرف سو روپیہ تھا یہ رقم داخل خزانہ حکومت نے کر دی ہے۔ اب پتہ نہیں کہ خاوند نے اس رقم کو وصول کر لیا ہے یا نہیں، کیا ایسے حالات میں فسخ ہوگا اور عورت آگے نکاح کرنے کی مجاز ہے۔

جواب عائلی زندگی میں طلاق دینے کا حق خاوند کو سونپا گیا ہے لیکن اگر میاں بیوی کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو جائیں کہ گزر اوقات کے لیے کوئی صورت باقی نہ رہے اور شوہر بھی طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو ایسے حالات میں اسلام نے عورت کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کر لے، اسے شریعت کی اصطلاح میں ''خلع'' کہتے ہیں۔ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں حدود اللہ کے پامال ہونے کا اندیشہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اگر انہیں اندیشہ ہو کہ زن وشوہر اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے درمیان کوئی معاملہ طے ہو جانے سے کوئی مضائقہ نہیں کہ عورت (خاوند سے رہائی پانے کے بدلے) کچھ دے ڈالے''۔ [۲/البقرہ:۲۲۹]

اس خلع کی دو صورتیں ممکن ہیں:

① میاں بیوی باہمی رضامندی سے گھر ہی کوئی معاملہ طے کر لیں اس کے مطابق خاوند اپنی بیوی سے وصولی کے بعد اسے طلاق دے دے۔

② خاوند طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو تو عورت عدالت کی طرف رجوع کرے پھر عدالت فریقین کے بیانات سننے کے بعد ڈگری جاری کرے۔

صورتِ مسئولہ میں بھی خاوند طلاق دینے پر آمادہ نہیں اس لیے عورت نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہے اور عدالت نے خاوند کی موجودگی میں بر بنائے خلع فسخ نکاح کا فیصلہ سنا دیا اور حسبِ حکم عورت نے مبلغ پانچ ہزار روپیہ داخل خزانہ بھی کر دیئے ہیں، اب خاوند کی طرف سے خاموشی تنسیخ نکاح پر کوئی اثر انداز نہیں ہوگی جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے بھی حاکم وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا تھا اور حق مہر میں وصول کیا ہوا باغ واپس کر کے اپنے خاوند سے خلاصی حاصل کر لی تھی۔ [صحیح بخاری]

احناف کے ہاں بھی یہ بات مسلم ہے کہ عورت اپنے شوہر کی رضامندی سے خلع لے اگر ایسا ممکن نہ ہو تو قاضی سے اپنے فسخ نکاح کی درخواست کرے۔ جبکہ اس کا خاوند ازدواجی حقوق نہ ادا کر سکتا ہو یا دیوانہ یا ضدی ہو یا گم ہو چکا ہو۔

[تکملہ فتح الملہم شرح مسلم]

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''خلع پر میاں بیوی کا اتفاق ضروری ہے اگر باہمی ناچاقی ہو تو عدالت کا فیصلہ نافذ العمل ہوگا اس کتاب کے شارح علامہ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں'' کہ عدالت کے فیصلے کو قبول کرنا اس بنا پر ہے کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اور اس کی بیوی نے اپنا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں پیش کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا تھا کہ ثابت تم باغ لے کر طلاق دے دو اور عورت کو تاریخ فیصلہ سے عدت گزارنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی اجازت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال لاہور سے محمد افضل لکھتے ہیں کہ خلع لینے والی عورت کا دوبارہ اسی خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔ نیز خلع لینے سے عورت کو کن کن حقوق سے دستبردار ہونا پڑے گا، قرآن مجید میں ہے کہ نکاح کے فوراً بعد اگر خاوند بیوی کو طلاق دے دے تو عورت نصف حق مہر کی حقدار ہوگی کیا نکاح کے فوراً بعد خلع لینے سے عورت کو حق مہر ملے گا یا نہیں؟

جواب صورت مسئولہ میں تین سوالات ہیں ان کے ترتیب وار جوابات حسب ذیل ہیں:

① شریعت اسلامیہ میں بیوی اور خاوند کے درمیان تفریق کے لیے صرف دو صورتیں ہیں ایسی ہیں کہ عام حالات میں بیوی خاوند دوبارہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

☆ جب بیوی اور خاوند کے درمیان بذریعہ لعان علیحدگی ہوئی ہو تو آیندہ زندگی میں دونوں کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

☆ اگر خاوند وقفے سے تین طلاق دے دے تو اس صورت میں بھی بیوی خاوند دوبارہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

ان صورتوں کے علاوہ تفریق کی جتنی بھی صورتیں ہیں ان میں دوبارہ اکٹھے ہونے کی گنجائش ہے۔ اس وضاحت کے بعد اگر تفریق بذریعہ خلع عمل میں آئے تو ایک حیض آنے کے بعد دوبارہ نکاح سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو سکتے ہیں۔

② اگر عورت کے مطالبہ پر علیحدگی ہو جسے خلع کہا جاتا ہے تو اس صورت میں بیوی کو صرف حق مہر سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی۔

③ نکاح کے فوراً بعد طلاق ہونے کی صورت میں اگر حق مہر مقرر طے ہو چکا تھا تو عورت نصف حق مہر کی حق دار ہوگی اگر نکاح کے وقت حق مہر طے نہیں ہوا تھا تو طلاق کے مطابق متعہ طلاق دینا ہوگا، اس کی تعیین شریعت میں نہیں کی گئی اس سے صرف عورت کی دلجوئی اور دلداری مقصود ہے تاکہ مستقبل میں متوقع خصومتوں کا سد باب ہو سکے اگر نکاح کے فوراً بعد بذریعہ خلع تفریق ہو جائے تو بھی عورت کو حق مہر سے ہی دستبرداری اختیار کرنا ہوگی، مختصر یہ کہ خلع لینے والی عورت کو کسی صورت میں حق مہر نہیں دیا جائے گا۔

سوال گوجرانوالہ سے ابوبکر لکھتے ہیں کہ خلع کی صورت میں عورت سے حق مہر سے زیادہ مال وصول کیا جا سکتا ہے یا نہیں، قرآن وحدیث کی رو سے اس کا جواب درکار ہے۔

جواب عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا خلع کہلاتا ہے، کیا خاوند کو حق مہر سے زیادہ مال وصول کرنے کی اجازت ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق بعض فقہا نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر عورت قصوروار ہونے کے باوجود طلاق کا مطالبہ کرتی ہے تو خاوند کو حق مہر سے زیادہ وصول کرنے کی اجازت ہے لیکن محدثین کرام نے فقہا کے اس موقف سے اتفاق نہیں کیا، انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ جو مال شوہر نے بیوی کو دیا ہے اس سے زیادہ کا مطالبہ کیا جائے اگرچہ قرآن کریم سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ بیوی خاوند کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے لیکن احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے۔ بلکہ زیادہ دینے یا وصول کرنے سے منع کر دیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے خاوند سے طلاق لینے کا مطالبہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو اس کا حق مہر میں دیا ہوا باغ واپس کر دے گی۔'' ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی نے عرض کی کیوں نہیں بلکہ کچھ زیادہ بھی دوں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زیادہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صرف اس کا باغ ہی واپس لوٹا دے''۔ [دارقطنی: ۳/۲۵۵]

ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کو اس کا باغ واپس کر دینے کے متعلق کہا تو خاوند کو حکم دیا ''کہ اپنا یہ باغ وصول کر لو اور اس سے زیادہ وصول نہ کرو۔'' [ابن ماجہ: الطلاق ۲۰۵۶]

اگرچہ بعض روایات میں اس عورت کی طرف سے زیادہ دینے کے الفاظ بھی ملتے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی طرف سے حق مہر سے زیادہ کو برقرار نہیں رکھا۔ پھر یہ روایت محدثین کرام کے معیار صحت پر بھی پوری نہیں اترتی اگر صحیح بھی ہو تو زیادہ دینا عورت کی اپنی صوابدید پر موقوف ہے۔ آدمی کی طرف سے مطالبے کے پیش نظر ایسا نہیں کیا گیا۔ اس بنا پر خاوند کو چاہیے کہ وہ حق مہر سے زیادہ وصول نہ کرے جو اس نے بیوی کو دیا ہے ویسے بھی حق مہر سے زیادہ وصول کرنا اخلاقی اصولوں کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ عقل سلیم اس کی اجازت نہیں دیتی۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال میں نے اپنی بیوی کو کچھ عرصہ پہلے طلاق دے کر اپنی زوجیت سے فارغ کر دیا ہے اب میری پانچ سالہ بچی اس کے پاس ہے چونکہ جہاں میری سابقہ بیوی رہائش رکھے ہوئے ہے وہاں مغربی تہذیب وثقافت کا زیادہ اثر ہے۔ اس لیے مجھے اپنی بچی کے عقائد ونظریات اور اعمال واخلاق کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی بچی کو اپنے پاس رکھوں کیا شریعت کی رو سے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ ایسی حالت میں اپنی بچی کو اس کی ماں کے پاس چھوڑنے کی بجائے اسے اپنے پاس رکھوں تاکہ اس کی صحیح تربیت کا بندوبست ہو سکے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ درکار ہے۔ (سائل: عبدالرشید لاہور)

جواب شریعت اسلامیہ نے بچے کی پرورش وپرداخت کا حقدار ماں کو ٹھہرایا ہے۔ اس طرح چھوٹے بچوں کی پرورش کرنے کو شرعی اصطلاح میں ''حضانت'' کہا جاتا ہے، والدہ کا یہ حق حضانت متعدد روایات سے ثابت ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ منورہ روانہ ہونے لگے تو سید الشہداء حضرت حمزہ کی ایک چھوٹی بیٹی آپ کے پیچھے آنے لگی حضرت علی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کر دیا بعد میں حضرت علی، حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہم اس کے متعلق جھگڑنے لگے۔ ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ میں اس کی پرورش کا حقدار ہوں۔ چونکہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی بیوی اس بچی کی خالہ تھی اس لیے آپ نے بچی کے متعلق خالہ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور فرمایا: ''**الخالة بمنزلة الام**'' [مسند امام احمد: ۱/۱۱۵]

''خالہ ماں کے درجہ میں ہے'' آپ کے فیصلے کی بنیاد یہ تھی کہ بچے کے حق میں ماں انتہائی مہربان ہوتی ہے اور پرورش ونگرانی میں وہ مرد کی نسبت زیادہ قدرت رکھتی ہے، ہاں اگر ایسے عوارض پیش آجائیں جن کی وجہ سے بچے کے حق میں ماں کی اس محبت وشفقت کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ماں کا حق حضانت ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس سے مقصود بچے کی فلاح وبہبود

ہے۔حضانت اور پرورش کے معاملہ میں بچے کی بہبود کو فوقیت حاصل ہے۔اس بات کا اشارہ ان احادیث سے ملتا ہے جن میں رسول اللہ ﷺ نے نکاح ثانی کرنے کے بعد ماں کو حق حضانت سے محروم قرار دیا ہے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ والدین کے اختلاف کے وقت فیصلہ دیا تھا:

''جب تک تو نکاح ثانی نہ کرے اس بچے کی حقدار ہے۔'' [مسند امام احمد: حدیث نمبر ۲۲۱۸۲]

کیوں کہ عین ممکن ہے کہ شوہر ثانی کے حقوق کی ادائیگی میں مصروف رہنے کی وجہ سے اپنے سابق شوہر کے بچے کی پرورش کا حق صحیح طور پر ادا نہ کر سکے۔اس لیے ضروری ہے کہ حق پرورش کے معاملہ میں بچے کی بہبود وحفاظت کا لحاظ رکھا جائے اور حالات کے تقاضے کو نظر انداز نہ کیا جائے۔جہاں تک ممکن ہو ماں کو اولیت دی جائے تا کہ اس کی ماما کا تحفظ ہو۔بشرطیکہ وہاں کوئی امر مانع ہو،فقہائے اسلام نے حق حضانت کے متعلق قابل قدر مباحث سپرد قلم کئے ہیں۔یہ تو ظاہر ہے کہ فلاح و بہبود سے مراد صرف جسمانی طور پر پرورش و پرداخت کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ذہنی نشوونما بھی اس میں شامل ہے۔چنانچہ جس مقام پر بچے کی ذہنیت خراب ہونے کا اندیشہ ہو اور اس کے اخلاق وافعال کے بگڑنے کا خطرہ ہو ماں کو حق پرورش نہیں دیا جائے گا درمختار میں ہے: دین اسلام سے برگشتہ ہونے والی یا فسق وفجور میں مبتلا عورت سے حق حضانت ساقط ہو جاتا ہے''۔ [ج ۲ ص ۶۸۸]

جسمانی پرورش کے متعلق بھی یہی ضابطہ ہے چنانچہ لکھا ہے کہ:''اگر عورت میں شوق عبادت حد اعتدال سے بڑھا ہوا ہو اور یہ ''جنونی شوق'' بچے کی صحیح طور پر نشوونما میں رخنہ اندازی کا باعث ہو تو اس قسم کی عورت کو بھی حق حضانت سے محروم کر دیا جائے گا''۔

[حوالہ مذکورہ]

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''اگر ماں کسی غیر محفوظ مقام پر رہائش رکھے ہوئے ہے یا اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے تو باپ کو اپنی اولاد کا حق ہے۔'' [فتاویٰ: ج ۳۴ ص ۱۳۱]

آگے چل کر مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:''اصل اعتبار بچے کی بہبود کا ہے اس بنا پر دونوں میں سے کسی ایک کو مطلق طور پر بچے کی پرورش کا حقدار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔بلکہ نیک،عادل بہی خواہ اور اپنے فرائض وواجبات کی ادائیگی پر قدرت رکھنے والے کو یہ حق ملنا چاہیے۔اپنی ذمہ داری پوری طرح نہ نبھانے والے کو یہ حق نہیں سونپا جائے گا''۔

[فتاویٰ ابن تیمیہ: ج ۳۴ ص ۱۳۲]

سید سابق رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:''اس معاملہ میں بچے کو پوری نگہداشت وحفاظت کی قدرت کا اعتبار ہوگا''۔ [فقہ السنۃ: ۲/۲۹۸]

ہمارے ملک کی اعلیٰ عدالتوں نے بھی متعدد فیصلے اسی بنیاد پر صادر کئے ہیں۔چنانچہ کیکاؤس نے ایک فیصلہ میں لکھا ہے:''اگرچہ ماں اپنے نابالغ بچے کا(قانونی)حق حضانت رکھتی ہے۔لیکن باپ حقیقی ولی ہوتا ہے اور بچے پر نگرانی اور کنٹرول کرنے کا حق رکھتا ہے۔چنانچہ اگر عورت بچے کو ایسی جگہ پر لے جائے جہاں باپ اس پر اپنی نگرانی اور کنٹرول نہیں رکھ سکتا تو ماں حق حضانت کو کھو دیتی ہے''۔ [بحوالہ مجموعہ قوانین اسلام: ۳/۸۹۸]

ہمارے فاضل ججوں کے متعدد فیصلے ایسے ہیں جن میں انہوں نے نابالغ بچوں کو اس بنا پر ماں کی حضانت سے نکال کر باپ کی

حضانت میں دے دیا کہ ماں غیر اخلاقی زندگی بسر کررہی ہے اوراپنے لیے ایسے ماحول کا انتخاب کرلیا ہے جس میں رہ کرنا بالغ بچے مستقل طور پر ایسے اثر میں رہیں گے جوان کی اخلاقی عادات اور روحانی اقدار کو متاثر کرنے کا سبب بن سکتا ہے صورت مذکورہ میں بھی باپ اس قسم کے حالات سے دوچار ہے کہ اس کی بچی اپنی ماں کے زیر اثر رہ کر اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوسکتی ہے۔ اگر واقعی حالات ایسے ہیں جن کا سوال میں ذکر کیا گیا ہے تو ماں کو حق پرورش سے محروم کرکے پانچ سالہ بچی کو باپ کے حوالہ کردیا جائے تاکہ وہ صحیح طور پر اس کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرسکے۔

سوال محمد عمر بذریعہ ای میل لکھتے ہیں کہ میں نے ایک عورت سے شادی کی جس کے ہمراہ پہلے خاوند سے تین نابالغ بچے بھی تھے۔ ان میں ایک جب جوان ہوا تو میں نے اپنے اخراجات پر اس کی شادی کردی، اس لڑکے کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی جو پیدائشی طور پر یرقان کی مریضہ تھی۔ میں چونکہ لاولد تھا اس لیے بچی کے والدین کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ کے تحت ان کی رضامندی سے اس بیمار بچی کو میں نے لے لیا اور بہترین ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ۳ دن کی بیمار بچی کا قیمتی علاج کروایا۔ اللہ تعالیٰ نے بچی کو روبہ صحت کردیا۔ دوسال کے بعد بچی کے والدین صرف ایک دن کے لیے اپنے گھر لے گئے۔ پھر واپس کرنے سے انکار کردیا۔ کیا انہیں شرعی طور پر ایسا کرنے کا حق تھا کیا بچی کی واپسی کا مطالبہ کرسکتا ہوں؟

جواب واضح رہے کہ کسی کے بچے کو اپنا بیٹا بنانا اور اپنے گھر اس کی پرورش کرنا دورِ جاہلیت میں بھی رائج تھا۔ عرب کے لوگ جس بچے کو متبنیٰ (لے پالک) بنالیتے اسے بالکل حقیقی اولاد کی طرح سمجھتے اور صلبی اولاد کا درجہ دیتے۔ منہ بولے بیٹے کو وراثت بھی ملتی، اس سے منہ بولی بہن وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور حقیقی بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ یہ رسم اسلام کے قوانین ستر وحجاب، وراثت اور نکاح وطلاق سے قدم قدم ٹکراتی تھی اور بعض اوقات کئی ایک برائیوں اور بداخلاقیوں کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتی تھی۔ کیوں کہ اس طرح ایک ایسے شخص کو وراثت کا حق دار ٹھہرادیا جاتا جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ پھر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کردیا جائے وہ کسی صورت میں بھی حقیقی رشتہ کی طرح نہیں ہوسکتا۔ اس مصنوعی رشتے کے تقدس پر اعتماد کرکے جب مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہوتا تو برے نتائج پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے اسلام نے لے پالک کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیل کو باطل قرار دیا ہے اور اس رسم کی حوصلہ شکنی کی ہے، ہمارے ہاں اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ بے اولاد انسان اپنے دل بے قرار کو وقتی طور پر اطمینان دے لیتا ہے۔ اور لے پالک کے ساتھ تعاون کی بھی کوئی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ مثلاً اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی جاتی ہے۔ لیکن اکثر بے اولاد حضرات لے پالک کو اپنی حقیقی اولاد کا ہی درجہ دیتے ہیں۔ جو اسلام کو گوارا نہیں ہے۔ صورت مسئولہ میں سائل لاولد تھا۔ اس نے اپنی شفقت پدری دینے کے لیے کسی دوسرے کی بیمار بچی کو اپنے گھر پالا اور اس کے قیمتی علاج پر اخراجات بھی برداشت کیے۔ شاید حقیقی والدین یہ فریضہ سرانجام نہ دے سکتے۔ لہٰذا اس خدمت کی بجا آوری پر شکر وسپاس کا حقدار ہے لیکن شرعی طور پر چونکہ وہ والدین کی بچی تھی اس لیے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہ اسے لے گئے ہیں۔ والدین اب اس بات کے پابند ہیں کہ بچی کے علاج پر اٹھنے والے اخراجات، پرورش کنندہ کو واپس کریں اور وعدہ خلافی کی اللہ سے معافی مانگیں۔ محبت ویگانگت کی فضا میں اس معاملے کو حل کریں۔

سوال علی پور سے فرزانہ پوچھتی ہیں کہ کسی مجبوری کی وجہ سے مانع حمل ادویات استعمال کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

جواب مانع حمل ادویات استعمال کرنے کی دو اقسام ہیں:

(الف) ہمیشہ کے لیے مکمل طور پر رحم کو حمل کے قابل نہ رہنے دینا، ایسا کرنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، اس کی دو وجوہات ہیں:

☆ رسول اللہ ﷺ کے مقصود کے خلاف حرکت کرنا ہے۔ کیوں کہ آپ کا مقصود ہے کہ امت اسلامیہ کثرت سے ہوتا کہ قیامت کے دن امت کی کثرت آپ کے لیے سرفرازی اور فخر کا باعث ہو، مستقل طور پر رحم کو ادویات سے ناکارہ کر دینا پیغمبرانہ مشن کے خلاف ہے لہٰذا ایسا کرنا جائز نہیں۔

☆ ممکن ہے کہ کسی ناگہانی بیماری سے پہلی اولاد فوت ہو جائے، اگر آئندہ اولاد نہ ہونے کا بندوبست کر لیا ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے بے اولاد رہے گی۔ اس سے بڑھ کر شومئ قسمت کیا ہو سکتی ہے؟

(ب) عارضی طور پر کسی بیماری کی وجہ سے رحم میں بندش کر دینا اس کے لیے تین شرائط ہیں:

① دیانت دار، تجربہ کار ڈاکٹر کی ہدایت ہو کہ آئندہ حمل عورت کے لیے جان لیوا ہو سکتا ہے یا اس کا حمل کسی مہلک بیماری کا باعث بن سکتا ہے۔

② خاوند سے اجازت لی جائے کیوں کہ حصول اولاد خاوند کا حق ہے، اس لیے اس سے اجازت لینا بھی ضروری ہے۔

③ ادویات کے استعمال سے اسے کسی قسم کے نقصان یا ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''خود بخود تم اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت پڑو''۔ [۲/البقرہ:۱۹۵]

اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر عورتوں سے عزل کر لیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ انہیں منع نہیں فرماتے تھے۔ لیکن آدمی کے ایک پرائیویٹ معاملے کو بنیاد بنا کر قطع نسل کی قومی سطح پر تحریک چلانا کسی طرح بھی جائز نہیں ہے، لہٰذا کسی تجربہ کار، دیانت دار ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر وقتی طور پر مانع حمل ادویات استعمال کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ایسی ادویات جن کے استعمال سے رحم ہمیشہ کے لیے اولاد کے قابل نہ رہے، کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بہاولپور سے خادم حسین لکھتے ہیں کہ حکومتی سطح پر منصوبہ بندی کے متعلق آج کل بہت پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے، اس سلسلہ میں عزل کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے، اس کے متعلق بھی صحیح موقف کی نشاندہی کریں۔

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ تحریک ضبط ولادت کی بنیاد روزِ اول ہی سے قوانین فطرت سے تصادم اور احکام شریعت سے بغاوت پر رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ اس کے پس منظر میں یہ سوچ کارفرما ہے کہ زمین کے ذریعے پیداوار اور وسائل معاش انتہائی محدود ہیں اور اس کے مقابلہ میں شرح پیدائش غیر محدود ہے۔ لہٰذا اس ''بحران'' پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کم سے کم پیدا کیے جائیں تاکہ معیارِ زندگی پست ہونے کے بجائے بلند ہو، لیکن قرآن کریم سرے سے اس اندازِ فکر کو غلط قرار دیتا ہے اور بار بار اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ رزق دینا اس کی ذمہ داری ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ رازق بھی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:''کہ زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔'' [١١/ہود:٦]

انسان کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ خزانوں سے اپنا رزق تلاش کرنے کے لیے محنت کرے اور یہ تحریک اس لیے بھی مزاجِ اسلام کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو امتِ مسلمہ کی سلامتی سے بڑھ کر اور کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتا ہے کہ بے شمار دشمنوں میں گھرے ہوئے مٹھی بھر مسلمان ہر وقت خطرے میں پڑے رہیں، اس لیے وہ مسلمانوں کو اپنی افرادی قوت بڑھانے کے لیے بطور خاص حکم دیتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:''کہ تم نکاح کے لیے ایسی عورتوں کا انتخاب کرو جو زیادہ محبت کرنے کے ساتھ ساتھ بچے زیادہ جننے والی ہوں۔ قیامت کے دن کثرتِ امت کی بنا پر تمام انبیا سے بڑھ کر میں ہوں گا۔''

[صحیح ابن حبان:٧/١٣٦]

اور رسول اللہ ﷺ نے بلاوجہ مجردانہ زندگی بسر کرنے سے سخت منع فرمایا ہے۔ [مسند امام احمد:٣/١٥٨]

اللہ تعالیٰ نے مرد کو کاشتکار اور عورت کو کھیتی کی حیثیت دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:''کہ عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔'' [٢/البقرة:٢٢٣] کوئی بھی دانشمند اپنی کھیتی کو برباد نہیں کرتا بلکہ اس سے پیداوار لینے کے لیے اپنے وسائل کو بروئے کار لاتا ہے۔ لیکن منصوبہ بندی کی تحریک کا مقصد اس کھیتی کو بنجر اور بے کار کرنا ہے، تحریک تحدید نسل کے حامی اسے مشرف با اسلام کرنے کے لیے عزل کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ سوال میں بھی اس کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ عزل کا پس منظر ضبط ولادت کے متعلق کوئی عمومی تحریک برپا کرنا نہ تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ سے مختلف اوقات میں بعض افراد نے اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر دریافت کیا تھا کہ ان حالات میں ایک مسلمان کے لیے عزل کرنا جائز ہے یا نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے متعلق کچھ تفصیل سے ذکر کر دیا جائے۔

دورِ جاہلیت میں اندیشہ مفلسی اور حد سے بڑھے ہوئے جذبہ غیرت کے پیش نظر ضبطِ ولادت کے لیے قتل کا طریقہ رائج تھا۔ اسلام نے آتے ہی اس ظالمانہ طریقہ کو سختی سے روک دیا، مسلمانوں میں چند مخصوص حالات کے پیش نظر عزل کا رجحان پیدا ہوا جس کی درج ذیل وجوہات تھیں:

① آزاد عورت سے اس لیے عزل کیا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک استقرار حمل سے شیر خوار بچے کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

② لونڈی سے اس لیے عزل کیا جاتا ہے کہ اس سے اولاد نہ ہو کیوں کہ ایسے حالات میں اسے فروخت نہیں کیا جا سکے گا بلکہ اسے اپنے پاس رکھنا ہوگا۔

چونکہ ابتدا میں عزل کے عدم جواز کے متعلق کتاب وسنت میں کوئی صراحت نہ تھی، اس بنا پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے مخصوص حالات کے پیش نظر عزل کی ضرورت محسوس کی اور اس پر عمل کیا، جیسا کہ حضرت ابن عباس، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم کے متعلق روایات میں آیا ہے۔ [موطا امام مالک: کتاب الطلاق، باب ماجاء فی العزل]

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے سکوت فرمایا۔ آپ ﷺ کی خاموشی کو رضا پر محمول کرتے ہوئے اس پر عمل کیا گیا جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں عزل

کرتے تھے، اس کی خبر آپ ﷺ کو پہنچی لیکن اس کے باوجود آپ نے ہمیں منع نہیں فرمایا۔ [مسلم: کتاب النکاح، باب حکم العزل]

جب رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے مختلف حالات کے پیش نظر مختلف جوابات دیئے جس کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

☆ اظہارِ تعجب کرتے ہوئے فرمایا: ''کیا تم ایسا کرتے ہو؟ قیامت تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو پیدا ہو کر رہیں گے۔'' [صحیح بخاری: کتاب النکاح، باب العزل]

☆ اگر تم ایسا نہ کرو تو تمہارا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ [صحیح مسلم: کتاب النکاح]

راوی کہتا ہے کہ ''لا علیکم'' کے الفاظ نہی کے زیادہ قریب ہیں، ایک دوسرا راوی کہتا ہے کہ اس انداز گفتگو کے ذریعے آپ ﷺ نے عزل کے ارتکاب سے ڈانٹا ہے۔

☆ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جس نفس کو پیدا کرنا ہے وہ ضرور پیدا ہوگا۔ [صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب حکم العزل]

☆ تم چاہو تو عزل کر لو مگر جو اولاد تقدیر میں لکھی ہے وہ تو ہو کر رہے گی۔ [مسند امام احمد: ۳/۳۱۲]

ان روایات کے پیش نظر اہل علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے مکروہ خیال کرتے تھے۔ [ترمذی: کتاب النکاح، باب ماجاء فی کراہیۃ العزل]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی عزل کو اچھا نہیں خیال کرتے تھے۔ [مؤطا امام مالک: کتاب الطلاق، باب ماجاء فی العزل]

ان مختلف جوابات میں سے کسی ایک جواب کو چھانٹ کر اس پر تحریک ضبطِ تولید کی بنیاد رکھنا عقل مندی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے انفرادی طور پر کسی مجبوری کے پیش نظر ضبطِ ولادت کے لیے دلیل بنایا جا سکتا ہے۔ ایک عمومی تحریک جاری کر دینے کا جواز اس سے ثابت نہیں ہوتا ہمارے نزدیک موجودہ تحریک اور عزل میں کئی طرح سے فرق کیا جا سکتا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① اپنے مخصوص حالات کی بنا پر عزل کرنا، بیوی خاوند کا ایک انفرادی معاملہ ہے۔ مثلاً: حمل ٹھہرنے سے عورت کی جان کو خطرہ ہو یا اس کی صحت کو غیر معمولی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو ایسے حالات میں اگر کسی ماہر ایماندار ڈاکٹر کے مشورہ سے ضبطِ ولادت کے لیے عزل یا کوئی اور جدید طریقہ اپنا لیا جائے تو جائز ہے اور یہ بیوی خاوند کا اپنا ایک پرائیویٹ معاملہ ہے لیکن ایک قومی پالیسی کے طور پر ان کے حقوق پر شبخون مارنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی اور نہ بطورِ فیشن اسے عمل میں لانے کی گنجائش ہے۔

② عزل پر عمل کرنے سے حمل کا نہ ہونا یقینی نہیں بلکہ متصور ہے جیسا کہ ایک واقعہ سے ظاہر ہے۔ احتیاط کے باوجود حمل ٹھہر گیا تھا لیکن منصوبہ بندی کا جو طریقِ کار ہے اس سے عمل کرنے سے حمل کا نہ ہونا یقینی ہے لہٰذا عزل کو منصوبہ بندی کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرنا یا اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

③ جس عورت سے عزل کیا گیا ہو اگر اس کا خاوند فوت ہو جائے یا اسے طلاق مل جائے تو طلب اولاد کے لیے اس سے شادی کی جا سکتی ہے اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ جبکہ بعض حالات میں منصوبہ بندی پر عمل کرنے والی عورت کے لیے یہ مشکل پیش آ سکتی ہے کہ اگر اس نے ہمیشہ کے لیے اولاد نہ ہونے والی ادویات یا آلات استعمال کئے ہیں تو اس سے اولاد کا طلب گار کیونکر شادی کرے گا۔

اس کے ناجائز اور حرام ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ اگر تحریک منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہوئے وسیع پیمانے پر ایسے طریقوں کو لوگوں میں عام کر دیا جایا ایسے آلات وادویات کو عام لوگوں کی دسترس تک پہنچا دیا جائے جن سے مرد اور عورتیں جنسی بے راہ روی سے باہم لذت اندوز تو ہوتے رہیں مگر استقرار حمل کا اندیشہ نہ ہو جیسا کہ گلی کوچوں میں اس کے سنٹر کھولے جا رہے ہیں تو اس کا انجام کثرت سے بے حیائی اور اخلاقی تباہی کی صورت میں رونما ہوگا جیسا کہ اب وہ ممالک اس کے انجام بد سے چیخ رہے ہیں جن میں اس کا تجربہ کیا گیا تھا۔

لہٰذا ایک خوددار اور باغیرت مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اس بے دینی اور بے حیائی پر مبنی تحریک کو سہارا دے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

سوال ابوبکر صدیق نیازی میانوالی سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں شادی کے موقع پر لڑکی کو جہیز دینے کا عام رواج ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے کچھ لوگ اسے لعنت قرار دیتے ہیں اگر جائز ہے تو کس حد تک اس کی اجازت ہے قرآن وحدیث کی رو سے وضاحت کریں۔

جواب واضح رہے کہ لڑکی کو جہیز دینے کے سلسلہ میں ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ حالانکہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ جس میں انتہا پسندی درست نہیں ہے البتہ یہ ایک فطری بات ہے کہ والد جب اپنی لخت جگر کو شادی کے موقع پر گھر سے رخصت کرتا ہے تو حسب استطاعت کچھ سامان دینا دونوں کے لیے باعث فرحت وانبساط ہے۔ محدثین کرام نے اس مسئلہ کو اپنی کتب حدیث میں بیان فرمایا ہے چنانچہ امام نسائی اپنی سنن میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کرتے ہیں۔

"باب جهاز الرجل ابنته" باپ کی طرف سے اپنی بیٹی کو جہیز دینے کا بیان۔ پھر حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہ کو چادر، مشکیزہ اور ایک تکیہ جس میں روئی کی بجائے اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔ بطور جہیز دیا (کتاب النکاح) اس وقت آپ نے جو سامان دیا اس کے لیے لفظ "جهز" استعمال کیا۔

مسند امام احمد میں مذکور ہے کہ سامان کے ساتھ چکی اور دو مٹکوں کا بھی ذکر ہے۔ [مسند امام احمد: ۱/۱۰۴]

اسی طرح جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو اپنے حبالہ عقد میں لیا تو وہ حبشہ میں تھیں حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے اس کا نکاح پڑھایا پھر چار ہزار درہم اپنی طرف سے بطور حق مہر دیا اس کے ساتھ اپنی گرہ سے جہیز کا بھی بندوبست کیا حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "ثم جهزها من عنده...... وجهازها كله من عند النجاشي، ولم يرسل اليها رسول الله ﷺ بشيء"

[مسند امام احمد: ۴/۴۲۷]

"حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا جہیز حضرت نجاشی کی طرف سے تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق کوئی بندوبست نہیں کیا تھا" مسند امام احمد کی ان احادیث پر احمد بن عبدالرحمٰن البنا الساعاتی بایں الفاظ عنوان قائم کرتے ہیں "باب ما جاء في الجهاز" جہیز دینے کا بیان' احادیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ جہیز کے متعلق میانہ روی اختیار کی جائے، صرف ضروریات کے پیش نظر اس کا اہتمام ہونا

چاہیے۔ مبالغہ آمیزی سے اجتناب کرنا چاہیے، ہمارے اس دور میں تو اس کے متعلق بہت اسراف کیا جاتا ہے جس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں بلکہ لوگ فخر ومباہات کرتے ہیں حتی کہ غریب آدمی اپنا مکان فروخت کرتا ہے بعض دفعہ قرضہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے ایسا کرنا بالکل حرام ہے۔ [الفتح الربانی:۱۶/۱۷۷]

علامہ ساعاتی نے ان قباحتوں کا ذکر کیا ہے جو ہمارے معاشرے میں در آئی ہیں اس سلسلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ جہیز دینے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔

① اسے شادی کا جزو خیال نہ کیا جائے کہ اس کے بغیر شادی نامکمل رہتی ہو۔

② لڑکے والوں کی طرف سے کسی قسم کا مطالبہ نہ ہو خود والد اپنی خوشی سے جو دینا چاہے دے دے۔

③ خود والد بھی حسب استطاعت دے ایسا نہ ہو کہ بچی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لیے زندگی بھر قرض کے نیچے دبا رہے۔

④ جو کچھ دینا چاہے نہایت سادگی سے خاموشی سے دے دیا جائے اسے شہرت، نمود ونمائش اور فخر ومباہات کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

⑤ اس سلسلہ میں عدل وانصاف سے کام لیا جائے باقی بچوں اور بچیوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔

⑥ سامان جہیز کے عوض بچی کو قطعی طور پر وراثت سے محروم نہ کیا جائے۔

⑦ کوئی ناجائز چیز یا جس کا استعمال ناجائز ہو اسے جہیز میں نہ دیا جائے مثلاً ٹی۔وی۔اور وی۔سی آر وغیرہ بالفاظ دیگر فضولیات کے بجائے صرف ضروریات کا خیال رکھا جائے یہ بات جو مشہور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ فروخت کر کے سامان جہیز خریدا گیا تھا اس کے متعلق کوئی حوالہ ہمارے علم میں نہیں ہے اگر ایسا ہوا ہے تو بس کوئی حرج والی بات نہیں کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر کفالت تھے نیز روایات میں تفصیل کے لیے ابوداؤد نسائی اور مسند امام احمد کو دیکھا جا سکتا ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک عورت جس کا خاوند گم ہو جائے وہ کتنی دیر تک اس کا انتظار کرنے کے بعد دوبارہ نکاح کر سکتی ہے؟ قرآن وسنت کی روشنی میں فتویٰ صادر فرمائیں۔ (☆ سائل: عبدالجبار چک نمبر ۴۹۳ گ۔ب تحصیل سمندری ضلع فیصل آباد)

جواب بشرط صحت سوال صورت مسؤلہ میں واضح ہو کہ اگر واقعی شوہر کی گمشدگی کے بعد اس کے زندہ ہونے یا فوت ہو جانے کا پتہ نہ چل سکے، نہ اس کے دوھیال کے کسی مرد وعورت کو اس کی زندگی یا موت کا علم ہو اور اس کے سسرال، دوستوں اور جاننے والوں میں سے کسی کو اس کے متعلق کچھ علم نہ ہو تو اس کی بیوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مشہور قول کے مطابق چار برس اور چار ماہ دس دن تک اس کا انتظار کرے۔ چار برس اس کے انتظار کے لیے ہیں۔ اس مدت کے گزر جانے پر اس کو فوت شدہ قرار دیا جائے گا اور پھر چار ماہ دس دن بیوگی کی عدت منظور ہوگی۔ ازاں بعد وہ بی بی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں شرعاً مختار اور آزاد ہوگی۔ جیسا کہ سبل السلام میں ہے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس عورت کا شوہر گم ہو جائے وہ چار برس تک انتظار کرے۔ جب چار برس پورے ہو جائیں (تو گویا وہ فوت ہو چکا ہے اور اس کی بیوی بیوہ قرار پائی) لہٰذا اب وہ وفات کی عدت چار ماہ دس دن پوری کرے اس کے بعد وہ جہاں چاہے اپنے شرعی ولی سے مشورہ کر کے نکاح کر سکتی ہے۔'' [سبل السلام، ج۳]

''جناب سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جونہی عورت کا شوہر گم ہو جائے اور اس کے

بارے کچھ علم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے کہ جس روز سے اس کی خبر بند ہوئی چار برس عورت اس کا انتظار کرے اور چار برس پورے ہونے کے بعد چار ماہ دس دن اپنی بیوگی کی عدت گزار کر چاہے تو نکاح کر سکتی ہے۔" [مؤطا امام مالک]

صحیح بخاری میں جناب سعید بن مسیب تابعی کا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ وہ عورت گمشدگی کے ایک برس بعد اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی مجاز ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسی مدت کے قائل ہیں۔

"کہ ابن مسیب تابعی نے فرمایا کہ جب کوئی سپاہی میدان دغا میں گم ہو جائے تو اس کی بیوی اس کا ایک برس تک انتظار کرے۔" [صحیح بخاری: الطلاق، باب نمبر ۲۲]

"کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کسی سے ادھار لونڈی خریدی پھر لونڈی کا مالک گم ہو گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا ایک برس انتظار کیا۔" [صحیح بخاری: الطلاق، باب نمبر ۲۲]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے اور موجودہ ظروف و احوال کے مطابق یہ موقف قرین قیاس بھی ہے اب چونکہ ذرائع مواصلات اور میڈیا اتنا وسیع اور مستحکم ہو چکا ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں ایک برس کا انتظار بظاہر کافی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فتویٰ اس دور کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ جس میں آج کی طرح معلومات عامہ اور شعبہ مواصلات یعنی اخبار، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ موجودہ دور کی فراہم کردہ اطلاعی سہولتیں ہرگز میسر نہ تھیں۔ لہٰذا اب اس دور میں ایک سال کا انتظار کافی معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ پرانا فتویٰ تو اپنی جگہ جمہور علمائے اسلام اور مفتیان کرام کے نزدیک بہر حال دائر اور رائج چلا آ رہا ہے۔

سوال ہمارے گھر میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا سب کچھ ہے، اس کے باوجود میرے خاوند گھریلو اخراجات کے متعلق بہت تنگ کرتے ہیں، ایسے حالات میں مجھے شرعاً اجازت ہے کہ میں گھریلو اخراجات کے لیے اپنے خاوند کی جیب سے اس کی اجازت کے بغیر پیسے نکال لوں (ایک خاتون...... ملتان)

جواب نکاح کے بعد بیوی کے جملہ اخراجات کی ذمہ داری خاوند پر عائد ہوتی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: "خوشحال کو چاہیے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اخراجات پورے کرے اور تنگدست اللہ کی دی ہوئی حیثیت کے مطابق خرچہ دے۔" [۶۵/الطلاق:۷]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی بات کی تلقین فرمائی ہے حدیث میں ہے: "بیوی کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے اخراجات تمہارے ذمے ہیں۔" [صحیح مسلم: الحج، ۲۹۵۰]

ان اخراجات میں کھانا، پینا، علاج رہائش اور لباس وغیرہ شامل ہے، خاوند کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق ان اخراجات کو پورا کرے اگر وہ ان اخراجات کی ادائیگی سے پہلو تہی کرتا ہے یا بخل سے کام لے کر پورے ادا نہیں کرتا تو بیوی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی بھی طریقہ سے خاوند کی آمدن سے انہیں پورا کر سکتی ہے جیسا کہ حضرت ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خاوند کے متعلق شکایت کی کہ میرا خاوند ابوسفیان گھریلو اخراجات پورے طور پر ادا نہیں کرتا تو کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اس کی آمدن سے اتنی رقم اس کی اجازت کے بغیر لے لوں جس سے گھر کا نظام چل سکے اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہاں! اس کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر اتنا لے سکتی ہو، جس سے معروف طریقہ کے مطابق تیری اور تیری اولاد کی

گزراوقات ہوسکے یعنی گھر کا نظام چل سکے۔'' [صحیح بخاری: النفقات ۵۳۶۴]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے:

''اگر خاوند اخراجات پورے نہ کرے تو بیوی کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اس قدر لے لے جس سے معروف طریقہ کے مطابق اہل خانہ کا گزارہ ہوسکے۔'' مندرجہ بالا احادیث کے پیش نظر اگر خاوند گھریلو اخراجات کی ادائیگی میں کنجوسی کرتا ہے تو بیوی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اتنی رقم لے سکتی ہے جس سے گھر کا نظام چل سکے لیکن یہ اجازت صرف ضروریات کے لیے ہے فضولیات کے نہیں نیز اگر ایسا کرنے سے بیوی خاوند کے درمیان اختلاف اور تعلقات کے کشیدہ ہونے کا اندیشہ ہے تو اس طریقہ سے اخراجات پورے نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ بیوی خاوند کے تعلقات کی استواری مقدم ہے، اس بات کا فیصلہ بیوی خود کرسکتی ہے کہ ایسا کرنے سے تعلقات تو خراب نہیں ہوں گے، بہرحال ایسے حالات میں ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بیوی کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اس قدر رقم لینے کی شرعاً اجازت ہے جس سے معروف طریقہ کے مطابق گزراوقات ہوسکے۔

سوال افتخار نامی ایک شخص نے پہلی بیوی کی موجودگی میں عقد ثانی کا ارادہ کیا، دوسری بننے والی بیوی نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی شرط عائد کی چنانچہ موصوف نے اسے مطمئن کرنے کے لیے پہلی بیوی کے نام طلاق تحریر کرکے دوسری ہونے والی بیوی کے حوالے کردی کہ تم اس تحریر کو خود ہی ارسال کردو، اس نے اس تحریر کو اپنے پاس رکھا، اس طرح شادی ہوگئی، دوسری طرف اس نے پہلی بیوی سے کہہ دیا کہ اگر تجھے میری طرف سے تحریر ملے تو اسے وصول نہ کرنا یا اسے پھاڑ دینا، اس نکاح جدید کے دو سال تین ماہ بعد پہلی بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا جو اس کے ساتھ رہائش رکھے ہوئے تھی، جب دوسری بیوی کو اس کا علم ہوا تو اس نے طلاق نامہ مع اپنا نکاح نامہ پہلی بیوی کو ارسال کردیا، جب اس کے والدین کو پتہ چلا تو وہ اپنی لڑکی کو افتخار کے گھر سے لے گئے، اب اس کا موقف ہے کہ میں نے طلاق نامہ خوشی سے نہیں لکھا تھا بلکہ مجبوری اور دوسری سے نکاح کے لالچ میں تحریر کیا تھا، دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ طلاق واقع ہوچکی ہے؟ افتخار کا اس دوران پہلی بیوی کے پاس رہنا درست تھا؟ کیا پہلی بیوی سے رجوع ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کیوں کہ اس نے تینوں طلاق بیک وقت تحریر کردی تھیں۔ (حافظ عطاء الرحمٰن، مرید کے، خریداری نمبر ۵۶۵۵)

جواب صورت مسئولہ میں نکاح ثانی کے وقت دین سے ناواقفیت کی بنا پر کئی ایک غیر شرعی کام ہوئے ہیں۔ پہلا تو یہ کسی عورت کا پہلی بیوی کو طلاق دینے کا مطالبہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق واضح طور پر منع کیا ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے: ''کہ کوئی عورت نکاح کے وقت اپنی بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے تاکہ اس کے برتن کو انڈیل کر رکھ دے۔''

[صحیح بخاری: الشروط ۲۷۲۳]

دوسری روایت میں ہے کہ اسے تو وہی کچھ ملے گا جو اس کا مقدر ہے۔ (اس لیے مطالبہ طلاق کے بغیر ہی نکاح کرے)

[صحیح بخاری: النکاح ۵۱۵۲]

دوسرا غیر شرعی کام یہ ہے کہ خاوند نے اداکاری کے طور پر طلاق دی ہے حالانکہ طلاق کا معاملہ انتہائی نزاکت کا حامل ہے وہ

یوں کہ اگر کوئی بطور مذاق اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو وہ شرعاً نافذ ہو جاتی ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ تین کام ایسے ہیں اگر کوئی سنجیدگی سے کرے یا ازراہ مذاق انہیں سرانجام دے وہ بہر صورت منعقد ہو جاتے ہیں وہ نکاح، طلاق اور رجوع ہے۔'' [ابوداؤد: الطلاق ۲۱۹۴]

بناء بریں بیوی کی طلاق صحیح ہے اگرچہ اس نے دوسری سے نکاح کے لالچ میں تحریر کی ہے۔ واضح رہے کہ طلاق کے وقت عورت کا موجود ہونا یا اسے مخاطب کرنا ضروری نہیں بلکہ یہ خالص خاوند کا حق ہے وہ جب بھی اپنے اختیارات کو استعمال کرے گا، طلاق واقع ہو جائے گی، خواہ عورت طلاق نامہ کو وصول نہ کرے یا وصول کر کے اسے پھاڑ دے، ایسا کرنے سے طلاق پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اسی طرح نکاح ثانی بھی صحیح ہے کیوں کہ اس کے لیے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری نہیں ہے، پھر دوسری بیوی کی نکاح کے لیے شرط ناجائز تھی، اس کا پورا کرنا بھی ضروری نہیں تھا تاہم خاوند نے اسے پورا کیا ہے اور طلاق نامہ لکھ کر اس کے حوالے کر دیا، اب رہا رجوع کا مسئلہ تو یہ دو طرح سے ہو سکتا ہے خاوند اپنی زبان سے رجوع کرے یا دوسرا یہ کہ عملی طور پر وظیفہ زوجیت ادا کرے۔ سوال میں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ اس نے طلاق کے کتنے عرصے بعد وظیفہ زوجیت ادا کیا ہے جس کے نتیجے میں بچہ پیدا ہوا، اگر دوران عدت عملی رجوع ہوا ہے تو ایسا کرنا اس کا حق تھا، اگر عدت گزرنے کے بعد رجوع کیا ہے تو یہ رجوع صحیح نہیں ہے کیوں کہ عدت گزرنے کے بعد نکاح ختم ہو جاتا ہے پھر بیوی اس کے لیے اجنبی عورت بن جاتی ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک ایک ہی مجلس میں تین طلاق کہنا یا تحریر کرنا اس سے ایک رجعی طلاق ہوتی ہے۔ دوران عدت تجدید نکاح کے بغیر رجوع ہو سکتا ہے جبکہ عدت کے بعد تجدید نکاح سے رجوع ممکن ہے بشرطیکہ یہ پہلا یا دوسرا واقعہ ہو۔ [واللہ اعلم]

سوال کھاریاں سے محمد شریف لکھتے ہیں کہ منگنی ہونے کے بعد اپنی ہونے والی بیوی کے ساتھ تصویر بنانا شرعاً کیسا ہے، نیز اس کے ساتھ علیحدہ ہو کر ایک کمرے میں بیٹھنا، باہم گفتگو کرنا اور ایک دوسرے کو خط لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ کیا ایسا کرنے سے منگنی پر اثر پڑ سکتا ہے؟۔

جواب منگنی کے متعلق ہمارے ہاں بہت افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے، بعض مذہبی خاندان تو ''حیاداری'' سے کام لیتے ہوئے اپنی منگیتر کو دیکھنے کے مسئلہ کو اپنے لیے عزت وغیرت کا مسئلہ بنا لیتے ہیں، جبکہ بعض مغرب زدہ حضرات شریعت اسلامیہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے مستقبل میں بننے والے جوڑے کو نکاح سے پہلے ہی آزادانہ گھومنے پھرنے کی کھلی چھٹی دے دیتے ہیں اور ایسا کرنے میں کچھ شرم وحیا محسوس نہیں کرتے، جیسا کہ سوال میں ان امور کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ دین اسلام میں منگنی کے لیے صرف ایک دوسرے کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت ہے، جس کی لیے کسی قسم کا اہتمام کرنا ضروری نہیں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''کہ جب تم میں سے کوئی کسی عورت سے منگنی کرے تو اسے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' [مسند امام احمد: ۵/۴۲۴]

اس کی وجہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں بعض ظاہری پہلو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو آیندہ کسی وقت باہمی عداوت وناچاقی کا باعث بن سکتے ہیں، اس لیے شریعت نے پیش بندی کے طور پر ایسی باتوں کا کسی حد تک تدارک کیا ہے، تاکہ آیندہ زندگی باہمی خوش اسلوبی سے بسر ہو، حدیث میں ہے: ''کہ ایسا کرنے سے تمہارے تعلقات مضبوط رہیں گے اور آپس میں محبت ویگانگت رہے گی۔''

[دارمی: ۲/۱۳۴]

حضرت عمر، حضرت جابر، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم جیسے اکابر صحابہ نے اس ہدایت نبوی ﷺ پر عمل کیا ایسا کرنے سے آیندہ زندگی کے پرسکون گزرنے کی راہ ہموار ہوئی۔ لیکن اپنی منگیتر کے ساتھ تصویر بنانا اور علیحدہ بیٹھ کر باہمی گفتگو کرنا نہ صرف ناجائز وحرام ہے، بلکہ ایسا کرنے سے آیندہ برے نتائج کا بھی اندیشہ ہے، اللہ تعالیٰ ایسا کرنے سے اپنی رحمت وبرکت کو ضرور اٹھا لیتے ہیں، جو نحوست وبدبختی کی علامت ہے حدیث میں تصویر بنانے والے کو ملعون کہا گیا ہے اور اسے بدترین سزا کی دھمکی دی گئی ہے۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''کہ کوئی آدمی کسی ایسی عورت کے ساتھ خلوت نہ کرے جو اس کے لیے حلال نہیں ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے تیسرا شیطان ان میں گھس آتا ہے۔'' [ابوداؤد: کتاب النکاح]

البتہ محرم انسان اس حکم امتناعی سے مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا اپنی منگیتر کو دیکھنے کے علاوہ سوال میں ذکر کردہ دوسرے تمام کبیرہ گناہ ہیں، جن سے اجتناب ضروری ہے، ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ایسے معاملات کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔ [واللہ اعلم]




جمعہ و عیدین

جمعہ وعیدین

سوال بہاول پور سے محمد حیات لکھتے ہیں کہ ہماری کالونی دوصد نفوس پر مشتمل ہے اور شہر کی حدود سے باہر ہے، ہمارے ہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جہاں مستقل امام تو نہیں البتہ پانچوں نمازیں باجماعت ادا کی جاتی ہیں۔ کیا ہم پر جمعہ فرض ہے اگر ہے تو کیا ہم اس کالونی میں اس کا اہتمام کر سکتے ہیں؟

جواب واضح رہے کہ نماز جمعہ فرض ہے اور اس کے لیے صرف جماعت کا ہونا ضروری ہے اور جماعت کا اطلاق کم از کم دو افراد پر کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ دو اور اس سے زائد افراد جماعت ہیں۔'' [ابن ماجہ: حدیث نمبر ۹۷۲]

جمعہ کی فرضیت کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کی صورت میں فرض ہے، صرف عورت، بچہ اور مریض اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ [ابوداؤد: الجمعۃ ۱۰۶۷]

جمعہ کی ادائیگی کے لیے کسی خاص جگہ یا مقام کی شرط بھی غیر ضروری ہے، فرمان باری تعالیٰ ہے: ''کہ ایمان والو! جب جمعہ کے دن اذان دی جائے تو تم ذکر الٰہی کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت ترک کر دو۔'' [۶۲/الجمعۃ: ۹]

اللہ کا یہ حکم عام ہے جو ہر مسلمان کے لیے ہر جگہ پر جمعہ کی ادائیگی کو واجب قرار دیتا ہے، اس کے لیے افراد کی کوئی خاص تعداد کا ہونا ضروری نہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ نماز جمعہ ادا کر رہے تھے کہ شام سے ایک قافلہ غلہ لے کر آ گیا اور اس نے آتے ہی غلے کے متعلق اعلان کر دیا، حاضرین اعلان سن کر مسجد سے باہر چلے گئے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ صرف بارہ اشخاص باقی رہ گئے تو آپ ﷺ نے باقی ماندہ افراد کو نماز پڑھائی۔ [صحیح بخاری: الجمعۃ ۹۳۶]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''کہ جب لوگ جمعہ چھوڑ کر چلے جائیں تو امام باقی ماندہ افراد کو جمعہ پڑھا دے تو ان کی نماز صحیح ہے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جمعہ کی ادائیگی کے لیے افراد کے متعلق کسی خاص تعداد کی شرط خود ساختہ ہے، مسجد نبوی ﷺ میں اقامتِ جمعہ کے بعد سب سے پہلے جس مقام پر جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کیا گیا تھا وہ بحرین کے ایک گاؤں ''جواثی'' میں ہوا، جہاں قبیلہ عبدالقیس کی مسجد تھی۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۸۹۱]

اس حدیث پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے کہ ''جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام شہروں اور بستیوں میں کیا جائے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل بحرین کو لکھا تھا کہ تم جہاں کہیں ہو جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کرو۔ [مصنف ابن ابی شیبہ]

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نے پہلا جمعہ بنو بیاضہ کے محلے ہزم النبیت جسے نقیع خضمات کہا جاتا تھا وہاں چالیس نفوس پر مشتمل آبادی میں جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کیا تھا۔ [ابوداؤد: الجمعۃ ۱۰۶۹]

حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے دور میں ساحلِ سمندر پر رہنے والے لوگ جمعہ کا اہتمام کرتے تھے، ان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خاصی تعداد ہوتی تھی۔ ان روایات و آثار کے پیش نظر اہل کالونی کو چاہیے کہ وہ جمعہ کی ادائیگی کا کالونی میں ہی بندوبست کریں، اس سلسلہ میں جن شرائط کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ سب خود ساختہ اور ایجاد بندہ ہیں۔

سوال ملتان سنٹرل جیل سے محمد منشاء لکھتے ہیں کہ جیل کے اندر نماز جمعہ ادا ہو سکتی ہے یا نہیں، نیز کیا نماز کے وقت اذان دینا ضروری ہے یا کسی دوسری اذان کی آواز سن کر جماعت کرائی جا سکتی ہے ہمارے ہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اگر جیل سے باہر کی اذان سنی جائے تو جیل کے اندر اذان کے بغیر ہی جماعت کرانا درست ہے۔

جواب واضح رہے کہ نماز جمعہ فرض عین ہے، ہر عاقل، بالغ اور مقیم کے لیے اس کا ادا کرنا ضروری ہے، رسول اللہ ﷺ نے دانستہ جمعہ ترک کرنے کی سخت وعید سنائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جو لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور جمعہ کی ادائیگی سے دانستہ سستی کرتے ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔'' [صحیح مسلم: باب الجمعۃ]

ان احادیث کی روشنی میں جیل میں رہنے والے قیدیوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ جیل کے اندر جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کریں تا کہ وہ اس اہم فریضہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکیں، ویسے ملتان جیل میں حکومت کی طرف سے نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے باقاعدہ انتظام ہوتا ہے۔

مسجد میں ابتداءً نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے اذان ضروری ہے، البتہ کسی مجبوری کے پیش نظر اگر اس مسجد میں دوبارہ جماعت کی ضرورت ہو تو اذان دینا ضروری نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تین آدمی جمع ہوں اور وہ اذان دے کر نماز باجماعت کا اہتمام نہ کریں تو ان پر شیطان کا غلبہ ہوتا ہے۔'' [مسند امام احمد: ۵/۱۹۶]

اس کے علاوہ بعض روایات میں اذان کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا حکم بھی منقول ہے۔ [جامع ترمذی]

اس لیے اگر جیل میں سرکاری طور پر نماز باجماعت ادا کرنے کا اہتمام نہیں ہے تو قیدی حضرات کو چاہیے کہ وہ از خود اس کا اہتمام کریں اور اذان دے کر باجماعت نماز ادا کریں، اگر کبھی ہنگامی طور پر مسجد میں نماز باجماعت پڑھنے کا موقع نہ ملے تو باہر کی اذان پر اکتفا کرتے ہوئے نماز کی جماعت کرائی جا سکتی ہے، واضح رہے کہ اگر جیل میں نماز باجماعت کا اہتمام ہے تو اس کے مقابلہ میں اپنی طرف سے جماعت کا اہتمام صحیح نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ضلع بھکر سے محمد ایوب لکھتے ہیں کہ ہماری مسجد میں سنت کے مطابق جمعہ کی صرف ایک اذان دی جاتی تھی، مقامی خطیب نے بعض احناف کے اصرار پر دو اذانوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، اب کچھ نمازی اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور کچھ اس کی حمایت پر کمربستہ ہیں۔ تا کہ جماعت انتشار کا شکار نہ ہو جائے مخالفت کرنے والوں نے دوسروں سے بول چال بند کر دی ہے، بعض افراد نے مقامی خطیب کے پیچھے نماز پڑھنا بھی ترک کر دی ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ:

① نمازیوں کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر سنت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟۔

② کیا بول چال بند کر دینا اللہ کی ناراضگی تصور ہوگی۔

③ کیا ایسے حالات میں مقامی خطیب کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے؟۔

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ اصل اذان تو وہی ہے جو امام کے منبر پر بیٹھتے وقت دی جاتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: رسول اللہ ﷺ کے عہد رسالت اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں جمعہ کے دن اس وقت اذان

دی جاتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا۔ [صحیح بخاری: کتاب الجمعہ]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن ایک اذان دینے کا یہ طرزِ عمل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت تک جاری رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مدینہ کی آبادی بڑھ گئی تھی جس کی وجہ سے دور دور تک مکانات پھیل گئے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی سہولت کے پیش نظر زوراء نامی پہاڑی پر ایک اور اذان دینے کا فیصلہ فرمایا جسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت نے قبول کرلیا البتہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس اذان کو خلافِ سنت کہا۔ [مصنف ابن ابی شیبہ: ۳/۱۴۰]

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دارالحکومت کوفہ میں اسے ختم کر کے اذان نبوی کو ہی برقرار رکھا۔ [تفسیر قرطبی: ۱۸/۱۰۰]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق نویں صدی ہجری کے نصف تک مغرب کے علاقہ میں جمعہ کے دن صرف ایک اذان دینے کا اہتمام تھا، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کی اذان کے متعلق عہد رسالت ہی کے طرز عمل کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ [کتاب الام: ۱/۱۹۵]

تفصیل بالا کے پیش نظر سنت نبوی کے مطابق جہاں ایک اذان دینے کا عمل ہے وہاں اسے برقرار رہنا چاہیے کسی خاص مکتب فکر کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے اس طرزِ عمل کو بدلنا قطعاً مستحسن نہیں ہے۔ البتہ جہاں دو اذانیں ہوتی ہیں وہاں دیکھا جائے اگر کسی قسم کے فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو تو وہاں ایک اذان پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اگر حالات ناساز گار ہوں تو دونوں اذانوں کو برقرار رکھنے کی گنجائش موجود ہے۔ ایسا کرنا گناہ نہیں کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں خلیفہ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس عمل کو جاری فرمایا تھا اور ان کی اکثریت نے اسے قبول کرلیا تھا۔ اس بنا پر ایسے معاملات کو باہمی اختلاف وجدال کا ذریعہ نہ بنایا جائے اب سوالات کے ترتیب وار جواب ملاحظہ فرمائیں:

① نمازیوں کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر سنت نبوی کو نظرانداز کر کے دو اذانوں کو جاری کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ نمازیوں کے دلوں میں سنت کی افادیت واہمیت کو اجاگر کیا جائے۔

② ایسے معاملات کو سامنے رکھ کر نمازیوں کا آپس میں بول چال بند کر لینا درست نہیں ہے بلکہ افہام وتفہیم کے ذریعے محبت ویگانگت کی فضا پیدا کی جائے۔ اس قسم کی ناراضگی اللہ کے لیے ناراضگی تصور نہیں ہوگی۔

③ مقامی خطیب نے غلطی کا ارتکاب ضرور کیا ہے لیکن اسے توہین سنت کا نام دے کر اس کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دینا دانش مندی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو بدگمانی سے محفوظ رکھے اور انہیں اتفاق ومحبت سے رہنے کی توفیق دے۔ (آمین)

سوال پسرور سے شفیق الرحمٰن اسلم خریداری نمبر ۱۸۸ لکھتے ہیں:

☆ اگر منبر موجود ہو تو کیا اس کے بغیر خطبہ دیا جا سکتا ہے، ہمارے ہاں سالہا سال سے یہ طریقہ ہے کہ منبر کی موجودگی میں خطبہ نیچے کھڑے ہو کر دیا جاتا ہے صرف دوسرے خطبہ کے لیے چند منٹ منبر پر بیٹھا جاتا ہے۔

جواب مسجد میں اگر منبر موجود ہے تو خطبہ جمعۃ المبارک اس پر کھڑے ہو کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی عمل مسنون ہے۔ اگر مسجد میں اس کا اہتمام نہیں تو سنت کے احیا کے پیش نظر اس کا انتظام کرنا چاہیے لیکن صورت مسئولہ میں یہ حرکت انتہائی

معیوب ہے کہ منبر کی موجودگی میں خطبہ کے لیے اسے استعمال نہ کیا جائے۔البتہ دوسرے خطبہ کے آغاز میں چند منٹ تک منبر پر بیٹھا جائے۔اس طرح خطبہ ہوتو جاتا ہے لیکن یہ انداز محض تکلف اور غیر مسنون ہے۔

سوال چکوال سے اسامہ ہارون لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور سلف صالحین سے خطبہ جمعہ صرف عربی زبان میں دینا ثابت ہے،اس عمل کے باوجود ہم اپنی زبان میں خطبہ جمعہ دیتے ہیں جبکہ نماز عربی میں ادا کی جاتی ہے خطبہ جمعہ کے متعلق یہ تبدیلی کس دلیل سے ثابت ہے؟۔

جواب حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خطبہ جمعہ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ آپ جمعہ کے دو خطبے ارشاد فرماتے۔دونوں کے درمیان بیٹھتے،قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے۔ [صحیح مسلم:حدیث نمبر ۱۹۹۵]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں تلاوت قرآن کے ساتھ ساتھ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا،امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث میں امام شافعی کے موقف کی تائید ہے کہ خطبہ جمعہ میں تلاوت قرآن اور لوگوں کو وعظ وارشاد بنیادی شرط ہے۔ [شرح نووی:۱۵۰،طبع ہند]

مزید لکھتے ہیں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خطبہ جمعہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا رسول اللہ ﷺ پر درود وسلام اور لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا ضروری ہے۔ [حوالہ مذکورہ]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ کے خطبہ جمعہ کی کیفیت بایں الفاظ بیان کرتے ہیں کہ گویا آپ کسی لشکر کو آنے والے خطرات سے خبردار کررہے ہیں۔ [صحیح مسلم:کتاب الجمعہ]

ان ہر دو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ لوگوں کو احکام شریعت سے آگاہ کرنے اور انہیں وعظ و نصیحت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کے مخاطبین اہل زبان عرب لوگ تھے،اس لیے رسول اللہ ﷺ انہیں عربی میں وعظ و نصیحت فرماتے تھے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:''کہ ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کوئی رسول بھیجا تو اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔'' [۱۴/ابراہیم:۴]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تلقین و تعلیم اور تفہیم و تبیین کی اہمیت زیادہ ہے،جس کے لیے ضروری تھا کہ قوم کو اسی زبان میں پیغام پہنچایا جائے جسے وہ سمجھتی ہے،اس لیے ہم اہل زبان اپنی زبان میں خطبہ دیتے ہیں تاکہ خطبہ کا مقصد فوت نہ ہو اور خطبہ کے لیے آنے والے سامعین احکام و مسائل سے آگاہ ہوں البتہ نماز کے کلمات مخصوص ہیں اور اس میں کسی دوسرے کو وعظ و نصیحت مقصود نہیں ہوتی اس بنا پر تمام دنیا میں نماز ایک ہی زبان میں یعنی عربی میں ادا کی جاتی ہے،جبکہ خطبہ میں مختلف موضوعات ہوتے ہیں اس سے مراد لوگوں کو احکام شریعت سے آگاہ کرنا ہوتا ہے۔اس لیے سامعین کی زبان میں خطبہ دیا جاسکتا ہے ہمارے خطبا حضرات کو چاہیے کہ وہ دوسرے خطبہ میں بھی لوگوں کو وعظ وارشاد کیا کریں اسے خالص عربی میں ادا کرنے کا چنداں فائدہ نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال رینالہ خورد سے محمد یوسف دریافت کرتے ہیں کہ درس قرآن یا خطبہ جمعہ کے دوران اگر آیت سجدہ آجائے تو کیا اسی

وقت سجدہ کرنا ضروری ہے یا بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے؟۔

جواب اس سوال کے جواب سے پہلے سجدہ تلاوت کی حیثیت متعین کرنا ضروری ہے، ہمارے نزدیک سجدہ تلاوت واجب نہیں بلکہ سنت مؤکدہ ہے امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم نے اسی موقف کو اختیار کیا ہے۔ البتہ احناف کے ہاں اس کی ادائیگی ضروری ہے، دلائل کے لحاظ سے ائمہ ثلاثہ کا موقف زیادہ قوی ہے کیوں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سورۃ ''والنجم'' کو تلاوت کیا تو آپ نے سجدہ نہ کیا۔ [صحیح بخاری]

مولانا عبید اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لیے ایسا کیا اگر سجدہ تلاوت واجب ہوتا تو کم از کم آپ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے''۔ [مرعاۃ المفاتیح:۲/۴۵]

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن منبر پر سورۃ النحل تلاوت کی ''آیت سجدہ تلاوت کی تو منبر سے اترے اور سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ہمراہ سجدہ کیا آئندہ جمعہ پھر وہی سورت تلاوت کی، آیت سجدہ پر آپ نے سجدہ نہ کیا بلکہ فرمایا: ''کہ جو سجدہ کرتا ہے وہ بھی درست ہے اور جس نے سجدہ نہیں کیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔'' [بخاری: کتاب سجود القرآن]

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی ایسا منقول ہے۔ [مصنف عبدالرزاق]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی دوران خطبہ یا اثنائے درس سجدہ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے، بہر حال اس میں توسع ہے، ایک مجلس میں بار بار پڑھنے سے صرف ایک دفعہ سجدہ تلاوت کر دینا کافی ہے، ہمارے ہاں شعبہ تحفیظ القرآن میں بچے قرآن یاد کرتے ہیں اور سجدہ تلاوت پر مشتمل آیات بار بار پڑھتے ہیں، ان کے لیے سجدہ تلاوت ضروری نہیں ہے اگر وہ کرنا چاہیں تو ایک دفعہ سجدہ کر لینا ہی کافی ہے۔

سوال نماز جمعہ جب انفرادی طور پر ادا کیا جائے تو اس کے لیے دو رکعت پڑھی جائیں یا چار، نیز خواتین کے لیے نماز جمعہ کی کیا حیثیت ہے اور جمعہ کم از کم کتنے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔

جواب جمعہ انفرادی طور پر نہیں ادا ہوتا اس کے لیے جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ حدیث میں ہے: ''کہ چار کے علاوہ نماز جمعہ با جماعت ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے صرف عورت، نابالغ، غلام اور بیمار اس حکم سے خارج ہیں۔'' [سنن ابی داؤد: کتاب الجمعۃ]

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ [نیل الاوطار:۳/۲۸۵]

اگر کسی کا جمعہ رہ جائے تو وہ انفرادی طور پر چار رکعت ظہر ادا کرے گا۔ خواتین کے لیے جمعہ فرض نہیں اگر وہ گھر میں جماعت کا اہتمام کر لیں تو با جماعت دو رکعت پڑھنے کی گنجائش ہے، جمعہ چونکہ با جماعت ادا کیا جاتا ہے اس لیے کم از کم دو کا ہونا ضروری ہے۔ خواتین، جو مسجد میں جا کر نماز جمعہ ادا کرنا چاہتی ہوں وہ ایسا کر سکتی ہیں۔ صحابیات رضی اللہ عنہن کا نماز وغیرہ کے لیے مسجد میں جانا ثابت ہے۔

سوال کراچی سے رب نواز سوال کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن دورانِ خطبہ جھولی اٹھا کر مسجد کی ضروریات کے لیے چندہ جمع کرنا شرعاً کیسا ہے؟۔

جواب خطبہ جمعہ بھی نماز کی طرح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دوران خطبہ اگر کسی نے شور کرنے والے کو خاموش

رہنے کا کہا تو خاموشی کی تلقین کرنے والے نے خود ایک لغو اور بے ہودہ فعل کا ارتکاب کیا ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب خاموش کرانے والے کے متعلق اس قدر شدید وعید ہے تو مصروف گفتگو رہنے والا کس قدر سنگین جرم کا مرتکب ہو رہا ہے، اس بنا پر دوران خطبہ سامعین اور حاضرین کو صرف خطبہ کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔ چندہ وغیرہ اکٹھا کرنا سامعین کی توجہ کو منتشر کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اس لیے یہ حرکت بھی دوران خطبہ نہیں کرنا چاہیے، البتہ اگر کوئی ہنگامی ضرورت آ پڑی ہے تو امام کو چاہیے کہ وہ خود اس کا اعلان کرے اور حاضرین کو ترغیب دے، لیکن اس کے لیے بھی حاضرین کو نام بنام آواز دینے پھر سامعین کی گردنیں پھلانگ کر فوراً چندہ دینے کی ضرورت نہیں بلکہ نماز سے فراغت کے بعد اطمینان اور سکون سے حسب استطاعت اس کار خیر میں حصہ ڈالا جا سکتا ہے، صورت مسئولہ میں جس طرح سوال اٹھایا گیا ہے اگر واقعی چندہ جمع کرنے کی یہی صورت ہے تو ایسا کرنا مسجد کے تقدس اور احترام ووقار کے بہت منافی ہے کہ انسان جھولی پھیلا کر لوگوں کے سامنے آئے اور مسجد کے لیے چندہ جمع کرے، اہل مسجد کو چاہیے کہ مسجد کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوئی اور باعزت طریقہ اپنائیں، یاد رہے کہ امام کے منبر پر کھڑا ہونے سے لے کر نماز کے لیے کھڑا ہونے تک سب خطبہ ہی شمار ہوتا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ بعض مقامات پر دونوں خطبوں کے درمیان وقفہ لمبا کر کے یہ ''فریضہ'' سرانجام دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال دوبئی سے محمد زبیر سلفی سوال کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیماری یا کسی اور وجہ سے جمعہ کی نماز باجماعت ادا نہ کر سکے تو اسے کونسی نماز پڑھنا ہوگی جمعہ کی دو رکعت یا ظہر کی چار رکعات۔

جواب اس سوال کا جواب پہلے بھی ''اہل حدیث'' میں لکھا جا چکا ہے اب قدرے تفصیل سے اس کا جواب پیش خدمت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ کے متعلق کچھ اختلاف ہے کہ جمعہ فوت ہو جانے پر دو رکعت پڑھنا ہیں یا چار رکعات ادا کرنا ہیں۔ اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ جمعہ بذات خود اصل ہے یا ظہر اصل اور جمعہ اس کا بدل ہے۔ جو حضرات جمعہ ہی کو اصل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جمعہ فوت ہو جانے پر دو رکعت ہی ادا کرنا ہوگی اور جن حضرات کے نزدیک نماز ظہر اصل ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے، ان کے نزدیک اگر جمعہ فوت ہو جائے تو ظہر کی چار رکعات ادا کرنا ہوں گی۔ کیوں کہ اگر بدل نہیں مل سکا تو اصل کو عمل میں لانا چاہیے۔ ہمارا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ نماز ظہر اصل ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے۔ اگر کوئی جمعہ کی نماز نہ پڑھ سکے تو اسے نماز ظہر ادا کرنا چاہیے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جمعہ کے دن دوران سفر نماز ظہر ہی ادا کرتے تھے۔ لیکن سفر کی وجہ سے ظہر کی چار رکعت ادا کرنیکی بجائے دو رکعت پڑھتے، اگر جمعہ اصل ہوتا تو دوران سفر اس کا ضرور اہتمام کرتے ہمارے اس موقف کی تائید ایک واقعہ سے بھی ہوتی ہے جو جمعہ فوت ہونے پر دو رکعت ادا کرنے والوں کی طرف سے بطور دلیل بھی پیش کیا جاتا ہے۔ واقعہ کی تفصیل یوں ہے: حضرت موسیٰ بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ جو بصرہ کے رہنے والے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کرتے ہیں کہ اگر وادی بطحا میں مجھ سے جمعہ فوت ہو جائے تو میں کتنی رکعت ادا کروں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دو رکعت ادا کرو، ایسا کرنا ابو القاسم ﷺ کی سنت ہے۔ [ذکر اخبار اصفہان:۲/۲۰۰]

مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوران سفر جمعہ کے دن بھی ظہر کی دو رکعت ادا کرتے تھے اس بنا پر جمعہ فوت ہو جانے پر سفر میں دو رکعت ادا کرنا ہی سنت ہے۔

☆ عورتوں پر نماز جمعہ فرض نہیں ہے اگر وہ جمعہ ادا کرنا چاہیں تو اجازت ہے۔ اگر جمعہ نہ ادا کریں تو گھر میں نماز ظہر ادا کرنا ہوگی اگر جمعہ اصل ہوتا تو انہیں گھر میں ہی دو رکعت ادا کرنے کا حکم ہوتا لیکن ایسا نہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عورتوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: ''کہ اگر تم امام کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرو تو تمہارے لیے اس کے ساتھ (دو رکعت) نماز ادا کرنا ہی کافی ہے اور اگر تم نماز پڑھنا چاہو تو چار رکعت ادا کرنا ہوگی۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۱۰]

ان روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن اصل نماز ظہر ہے اور جمعہ اس کا بدل ہے اگر بدل رہ جائے تو اصل ادا کرنا چاہیے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کے متعلق صریح نصوص بھی منقول ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہیں۔

① حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ جو آدمی جمعہ پا لے اس کے لیے دو رکعت ہیں اور جو اس دن جمعہ سے رہ جائے اسے چاہیے کہ چار رکعت ادا کرلے۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۲۹]

② حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''کہ جب تجھے امام کے ساتھ جمعہ کی ایک رکعت مل جائے تو دوسری رکعت اس کے ساتھ ملا لی جائے اور اگر تو بحالت تشہد پڑھے تو چار رکعات ادا کرنا ہوں گی۔'' [بیہقی:۳/۲۰۴]

③ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی ذویب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ میں جمعہ کے دن حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے ہمراہ باہر نکلا تو آپ نے جمعہ کے وقت چار رکعت ادا کیں۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۱۰۵]

ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی کا جمعہ رہ جائے تو جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں ہے مثلاً: مسافر، عورت وغیرہ تو انہیں نماز ظہر ہی ادا کرنا ہوگی۔ چنانچہ علامہ صنعانی لکھتے ہیں: ''بلکہ ظہر اصل ہے جو شب معراج میں فرض ہوئی تھی اور جمعہ کی فرضیت اس کے بعد ہوئی ہے اگر جمعہ فوت ہو جائے تو نماز ظہر کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس پر اجماع ہے کیوں کہ جمعہ نماز ظہر کا بدل ہے۔''
[سبل السلام:۲/۵۳]

بعض دیگر روایات بھی اس موقف کے لیے بطور دلیل پیش کی جا سکتی ہیں لیکن خوف طوالت کے پیش نظر ہم اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

سوال علی پور سے محمد صادق سوال کرتے ہیں کہ بعض حضرات عید کی رات خصوصی عبادت کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کی فضیلت میں ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس رات عبادت کرنے سے قیامت کے دن دل مردہ نہیں ہوں گے۔ اس کے متعلق وضاحت درکار ہے۔

جواب عیدین کی رات خصوصی عبادت کا اہتمام صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ ویسے اگر کوئی پابندی سے تہجد گزار ہے تو حسب عادت اس رات نوافل ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مکمل ترجمہ یہ ہے:

''جو شخص عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی رات عبادت کرتا ہے اس کا دل اس دن بھی مردہ نہیں ہوگا جس دن تمام دل مردہ ہو جائیں

گے۔یعنی قیامت کے دن''۔ [مجمع الزوائد:۲/۱۹۸]

یہ روایت موضوع ہے کیوں کہ اس میں ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ہے۔جس کے متعلق علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ:''ابن معین نے اس کو کذاب کہا ہے اور محدثین کی جماعت نے اسے متروک قرار دیا ہے۔'' [تلخیص المستدرک:۴/۸۷]

علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر اس راوی کے متعلق ''کذاب خبیث'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔[میزان الاعتدال:۲/۲۲۸]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو خود ساختہ قرار دیا ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ:۲/۱۱]

اسی طرح کی ایک روایت ابن ماجہ میں بھی ہے وہ بھی بقیہ بن ولید نامی راوی کی وجہ سے سخت ضعیف ہے کیوں کہ یہ مدلس ہے۔محدثین نے اس کی تدلیس سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے۔علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو سخت ضعیف قرار دیا ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ:۲/۱۱]

سوال محمد منور زکی سعودیہ سے دریافت کرتے ہیں کہ عیدین کے موقع پر تکبیرات زوائد میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں

جواب نماز عیدین میں تکبیرات زوائد میں ہاتھ اٹھانا کسی صحیح اور صریح روایت سے ثابت نہیں۔ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بصراحت آیا ہے کہ وہ نماز جنازہ اور نماز عید میں ہر تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھاتے تھے۔ [بیہقی:۳/۲۹۳]

لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔ [ارواء الغلیل:۳/۱۱۲]

البتہ بعض علما نے ایک صحیح روایت سے استنباط کیا ہے۔جس کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے پہلے ہر تکبیر کے موقع پر ہاتھ اٹھاتے تھے۔ [بیہقی ۳/۲۹۲]

اس روایت کا سیاق تو فرض نماز میں رفع الیدین سے متعلق ہے تاہم الفاظ کے عموم کا تقاضا ہے کہ اس میں تکبیرات عیدین بھی شامل ہیں۔چنانچہ محدثین میں سے امام بیہقی اور ابن منذر نے اس حدیث کے عموم سے استدلال کر کے تکبیرات عیدین کے موقع پر ہاتھوں کا اٹھانا ثابت کیا ہے اور کسی محدث سے ان کی مخالفت بھی منقول نہیں۔مندرجہ ذیل آثار بھی اس موقف کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں:

① ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: کیا امام نماز عید میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرے انہوں نے جواب دیا کہ ہاں وہ رفع الیدین کرے اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہاتھ اٹھائیں۔'' [مصنف عبدالرزاق:۳/۲۹۷]

② امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''کہ تکبیرات عیدین کے موقع پر ہاتھ اٹھانے چاہئیں اگرچہ میں نے اس کے متعلق کچھ نہیں سنا۔'' [الفریابی بحوالہ ارواء الغلیل:۳/۱۱۳]

③ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی موقف ہے کہ عیدین میں تکبیرات زوائد میں ہاتھ اٹھانے چاہئیں۔[کتاب الام:۱/۲۳۷، مسائل احمد وغیرہ۔

ان آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدین کی تکبیرات میں ہاتھ اٹھانے کا جواز ملتا ہے ہمارا رجحان بھی اس طرف ہے تاہم ایسے

مسائل کو باہمی اختلاف کی بنیاد نہ قرار دیا جائے۔

سوال کسی نا معلوم سائل نے بذریعہ ای میل سوال کیا ہے کہ عیدین کے دن غسل کے استحباب پر کوئی مرفوع حدیث اگر مروی ہے تو اس کا حوالہ درکار ہے۔

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں عیدین کے لیے تجمل کے استحباب پر ایک عنوان قائم کیا ہے بلکہ کتاب العیدین کا آغاز ہی اس باب سے کیا ہے، پھر اس کے اثبات کے لیے احادیث لائے ہیں۔ [بخاری: حدیث نمبر ۹۴۸]

تجمل، مقدمات غسل سے ہے، تاہم اس کے لیے کوئی صحیح مرفوع حدیث مروی نہیں ہے۔ البتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس دن غسل کرنا صحیح سند سے ثابت ہے، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

① حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے قبل غسل کرتے تھے۔ [بیہقی: ۳/۲۷۸]

اس اثر کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی صحیح سند کے ساتھ مؤطا میں بیان کیا ہے، جبکہ اس کے برعکس ایک روایت ہے، حضرت نافع فرماتے ہیں: کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کو عید کے روز کبھی غسل کرتے نہیں دیکھا وہ عید الفطر کی رات مسجد میں ٹھہرتے اور وہیں سے صبح سویرے عید گاہ چلے جاتے۔ [مصنف عبدالرزاق]

محدثین نے اس روایت کو اس بات پر محمول کیا ہے کہ جب وہ اعتکاف کرتے اور مسجد میں سوتے تو غسل کیے بغیر عید گاہ چلے جاتے اور اگر گھر سے عید گاہ جاتے تو غسل کر کے تشریف لے جاتے، یعنی پہلی روایت دوسرے اوقات پر محمول ہے۔

② حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی عیدین کے دن غسل کا استحباب مروی ہے۔ [بیہقی: ۳/۲۷۸]

③ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ وہ عید گاہ جانے سے پہلے غسل کرتے تھے۔ [احکام العیدین للفریابی: ۸۰]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غسل کرنا بھی مروی ہے۔ لیکن یہ روایات محدثین کرام کے قائم کردہ معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں۔

① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کے روز غسل کرتے تھے۔ [ابن ماجہ: حدیث نمبر ۱۳۱۵]

لیکن اس کی روایت میں جبارۃ بن مغلس اور حجاج بن تمیم نامی دو راوی ضعیف ہیں، جن کی وجہ سے یہ روایت نا قابل حجت ہے۔ [تعلیق ابن ماجہ: حدیث مذکور]

② فاکہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید اور عرفہ کے دن غسل کرتے اور حضرت فاکہ رضی اللہ عنہ بھی ان ایام میں اپنے اہل خانہ کو غسل کرنے کا حکم دیتے۔ [مسند امام احمد: ۴/۷۸]

اس روایت میں یوسف بن خالد سمتی نامی ایک راوی ہے جو علمائے جرح وتعدیل کے نزدیک مجروح ہے۔ بلکہ ابن معین نے کذاب لکھا ہے۔ اس لیے یہ روایت من گھڑت ہے۔ [تعلیق ابن ماجہ: حدیث نمبر ۱۳۱۶]

③ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کے روز غسل کرتے تھے۔ [مسند البزار: حدیث نمبر ۶۴]

اس روایت کے متعلق علامہ ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں محمد بن عبید اللہ ایک راوی سخت ضعیف ہے۔ [مجمع الزوائد: ۲/۱۹۸]

④ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھے، غسل کر کے عید گاہ جائے اور صدقہ فطر ادا کرے تو

اللہ تعالیٰ کی مغفرت لے کر گھر واپس آتا ہے۔ [مجمع الزوائد:۲/۱۹۸]

مگر اس کی سند میں بھی نصر بن حماد راوی متروک ہے جیسا کہ حافظ ہیثمی نے حدیث بیان کرنے کے بعد خود اس کی وضاحت کردی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ عیدین کے روز غسل کے استحباب پر کوئی صحیح مرفوع روایت نہیں ہے تاہم ابن عمر، حضرت علی اور حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہم کے عمل سے عید کے دن غسل کا استحباب ثابت ہوتا ہے، حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک عید کا غسل، غسل جمعہ پر قیاس کی وجہ سے مستحب اور پسندیدہ ہے۔'' [التمہید:۱۰/۲۶۶]

ان آثار کے پیش نظر عیدین میں عید گاہ جانے سے پہلے غسل کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنا مستحب ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ساہیوال سے عبدالسلام لکھتے ہیں کہ بعض عورتیں عید کے دن اپنا بناؤ سنگھار دکھانے کے لیے عید گاہ جاتی ہیں، ان حالات میں عورتوں کا عید پڑھنے کے لیے عید گاہ جانا کیسا ہے؟۔

جواب مردوں کے علاوہ مستورات کا بھی عید گاہ میں جا کر نماز عید میں شریک ہونا مسنون ہے، چنانچہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن ہم چھوٹی بچیوں، پردہ نشین جوان لڑکیوں حتّٰی کہ حائضہ عورتوں کو بھی عید گاہ لے جائیں تاکہ مسلمانوں کے اس عظیم اجتماع کی خیر و برکت اور ان کی دعاؤں میں شمولیت کریں، البتہ حائضہ عورتیں نماز اور جائے نماز سے الگ رہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جن کے پاس چادر نہیں ہوتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کے پاس چادر نہ ہو اس کی بہن کو چاہیے کہ اسے اپنی چادر میں لے لے یا اسے اپنی فالتو چادر عاریتاً دے دے۔'' [صحیح بخاری: کتاب العیدین]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ شوکت اسلام کے لیے تمام افراد کا عورتوں اور بچوں سمیت عید گاہ میں جانا مستحب ہے۔'' [حجۃ اللہ البالغہ]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع نقل کیا ہے۔ [فتح الباری]

البتہ اس سنت پر عمل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

☆ عورتیں باپردہ، سادہ لباس میں عید گاہ جائیں اور مہکنے والی خوشبو وغیرہ نہ لگائیں۔

☆ ظاہری آرائش و زیبائش سے بھی گریز کریں وگرنہ نیکی برباد گناہ لازم کے مترادف ہوگا۔

☆ راستہ کے ایک طرف ہو کر چلیں اور مردوں کے اختلاط سے پرہیز کریں۔

☆ عید گاہ میں تکبیرات اور ذکر الٰہی میں مصروف رہیں اور ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہ کریں۔

☆ شور و غل کرنے والے شرارتی بچوں کو ہمراہ نہ لائیں۔

☆ سوال میں جس صورت حال کا ذکر کیا گیا ہے یہ انتہائی افسوس ناک ہے۔ عورتوں کو عام حالات میں بھی ان احکام کا پابند کیا گیا

ہے کہ:

☆ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں، نیز اوڑھنیاں گریبانوں پر ڈالے رکھیں۔

☆ اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں کیوں کہ ایسا کرنے سے ان کی عفت مآبی مجروح ہوتی ہے۔

☆ چلتے وقت اپنے پاؤں زور سے نہ ماریں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے، اس میں اونچی ایڑی کے وہ سینڈل بھی آجاتے ہیں جنہیں عورتیں پہن کر چلتی ہیں تو ٹک ٹک کی آواز زیور کی چھنکار سے کم نہیں ہوتی۔

☆ خوشبو لگا کر باہر نکلنا بھی عورت کے لیے جائز نہیں اور جو عورت ایسا کرتی ہے وہ شریعت کی نظر میں بدکار ہے۔ اگر کوئی عورت ان احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نماز عید یا عام نماز کے لیے گھر سے باہر نکلی تو سرپرست حضرات کو چاہیے کہ وہ انہیں منع کریں اگر باز آجائیں تو ٹھیک بصورت دیگر وہ باہر جانے کے لیے ان پر پابندی لگادیں عورت کو شمع محفل بننے کے بجائے چراغ خانہ بننا چاہیے۔ تاکہ اس کی چادر اور چار دیواری کا تحفظ ہو۔

سوال جھنگ سے حافظ محمد ارشد لکھتے ہیں کہ عیدین کے موقع پر کوئی عورت دوسری عورت کو گھر میں نماز عید پڑھا سکتی ہے یا نہیں؟

جواب فرض نمازوں کے متعلق عورت کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں حاضر ہونے سے بہتر ہے، لیکن عیدین کے موقع پر شوکت اسلام کے اظہار کے لیے عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مردوں کے ہمراہ عیدین میں نماز عید ادا کریں۔ اگر اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ نماز نہیں پڑھ سکتیں تو بھی مسلمانوں کے ساتھ ان کی دعا وغیرہ میں ضرور شامل ہوں۔ البتہ نماز نہ پڑھیں بلکہ عورتوں سے الگ رہیں۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''کہ ہمیں حکم ہوتا تھا کہ ہم نوجوان اور پردہ نشین عورتوں کو نماز عید ادا کرنے کے لیے اپنے ہمراہ لے کر نکلیں۔'' [صحیح بخاری: کتاب العیدین، باب خروج النساء]

اور جو عورتیں مخصوص ایام میں ہیں وہ بھی ساتھ جائیں لیکن وہ نماز سے الگ رہیں۔ [صحیح بخاری: کتاب العیدین، باب خروج النساء]

جن کے پاس چادر نہ ہوتی وہ اپنی سہیلی سے عاریتاً چادر لے کر عید گاہ میں حاضر ہوتی۔ (صحیح بخاری) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو عید گاہ چلنے کا حکم دیتے۔ [مسند امام احمد: ج۱، ص۲۳۱]

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر عورت کو عید گاہ جانے کا تاکیدی حکم ارشاد فرماتے۔ [بیہقی: ج۳، ص۳۰۶]

ان تمام احادیث کا تقاضا ہے کہ عورتیں گھروں میں الگ نماز باجماعت پڑھنے کی بجائے عام مسلمانوں کے ہمراہ نماز عید ادا کریں۔ لہٰذا عورتوں کو الگ جماعت نہیں کرانی چاہیے۔ جبکہ عید گاہ میں ان کے لیے پردے کا انتظام ہوتا ہے۔

سوال سیالکوٹ سے پروفیسر حفیظ اللہ اعوان لکھتے ہیں کہ مسجد میں بلا عذر نماز عید ادا کرنا شرعاً کیا حقیقت رکھتا ہے، کیا اس طرح مسجد میں عید پڑھنے سے ثواب میں کمی تو نہیں ہوتی؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زندگی بھر یہی معمول رہا ہے کہ آپ کھلے میدان میں نماز عید ادا کرتے تھے۔ حالانکہ مسجد نبوی میں گنجائش ہوتی تھی۔ اس طرح خلفائے راشدین بھی اسی سنت پر عمل پیرا رہے۔ مساجد میں نماز عید ادا کرنے سے ترک سنت کے

علاوہ ایک زبردست نقصان یہ ہے کہ ہر گلی کوچے کی مسجد میں اس کا اہتمام ہونے لگا ہے جو اسلام کی شان و شوکت کے بالکل منافی ہے' اس لیے ہمیں مساجد میں نماز عید ادا کرنے کے بجائے کھلے پارک میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے متعلق بکثرت احادیث وارد ہیں۔ ہم چند ایک کا حوالہ دیتے ہیں۔

☆ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن عید کی ادائیگی کے لیے عید گاہ تشریف لے جاتے۔ [صحیح بخاری: کتاب العیدین]

یہ عید گاہ مسجد نبوی کے مشرقی جانب بقیع کے پاس تھی۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے درمیان تقریباً ایک ہزار فٹ کا فاصلہ تھا۔ [فتح الباری]

☆ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید کے دن نماز عید کی ادائیگی کے لیے صبح صبح عید گاہ تشریف لے جاتے۔ [صحیح بخاری: کتاب العیدین]

☆ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ کے دن بقیع کی طرف گئے وہاں عید گاہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید کی دو رکعات پڑھائیں۔ [صحیح بخاری: کتاب العیدین]

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال ہوا کہ کیا آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز عید ادا کی؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ادائیگی کے لیے عید گاہ تشریف لے گئے۔ جہاں آج کثیر بن صلت کا گھر ہے۔ آپ نے نماز عید ادا کی اور پھر خطبہ دیا۔
[صحیح بخاری: کتاب العیدین]

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہی تھا کہ آپ نماز عید کی ادائیگی کے لیے باہر کھلے میدان میں تشریف لے جاتے۔ باوجود اس کے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے سے ایک ہزار نماز کے برابر ثواب ملتا ہے، چنانچہ حافظ ابن قیم لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ ہمیشہ نماز عیدین عید گاہ میں ادا کرتے تھے۔''

[زاد المعاد: ۱/۱۷۲]

خلفائے راشدین کا بھی یہی معمول تھا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ ہر ذات نطاق (عورت) کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز عید کی ادائیگی کے لیے عید گاہ جائے۔'' [مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/۱۸۴]

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکماً کہتے تھے کہ ہم عورتوں کو عید گاہ لے کر چلیں جو کسی مجبوری کی وجہ سے نماز ادا نہیں کر سکتی وہ بھی عید گاہ جاتیں اور مسلمانوں کی دعائے خیر میں شرکت کرتیں جبکہ مسجد میں نماز ادا کرنے سے مخصوص ایام میں مبتلا عورتیں اس سنت کی ادائیگی سے محروم رہتی ہیں۔ ہاں اگر بارش، آندھی وغیرہ کا عذر ہو تو مسجد میں نماز عید ادا کی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

نوٹ: اس موضوع پر علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مستقل رسالہ بھی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

سوال: ٹھینگ موڑ (الٰہ آباد) سے محمد شفیع پوچھتے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر نماز عید کے بعد مصافحہ کرنے اور گلے ملنے کی

عادت ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ نیز عید کے موقع پر مبارک باد دینے کا بھی ثبوت ملتا ہے؟۔

جواب نماز عید کے بعد مصافحہ کرنے یا گلے ملنے کا ثبوت کتاب وسنت سے نہیں ملتا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ نے بایں الفاظ بڑا جامع جواب دیا۔ فرماتے ہیں: ''مصافحہ بعد از سلام آیا ہے، عید کے روز بھی بحیثیت تکمیل سلام مصافحہ کریں تو جائز ہے، بحیثیت خصوصِ عید بدعت ہے کیوں کہ زمانۂ رسالت وخلافت میں مروج نہ تھا۔''

[فتاویٰ ثنائیہ:۱/۴۵۰]

البتہ عید کے بعد ایک دوسرے کو بایں الفاظ مبارک باد دی جاسکتی ہے۔ ''تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ''۔ (اللہ تعالیٰ ہم سے اور آپ سے قبول فرمائے) اگرچہ اس کے متعلق بھی کوئی مرفوع روایت صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل صحیح سند سے منقول ہے۔ چنانچہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب عید کے دن ملتے تو مذکورہ الفاظ سے ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔'' [فتح الباری:۳/۴۴۶]

اسی طرح محمد بن زیاد فرماتے ہیں: ''کہ میں حضرت ابوامامہ باہلی اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تھا جب وہ عید پڑھ کر واپس ہوئے تو انہوں نے ان الفاظ سے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اللہ ہم سے اور تجھ سے قبول فرمائے۔'' [الجواہر النقی:۳/۳۲۰]

کتب حدیث سے بعض روایات ایسی ملتی ہیں جن سے اس کی کراہت معلوم ہوتی ہے اور اسے اہل کتاب کا طریقہ بتایا گیا ہے لیکن وہ روایات محدثین کے معیار صحت پر پورا نہیں اترتی۔ [سنن بیہقی:۳/۳۲]

ان روایات کے پیش نظر مذکورہ الفاظ سے مبارک باد دی تو جاسکتی ہے لیکن مصافحہ کرنا اور معانقہ ایک رواج ہے جس کا ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا۔ [واللہ اعلم]

عید منانے سے پہلے ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم نے رمضان کا مہینہ کیسے گزارا؟ اس کے حقوق وفرائض کہاں تک ادا کیے؟ روزہ کے مقصد (حصول تقویٰ) کو حاصل کرنے کے لیے کس حد تک کوشش کی؟ کیا رمضان کے روزوں سے ہماری دنیا سے محبت میں کمی اور آخرت کے شوق میں اضافہ ہوا؟ دنیا میں بسنے والے مظلوم مسلمانوں کی بے بسی نے ہمیں کس حد تک پریشان کیا؟ ان کے ساتھ مالی، اخلاقی تعاون کا جذبہ کس حد تک بیدار ہوا؟ اگر ان سب سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو ہم عید منانے اور اس کی مبارک باد دینے اور قبول کرنے کے حق دار ہیں۔ بصورت دیگر ہم اپنے گریبان میں خود جھانکیں اور سوچیں۔

سوال ڈیرہ نواب سے عبدالرحمٰن لکھتے ہیں کہ جو خطیب حضرات تنخواہ لے کر خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں ان کا کاروبار تو اذانِ جمعہ کے متصل ہی شروع ہو جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اذان کے بعد ہر قسم کی خرید وفروخت سے منع فرمایا ہے تو کیا اس فرمانِ الٰہی کی رو سے علمائے حضرات کا معاوضہ لے کر خطبہ دینا صحیح ہے؟

جواب واضح رہے کہ پیش آمدہ مسئلہ کے مطابق ہم افراط وتفریط کا شکار ہیں کیوں کہ اس دور میں کچھ حضرات جو خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے ہیں، ضروریات زندگی سے آگے بڑھ کر طمع ولالچ اور ہوائے نفس کا شکار ہو چکے ہیں۔ جبکہ ردعمل کے طور پر بعض انتہا پسند اس دینی خدمت پر ''کاروبار'' کی پھبتیاں کس رہے ہیں اور بعض مقامات پر فضا اس قدر مکدر کر دی گئی ہے کہ بقدر ضرورت مشاہرہ لینے

کے "جرم" میں ان کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دیا گیا ہے اس سلسلہ میں ہماری گزارشات یہ ہیں کہ ضروریات زندگی سے بالاتر ایسے مخلصین آج کل کہاں دستیاب ہیں جو فی سبیل اللہ یہ خدمت سرانجام دیں، دوسری طرف یہ بھی اندیشہ ہے کہ طعن وملامت کے ان شدید حملوں کی تاب نہ لا کر بعض کم ہمت اس دینی فریضہ کی بجا آوری سے اجتناب کرنے لگیں اس کے سنگین نتائج مساجد کے ویران ہونے کی صورت میں سامنے آسکتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا جائے۔ لہٰذا سوال یوں ہونا چاہیے کہ دینی کام کے لیے کسی صاحب علم کی ہمہ وقتی یا جز وقتی خدمات معقول مشاہرہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا معاملہ پیش خدمت ہے کہ وہ خلافت اٹھانے سے پہلے کپڑا فروخت کرنے کا کاروبار کرتے تھے جس دن خلافت کا بوجھ کندھوں پر آپڑا تو اگلے دن حسب پروگرام کپڑا فروخت کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلے اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جناب امیر المؤمنین! رعایا کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد یہ کیا کرنے لگے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اہل خانہ کو کہاں سے کھلاؤں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہم آپ کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود بیان کرتے ہیں کہ خلافت سے پہلے میرا کاروبار میرے بال بچوں کے لیے کافی تھا۔ اب چونکہ میں مسلمانوں کے معاملات میں مصروف رہتا ہوں۔ لہٰذا آل ابی بکر کو مسلمانوں کے مال سے بقدر ضرورت لینے کا حق ہے۔ [بخاری: کتاب البیوع' حدیث نمبر ۲۰۷۰]

قرآن مجید کی تصریح کے مطابق خلیفہ کی پہلی ذمہ داری نماز پڑھانا ہے۔ [۲۲/الحج: ۴۱]

جب اس مصروفیت کی وجہ سے خلیفہ کو بیت المال سے کچھ وصول کرنے کا حق ہے تو خطیب کو اپنی پابندی اور مصروفیت کا حق وصول کرنا کیوں ناجائز ہے؟ جبکہ وہ اہل مسجد سے "معاہدۂ خدمت" طے کرنے کے بعد مصروف ہو گیا ہے۔ اسی طرح جز وقتی دینی خدمات سرانجام دینے پر مشاہرہ وصول کرنا بھی شریعت سے ثابت ہے۔ جیسا کہ ایک مریض پر سورۃ فاتحہ کا دم کرنے پر چالیس بکریاں لینے کا معاہدہ طے ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق فرمایا: "کتاب اللہ پر معاوضہ لینے کا تم زیادہ حق رکھتے ہو۔" [صحیح بخاری: کتاب الطب' حدیث نمبر ۵۷۳۷]

بلکہ آپ نے دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے مزید فرمایا: "کہ میرا بھی اس میں حصہ رکھنا۔" [حدیث نمبر ۵۷۳۶]

اب ہم ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا واقعی یہ دینی خدمت کاروبار یا خرید وفروخت ہے جو اس آیت کی زد میں آتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ اجارہ کی ایک قسم ہے جو پابندی کے مقابلہ میں طے ہوئی ہے۔ اگر اسے کاروبار کا نام بھی دے دیا جائے تو بھی منع نہیں ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اذان کے بعد اس کاروبار کو منع فرمایا ہے۔ جو ذکر اللہ یعنی جمعہ کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث ہو یہی وجہ ہے کہ ادائیگی جمعہ کے لیے مسجد کو آتے وقت راستہ میں جو کاروباری معاملہ طے ہو جاتا ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ اس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں جس دینی خدمت کو کاروبار کہا گیا ہے وہ اللہ کے ذکر میں رکاوٹ کا موجب نہیں ہے بلکہ وہ تو عین اللہ کا ذکر ہے، اس میں اور دنیاوی کاروبار میں کیا قدر مشترک ہے کہ دونوں کا حکم ایک جیسا ہو؟ مسئلہ کی وضاحت کے بعد ہم خطیب حضرات سے بھی یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ صاحب

حیثیت ہیں تو اس قسم کی خدمت کو لوجہ اللہ سرانجام دیں اور اگر واقعی ضرورت مند ہیں تو بقدر ضرورت لینے پر اکتفا کریں، اسے دنیا طلبی کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ جذبہ تبلیغ سے سرشار ہو کر اس عظیم خدمت کو سرانجام دیا جائے۔

سوال بعض اہلحدیث مصنفین نے درج ذیل احادیث کو اپنی تالیفات میں ذکر کیا ہے، ان کی اسنادی حیثیت کے متعلق وضاحت کریں۔

① جس نے عیدین کی دونوں راتوں میں اخلاص اور حصول ثواب کی نیت سے قیام کیا تو اس کا دل، اس دن زندہ رہے گا جس دن دل مردہ ہو جائیں گے۔

② جو پانچ راتوں میں عبادت کرے گا، اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی، ذوالحجہ کی آٹھویں، نویں اور دسویں رات، عید الفطر کی رات اور شعبان کی پندرھویں رات۔ (محمد اسلام طاہر محمدی لاہور: خریداری نمبر ۱۲۷۴)

جواب پہلی روایت موضوع ہے کیوں کہ اس میں ایک راوی عمر بن ہارون البلخی ہے جس کے متعلق علامہ ذھبی لکھتے ہیں ''ابن معین نے اسے کذاب کہا ہے اور محدثین کی ایک جماعت نے اسے متروک قرار دیا ہے۔'' [تلخیص المستدرک: ج۴، ص۸۷]

میزان الاعتدال میں اس کے متعلق ''کذاب خبیث'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ [میزان الاعتدال: ج۳، ص۲۲۸]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے خود ساختہ اور بناوٹی بتایا ہے۔ [سلسلہ الاحادیث الضعیفہ: ج۲، ص۱۱]

مذکورہ الفاظ سنن ابن ماجہ کے ہیں، اس میں بقیہ بن ولید نامی ایک راوی سخت مدلس ہے، محدثین کرام نے اس کی تدلیس سے اجتناب کرنے کی تلقین کی ہے، علامہ ابن قیم لکھتے ہیں: ''عید کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح تک سوئے رہے اور آپ نے شب بیداری نہیں فرمائی۔ عیدین کی رات عبادت کرنے کے متعلق کوئی صحیح روایت مروی نہیں ہے۔'' [زاد المعاد: ج۱، ص۲۱۲]

دوسری روایت کو علامہ منذری نے بیان کیا ہے۔ [الترغیب والترھیب: ۲/۱۵۲]

علامہ منذری نے اس کے موضوع یا ضعیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کیوں کہ انہوں نے بصیغۂ تمریض بیان کیا ہے، بعض روایات میں پانچ راتوں کے بجائے چار راتوں کے الفاظ ہیں، اس روایت میں عبدالرحیم بن زید العمی راوی کذاب ہے اور اس سے بیان کرنے والا سوید بن سعید بھی سخت ضعیف ہے، علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت پر موضوع ہونے کا حکم لگایا ہے۔

[سلسلہ الاحادیث الضعیفہ: ج۱، ص۱۲]

بعض روایات میں عید الفطر کی رات کو لیلۃ الجائزہ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے، اسے ابن حبان نے اپنی تالیف کتاب الثواب میں نقل فرمایا ہے، حافظ منذری نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے یہ ایک طویل حدیث ہے جس کے الفاظ ہی اس کے موضوع ہونے پر دلالت کرتے ہیں، حافظ منذری نے بھی اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔ [ترغیب: ج۱، ص۱۰۰]

بہر حال ہمارے ہاں بعض بزرگ ان راتوں میں عبادت کا خاص اہتمام کرتے ہیں جبکہ اس سلسلہ میں مروی احادیث قابلِ اعتماد نہیں ہیں، جیسا کہ گزشتہ سطور میں وضاحت کی گئی ہے۔

سوال ہمارے اکثر خطبا نماز جمعہ میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پوری نہیں پڑھتے بعض حضرات ان سورتوں کے علاوہ اور

سورتیں پڑھتے ہیں، ان کا استدلال ارشاد باری تعالیٰ کا عموم ہے ''کہ قرآن سے جو آسان ہو پڑھ لو۔'' کیا ان کا یہ عمل مطابق سنت ہے یا مخالف سنت، وضاحت فرمائیں۔ (محمد ابراہیم خریداری نمبر ۱۰۱۵)

جواب اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ کی رکعات میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے۔ چنانچہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ دونوں عیدوں اور جمعہ کی نماز میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی﴾ اور ﴿هَلْ اَتَاکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَةِ﴾ پڑھتے تھے، اگر عید اور جمعہ ایک دن میں جمع ہوتے تو پھر بھی آپ دونوں سورتیں عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں پڑھتے۔ [صحیح مسلم: الجمعۃ' ۸۷۸]

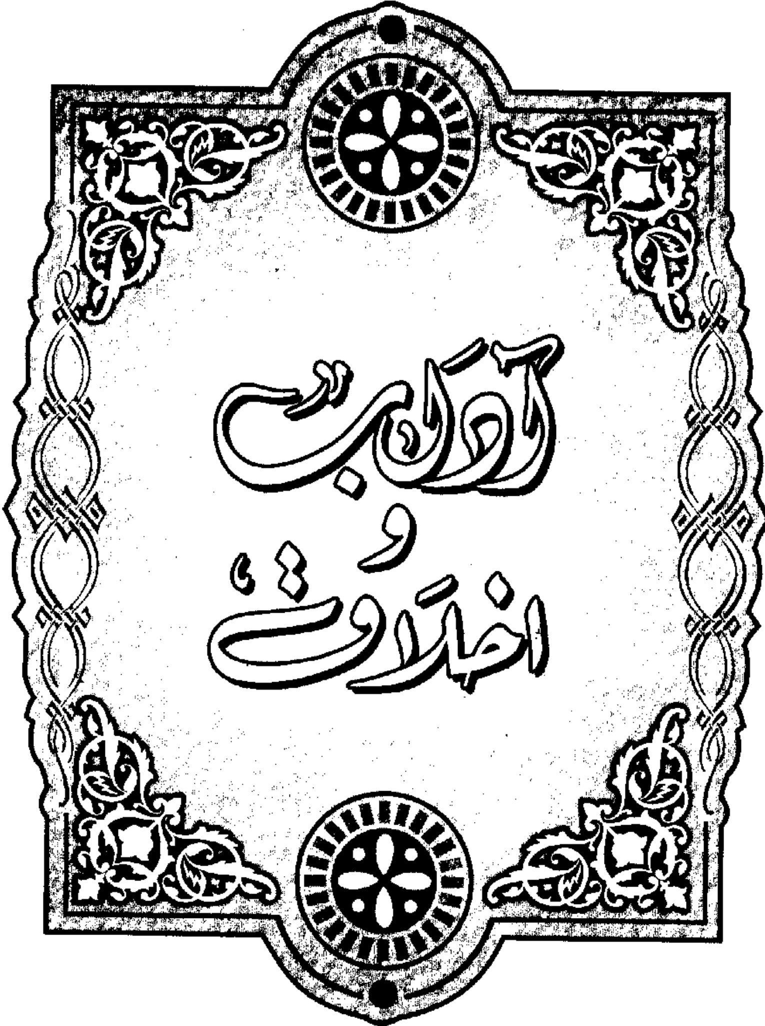
اس طرح جمعہ کی نماز میں سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقون پڑھنا بھی صحیح روایت سے ثابت ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھائی تو اس میں سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون کو تلاوت کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ کی نماز میں یہ سورتیں پڑھتے سنا ہے۔ [صحیح مسلم: الجمعۃ' ۸۷۷]

ان احادیث کے پیش نظر ہمارے خطبا حضرات کو چاہیے کہ وہ نماز جمعہ میں ان سورتوں کو مکمل پڑھنے کا التزام کریں۔ سوال میں ذکر کردہ جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے عموم کو رسول اللہ ﷺ کے معمولات کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ البتہ اگر کوئی ان سورتوں کو نامکمل پڑھتا ہے یا ان کے علاوہ دوسری سورتوں کو نماز میں پڑھتا ہے تو اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں اگرچہ سنت پر عمل کرنے کے ثواب سے محرومی ہوگی تاہم ایسا کرنے کا جواز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے۔

''دو سورتوں کو ایک رکعت میں جمع کرنا یا کسی سورت کی ابتدائی یا آخری آیات پڑھنا یا موجودہ ترتیب کے خلاف پڑھنا یہ جائز ہے''۔ پھر آپ نے اس کے جواز کے لیے چند ایک روایات اور آثار بھی پیش کیے ہیں۔ [صحیح بخاری: الاذان' باب ۱۰۶]

البتہ سنت کے احیا کا تقاضا ہے کہ خطبا حضرات عیدین اور جمعہ کی نماز میں وہی سورتیں پڑھنے کی پابندی کریں جو رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے تاکہ اہلحدیث کی علامت اور امتیازی حیثیت برقرار رہے۔




آداب
و
اخلاق

آداب و اخلاق

سوال ہمارے ادارہ خدمۃ الکتاب والسنۃ کے قابل اعتماد رکن جناب پروفیسر محمد حسین آزاد وہاڑی سے لکھتے ہیں کہ مستدرک حاکم کا ترجمہ کرتے ہوئے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سامنے آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں کو بلند و بالا محلات میں مت رکھو اور انہیں لکھنا نہ بھی سکھاؤ بلکہ انہیں سوت کاتنے اور سورۃ مریم کی تعلیم دو۔ [مستدرک حاکم]

اس حدیث کی وضاحت کریں جبکہ اسلام خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ پھر اس قسم کی احادیث کے پیش نظر منکرین حدیث کو احادیث پر اعتراض کا موقع ملتا ہے۔

جواب اس میں شک نہیں کہ اسلام خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، امہات المؤمنین کو اللہ تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیات اور دانائی کی باتیں پڑھی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتی رہو۔''

[۳۳/الاحزاب:۳۴]

اس آیت کریمہ میں ''حکمۃ'' سے مراد احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو اپنے گھروں میں قرآن و حدیث پڑھنے، پڑھانے کی تلقین کی ہے، اس سے تعلیم نسواں کی طرف واضح اشارہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خواتین کو لکھنا، پڑھنا سکھانا شریعت کی نظر میں جائز اور درست ہے جبکہ مذکورہ حدیث سے عدم جواز معلوم ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس کی استنادی حیثیت کو واضح کیا جائے، اس حدیث کو امام حاکم نے مستدرک (صفحہ 396 جلد 2) اور امام بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان (صفحہ 377 جلد 5) میں روایت کیا ہے، بنیادی طور پر اسے امام حاکم نے بیان کیا ہے، پھر انہیں کے واسطہ سے امام بیہقی نے نقل کیا ہے، اس روایت میں ایک راوی عبدالوہاب بن الضحاک ہیں جن کے متعلق محدثین کرام نے اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کیا، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ متروک ہے اور ابو حاتم نے اسے کذاب کہا ہے۔'' [تقریب:۲۲۲]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''کہ اسے عجائب و غرائب بیان کرنے کی عادت ہے۔'' [الکامل لابن عدی:۵/۱۹۳۳]

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ مقلوب اور باطل احادیث وضع کرتے ہوئے دیکھا ہے۔'' [تہذیب:۶/۳۹۶]

امام حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے تلخیص المستدرک میں اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے اور فرمایا ''کہ اس کی آفت عبدالوہاب بن الضحاک ہے جسے امام ابو حاتم نے کذاب کہا ہے۔'' [المستدرک:۲/۳۹۶]

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کی ایک دوسری سند بیان کی ہے اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ روایت اس سند کے ساتھ بھی منکر ہے یعنی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ [شعب الایمان:۵/۳۸۹ حدیث نمبر ۲۲۲۷]

اس سند میں ایک راوی محمد بن ابراہیم الشامی ہیں جسے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے منکر قرار دیا ہے۔ [تقریب:ص ۴۸۸]

اور ابن حبان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ [تہذیب:۹/۱۴]

حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ روایت کو وضع حدیث کے سلسلہ میں بطور مثال بیان کیا ہے۔ نیز دارقطنی کے حوالہ سے لکھا ہے

کہ یہ راوی کذاب ہے۔ [میزان الاعتدال:۳/۴۴۶]

ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس کی عام مرویات غیر محفوظ ہوتی ہیں۔ [الکامل:۶/۲۲۷۵]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ روایت بایں الفاظ منقول ہے:

''اپنی عورتوں کو خط و کتابت کی تعلیم نہ دو، انہیں بالا خانوں میں مت رکھو، عورت کے لیے بہترین تفریح سوت کاتنا اور مرد کے لیے سیر و سیاحت ہے۔'' [ضعفاء لابن حبان:۳/۷۸]

اس سند میں بھی ایک راوی جعفر بن نصر ہے جس کے متعلق امام ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ متہم بالکذب ہے۔ [میزان الاعتدال:۱/۴۱۸] پھر انہوں نے اس سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے علامہ ابن عدی نے لکھا ہے کہ جعفر بن نصر ثقہ راویوں کے نام سے باطل احادیث بیان کرتا تھا، پھر انہوں نے بطور مثال ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کا حوالہ دیا ہے۔ [الکامل:۱/۵۷۵]

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ عدم جواز کی جملہ روایات ناقابل اعتبار اور بے بنیاد ہیں۔ لہٰذا ان کو بنیاد بنا کر تعلیم نسواں کو ناجائز قرار نہیں دیا جا سکتا، کتب حدیث میں چند ایسی احادیث بھی ہیں جو عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے متعلق بڑی وضاحت سے دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ حضرت شفاء بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ میرے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور مجھے فرمایا: ''کہ تم حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو مرض نملہ کی جھاڑ پھونک سکھاؤ جیسا تم نے اسے خط و کتابت کی تعلیم دی ہے۔'' [مسند امام احمد:۶/۳۷۲؛ ابوداود: الطب ۳۸۸۷]

نملہ ایک انتہائی تکلیف دہ قسم کا پھوڑا ہے مریض ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس پر چیونٹیاں رینگتی اور اسے کاٹتی ہیں۔ یہ حدیث عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی واضح دلیل ہے۔ اس کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک اثر سے بھی ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے زیر کفالت تھی، لوگ مختلف ممالک سے ان کے پاس آیا کرتے تھے......اور ہدیہ پیش کرتے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں میری بہت قدر و منزلت تھی۔ تمام شہروں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نام خطوط میرے پاس آتے، میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہتی، خالہ جان! یہ خط اور ہدیہ فلاں شخص نے بھیجا ہے آپ مجھے فرماتیں: ''کہ بیٹی انہیں جواب لکھو اور ہدیہ کے بدلے بھی کچھ نہ کچھ روانہ کرو، اگر تمہارے پاس کچھ نہ ہو تو میں دے دوں گی۔'' چنانچہ وہ مجھے کچھ دے دیا کرتی تھیں۔ [الادب المفرد:۷/۲۸۷ حدیث نمبر ۱۱۱۸]

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ عورتوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، چھوٹی بچیوں کو تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کے سرپرستوں پر ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس کا اہتمام کریں، البتہ بالغ خواتین کے لیے ضروری ہے کہ وہ خواتین یا محارم سے تعلیم حاصل کریں، پردہ میں رہتے ہوئے غیر محرم سے بھی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے۔ بہر حال عورتوں کو لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال خانیوال سے اطہر مشہدی لکھتے ہیں کہ آپ نے دیور سے پردہ کے متعلق وضاحت فرما کر ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کر

دیا، ذرا بہنوئی سے پردہ کے متعلق بھی تحریر کریں، حقیقت یہ ہے کہ بہنوئی بھی ہمارے معاشرہ میں باعث آزمائش بنا ہوا ہے اسے دیور کی نسبت اختلاط کا زیادہ موقع ملتا ہے جس سے کئی ایک برائیاں جنم لیتی ہیں اس کے متعلق وضاحت سے لکھیں۔

جواب پردہ کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۳]

روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کر چکے تھے کہ آپ کے ہاں برے بھلے سبھی لوگ آتے ہیں۔ اس لیے آپ اپنی ازواج مطہرات وطیبات کو پردہ کرنے کا حکم دیں لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے اس لیے اللہ کی طرف سے اشارہ کے منتظر رہے آخر کار یہ حکم آ گیا کہ محرم مردوں کے علاوہ کوئی دوسرا آپ کے گھر نہ آئے اور جس غیر محرم کو خواتین خانہ سے کوئی کام ہو تو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے، اگلی آیت میں ان محرم رشتہ داروں کی فہرست ہے جن سے پردہ ضروری نہیں ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ازواج مطہرات کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۵]

اس فہرست میں بہنوئی کا ذکر نہیں ہے لہٰذا اس سے پردہ کرنا ضروری ہے، اس آیت میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلہ والدین ہیں یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا ہے کہ بھتیجوں اور بھانجوں کا ذکر آ جانے کے بعد ان کے ذکر کی حاجت نہیں رہی، کیونکہ بھتیجے اور بھانجے سے پردہ نہ کرنے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ کرنے کی ہے۔ بہر حال بہنوئی ان محرم رشتے داروں میں شامل نہیں ہے جس سے پردہ اٹھا لیا گیا ہو بلکہ پردہ کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ جس سے عورت کا نکاح کسی وقت بھی ہو سکتا ہو اس سے پردہ کرنا ضروری ہے بہر حال بہنوئی اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے جب اس کی بیوی فوت ہو جائے یا اسے طلاق مل جائے۔ واضح رہے کہ پردہ کے متعلق یہ ابتدائی احکام تھے اس کے علاوہ سورۂ نور میں احکام ستر وحجاب بیان کیے گئے ہیں وہاں بھی جن لوگوں کو پردہ سے مستثنیٰ کیا گیا ہے ان میں بہنوئی شامل نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وہ (عورتیں) اپنا بناؤ سنگار ظاہر نہ کریں مگر ان لوگوں کے سامنے، شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، اپنے شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے......'' [۲۴/النور:۳۱]

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ بہنوئی غیر محرم ہے جس سے پردہ ضروری ہے، ہمیں اس پہلو پر خاص نظر رکھنی چاہیے۔ عام طور پر بے تکلفی کے انداز میں بہنوئی سے پردہ نہیں کیا جاتا، ہم لوگ بھی اس معاملہ میں نرمی سے کام لیتے ہیں، بعض اوقات اس نرمی کے غلط نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ہماری غیرت کے لیے جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔

سوال عبدالحمید بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے کے مخصوص حالات اور دیہاتی زندگی کے پیش نظر شرعی پردہ کیسے نافذ کیا جا سکتا ہے، کیا مخصوص حالات وظروف کی وجہ سے اس کے متعلق کوئی نرمی کی جا سکتی ہے؟

جواب پردہ کے متعلق قرآن وحدیث میں واضح احکام موجود ہیں، ان پر عمل کرنے سے بے حیائی اور فحاشی کے سیلاب کو روکا

جا سکتا ہے، امہات المؤمنین اور دیگر صحابیات کا نمونہ سامنے ہے کہ انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں اس پر عمل کیا ہے، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جب اپنے گھوڑوں کی خوراک لانے کے لیے باہر نکلتی ہیں تو پردہ سے باہر جاتی ہیں، ان احکام پر عمل کرنے کے لیے شہری یا دیہاتی ماحول کی تفریق درست نہیں ہے۔ نیز اس پر مخصوص حالات یا خاص طرز زندگی بھی اثر انداز نہیں ہونی چاہیے۔ اور نہ ہی حالات وظروف کی وجہ سے ان میں نرمی کی جا سکتی ہے۔ ہاں کسی انتہائی مجبوری کے وقت مثلاً: بیماری یا حادثہ کی صورت میں غیر محرم کے سامنے چہرہ کھولنے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان خاتون کے لیے ضروری ہے کہ وہ حالات وظروف کی پروا کیے بغیر پردہ کے احکام پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ قرآن کریم نے اسے دلوں کی پاکیزگی قرار دیا ہے۔

سوال انجمن اصلاح معاشرہ کی طرف سے سوال ہے کہ ایسا کاروبار جس میں غیر محرم عورتوں کو ہاتھ لگانا پڑے شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ مرد، عورتوں کو چوڑیاں پہناتے ہیں؟

جواب شریعت اسلامیہ میں غیر محرم عورتوں کو دیکھنا اور انہیں ہاتھ لگانا حرام ہے۔ البتہ کسی مجبوری کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس سے اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ سمع و اطاعت کی بیعت لیتے وقت آپ ﷺ مردوں سے مصافحہ فرماتے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ان سے عہد و پیمان لیتے لیکن عورتوں سے بیعت لیتے وقت صرف احکام دینے پر اکتفا کرتے ان سے مصافحہ نہ فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بیعت لیتے وقت عورتوں سے مصافحہ نہ کرتے تھے۔ [مسند امام احمد: ۲/۲۱۳]

حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ ہم سے مصافحہ نہیں فرمائیں گے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ”کہ میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا ہوں۔“ [مسند احمد: ۶/۳۵۷]

اسی طرح حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے درخواست کی کہ آپ ﷺ اپنے دست مبارک سے کپڑا نہیں اٹھاتے (تا کہ ہم بیعت کریں) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔“ [مسند امام احمد: ۶/۴۵۴]

ان دلائل کے پیش نظر ایسا کاروبار شرعاً حرام ہے جس میں غیر محرم عورتوں کو ہاتھ لگانا پڑے اگر عورتیں ہی ایک دوسرے کو چوڑیاں پہنائیں تو ایسا کاروبار جائز ہے۔ لیکن مردوں کے لیے ایسا کام کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ایسا کاروبار کرنے کے لیے عورتوں کا بندوبست کیا جائے۔ تا کہ مردوں کے غیر محرم عورتوں کو ہاتھ لگانے سے شریعت کا ایک اہم ضابطہ مجروح نہ ہو۔

سوال بہاولنگر سے مرزا اکبر لکھتے ہیں کہ میرے گھر میں T.V نہیں ہے، اور نہ ہی میں اسے پسند کرتا ہوں، میرے بچے پڑوس میں جا کر T.V دیکھ آتے ہیں، جس سے بچوں کے اخلاق و عادات میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے، بچوں کو سزا اس لیے نہیں دیتا کہ اس سے بھی اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ کیا ایسے حالات میں مجھے T.V رکھنے کی اجازت ہے۔

جواب ٹیلی ویژن دورِ حاضر کا ایک ایسا فتنہ ہے کہ اس کے متعلق نرم گوشہ رکھنے والوں کا ضمیر بھی چیخ اٹھا ہے کہ اس کے دیکھنے سے بچوں کے اخلاق و عادات میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔ جیسا کہ سوال میں اس کی وضاحت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”جو لوگ

ایمانداروں میں فحاشی پھیلانا چاہتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں سخت سزا کے حقدار ہیں۔'' [۱۰/التوبہ:۱۹]

اس آیت کریمہ کی زد میں وہ تمام ذرائع و وسائل آجاتے ہیں جو فحاشی پھیلانے ، بے حیائی عام کرنے ، بداخلاقی کی تعلیم دینے ، بے راہ روی پر اکسانے ، جذبات بھڑکانے ، جنسی خواہشات ابھارنے اور رقص و سرور کا سامان مہیا کرنے میں پیش پیش ہیں، ٹیلی ویژن اگرچہ دنیاوی لحاظ سے بے شمار فوائد و منافع کا حامل ہے لیکن دینی اور اخلاقی اعتبار سے انتہائی نقصان دہ اور ضرر رساں واقع ہوا ہے۔ بالخصوص نئی پود میں آوارگی اور نوجوانوں میں حیا باختگی پیدا کرنے میں اس نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے، ہمارے نزدیک ٹیلی ویژن کے دنیاوی فوائد کے پیش نظر اس کے گھر میں رکھنے کا جواز مہیا کرنا ایک چور دروازہ کھولنا ہے، اس کے ذریعے شیطان اور اس کی ذریت کو اپنے گھر کا موقع فراہم کرنا ہے، اس کے مفاسد کے پیش نظر مکمل طور پر اس سے اجتناب کرنا چاہیے اور بچوں کو سختی سے منع کرنا چاہیے اس کے لیے اگر بچوں کو تھوڑی بہت سزا دی جائے تو اس سے بچوں کے اخلاق متاثر نہیں ہوں گے، جیسا کہ سائل نے اس خدشے کا اظہار کیا ہے اسلامی غیرت اور دینی حمیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ٹیلی ویژن کے متعلق اپنے اندر کوئی نرم گوشہ نہ رکھا جائے ، اس کے نقصانات کی مختصر جھلک یہ ہے کہ ٹیلی ویژن ایسے حیا سوز ڈرامے اور فحش مناظر پیش کرتا ہے کہ انہیں دیکھ کر باحیا انسان کا سر شرم سے جھلک جاتا ہے، چوری ڈکیتی ، مار دھاڑ کی عملی تربیت دی جاتی ہے، جس سے امن عامہ تباہ و برباد ہو رہا ہے، نیز اخلاق و کردار بگاڑنے میں بڑا موثر کردار سرانجام دے رہا ہے، اس کے علاوہ تصویر کو اس میں نمایاں حیثیت دی جاتی ہے، جو فتنہ و فساد کی اصل بنیاد ہے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بے شمار نقصانات ہیں جن کے پیش نظر اس سے کلی اجتناب کرنا ہی مناسب ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال مظفر گڑھ سے ظفر اللہ پوچھتے ہیں کہ ایک حدیث میں خوشی کے وقت دف بجانے کی اجازت دی گئی ہے۔ کیا اس روایت کو آلات موسیقی کے استعمال پر بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔

جواب دف اور آلات موسیقی میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ بلکہ آلات موسیقی کے استعمال کی حرمت قرآن و حدیث کی صریح نصوص سے ثابت ہے بلکہ رسول اللہ ﷺ نے قرب قیامت کی یہ علامت بتائی ہے کہ لوگ اسے جائز سمجھ کر استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔ قرآن کریم نے ان آلات موسیقی کو ''لهو الحديث'' کہہ کر ان سے نفرت کا اظہار کیا ہے سوال میں جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ مدینہ منورہ میں کسی شادی کے موقع پر انصار کی بچیاں دف بجا کر اپنے اسلاف کی شجاعت و بہادری پر مشتمل اشعار پڑھ رہی تھیں ان اشعار میں ایک مصرع کا مطلب یہ تھا کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو کل کی باتیں بھی جانتا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں روکا اور پہلی طرح اشعار پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ اس حدیث کی روشنی میں مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے خوشی کے موقع پر دف کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

① دف صرف ایک طرف سے بجائی جاتی ہے اور اس کے بجانے سے سادہ سی آواز پیدا ہوتی ہو۔ اس کے ساتھ گھنگرو کی چھنکار نہیں ہوتی۔

② دف بجاتے وقت دیگر آلات موسیقی استعمال نہ کیے جائیں کیونکہ ان کی حرمت پر قرآن و حدیث کی واضح نصوص موجود ہیں۔

③ رزمیہ اشعار یعنی شجاعت و بہادری پر مشتمل اشعار ہوں بزمیہ اشعار یعنی ہیجان انگیز اور عشقیہ غزلیں نہ گائی جائیں۔

④ جوان عورتیں اس میں حصہ نہ لیں بلکہ نابالغ بچیاں اس طرح خوشی کا اظہار کر سکتی ہیں۔

⑤ یہ اہتمام بھی ایسے حلقہ میں ہونا چاہیے جہاں اپنے عزیز و اقارب موجود ہوں۔ اجنبی لوگوں کے سامنے ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

⑥ گیت اور اشعار خلاف شرع نہ ہوں کیونکہ اس قسم کے اشعار پڑھنا شرعاً حرام ہیں۔

⑦ اس کے باوجود اگر فتنہ وغیرہ کا اندیشہ ہو تو اس طرح کا مباح کام کرنا بھی ناجائز قرار پاتا ہے۔

مذکورہ شرائط کی پابندی کرتے ہوئے خوشی کے موقع پر دف کے ساتھ اشعار پڑھے جا سکتے ہیں۔ [واللہ اعلم]

سوال پسرور سے شفیق الرحمٰن اسلم خریداری نمبر 188 لکھتے ہیں کہ گھر میں کبوتر رکھنا شرعاً کیسا ہے کیا انہیں اڑانا جائز ہے۔

جواب چھوٹے بچوں کی تفریح طبع یا گھر کی زینت کے لیے پرندوں کو گھر میں رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ایک ابوعمیر نامی مادری بھائی تھا جس نے اپنے گھر میں نغیر نامی ایک سرخ چڑیا رکھی تھی جو کسی وجہ سے مرگئی تو ابوعمیر بہت پریشان ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے تو عمیر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرماتے: ''اے ابوعمیر! نغیر کو کیا ہوا۔'' [صحیح بخاری: 6203]

بخاری میں یہ وضاحت ہے کہ ابوعمیر نے یہ پرندہ محض تفریح طبع کے لیے رکھا تھا۔ اگر کبوتروں کو اپنے گھر میں زینت اور بچوں کے دل بہلانے کے لیے رکھا جائے تو حدیث بالا کے پیش نظر اس کی گنجائش ہے لیکن انہیں اڑانے اور شرط لگانے کے لیے رکھنا ناجائز ہے حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو کبوتروں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ ایک شیطان ہے۔ مادہ شیطان کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔'' [مسند امام احمد: ۲/۳۵۴]

امام ابوداؤد اور امام ابن ماجہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے۔

''کبوتروں سے کھیلنا''

ابن ماجہ میں مختلف صحابہ کرام سے اس کی کراہت کے متعلق متعدد روایات ہیں (3767,3765,3764) ان کے پیش نظر انسان کو اس قسم کے فضول شوق سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال ساہیوال سے غلام حیدر لکھتے ہیں کہ ایک آدمی نماز پنجگانہ کا پابند ہونے کے باوجود لوگوں کو ناجائز تنگ کرتا ہے، نیز جھوٹے مقدمے کرتا اور جھوٹی گواہیاں دیتا ہے، ایسے انسان کے متعلق کیا سلوک کیا جائے؟

جواب نماز، دین اسلام کا ایک اہم رکن ہے، جس کا فلسفہ قرآن کریم نے بایں الفاظ بیان کیا ہے: ''یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔'' [۲۹/العنکبوت: ۴۵]

نماز کے بے شمار اوصاف میں ایک اہم وصف یہ ہے کہ نماز برے کاموں سے روکتی ہے لیکن اس بات کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاح نفس کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہو، فائدہ اٹھانے کی نیت رکھے، اور اس کی کوشش بھی کرے، اس قسم کے جذبات رکھنے

والے نمازی پر نماز کے اصلاحی اثرات ضرور ہوں گے، بصورتِ دیگر دنیا کی کوئی اصلاحی تدبیر بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی۔ جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو یا دانستہ اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے، قبولیت نماز کے لیے یہ ایک معیار ہے کہ اس نے نماز کو کس حد تک فحش و منکرات سے دور رکھا ہے، اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیوں کے ارتکاب سے رک گیا تو اس کی نماز قبول ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ چونکہ اسلام نے معاشرہ کو ایک جسم قرار دیا ہے، اگر جسم کا کوئی حصہ صحیح کام نہ کرے تو اس کی اصلاح کرنا چاہیے، اگر کوشش کے باوجود صحیح نہیں ہوتا بلکہ اس میں پڑے ہوئے زہر سے یہ اندیشہ ہے کہ سارے جسم میں سرایت کر جائے گا تو اسے کاٹ دینا ہی مناسب ہے۔ لہٰذا ایسے بدعمل نمازی کی اصلاح کے لیے پوری پوری کوشش کرنی چاہیے، اگر تمام تر کوششیں بے سود ثابت ہوں تو اسے اپنے حال پر رہنے دیا جائے، البتہ اسے اپنے دل سے کاٹ دینا چاہیے یعنی اس کے ساتھ قلبی تعلقات قائم نہ کیے جائیں، ایمانی غیرت کا یہی تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے بدعمل نمازی کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین.

سوال فیصل آباد سے عبدالمنان لکھتے ہیں کہ تمباکو نوشی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ حرام ہے یا مکروہ؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔

جواب واضح رہے کہ تمباکو نوشی کے متعلق قرآن وحدیث میں صراحت کے ساتھ کوئی نص وارد نہیں ہے کیونکہ یہ عہد نبوت سے بہت بعد کی دریافت ہے، البتہ شریعت اسلامیہ میں حلال وحرام کے متعلق جو عام اصول بیان ہوئے ہیں ان کے پیش نظر تمباکو کا استعمال حرمت کی زد میں آتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو انسان کی صحت کے لیے نقصان دہ ہو یا پڑوسی کے لیے اذیت رساں یا اپنے مال کے ضیاع کا باعث ہو۔ تمباکو نوشی میں یہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں، اس بنا پر اس کا استعمال حرام اور ناجائز ہے خواہ سگریٹ، سگار یا پائپ کی شکل میں ہو یا حقہ، پان، بیڑی اور پان کی شکل میں ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تم خود کو ہلاک نہ کرو۔'' [۴/النسآء:۲۹]

نیز فرمایا: ''کہ تم اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔'' [۲/البقرہ:۱۹۵]

ان ارشادات کے پیش نظر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان تمباکو کے ذریعے اپنی صحت کو برباد کر کے اپنے ہاتھوں خود کو ہلاک کرنے کا ارتکاب کرتا ہے، کیونکہ تمباکو چند ایک ایسے زہریلے اجزاء پر مشتمل ہے جو بے شمار مہلک بیماریوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں ان میں سے بے خوابی، دماغی کمزوری، بدحواسی، مالیخولیا، مرگی، ہائی بلڈ پریشر اور پھیپھڑوں کا سرطان سرفہرست ہیں۔ تمباکو میں جو زہریلے مادے پائے جاتے ہیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① نکوٹین: یہ ایک انتہائی خطرناک قسم کا زہر ہے جو دل و دماغ اور گردوں کو بری طرح متاثر کرتا ہے، 60 ملی گرام نکوٹین ایک جوان آدمی کے عمل تنفس کو مفلوج کرنے کے لیے کافی ہے۔

② پائرڈین: یہ ایک ایسا زہریلا مادہ ہے جو پھیپھڑوں کے سرطان کا باعث ہے۔

③ نیوپائرین: یہ کولتار کی مانند انتہائی خطرناک زہر ہے جو ذیابیطس کا سبب بن سکتا ہے۔

④ نیوکلولین: یہ ایک مہلک زہر ہے اس کی معمولی سی مقدار کتے کو ہلاک کر دیتی ہے، میونسپل کارپوریشن کے اہل کار اس مادے کو

گوشت میں ملا کر آوارہ کتوں کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

⑤ میتھائل الکوحل: ذیابیطس کے مریضوں کے لیے مکمل اور عام لوگوں کے لیے عارضی طور پر بینائی کو زائل کر کے اندھا پن پیدا کرتا ہے۔

⑥ کاربالک ایسڈ: یہ زہریلا مادہ گلے اور تنفس کی نالیوں میں سوزش پیدا کرتا ہے جو منہ، حلق اور سینے کے سرطان کا باعث ہے۔

ان اجزاء کے علاوہ کئی دوسرے اجزاء بھی تمباکو میں پائے جاتے ہیں، جو انسانی جسم کے لیے نقصان دہ اور خطرناک بتائے جاتے ہیں۔(ماخوذ از روزنامہ ''امروز'' مجریہ 19 نومبر:1986)اس کی وضاحت کے بعد رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی بھی پیش نظر رہنا چاہیے۔''جو انسان زہر کے ذریعے خودکشی کرتا ہے قیامت کے دن اسے ہمیشہ زہرنوشی کرنے کی سزادی جائے گی۔''

[صحیح بخاری وصحیح مسلم]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:''کہ وہ پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال کرتا ہے جو خبیث اشیاء کو ان پر حرام قرار دیتا ہے۔''

[الاعراف]

تمباکو کے متعلق کوئی بھی عقلمند اور صاحب بصیرت آدمی ''طیب'' ہونے کا فیصلہ نہیں دیتا بلکہ اس کے عادی حضرات بھی مقدس مقامات یعنی مساجد وغیرہ میں سب اس کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں، بلکہ اسے مسجد سے باہر رکھتے ہیں، اس لحاظ سے بھی اسے حرام قرار دیا جانا ہی مناسب ہے۔بعض لوگ اسے ''مکروہ'' کہہ کر اس کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بفرض تسلیم اگر مکروہ بھی ہو تب بھی حلال کی نسبت حرام کے زیادہ قریب ہے۔چنانچہ فرمان نبوی ہے:''حلال اشیاء واضح ہیں اور حرام چیزیں بھی نمایاں ہیں، ان کے درمیان بعض مشتبہ اشیاء ہیں جن کی حقیقت لوگوں کی اکثریت سے اوجھل ہے، جو انسان ایسی مشتبہ چیزوں سے اجتناب کرتا ہے اس نے اپنے دین اور عزت وآبرو کو محفوظ کر لیا، اور جو ان مشتبہ چیزوں میں دلچسپی لیتا ہے وہ حرام میں جا پڑتا ہے بالکل اس چرواہے کی طرح جو اپنی بکریاں شاہی چراگاہ کے قریب چراتا ہے بعید نہیں کہ اس کی بکریاں اس سرکاری چراگاہ میں چرنے لگیں''(جو ان کے لیے ممنوع ہے) [صحیح بخاری: کتاب البیوع]

☆ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:''جو شخص اللہ پر ایمان اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الادب]

چنانچہ تمباکو نوشی کرنے والا اپنی اس حرکت سے اپنے بیوی بچوں اور ساتھ بیٹھنے والوں کو تکلیف دیتا ہے خاص طور پر نمازی تو اس گندی اور اذیت ناک بو سے بہت تنگ ہوتے ہیں اور فرشتے بھی تنگ ہو کر کوسوں دور بھاگ جاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے کچے پیاز اور لہسن کے متعلق فرمایا ہے:''جو انہیں استعمال کرتا ہے اسے چاہیے کہ وہ ہم سے دور رہے اور ہماری عبادت گاہوں سے بھی الگ رہے بلکہ اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔''

اس حدیث سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بدبودار چیز استعمال کرنے والے کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو کس قدر نفرت ہے۔تمباکو تو کچے پیاز اور لہسن سے بڑھ کر خطرناک اور ضرر رساں ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''فضول خرچی میں اپنا مال نہ اڑاؤ کیونکہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔'' [۱۷/الاسراء:۲۷]
رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی دولت ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ان تصریحات کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے خون اور پسینہ سے کمائی ہوئی دولت کو ضائع نہ کرے، ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی انسان اپنی دولت کو آگ سے جلانا پسند نہیں کرتا لیکن سگریٹ نوشی کرنے والا گویا اپنی دولت کو آگ کے ذریعے تباہ و برباد کرتا ہے، یہی وہ اسراف ہے جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والے کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے، ان خرابیوں کے علاوہ یہ بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ اکثر بچے سگریٹ نوشی کی وجہ سے چوری اور جھوٹ کی عادت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے والدین سے چھپ چھپا کر سگریٹ نوشی کرتے ہیں۔ اور جب جیب خرچ ختم ہو جاتا ہے تو سگریٹ نوشی کے لیے دوسرے لوگوں کی جیبوں سے رقم چرائی جاتی ہے۔ اس چوری اور دروغ گوئی کی نحوست سے بعض بچے بڑے ہو کر ڈاکہ اور راہزنی کی وارادت میں ملوث ہو جاتے ہیں، نیز تمباکو نوشی دورِ حاضر میں ہیروئن اور دیگر منشیات کے فروغ کے لیے خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔

تمباکو نوشی کے مذکورہ بالا مفاسد کے پیش نظر اکثر علما نے اس کی حرمت کا فتویٰ دیا ہے، بعض اہل علم نے اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں، ان علما میں مفتی شیخ عبدالعزیز بن باز، شیخ محمد ابراہیم، شیخ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی، شیخ عبدالرزاق عفیفی اور شیخ ابوالجزائری سرفہرست ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ تمباکو نوشی سے جو جسمانی، مالی، اخلاقی اور معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں، ان کے پیش نظر اس کا استعمال ہر طرح سے ناجائز اور حرام ہے، عقل مند اور صاحب بصیرت انسان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال پسرور سے شفیق الرحمٰن اسلم خریداری (ایجنسی) نمبر 188 لکھتے ہیں۔ حمنہ کے لغوی معنی کیا ہیں۔ کیا یہ نام اسلامی ہے بعض حضرات اس نام کو صحیح خیال نہیں کرتے۔

جواب عربی لغت کے اعتبار سے ہر وہ چیز جس میں سیاہ اور چھوٹے ہونے کا وصف پایا جائے اسے حمن کہا جاتا ہے۔ اسکی تانیث حمنہ ہے چنانچہ علاقہ طائف میں پائے جانے والی سیاہ انگوروں کی ایک خاص قسم بڑے سیاہ دانوں میں چھوٹے چھوٹے سیاہ دانے سیاہ چیونٹی، جوں اور حیوانات کے جسم سے لگی ہوئی چچڑی کو عربی زبان میں حمنہ کہا جاتا ہے اس وضاحت کے بعد حمنہ رضی اللہ عنہا ایک جلیل القدر صحابیہ ہیں۔ جن کے ذریعے استحاضہ کے متعدد مسائل سے اس امت کو معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان کی ایک ہمشیرہ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی اہلیہ تھیں جن کے نیک اور پارسا ہونے کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے گواہی دی ہے۔ اس بنا پر کسی بچی کا نام حمنہ رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ ایسے ناموں کے متعلق لغوی کھوج لگانا تحصیل لاحاصل اور بے سود ہے۔ کیونکہ ان کی معنویت ان کے حاملین کے کردار میں ہے جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے متعلق لغوی مفہوم کی کرید کرنا درست نہیں ہے، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو نام اور کام کی وجہ سے اپنی نگاہوں سے روپوش رہنے کی تلقین فرمائی تھی۔ لیکن ہمارے لیے صحابہ کرام کے متعلق حسن ظن کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے دلوں میں ان کے متعلق محبت اور الفت کے جذبات رکھیں اور کسی بھی پہلو سے ان کے متعلق نفرت کا اظہار نہ ہو۔ چونکہ حضرت

حمنہ رضی اللہ عنہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں میں شریک تھیں۔اس لیے کچھ حضرات اس نام سے تکدر محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسا رویہ درست نہیں ہے کیونکہ سزا اور توبہ کے متعلق جرم کی نوعیت ختم ہو جاتی ہے۔ویسے انسان کے نام کا اسکی شخصیت کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔اس کے اخلاق و کردار پر بھی نام اثر انداز ہوتا ہے نیز قیامت کے دن انسان کو اسکے نام مع ولدیت آواز دی جائے گی۔اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:''کہ تم اپنی اولاد کے لیے اچھے نام کا انتخاب کیا کرو۔''

[ابوداؤد: الادب، ۴۹۴۸]

اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ نام وہ ہیں جن میں اللہ یا رحمٰن کے لیے عبودیت کا اظہار ہو چنانچہ حدیث میں ہے:''کہ اللہ تعالیٰ کو عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام بہت پسند ہیں۔'' [صحیح مسلم: آداب، ۵۵۸۷]

اسی طرح وہ نام جن میں بندے کی عبودیت کا اللہ تعالیٰ کی کسی بھی صفت کی طرف انتساب ہو جیسا کہ عبدالسلام، عبدالرحیم اور عبدالقدوس وغیرہ، حضرات انبیا علیہم السلام کے نام بھی اللہ کے ہاں اچھے نام ہیں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''کہ اپنی اولاد کے لیے انبیا کے نام تجویز کیا کرو۔'' [ابوداؤد: الادب، ۴۹۵۰]

اسلاف میں جو نیک سیرت اور اچھے کردار کے حامل لوگ ہوں ان کے نام بھی تجویز کیے جا سکتے ہیں۔جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:''کہ تم سے پہلے لوگ حضرات انبیا علیہم السلام اور صالحین کے ناموں کے مطابق اپنی اولاد کے نام رکھتے تھے۔''

[صحیح مسلم: الادب، ۵۵۹۸]

ان حقائق کے پیش نظر حمنہ ایک اسلامی نام ہے اور اپنی بچیوں کا نام رکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال کراچی سے ابوعمر سوال کرتے ہیں کہ الحماد کا کیا معنی ہے اور آپ اسے اپنے نام کے آگے کیوں لکھتے ہیں؟

جواب اس سوال کا تعلق عملی زندگی سے نہیں ہے تاہم اس کا جواب پیش خدمت ہے، الحماد کا معنی کثرت سے اللہ کی تعریف کرنے والا ہے۔اگرچہ راقم آثم کثرت سے اللہ کی تعریف نہیں کرتا لیکن اس امید پر اس لقب کو اختیار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسا کرنے کی توفیق دے، اسے بطور لقب اختیار کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تورات میں اس امت کا صفاتی نام ''الحمادون'' بتایا گیا ہے۔جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کرنے پر کعب احبار نے اس کی وضاحت کی ہے۔ [دارمی: ۱/۱۶۔حدیث نمبر ۵،۷،۸]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:''کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے دن اللہ کے ہاں بہترین بندے ''الحمادون'' ہیں یعنی جو اس کی کثرت سے تعریف کرنے والے ہوں گے۔'' [مسند امام احمد: ۴/۴۳۴]

بطور تفاؤل اس لقب ''الحماد'' کو اختیار کیا گیا ہے، قارئین کرام سے دعا کی اپیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے لقب کی لاج رکھنے کی توفیق دے۔(آمین)

سوال وہاڑی سے رضوان اللہ لکھتے ہیں کہ ایک آدمی کا کسی ٹیچر لڑکی سے نکاح ہوا وہ اس وقت اس کی تنخواہ وصول کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ عورت کی آمدنی صرف شوہر کے لیے ہے عورت کو جائیداد بنانے کا شریعت نے حق نہیں دیا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شادی کے بعد بھی عورتوں کے حق ملکیت کو برقرار رکھا

ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ: ''عورتوں کو ان کے حق مہر خوشی سے دیا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے انہیں چھوڑ دیں تو اسے ذوق وشوق سے کھالو''۔ [۴/سورۃ النساء:۴]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہر کے متعلق عورت کا حق ملکیت ثابت کیا ہے، اسی طرح وراثت وغیرہ کے کئی ایک مسائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو جائیداد بنانے کا شرعی حق ہے بلکہ بعض احادیث سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض مالدار صحابیات اپنے شوہروں کو زکوٰۃ بھی دیتی تھی۔ چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں اپنے خاوند حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پر مال زکوٰۃ صرف کروں تو کیا یہ جائز ہے؟ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں! اس کے لیے دو اجر ہیں ایک رشتہ سے حسن سلوک کرنے کا اور دوسرا صدقہ کرنے کا''۔

[صحیح بخاری: کتاب الزکوٰۃ' باب الزکوٰۃ علی الزوج]

اسی طرح حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ وہ اپنے خاوند کے بچوں پر مال زکوٰۃ خرچ کرتی تھیں۔

[صحیح بخاری حوالہ مذکورہ]

اندریں حالات بیوی کو شریعت نے یہ حق دیا ہے اگر وہ اپنی تنخواہ الگ رکھنا چاہتی ہے تو اسے یہ حق پہنچتا ہے۔ خاوند کو چاہیے کہ وہ اس سلسلہ میں زیادتی کا مرتکب نہ ہو۔ البتہ خاوند کو یہ حق بھی شریعت نے دیا ہے کہ بیوی کی ملازمت اگر حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ کا باعث ہے تو بیوی کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کرسکتا ہے اور بیوی کے لیے اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال لودھراں سے قاری عمر فاروق ثاقب (خریداری نمبر ۵۱۸۸) لکھتے ہیں کہ میں نے دوسری شادی کی ہے، میری پہلی بیوی کا بیٹا دوسری بیوی نے پالا، لیکن دودھ نہیں پلایا، میرا بیٹا گویا اس کا بیٹا ہوا، ایسے حالات میں میری سالی یا خوش دامن اس بیٹے سے پردہ کرے گی یا نہیں؟

جواب سوال میں ''میرا بیٹا گویا اس کا بیٹا ہوا'' بڑا خطرناک جملہ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صرف دو عورتوں کو ماں کا مقام دیا ہے چنانچہ ایک وہ ماں ہے جس نے اسے جنم دیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے ہیں''۔ [۵۸/المجادلہ:۲]

دوسری وہ ماں ہے جس نے جنم تو نہیں دیا لیکن بچے کو ابتدائی دو سال کی مدت میں کم از کم پانچ مرتبہ دودھ پلایا ہے، اس کے متعلق ارشادی باری تعالیٰ ہے: ''اور تمہاری وہ مائیں بھی حرام ہیں جنہوں نے دودھ پلایا ہو''۔ [۴/النساء:۲۳]

پہلی ماں کو حقیقی اور دوسری کو رضاعی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ کسی تیسری عورت کو ماں نہیں کہا جاتا اور نہ ہی اس کی طرف بیٹا ہونے کی نسبت کی جاسکتی ہے۔ دوسری بیوی نے صرف پہلی بیوی کے بچے کی پرورش کی ہے پرورش کرنے سے وہ بیٹا نہیں بن جائے گا، البتہ اس سے پردہ نہ کرنے کی دیگر وجوہات ہیں، ان میں پرورش کرنا یا نہ کرنا اس کو کوئی دخل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو جن محارم کے سامنے اظہار زینت کی اجازت دی ہے، ان میں سے خاوند کا وہ بیٹا بھی ہے جو اس کے بطن سے نہ ہو، بلکہ کسی دوسری بیوی

سے پیدا ہوا ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے خاوندوں...... یا اپنے خاوند کے لڑکوں کے......''۔ [۲۴/النور:۳۱]

یہی وجہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ کی منکوحہ سے نکاح نہیں کر سکتا، لیکن دوسری بیوی کی بہن (سالی) اور اس کی ماں (خوش دامن) سے ذکر کردہ لڑکے کا کوئی دودھ یا سسرالی رشتہ نہیں ہے، لہٰذا انہیں اس سے پردہ کرنا ہوگا، پردہ نہ کرنے کی رعایت صرف دوسری بیوی کے لیے ہے، بیوی کی بہنیں اور ماں اس کے لیے غیر محرم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

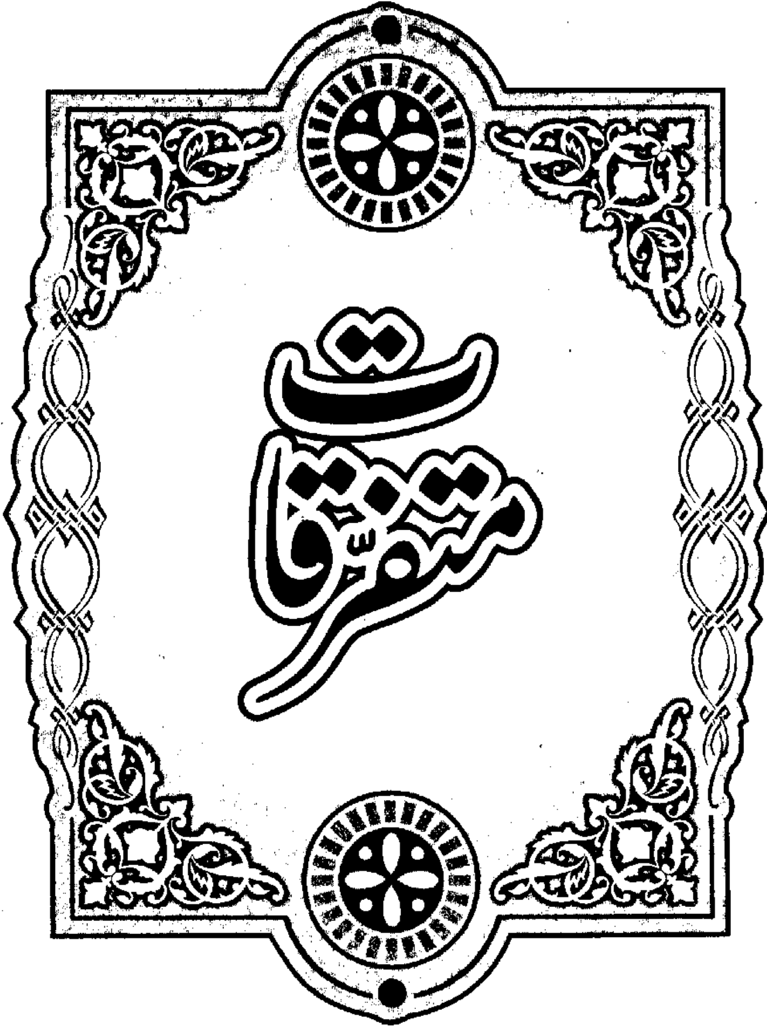
سوال غریب آباد جہانیاں سے حافظ محمد شفیع لکھتے ہیں کہ ایک لڑکی کی اس کے بہنوئی نے پرورش کی اور اس کی شادی کا فریضہ بھی اپنے ہاتھوں سرانجام دیا۔ اب کیا وہ اپنے بہنوئی سے پردہ کرے گی جبکہ اس کی بہن، بہنوئی کے نکاح میں موجود ہے......؟

جواب پردے کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''نبی ﷺ کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہے تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو''۔ [۳۳/الاحزاب:۵۳]

روایات میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کر چکے تھے کہ آپ کے ہاں بھلے اور برے لوگ آتے ہیں کاش! آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دیں، لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے اس لیے آپ اللہ کی طرف سے اشارہ کے منتظر رہے آخر کار یہ حکم آ گیا کہ محرم مردوں کے علاوہ کوئی مرد آپ کے گھر نہ آئے اور جس غیر محرم کو خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے، اگلی آیت میں ان محرم رشتہ داروں کی فہرست ہے جن سے پردہ ضروری نہیں ہے چنانچہ فرمایا: ''ازواج مطہرات کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے، ان کے میل جول کی عورتیں اور ان کے مملوک گھروں میں آئیں''۔ [۳۳/الاحزاب:۵۵]

اس فہرست میں بہنوئی کا ذکر نہیں ہے لہٰذا اس سے پردہ کرنا ضروری ہے، اس آیت میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلہ والدین ہیں یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا ہے کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آ جانے کے بعد ان کے ذکر کی حاجت نہیں ہے کیوں کہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے، بہر حال بہنوئی ان محرم رشتہ داروں میں شامل نہیں ہے جس سے پردہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ پردہ کے لیے ضابطہ یہ ہے کہ جس سے عورت کا نکاح کسی وقت بھی ہو سکتا ہو اس سے پردہ کرنا ضروری ہے، بہنوئی اپنی سالی سے نکاح کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کی بیوی فوت ہو جائے یا اسے طلاق مل جائے۔ پردے کے متعلق یہ ابتدائی احکام تھے سورہ نور میں احکام ستر بیان کیے گئے ہیں وہاں بھی جن لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے ان میں بہنوئی شامل نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وہ (عورتیں) اپنا بناؤ سنگار نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے (شوہروں کے بھائی، اپنے بیٹے، بھائی، شوہروں کے بیٹے، بھائیوں کے بیٹے، بہنوں کے بیٹے......) [۲۴/النور:۳۱]

صورت مسئولہ میں اگرچہ بہنوئی نے اپنی سالی کی پرورش کی اور اس کی شادی کا فریضہ بھی اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا ہے تاہم وہ اس کے لیے محرم نہیں ہے جس سے پردہ اٹھا دیا گیا ہو، بلکہ وہ اس کے لیے غیر محرم ہے جس سے پردہ ضروری ہے۔


متفرقات

متفرقات

سوال گولڈن کلر یعنی سونے کے رنگ کی کلائی گھڑی پہننا جائز ہے یا نہیں؟ اگر چہ اس کا چین سونے کا نہیں ہوتا لیکن اس پر سونے کا پانی ضرور ہوتا ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔ (محمد عمران...... بہاولپور)

جواب قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے نبی! ان سے دریافت کریں کہ کس نے اللہ تعالیٰ کی اس زینت کو حرام کیا ہے جسے اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے۔'' [۷/الاعراف:۳۲]

اس آیت کریمہ کی رو سے انسان کے لیے ہر قسم کی زینت کا استعمال حلال ٹھہرتا ہے لیکن احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے ہر قسم کی زینت مطلق طور پر حلال نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کچھ حدود ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

☆ اس زینت کی حرمت نص قطعی سے ثابت نہ ہو جیسا کہ سونے اور ریشم کے متعلق حدیث میں ہے کہ ان کا استعمال عورتوں کے لیے جائز اور مردوں کے لیے ناجائز ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لیے حلال اور مردوں کے لیے حرام کیا گیا ہے''۔ [مسند امام احمد: ج ۴' ص ۳۹۲]

☆ اس زینت سے نمود ونمائش اور ریاکاری مقصود نہ ہو ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ ''مجھے تمہارے متعلق زیادہ اندیشہ شرک اصغر یعنی ریاکاری میں مبتلا ہو جانے کا ہے''۔ [مسند امام احمد: ج ۵' ص ۴۲۸]

☆ عورتوں سے مشابہت کرنے کے لیے اس زینت کو استعمال نہ کیا گیا ہو۔ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ان مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں''۔ [مسند امام احمد: ج ۱' ص ۳۳۹]

☆ زینت اختیار کرتے وقت غیر مسلم اقوام کی نقالی مقصود نہ ہو، جیسا کہ ہمارے ہاں بعض منچلے شوق فضول کی خاطر گلے میں صلیب وغیرہ لٹکا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے متعدد مرتبہ یہود ونصاریٰ کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا، نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جو انسان کسی دوسرے کی نقالی کرتا ہے وہ انہیں سے شمار ہوگا۔'' صورت مسئولہ میں مذکورہ بالا حدود وقیود کی پابندی کرتے ہوئے گولڈن کلر یعنی سونے رنگ جیسی کلائی گھڑی استعمال کی جا سکتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال گھوڑے کی حلت وحرمت کے متعلق قرآن وحدیث کا کیا فیصلہ ہے دلائل سے بیان کریں۔ (محمد عاشق...... قصور)

جواب واضح رہے کہ گھوڑا حلال ہے اور متعدد روایات میں اس کی حلت منقول ہے، حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں گھوڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت کھایا۔ [صحیح بخاری: الذبائح' ۵۵۱۹]

ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اور رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت نے اس کا گوشت کھایا۔ [دارقطنی: ج ۴' ص ۲۹۰]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خیبر کے دن گدھوں کے گوشت سے منع فرمایا اور گھوڑے کے گوشت کو کھانے کی اجازت دی۔ [صحیح بخاری: الذبائح' ۵۵۲۰]

بعض روایات میں ہے کہ ہم نے خیبر کے دن گھوڑے کا گوشت کھایا۔ [صحیح مسلم: الصید' ۵۰۲۲]

ائمہ کرام میں سے صرف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے اس کی حرمت منقول ہے البتہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاد سے اختلاف کرتے ہوئے اس کی حلت کا فتویٰ دیا ہے۔ [کنز الدقائق: ص۲۲۹ مترجم فارسی]

محدث ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی حنفی لکھتے ہیں: ''کہ گھوڑا حلال ہے۔'' [مالا بدمنہ: ص۱۱۰]

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ گھوڑوں کا کھانا جائز ہے بہتر نہیں ہے۔'' [بہشتی زیور: ج۳' ص۵۶]

کتب فقہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی وفات سے تین دن پہلے گھوڑے کی حرمت سے رجوع کر لیا تھا (در مختار) مختصر یہ ہے کہ گھوڑا حلال ہے اگر طبیعت نہ چاہے تو اس کا کھانا ضروری نہیں، لیکن حلال کہنے والوں پر طعن و تشنیع درست نہیں ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے صاف اعلان کیا ہے کہ ہم گھوڑے کے گوشت کے متعلق کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ [کتاب الآثار: ص۱۸۰]

اس بنا پر احناف کو اس مسئلہ کے متعلق سختی نہیں کرنی چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال میں پیدائشی طور پر ایک ہیجڑا ہوں، میری شکل وصورت، چال وڈھال اور جسمانی ساخت و پرداخت انتہائی طور پر لڑکیوں سے مشابہ ہے، میرا نام لڑکیوں والا اور لباس بھی لڑکیوں والا پہنتا ہوں، میرے سر کے بال لڑکیوں کی طرح لمبے اور خوبصورت ہیں، ایک آواز ہے جو لڑکیوں سے قدرے بھاری ہے، مجھے دیکھنے والا لڑکی ہی خیال کرتا ہے، میرے ساتھ یہ حادثہ ہوا کہ میرا گرو عدالتی کارروائی کے ذریعے مجھے میرے والدین سے چھین کر لے آیا تھا، میں بچپن سے اب تک گرو کی صحبت میں اور اس کی زیر تربیت رہا ہوں، اس لیے ناچ گانے کا پیشہ اپنانا ایک فطرتی بات تھی، تاہم میں شروع ہی سے اس کاروبار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اب جب کہ میرا گرو مر چکا ہے اور میں آزاد ہوں، میری عمر تیس بتیس سال کے قریب ہے لیکن میں اپنے گرو کے مکان میں دوسرے ہیجڑے ساتھیوں کے ساتھ رہتا ہوں، مجھے اس پیشہ سے جنون کی حد تک نفرت ہو چکی ہے میں نے عزم کر لیا ہے کہ اس پیشہ اور ہیجڑوں سے کنارہ کش ہو جاؤں اور اپنی توبہ کا آغاز حج بیت اللہ کی سعادت سے کرنا چاہتا ہوں، میری الجھن یہ ہے کہ میں مردوں کی طرح حج کروں یا عورتوں کی طرح، کتاب وسنت کے مطابق میری الجھن حل کریں، مجھے اس بات کا علم ہے کہ اگر میں مردوں کی طرح حج کروں تو مجھے احرام باندھنا ہوگا اور مجھے بدن کا کچھ حصہ ننگا رکھنا ہوگا، اس کے علاوہ سر کے بال بھی منڈوانا ہوں گے لیکن سچی بات ہے کہ میرے لیے یہ امر بہت مشکل ہوگا، جس سے مجھے خوف آتا ہے بلکہ تصور کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب کہ عورتوں کی طرح حج کرنے میں مجھے آسانی ہی آسانی ہے کیوں کہ میں نے اب تک عمر کا تمام حصہ عورتوں کی طرح گزارا ہے اور جنسی طور پر مردانہ خواہش کبھی بھی میرے دل میں نہیں ابھری، بعض علما سے دریافت کرنے سے الجھن کا شکار ہو چکا ہوں کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں، مجھے کسی نے کہا ہے کہ اگر تم مسئلہ کا صحیح حل چاہتے ہو تو کسی وہابی عالم کی طرف رجوع کرو، اس لیے میں نے آپ کی طرف رجوع کیا ہے، مجھے جلدی اس کا جواب دیا جائے۔ (ایک سائل، معرفت محمد اسلام طاہر محمدی، لاہور کینٹ خریداری نمبر۴۷ ۱۲)

جواب اس قدر طویل سوال کے باوجود بعض امور دریافت طلب ہیں، تاہم جواب پیش خدمت ہے، اس سلسلہ میں چند باتیں قابل ملاحظہ ہیں۔

① گرو کا والدین سے عدالتی کارروائی کے ذریعہ چھین کر لے آنا انتہائی محل نظر ہے کیوں کہ ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کا سہارا لے کر عدالتی کارروائی کے ذریعے اس ''مخلوق'' کو اس کے والدین سے زبردستی چھینا جھپٹی کی جاسکے، یقیناً اس میں والدین کی مرضی شامل ہوگی جس کے متعلق وہ جوابدہ ہوں گے، ایسے متعدد واقعات ہمارے مشاہدہ میں ہیں کہ اس جنس کے گرو حضرات والدین سے انہیں لینے آئے لیکن والدین نے انکار کر دیا اور انہیں دینی مدرسہ میں داخل کرایا، دینی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ وہ گانے بجانے کا دھندہ کرنے کے بجائے دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

② اس کام سے صرف نفرت ہی کافی نہیں ہوگی بلکہ فریضہ حج کا انتظار کیے بغیر فوراً اس سے توبہ کی جائے اپنے ساتھیوں سے الگ ہو جانا چاہیے، کیوں کہ موت کا کوئی پتہ نہیں کب آ جائے، اخروی نجات کے لیے برے کام سے صرف نفرت ہی کافی نہیں، بلکہ اسے اللہ کی بارگاہ میں ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے چھوڑ دینا ضروری ہے۔ پھر نیک اعمال نماز، روزہ وغیرہ سے اس کی تلافی کرنا بھی لازمی ہے، اس بنا پر سائل کو ہماری نصیحت ہے کہ وہ فوراً اس کام سے باز آ جائے اور اپنے ہم پیشہ ساتھیوں سے کنارہ کش ہو کر اخروی نجات کی فکر کرے۔

③ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں یہ جنس موجود تھی بعض کے نام بھی ملتے ہیں کہ وہ ھیت، ماتع، ابو ماریہ اور مابور جیسے ناموں سے پکارے جاتے تھے، یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شرائع اسلام ادا کرتے تھے، نمازیں پڑھتے، جہاد میں شریک ہوتے اور دیگر امور خیر بھی بجا لاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے متعلق پہلے یہ خیال کرتے تھے کہ یہ بے ضرر مخلوق ہے، آدمی ہونے کے باوجود انہیں عورتوں کے معاملات میں چنداں دلچسپی نہیں ہے، اس لیے آپ ازواج مطہرات کے پاس ان کے آنے جانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے لیکن جب آپ کو پتہ چلا کہ انہیں عورتوں کے معاملات میں خاصی دلچسپی ہی نہیں بلکہ یہ لوگ نسوانی معلومات بھی رکھتے ہیں تو آپ نے انہیں ازواج مطہرات اور دیگر مسلمان خواتین کے ہاں آنے جانے سے منع فرما دیا بلکہ انہیں مدینہ بدر کر کے روضہ خاخ، حمراء الاسد اور نقیع کی طرف آبادی سے دور بھیج دیا تاکہ دوسرے لوگ ان کے برے اثرات سے محفوظ رہیں۔ [صحیح بخاری: المغازی ۴۳۲۴]

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ انہیں بے ضرر خیال کر کے اپنے پاس مت آنے دیں، بلکہ انہیں گھروں میں داخل ہونے سے روکیں۔ [صحیح بخاری: النکاح ۵۲۳۵]

④ واضح رہے کہ مخنث بنیادی طور پر مرد ہوتا ہے لیکن مردی قوت سے محروم ہونے کی وجہ سے عورتوں جیسی چال ڈھال اور ادا و گفتار اختیار کیے ہوتا ہے یہ عادات اگر پیدائشی ہیں تو انہیں چھوڑنا ہوگا اگر پیدائشی نہیں بلکہ تکلف کے ساتھ انہیں اختیار کیا گیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس اختیار پر لعنت فرمائی ہے: ''کہ وہ مرد جو عورتوں جیسی چال و ڈھال اور وہ عورتیں جو مردوں جیسی وضع قطع اختیار کریں اللہ کے ہاں ملعون ہیں۔'' [صحیح بخاری: اللباس ۵۸۸۷]

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک ایسا مخنث لایا گیا جس نے عورتوں کی طرح اپنے ہاتھ پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے تھے آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ از خود عورتوں جیسی چال ڈھال پسند کرتا ہے تو آپ نے اسے مدینہ بدر کر کے علاقہ نقیع میں بھیج دیا جہاں

سرکاری اونٹوں کی چراگاہ تھی، آپ سے کہا گیا کہ اسے قتل کر دیا جائے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ مجھے نمازیوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔'' [ابوداؤد: الادب ۴۹۲۸]

البتہ خنثیٰ اس سے مختلف ہوتا ہے کیوں کہ فقہا کے ہاں اس کی تعریف یہ ہے کہ جو مردانہ اور زنانہ آلات جنسی رکھتا ہو یا دونوں سے محروم ہو۔ [المغنی لابن قدامہ: ج۹، ص ۱۰۸]

بلوغ سے پہلے اس کے لڑکے یا لڑکی ہونے کی پہچان اس کے پیشاب کرنے سے ہوسکتی ہے اور بلوغ کے بعد اس کی داڑھی یا چھاتی سے پہچانا جاسکتا ہے، بہرصورت وہ شرعی احکام کا پابند ہے اگر مرد ہے تو مردوں جیسے اور اگر عورت ہے تو عورتوں کے احکام پر عمل کیا جائے۔

⑤ صورت مسئولہ میں جس طرح تفصیل بیان کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل لڑکی ہے اور اس پر عورتوں جیسے احکام لاگو ہوں گے لیکن حقیقت حال وہ خود ہی بہتر جانتا ہے کہ اگر وہ مرد ہے اور عورتوں جیسی شکل وصورت اختیار کی ہے جو اس کے گروکی صحبت اور تربیت کا نتیجہ ہے تو اسے اس شکل وصورت کو یکسر ختم کرنا ہوگا کیوں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس طرح عورتوں کا روپ دھارنے والے پر لعنت فرمائی ہے، اور اگر وہ حقیقت میں عورت ہی ہے نیز گروکی مجلس نے اس کی نسوانیت کو دو آتشہ کر دیا ہے تب بھی اسے یہ کام ختم کرنا ہوں گے اور مسلمان عورتوں کی طرح چادر اور چاردیواری کا تحفظ کرنا ہوگا۔ تاہم احتیاط کا تقاضا ہے کہ حج کے لیے عورتوں جیسا احرام اختیار کرے یعنی عام لباس پہنے، اپنے چہرے کو کھلا رکھے تاہم اگر کوئی اجنبی سامنے آجائے تو گھونگھٹ نکالے جیسا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان کتب حدیث میں مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالتِ احرام میں ہوتیں اور قافلے ہمارے پاس سے گزرتے جب وہ ہمارے سامنے آتے تو ہم اپنی چادریں اپنے چہروں پر لٹکا لیتیں اور جب وہ گزر جاتے تو ہم انہیں اٹھا دیتیں۔ [ابوداؤد: مناسک ۱۸۳۳]

اس کے علاوہ محرم کی بھی پابندی ہے کہ وہ اپنے کس محرم کے ساتھ یہ مبارک سفر کرے، رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اس کی بیوی کے ساتھ سفر حج پر روانہ کیا تھا جبکہ وہ جہاد میں اپنا نام لکھوا چکا تھا، اس لیے سائل کو حج پر جانے کے لیے اپنے کسی محرم کا انتخاب بھی ضروری ہے، اسے اپنے کسی محرم کا پتہ نہیں جیسا کہ سوال میں بیان کردہ صورت حال سے واضح ہوتا ہے تو اسے چاہیے کہ چند ایسی عورتوں کی رفاقت اختیار کرے جن کے محرم ان کے ساتھ ہوں، اسے اجنبی عورتوں یا اکیلے مردوں کے ساتھ سفر کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

سوال اہلحدیث حضرات بھینس کا حلال ہونا قیامت تک قرآن وحدیث سے ثابت نہیں کر سکتے ہاں اگر فقہ حنفی کو تسلیم کر لیا جائے تو ہر مسئلہ بآسانی حل ہوسکتا ہے۔ (قاری رحمت اللہ، احمد پور خریداری نمبر ۵۳۳۵)

جواب فقہ حنفی منزل من اللہ نہیں ہے جس کا اتباع ضروری ہو اگر ایسا ہوتا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردانِ رشید امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی امام صاحب کی 1/3 حصے سے مخالفت نہ کرتے۔ مثلاً امام صاحب کے نزدیک بٹائی پر زمین لے کر کاشت کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح نومولود کا عقیقہ کرنا بھی ان کے نزدیک غیر مشروع ہے جبکہ صاحبین نے اپنے امام کی مخالفت

کرتے ہوئے ان کے جواز واستحباب کا فتویٰ دیا ہے۔قرآن کریم نے اس امت کو ''مَــا اُنْـزِلَ'' کی اتباع کا حکم دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:''لوگو! جو کچھ تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو،اس کے علاوہ دوسرے سر پرستوں کی پیروی نہ کرو۔'' [۷/الاعراف:۳]

اللہ تعالیٰ نے بطور شریعت دو ہی چیزیں نازل کی ہیں ایک قرآن اور دوسرا اس کا بیان یعنی احادیث رسول اللہ ﷺ ''مَـااُنْزِلَ''میں بھینس کی حلت اس طرح ہے کہ اس میں ان چیزوں کی نشاندہی کردی گئی ہے جو حرام ہیں مثلاً جانوروں میں سے وہ حرام ہیں جو نیش دار یعنی کچلی والے ہیں اور پرندوں میں وہ حرام ہیں جو چنگال دار یعنی پنجے سے شکار کرتے ہیں اور پنجے ہی سے پکڑ کر کھاتے ہیں،بعض حرام جانوروں یا پرندوں کا نام بھی لیا ہے مثلاً گھریلو گدھا،کتا اور کوا وغیرہ۔اسی طرح وہ جانور بھی حرام ہیں جنہیں مارنے کا حکم ہے مثلاً چھپکلی وغیرہ یا جنہیں مارنے سے منع کیا گیا ہے۔مثلاً بلی اور مینڈک وغیرہ،ان کے علاوہ جتنے بھی جانور یا پرندے ہیں سب حلال ہیں بھینس ان حرام جانوروں کی فہرست میں کسی طرح بھی داخل نہیں ہے اس بنا پر اس کے حلال ہونے میں کیا شبہ ہے اس کے لیے ہمیں مزعومہ فقہ حنفیہ کا سہارا لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے،اگر شریعت کی نظر میں فقہ حنفی کی اتنی ہی قدر و قیمت ہے تو حجۃ الوداع کے موقع پر تکمیل دین کا اعلان چہ معنی دار؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے اَسّی سال بعد پیدا ہوئے ہیں،اگر فقہ حنفی کا وہی مقام ہے جس کے لیے اس قدر زور صرف کیا جارہا ہے تو اسی سال تک دین نامکمل رہا جسے فقہ حنفی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا نعوذ باللہ ،اس فکر کو تسلیم کرلینے سے کیا نتائج برآمد ہوں گے،بہرحال ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن وحدیث ایک مکمل شریعت ہے جس کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہوئی،اسے کسی قسم کی پیوندکاری کی ضرورت نہیں ہے،اور یہ مکمل دین قیامت تک کے لیے ہے،ہمارے نزدیک دین اور شریعت کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا نصاً 'اشارۃ یا اقتضاءً قرآن وحدیث میں ذکر نہ ہو۔اگر کوئی ہے تو اسے پیش کیا جائے۔دیدہ باید۔

سوال فیصل آباد سے قاری محمد حبیب اللہ بسمل خریداری نمبر ۱۴۴۸ لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں آج کل نئے گروہ نے جنم لیا ہے جو اپنے ہاں ایک خودساختہ خلیفہ سے بیعت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔آپ سے استدعا ہے کہ خلیفہ برحق کی علامتیں اور شناخت سے آگاہ فرمائیں نیز بتائیں کہ اس کا تعین کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

جواب شرعی خلیفہ کے لیے مندرجہ ذیل علامتوں کا ہونا ضروری ہے۔

① وہ قریشی ہو بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ اقامت دین کے لیے سرگرم عمل ہو۔

② جسمانی اور علمی طور پر انتہائی مضبوط ہو۔

③ اللہ کی حدود کو عملاً نافذ کرنے کی اپنے اندر ہمت رکھتا ہو۔

④ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے میں بااختیار ہو۔

⑤ امت مسلمہ نے اسے اپنے ہاں شرف قبولیت سے نوازا ہو یعنی وہ خودساختہ نہ ہو۔

ایسا نہیں کہ کسی غیر ملک میں بیٹھ کر وہ سیاسی پناہ لے لے اور وہاں اپنی خلافت کا دعویٰ کردے اور اپنے قریشی ہونے کا اعلان

کر کے دیگر ممالک میں حصول بیعت کے لیے اپنے نمائندگان مقرر کردے، تاکہ بغاوت کی فضا سازگار کی جائے اور اس کے مقرر کردہ نمائندے شہروں اور دیہاتوں میں پھیل جائیں اور خود ساختہ خلیفہ کی بیعت لیتے پھریں۔ ہمارے نزدیک یہ کھلی بغاوت ہے جس کی شریعت ہمیں اجازت نہیں دیتی۔ حکومت وقت کو چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں کا سختی سے نوٹس لے، ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ کے منہج اور طریقہ کار کے خلاف ہے۔ ایسے پرفتن حالات میں زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے راہنمائی ملتی ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ ایسے حالات میں مسلمانوں کی جماعت اور ان کے امام سے چمٹے رہنا چاہیے'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی جماعت اور ان کا امام نہ ہو تو کیا کیا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ ایسے حالات میں تمام فرقوں سے الگ رہنا خواہ تمہیں جنگل میں درختوں کی جڑیں چبا کر ہی گزر اوقات کرنا پڑے تا آنکہ تمہیں اسی حالت میں موت آجائے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الفتن]

حدیث میں ہے کہ جب عبداللہ بن زیاد اور مروان بن حکم نے شام میں، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے مکہ مکرمہ میں اور خوارج نے بصرہ میں اپنی اپنی حکومتوں کا اعلان کیا تو ابو المنہال اپنے باپ کے ہمراہ حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ میرے باپ نے ان سے عرض کیا۔ اے ابو برزہ! آپ نہیں دیکھتے کہ لوگ کس قسم کے اختلاف میں الجھے ہوئے ہیں ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

آپ نے فرمایا کہ میں قریش کے لوگوں سے ناراض ہوں اور میری ناراضی اللہ کی رضا کے لیے ہے اور مجھے اس ناراضی پر اللہ تعالیٰ سے اجر ملنے کی امید ہے۔

عرب کے لوگو! تم جانتے ہو کہ تمہارا پہلے کیا حال تھا تم سب گمراہی میں گرفتار تھے، اللہ نے تمہیں دین اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے ذریعے اس بری حالت سے نجات دی پھر تم مقام عزت پر فائز ہوگئے۔ آج تمہیں اس دنیا نے خراب کر دیا ہے یہ سب بزعم خویش خلفا دنیا کے لیے آپس میں دست و گریبان ہیں اور ایک دوسرے سے قتال کر رہے ہیں۔

[صحیح بخاری: الفتن، ۷۱۱۲]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ آج ہمیں کتاب و سنت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہیے، جب کبھی حالات سازگار ہو جائیں کہ کتاب و سنت کے علمبردار باہمی اتحاد و اتفاق سے کسی با اختیار خلیفہ پر متفق ہو جائیں تو اس کی بیعت کے لیے تحریک چلانا مناسب اور باعث اجر و ثواب ہے لیکن کسی خود ساختہ خلیفہ جس کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں اور نہ ہی کسی نے اسے دیکھا ہے اس کی خلافت کے لیے بیعت لینا، فضا سازگار کرنا اور تحریک چلانا حکومت وقت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے جس کی شریعت ہمیں اجازت نہیں دیتی۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال نور پور سے حافظ مقصود احمد لکھتے ہیں کہ ایک شخص حدیث اور کتب حدیث پر اس طرح تنقید کرتا ہے کہ ان کی توہین کا پہلو نمایاں ہوتا ہے نیز وہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی صحابیت کا بھی منکر ہے اس کے علاوہ وہ کہتا ہے کہ اسلام میں پہلا اختلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ڈالا، کیا اس طرح کے عقائد رکھنے والے کو مسجد کا ممبر بنایا جا سکتا ہے، بالخصوص جبکہ اندیشہ ہو کہ یہ اپنے

فاسد عقائد ونظریات دوسرے نمازیوں میں بھی پھیلائے گا، ایسے شخص کے ساتھ تعلقات رکھنا شرعاً کیسا ہے کیا ایسے شخص کو سلام کرنا یا اس کے سلام کا جواب دینا درست ہے، کیا ایسے شخص کو زندیق کہا جا سکتا ہے۔ نیز زندیق کی شرعی طور پر سزا کیا ہے؟

جواب واضح ہو کہ دین اسلام کی بنیاد قرآن اور اس کے بیان (حدیث) پر ہے، بیان قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے، آپ نے اپنے فرمودات وارشادات اور سیرت وکردار سے قرآن کریم کی وضاحت اور تشریح کی ہے جو ہمارے پاس کتب حدیث کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن دور حاضر کے متجددین کتب حدیث کو ہدف تنقید بنا کر نہ صرف ان دفاتر حدیث کی توہین کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ سے وہ اعزاز بھی چھیننا چاہتے ہیں جو خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا ہے، دراصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کے ذریعہ قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اطلاق کی تقیید ان معتزلہ کو گوارا نہیں وہ صرف اپنی عقل عیار کو بنیاد بنا کر قرآن کریم کی تشریح کرنا چاہتے ہیں تاکہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ اس ضابطہ حیات کو اپنی من مانی تاویلات کی بھینٹ چڑھایا جا سکے۔ ان کے نزدیک حدیث اور کتب حدیث ایک ''عجمی سازش'' کا حصہ ہیں۔ صورت مسئولہ میں ایک ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا گیا ہے جو توہین رسالت کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تشتت واختلاف کا موجب گردانتا ہے، ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھیں تاآنکہ وہ کسی دوسری بات میں لگ جائیں۔'' [۴/النسآء:۱۴۰]

ایسے شخص کو کسی مسجد یا دینی جماعت کا ممبر بنانا جائز نہیں ہے۔ اس کے ساتھ تعلقات اصلاح احوال کے لیے تو رکھے جا سکتے ہیں لیکن جب اس قسم کے گندے جراثیم آگے منتقل ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے عضو کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے یعنی ایسے شخص سے روابط ختم کر لیے جائیں ایسے شخص کو سلام کرنے میں ابتدا نہیں کرنی چاہیے، البتہ اگر وہ سلام کہتا ہے تو اس کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ ایسا انسان زندیق اور ملحد ہے اور اسلامی حکومت میں ایسے شخص کی سزا قتل ہے اور اس قسم کی سزا کا نفاذ بھی اسلامی حکومت کا کام ہے۔

[واللہ اعلم]

سوال چکی، پنڈی گھیپ سے قاری عبدالرحمن صدیق خریداری نمبر ۵۸۸۷ لکھتے ہیں کہ عورتوں کے لیے سونے کے زیورات جائز ہیں یا نہیں، اس کے عدم جواز پر ہمارے بعض علما چند احادیث پیش کرتے ہیں وضاحت فرمائیں۔

جواب حدیث میں ہے کہ سونے کے زیورات مردوں کے لیے ناجائز ہیں جبکہ عورتوں کو اس کے پہننے کی اجازت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے مردوں کے لیے سونے اور ریشم کو حرام قرار دیا ہے اور عورتوں کو اس کے پہننے کی اجازت دی ہے۔'' [نسائی: الزینۃ ۵۲۶۷]

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ سے سونے کی بالیاں پہننے کے متعلق سوال ہوا تو آپ نے بایں الفاظ جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل عمومی فرمان کے پیش نظر عورتوں کے لیے سونا پہننا جائز ہے۔ ''کیا وہ جو زیورات میں پرورش پائے اور مباحثہ میں صاف صاف بات نہ کر سکے۔'' [۴۳/الزخرف:۱۸]

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے زیور کو عورت کے وصف کے طور پر بیان فرمایا کہ جو کہ سونے اور غیر سونے کے لیے عام ہے۔

[فتاویٰ برائے خواتین: ص ۲۷۵]

جن روایات میں سونے کے زیورات پہننے کے متعلق وعید آئی ہے ان سے مراد وہ زیورات ہیں جن کی زکوٰۃ نہ ادا کی گئی ہو جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس کے ہمراہ اس کی بیٹی بھی تھی جس کے ہاتھ میں سونے کے دو کنگن تھے، آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا تو اس کی زکوٰۃ دیتی ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تجھے یہ پسند ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے بدلے تمہیں آگ کے دو کنگن پہنائے۔'' یہ سن کر اس خاتون نے دونوں کنگن پھینک دیئے۔ [ابوداود: زکوٰۃ ۱۵۶۳]

اس کے علاوہ دیگر قرائن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ زمانہ نبوت میں خواتین زیورات استعمال کرتی تھیں جیسا کہ عید الفطر کے موقع پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی جھولی میں خواتین کی طرف سے زیورات ڈالنے کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بدوملہی سے چودہری بشیر احمد ملہی (خریداری نمبر ۲۲۴۴) لکھتے ہیں کہ غنیۃ الطالبین میں شعبان کی پندرھویں رات یعنی شب براءت کے متعلق لکھا ہے کہ اس رات آئندہ سال کی پیدائش واموات لکھی جاتی ہیں اور اس میں رزق بھی تقسیم ہوتا ہے، ہر سال ایسا ہوتا ہے جبکہ ہر انسان کی قسمت کا فیصلہ یعنی موت وحیات اور رزق وغیرہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے پہلے طے کر رکھا ہے، وضاحت فرمائیں اس کے علاوہ اس رات سو رکعت پڑھنے کے متعلق بھی لکھا ہے کہ ہر رکعت میں دس، دس مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھی جائے، اسے صلوٰۃ خیر کہتے ہیں، اس کا اہتمام کرنے سے برکت پھیلتی ہے، مزید فرمایا کہ ہمارے اسلاف اس نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھتے تھے، اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ستر بار نظر رحمت سے دیکھتا ہے اور ہر بار دیکھنے سے انسان کی ستر حاجتیں پوری ہوتی ہیں، اس کے متعلق تفصیل سے لکھیں۔

جواب قرآن کریم میں ہے: ''کہ ہم نے اس قرآن کو لیلہ مبارکہ یعنی خیر وبرکت والی رات میں نازل کیا ہے کیوں کہ ہمیں اس سے ڈرانا مقصود تھا، اس رات ہمارے حکم سے ہر معاملہ کا حکیمانہ فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔'' [۴۴/ الدخان: ۳، ۴]

اسی رات کو دوسرے مقام پر لیلۃ القدر کہا گیا ہے کہ اس رات کو بڑے اہم امور کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اس رات ملائکہ اور جبرائیل اپنے پروردگار کے اذن سے ہر طرح کا حکم لے کر اترتے ہیں۔'' [۹۷/ القدر: ۴]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس رات اللہ تعالیٰ افراد واقوام کی قسمتوں کے فیصلے کر کے انہیں نافذ کرنے کے لیے اپنے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے، پھر وہ سال بھر اللہ کے فیصلے کے مطابق عمل درآمد کرتے رہتے ہیں، احادیث میں اس رات کے متعلق صراحت ہے کہ ماہِ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں آتی ہے، مگر بعض ناقابلِ حجت روایات کی بنا پر انہیں دو الگ الگ راتیں قرار دیا گیا ہے۔ لیلۃ القدر سے مراد رمضان کے آخری عشرہ والی رات اور لیلۃ مبارکہ سے ماہِ شعبان کی پندرھویں رات مراد لی گئی ہے، جس کا نام شب براءت ہے، پھر ستم یہ ہے کہ جس قدر فضائل ومناقب لیلۃ القدر کے متعلق احادیث میں وارد ہیں، ان تمام کو شب براءت کے کھاتے میں ڈال کر اسے خوب رواج دیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ سے ماہِ شعبان کے متعلق یہ منقول ہے کہ آپ ﷺ اس مہینے کے روزے بکثرت رکھتے تھے، باقی اس رات آئندہ سال کی پیدائش واموات لکھی جانے والی بات سرے سے غلط

ہے، اگرچہ تفسیر ابن کثیر میں حضرت مغیرہ بن اخنس سے مروی ہے کہ اس رات شعبان سے شعبان تک لوگوں کی عمریں لکھی جاتی ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر:۴/۱۳۷]

لیکن اس کے متعلق آپ کا فیصلہ بھی مذکور ہے کہ یہ مرسل روایت صحیح نصوص کے خلاف ہے، بہرحال ہر انسان کی موت وحیات اور رزق وغیرہ کا فیصلہ لیلۃ القدر میں ہوتا ہے جو ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے، اگرچہ یہ فیصلے اللہ کی تقدیر میں پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں تاہم اللہ تعالیٰ سال بھر کے فیصلے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے تاکہ وہ انہیں اہل دنیا پر نافذ کریں۔ واضح رہے کہ اہل علم نے تقدیر کی چار اقسام بیان کی ہیں۔

① تقدیر ازلی: اس سے مراد اللہ کی وہ تقدیر ہے جو زمین وآسمان کی پیدائش سے پہلے تحریر کی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''کوئی مصیبت ملک پر یا خود تم پر نہیں آتی مگر اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں، وہ ایک خاص وقت میں لکھی ہوئی تھی۔ [۵۷/الحدید:۲۲]

② تقدیر عمری، یعنی عمر بھر کی تقدیر اس کی دو انواع ہیں:

(الف) عہد و پیمان کے وقت لکھی گئی تقدیر جس کے متعلق قرآن میں ہے ''جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کیوں نہیں! ہم سب گواہ بنتے ہیں تاکہ تم لوگ قیامت کے دن یوں نہ کہو کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے۔'' [۷/الاعراف:۱۷۲]

(ب) شکم مادر میں تقدیر عمری کا بیان حدیث میں ہے ''کہ قرار نطفہ کے چار ماہ بعد فرشتہ اس کی تقدیر کو لکھتا ہے'' قرآن میں ہے ''کہ وہ تمہیں خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔'' [۵۳/النجم:۳۲]

③ تقدیر حولی: جس میں سال بھر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ کام لیلۃ القدر میں سرانجام پاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

④ تقدیر یومی: ہر روز اس کے تازہ فیصلوں کا نفاذ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وہ ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے''۔ [۵۵/الرحمٰن:۲۹]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر روز کسی کو بیمار کر رہا ہے تو کسی کو شفایاب کر رہا ہے، کسی کو مالدار بنا رہا ہے تو کسی مالدار کو فقیر کر رہا ہے، کسی کو گدا سے شاہ اور شاہ سے گدا۔ الغرض کائنات میں یہ سارے تصرف اس کے امر اور اس کی مشیت سے ہو رہے ہیں۔ کائنات میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی کارگزاری سے خالی ہو۔ ماہِ شعبان کی پندرھویں رات کے متعلق جو صلوٰۃ خیر بیان کی جاتی ہے، اس کے متعلق ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں: ''شب براءت میں سو رکعت اور ہزار رکعت نماز باجماعت یا انفرادی طور پر اس کا ثبوت کسی بھی صحیح حدیث میں نہیں ہے''۔ ان کے متعلق دیلمی اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب موضوع اور خود ساختہ ہے۔ [تحفۃ الاحوذی:۲/۵۳]

بہرحال اس کے متعلق غنیۃ الطالبین کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ثبوت صحیح احادیث سے نہیں ملتا۔ [واللہ اعلم]

سوال ٹھٹھہ حسن سے محمد اسماعیل ربانی خریداری نمبر ۶۱۹۹ لکھتے ہیں کہ شب براءت کے متعلق وضاحت کریں کہ اس کی شریعت میں کیا حیثیت ہے، کیا اس دن روزہ رکھنا چاہیے۔

جواب بعض نا قابل حجت روایات کی بنا پر لیلہ مبارکہ سے مراد ماہ شعبان کی پندرھویں رات مراد لی گئی ہے جس کا نام لوگوں نے شب براءت رکھا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ جس قدر فضائل ومناقب لیلۃ القدر کے متعلق احادیث میں وارد ہیں ان تمام کو شب براءت کے کھاتے میں ڈال کر اسے خوب رواج دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے ماہ شعبان کے متعلق مندرجہ ذیل طرز عمل منقول ہے۔

☆ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ماہ شعبان میں بکثرت روزے رکھتے دیکھا ہے۔

[صحیح بخاری: الصوم ۱۹۶۹]

☆ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہِ شعبان کے پورے روزے رکھتے حتیٰ کہ اسے ماہِ رمضان سے ملا دیتے۔ [ابوداؤد: الصوم ۲۳۳۶]

شعبان کی پندرھویں تاریخ کو صرف ایک روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اسی طرح شب براءت کے قیام کی بھی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔

سوال شھداد پور سے حافظ اللہ وسایا لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں قرآن کریم کے پرانے اوراق اور مذہبی اخبار وجرائد کے جلانے پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بتائیے کہ ایسے اوراق کو کیا جائے تاکہ ان کی حرمت پامال نہ ہو۔

جواب واضح رہے کہ قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق اور قرآنی آیات پر مشتمل رسائل وجرائد کی حفاظت کے لیے ہمارے ہاں کئی ایک طریقے رائج ہیں۔ بعض مقامات پر دیکھا گیا ہے کہ لوگوں نے مقدس اوراق کے لیے قبرستان میں ایک جگہ مخصوص کی ہوتی ہے وہاں قرآن مجید کے پھٹے پرانے اوراق ڈال دیئے جاتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے بعض اوقات ان کی بہت بے حرمتی ہوتی ہے کیوں کہ بعض اوقات تیز ہوا چلنے سے کاغذ اڑ کر پلید جگہ پر گر جاتے ہیں بعض حضرات زمین میں گڑھا کھود کر اس میں دفن کر دیتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے بھی ان کی بے حرمتی کا خطرہ بدستور قائم رہتا ہے کیوں کہ کسی بھی وقت زمین پلید ہو سکتی ہے یا ان اوراق کو دیمک وغیرہ لگنے کا اندیشہ رہتا ہے بعض لوگ ان اوراق کا بنڈل بنا کر پانی میں پھینک آتے ہیں لیکن یہ کوئی محفوظ طریقہ نہیں ہے ہمارے نزدیک ان تمام صورتوں سے وہی صورت بہتر اور قابل عمل ہے جسے صحابہ کرام نے اپنایا وہ حضرات ان اوراق کو جلا کر ان کی راکھ کو پانی میں بہا دیتے تھے چنانچہ روایات میں ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی مختلف نقول تیار کر لیں تو جو مصاحف ان نقول کے مطابق نہیں تھے انہیں جلا دیا گیا۔ [صحیح بخاری]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس خیبر کے لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو جب جذباتی انداز میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا:

مصاحف کے جلانے کے متعلق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے کلمہ خیر ہی کہو انہوں نے یہ کام کر کے کوئی برا اقدام نہیں کیا۔

[فتح الباری: ج ۹، ص ۱۲]

حضرت مصعب بن سعد کا بیان ہے کہ جب ان مصاحف کو جلایا گیا تو بے شمار لوگ وہاں موجود تھے سب نے اس بات کو پسند

کیا کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔

حضرت ابن بطال کہتے ہیں اس حدیث سے ان کتابوں کے جلا دینے کا ثبوت ملتا ہے جن میں اللہ کا نام ہو کیوں کہ یہی ان کی حرمت کو محفوظ اور قدموں تلے آنے سے بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ [فتح الباری]

حضرت طاؤس اور حضرت عروہ کے متعلق روایات میں ہے کہ ان کے پاس جب ایسے خطوط جمع ہو جاتے جن میں بسم اللہ لکھی ہوتی تھی تو وہ انہیں جلا دیتے تھے۔ [مصنف عبدالرزاق]

ہمارے ہاں اس مسئلہ کو ایک جذباتی رنگ دے دیا جاتا ہے حالانکہ کسی بھی کلمہ گو مسلمان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان کی بے حرمتی کرتے ہوئے جلائے گا بلکہ ان کی حفاظت کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔

ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں کہ بعض حضرات بوسیدہ اوراق کے جلا دینے کو بہتر خیال کرتے ہیں کیوں کہ ایسا کرنے سے توہین اور بے حرمتی کے تمام پہلو ختم ہو جاتے ہیں نیز دھوکر ان کے حروف صاف کر دیئے جائیں تو لازماً اس پانی کو زمین پر بہانا ہوگا تو یہ اپنے اندر بے حرمتی کا پہلو رکھتا ہے بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ اس کے حروف کو دھوکر صاف کرنا بہتر ہے پھر پانی کو کسی پاکیزہ جگہ پر بہا دیا جائے۔ [مرقاۃ: ج ۵ ص ۲۹]

لیکن یہ اقدام موجودہ دور میں ناقابل عمل ہے کیوں کہ پریس کے ایجاد کے بعد اس کے حروف کو دھونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اس لیے ہماری ناقص رائے کے مطابق ان مقدس اوراق کا جلا دینا ہی بہتر ہے کیوں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں انہیں جلانے کا حکم دیا تھا اور یہی ان کے تقدس اور احترام کے مطابق ہے پھر ان کی راکھ کو پانی میں بہا دیا جائے یا اسے دفن کر دیا جائے اگرچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمل میں راکھ وغیرہ کو محفوظ کرنے کا ذکر نہیں ہے تاہم احتیاط کا یہی تقاضا ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے یا پانی میں بہا دیا جائے تاکہ لوگوں کی پامالی سے محفوظ رہے بہتر ہے کہ یہ کام عام لوگوں کے سامنے نہ کیا جائے بلکہ رات کے وقت سرانجام دیا جائے تاکہ لوگوں کے لیے کسی قسم کے اشتعال کا باعث نہ ہو۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال کراچی سے عبدالحمید لکھتے ہیں کہ سوموار اور جمعرات کے دن اعمال کی پیشی کے متعلق کوئی حدیث ہے، اس کے متعلق تفصیل درکار ہے۔

جواب سوموار اور جمعرات کے دن اللہ کے حضور اعمال پیش کیے جانے کا ذکر صحیح احادیث میں ملتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''کہ لوگوں کے اعمال ہر ہفتہ میں دو دفعہ یعنی سوموار اور جمعرات کے دن پیش کیے جاتے ہیں۔'' [صحیح مسلم: کتاب البر، باب النھی عن الشحناء]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔ اس کی وجہ دریافت کی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان ایام میں اللہ کے حضور اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ [مسند امام احمد: ۵/۲۰۰]

ترمذی کی روایت میں وضاحت ہے اس میں ہے ''کہ میں چاہتا ہوں کہ روزے کی حالت میں میرے اعمال کی پیشی ہو۔ (کتاب الصوم) ترمذی کی روایت میں ایک راوی محمد بن رفاعہ ہے جس کی محدث ابن حبان کے علاوہ کسی دوسرے محدث نے

توثیق نہیں کی ہے تاہم قرائن وشواہد کی وجہ سے یہ روایت درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہے۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی وجہ سے اسے ''حسن غریب'' کہا ہے بہر حال سوموار اور جمعرات کے دن اعمال پیش ہونے کی روایت بالکل صحیح ہے۔یہ ہفتہ وار رپوٹ ہے جو اللہ کے حضور پیش کی جاتی ہے۔

سوال کوہاٹ سے سیدنا در شاہ گیلانی پوچھتے ہیں کہ عورت کو اپنے دیور سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں،اگر کرنا چاہیے تو سورۃ النور میں ''اِلَّامَا ظَهَرَ مِنهَا'' کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بایں الفاظ کی گئی ہے کہ اس سے مراد عورت کا چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں،اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب پردے کی حکمت یہ ہے کہ معاشرے کو برائیوں سے پاک رکھا جائے لیکن پردے کی یہ علت نہیں ہے اس کی علت غیر محرم ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بتادیا ہے کہ کون محرم ہے جس سے پردہ نہیں اور کون غیر محرم ہے جس سے پردہ ضروری ہے،دیوران رشتہ داروں میں سے ہے جن سے پردہ فرض ہے اور اسے اللہ تعالیٰ نے محارم میں شمار نہیں کیا ہے۔حدیث میں یہ مسئلہ بہت وضاحت سے بیان ہوا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''کہ خبردار!عورتوں کے پاس تنہائی میں مت جاؤ''انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!دیور اور جیٹھ کے متعلق کیا ارشاد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''دیور تو موت ہے۔''
[صحیح بخاری:کتاب النکاح'حدیث نمبر۵۲۳۲]

ہم اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ شرعی احکام کی حکمتوں کو تلاش کریں کہ کہاں حکمت پائی جاتی ہے کہاں نہیں پائی جاتی۔البتہ یہ پابندی ضرور ہے کہ جہاں شرعی حکم کی علت پائی جائے اس پر عمل کیا جائے خواہ حکمت نظر آئے یا نہ آئے لہٰذا جو غیر محرم ہے اس سے پردہ فرض ہے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ پردے کا مدار دل کے جذبات پر نہیں ہے کہ اگر کسی کے متعلق پاکیزہ جذبات ہیں تو اس سے پردہ نہیں ہے۔دیکھیے ازواج مطہرات جوامت کی مائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ان کے متعلق جو پاکیزہ جذبات تھے وہ آج کسی میں بھی نہیں ہوسکتے۔اس کے باوجود ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے ان سے پردہ کیا چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:''اور جب تم ان(امہات المؤمنین رضی اللہ عنہن)سے کوئی سامان مانگو تو پردے کی اوٹ سے مانگو ایسا کرنے سے تمہارے اور ان کے دل زیادہ پاکیزہ رہیں گے۔'' [۳۳/الاحزاب:۵۳]

ان تصریحات کا تقاضا ہے کہ عورت کو اپنے دیور سے پردہ کرنا چاہیے،سوال کے دوسرے جزو کے متعلق ہماری گزارشات یہ ہیں کہ قرآن کا سیاق بایں طور ہے۔''اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہوجائے''۔ [۲۴/النور:۳۱]

اس آیت کا مفہوم بالکل صاف ہے کہ پردے کے متعلق ایک حکم امتناعی سے جس چیز کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ واضح ہے یعنی عورتوں کو خود اپنی آرائش وزیبائش کی نمائش نہیں کرنا چاہیے البتہ جو خود بخود ظاہر ہوجائے جیسے چادر کا ہوا سے اڑ جانا اور کسی زینت کا ظاہر ہوجانا یا خود ظاہر ہو جیسے وہ چادر جو زینت کو چھپانے کے لیے اوپر اوڑھی جاتی ہے اس کا چھپانا تو ممکن نہیں ہے،بہر حال وہ چادر عورت کے جسم پر ہے لیکن اس کے ظاہر ہوجانے یا ظاہر ہونے میں عورت کے ارادہ اور اختیار کو دخل نہیں،لہٰذا اس پر اللہ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں ہے،حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔(تفسیر ابن کثیر)شارع کا

مقصد یہ ہے کہ عورتوں کی نیت اظہار زینت کی نہیں ہونی چاہیے، ان میں یہ جذبہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی آرائش غیروں کو دکھاتی پھریں، انہیں اپنی طرف سے اخفائے زینت کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر کوئی زینت یا اس کا حصہ اضطراراً کھل جائے تو اس پر باز پرس نہیں ہوگی، عورتیں جن کپڑوں میں اپنی زینت کو چھپائیں گی وہ تو بہرحال ظاہر ہی ہوں گے، ان کا قد وقامت، ڈیل ڈول اور جسمانی تناسب تو ان میں محسوس ہوگا، ان تمام تحفظات کے باوجود اگر کوئی کمینہ نظر بد سے باز نہیں آتا تو وہ اپنی بدنیتی کی سزا خود بھگتے گا۔ اگرچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے کہ اس سے عورت کا چہرہ، ہاتھ اور انگوٹھی وغیرہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عورت اپنے منہ کو سرخی پاؤڈر اور سرمے سے، پھر اپنے ہاتھوں کو انگوٹھی، چھلے اور کنگن وغیرہ سے آراستہ کرکے لوگوں کے سامنے آئے اور انہیں دعوت نظارہ دے، آخر ظاہر ہونے اور ظاہر کرنے میں کھلا فرق ہے قرآن کریم واضح طور پر ظاہر کرنے سے منع کرکے صرف ظاہر ہونے کے معاملہ میں رخصت دے رہا ہے اس رخصت کو ظاہر کرنے کی حد تک وسعت دینا شارع کے منشا کے بالکل خلاف ہے، حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت پردہ (۳۳/الاحزاب:۵۳) کے نازل ہونے سے پہلے کی حالت بیان کی ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۃ احزاب آیت نمبر ۵۹ کی تفسیر بایں الفاظ مروی ہے ''کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی خواتین کو حکم دے رہا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے اپنے گھروں سے نکلیں تو اپنے چہروں کو اپنے سر کی چادر سے ڈھانپ لیں راستہ دیکھنے کے لیے صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں۔'' [تفسیر ابن کثیر: سورۃ احزاب آیت:۵۹]

اس کے باوجود اگر کسی کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر سے اپنی مطلب برآری کشید کرنے پر اصرار ہو تو بھی اس سے کچھ زیادہ فائدہ اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے مقابلہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر موجود ہے، ایسی صورت حال میں ضروری ہے کہ دونوں اصحاب کی تفسیر سے ایک کو دلائل اور خارجی قرائن سے ترجیح دی جائے پھر جو تفسیر راجح قرار دیں اس پر عمل کیا جائے۔

بہرحال یہ بات دلائل سے ثابت ہے کہ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حکم حجاب آجانے کے بعد اہل ایمان خواتین کھلے منہ نہیں پھرتی تھیں اور حجاب کے حکم میں منہ کا پردہ شامل تھا اور احرام کے علاوہ دوسری تمام حالتوں میں نقاب کو عورتوں کے لباس کا ایک جزو بنا دیا گیا۔ آخر میں ہم ہر اس مؤمن عورت کو پیغام دینا چاہتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی سچے دل سے پابند رہے اور موجودہ ننگی تہذیب کے کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو اور یہ بات ذہن میں رہے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کی نمائش کرنا یا لوگوں کو دعوت نظارہ دینا شارع کا منشا ہرگز نہیں ہے۔

سوال کرتا پور سے خلیل الرحمٰن سوال کرتے ہیں عورتوں کا جلسہ کرنا پھر اس میں کسی عورت کا تقریر کرنا شرعاً کیسا ہے۔ اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔

جواب دعوت وتبلیغ ہر مسلمان مرد وزن کا حق ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''مؤمن مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں''۔ [۹/التوبہ:۷۱]

اس آیت کریمہ میں اہل ایمان خواتین وحضرات کی یہ خوبی بیان کی گئی ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں جس طرح مرد کو اچھی بات کہنے اور بری بات سے روکنے کا حق ہے اسی طرح عورت بھی اس حکم کی پابند ہے کہ وہ اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے دوسروں کو منع کرے، صدر اول میں وعظ وتبلیغ کے لیے موجودہ اجتماعات کا طریقہ رائج نہ تھا کہ باقاعدہ جلسہ اور کانفرنس کا اہتمام کیا جاتا ان کا جواز بھی قرآن وحدیث کی عمومی نصوص سے ہے عورتوں کا جلسہ کرنا اور اس میں کسی مبلغہ خاتون کا تقریر کرنا بھی اسی قبیل سے ہے البتہ خواتین کے لیے درج ذیل شرائط ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

① عورت جب گھر سے نکلے تو باپردہ ہو اور مہکنے والی خوشبو استعمال نہ کرے۔

② اپنے سرپرست یا خاوند کی اجازت سے اجتماع میں شریک ہو۔

③ تبلیغی اجتماع اگر گھر سے دور ہو تو ایسے سفر پر نکلنے کے لیے اپنے محرم کو ساتھ لے کر جائے۔

④ تقریر کا انداز بالکل سادہ اور فطرتی ہو۔ موجودہ رائج الوقت نقالی اور راگ سے اجتناب کرے۔

⑤ مقررہ جب تقریر کے لیے آئے تو آرائش ونمائش سے مبرا ہو کر آئے۔

⑥ اجتماع صرف خواتین کا ہو اس میں کسی پہلو سے بھی مردوں کا اختلاط نہ ہو۔

ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے خواتین دعوتی اور اصلاحی پروگرام منعقد کرسکتی ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال بھائی پھیرو (پھول نگر) سے رب نواز لکھتے ہیں کہ سکول میں ایک واٹر پمپ سرکاری فنڈ سے لگایا گیا، کچھ رقم سکول کے بچوں نے خرچ کی ہے البتہ بجلی کا بل بچوں کے فنڈ سے ادا کیا جاتا ہے۔ کیا اوقات تعلیم میں اساتذہ اور اوقات تعلیم کے علاوہ دیگر ملازمین اس پانی کو استعمال کرسکتے ہیں؟۔

جواب واضح رہے کہ صورت مسئولہ میں یہ واٹر پمپ رفاہ عامہ کے ضمن میں آتا ہے۔ اس لیے اوقات تعلیم میں اساتذہ اور اس کے علاوہ دیگر سرکاری ملازمین اسے استعمال کرسکتے ہیں بشرطیکہ اس کے استعمال سے بچوں کی ضروریات متاثر نہ ہوں، جن کے لیے وہ واٹر پمپ لگایا گیا ہے جیسا کہ رفاہِ عامہ کی دوسری چیزیں ان کے استعمال میں آتی ہیں، اگر پانی ضرورت سے زائد ہو تو عامۃ الناس بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔ اس میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔

سائل کی حساس طبیعت کے پیش نظر یہ عرض کرنا ہم اپنی ذمہ داری خیال کرتے ہیں کہ جب زندگی میں پیش آمدہ چھوٹے چھوٹے مسائل کے متعلق ہم شریعت سے راہنمائی لیتے ہیں تو بڑے بڑے مسائل کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، اس پر فتن دور میں استاد کی شخصیت انتہائی اہم کردار کی حامل ہے، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ نونہالان قوم کی اس نہج پر تربیت کرے کہ مستقبل میں یہ ملک وملت کے لیے دینی اور دنیاوی طور پر صحیح راہنما بن سکیں۔ خودغرضی اور مفاد پرستی کے بت کو یہ ہمیشہ کے لیے پاش پاش کردیں، اس کے علاوہ سکول کی چاردیواری کے اندر جو شرعی پابندی ہوسکتی ہے اس کی طرف خصوصی توجہ دی جائے کیوں کہ آپ ان کے پاسبان ہیں اور قیامت کے دن اس پاسبانی کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

سوال صوبہ بلوچستان سے عبدالرحمٰن کھوسہ لکھتے ہیں کہ:

① دست شناسی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے۔

② کیا ٹوٹے ہوئے برتن کو چاندی کی تار سے جوڑا جاسکتا ہے۔

③ بوقت ضرورت غیر مسلم کے برتن استعمال کرنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے۔

جواب کپڑا یا ہاتھ دیکھ کر یا زائچہ بنا کر یا مریض سے اس کا اور اس کی والدہ کا نام پوچھ کر یا کتاب کھول کر غیب کی خبریں دینے والے کو عربی زبان میں عراف یا کاہن کہتے ہیں، ان کے پاس جا کر ان سے معلومات لینا اور ان کی تصدیق کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے ''کہ جو شخص کسی غیب کی خبریں بتانے والے کے پاس گیا اور اس سے کچھ پوچھا تو اس کی چالیس راتوں کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی''۔ [صحیح مسلم: کتاب الصوم]

نیز رسول اللہ ﷺ نے اس کی شناعت بایں الفاظ بیان کی ہے ''کہ جو شخص کسی کاہن کے پاس گیا اور اس کی بات کو سچ سمجھا تو اس نے گویا ان تعلیمات کا انکار کر دیا جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئیں'' بعض روایات میں ہے کہ وہ تعلیمات نبوی ﷺ سے بیزار ہو گیا۔ [مسند امام احمد: ۲/۴۰۸]

غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے ایک مسلمان کو ان کے پاس جا کر اپنے ایمان و اخلاق اور غیرت و عزت کو نیلام نہیں کرنا چاہیے۔

(ب) سونے اور چاندی کے برتنوں میں خورد و نوش کی شرعاً ممانعت ہے کیوں کہ ان کے استعمال میں تکبر کا عمل دخل ہوتا ہے یہ کبر و نخوت خالق کائنات کو پسند نہیں ہے، اس لیے ان کا استعمال ناجائز قرار دیا گیا ہے، البتہ شکستہ برتن کو چاندی کے تار سے پیوستہ کر کے استعمال کرنے کی شرعاً اجازت ہے، کیوں کہ اس میں کبر و غرور کو عمل دخل نہیں ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک نضار نامی لکڑی کا پیالہ ٹوٹ گیا تو آپ ﷺ نے اس ٹوٹی جگہ پر چاندی کا تار لگوا دیا تھا۔

[صحیح بخاری: کتاب الاشربہ حدیث نمبر ۵۶۳۸]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے پیش نظر ٹوٹے برتن کو چاندی کی تار سے جوڑا جاسکتا ہے۔

(ج) غیر مسلم یہود و نصاریٰ اکثر اوقات اپنے برتنوں میں خنزیر کا گوشت پکاتے ہیں اور ان میں شراب بھی پیتے ہیں، جیسا کہ مسند امام احمد وغیرہ میں اس کی وضاحت ہے، اس بنا پر رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے برتن استعمال کرنے میں تردد پیدا ہوا تو انہوں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ ہاں اگر ان کے علاوہ کوئی برتن نہ ملے تو پھر انہیں دھو کر استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الذبائح، حدیث نمبر ۵۴۹۶]

اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم کے برتنوں میں خورد و نوش سے اجتناب کرنا چاہیے تاوقتیکہ ان کے استعمال کرنے میں اضطراری حالت پیش نہ آئے، مجبوری کے وقت ان کے دھونے پر اعتماد کیا جائے بلکہ خود انہیں دھو کر استعمال کیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال صوبہ بلوچستان سے عبدالرحمٰن کھوسہ (خریداری نمبر ۱۳۴۱) لکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں چڑیوں کی بہتات ہے، کیا ان کا شکار کرنا جائز ہے؟۔

جواب قرآن کریم کے مطابق ہر پاکیزہ چیز ہمارے لیے حلال ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کچھ حلال ہے، آپ کہہ دیں کہ تمام پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں۔ [۵/المائدۃ:۴]

دوسرے مقام پر فرمایا: ''کہ ہر خبیث چیز حرام ہے جیسا کہ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کے اوصاف میں سے ہے کہ وہ ہر پاکیزہ چیز کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں''۔ [۷/الاعراف:۱۵۷]

قرآن کریم نے ہر اس چیز کو کھانے کی اجازت دی ہے جو حلال اور پاکیزہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ پیئو''۔ [۲/البقرہ:۱۷۲]

قرآن کریم میں جو چیزیں حرام ہیں۔ ان کا ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

1. بعض چیزوں کا نام لے کر انہیں حرام کہا گیا ہے۔
2. نیش دار حیوانات حرام ہیں۔
3. پنجے سے شکار کر کے پنجے کے ساتھ کھانے والے پرندے حرام ہیں۔
4. جن جانوروں کو قتل کرنے کی اجازت ہے وہ بھی حرام ہیں۔
5. جنہیں مارنے سے منع کیا ہے وہ بھی حرام ہیں۔

چڑیا کسی لحاظ سے مذکورہ ضابطہ میں نہیں آتی۔ لہٰذا اس کے شکار کرنے اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر احادیث میں ان کے متعلق وضاحت بھی وارد ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے: ''جو شخص کسی فائدہ کے بغیر چڑیا کو مارتا ہے قیامت کے دن اس سے باز پرس ہوگی۔'' [مسند امام احمد:۲/۱۶۶]

اس کا مطلب یہ ہے کہ محض نشانہ پکانے کے لیے چڑیا کو مارنا درست نہیں ہے بلکہ اسے ذبح کر کے اپنے استعمال میں لانے کی نیت سے شکار کیا جائے۔ [مسند امام احمد:۴/۳۸۹]

اس کے متعلق ایک اور چیز کا خیال رکھنا ہوگا کہ ہم لوگ ذبح کر کے اس کی گردن اتار کر پھینک دیتے ہیں اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ چڑیا کو ذبح کر کے اس کا حق ادا کرنا چاہیے۔'' آپ سے سوال کیا گیا کہ اس کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اسے ذبح کر کے اس کے سر کو استعمال میں لانا اس کا حق ہے۔'' [مسند امام احمد:۶۸۶۱]

علامہ احمد شاکر نے ابوطیالسی کے حوالے سے مزید وضاحت نقل فرمائی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں: ''اس کا حق یہ ہے کہ اسے ذبح کیا جائے اور اس کی گردن اتار کر پھینکی نہ جائے۔ [مسند امام احمد:۶۵۵۱]

بعض اوقات جلدی میں چھری وغیرہ کے زیادہ تیز ہونے کی صورت میں ذبح کرتے وقت گردن الگ ہو جاتی ہے، اس قسم کی اضطراری حالت کے پیش نظر جانور یا پرندہ حلال ہے اس کے کھانے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال لاہور سے محمد بشیر لکھتے ہیں کہ جب کسی شہر میں سربراہ مملکت یا کسی بڑے سیاسی راہنما کی آمد ہوتی ہے تو جگہ جگہ 50 × 30 سائز کی تصاویر لگائی جاتی ہے، ان کی شرعی حیثیت کے متعلق آگاہ فرمائیں۔

جواب آج امتِ مسلمہ جن فتنوں میں بڑی شدت سے مبتلا ہے، ان میں ایک فتنہ تصویر بھی ہے، حالانکہ دینِ اسلام میں تصویر کشی کی بہت حوصلہ شکنی کی گئی ہے، قبل از اسلام بت پرستی کے عام ہونے میں جو عوامل کارفرما تھے ان میں تصویر سرفہرست ہے، چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما قوم نوح میں بت پرستی کا پس منظر بایں الفاظ بیان کرتے ہیں: حضرت نوح علیہ السلام نے جب اپنی قوم میں وعظ و تبلیغ کا آغاز فرمایا تو ان کی قوم نے ردِعمل کے طور پر کہا: ''تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور ود، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر کو بھی نہ چھوڑنا''۔ [۷۱/نوح:۲۳]

یہ پانچوں قوم نوح میں نیک آدمیوں کے نام تھے، جب فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کے عقیدت مندوں کو کہا کہ ان کی تصویریں بنا کر اپنے گھروں اور دکانوں میں رکھ لو تاکہ ان کی یاد تازہ رہے، اور ان کے تصور سے تم بھی ان کی طرح نیکیاں کرتے رہو، جب تصویر بنا کر رکھنے والے مر گئے تو شیطان نے دوسروں کو یہ کہہ کر شرک میں ملوث کر دیا کہ تمہارے باپ دادا تو ان کی عبادت کرتے تھے، جن کی تصاویر تمہارے گھروں میں لٹک رہی ہیں، چنانچہ انہوں نے ان کی پوجا شروع کر دی پھر ان کی اتنی شہرت ہوئی کہ عرب میں بھی ان کی پوجا ہونے لگی، دومۃ الجندل میں قبیلہ کلب کا سواع، ساحل بحر پر قبیلہ ہذیل کا یغوث، سبا کے قریب قبیلہ مراد اور بنو غطیف کا یعوق، قبیلہ ہمدان کا ود اور نسر قوم حمیر کے قبیلہ ذوالکلاع کا معبود رہا۔ [صحیح بخاری: تفسیر، ۴۹۲۰]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شناعت کو بایں الفاظ بیان فرمایا:

① ''جس گھر میں کتا اور تصاویر ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں جاتے۔'' [صحیح بخاری: اللباس، ۵۹۴۹]

② قیامت کے دن تصویر بنانے والے سخت ترین عذاب سے دوچار ہوں گے۔ [صحیح بخاری: اللباس، ۵۹۵۰]

③ جو تصویریں بناتے ہیں انہیں قیامت کے دن اپنی تخلیقات میں روح ڈالنے کے متعلق کہا جائے گا بصورت دیگر انہیں المناک سزا دی جائے گی۔ [صحیح بخاری: اللباس، ۵۹۵۱]

④ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر بنانے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ [صحیح بخاری: اللباس، ۵۹۶۲]

صورت مسئولہ میں سیاسی راہنماؤں کی قد آور تصاویر آویزاں کرنا انتہائی گھناؤنا فعل ہے، علما حضرات بھی اس فتنہ میں پوری طرح ملوث ہیں، اضطراری اور مجبوری کی بات زیر بحث نہیں کیوں کہ بوقت ضرورت تو خنزیر اور مردار بھی کھایا جا سکتا ہے، اگرچہ اس کی بھی حدود و قیود ہیں، تاہم پاسپورٹ، شناختی کارڈ اور کرنسی نوٹوں کی آڑ میں شوقیہ تصاویر کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سوال کراچی سے عبدالقدوس سوال کرتے ہیں کہ زینت اور تفریح طبع کے طور پر پرندوں کو پنجروں میں بند رکھنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے۔

جواب جب پرندوں سے اچھا برتاؤ کیا جائے اور ان کے دانے دنکے کا اہتمام کیا جائے تو انہیں گھر میں زینت یا تفریح طبع کے طور رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: ''حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ایک ابو عمیر نامی مادری بھائی تھا جس نے گھر میں نغیر نامی پرندہ رکھا تھا جو کسی وجہ سے مر گیا تو ابو عمیر بہت پریشان ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر جاتے تو ابو عمیر سے مخاطب ہو کر فرماتے: ''اے ابو عمیر! نغیر کو کیا ہوا۔'' [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۶۲۰۳]

بخاری میں وضاحت ہے کہ ابو عمیر رضی اللہ عنہ نے یہ پرندہ محض تفریح طبع کے لیے رکھا تھا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے ساٹھ سے زیادہ مسائل کا استنباط کیا ہے۔ چند ایک درج ذیل ہیں۔

☆ بچوں کا دل بہلانے اوران کی تفریح طبع کے لیے مال خرچ کرنا جائز ہے۔

☆ پرندوں کو تفریح کے طور پر گھر میں رکھا جاسکتا ہے، اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) انہیں پنجروں میں بند کر دیا جائے۔

(ب) ان کے پر کاٹ دیئے جائیں۔

دونوں صورتیں جائز ہیں بشرطیکہ ان کی خوراک کا اہتمام کیا جائے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حدیث میں حیوانات کو تکلیف دینے کی ممانعت ہے۔ لہٰذا پرندوں کو اس طرح بند رکھنا جائز نہیں بلکہ منسوخ ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب دیا ہے کہ بچوں کے لیے دل بہلاوے کے طور پر گھر میں پرندوں کا رکھنا جائز ہے۔ البتہ انہیں تنگ کرنے کے لیے رکھنا جائز نہیں۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ان کی خوراک اور پانی وغیرہ کا اہتمام نہ کیا جائے جیسا کہ حدیث میں ہے ''کہ ایک عورت کو صرف اس لیے عذاب دیا گیا کہ اس نے گھر میں بلی کو باندھ رکھا تھا نہ تو اسے خوراک مہیا کرتی اور نہ ہی اسے آزاد کرتی تا کہ وہ خود اپنی خوراک کا اہتمام کر لے۔'' [فتح الباری:۱۰/۷۱۸]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ چھوٹے بچوں کی تفریح طبع یا گھر کی زینت کے لیے پرندوں کو گھر میں رکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔

سوال خانیوال سے محمد علی دریافت کرتے ہیں کہ سانپ حلال ہے یا حرام نیز سمندری سانپ کے متعلق کیا حکم ہے؟ عام مشہور ہے کہ سانپ کا سر الگ کر کے باقی حصہ کھایا جاسکتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟۔

جواب سانپ کی حلت وحرمت کے متعلق صریح طور پر کسی حدیث میں ذکر نہیں ہے، البتہ حلال وحرام کے متعلق جو عام شرعی اصول ہیں، ان کی رو سے سانپ حرام معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سانپ کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری) نیز محرم آدمی پر اس کے قتل کرنے کا کوئی فدیہ نہیں ہے۔ (صحیح مسلم) اسے موذی جانوروں میں شمار کیا گیا ہے۔

اس لیے اس کی ایذا رسانی کی بنا پر اسے مار ڈالنے کا حکم اس کے حرام ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، اگرچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس کی حلت منسوب ہے۔ [مغنی:۸/۶۰۵]

تاہم دیگر ائمہ کرام نے ان سے اتفاق نہیں کیا، البتہ سمندری سانپ کا حکم اس سے الگ ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سمندری جانوروں کو حلال قرار دیا ہے، اس لیے اگر کسی جانور کی زندگی کا دارومدار پانی اور پانی میں رہنا ہے تو اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ سانپ کی گردن اتار کر باقی حصہ استعمال کرنا ایک خود ساختہ مسئلہ ہے۔ احادیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

سوال ملتان سے ایک خاتون سوال کرتی ہے کہ عورت کو سر کے بال کالے کرنا جائز ہے یا نہیں، اگر کالے کرنے کی اجازت ہے تو کس چیز کو استعمال کیا جائے؟ یا صرف سرخ مہندی ہی لگائی جائے؟ تفصیل سے جواب دیں۔

جواب عورت کے بال اس کی خوبصورتی ہے،ان پر توجہ دینا اور ان کی اصلاح وآراستگی شریعت کے دائرہ میں کی جاسکتی ہے،اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل ہدایات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

① بال اگر سفید ہیں تو انہیں مہندی یا زعفران سے رنگا جاسکتا ہے،لیکن انہیں سیاہ کرنا جائز نہیں ہے۔محدثین نے سفید بالوں کو سیاہ کرنا کبیرہ گناہوں سے بتایا ہے،ایسا کرنے سے انسان اللہ کی رحمت سے محروم ہوجاتا ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:"اللہ تعالیٰ جوانی کے بعد کمزوری اور بڑھاپے کا دور لاتا ہے"۔(الروم) بالوں کو سیاہ کرنا قدرت کی اس نشانی کو گم کرنے کے مترادف ہے،پھر ایسا کرنا دھوکہ اور فریب بھی ہے جس سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔اس کی ممانعت کے متعلق متعدد احادیث کتب احادیث میں مروی ہیں،اختصار کے پیش نظر ہم صرف ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں۔

☆ فتح مکہ کے دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد گرامی حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا،جب کہ ان کے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید ہوچکے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"کہ اس سفیدی کو تبدیل کرو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔" [صحیح مسلم:کتاب اللباس]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امر وجوب کے لیے ہے جس کی خلاف ورزی حرام ہے،علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں"کہ سیاہ رنگ کا خضاب حرام ہے۔" [شرح نووی:۲/۱۹۹]

☆ بالوں کی زیبائش وآرائش اور جمال وزینت صرف خاوند کے لیے ہونی چاہیے،اس کے علاوہ دیگر غیر محارم کے سامنے ان کی نمائش کرنا حرام ہے،عورت کے بال اس کے ستر میں شامل ہیں،لہٰذا دورانِ نماز انہیں ڈھانپنا ہوگا خواہ گھر میں صرف خاوند ہی کیوں نہ ہو،حتیٰ کہ والد اور بھائیوں کے سامنے بھی ان کا کھولنا جائز نہیں ہے۔

☆ بالوں کی خوبصورتی کے لیے بیوٹی پارلروں میں جانا بھی درست نہیں ہے،کیوں کہ وہاں کام کرنے والے مرد یا کافر عورتیں بھی ہوتی ہیں،جن کے سامنے بالوں کا کھولنا جائز نہیں ہے،عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے بالوں کی آرائش اپنے گھر میں رہ کر کرے۔

☆ بالوں کا فطری رنگ سیاہ ہے،اس فطری رنگ کو ڈائی کرانا اور سنہری یا دوسرے رنگوں میں انہیں تبدیل کرنا فطری حسن کو تبدیل کرنا ہے،جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے،صرف سفید بالوں کو سیاہ رنگ کے علاوہ سرخ یا زعفرانی رنگ کرنا جائز ہے۔

☆ سفید بالوں کو چھپانے کے لیے سیاہ وگ استعمال کرنا بھی درست نہیں ہے،حدیث میں بالوں کے ساتھ دوسرے بالوں کا پیوند کرنا باعث لعنت عمل بتایا گیا ہے،اس جدید دور میں وگ کا استعمال متبادل ہے،لہٰذا باحیا اور اہل ایمان خاتون کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال لاہور سے عطاء الرحمٰن لکھتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شافعی المسلک تھے اور اپنی صحیح بخاری میں انہوں نے اسی مسلک کی ترجمانی کی ہے،اس کے متعلق وضاحت فرمائیں۔

جواب امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فقہی فروعات اور اجتہادی مسائل میں دنیا کے مروجہ مسالک سے بالکل آزاد ہیں،وہ تو مروجہ طریقہائے فکر سے کسی کے بھی پابند نہیں،ان کی مایۂ ناز تصنیف الجامع الصحیح اس وقت ہمارے سامنے ہے،جسے جملہ مکاتب فکر کے ہاں پڑھا،پڑھایا جاتا ہے،یہی وہ پاکیزہ نوشتہ ہے جس سے ہمیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کا پتہ چلتا ہے،ایمان وعلم،عبادات ومعاملات،معاشیات واخلاقیات،تعلقات ومحاربات اور بدعات سے اجتناب جیسے اہم گوشے اس کی وسعت میں سمو دیئے گئے

ہیں، اس میں شک نہیں کہ امام بخاری نے نواقضِ وضو کے متعلق عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''جو مخرجین یعنی قبل اور دُبر کے علاوہ کسی اور چیز کو ناقضِ وضو نہیں مانتے'' ناقضِ وضو کے متعلق نہ پورے طور پر شوافع سے متفق ہیں اور نہ ہی ہمہ وجوہ سے مالکیہ کے ہم نوا ہیں اور نہ ہی کلی طور پر آپ نے احناف کی مخالفت کی ہے، بلکہ اس سلسلہ میں مستقل طور پر ان کی اپنی رائے ہے، امام بخاری قے، نکسیر، خون اور پیپ وغیرہ کے نکلنے سے احناف کے مخالف ہیں اور عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جانے کے متعلق وہ شوافع کی مخالفت کرتے ہیں، اسی طرح اگر مخرجین سے کوئی کیڑا وغیرہ برآمد ہو تو وضو ٹوٹے گا یا نہیں؟ اس کے متعلق وہ موالک کی مخالفت کرتے ہیں الغرض وہ کلی طور پر احناف، موالک اور شوافع میں سے کلی طور کسی کے ساتھ متفق نہیں ہیں، بلکہ وہ صاحب اجتہاد ہیں، متعدد مقامات پر انہوں نے شوافع کی تردید فرمائی ہے، جس کی وضاحت حسب ذیل ہے:

① شوافع کا موقف ہے کہ زکوٰۃ جہاں سے وصول کی جائے وہاں کے فقرا میں اسے تقسیم کیا جائے، دوسری جگہ اسے تقسیم کرنا ان کے ہاں درست نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے ایک عنوان یوں قائم کیا ہے: ''اغنیا سے صدقہ لے کر فقرا کو دیا جائے خواہ وہ کہاں کے رہنے والے ہوں''۔

② شوافع کا خیال ہے کہ زکوٰۃ ان تمام مصارف پر خرچ ہونی چاہیے جن کا ذکر قرآن حکیم میں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ پابندی صحیح نہیں ہے، اگر ضرورت ہو تو پوری زکوٰۃ ایک مصرف پر بھی خرچ کی جاسکتی ہے، آپ نے ایک عنوان قائم کیا ہے ''صدقہ کے اونٹ اور ان کا دودھ صرف ابناء السبیل پر استعمال کرنا۔''

③ شوافع کے نزدیک جمعہ کے لیے کم از کم چالیس آدمیوں کا اجتماع ضروری ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صرف بارہ آدمیوں کے ہمراہ نماز جمعہ ادا فرمائی۔ یہ موقف شوافع کے خلاف ہے۔

④ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سر کے مسح کے متعلق کسی قسم کی تحدید نہیں ہے، ان کے نزدیک سر کے کسی بھی حصہ کا مسح فرض کی ادائیگی کے لیے کافی ہے، خواہ اس کی مقدار ایک یا دو بال ہی کیوں نہ ہو، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پورے سر کا مسح کرنا ضروری ہے، انہوں نے اس کے متعلق ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے ''پورے سر کا مسح کرنا۔''

اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دیگر مسالک سے بھی اختلاف کیا ہے۔ بخاری کے طالب علم پر یہ بات مخفی نہیں ہے۔

⑤ حنابلہ کا مشہور مسلک ہے کہ جمعہ قبل زوال بھی درست ہے، لیکن حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے ایک عنوان یوں قائم کیا ہے: ''جمعہ کے وقت کا آغاز زوال آفتاب سے ہوتا ہے''۔

⑥ حیوانات کے سور اور ان کی حلت و حرمت کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے موالک کے مشہور مسلک کی مخالفت فرمائی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح بخاری میں ایک خاص مسلک کو اختیار فرمایا ہے جس کی بنیاد صرف کتاب وسنت ہے۔ مذاہب اربعہ سے کسی کی موافقت یا مخالفت کا انحصار دلیل پر ہے۔ اس لیے ان کی شافعیت یا حنبلیت کا دعویٰ صرف خوش فہمی ہے، صحیح بخاری کے مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے۔

سوال کاموں کی سے محمد یوسف سوال کرتے ہیں کہ میرے ایک بیٹے کے ہاں اولاد نہیں ہے جبکہ دوسرے بیٹے نے اپنی نوزائیدہ

بچی میرے لاولد بیٹے کو دے دی ہے کیا یہ بیٹا لے پالک بیٹی کی ولدیت میں اپنا نام لکھوا سکتا ہے یا نہیں۔

جواب دورِ جاہلیت میں جو مسائل اصلاح طلب تھے، ان میں سے ایک گود لینے یا بیٹا بنانے کا مسئلہ بھی تھا۔عرب کے لوگ جس بچے کو لے پالک بنا لیتے تھے اسے بالکل حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا، اسے وراثت بھی ملتی تھی، اس کی نسبت بھی حقیقی باپ کی بجائے منہ بولے باپ کی طرف کی جاتی ہے، اس کے ساتھ منہ بولی ماں اور منہ بولی بہن وہی خلا ملا رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور حقیقی بھائی سے رکھا جاتا تھا، یہ رسم قدم قدم پر نکاح، طلاق اور وراثت کے ان قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے تھے۔یہ رسم حقیقی وارثوں کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو حق دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا اور جن مردوں، عورتوں کے درمیان رشتہ نکاح حلال تھا یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ نقصان تھا کہ اسلامی قانون جن بداخلاقیوں کا دروازہ بند کرنا چاہتا تھا یہ رسم ان کے فروغ میں مددگار تھی کیوں کہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کر دیا جائے بہرحال وہ حقیقی رشتے کی طرح نہیں ہو سکتا، اس مصنوعی رشتے کے تقدس پر بھروسہ کر کے جب مردوں اور عورتوں کے درمیان حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو وہ برے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے اسلام نے لے پالک اولاد کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیل کا قطعی استیصال کیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید کو زید بن محمد کہتے تھے حالانکہ وہ حارثہ کے بیٹے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس رسم کی بایں الفاظ اصلاح فرمائی: ''اور اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا ہے، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم اپنے منہ سے نکال دیتے ہو''۔ [۳۳/الاحزاب:۴]

اس کی مزید اصلاح کرتے ہوئے فرمایا: ''ان کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے''۔ [۳۳/الاحزاب:۵]

چنانچہ حدیث میں ہے ''کہ اس آیت کے نزول کے بعد لوگ زید بن محمد ﷺ کے بجائے زید بن حارثہ کہنے لگے۔'' (صحیح بخاری) نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کا بیٹا کہا درآنحالیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ شخص اس کا باپ نہیں ہے اس پر جنت حرام ہے''۔ [صحیح بخاری]

اس آیت اور پیش کردہ حدیث کا تقاضا ہے کہ کسی شخص کو شرعاً اجازت نہیں کہ وہ اپنے حقیقی باپ کے سوا کسی اور شخص کی طرف اپنا نسب منسوب کرے ہاں کسی کو پیار سے بیٹا کہہ دینا یہ اور بات ہے اس میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔لہٰذا صورت مسئولہ میں اس نوزائدہ بچی کی ولدیت وہی لکھوائی جائے جو حقیقی ہے لاولد آدمی کو اجازت نہیں ہے کہ ولدیت کے طور پر اپنا نام لکھوائے قرآن وحدیث کی رو سے ایسا کرنا سخت گناہ اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

سوال سیالکوٹ سے منیر احمد سوال کرتے ہیں کہ آدمی جب سفر سے واپس آئے تو کیا اپنی بیوی، والدہ، بہن اور بیٹی سے مصافحہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ کتاب وسنت کی رو سے جواب دیں۔

جواب اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات فرماتے تو مصافحہ کرتے تھے۔حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ جب آپ سے ملاقات فرماتے تو کیا مصافحہ کرتے

تھے؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی مجھ سے ملاقات کرتے تو مصافحہ ضرور کرتے تھے۔

[ابوداؤد: الادب ۵۲۱۴]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ملاقات کی تو مصافحہ فرمایا، میں نے عرض کیا کہ ہم تو اسے عجمی لوگوں کا طریقہ خیال کرتے تھے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ ہم مصافحہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔''

[فتح الباری: ۱۱/۶۶]

حضرت قتادہ نے انس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں مصافحہ رائج تھا تو آپ نے جواب دیا کیوں نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جب ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے تھے۔ [صحیح بخاری: ۶۲۶۳]

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل یمن نے اس سنت انبیا کو زندہ رکھا تھا، چنانچہ اہل یمن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کہ ان حضرات نے سب سے پہلے مصافحہ کی سنت کو زندہ کیا ہے۔'' [ابوداؤد: ۵۲۱۳]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ جب ایک مسلمان دوسرے سے ملاقات کرے تو اسے جھکنا چاہیے؟ فرمایا: ''نہیں بلکہ ملاقات کرتے وقت انہیں مصافحہ کرنا چاہیے۔'' [ابن ماجہ: الادب ۳۷۰۱]

اس کی فضیلت یہ ہے: مصافحہ کرنے سے گناہ جھڑ جاتے ہیں، حدیث میں ہے: ''کہ جب دو مسلمان ملاقات کرتے وقت مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے الگ ہونے سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔'' [ابوداؤد: الادب ۵۲۱۲]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سلام کی تکمیل یہ ہے کہ ملاقات کے وقت اپنے بھائی سے مصافحہ کیا جائے۔

[الادب المفرد: حدیث نمبر ۹۶۸]

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے اسلامی بھائیوں سے مصافحہ کرنے کی خاطر ہمیشہ اپنے ہاتھ کو خوشبودار رکھتے تھے۔

[الادب المفرد: حدیث نمبر ۱۰۱۲]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصافحہ کرنے میں مرد اور عورت کی تفریق درست نہیں ہے صرف اجنبی عورتیں اس عمومی سنت سے مستثنیٰ ہیں۔ [فتح الباری: ۱۱/۶۶]

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک نے کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا تھا ہاں وہ عورت جس کے آپ مالک ہوتے، وہ اس حکم امتناعی سے مستثنیٰ ہے۔ [صحیح بخاری: الاحکام ۷۲۱۴]

اس سے مراد آپ کی بیویاں اور لونڈیاں ہیں۔ [عمدۃ القاری: ۱۶/۴۶۰]

دیگر محرم عورتیں مثلاً: ماں، بہن، بیٹی، ان پر قیاس کی جا سکتی ہیں۔ ان سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اجنبی عورتوں سے کسی صورت میں مصافحہ جائز نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ [مسند امام احمد: ۲/۲۱۳]

ان عورتوں سے مراد اجنبی اور غیر محرم عورتیں ہیں، جیسا کہ حدیث بخاری میں اس کی وضاحت ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''کہ اس حدیث کے پیش نظر اجنبی عورتوں کو ضرورت کے بغیر ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔'' [فتح الباری: ۱۳/۲۵۲]

تفصیل بالا سے معلوم ہوا کہ عورتیں، عورتوں سے مصافحہ کرسکتی ہیں، کیوں کہ ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے اور آدمی آدمیوں سے ملاقات کے وقت مصافحہ کریں، نیز اپنی محرم عورتوں سے مصافحہ کرسکتا ہے اور غیر محرم اور اجنبی عورتوں سے مصافحہ کرنے کی ممانعت ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال شاہدرہ سے غلام اللہ سوال کرتے ہیں کسی شخص کے متعلق حتمی فیصلہ دینا کہ جس نے کسی جنتی کو دیکھنا ہے تو وہ ''فلاں پیر'' کو دیکھ لے، ایسے شخص کی بیعت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنتی ہونے کی بشارت ضرور دی ہے، جو عشرہ مبشرہ کے نام سے مشہور ہیں، رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی معین شخص کے متعلق جنتی یا جہنمی ہونے کا سرٹیفکیٹ دے، البتہ جن کے متعلق قرآن وحدیث میں نص آچکی ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ مثلاً حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جنتی ہونا اور ابولہب کا جہنمی ہونا وغیرہ۔ یوں تو کہا جاسکتا ہے کہ فلاں قسم کے اعمال کرنے والا جنتی یا جہنمی ہے، لیکن شخصی طور پر تعین جائز نہیں ہے، نیز بیعت کی کئی اقسام ہیں، ان میں آج بیعت جہاد تو کی جاسکتی ہے، لیکن رائج الوقت بیعت تصوف کا ثبوت سلف صالحین سے نہیں ملتا۔ لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ سوال میں ذکر کردہ بیعت کا تعلق بھی بیعت تصوف سے ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

سوال شاہدرہ سے غلام اللہ سوال لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سوال کا جواب کتاب وسنت کی روشنی میں دیں۔

① ہمارے ہاں انجیندی منائی جاتی ہے، یعنی چاند کے بعد پہلی یا دوسری جمعرات کو متبرک خیال کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت واضح کریں؟۔

جواب عبادت کے لیے اپنی طرف سے کسی دن کو خاص کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن خاص طور پر روزہ سے منع فرمایا ہے، البتہ شریعت نے بعض ایام میں عبادت کرنے کی ترغیب ضرور دی ہے، جیسا کہ سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھنے کے متعلق حدیث میں آیا ہے کیوں کہ ان دنوں اللہ کے حضور اعمال پیش ہوتے ہیں، لہٰذا مطلق طور پر جمعرات کی تخصیص جائز ہے لیکن چاند کی پہلی یا دوسری جمعرات کو متبرک خیال کرنا درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ جاہلانہ باتیں ہیں۔

سوال جوہر آباد سے طالب حسین پوچھتے ہیں کیا طوطا حلال ہے یا حرام؟

جواب حرام پرندوں کے متعلق شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ وہ ذی مخلب یعنی چنگال والے ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے پنجے سے شکار کریں یا جھپٹ کر کسی چیز کو پنجے سے پکڑیں ان کا گوشت حرام ہے۔ البتہ جو جانور کبھی کبھار پنجے سے پکڑ کر کھاتے ہیں وہ اس حرمت میں شامل نہیں ہیں۔ طوطا اس آخری قسم سے سمجھا جاتا ہے۔

سوال جوہر آباد سے طالب حسین پوچھتے ہیں منافق کسے کہتے ہیں اور اسلام میں اس کی کیا سزا ہے؟

جواب دینی معاملات میں دورخی پالیسی اختیار کرنے والے کو شرعاً منافق کہا جاتا ہے شارحین حدیث نے منافقت کی دو اقسام بتائی ہیں۔

① انسان اصلاً کافر ہو لیکن مفادات کے تحفظ کے لیے ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو اسے ایمانی یا اعتقادی منافق

کہا جاتا ہے۔اصل نفاق یہی ہے۔زمانہ وحی میں اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی رسول اللہ ﷺ کو اس قسم کے منافقین کے بارے میں آگاہ کردیتے تھے البتہ اس دور میں ان کی تعیین انتہائی مشکل ہے۔

② انسان مسلمان ہو لیکن اس میں منافقین کی خصلتیں پائی جائیں احادیث میں ایسی چند خصلتوں کی نشاندہی کی گئی ہے جنہیں منافقین کی علامت اور نشانی قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً بات بات پر جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا لڑائی جھگڑے کے وقت فحش گالی دینا، غداری کا مرتکب ہونا اور امانت میں خیانت کرنا وغیرہ۔اسے شارحین عملی اور اخلاقی نفاق قرار دیتے ہیں۔اگر کوئی یہ خصلتیں دائمی عادت کے طور پر اپنائے ہوئے ہے تو ایسا انسان پختہ عملی منافق ہے۔اعتقادی منافقین کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: کہ انہیں جہنم کے نچلے گڑھے میں پھینکا جائے گا اس کے علاوہ دنیا میں ان کے لیے کوئی سزا نہیں ہے۔

سوال سیالکوٹ سے حافظ احمد دریافت کرتے ہیں کہ جہنم کا عذاب محدود مدت کے لیے ہے، مدت ختم ہونے کے بعد کیا جہنم کو ختم کردیا جائے گا، نیز ہم نے سنا ہے کہ شیطان (ابلیس) کو کسی ایسے اسم اعظم کا علم ہے جس کے ذریعے وہ دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کر کے اسے جہنم سے آزاد کردیں گے اور اسے جنت میں داخلہ مل جائے گا۔

جواب اہل جہنم کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''وہ جہنم میں مدتوں پڑے رہیں گے''۔ [۴/النسآء:۲۳]

اس آیت کریمہ سے بعض لوگوں نے یہ مطلب کشید کرنے کی کوشش کی ہے کہ جہنم کا عذاب ایک محدود مدت تک کے لیے ہوگا کیوں کہ احقاب، حقب کی جمع ہے جس کا معنی مدتِ دراز ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں بالآخر وہ ختم ہو جائیں گی لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کیوں کہ حقب کا معنی ہے ''پے در پے آنے والا طویل دورانیہ کہ ایک دور ختم ہونے کے بعد دوسرا شروع ہو جائے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ احقاب ایسے ادوار کے لیے بولا جائے گا جو مسلسل ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جس کے بعد دوسرا نہ آئے، اس کے علاوہ جہنم کے متعلق یہ خیال کہ اسے محدود مدت کے لیے باقی رہنا ہے قرآن کریم کے دیگر بیانات سے ٹکراتا ہے جن میں اہل جہنم کے لیے خلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے بلکہ بعض مقامات پر اس خلود کو مؤکد کرنے کے لیے ابـــدًا (ہمیشہ ہمیشہ) کے الفاظ بھی قرآن کریم نے استعمال فرمائے ہیں بلکہ ایک مقام پر تو یہ صراحت موجود ہے کہ ''وہ اہل جہنم چاہیں گے کہ جہنم سے نکل بھاگیں مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے''۔ [۵/المآئدہ:۳۷]

کیا ان تصریحات کے بعد بھی اس تصور کی گنجائش ہے کہ جہنم میں اللہ کے باغی ہمیشہ نہیں رہیں گے بلکہ کبھی نہ کبھی وہ اس سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ [العیاذ باللہ]

نیز شیطان (ابلیس) کے متعلق سوال میں جو مفروضہ قائم کیا گیا ہے کہ اسے اسم اعظم کا علم ہے جس کے ذریعہ وہ جہنم سے نکل جائے گا اور جنت میں اسے داخلہ مل جائے گا، اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اس عالم رنگ و بو میں معرکہ حق و باطل ایک کھلنڈرے کا کھیل معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم میں کئی ایک مقامات پر اس بات کی صراحت موجود ہے کہ ابلیس اور اس کے پیروکار جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو صرف قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت دی ہے، تاکہ اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے متعلق اپنے

ارمان پورے کرے اور بس، دراصل اس قسم کے مفروضے وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو اپنے اندر شریعت پر عمل پیرا ہونے کی ہمت نہیں پاتے، اس قسم کی طفل تسلیوں کے بل بوتے باغیانہ زندگی بسر کرتے ہیں، بہرحال سوال میں ذکر کردہ دونوں باتیں عقل ونقل کے خلاف ہیں۔

سوال لاہور سے یحییٰ عزیز ڈاہروی نمائندہ خصوصی ہفت روزہ ''اہلحدیث'' حلقہ کوٹ رادھا کشن لکھتے ہیں کہ حلال جانوروں میں وہ کون کون سے اجزاء ہیں جو حرام یا مکروہ کے درجے میں آتے ہیں؟ اس سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں ان کا سند اور متن کے لحاظ سے کیا درجہ ہے؟۔

جواب کسی چیز کو لوگوں کے لیے حلال یا حرام کرنے کا اختیار اللہ کے پاس ہے، ایک مرتبہ خود رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی حلال کردہ کسی چیز کو اپنے آپ پر حرام کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بات پر آپ کا بایں الفاظ نوٹس لیا۔

''اے نبی! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کردیا ہے آپ اسے حرام کیوں کرتے ہیں؟''۔

[۶۶/التحریم:۱]

چونکہ بندوں پر اللہ کی حلال یا حرام کردہ چیزوں کا علم رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ہوتا ہے اس لیے بعض اوقات اس تحلیل وتحریم کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف بھی کردی جاتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اوصاف قرآن میں بایں الفاظ بیان ہوئے ہیں: ''وہ امین، اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، نیز وہ پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں''۔ [۷/الاعراف:۱۵۷]

اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ جو جانور اللہ تعالیٰ نے انسانون کے لیے حلال کیے ہیں، ان کے تمام اجزاء بالعموم حلال ہیں۔ ہاں اگر اللہ خود کسی چیز کو حرام کردے تو الگ بات ہے جیسا کہ حلال جانور کو ذبح کرتے وقت اس کی رگوں سے جو تیزی کے ساتھ خون بہتا ہے، جسے دم مسفوح کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آتے ہیں، میں تو ان میں کوئی چیز حرام نہیں پاتا، مگر یہ کہ وہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا خنزیر کا گوشت کیوں کہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے لیے نامزد کردیا گیا ہو''

[۶/الانعام:۱۴۵]

اس دم مفسوح کے علاوہ حلال جانور کی کوئی چیز نصاً حرام نہیں ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر حلال جانور کا ہر جزو کھانا ضروری ہو، اگر کسی حصے کے متعلق دل نہیں چاہتا تو یہ انسان کی اپنی مرضی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بعض جانوروں کے گوشت کے متعلق اظہار ناپسندیدگی فرمایا لیکن آپ کے سامنے ایک ہی دستر خوان پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے تناول فرمایا، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا ناپسندیدہ ہونا اور بات ہے اور اسے حرام قرار دینا چیزے دیگر است، مختصر یہ ہے کہ حلال جانور کے تمام اجزاء حلال ہیں سوائے ان اجزاء کے کہ جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا ہو۔ بعض فقہا نے اس سلسلہ میں کاوش کی ہے کہ حلال جانور کے کچھ اجزاء کو حرام کہا ہے۔ مثلاً:

① پتہ۔ ② مثانہ۔ ③ غدود۔ ④ مادہ کی شرمگاہ۔

⑤ نر جانور کا عضو مخصوص۔ ⑥ کپورے۔

⑦ بہتا ہوا خون۔ بعض حضرات نے بڑی باریک بینی کے ساتھ کھوج لگا کر مزید کچھ چیزوں کی بھی فہرست جاری کی ہے۔

① حرام مغز۔ ② تلی کا خون۔ ③ جگر کا خون۔ ④ دل کا خون۔

⑤ پتہ کا پانی۔ ⑥ ناک کی بلغم۔ ⑦ آنتیں۔

⑧ اوجھڑی۔ ان چیزوں کی حرمت یا کم از کم کراہت کو ثابت کرنے کے لیے دو چیزوں کو بنیاد بنایا گیا ہے:

① روایت۔ ② درایت۔

پہلی بنیاد: روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ذبح شدہ بکری سے سات چیزوں کو مکروہ خیال کرتے تھے: پتہ، غدود اور بہتا ہوا خون وغیرہ۔

دوسری بنیاد: انسانی نفوس ان چیزوں کو خبیث خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ مذکورہ چیزیں حرام یا مکروہ ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک عقل ونقل کے اعتبار سے یہ چیزیں ناپسندیدہ اور خبیث ہیں، لہٰذا انہیں حرام ہونا چاہیے۔ اب ہم پہلے روایت کا کھوج لگاتے ہیں اور محدثین کرام کے ہاں ان کا درجہ متعین کرتے ہیں۔

اس روایت کو علامہ سیوطی نے المعجم الاوسط للطبرانی، السنن الکبریٰ للبیہقی اور کامل لابنِ عدی کے حوالے سے بیان فرمایا ہے اور اس پر ضعیف ہونے کی علامت بھی ثبت کی ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف الجامع الصغیر میں رقم ۴۶۱۹ کے تحت بیان کیا ہے اور اس کے ضعف اور سبب کو بیان کرنے کے لیے الاحادیث الضعیفہ: حدیث نمبر ۲۴۹۲ کا حوالہ دیا ہے جو ابھی تک زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی اگر ہوئی تو راقم کے پاس نہیں ہے، تاہم بیہقی کے حوالہ سے اس کی سند کے متعلق مؤلف بیان کرتے ہیں۔

امام بیہقی نے اس روایت کو دو سندوں سے بیان کیا ہے، پہلی سند منقطع ہے کیوں کہ امام مجاہد اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان کسی ایک راوی کے رہ جانے کی وجہ سے انقطاع آیا ہے امام بیہقی اسے بیان کرنے کے بعد خود وضاحت کرتے ہیں کہ اس کی سند منقطع ہے۔ [السنن الکبریٰ للبیہقی: ۱۰/۷]

پھر ایک دوسری سند سے اس روایت کو بیان کرتے ہیں اس میں انقطاع تو نہیں ہے لیکن ایک دوسری خرابی کی وجہ سے یہ عدم انقطاع مخدوش ہو جاتا ہے اس سند میں ایک راوی عمر بن موسیٰ ہیں جس کے متعلق خود امام بیہقی فرماتے ہیں ''کہ وہ ضعیف کمزور ہے اس وجہ سے اس کا موصول ہونا بھی صحیح نہیں رہتا۔'' [۱۰/۸]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ منکر الحدیث ہے، ابن عدی لکھتے ہیں کہ اسے احادیث وضع کرنے کی عادت تھی، امام ابن معین کہتے ہیں کہ یہ ثقہ نہیں ہے۔ [میزان الاعتدال: ۳/۲۲۴]

اس کا شیخ واصل بن ابی جمیل ہے، اس کے متعلق یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ امام مجاہد اور مکحول سے اور اس سے امام اوزاعی مرسل احادیث بیان کرتے ہیں۔ [میزان الاعتدال: ۴/۳۲۸]

ان تصریحات کی موجودگی میں سند کے اعتبار سے یہ روایت ناقابل حجت قرار پاتی ہے۔

اب ہم دوسری بنیاد کا جائزہ لیتے ہیں کہ ان چیزوں کو انسانی نفوس خبیث خیال کرتے ہیں، اس بنیاد کی بھی کوئی حیثیت نہیں کیوں کہ کسی چیز کو خبیث یا طیب قرار دینا انسانی نفوس کا کام نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے۔ اور وہ اپنے رسول ﷺ کو کسی چیز کے متعلق خبیث یا طیب ہونے کے متعلق مطلع کرتا ہے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال عائشہ بذریعہ ای میل سوال کرتی ہیں کہ کیا درس قرآن کی ویڈیو فلم بنائی جاسکتی ہے تاکہ دوسرے لوگوں یا دور کے ممالک تک اللہ کا پیغام پہنچایا جائے۔ اگر جائز ہے تو کیا اس قسم کی ویڈیو فلم عورتیں دیکھ سکتی ہیں، نیز درس قرآن سننے کے لیے ٹی وی یا ویڈیو گھر میں رکھا جاسکتا ہے؟

جواب بشرط صحت سوال واضح ہو کہ تصویر کشی کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے متعدد تنبیہی اور امتناعی احکام کتب حدیث میں مروی ہیں، یہ T.V جیسے فتنہ کے ثمرات ہیں، کہ پہلے پہلے سینما گھر مخصوص مقامات پر ہوتے تھے۔ اب ان کی آمد سے جگہ جگہ سینما گھر کھل گئے ہیں، بلکہ گھروں اور دکانوں کو بے حیائی اور فحاشی کے اڈوں میں بدل دیا گیا ہے۔ اسے دوسروں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا ذریعہ قرار دینا محض خام خیالی ثابت ہوا ہے، اس کے استعمال سے نہ صرف گلی، گلی، کوچے کوچے، سینما گھر کھل گئے ہیں بلکہ علمائے کرام میں دعوت و تبلیغ کے جذبات بھی ماند پڑ گئے ہیں۔ ان میں جذبہ نمائش پروان چڑھا ہے۔ اسے انتہائی مجبوری یا یقینی فائدہ کے پیش نظر تو کسی حد تک استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اگر اللہ کا پیغام پہنچانا مقصود ہے تو کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے اللہ کا پیغام آگے پہنچانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ٹی وی اور ویڈیو کے استعمال سے پرہیز کرنا زیادہ بہتر ہے۔ خواہ اس سے مقصود تبلیغ ہی کیوں نہ ہو۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال حافظ محمد یونس میرپور آزاد کشمیر سے پوچھتے ہیں عقیقہ نہ ہو سکے تو کیا بعد میں کسی وقت عقیقہ کیا جاسکتا ہے، لڑکے کے لیے عموماً دو جانوروں کی شرط ہے کیا ایک جانور بھی ذبح کیا جاسکتا ہے، نیز کیا عقیقہ کے جانور میں قربانی کی شرائط ملحوظ رکھنا ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہمارے لیے باعث نزاع بنا ہوا ہے کہ کچھ لوگ دن معین کیے بغیر میت کی طرف سے کھانا کھلانے کا اہتمام کرتے ہیں اور تمام عزیز و اقارب کو اس دعوت میں مدعو کرتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا ثواب ہمارے فوت شدہ عزیز کو ملے گا، اس کے متعلق شرعی موقف بیان کریں۔

جواب عقیقہ اس جانور کو کہتے ہیں کہ جو بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ذبح کیا جاتا ہے تمام ائمہ و محدثین کرام اس کی مشروعیت کے قائل ہیں صرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے عدم مشروعیت منقول ہے۔ کیوں کہ وہ اسے دور جاہلیت کی یادگار قرار دیتے ہیں۔ صاحب استطاعت کو بچے کی پیدائش کے ساتویں دن عقیقہ کرنا ضروری ہے۔ فرمان نبوی ﷺ ہے:

① ''بچے کی پیدائش پر عقیقہ ہے، اس کی طرف سے جانور ذبح کرواور اس کی حجامت بنواؤ۔'' [جامع ترمذی]

② حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے ''کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ایک جیسی اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری بطور عقیقہ ذبح کریں۔'' [مسند امام احمد]

③ سر کے بال منڈوائے جائیں اور اس کا نام رکھا جائے۔ [ابوداود، ابن ماجہ]

رسول اللہ ﷺ کے عمل سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نواسوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کا عقیقہ کیا تھا (نسائی) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے دو دو مینڈھے ذبح کیے تھے۔

اگر چہ بعض روایات میں ایک ایک مینڈھا ذبح کرنے کا بھی ذکر ہے لیکن علامہ البانی رحمہ اللہ نے ان تمام روایات کو مرجوح قرار دیا ہے۔ [ارواء الغلیل ص۳۸۴/۴]

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی مختلف دلائل سے اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ بچے کی طرف سے دو اور بچی کی طرف سے ایک جانور ذبح کیا جائے۔ [زادالمعاد]

اگر عدم استطاعت کی وجہ سے ساتویں دن عقیقہ نہ ہو سکے تو جب بھی اللہ ہمت اور موقع دے عقیقہ کیا جا سکتا ہے۔ چودھویں اور اکیسویں دن عقیقہ کرنے کی روایات صحیح نہیں ہیں۔

عقیقہ کا جانور نمایاں اور کھلے عیوب سے پاک ہونا چاہیے۔ البتہ قربانی کی شرائط اس میں نہیں ہیں۔ قربانی کے احکام اس سے الگ ہیں۔ نمایاں فرق یہ ہے کہ قربانی میں ایک ہی جانور تمام اہل خانہ کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے جبکہ عقیقہ میں ایسا نہیں ہوتا۔

میت کے ایصال ثواب کے لیے دعوت کا اہتمام کرنا پھر اس میں خویش و اقارب کو بلانا قرون اولیٰ میں اس کا ثبوت نہیں ملتا ہے خواہ کسی دن کی تعیین ہو یا پہلے سے کوئی دن مقرر نہ کیا جائے میت کی طرف سے صدقہ و خیرات کرنا چاہیے یا پھر غربا و مساکین کے کھانے کا اہتمام کیا جائے۔ سلف صالحین نیکی کے کاموں میں بہت حریص تھے۔ ان سے اس قسم کی دعوتیں کرنا ثابت نہیں ہے جس میں صرف برادری کو مدعو کیا جائے، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے محمد یوسف سوال کرتے ہیں کہ خرگوش کے حلال ہونے پر قرآن و حدیث سے کوئی صریح ثبوت ملتا ہے۔

جواب دین اسلام میں حرام چیزوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے اور اس کے اصول بتا دیئے گئے ہیں۔ جن کے تحت خرگوش حرام اشیاء کے ضمن میں نہیں آتا۔ خرگوش حلال ہے کیوں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک دفعہ خرگوش لایا گیا آپ نے اسے ذبح کیا اور کچھ گوشت رسول اللہ ﷺ کے لیے آپ کے گھر بھیجا، آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ [صحیح بخاری: کتاب الصید، باب الارنب]

جن روایات میں اس کے خون کی وجہ سے اسے نہ کھانے کا ذکر ہے وہ صحیح نہیں ہیں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ حدیث سے خرگوش کا گوشت کھانے کا جواز فراہم ہوتا ہے، تمام علما کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف سے اس کی کراہت منقول ہے۔ [فتح الباری: ۶۶۲/۹]

اس لیے خرگوش کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، شیعہ حضرات کے کہنے سے اس کے متعلق اندیشائے دور دراز میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ [واللہ اعلم]

سوال محمد علی خریداری نمبر ۵۳۸۳ ہی سوال کرتے ہیں کہ ہم لیڈیز ٹیلرنگ کا کام کرتے ہیں، ہمارے ہاں مختلف قسم کی عورتیں آتی ہیں۔ کچھ عورتیں ناپ کے لیے اپنے کپڑے لے کر آتی ہیں اور کچھ عورتیں کپڑوں کی بجائے اپنے جسم کا ناپ دیتی ہیں، ہمیں

کسی نے بتایا ہے کہ عورت غیر مرد کو جسم کا ناپ نہیں دے سکتی اور نہ ہی غیر مرد عورتوں کے کپڑے دیکھ سکتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ یہ کام حرام ہے۔ مسئلہ کی وضاحت فرمادیں؟

جواب لباس انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ قرآن کریم نے اس کی غرض وغایت بایں الفاظ بیان کی ہے: ''کہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصے کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہے۔'' [۷/الاعراف:۲۶]

یعنی لباس انسان کی ستر پوشی، جسم کی حفاظت اور اس کے لیے باعث زینت ہے۔ آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے لباس اخلاقی ضرورت ''ستر پوشی'' اس کی طبعی ضرورت ''حفاظت وزینت'' سے مقدم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لباس کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ وہ ستر پوشی کا فائدہ دے۔ اس کے برعکس اگر لباس اتنا باریک ہے کہ اس میں جسم کی جھلک نمایاں ہو یا سلائی اتنی چست ہے کہ جسم کے پوشیدہ حصوں کے خدوخال نمایاں ہوں اس قسم کے لباس کو ستر پوش نہیں کہا جاسکتا۔ اور ایک ایمان دار درزی کے لیے ضروری ہے کہ وہ عورتوں کے ایسے تنگ لباس تیار کرنے سے پرہیز کرے جو ساتر ہونے کے بجائے ان کی عریانی کا باعث ہوں، اس قسم کے لباس کی اجرت جائز نہیں ہے۔ خواہ عورتیں خود ناپ دیں یا اپنے ناپ کا کپڑا بھیج دیں، اسی طرح عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ ہمیشہ ساتر لباس زیب تن کریں۔ انتہائی باریک اور چست لباس سے اجتناب کریں۔ مغرب اور مغرب زدہ لوگوں کی تحریک عریاں کو ناکام ونامراد بنانے کے لیے تمام مسلمان عورتیں اپنے ساتر لباس اور شرعی حجاب کی پابندی اختیار کریں۔ اسلامی لباس تیار کرنے کی اجرت لی جاسکتی ہے۔ لیکن عورتوں کے جسم کی خود پیمائش نہ لے بلکہ یہ کام اپنی عزیزہ بہن، بیٹی، والدہ، بیوی وغیرہ سے لیا جاسکتا ہے۔ عورت کے جسم کو بلاوجہ ہاتھ لگانا حرام ہے۔ بالخصوص جسم کے ان حصوں کو چھونا جو اعضائے صنفی کہلاتے ہیں اور جن سے شہوانی جذبات ابھرنے کا اندیشہ ہے۔ اس کام کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ہوگا:

① مردوں اور بچوں کے لباس تیار کیے جائیں۔

② عورتوں کے ساتر لباس تیار کیے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ، ان کی پیمائش خود نہ لی جائے۔ بلکہ ان کے کپڑوں کے ناپ سے کام چلایا جائے۔

③ بہتر ہے کہ خواتین کسی خاتون ٹیلر کی خدمات حاصل کریں اور شرعی حدود میں رہتے ہوئے ان سے اپنے لباس تیار کرائیں۔

مختصر یہ ہے کہ لباس تیار کرتے وقت مذکورہ بالا قرآنی ہدایات کو ضرور مدنظر رکھا جائے کیوں کہ لباس تو تقویٰ کا ہی بہتر ہے۔

سوال کمالیہ سے عبدالعلیم لکھتے ہیں کہ بھینس کا ذکر قرآن وحدیث میں نہیں ہے، اس کے حلال ہونے کا فیصلہ کیسے کیا جائے گا، وضاحت کریں۔

جواب تمام جانوروں کے نام بنام حلت وحرمت کا ذکر قرآن وحدیث میں نہیں ہے، شریعت میں حرمت کے متعلق چند ایک اصول بتادیئے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

① وہ تمام جانور حرام ہیں جن کی حرمت کے متعلق صراحت آچکی ہے، جیسا کہ گھریلو گدھے ہیں۔

② جو جانور کچلی والے ہیں، وہ بھی حرام ہیں جیسا کہ چیتا اور بھیڑیا وغیرہ۔

③ جو جانور پنجے سے شکار کرتے ہیں اور پنجے سے ہی پکڑ کر کھاتے ہیں، جیسا کہ باز اور کوا وغیرہ۔

④ جن جانوروں کو مارنے کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ سانپ اور دیگر موذی جانور۔

⑤ جن جانوروں کو مارنے سے منع کیا گیا ہے جیسا کہ مینڈک وغیرہ۔

ان کے علاوہ تمام جانور حلال ہیں۔ بھینس بھی انہی حلال جانوروں میں شامل ہے، ویسے بھی بے شمار ایسے پرندے ہیں جن کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں ہوا کہ یہ حلال ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم انہیں حلال سمجھتے ہیں۔ مثلاً: مرغابی، اور تیتر وغیرہ۔ لہٰذا یہ اصول غلط ہے کہ جس کی حلت یا حرمت کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن یا حدیث میں آجائے وہی حلال یا حرام ہے۔

سوال لاہور سے محمد یٰسین طاؔ (خریداری نمبر ۳۴۲۴) لکھتے ہیں کہ ہمارے ایک دوست چند سال سے پراسرار طور پر غائب ہیں، تاحال ان کے متعلق کوئی خبر موصول نہیں ہوئی، اس کے کچھ کپڑے وغیرہ میرے پاس بطور امانت موجود ہیں، جن کے بوسیدہ اور ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیا یہ پارچہ جات کسی ضرورت مند کو دیئے جاسکتے ہیں؟

جواب امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ ’’مفقود الخبر کی بیوی اور اس کے مال کا حکم‘‘۔ لیکن اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں فرمایا، البتہ آپ کا رجحان پیش کردہ احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام بخاری کے عنوانات خاموش مگر ٹھوس ہوتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک اثر پیش کیا ہے۔ کہ انہوں نے کسی سے ایک لونڈی خریدی، اس کی قیمت ادا کرنے سے پہلے مالک لاپتہ ہوگیا، ایک سال تک اسے تلاش کیا لیکن وہ نہ مل سکا، پھر آپ نے اس لونڈی کی قیمت کو بطور صدقہ خرچ کردیا اور فرمایا اگر اس کا مالک مل گیا تو اسے قیمت ادا کردوں گا اور صدقہ کے ثواب کا خود حقدار رہوں گا اگر وہ اپنی طرف سے صدقہ کردے تو اس کی صوابدید پر ہے۔ [فتح الباری:۹/۵۳۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح منقول ہے، ان تمام حضرات نے مفقود الخبر کے مال کو گری ہوئی چیز پر قیاس کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے کہ سال تک اس کا انتظار کیا جائے، اگر نہ مل سکے تو وہ مال اس کی طرف سے صدقہ کردیا جائے، اگر اس کے بعد وہ مل جائے تو صدقہ کا اجر یا مال لینے کا اختیار دیا جائے۔ صورت مسئولہ میں مفقود الخبر کے کچھ کپڑے وغیرہ بطور امانت سائل کے پاس موجود ہیں، جن کے بوسیدہ اور ضائع ہونے کا بھی اندیشہ ہے پیش کردہ تصریحات کی روشنی میں یہی فیصلہ دینا مناسب ہے کہ ملبوسات کی قیمت کا حساب اپنے پاس رکھ لیا جائے اور لاپتہ دوست کی طرف سے ان پارچہ جات کو مساکین اور ضرورت مند پر صدقہ کردیا جائے۔ اگر گم شدہ شخص صدقہ کرنے کے بعد واپس آجائے تو اختیار دیا جائے اگر صدقہ بحال رکھے تو عنداللہ ثواب کا حقدار ہوگا، اگر اپنے کپڑوں کی قیمت لینا چاہے تو اسے قیمت دے دی جائے اور صدقہ کے ثواب کا حقدار وہ شخص ہوگا، جس کے پاس کپڑے بطور امانت پڑے تھے اور اس نے مساکین کو دے دیئے تھے۔

سوال لدھڑ ضلع سیالکوٹ سے محمد افضل صارم لکھتے ہیں کہ بریلوی حضرات ختم ثابت کرنے کے لیے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوردونوش کی اشیاء آگے رکھ کر دعا پڑھی تھی۔

جواب واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سمیت حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر دعوتِ طعام

کے لیے تشریف لے گئے، روٹی کے ٹکڑے کیے گئے اور ان پر گھی نچوڑ کر ''رسول اللہ ﷺ نے کچھ پڑھا'' پھر دس، دس آدمیوں کو بلایا گیا، اس طرح ستر آدمیوں نے وہ کھانا سیر ہو کر تناول کیا''۔ [صحیح بخاری: المناقب ۳۵۷۸]

① اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ ''علامات النبوة فی الاسلام'' یعنی معجزات میں لائے ہیں، یقیناً یہ رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ تھا کہ چند ایک روٹی سے ستر، اسی آدمی سیر ہو گئے، یہ ایک قاعدہ ہے کہ معجزہ دلیل نبوت ہوتا ہے لیکن کسی شرعی حکم کو اس سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس سے ختم کا جواز ثابت کرنا سینہ زوری اور تحکم ہے۔

② رسول اللہ ﷺ نے بطور ''ختم شریف'' مخصوص قرآنی سورتوں کو تلاوت نہیں فرمایا بلکہ روایات میں صراحت ہے کہ آپ ﷺ نے طعام ماحضر میں خیر و برکت کی دعا فرمائی۔ جیسا کہ سعد بن سعید کی روایت میں ہے بلکہ روایات میں وہ الفاظ بھی منقول ہیں جو بطور دعا ادا کیے۔ چنانچہ نضر بن انس کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے درج ذیل الفاظ کہے تھے: ''بسم الله اللهم اعظم فيها البركة''۔ ''اللہ کے نام سے اے اللہ! اس کھانے میں بہت زیادہ برکت عطا فرما''۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے بطور ختم شریف مخصوص سورتیں نہیں بلکہ خیر و برکت کی دعا فرمائی تھی۔ [فتح الباری: ۶/۷۲۱]

③ اہل خانہ نے خاص اہتمام کے ساتھ متنوع کھانے تیار نہیں کیے تھے کہ ان پر ختم پڑھنا مقصود ہو، بلکہ وہاں تو جو کے آٹے کی صرف ایک روٹی تھی جو صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے تیار کی گئی تھی اور اس پر بچا ہوا گھی نچوڑ دیا گیا تھا۔ نہ تو رسول اللہ ﷺ ختم شریف کے لیے تشریف لائے اور نہ ہی اہل خانہ نے ختم کے لیے خاص اہتمام کیا تھا جبکہ ہمارے ہاں دونوں طرف سے لاؤ لشکر اور عمدہ کھانوں کا اہتمام ہوتا ہے۔

④ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گھر بھی غزوۂ خندق کے موقع پر اسی قسم کے معجزے کا ظہور ہوا تھا، وہاں روٹیوں کے ساتھ گوشت بھی پکایا گیا تھا، بعض روایات میں ہے کہ آپ نے ہنڈیا میں بابرکت لعاب دھن ڈالا تھا، ذرا ختم دینے والے حضرات بھی کھانے میں تھوک ڈالنے کی جسارت تو کریں پھر دیکھیں کیا تماشہ بنتا ہے؟۔ بہر حال ہمارے نزدیک یہ ختم شریف کے اضافے کھانے پینے کے طور طریقے ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

سوال محمد اسامہ بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو تمام رنگوں سے سبز رنگ زیادہ محبوب تھا۔ نیز کیا یہ فرمان نبوی ﷺ ہے کہ جاری پانی اور سبز رنگ دیکھنے سے نظر تیز ہو جاتی ہے۔

جواب جن کتابوں میں موضوع روایات کو جمع کیا گیا ہے ان میں اس قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں، علامہ سیوطی نے اس روایت کو ابن السنی اور ابو نعیم کے حوالہ سے نقل کرنے کے بعد اس پر ''ض'' کا نشان لگایا ہے جو ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

[جامع صغیر]

اس کے ضعیف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت کا مدار قاسم بن مطیب نامی ضعیف راوی پر ہے۔ جسے امام ابن حبان نے متروک قرار دیا ہے۔ [دیوان الضعفاء والمتروکین: ص ۲۵۲]

اس لیے قلت روایات کے باوجود نقل و بیان میں بہت غلطیاں کیا کرتا تھا۔ [کتاب المجروحین: ج ۲، ص ۲۰۳]

حافظ عراقی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کی سند کمزور ہے۔ [فیض القدیر]

علامہ طاہر بن علی ہندی اس طرح کی دیگر روایات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ روایات صحیح نہیں ہیں۔

[تذکرۃ الموضوعات: ص۱۶۲]

علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ضعیف ٹھہرایا ہے، حاصل کلام یہ کہ اس طرح کی تمام روایات بے کار ہیں۔

[ضعیف الجامع الصغیر: ۴/۲۲۶]

نیز اس حدیث میں لفظ خضرۃ کا ترجمہ سبز رنگ نہیں بلکہ سبزہ ہے۔ چنانچہ علامہ مناوی لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ہرے بھرے درخت اور سرسبز کھیتیاں ہیں۔ [فیض القدیر: ۵/۲۳۲]

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے جو روایت بیان کی گئی ہے اس کے الفاظ یوں ہیں ''سبزہ، جاری پانی اور خوبصورت چہرے کو دیکھنے سے نگاہ تیز ہوتی ہے۔'' اس روایت کے الفاظ ہی اس کے خودساختہ ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں کیوں کہ ایسی ناشائستہ بات حضرات انبیا علیہم السلام کے شایان شان نہیں ہوتی۔ امام ابن جوزی یہ وضعی روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔

[کتاب الموضوعات: ۱/۱۶۳]

محدثین کرام نے وضعی احادیث معلوم کرنے کا ایک یہ بھی قاعدہ لکھا ہے کہ وہ ایسی گفتگو پر مشتمل ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کجا ایک عام نیک سیرت انسان بھی اسے بیان کرتے ہوئے شرماتا ہے۔ ملا علی قاری نے اس سلسلہ میں مذکورہ روایت کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ [اسرار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ: ۴۳۵]

علامہ سیوطی نے اگرچہ اس روایت کا دفاع کیا ہے لیکن وہ اس دفاع میں ناکام نظر آتے ہیں کیوں کہ اس روایت کے جتنے بھی طرق ہیں ان تمام میں کوئی نہ کوئی راوی ضعیف یا مجہول یا متہم بالکذب ضرور پایا جاتا ہے۔ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ''کہ یہ روایت سند کے لحاظ سے ضعیف اور متن کے لحاظ سے موضوع ہے۔ ایسی بے شمار روایات ہیں جو سنداً ضعیف اور متناً موضوع ہوتی ہیں۔''

[ضعیفہ: ج۱ ص۱۶۶]

طبی لحاظ سے سرسبز و شاداب درخت اور کھیت دیکھنے سے نگاہ تیز ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ دوسری باتوں کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اگرچہ ایک مذہبی گروہ نے سبز رنگ کو اپنی شناختی علامت قرار دیا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد کوئی صحیح روایت نہیں بلکہ بے کار اور خودساختہ احادیث ہیں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے محمد شفیع دریافت کرتے ہیں کہ بوقت ضرورت کسی مریض کو خون دینا شرعاً کیسا ہے کیا کوئی غیر محرم کسی عورت کو خون دے سکتا ہے؟

جواب مریض کو بوقت ضرورت خون دینا دورِ حاضر کا ایک جدید مسئلہ ہے جس کی مثال قرونِ اولیٰ میں نہیں ملتی ویسے تو انسان کا خون حرام ہے اور یہ حرمت اس کے نجس یا پلید ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ اس کی حرمت اس کے احترام کے پیش نظر ہے، انسانی خون پلید نہیں ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے دین اسلام کو بارگراں نہیں بنایا بلکہ وہ تو ہمارے ساتھ آسانی اور سہولت کا ارادہ رکھے

ہوئے ہیں۔ نیز ضرورت کے وقت حرام چیز بھی مباح ہو جاتی ہے اس لیے انسانی خون دوسرے انسان کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

① کوئی ماہر ڈاکٹر خون کے استعمال کو ناگزیر قرار دے دے۔

② خون کے علاوہ کوئی دوسری متبادل چیز میسر نہ ہو جس سے مریض کی جان بچ سکے یا وہ صحت کے قابل ہو سکے۔

③ محض قوت یا جسمانی حسن میں اضافہ کا ارادہ نہ ہو کیوں کہ یہ ایک فیشن ہے ضرورت نہیں۔

④ خون کا لینا دینا کسی کاروباری غرض سے نہ ہو۔

اس مقام پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ حرام میں شفا نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے حرام اشیاء میں تمہارے لیے شفا نہیں رکھی ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الاشربہ]

اس روایت کو مسند ابی یعلیٰ میں مرفوعاً بیان کیا گیا ہے اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''کہ حرام اشیاء سے دوا نہ کرو۔'' [سنن ابی داؤد: کتاب الطب]

ان روایات کا تقاضا ہے کہ حرام اشیاء میں شفا نہیں، پھر انہیں بطور علاج استعمال کرنا چہ معنی دارد؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خون کا استعمال بطور دوا یا علاج نہیں ہے بلکہ خون اس لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ مریض علاج کے قابل ہو جائے اور خون کی گردش از سر نو جاری ہونے سے دوا کے مؤثر ہونے کو ممکن بنایا جا سکے کیوں کہ خون کے نہ ہونے کی وجہ سے ادویات کا استعمال بے سود ہوتا ہے ڈاکٹر حضرات سے رابطہ کرنے سے یہی معلوم ہوا ہے کہ مریض کو جو خون دیا جاتا ہے وہ بطور دوا نہیں بلکہ اس کے ذریعے مریض کو علاج کے قابل بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا خون کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں اگر کسی محرم کا گروپ مریض کے خون سے موافقت نہ رکھتا ہو تو غیر محرم کا خون عورت کو دیا جا سکتا ہے کیوں کہ ایسا کرنا مجبوری کے پیش نظر ہے۔ چنانچہ ایک اصول ہے کہ ضرورت کے پیش نظر حرام چیز مباح ہو جاتی ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال منچن آباد سے محمد باقر دریافت کرتے ہیں کہ داڑھی کے وہ بال جو رخساروں کے اوپر نمودار ہوتے ہیں اور بعض اوقات آنکھوں تک پہنچ کر تکلیف کا باعث بنتے ہیں کیا اس قسم کے بال بھی داڑھی کا حصہ ہیں یا نہیں؟ شرعی طور پر انہیں کاٹنے میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟

جواب داڑھی رکھنا ایک اسلامی شعار اور مردوں کے لیے باعث زینت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی ثابت ہے کہ اسے مطلق طور پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے طول و عرض سے تراش و خراش کرتے ہوئے کچھ تعرض نہ کیا جائے داڑھی کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں۔

① مشرکین کی مخالفت کرو اور اپنی داڑھی کو بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو۔ [صحیح بخاری]

② مونچھوں کو کاٹو اور داڑھی کو چھوڑ دو اس سلسلہ میں آتش پرست مجوسیوں کی مخالفت کرو۔ [صحیح مسلم]

③ اپنی مونچھوں کو چھوٹا کرو اور داڑھی کو بڑھاؤ اور اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ [مسند امام احمد]

ان احادیث کا تقاضا یہ ہے کہ مشرکین، بے دین لوگوں، آتش پرستوں اور یہود ونصاریٰ کی مخالفت کرتے ہوئے داڑھی بڑھانا اور مونچھیں پست کرانا ضروری ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں پست کرنے کو امور فطرت سے شمار کیا ہے لہٰذا اس داڑھی کو اپنی حالت پر رہنے دیا جائے۔

لغوی لحاظ سے بھی ''لحیۃ'' کی تعریف یہ ہے کہ وہ بال جو رخساروں اور ٹھوڑی پر اگے ہوں انہیں داڑھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ المعجم الوسیط میں بایں الفاظ اس کی تعریف کی گئی ہے۔ ''شعر الخدین والذقن'' رخساروں اور ٹھوڑی کے بال داڑھی کہلاتے ہیں۔ اس لیے رخساروں پر اگنے والے بال بھی داڑھی کا حصہ ہیں جن کا کاٹنا جائز نہیں۔ صورت مسئولہ میں اگر رخساروں کے بال واقعی آنکھوں کے لیے باعث تکلیف ہیں (اگرچہ یہ صورت ابھی تک ہمارے مشاہدہ میں نہیں آئی) تو انہیں کاٹا جا سکتا ہے کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ تعالیٰ دین کے معاملہ میں تم پر تنگی نہیں کرنا چاہتا''۔ [الحج]

یاد رہے کہ مجبوری کے وقت اس ''گنجائش'' کو اپنے فیشن کی تکمیل کے لیے بطور بہانہ استعمال نہ کیا جائے۔

سوال چونیاں سے رانا محمد سلیم دریافت کرتے ہیں کہ اگر کوئی عورت شرعی پردہ کے ساتھ گاڑی چلاتی ہے تو اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب مرد اور عورت اگرچہ بنیادی طور پر ''نفس واحدۃ'' کی پیداوار ہیں تاہم فطری طور پر مرد جفاکش اور عورت نازک مزاج ہوتی ہے، ان دونوں کی بناوٹ وساخت کا لحاظ رکھتے ہوئے خالق نے ہر دونوں کا دائرہ کار بھی الگ الگ متعین فرمایا ہے، اجنبی مرد اور عورت کے باہمی اختلاط کو ناجائز ٹھہرایا تاکہ ایسا کرنا ان کے لیے کسی قسم کے فتنہ کا باعث نہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ مردوں اور عورتوں کو راستہ میں اکٹھے چلتے ہوئے دیکھا تو عورتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ایک طرف ہٹ جاؤ، راستہ کے درمیان میں چلنا تمہارا حق نہیں، راستہ کے کنارے پر چلو''۔ [ابوداود: کتاب الادب]

اس فرمان نبوی کے بعد صحابیات دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتیں، بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ ان کے کپڑے دیواروں سے چپک جاتے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے اندیشہ اختلاط کے پیش نظر عورتوں کو جنازہ کے ساتھ چلنے سے منع فرمایا ہے۔ [مسند ابی یعلیٰ بحوالہ فتح الباری: ۳/۱۸۲]

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی نظر سے وہ کام بھی حرام ہیں جو ارتکاب حرام کا پیش خیمہ یا ذریعہ ہوں۔ صورتِ مسئولہ کا شرعی پردہ کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا بھی اسی اصول کی زد میں آتا ہے مغربی تہذیب کے پرستار اس طرح کے چور دروازوں کی تلاش میں رہتے ہیں، کئی ایسی باتیں ہمارے مشاہدے میں ہیں جو ابتدائی طور پر کسی حد تک قابلِ قبول ہوتی ہیں لیکن ترقی کے مراحل سے گزرتی ہوئی ناقابلِ قبول بلکہ حرام کی حد تک پہنچ جاتی ہیں، عورتوں کا گاڑی چلانا بھی اسی قبیل سے ہے، گاڑی چلانے کے دوران بے شمار ایسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو عورت کی نسوانیت بلکہ، اس کی عزت وحرمت کے منافی ہیں مثلاً:

① ڈرائیوری کے لیے نگاہ کو آزادانہ گھمانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

② گاڑی خراب ہونے کی صورت میں مردوں سے گفتگو اور ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

③ معمولی نقص دور کرنے کے لیے بسا اوقات خود بھی مصروف عمل ہونا پڑتا ہے۔

④ ٹریفک پولیس سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔

یہ تمام چیزیں عورتوں کی عصمت کے خلاف ہیں، اس کے علاوہ مختلف مقامات پر عورت فتنہ وفساد کا باعث بن سکتی ہے مثلاً پٹرول پمپ، راستہ، اشارات کی جگہ اور تفتیش وغیرہ کے مقامات جہاں اسے رکنا پڑتا ہے، لہٰذا اس کے متعلق ہماری وہی رائے ہے جو مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ عورت کا گاڑی چلانا شرعاً درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی اجازت دینے سے عورتوں کے تمام اسلامی تحفظات ختم ہو جائیں گے اور ان کا مقام ووقار بھی مجروح ہوگا، اس لیے عورت کو ''عورت'' ہی رہنے دیا جائے اور اس چراغ خانہ کو شمع محفل نہ بننے دیا جائے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال چنیوٹ سے ڈاکٹر محمد یوسف لکھتے ہیں کہ سلام کہتے وقت بعض لوگ وبرکاتہ کے بعد ومغفرتہ وعافیتہ ورضوانہ کا اضافہ کردیتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی رو سے اس کی حیثیت واضح کریں؟

جواب ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''جب کوئی احترام کے ساتھ تمہیں سلام کرے تو اسے بہتر طریقہ سے جواب دو یا کم از کم اسی طرح سے اس کا جواب دے دیا جائے''۔ [۴/النسآء:۱۱۵]

اس آیت کریمہ کا تقاضا یہ ہے کہ سلام کا جواب احسن اور بہتر الفاظ سے دیا جائے۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر کی حد بندی ''وبرکاتہ'' کہنے تک ہے، اس سے زائد الفاظ مسنون نہیں ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضرت جبرائیل کا سلام پہنچایا تو آپ نے اس کا جواب بایں الفاظ دیا: ''وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' [بخاری کتاب بدء الخلق]

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور السلام علیکم کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: ''یہ دس نیکیاں ہیں'' اس کے بعد ایک دوسرا آیا اور اس نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہا آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: ''یہ بیس نیکیاں ہیں'' پھر تیسرا شخص آیا اور اس نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہا، آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: ''یہ تیس نیکیاں ہیں۔'' [ابوداود: کتاب الادب، باب کیف السلام]

بعض روایات میں ہے کہ ایک آدمی آیا اور اس نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ'' کہا۔ آپ نے فرمایا: ''یہ چالیس نیکیاں ہیں۔ مزید فرمایا کہ فضیلت ایسے ہی بڑھتی رہتی ہے۔'' [ابوداود]

لیکن یہ روایت محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتی۔ اس کے متعلق علامہ منذری فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ابو مرحوم عبدالرحیم بن میمون اور سہل بن معاذ دو راوی ہیں جو قابل حجت نہیں ہیں۔ [مختصر سنن ابی داود]

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس قسم کے اضافہ کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی آیا اور سلام کہتے وقت اس نے وبرکاتہ کے بعد کچھ مزید الفاظ کا اضافہ کیا۔ آپ نے اسے ٹوکا اور فرمایا ''کہ سلام

وبرکاتہ کہنے پر ختم ہو جاتا ہے۔'' [مؤطا امام مالک: باب العمل فی السلام]

مطلب یہ تھا کہ اس کے بعد کے الفاظ سلام میں شامل نہیں ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے بایں الفاظ سلام کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ والغادیات والرائحات '' اس کے جواب میں آپ نے فرمایا: علیک الفاً کَاَنَّہٗ کرہ ذالک۔ [مؤطا امام مالک باب جامع السلام]

تجھ پر ہزار ہوں، آپ نے یہ الفاظ اظہار ناپسندیدگی کے طور پر فرمائے۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے'' کہ سلام وبرکاتہ پر ختم ہو جاتا ہے۔'' [شعب الایمان: ۱۶/۹۸]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسا انکار نقل کیا ہے۔ [فتح الباری: کتاب الادب]

اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابن عمر وبرکاتہ کے بعد ''طیب صلوٰتہ'' کا اضافہ کرتے تھے۔

[الادب المفرد: ۲۶۳]

اسی طرح حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھتے تو وبرکاتہ کے بعد ''مغفرتہ وطیب صلوٰتہ'' کا اضافہ کرتے تھے۔ [الادب المفرد: ۲۵۹]

تاہم اتباع سنت کا تقاضا یہی ہے کہ سلام کرتے وقت وبرکاتہ کہنے تک اکتفا کیا جائے۔ کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو اور اللہ سے ڈرو''۔ [۴۹/الحجرات: ۱]

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ مجھے جامع کلمات عطا کیے گئے ہیں۔ [صحیح بخاری]

اس جامعیت کے پیش نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام میں ''وبرکاتہ'' تک اضافہ کو برقرار رکھا ہے اور ہمیں بھی اس پر ہی کاربند رہنا چاہیے۔ اس کے بعد اضافہ کا دروازہ کھولنا کئی ایک خرابیوں کے جنم لینے کا باعث ہے۔ جو کہ اتباع سنت کے منافی ہے۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے حبیب دریافت کرتے ہیں کہ میری عمر تقریباً پچیس سال ہے بیماری کی وجہ سے میری داڑھی اور سر میں سفید بال آنا شروع ہو چکے ہیں، رشتہ کے لیے میری قبل از وقت بالوں کی سفیدی رکاوٹ بن رہی ہے کیا شرعاً گنجائش ہے کہ میں انہیں کسی طرح سے سیاہ کرلوں؟

جواب بالوں کی سفیدی کو بدلنے کے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں لیکن سیاہ کرنے پر ممانعت اور تنبیہ وارد ہے۔ محدثین کرام نے بالوں کا سیاہ کرنا کبائر سے بتلایا ہے پھر ایسا کرنے سے انسان اللہ کی نظر رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وہ جوانی کے بعد کمزوری اور بڑھاپے کا دور لاتا ہے''۔ [الروم]

بالوں کو سیاہ کرنا قدرت کی اس نشانی کو گم کرنے کے مترادف ہے پھر ایسا کرنا دھوکہ اور فریب بھی ہے جس سے شریعت نے منع فرمایا ہے، اس کی ممانعت کے متعلق چند احادیث ملاحظہ فرمائیں:

☆ فتح مکہ کے دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد گرامی ابوقحافہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا جبکہ ان کے سر اور داڑھی

کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اس سفیدی کو تبدیل کرو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب کرو۔'' [صحیح مسلم] نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ اسے سیاہ رنگ سے دور رکھو۔ رسول اللہ ﷺ کا امر وجوب کے لیے ہے، جس کی خلاف ورزی حرام ہے۔ چنانچہ علامہ نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں ''کہ سیاہ رنگ کا خضاب حرام ہے''۔ [شرح نووی:۲/۱۹۹]

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے وقت کچھ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو اپنے بالوں کو کبوتر کے پپوٹوں کی طرح سیاہ کریں گے، وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائیں گے''۔ [مستدرک حاکم]

یہ حدیث بھی اپنے بالوں کو سیاہ کرنے کی حرمت کے متعلق بالکل صریح اور واضح ہے۔

☆ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ آخر زمانہ میں ایسے لوگ ہوں گے جو اپنے بالوں کو سیاہ رنگ کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی طرف نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا''۔ [مجمع الزوائد بحوالہ معجم طبرانی]

جس کام کے ارتکاب پر اتنی سنگین وعید ہو ایک مسلمان اسے کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

☆ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ جس شخص نے سیاہ رنگ کا خضاب کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے منہ کو سیاہ کریں گے''۔ [مجمع الزوائد:۵/۱۶۳]

بعض لوگ ابن ماجہ کی ایک حدیث کا سہارا لے کر بالوں کو سیاہ کرنے کا جواز کشید کرتے ہیں لیکن یہ سخت ضعیف اور ناقابل حجت ہے۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں جو مجبوری پیش کی گئی ہے اس کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کیا جائے اللہ تعالیٰ ضرور آسانی پیدا کریں گے۔

سوال طیب فاروق بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ حدیث میں بطور تکبر شلوار ٹخنوں سے نیچا کرنے کی ممانعت ہے اگر کوئی عادتاً ایسا کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہے؟ نیز اسے کس حد تک اونچا رکھنا چاہیے، جو عورتیں اپنا کپڑا ٹخنوں سے اوپر رکھتی ہیں، ان کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے، حدیث میں شلوار کے بجائے تہبند کا ذکر ہے کیا یہ حکم عام ہے یا تہبند کے ساتھ خاص ہے؟

جواب بلاشبہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھے گا جو تکبر اور غرور کرتا ہوا اپنے کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے''۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

''خیلاء'' کے لفظ سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ تکبر کے بغیر عادت کے طور پر ٹخنوں سے کپڑا نیچے کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ٹخنوں سے نیچے لٹکانے کو ہی تکبر کی علامت قرار دیا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ حدیث میں ہے: ''اپنی چادر کو ٹخنوں سے نیچے کرنے سے اجتناب کرو کیوں کہ یہ تکبر ہے اور اللہ تعالیٰ مخلوق سے تکبر کو پسند نہیں کرتے''۔ [ابوداود کتاب اللباس]

اس حدیث میں تکبر اور غیر تکبر کی بنا پر ٹخنوں سے نیچے کپڑا کرنے والے کے لیے دو الگ الگ سزاؤں کا بیان ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر بڑی عمدہ بحث کی ہے جو قابلِ ملاحظہ ہے۔ [فتح الباری:۱۰/۲۵۷]

اس سلسلہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں: ''کہ

مومن کی چادر نصف پنڈلی تک ہوتی ہے پنڈلی اور ٹخنوں کے درمیان چادر رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہے وہ آگ کا حصہ ہے اور جس نے تکبر اور غرور کرتے ہوئے کپڑا اپنے نیچے لٹکایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے نظر رحمت سے نہیں دیکھے گا۔" [ابوداؤد: کتاب اللباس]

اپنے کپڑے کو کس حد تک اونچا رکھنا چاہیے۔اس کے متعلق متعدد احادیث میں نصف پنڈلی تک اونچا رکھنے کی حد مقرر کی گئی ہے۔چنانچہ کعب احبار رسول اللہ ﷺ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ کی امت کے لوگ حماد یعنی اللہ کی بکثرت حمد وثنا کرنے والے ہوں گے وہ یوں کہ اوپر چڑھتے وقت اللہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے اور نیچے اترتے وقت اللہ کی تعریف کریں گے اور اپنی چادروں کو نصف پنڈلی تک رکھیں گے"۔ [دارمی: ۱/۵]

رسول اللہ ﷺ نے ایک مسلمان کی پہچان یہی بتلائی ہے کہ اس کی چادر نصف پنڈلی تک رہتی ہے۔ [ابوداؤد]

اس وعید سے چار صورتیں مستثنیٰ ہیں:

① کسی کی توند بڑھی ہوئی ہے یا جسم کے نحیف ہونے کی وجہ سے کمر میں جھکاؤ ہے،کوشش کے باوجود چادر نیچے ہو جاتی ہے۔ایسی حالت میں اگر چادر ٹخنوں سے نیچے ہو جائے تو مواخذہ نہیں ہوگا۔

② بعض دفعہ انسان گھبراہٹ کے عالم میں اٹھتا ہے اور جلدی جلدی چلتے ہوئے بے خیالی میں چادر ٹخنوں سے نیچے آجاتی ہے۔اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ صورت اس سخت وعید کے تحت نہیں ہوگی۔

③ ٹخنوں یا پاؤں پر زخم ہو اور اسے ڈھانپنے کے لیے کوئی اور کپڑا نہ ہو تو مکھیوں اور گرد وغبار سے بچانے کے لیے اپنی چادر کو ٹخنوں سے نیچے کیا جاسکتا ہے۔

④ عورتیں بھی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جب یہ سخت وعید سنائی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے سوال کرنے پر آپ نے وضاحت فرمائی کہ عورتیں ایک ہاتھ تک کپڑا اپنے نیچے لٹکا سکتی ہیں۔ [ترمذی: ابواب اللباس]

اگر کوئی عورت اس کے باوجود اپنا کپڑا اوپر رکھتی ہے جس سے قابل ستر حصہ ننگا ہوتا ہو تو وہ اللہ کے ہاں بہت بڑے جرم کا ارتکاب کرتی ہے۔

یہ سخت وعید صرف چادر کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر قسم کے کپڑے سے متعلق ہے۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: کہ کپڑا اپنے نیچے لٹکانے کا حکم چادر،قمیص اور پگڑی وغیرہ کے لیے عام ہے۔ [ابوداؤد: کتاب اللباس]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حکم چادر کے متعلق دیا ہے وہی قمیص کے متعلق ہے۔نیز راوی حدیث حضرت شعبہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ محارب بن دثار سے دریافت کیا کہ آپ نے چادر کا ذکر کیا تھا۔انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مطلق طور پر کپڑے کا ذکر کیا ہے،چادر وغیرہ کا خصوصیت کے ساتھ تو ذکر نہیں کیا۔[صحیح بخاری: کتاب اللباس]

لہٰذا شلوار وغیرہ کے بارہ میں بھی وہی حکم ہے جو چادر اور تہبند کا ہے۔

سوال دینی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کرام بالخصوص جو سادات خاندان سے تعلق رکھتے ہیں کیا مدرسہ میں تیار

ہونے والا کھانا استعمال کر سکتے ہیں جبکہ یہ کھانا مال زکوٰۃ سے تیار کیا گیا ہو۔ (عبدالوحید، ملتان)

جواب دینی مدارس میں پڑھانے والے سادات یا غیر سادات اساتذہ سے یہ معاملہ طے شدہ ہوتا ہے اگر وہ انفرادی طور پر مدرسہ میں رہائش رکھیں گے تو انہیں حق الخدمت کے طور پر تنخواہ کے علاوہ قیام وطعام بھی دیا جائے گا، اہل مدرسہ کے پاس جب صدقہ یا زکوٰۃ کا مال پہنچ جاتا ہے تو اس کی حیثیت بدل جاتی ہے جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کے متعلق کتاب الزکوٰۃ میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے: "**باب اذا تحولت الصدقة**" یعنی جب صدقہ کی حیثیت بدل جائے۔

شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "**فقد جاز للهاشمی تناولها**" یعنی سادات کے لیے اس کا استعمال جائز ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دلیل کے طور پر حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث پیش فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کے لیے ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ نے ام عطیہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ کے مال سے جو بکری دی تھی اس نے کچھ گوشت ہمیں بھیجا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ وہ صدقہ اپنے مقام کو پہنچ چکا ہے۔" (اس لیے اس کا استعمال ہمارے لیے جائز ہے)

اس طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ گوشت لایا گیا دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ یہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا پر صدقہ کیا گیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ یہ گوشت بریرہ کے لیے صدقہ تھا ہمارے لیے ہدیہ ہے۔

[صحیح بخاری: کتاب الہبۃ، باب قبول الہدیۃ]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں حدیثوں سے یہ مسئلہ ثابت کیا ہے کہ سادات خاندان سے متعلق کسی شخص کو فراہمی زکوٰۃ پر مقرر کیا جائے تو اس کے لیے مال زکوٰۃ سے اجرت لینا جائز ہے کیوں کہ وہ اپنے کام کا معاوضہ لے رہا ہے۔ صدقہ نہیں لے رہا۔ [فتح الباری: ۳/۳۵۷]

مذکورہ وضاحت کے پیش نظر دینی مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ خواہ سادات ہوں یا غیر سادات انہیں مدرسہ کی طرف سے دیئے جانے والے کھانے کو تناول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بعض حضرات کھانے کے عوض مدرسہ کے کھاتہ میں رقم جمع کرنے کا تکلف کرتے ہیں، اخروی ثواب کے پیش نظر تو ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن سادات خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایسا کرنا محض تکلف ہے، اسی طرح مدرسہ کے زیر اہتمام اگر کوئی مسجد کی ضرورت ہو تو مدرسہ کی رقم مسجد کی ضروریات پر بھی خرچ ہو سکتی ہیں۔

سوال کیا عیسائی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہم کھا سکتے ہیں، اگر عیسائی ہمارے برتن میں کھانا کھاتے ہیں تو اس برتن کو کتنی مرتبہ دھونا چاہیے۔ نیز اگر عیسائی سلام کے وقت ہاتھ بڑھائے تو کیا مصافحہ کر لینا چاہیے، یا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا جائے۔ [عبدالمتین، چیچہ وطنی]

جواب واضح رہے کہ عیسائی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ صفائی ونظافت اور پاکی وطہارت کا خیال رکھے اس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: "کہ آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔" [۵/المآئدہ: ۵]

اس آیت کریمہ میں پاکیزہ چیزوں کے حلال کر دینے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اہل کتاب پا کی وطہارت کے قوانین کی پابندی نہ کریں تو ان کے کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے، اس بنا پر ایک عیسائی کی عیسائیت اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا استعمال کرنے سے رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کی بد پرہیزی اور پاکی و پلیدی میں تمیز نہ کرنا رکاوٹ بن سکتا ہے، اسی طرح عیسائی اگر کسی برتن میں کھالیتا ہے وہ برتن پلید نہیں ہو جاتا جسے دھونے کی ضرورت ہو ہاں اگر وہ کوئی نجس چیز استعمال کرتا ہے تو اسے نجاست کی وجہ سے پاک کرنا ضروری ہے رسول اللہ ﷺ نے خود ایک مشرکہ عورت کے مشکیزہ سے پانی لے کر استعمال فرمایا تھا اس مشکیزہ کو وہ عورت خود بھی استعمال کرتی تھی نیز اگر عیسائی سلام کے وقت ہاتھ بڑھاتا ہے تو اس سے مصافحہ کرنے میں چنداں حرج نہیں ہے۔ البتہ عیسائی اور یہودی کو ابتداءً سلام نہ کیا جائے جیسا کہ حدیث میں ہے ''کہ اہل کتاب کو سلام کہنے میں ابتدا نہ کرو'' اسی طرح اگر عیسائی **السلام علیکم** کہتا ہے تو اسے جواب میں صرف ''**علیکم**'' کہا جائے احادیث میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ واضح رہے کہ ہمارے اور عیسائی کے درمیان کوئی چھوت چھات نہیں کہ ہم ان سے میل جول بند کر دیں۔ بلکہ اس معاملہ میں ہمیں حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے تا کہ انہیں دعوتِ اسلام پیش کرنے کے لیے راستہ ہموار ہو۔

سوال محمد حسین بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ ایک بیوہ اپنے بھائی کے پاس رہتی ہے، اس کا بھائی اس کے تمام اخراجات پورے کرتا ہے، کیا بیوہ کے لیے جائز ہے کہ وہ بلا اجازت اپنے بھائی کے گھر سے کوئی چیز اٹھا لے؟

جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو حقوق اور فرائض عائد کیے ہیں دو طرح کے ہیں:

① حقوق اللہ۔ ② حقوق العباد۔

سوال میں ذکر کردہ بیوہ کا بھائی کے گھر سے بلا اجازت کوئی چیز اٹھانے کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اگر کوئی ایسی چیز اٹھائی جاتی ہے جس کی عام طور پر پروا نہیں کی جاتی تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں ایسی چیزوں کے بارے میں باز پرس نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس ایسی چیز اٹھائی جاتی ہے جن کا مالک ضرورت مند ہے تو اگر بھائی نے مطلق طور پر اسے اجازت نہیں دی ہے تو قیامت کے دن ایسی اشیاء کے بلا اجازت استعمال پر ضرور مواخذہ ہوگا رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''جس کسی نے اپنے بھائی کا حق دبایا اسے چاہیے کہ اپنے لیے اس سے خلاصی کی کوئی سبیل پیدا کرے کیوں کہ قیامت کے دن وہاں درہم نہیں ہوں گے بلکہ وہاں تو اس کی نیکیاں لے کر حق تلفی کی جائے گی اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو حقدار کو اس کا حق دینے کے لیے اس کی برائیاں حق دبانے والے کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی''۔ [صحیح بخاری: کتاب الرقاق]

اس حدیث کے پیشِ نظر بہن کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی بلا اجازت اٹھائی ہوئی چیز واپس کرے اگر وہ چیز موجود نہیں بلکہ انہیں استعمال کر لیا گیا ہے تو ان کی قیمت ادا کرے یا اپنے بھائی سے معاف کروالے۔ کیوں کہ قیامت کے دن پیش آنے والی ندامت سے بہتر ہے کہ دنیا میں ندامت اٹھالے۔ حدیث میں ہے ''کہ اہل جنت کو اس وقت تک جنت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جب تک ان کے باہم معاملات اور لین دین صاف نہیں ہو جاتے۔ بلکہ جنت میں داخل ہونے سے انہیں ایک پل پر روک لیا

جائے گا جب وہ حقوق کے متعلق پاک صاف ہو جائیں گے تو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔"

[صحیح بخاری: کتاب الرقاق]

واضح رہے کہ قیامت کے دن زر مبادلہ کے طور پر انسان کی نیکیاں اور برائیاں ہی کام آئیں گی، لہٰذا ضروری ہے کہ معاملات کے متعلق انسان ہلکا اور پاک صاف ہو تاکہ دنیا میں اس کی کی ہوئی محنت دوسروں کے کھاتے میں نہ پڑ جائے، حقوق العباد کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: "کہ اگر کسی نے ایک رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا حق مارا ہوگا اسے سامنے لایا جائے گا۔"

[۲۱/الانبیآء:۴۷]

لہٰذا ہمیں حقوق العباد کے متعلق بہت حساس ہونا چاہیے، مالی معاملات کے علاوہ دیگر حقوق کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

سوال محمد یونس بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ آیا کوئی مسلمان تندرستی کی حالت میں اپنی محنت سے کمایا ہوا سارا مال جسے چاہے دے سکتا ہے یا نہیں؟

جواب اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود مختار بنا کر دنیا میں بھیجا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو جیسے چاہے استعمال کرسکتا ہے، مال وجائیداد بھی اللہ کی ایک نعمت ہے اس میں بھی تصرف کرنے کا اسے پورا پورا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "ہر مال دار اپنے مال میں تصرف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہے"۔ [بیہقی:۶/۱۷۵]

اس بنا پر صورت مسئولہ میں کوئی بھی مسلمان تندرستی کی حالت میں اپنا مال جسے چاہے دے سکتا ہے۔ لیکن مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھے۔

☆ یہ تصرف کسی ناجائز اور حرام کام کے لیے نہ ہو اور نہ ہی حرام کاری کے لیے کسی کو دیا جائے۔

☆ جائز تصرف کرتے وقت کسی شرعی وارث کو وراثت سے محروم کرنا مقصود نہ ہو۔

☆ اگر تصرف بطور ہبہ اولاد کے لیے ہے تو نرینہ اور مادینہ اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک کیا جائے۔

☆ اگر یہ تصرف بطور وصیت عمل میں آئے تو کل جائیداد کے 1/3 سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ اور وصیت شرعی وارث کے لیے بھی نہیں ہونی چاہیے۔ شرائط بالا کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی زندگی میں بحالت تندرستی اگر کوئی اپنی تمام جائیداد دینا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال عبدالرشید بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ حدیث میں فوٹو بنانے کے متعلق وعید آئی ہے کیوں کہ فوٹو اتروانے والا بھی اس وعید کی زد میں آتا ہے، ہدایۃ المستفید میں ہے کہ فوٹو اتروانا شرک ہے اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب واضح رہے کہ جرم کے لحاظ سے تصویر بنانے، بنوانے اور اس کے استعمال کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ جہاں تصویر بنانے والے کو قیامت کے دن کہا جائے گا کہ تم اس تصویر کو زندہ کرو بصورت دیگر اسے سخت سزا سے دوچار کیا جائے گا۔ وہاں تصویر استعمال کرنے کے متعلق بھی وعید ہے کہ جہاں تصویر ہوگی وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، نیز فیشن کے طور پر تصویر بنوانے والا ہی تو تصویر بنائے جانے کا باعث ہوتا ہے اس لیے بنوانے والا اور بنانے والا دونوں جرم میں برابر کے شریک ہیں، لیکن یہ اقدام

سنگین جرم ہونے کے باوجود شرک نہیں ہے، جیسا کہ سوال میں ظاہر کیا گیا ہے بلکہ ایک کبیرہ گناہ ہے، ہدایۃ المستفید میں کوئی ایسا جملہ نہیں ہے جس سے فوٹو اتروانا شرک معلوم ہوتا ہو، اس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

''یہی تصویر مصور کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی مشکل اور عذاب کا سبب بن جائے گی کہ مصور کو اس کا مکلف ٹھہرایا جائے گا کہ اس تصویر میں روح ڈالے لیکن وہ ایسا ہرگز نہ کر سکے گا لہٰذا اسے سخت ترین سزا دی جائے گی۔ کیوں کہ تصویر کبیرہ گناہوں سے ہے''۔ [ہدایۃ المستفید: ۱۵۳۷]

مختصر یہ ہے کہ تصویر بنانا اور بنوانا دونوں کبیرہ گناہ ہیں، شرک کے زمرہ میں نہیں آتا۔ جرم اور سزا کے لحاظ سے تصویر بنانا، بنوانا، اور اسے استعمال کرنا برابر حیثیت رکھتا ہے۔ بشرطیکہ کسی واقعی مجبوری کے پیش نظر ایسا نہ کیا گیا ہو۔ [فتح الباری: ۱۰/۳۹۰]

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب

سوال عبدالقدوس بذریعہ ای میل دریافت کرتے ہیں کہ حدیث میں ''قرن الشیطان'' کا ذکر آتا ہے، اس کا مطلب وضاحت سے لکھیں۔

جواب قرن الشیطان کا ذکر جس حدیث میں ہے اس کا ترجمہ یہ ہے: ''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک دفعہ اہل عراق سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرق کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہوئے دیکھا'' کہ خبردار فتنہ ادھر سے رونما ہوگا، بلاشبہ فتنہ اسی طرف سے ظاہر ہوگا، جہاں سے شیطان کا سینگ طلوع ہوتا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الفتن]

مدینہ منورہ سے عراق مشرق کی طرف پڑتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ فتنوں کی آماجگاہ سرزمین عراق ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ سرزمین عراق بڑی ہنگامہ خیز اور فتنہ پرور واقع ہوئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا پیش گوئی کے مطابق یہ منحوس خطہ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کی آماجگاہ ہے، قوم نوح کے بت ود اور سواع وغیرہ عراق ہی میں تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلاف آگ کا الاؤ تیار کرنے والا نمرود اسی عراق کا فرمانروا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف فتنہ بھی عراقی لوگوں نے برپا کیا تھا، نواسہ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے والے بھی عراقی کوفی تھے اور یہ واقعہ بھی سرزمین میں رونما ہوا، اب بھی یہ خطہ اس قسم کے فتنوں کی بدترین مثالیں قائم کیے ہوئے ہے۔

سوال گوجرانوالہ سے قاری حفیظ الرحمٰن اطہر لکھتے ہیں کہ ایک دینی مدرسہ کو لوگوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے سکول میں بدل دیا گیا ہے جہاں اردو، انگریزی، حساب، سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم کے ساتھ صحاح ستہ کے منتخب ابواب اور قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر کی تعلیم بھی دی جاتی ہے، اب بعض طلبا فیس ادا کرنے سے قاصر ہیں کیا زکوٰۃ و چرمہائے قربانی اور فطرانہ وعشر وغیرہ سے اخراجات کو پورا کیا جاسکتا ہے؟

جواب صورت مسئولہ میں لوگوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ایک دینی مدرسہ کی عمارت کو عصری سکول میں تبدیل کر دیا گیا ہے چونکہ ادارہ ہذا ایک سکول ہے اور دنیاوی تعلیمات کو ہی اولین حیثیت حاصل ہے۔ دینی تعلیمات ثانوی حیثیت میں ہیں وہ بھی ''صحاح ستہ'' کے منتخب ابواب اور قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کی حد تک ہیں اگرچہ دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم کی پیوندکاری

کے تجربات پہلے بھی ہوئے ہیں اور اب بھی انہیں تختہ مشق بنایا جارہا ہے ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے دینی علوم میں جو گہرائی اور گیرائی درکار ہے وہ اس طرح حاصل نہیں ہوتی تاہم مسئلہ کی حد تک ہمارا موقف یہ ہے کہ موجودہ دور کے کالج اور سکول مصارف زکوٰۃ سے خارج ہیں۔ مدارس دینیہ جن میں خالص قرآن وحدیث کی تعلیم دی جاتی ہے انہیں بھی کھینچ تان کر فی سبیل اللہ کی مد میں داخل کیا جاتا ہے تاہم غریب اور نادار طلبا کو زکوٰۃ دینا نصِ قطعی سے ثابت ہے خواہ وہ دینی مدارس میں زیرِ تعلیم ہوں یا کالج میں پڑھتے ہوں اس میں تو اختلاف کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں......''۔ [۹/التوبہ:۶۰]

لہٰذا غریب طلبا کی امداد زکوٰۃ، صدقات، چرمہائے قربانی، عشر اور فطرانہ وغیرہ سے کی جاسکتی ہے۔ جس کی صورت یہ ہو کہ سکول کی انتظامیہ زکوٰۃ وصدقات کو جمع کرے اور جو طلبا غریب اور نادار ہیں ان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کردے تاکہ وہ اس وظیفہ سے اپنی یونیفارم اور فیس وغیرہ کی ادائیگی کا بندوبست کریں اس جمع شدہ زکوٰۃ وخیرات سے سکول کی عمارت، اساتذہ کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات نہ پورے کیے جائیں کیوں کہ مصارف زکوٰۃ میں سے اس قسم کا کوئی مصرف قرآن وحدیث میں بیان نہیں ہوا ہے۔ اگر مصارف زکوٰۃ کے لیے اس قسم کے دروازے کھولنے کی اجازت دے دی جائے تو ہر کہترے مہترے کو مال زکوٰۃ سے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے سند جواز مل جائے گی جو قرآن وحدیث کے منافی ہے اس لیے ضروری ہے کہ انہیں صرف قرآن وحدیث میں بیان شدہ مصارف تک محدود رکھا جائے۔

سوال ناگرہ سے فاطمہ بی بی لکھتی ہیں کہ کیا عورت سر کے بالوں کا جوڑا بنا کر نماز پڑھ سکتی ہے؟

جواب امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم میں دوران نماز بالوں کا جوڑا بنانے کے منع ہونے پر ایک باب قائم کیا ہے پھر چند ایک احادیث بھی مذکور ہیں۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز مجھے اس بات سے بھی منع کیا گیا ہے کہ میں نماز میں اپنے کپڑوں کو سمیٹوں یا اپنے بالوں کو اکٹھا کروں۔'' [حدیث ۴۹۰]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ پیچھے سے اپنے بالوں کا جوڑا باندھ کر نماز پڑھ رہے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ان کے جوڑے کو کھول دیا۔ جب ابن حارث رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہو گئے تو ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے: ''میرے سر سے تمہیں کیا سروکار ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بلاشبہ اس طرح کے آدمی کی مثال اس شخص کی سی ہے جو مشکیں بندھی ہوئی حالت میں نماز ادا کرے''۔ [حدیث نمبر ۴۹۲]

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ سر کا جوڑا بنا کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے۔

سوال ناگرہ سے فاطمہ بی بی لکھتی ہیں کہ کیا گھر سے دور کسی عزیز پر آیۃ الکرسی سے دم کیا جاسکتا ہے؟

جواب دم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دم کرنے والے کی پھونک یا پھونک زدہ ہاتھ دوسرے آدمی کے وجود کو مس کرے، صورت مسئولہ میں یہ چیز مفقود ہے لہٰذا ایسا کرنا درست نہیں۔ اسی طرح سپیکر میں پھونک مارنا تاکہ جہاں تک اس کی آواز

جاتی ہے ان پر دم ہو جائے جیسا کہ ہمارے ہاں کسی وقت ''پیر سپاہی'' دم کیا کرتا تھا۔ یا ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے دم شدہ کیسٹ سے ''کسب فیض'' کرنا یہ سب خلاف عقل ونقل ہے، اس بنا پر گھر سے دور کسی عزیز پر'' آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرنا درست نہیں ہے۔

[واللہ اعلم]

سوال تحصیل چیچہ وطنی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن انسان کو باپ کی طرف منسوب کرکے آواز دی جائے گی یا ماں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا؟ واضح رہے کہ باپ کی طرف منسوب کرکے پکارے جانے کی روایت صحیح نہیں ہے جیسا کہ امام ابوداؤد نے اس کی وضاحت کی ہے۔ اس کے متعلق ہماری راہنمائی کریں۔

جواب سوال میں ذکر کردہ روایت حسب ذیل ہے:

''قیامت کے دن تمہیں تمہارے باپ کے نام سے پکارا جائے گا لہٰذا اچھے ناموں کا انتخاب کیا کرو۔''

[دارمی: کتاب الاستیذان؛ ابوداؤد: کتاب الادب؛ مسند امام احمد: ص۵/۱۹۴]

اس روایت کا دارومدار ایک راوی عبداللہ بن ابی زکریا الخزاعی پر ہے۔ جس کے متعلق امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔

حافظ منذری اس کے متعلق مزید وضاحت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی زکریا کی کنیت ابویحییٰ ہے۔ خود ثقہ اور عابد ہیں۔ لیکن حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے اس کا سماع ثابت نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ حدیث منقطع ہے۔ [مختصر ابوداؤد]

اگرچہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق لکھتے ہیں: ''کہ ابوداؤد نے اس روایت کو جید سند سے بیان کیا ہے۔ اور مشہور ہے کہ عبداللہ بن زکریا رضی اللہ عنہ نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو سنا ہے۔ (شرح مہذب) لیکن صحیح بات یہی ہے کہ یہ حدیث سند کے لحاظ سے کمزور ہے۔ جیسا کہ خود امام نووی نے بھی امام بیہقی کے حوالہ سے لکھا ہے۔ لہٰذا اس طرح کی روایت کو بطور دلیل نہیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ البتہ امام المحدثین حضرت بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ کو ایک اور انداز سے ثابت فرمایا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک باب بایں الفاظ قائم کیا ہے: ''کہ لوگوں کو ان کے باپ کے نام سے پکارا جائے گا۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ابوداؤد کے مفہوم کو عنوان کے طور پر ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ وہ حدیث ان کی شرائط کے مطابق نہ تھی۔ پھر بطور دلیل ایک اور حدیث کو پیش کیا ہے کہ قیامت کے دن غداری کرنے والے پر ایک جھنڈا لہرایا جائے گا۔ اور اعلان کیا جائے گا: ''یہ فلاں بن فلاں کی غداری کی وجہ سے ہے''۔ [صحیح بخاری: کتاب الادب]

اس حدیث میں غداری اور بے وفائی کی مذمت بیان کی گئی ہے اور اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرکے آواز دی جائے گی۔ [فتح الباری: ۱۰/۶۹۱]

ابن بطال اس کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کہ اس حدیث سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے جن کا موقف ہے کہ قیامت کے دن ستر پوشی کے طور پر انسانوں کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کرکے پکارا جائے گا۔ اس قول مردود کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جسے امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ''قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کے نام سے

پکارا جائے گا تاکہ ناجائز اولاد کے باپوں پر ستر پوشی ہو سکے''۔ یہ حدیث عقل اور نقل کے لحاظ سے ناقابل اعتبار ہے۔ کیوں کہ زانی کو عقلی، شرعی اور قانونی طور پر کسی وقت بھی بطور باپ تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اگر عورت شادی شدہ ہے تو خاوند کے گھر جو اولاد پیدا ہوگی اس کی نسبت خاوند کی طرف کی جائے گی خواہ وہ اس کے نطفہ سے نہ ہو۔ حدیث میں ہے: ''الولد للفراش وللعاهر الحجر'' (صحیح بخاری) ''زانی کے حصہ میں تو پتھر ہیں البتہ بچے کی نسبت خاوند کی طرف ہوگی''۔

اگر خاوند اس کا انکار کر دے تو لعان ہونے کی صورت میں ماں کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ اس زانی کی طرف نسبت نہیں ہو گی۔ ویسے یہ حدیث فنی لحاظ سے صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق کہتے ہیں: ''سنده ضعيف جدًا'' [فتح الباری: ۱۰/ ۷۹] اس کی سند انتہائی کمزور ہے۔ اس موضوع پر حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ [تہذیب السنن: ۷/ ۲۵۰]

ان قرائن اور شواہد کے پیش نظر ہمارا موقف یہ ہے کہ قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام سے پکارا جائے گا۔ اور صرف مندرجہ ذیل کی نسبت ماں کی طرف ہوگی۔

① حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔

② لعان شدہ بیوی خاوند کا متنازعہ بچہ بھی ماں کی طرف نسبت کر کے پکارا جائے گا۔

③ غیر شادی شدہ ماں کی اولاد بھی زانیہ کی طرف منسوب ہوگی۔

جب زانی انسان کی کوئی شرعی اور قانونی حیثیت نہیں ہے تو قیامت کے دن ان کی پردہ پوشی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سوال لاہور سے ابوعکاشہ دریافت کرتے ہیں کہ جب رافضی مؤذن ''علی ولی اللہ وصی رسول اللہ وخلیفۃ بلا فصل'' کہے تو کیا اہل سنت سامعین کو یہ سن کر لعنۃ اللہ علی الکاذبین کہنا درست ہے یا نہیں، نیز ایک رافضی کا جنازہ اہل سنت امام نے پڑھایا ہے ہمارے ہاں مشہور ہے کہ اس کا نکاح ٹوٹ گیا یا اسے اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا کیا یہ صحیح ہے۔؟

جواب روافض دراصل یہود و مجوس کی مشترکہ سازش کی پیداوار ہیں، انہوں نے عقائد و نظریات اور عبادات و معاملات کے متعلق ایک ایسا متوازی دین قائم کر رکھا ہے جو دین اسلام کے بالکل متصادم ہے۔ اذان میں ''علی ولی اللہ وصی رسول اللہ خلیفۃ بلا فصل'' جیسے کلمات کا اضافہ ان کے ہاں رائج متوازی دین کی ایک مثال ہے۔ یہ اضافہ خلاف اسلام ہے بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص خلیفہ راشد سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف بغض و عداوت کی ایک بدترین مثال ہے۔ ایمانی غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس طرح کے جھوٹ پر مبنی کلمات سن کر ''لعنۃ اللہ علی الکاذبین'' کہا جائے۔ انسان کو حق پرستی کے جوش میں مخاطب کو اندھا بہرا کر دینے والی بات نہیں کہنا چاہیے۔ مبادا وہ بھی بدزبانی پر اتر آئے اور وحی الٰہی کے اولین مخاطبین اور اصل حاملین اسلام کے متعلق یاوہ گوئی شروع کر دے قرآن کریم میں اس قسم کا انداز اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ کے سوا یہ مشرکین جن کو پکارتے ہیں تم انہیں گالی نہ دو کہ (اس کے نتیجہ میں) وہ تجاوز کر کے جہالت کی وجہ سے وہ اللہ کو گالیاں دیں گے''۔ [۶/الانعام: ۱۰۹]

صورت مسئولہ میں اگر اس قسم کے جھوٹے کلمات سننے والا اکیلا ہے یا چند ایک ہم ذہن ہیں تو اس لعنت کا برملا اظہار کیا جا سکتا

ہے۔لیکن اگر مخاطب سامنے ہے تو دل میں کہہ دیا جائے تا کہ وہ ہمارے اکابر کے متعلق بدزبانی نہ کریں، اگر کسی اہل سنت امام نے اپنی لاعلمی کی وجہ سے رافضی کی نماز جنازہ پڑھائی ہے تو اسے معذور تصور کیا جائے اور اگر دانستہ طور پر ایسا کام کیا ہے تو وہ بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔افہام وتفہیم کے ذریعے اس جرم کی سنگینی کا اسے احساس دلایا جائے ہنگامہ درست نہیں اور نہ ہی ایسا کرنے سے نکاح ٹوٹتا ہے اگر امام کو اس فعل پر کوئی ندامت نہ ہو بلکہ وہ اپنے فعل کے صحیح ہونے پر اصرار کرتا ہے تو ایسے امام کو امامت سے معزول کر دیا جائے۔کیوں کہ در پردہ وہ روافض کا حمایتی ہے اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت پیدا فرمائے اور ان کی عزت وناموس کے دفاع کی توفیق دے۔ [واللہ اعلم]

سوال ہارون آباد سے محمد اکرم دریافت کرتے ہیں کہ:

① باغ فدک کی حقیقت اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

② عباس علمبردار کے جھنڈے اٹھانا جائز ہیں یا ناجائز؟

③ شرک کیا ہے اور اس میں کونسی چیزیں شامل ہیں؟

④ قل خوانی، ساتواں اور چالیسواں کی شرعی حیثیت کیا ہے واضح کریں؟

⑤ ایک آدمی متعدد دفعہ قسمیں اٹھا کر انہیں توڑ دیتا ہے ان حالات میں کفارہ کیسے ادا ہوگا؟

جواب شمالی حجاز میں واقع خیبر کے قریب فدک ایک بستی کا نام ہے جو پانی کے قدرتی چشموں اور کھجوروں کے باغات پر مشتمل تھی۔خیبر کی طرح اس میں بھی یہودی کاشتکار آباد تھے۔جب خیبر فتح ہوا تو فدک کے باشندوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اگر آپ ہمیں امان دے دیں تو ہم اپنی جملہ جائیداد چھوڑ کر یہاں سے کہیں اور چلے جاتے ہیں آپ نے ان کی درخواست کو منظور فرما لیا۔اس طرح یہ گاؤں کسی قسم کی جنگی کارروائی کے بغیر فتح ہوگیا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی پیداوار سے اپنے اہل وعیال کے اخراجات اور دیگر ذاتی ضروریات کو پورا کرتے اور باقی اللہ کی راہ میں صرف کر دیتے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فدک کی زمین اور اس کے باغات کے متعلق حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تقاضا کیا کہ فدک کا خطہ میرے والد بزرگوار کی میراث کے طور پر میرے حوالے کیا جائے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کے مطالبہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کے پیش نظر تسلیم نہ کیا۔آپ نے بطور دلیل فرمان نبوی پیش کیا۔''ہمارا کوئی وارث نہیں ہوگا ہم نے جو کچھ بھی چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے''۔

[بخاری: کتاب فرض الخمس]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مزید فرمایا: ''کہ اس خطہ کی پیداوار اسی مصرف میں استعمال ہوگی جس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعمال فرمایا کرتے تھے۔اہل بیت کی ضروریات کو حسب سابق پورا کیا جاتا رہے گا۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس اصولی موقف سے اتفاق نہ کیا بلکہ کبیدہ خاطر ہوئیں بالآخر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کی تیمارداری کے لیے ان کے گھر تشریف لے گئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو راضی کر لیا۔

② عباس علمبردار کے جھنڈے اٹھا کر مخصوص دنوں میں گھومتے پھرنا یہ تمام ایک خاص مکتبہ فکر کی شعبدہ بازیاں ہیں جو سادہ لوح

مسلمانوں کو پھانسنے کے لیے عمل میں لائی جاتی ہیں تا کہ ان کے سامنے اہل بیت کے ساتھ اپنی خودساختہ محبت کا اظہار کر کے ان کے جذبات سے کھیلا جائے واضح رہے کہ یہ سب کچھ دینداری کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔ جس پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں دی جاتی۔ لہٰذا ایسا کرنا ناجائز ہے مسلمانوں کو اس قسم کی بدعات سے اجتناب کرنا چاہیے۔

③ شرک کا لغوی معنی حصہ داری ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور حقوق واختیارات میں کسی طور پر غیر کو شریک کرنا یا اس کا عقیدہ رکھنا شرک ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کی ہیں اور انہیں اپنے بندوں کے لیے نشان بندگی ٹھہرایا ہے انہیں کسی اور کے لیے ثابت کرنا شرک ہے مثلاً سجدہ کرنا، نذر ماننا، مشکل کے وقت پکارنا، کائنات میں ہر قسم کے تصرفات کی طاقت رکھنا، یعنی اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو داتا، حاجت روا، مشکل کشا، غریب نواز، گنج بخش، بگڑی بنانے اور تقدیر سنوارنے والا خیال کرنا شرک اکبر کے زمرے میں آتا ہے جو خالص توبہ کے بغیر معاف نہیں ہو گا۔ ریاکاری اور غیر اللہ کے نام پر قسم اٹھانا بھی شرک ہے۔ لیکن اسے شرک اصغر کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا علیہم السلام کو توحید پھیلانے اور شرک مٹانے کے لیے بھیجا اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں محفوظ رکھے۔

④ ان رسومات کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے جملہ امور بدعات میں شامل ہیں۔ کیوں کہ انہیں دین کا حصہ سمجھ کر اور ثواب کی نیت سے کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا جو ان کاموں کی بجا آوری کے لیے بطور دلیل پیش کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو کوئی ایسا کام کرتا ہے جس پر ہماری طرف سے مہر تصدیق ثبت نہیں وہ مردود ہے۔ اس بنا پر یہ بدعات ایجادِ بندہ ہیں۔ ہر مسلمان کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

⑤ اگر ایک ہی معاملہ کے لیے متعدد قسمیں اٹھاتا ہے تو ایک ہی قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ خواہ مجلس ایک ہو یا متعدد۔ کیوں کہ اس صورت میں قسم پہلی ہی ہے۔ باقی تاکید کے طور پر ہیں۔ لیکن اگر واقعات ومعاملات مختلف ہیں جن کے لیے قسمیں اٹھاتا ہے تو اگر انہیں توڑے گا اتنی ہی دفعہ کا کفارہ ادا کرنا پڑے گا۔ قرآن کریم کی وضاحت کے مطابق قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ "دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلایا جائے جو عام طور پر اپنے اہل وعیال کو کھلایا جاتا ہے۔ یا دس مساکین کو کپڑے دیئے جائیں۔ یا ایک غلام آزاد کیا جائے یا اگر ان سے کوئی بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے جائیں۔ [۵/المائدہ:۸۹]

سوال محمد منور بن ذکی احمد ریاض سعودیہ سے دریافت کرتے ہیں کہ ایک سلفی العقیدہ شخص اپنی عام زندگی میں سیاہ لباس پہن سکتا ہے یا نہیں؟ نیز بتائیں کہ عید کی نماز مسجد میں ادا کی جا سکتی ہے جبکہ کوئی مستقل عید گاہ نہ ہو، کیا نماز عید کا خطبہ منبر پر دیا جا سکتا ہے؟

جواب ☆ سیاہ لباس کی ممانعت کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے بلکہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سیاہ لباس زیب تن فرمایا چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اون کا ایک سیاہ جبہ تیار کیا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنا۔ [ابوداود: کتاب اللباس]

بعض روایات میں اس کی مزید تفصیل ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنا تو آپ کا سفید رنگ اور جبہ کا سیاہ رنگ ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ کبھی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید مکھڑے کو دیکھتی اور کبھی لباس کی سیاہ رنگت کو دیکھتی

پھر پسینہ کی وجہ سے اس سے ناگوار ہوا آنے لگی تو آپ نے اسے اتار دیا۔ [مسند امام احمد]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام خالد رضی اللہ عنہا بن خالد کو خود اپنے دست مبارک سے سیاہ چادر پہنائی پھر آپ نے خود ہی اس کی تحسین فرمائی۔ [صحیح بخاری: کتاب اللباس]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر یوں عنوان قائم کیا ہے "باب الخمیصه السوداء" سیاہ چادر پہننے کا بیان، اس سے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے میلان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ البتہ اظہار غم کے لیے سیاہ لباس نہیں پہننا چاہیے کیوں کہ ہمارے معاشرہ میں ایک مخصوص گروہ کے نزدیک سیاہ لباس ماتمی لباس ہے۔

☆ نماز عید کھلے میدان میں پڑھنا مسنون ہے رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نماز عید کھلے میدان میں پڑھتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ: "کان النبی ﷺ یخرج یوم الفطر والا ضحی الی المصلیٰ" [بخاری]

رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن (نماز کی ادائیگی کے لیے) عید گاہ کی طرف جاتے۔ یہ عید گاہ مدینہ کی آبادی سے باہر ایک جنگل میں واقع تھی۔ اگر کوئی عذر شرعی مثلاً: بارش، آندھی، یا زیادہ سردی ہو تو مسجد میں ادا کی جاسکتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے: "کہ ایک دفعہ عید کے دن بارش ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے نماز عید مسجد میں پڑھائی" اگرچہ اس حدیث کی سند کمزور ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ [التلخیص الحبیر ص:۲/۸۳]

تاہم مجبوری کے وقت مسجد میں نماز عید ادا کی جاسکتی ہے۔ جب اہل مسجد مستقل عید گاہ بنانے کی پوزیشن میں نہ ہوں تو مسجد میں نماز ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

عام حالات میں نماز عید آبادی سے باہر کسی پارک یا میدان میں ادا کرنی چاہیے۔ کیوں کہ یہ شوکت اسلام کا مظہر اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کی علامت ہے۔ ایسا کرنا رحمت الٰہی کے نزول کا باعث اور خیر و برکت کے حصول کا ذریعہ ہو گا۔ شاہ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "کہ عید کی نماز آبادی سے باہر کھلے میدان میں پڑھنا چاہیے۔ مسجد میں بلا عذر شرعی عید پڑھنا بہتر نہیں ہے۔" [غنیۃ الطالبین]

☆ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نماز عید کا خطبہ منبر کے بغیر ارشاد فرماتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے۔ "باب الخروج الی المصلیٰ بغیر منبر" عید گاہ منبر کے بغیر جانے کا بیان۔ روایات میں ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کی طرف منہ کیا اور خطبہ کے لیے اپنی جائے نماز میں کھڑے ہوئے (ابن ماجہ) وہیں اپنے پاؤں پر کھڑے کھڑے خطبہ ارشاد فرمایا (صحیح ابن خزیمہ) ان روایات کو بیان کرنے کے بعد حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: "هذا مشعر بأنه لم یکن بالمصلیٰ فی زمانه منبر" [فتح الباری:۲/۵۷۹]

یہ روایات اس بات کی دلیل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عید کے موقع پر منبر نہیں ہوتا تھا۔ اگرچہ ایک روایت میں صراحت ہے کہ جب آپ خطبہ سے فارغ ہوئے تو منبر سے اترے۔ [ابوداؤد: ابواب الضحایا]

لیکن یہ روایت ضعیف ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے کیوں کہ اس میں ایک راوی مطلب کا سماع حضرت جابر رضی اللہ عنہ

سے ثابت نہیں ہے۔صحیح روایات میں صرف ''نزل'' کے الفاظ ہیں محدثین نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ خطبہ سے فراغت کے بعد مردوں کی جگہ سے عورتوں کی جگہ کی طرف منتقل ہوئے۔ [الفتح الربانی:ص۱۴۸/۲]

مروان کے دور میں خطبہ عید کے لیے عیدگاہ میں منبر لے جانے کا آغاز ہوا چنانچہ روایات میں ہے:''اخرج مروان المنبر في يوم عيد ولم يكن يخرج به في يوم عيد'' [مسند امام احمد]

یعنی مروان سے پہلے عیدگاہ میں منبر لے جانے کا رواج نہیں تھا اس پر حاضرین میں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں بایں الفاظ اعتراض کیا۔

''يامروان خالفت السنة اخرجت المنبر يوم عيد ولم يكن يخرج به في يوم عيد'' (مسند امام احمد) اے مروان! تو نے عیدگاہ میں منبر لے جا کر سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہے، اس سے قبل منبر لے جانے کا رواج نہ تھا۔بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اعتراض کرنے والے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت مسعود انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔بہرحال عیدگاہ میں منبر لے جانا خلاف سنت ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال فیصل آباد سے حبیب الرحمٰن لکھتے ہیں کہ آج کل بعض ادویات میں الکحل (شراب) ملائی جاتی ہے؟ کیا ایسی ادویات سے علاج درست ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں فتویٰ دیں۔

جواب شریعت اسلامیہ نے ہر نشہ آور چیز کو حرام کہا ہے، پھر جس چیز کی زیادہ مقدار استعمال کرنے سے نشہ آتا ہو اس کی کم مقدار استعمال کرنا بھی حرام ہے۔یہ اس لیے کہ نفس کے اندر حرام چیز کے استعمال سے بچنے کے لیے جو حجاب ہوتا ہے وہ کم مقدار استعمال کر لینے سے اٹھ جاتا ہے۔یا کم از کم وہ رکاوٹ کمزور ضرور پڑ جاتی ہے حدیث میں ہے:''کہ جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔'' [ابوداؤد]

پھر یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ الکحل ''جوہر شراب'' ہے اور یہ حرام ہے۔اللہ تعالیٰ نے حرام چیزوں میں شفا نہیں رکھی۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر جو چیزیں حرام کی ہیں ان میں شفا نہیں ہے۔

[صحیح بخاری: کتاب الاشربہ]

اس روایت کو امام ابویعلیٰ الموصلی نے اپنی مسند میں مرفوعاً بیان کیا ہے اور امام ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[فتح الباری:۷۹/۱۰]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:''کہ حرام اشیاء کو بطور دوا استعمال نہ کرو۔'' [ابوداؤد: کتاب الطب]

شراب کے متعلق خصوصی طور پر فرمایا کہ یہ دوا نہیں بلکہ بیماری ہے، ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام چیزوں میں شفا نہیں ہے۔بلکہ نشہ آور چیزیں تو شفا کے بجائے بیماری کا باعث ہوتی ہیں، ہمارے ہاں جو انگریزی ادویہ بطور شربت استعمال ہوتی ہیں ان میں یہ جوہر شراب یعنی الکحل ضرور شامل ہوتی ہے جو کسی بھی صورت حلال نہیں ہے۔اگر جان بچانے کے لیے کوئی اضطراری صورت بن جائے تو الگ بات ہے۔بصورت دیگر ایک مسلمان کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ عام حالات میں ایسی ادویات کو اپنے

استعمال میں لائے جن میں الکحل کی آمیزش ہوئی ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت فن طب میں تمام تر ترقیات ایسے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی ہیں جو حلال وحرام کی تمیز سے عاری ہیں انہوں نے بیشتر ادویات میں الکحل کو دواسازی کے لیے مفید پا کر بکثرت استعمال کیا ہے، ہمیں ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ملتان سے امان اللہ خان دریافت کرتے ہیں کہ اسلام میں لونڈی اور غلام رکھنے کی کیا حیثیت ہے اور اس کی حدود وقیود اور شرائط کیا ہیں۔

جواب دین اسلام میں کئی ایک طریقوں سے غلاموں اور لونڈیوں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے جس کے نتیجہ میں آج کل لونڈی سسٹم تقریباً ناپید ہے لہٰذا اس کے متعلق سوالات ذہنی مفروضہ تو ہوسکتا ہے البتہ ضروریات زندگی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسئلہ کی وضاحت بایں طور ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ جنگ کے موقع پر جو مرد، عورتیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں انہیں شرعاً غلام اور لونڈی کہا جاتا ہے۔ ان کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ تمام اسیران جنگ کو حکومتِ وقت کے حوالہ کردیا جائے۔ کسی سپاہی یا فوجی کو حکومت کی پیشگی اجازت کے بغیر ان میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے البتہ حکومت ان کے متعلق درج ذیل اقدامات میں سے کوئی ایک مناسب اقدام کرسکتی ہے۔

☆ ان پر احسان کرتے ہوئے رواداری کے طور پر انہیں بلا معاوضہ رہا کردیا جائے۔
☆ ان سے فی کس مقررہ شرح کے مطابق فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔
☆ جو مسلمان قیدی، دشمن کے ہاتھ میں ہوں ان سے تبادلہ کرلیا جائے۔
☆ انہیں مالِ غنیمت سمجھتے ہوئے، مسلمان سپاہیوں میں تقسیم کردیا جائے۔

اس مؤخر الذکر صورت میں گرفتار شدہ عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے متعلق ہمارے ذہنوں میں بے شمار خدشات ہیں انہیں دور کرنے کے لیے اسلام کے مندرجہ ذیل اصول وضوابط کو پیش نظر رکھا جائے۔

① حکومتِ وقت کی طرف سے کسی سپاہی کو لونڈی کے متعلق حقوق ملکیت مل جانا ہی اس کا نکاح ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے باپ اپنی بیٹی کا عقد کسی دوسرے شخص سے کردیتا ہے جس طرح باپ نکاح کے بعد اپنی بیٹی واپس لینے کا مجاز نہیں ہوتا۔ اسی طرح حکومت کو بھی کسی سپاہی کی ملکیت میں دینے کے بعد وہ لونڈی واپس لینے کا اختیار نہیں ہے۔ اس بنا پر مسلمان سپاہی بھی صرف اسی عورت کے ساتھ صنفی تعلقات قائم کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے ملی ہو۔

② جو عورت جس کے حصہ میں آئے صرف وہی اس سے صنفی تعلقات قائم کرسکتا ہے کسی دوسرے شخص کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں، ہاں اگر حقیقی مالک کسی کے ساتھ اس کا نکاح کردے تو اس صورت میں دوسرے شخص کو حق تمتع حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس صورت میں اصل مالک اس لونڈی سے دیگر خدمات تو لے سکتا ہے لیکن اسے تمتع کی اجازت نہیں ہوگی۔

③ جس شخص کو کسی لونڈی کے متعلق حق ملا ہے وہ اس وقت صنفی تعلقات قائم کرسکے گا جب اسے یقین ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے اس کا ضابطہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایام ماہواری آنے کا انتظار کیا جائے۔ حمل کی صورت میں وضع حمل تک انتظار کرنا ہوگا۔

نوٹ:۔گھریلو خادمائیں اور کاروباری نوکر چاکر غلام اور لونڈی کے حکم سے خارج ہیں۔

سوال ملتان سے محمد اجمل سوال کرتے ہیں کہ داڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے اور اس کی مقدار کے متعلق شرعی ہدایات واضح کریں کیا ایک مشت سے زائد داڑھی کاٹنا جائز ہے، کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیل سے آگاہ کریں۔

جواب واضح رہے کہ داڑھی شعائر اسلام سے ہے اور یہ ایک مسلمان کے لیے شناختی علامت اور امتیازی نشان ہے۔رسول اللہ ﷺ نے ہمیں کئی ایک طریقوں سے اس کی اہمیت سے آگاہ فرمایا ہے۔چنانچہ فرمان نبوی ﷺ ہے:''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کراؤ''۔ [صحیح بخاری]

آپ ﷺ کے پاس ایرانی مجوسیوں کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:''یہ لوگ اپنی مونچھیں بڑھاتے اور داڑھی منڈواتے ہیں تم ان کی مخالفت کرو، اپنی داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں چھوٹی کرو''۔ [ابن حبان:۱/۴۰۸]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرنے کے متعلق فرمایا کہ:''تم لوگ اپنی داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو''۔ [مسند امام احمد:۵/۲۶۵]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں داڑھی بڑھانے اور مونچھیں پست کرنے کا حکم دیتے تھے۔ [صحیح مسلم]

واضح رہے کہ آپ ﷺ کا مذکورہ بالا حکم پانچ مختلف الفاظ سے مروی ہے، ان کے متعلق امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:''ان تمام الفاظ کا مطلب ہے کہ داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے''۔حدیث کا بظاہر یہی مطلب ہے۔ [شرح نووی:۱/۱۲۹]

رسول اللہ ﷺ کے متعلق مروی ہے:''کہ آپ ﷺ گھنی داڑھی والے تھے۔''(شمائل ترمذی)

ان تمام احادیث کے علاوہ قرآن مجید میں ابلیس لعین کے حوالہ سے یہ بیان ہوا ہے کہ میں انہیں حکم دوں گا چنانچہ یہ لوگ اللہ کی خلقت کو تبدیل کریں گے''۔ [النسآء]

اس آیت کریمہ کے پیش نظر جن امور فطرت میں اللہ نے تبدیلی کرنے کا حکم دیا ہے وہ جائز اور مباح ہیں۔مثلاً: ختنہ کرنا، زیر ناف بال لینا اور بغلوں کے بال اکھاڑو غیرہ۔البتہ داڑھی کے متعلق تبدیلی کرنے کا کہیں بھی اللہ نے حکم نہیں دیا ہے۔لہٰذا یہ کام ان شیطانی امور سے ہے جس کا اس نے اولاد آدم کو حکم دیا ہے اور وہ اس کی پیروی کررہے ہیں۔اس پہلو سے بھی داڑھی کے معاملہ پر غور کرنا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس دو ایرانی آئے جن کی داڑھیاں مونڈی ہوئی تھیں تو آپ ﷺ نے ان سے اظہار نفرت کرتے ہوئے انہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔آپ ﷺ نے فرمایا:''کہ مجھے تو میرے رب نے داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے''اس کے برعکس ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی داڑھی کے طول و عرض سے کچھ بال لے لیا کرتے تھے''۔(ترمذی) یہ روایت محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتی ،اور یہ روایت صحیحین کی متعدد روایات کے بھی خلاف ہے۔لہٰذا اس قسم کی روایت سے نہ تو کوئی مسئلہ ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی ترجیح کے لیے اسے پیش کیا جاسکتا ہے۔بعض حضرات جناب عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل کا سہارا لے

کر داڑھی کی کانٹ چھانٹ کو جائز سمجھتے ہیں۔لیکن یہ عمل سنت صحیح کے خلاف ہے اس لیے قابل حجت نہیں۔ پھر ان کا یہ عمل صرف حج وعمرہ کے موقع پر تھا وہ ہمیشہ کے لیے عام حالات میں اسے معمول نہیں بناتے تھے۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اعفاء اللحیہ والی حدیث کے راوی بھی ہیں، محدثین کا اصول ہے کہ جب کسی راوی کا عمل اس کی بیان کردہ روایت کے خلاف ہو تو روایت کا اعتبار ہوتا ہے،اس کے عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، کتب حدیث میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔جنہیں پیش کرنے کی اس فتویٰ میں گنجائش نہیں ہے۔

ان تمام بیان کردہ روایات کا تقاضا ہے کہ داڑھی رکھنا ضروری ہے اور اس میں کانٹ چھانٹ کرنا شرعاً جائز نہیں۔

[واللہ اعلم بالصواب]

سوال منڈی احمد آباد سے محمد منشاء ساجد دریافت کرتے ہیں کہ گھروں کی چھتوں پر جو جالا وغیرہ ہوتا ہے کیا یہ نحوست کی علامت ہے اور جو مکڑی جالا بنتی ہے اسے مارنا شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟

جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اپنے گھروں کو صاف ستھرا رکھو، یہود کی مخالفت کرو وہ اپنے گھروں میں گندگی اور کوڑا کرکٹ پھیلاتے ہیں۔ [کتاب الکنیٰ للدولابی:۲/۱۴۷]

اس حدیث کی بنا پر جو چیز بھی گھروں کی صفائی اور نظافت میں حائل ہوگی اسے دور کرنا ضروری ہے مکڑی کا جالا نحوست کی علامت خیال کرنا درست نہیں۔البتہ اجاڑ اور بے آبادی کی علامت ضرور ہے۔جبکہ ہمارے گھر آباد ہوتے ہیں،ان سے اجاڑ کی علامتوں کو دور کرنا چاہیے۔اگر مکڑی کو مارنے کے بغیر جالا وغیرہ اتار دیا جائے تو وہ خود کہیں اور بسیرا کرلے گی۔اگر گھر سے دور نہ ہو تو اس کے مارنے میں کوئی مواخذہ نہیں ہوگا،اگرچہ روایات میں ہے کہ اس نے اس غار پر جالا بن دیا تھا جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ داخل ہوئے تھے۔ [مسند امام احمد:۱/۳۴۷]

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس وجہ سے وہ قابلِ تکریم نہیں ہوسکتی جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تکریم بصراحت ثابت نہ ہو جائے۔بہر حال ہمیں اپنے گھروں کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے اور یہ مکڑی اور جالا گھروں کی صفائی میں ہوتے حائل ہیں۔لہٰذا ختم کرنا ضروری ہے۔

سوال شیخوپورہ سے محمد لطیف سوال کرتے ہیں کہ سر کے بالوں کی شرعی حیثیت اور مقدار کیا ہے؟

جواب کتب حدیث میں مروی مختلف روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سر کے بال مونڈے جاسکتے ہیں اور شریعت نے ایسا کرنے کی اجازت دی ہے۔البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ آپ کے بال رکھے ہوتے تھے اور ان کی مقدار مختلف اوقات میں مختلف ہوتی تھی،کبھی نصف کانوں تک اور کبھی کانوں کی لوؤں تک بڑھ جاتے ،بعض اوقات کندھوں تک بھی پہنچ جاتے اور کبھی گیسو کی شکل اختیار کرلیتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''جس کے بال ہوں وہ انہیں سنوارنے کا پابند ہے،سنوارنے میں تیل لگانا، کنگھی کرنا اور درمیان سے مانگ نکالنا' شامل ہے لیکن افسوس ہماری اکثریت آج کل مغربی تہذیب سے متاثر ہے۔فینسی بال اور ٹیڑھی مانگ نکالنے پر فخر کیا جاتا ہے حالانکہ ایسا کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کے خلاف ہے۔

سوال محمد صادق بذریعہ ای میل سوال کرتے ہیں کہ اہل حدیث مجریہ یکم مارچ، شمارہ نمبر ۹ میں سر کے بالوں کے متعلق آپ کا فتویٰ شائع ہوا ہے لیکن اس میں کسی کتاب کا حوالہ ندارد، براہ کرم باحوالہ تفصیل سے ہماری راہنمائی فرمائی۔

جواب اہل حدیث کے صفحات کی کمی کے پیش نظر بعض اوقات فتویٰ میں حوالہ دینے کا التزام نہیں کیا جاتا اب وہی فتویٰ ذرا تفصیل کے ساتھ باحوالہ ہدیہ قارئین ہے۔

سر کے بالوں کے متعلق ہماری اکثریت مغربی تہذیب سے متاثر ہے اور شرعی ہدایات سے آزاد ہو کر انہیں بطور فیشن رکھنے کی شوقین ہے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ سر کے اگلے حصے کے بال بڑھے ہوتے ہیں اور ان میں ٹیڑھی مانگ نکالی ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بالوں کے متعلق مندرجہ ذیل ہدایات دی ہیں۔

☆ سر کے تمام بال رکھے جائیں یا سب مونڈھ دیئے جائیں حدیث میں ہے:

''سر کے بال سب رکھے جائیں یا سب مونڈھے جائیں''۔ [صحیح مسلم: کتاب اللباس]

حضرت امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر بایں الفاظ عنوان قائم کیا ہے ''سر کے بالوں کے مونڈھنے کی اجازت کا بیان'' حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی جب شہادت ہوئی تو رسول اللہ ﷺ ان کے گھر تعزیت کے لیے گئے ان کے بچوں کو دیکھا کہ ان کے سر کے بال حد سے بڑھے ہوئے تھے آپ نے حجام کو بلا کر تمام بچوں کے بال منڈوا دیئے۔ [مسند امام احمد: ۱/۲۰۴]

حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ کثرتِ غسل کے عادی تھے اس لیے وہ عام طور پر اپنے سر کے بالوں کو صاف کرا دیا کرتے تھے''۔ [نسائی؛ ابوداود؛ ترمذی]

ان روایات کا حاصل یہ ہے کہ سر کے بال مونڈھے جا سکتے ہیں اور شریعت نے ایسا کرنے کی اجازت دی ہے البتہ رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ نے بال رکھے ہوئے تھے اور ان کی مقدار کے متعلق حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ کے بال نصف کانوں تک تھے۔ [ابوداود کتاب الترجل]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان اس سے ذرا مختلف ہے فرماتی ہیں: ''کہ آپ کے بال جمہ سے اوپر اور وفرہ سے نیچے ہوتے تھے۔'' [مسند امام احمد: ۶/۱۱۸]

جمہ وہ بال ہیں جو کندھوں تک پہنچ جائیں اور وفرہ وہ بال ہیں جو کانوں تک رہیں۔

مختلف حالات میں آپ کے بالوں کی مقدار مختلف ہوتی تھی جب انہیں کاٹ لیتے تو ان کی مقدار نصف کانوں تک ہوتی اور جب کاٹنے میں دیر ہو جاتی تو کبھی کانوں اور گردن کے درمیان تک رہتے (صحیح مسلم) اور کبھی کانوں اور کندھوں کے درمیان پہنچ جاتے۔ (سنن ابن ماجہ) اور بعض اوقات کندھوں تک بھی پہنچ جاتے۔ [بخاری: کتاب اللباس]

سفر کی حالت میں اگر بال کاٹنے کا موقع نہ ملتا تو بعض اوقات آپ کے بال گیسوؤں کی شکل اختیار کر جاتے تھے جیسا کہ فتح مکہ کے وقت جب آپ ﷺ حضرت ام ھانی رضی اللہ عنہا کے گھر رونق افروز ہوئے تو آپ کے چار گیسو تھے۔ (سنن ابی داؤد) جو حضرات رسول اللہ ﷺ کی اس عملی سنت کو پسند کرتے ہیں انہیں چاہیے کہ 'ابوجنڈل' بننے کے بجائے درج ذیل ہدایات کو پیشِ نظر رکھیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ کا ارشادگرامی ہے کہ جس کے بال ہوں وہ ان کا اکرام واحترام کرے۔ [ابوداؤد: کتاب الترجل]

بالوں کے اکرام میں چند چیزیں شامل ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

① انہیں حد سے تجاوز نہ کرنے دے جیسا کہ حضرت خریم اسدی رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ خریم اسدی اچھا آدمی ہے اگر اس کے بال حد سے بڑھے ہوئے نہ ہوں اور اس کی چادر ٹخنوں سے نیچی نہ ہو"۔ [مسند امام احمد: ۴/۱۸۰]

② اپنے بالوں کو سنوار کر رکھے سوارنے میں تین چیزیں شامل ہیں۔

☆ تیل لگانا۔ ☆ کنگی کرنا۔ ☆ درمیان سے مانگ نکالنا۔

③ اپنے سر کو کسی کپڑے یا ٹوپی سے ڈھانپ کر رکھے کیوں کہ ننگے سر گھومتے پھرنا کوئی شریفانہ عادت نہیں ہے بلکہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ننگے سر گھومنے پھرنے کو فرنگی عادت اور مغربی تہذیب قرار دیا جیسے آج مسلمانوں بالخصوص نوجوانوں نے اپنا لیا ہے۔ [تمام المنۃ: ۱۶۴]

یہ آخری ہدایت اگرچہ بال رکھنے یا نہ رکھنے دونوں حالتوں کو شامل ہے البتہ اگر بال رکھے ہوں تو بایں حالت ننگے سر گھومتے پھرنا بہت برا لگتا ہے پھر ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ کے معمولاتِ مبارکہ کے بھی خلاف ہے اس لیے ضروری ہے کہ جن حضرات کو رسول اللہ ﷺ کی اس عملی سنت سے پیار ہے وہ اس سے متعلقہ دوسری ہدایات کو بھی پیش نظر رکھا کریں۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال سورج اور چاند گرہن کیوں لگتا ہے، کیا یہ صحیح ہے کہ ان کے درمیان کوئی چیز حائل ہوجاتی ہے۔ مکمل رہنمائی فرمائیں۔

جواب سورج اور چاند گرہن کی حکمت حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے:"سورج او چاند کسی کے مرنے سے گرہن نہیں ہوتے یہ تو قدرت الٰہی کی دو نشانیاں ہیں۔ جب انہیں گرہن ہوتے دیکھو تو نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔" [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۰۴۱]

ایک روایت میں ہے کہ اس قسم کی نشانیاں تمہیں عبرت دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ ظاہر کرتا اسے دیکھو تو جلد از جلد دعا، استغفار اور یاد الٰہی کی طرف رجوع کرو۔ [صحیح بخاری: حدیث نمبر ۱۰۵۹]

لیکن ہم علم ہیئت کے طالب علم نہیں جو اس کی سائنسی توجیہہ بیان کریں البتہ اس کے متعلق مولانا عبدالرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:"چاند کی چودھویں رات کو سورج اور چاند کے درمیان زمین آجاتی ہے۔ لہٰذا چاند گرہن جب بھی ہوگا چودھویں کو ہوگا۔ اس طرح ۲۸ یا ۲۹ قمری تاریخ کو سورج اور زمین کے درمیان چاند آجاتا ہے لہٰذا سورج گرہن انہیں تاریخوں میں لگ سکتا ہے۔ لیکن ہر ماہ یہ واقعہ اس لیے پیش نہیں آتا کہ زمین اور چاند یا سورج کی اپنے اپنے مدار پر حرکت مستوی نہیں ہے۔ بلکہ ۵ درجے کا جھکاؤ ہے۔ لہٰذا یہ اجرام بسا اوقات بچ بچا کر نکل جاتے ہیں اور سورج یا چاند گرہن کا موقع کبھی کبھار ہی آتا ہے۔" [الشمس والقمر بحسبان: ۴۴]

سوال کیا سیاہ لباس پہننا درست ہے، ہم نے سنا ہے کہ قیامت کے دن یہ دوزخیوں کا لباس ہوگا.....؟

جواب سیاہ لباس کی ممانعت کے متعلق کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے اور نہ ہی ایسی روایات ہیں جن سے پتہ چلتا ہو کہ یہ اہل جہنم کا لباس ہوگا۔ بلکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے اون کا ایک سیاہ جبہ تیار کیا جسے

آپ ﷺ نے زیب تن فرمایا۔ [ابوداود: کتاب اللباس]

بعض روایات میں اس کی مزید تفصیل ہے کہ جب آپ نے سیاہ جبہ پہنا تو رسول اللہ ﷺ کا گورا رنگ اور جبہ کا سیاہ رنگ ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''کہ کبھی میں آپ کے سفید مکھڑے کو دیکھتی اور کبھی لباس کی سیاہ رنگت کو دیکھتی۔ پھر جب اس سے ناگوار ہوا آنے لگی تو آپ ﷺ نے اسے اتار دیا۔'' [مسند امام احمد: ۶/۱۴۴]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ایک عنوان بایں الفاظ قائم کیا ہے کہ ''سیاہ چادر پہننے کا بیان'' پھر آپ نے اس جواز کے لیے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام خالد بنت خالد رضی اللہ عنہا کو خود اپنے دست مبارک سے سیاہ چادر پہنائی اور پھر آپ نے خود ہی اس کی تحسین فرمائی۔ [صحیح بخاری حدیث: نمبر ۵۸۲۳]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ اونٹوں کو گرم لوہے سے نشان لگا رہے تھے اس وقت آپ نے سیاہ چادر پہن رکھی تھی۔ [صحیح مسلم: حدیث نمبر ۲۱۱۹]

ان احادیث سے محدثین کے میلان کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات سیاہ لباس پہننے کے جواز کا موقف رکھتے ہیں۔ البتہ اظہار غم کے لیے سیاہ لباس نہیں پہننا چاہیے کیوں کہ ہمارے معاشرے میں ایک مخصوص گروہ کے نزدیک سیاہ لباس رنج والم اور ماتم کی علامت ہے۔

سوال سگریٹ نوشی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب تمباکو کی حرمت کے متعلق کوئی نص صریح موجود نہیں ہے البتہ شریعت نے حلال وحرام کے متعلق جو عام اصول بیان کیے ہیں، ان کی رو سے اس کا استعمال حرام اور ناجائز معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ یا اپنے پڑوسیوں کے لیے ضرر رساں یا اپنے مال کے لیے ضیاع کا باعث ہو۔ تمباکو کے استعمال میں یہ تمام برائیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ جدید تحقیق کے مطابق تمباکو میں ایک ایسا زہریلا مادہ شامل ہوتا ہے جو بے شمار بیماریوں کو جنم دیتا ہے۔ ان میں سے مالیخولیا، بے خوابی، دماغی کمزوری، بدحواسی، مرگی اور پھیپھڑوں کا کینسر سرفہرست ہے۔ پھر اس کا استعمال بے فائدہ ہے جس سے مال کا ضیاع ایک بدیہی امر ہے، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے طیب چیزوں کو حلال فرمایا ہے تمباکو کے متعلق کوئی بھی عقلمند طیب ہونے کا فیصلہ نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے عادی حضرات بھی مقدس مقامات یعنی مساجد وغیرہ میں اس کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں، علاوہ ازیں یہ بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ اکثر بچے سگریٹ نوشی کی وجہ سے چوری اور جھوٹ جیسی بری عادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اپنے والدین سے چھپ چھپا کر سگریٹ نوشی کرتے ہیں جب جیب خرچ ختم ہو جاتا ہے تو سگریٹ نوشی کے لیے لوگوں کی جیبوں کو صاف کرنے کی سوچ میں پڑ جاتے ہیں، مختصر یہ ہے کہ اس کے استعمال سے بے شمار جسمانی، مالی، اخلاقی اور معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں جن کے پیش نظر اس کا استعمال ناجائز اور حرام ہے۔

سوال علی پور سے اسرار احمد سوال کرتے ہیں کہ حدیث میں عورت کے لیے ماتھے کے نوچنے کی ممانعت آئی ہے، کیا عورت مونچھوں کے بال اتار سکتی ہے؟ کیوں کہ اس جگہ بال بدنما لگتے ہیں۔ نیز کیا غیر ضروری بالوں کی صفائی کے بعد غسل کرنا لازمی ہے؟

جواب زمانہ جاہلیت میں عورتیں اپنے حسن کو نکھارنے کے لیے بہت سے مصنوعی اور غیر فطری امور سرانجام دیتی تھیں۔ چنانچہ ایسا کرنا دین اسلام کے مزاج کے خلاف تھا لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے ان تمام امور پر پابندی لگاتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو سرمہ بھرنے اور بھروانے والی ہیں' غیر ابرو کے بال نوچنے والی' حسن کی خاطر دانتوں کے درمیان فاصلہ کرنے والی اور اللہ کی ساخت کو تبدیل کرنے والی ہیں۔'' [صحیح بخاری]

اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ عورت کو اپنی ساخت وخلقت تبدیل کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ کسی تکلیف کے پیش نظر تبدیلی لائی جاسکتی ہے اسی طرح اگر عورت کے چہرے پر داڑھی آ جائے یا مونچھیں اُگ آئیں تو ان کا نوچنا بھی جائز نہیں ہے۔ [فتح الباری: ۱۰/۳۷۷]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''حسن کی خاطر ابرو کے بال نوچنے حرام ہیں تاہم اگر عورت کی داڑھی یا مونچھیں اُگ آئیں تو ان بالوں کو زائل کرنا حرام نہیں ہے بلکہ ہمارے نزدیک مستحب ہے۔'' [شرح مسلم: ۱۴/۱۰۶ طبع مصر]

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یہ شرط لگائی ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے اپنے خاوند سے اجازت لی جائے۔ [فتح الباری]

ہمارے نزدیک اس طرح کی پابندی لگانا درست نہیں کیوں کہ اس سے ایک تو عورتوں کی نسوانیت مجروح ہوتی ہے پھر یہ پابندی اس حدیث کی زد میں بھی آتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو مردوں جیسی شکل وشباہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس لیے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ عورتوں کے لیے مونچھوں وغیرہ کا زائل کر دینا جائز ہے اور اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ نیز غیر ضروری بالوں کی صفائی کے بعد غسل کرنا ضروری نہیں کیوں یہ بال پلید نہیں ہیں۔ البتہ صفائی اور نظافت کے پیش نظر غسل کرلیا جائے تو بہتر ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص کی کچھ رقم چوری ہوگئی، اسے اپنے پاس آنے جانے والے ایک دوست کے متعلق شبہ تھا، اتفاق سے ایک تیسرے شخص نے حلفیہ بیان دیا ہے کہ جس پر چوری کا شبہ تھا اس نے میرے روبرو اقرار جرم کرلیا ہے لیکن جب معاملہ کی تفتیش ہوئی تو اس نے صاف صاف انکار کر دیا کہ میں نے نہ چوری کی ہے اور نہ ہی کسی کے پاس اقرار کیا ہے، اب کیا شرعی لحاظ سے اس تیسرے آدمی کے بیان حلفی کو بنیاد بنا کر مشتبہ آدمی پر چوری ڈالی جاسکتی ہے؟

جواب بشرطِ صحت سوال واضح ہو کہ چوری کا جرم ثابت کرنے کے لیے مندرجہ ذیل دو طریقے ہیں:

① دو عادل گواہ ملزم کے ارتکاب کی عینی شہادت دیں۔

② ملزم خود اقرارِ جرم کرے کہ میں نے چوری کی ہے۔ صورتِ مسئولہ میں مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اقرار کی دھندلی سی ایک شہادت ہے وہ بھی ''انکار بعد اقرار'' کی صورت اختیار کر چکی ہے، اتنی سی بات سے چوری ثابت نہیں ہوتی، اگر ایک گواہ کی عدالت ثابت ہو جائے جو چوری کی گواہی کے لیے ضروری ہوتی ہے تو اس کی گواہی کے ساتھ مدعی کی قسم سے فیصلہ ہوسکتا تھا، لیکن یہاں یہ صورت بھی نہیں کیوں کہ چوری کو ثابت کرنے کے لیے ایک بھی عینی گواہ نہیں ہے اندریں حالات اگر مدعی قسم اٹھانے پر آمادہ ہو جائے تو اس کی بنیاد کیا ہوگی؟ اگر گواہ کی عدالت بھی مشتبہ ہو اور مدعی کا قسم اٹھانا بھی

بے بنیاد ہوتو اتنی سی بات سے جرم ثابت نہیں ہوتا۔اور نہ ہی تیسرے آدمی کے بیان حلفی کو بنیاد بنا کر مشتبہ آدمی پر چوری ڈالی جاسکتی ہے۔ بلکہ اگر مدعی کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے تو مدعیٰ علیہ سے قسم لے کر اسے بے قصور قرار دیا جانا ہی مناسب ہے۔

سوال میرے بھانجے کی شادی میری بھتیجی کے ساتھ ہونا طے پائی، منگنی وغیرہ تین سال قبل ہو چکی ہے جبکہ نکاح 22دسمبر 2004ء کو متوقع ہے۔شومئی قسمت سے میرے بھانجے نے ازراہ ہمدردی کسی کو اپنا خون دینے کا ارادہ کیا، جب خون چیک کرایا تو پتہ چلا کہ اسے ہیپاٹائٹس سی کا مرض ہے، کچھ ڈاکٹر حضرات کی رائے ہے کہ بھانجے کی شادی اس کی بھتیجی سے نہ کی جائے کیوں کہ شادی کے بعد بیماری کے جراثیم بھتیجی میں منتقل ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں اس صورتحال کے پیش نظر بھتیجی کے والدین اس شادی سے خوفزدہ ہیں کہ اس نکاح سے ہماری بیٹی زیادہ متاثر ہوگی، شادی نہ ہونے سے یہ بھی اندیشہ ہے کہ دو قریبی رشتہ داروں کے درمیان جدائی اور قطع تعلقی پیدا ہو جائے، برائے مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں دونوں خاندانوں کی صحیح راہنمائی فرمائیں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار ہے۔ (حفیظ الرحمٰن اسلام آباد: خریداری نمبر ۵۸۲۶)

جواب دورِ جاہلیت میں تو ہم پرستی عام تھی، یعنی بیماریوں کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کے حکم سے بالا بالا ذاتی اور طبعی طور پر متعدی ہیں گویا وہ اڑ کر دوسروں کو چمٹ جاتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے اس عقیدہ کا ابطال کرتے ہوئے فرمایا: ''کہ کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی۔'' [صحیح بخاری: ۵۷۷۲]

اس حدیث کا واضح مفہوم یہ ہے کہ کوئی بیماری طبع کے اعتبار سے دوسروں کو نہیں لگتی بلکہ اللہ کے حکم اور اس کی تقدیر سے دوسروں کو لگتی ہے جیسا کہ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دورِ جاہلیت کے عقیدہ فاسد کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی بیماری متعدی نہیں ہوتی تو ایک اعرابی کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا کہ ہمارے اونٹ ریتلے میدان میں ہرنوں کی طرح ہوتے ہیں جب ان کے ہاں کوئی خارشی اونٹ آجاتا ہے تو سب اونٹ خارش زدہ ہو جاتے ہیں اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ پہلے اونٹ کو خارشی کس نے بنایا تھا؟'' [صحیح بخاری: الطب ۵۷۷۵]

آپ کا یہ جواب انتہائی حکمت بھرا تھا کیوں کہ اگر وہ جواب دیتا کہ پہلے اونٹ کو بھی کسی دوسرے سے خارش کی بیماری لگی تھی تو یہ سلسلہ لاتناہی ہو جاتا اور اگر یہ جواب دیتا کہ جس ہستی نے پہلے اونٹ کو خارشی بنایا اسی نے دوسرے میں خارش پیدا کر دی تو یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام اونٹوں میں یہ فعل جاری کیا ہے کیوں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے بھی اس جاہلانہ عقیدہ کی بیخ کنی کی ہے چنانچہ آپ ﷺ نے ایک مجذوم یعنی کوڑھی کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لیے اپنے پیالہ پر ہی بٹھالیا اور فرمایا: ''کہ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اس کا نام لے کر کھاؤ۔'' [ترمذی: ۱۸۱۷]

صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سیرت طیبہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ ان کا ایک غلام کوڑھ کے مرض میں مبتلا تھا وہ آپ کے برتنوں میں کھاتا اور آپ ہی کے پیالہ سے پانی پیتا اور بعض دفعہ آپ کے بستر پر لیٹ بھی جاتا تھا۔ [فتح الباری، ص ۱۹۷ ج ۱۰]

ان احادیث وواقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے امراض کے وبائی طور پر لگ جانے کی نفی فرمائی ہے۔البتہ ان کے

بالاسباب متعدی ہونے کا اثبات فرمایا ہے یعنی اصل مؤثر حقیقی تو اللہ کی ذات گرامی ہے اور اس نے بعض ایسے اسباب پیدا کیے ہیں جن کے پیش نظر امراض متعدی ہو جاتے ہیں جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ نے امراض کے ذاتی طور پر متعدی ہونے کی نفی فرمائی تو حدیث کے آخر میں فرمایا کہ مجذوم یعنی کوڑھی انسان سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہو۔

[صحیح بخاری: الطب ۵۷۰۷]

نیز آپ ﷺ نے ضعیف الاعتقاد لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے ایسا فرمایا تاکہ اللہ کی تقدیر کے سبب بیماری لگ جانے سے ان کے عقیدہ میں مزید خرابی نہ پیدا ہو کہ وہ کہنے لگیں ''ہمیں تو فلاں مریض سے بیماری لگی ہے'' حالانکہ بیماری لگانے والا تو اللہ ہے اس موقف کی تائید ایک روایت سے ہوتی ہے کہ جب آپ ﷺ نے امراض کے متعدی ہونے کی نفی فرمائی تو آخر میں فرمایا: ''بیمار اونٹوں کو تندرست اونٹوں کے پاس مت لے جاؤ'' [صحیح بخاری: الطب ۵۷۷۱]

امراض کے بالاسباب متعدی ہونے اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کے عقائد کی حفاظت کے پیش نظر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس علاقہ میں طاعون کی وبا پھیلی ہو وہاں مت جاؤ اگر تم وہاں رہائش رکھے ہوئے ہو تو راہ فرار اختیار کرتے ہوئے وہاں سے مت نکلو'' [صحیح بخاری: الطب ۵۷۳۰]

امراض کے بالاسباب متعدی ہونے میں بھی اس بات کا بطور خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اصل مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ سبب کی موجودگی میں بیماری بھی آ موجود ہو کیوں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سبب موجود ہوتا ہے لیکن بیماری نہیں آتی بیماری کا آنا یا نہ آنا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے اگر وہ چاہے تو سبب کو مؤثر کر کے وہاں بیماری پیدا کر دے اگر چاہے تو سبب کو غیر مؤثر کر کے وہاں بیماری پیدا نہ کرے۔ [فتح الباری: ج۱۰، ص۱۹۸]

اس بات کا ہم خود بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ جس علاقہ میں وبائی امراض پھوٹ پڑتی ہیں وہاں تمام لوگ ہی اس کا شکار نہیں ہو جاتے بلکہ اکثر و بیشتر ان کے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں طبی لحاظ سے اس کی تعبیر یوں کی جا سکتی ہے کہ جن لوگوں میں قوت مدافعت زیادہ ہوتی ہے وہ بیماری کا مقابلہ کر کے اس سے محفوظ رہتے ہیں اور جن میں یہ قوت کم ہوتی ہے وہ بیماری کا لقمہ بن جاتے ہیں، اس وضاحت کے بعد ہم مذکورہ سوال کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی تہذیب کے علمبردار (یہود و نصاریٰ) یہ نہیں چاہتے کہ مسلمان اعتقادی، عملی اور اخلاقی و مالی اعتبار سے مضبوط ہوں، وہ آئے دن انہیں کمزور کرنے کے لیے منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے خیال کے مطابق ہیپاٹائٹس کے متعلق میڈیا پر شور وغل اور چیخ و پکار بھی مسلمانوں کو اعتقادی اور مالی لحاظ سے کمزور کرنے کا ایک مؤثر اور سوچا سمجھا منصوبہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے اس کے متعلق غیر فطرتی چرچہ شروع ہوا ہے، گھروں میں کوئی نہ کوئی اس مرض کا شکار ہے۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھائی، بہن، بیٹا، باپ، ماں اور بیوی خاوند اس اچھوت میں مبتلا ہو گئے ہیں، پہلے تو اس کے ٹیسٹ بہت مہنگے ہیں، ہزاروں روپیہ ان کی نذر ہو جاتا ہے پھر اس کا علاج اس قدر گراں ہے کہ عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے، جو گھر کے باشندے اس مرض سے محفوظ ہیں انہیں حفاظتی تدابیر کے چکر میں ڈال کر پھانس لیا جاتا ہے۔ حفاظتی ٹیکے بہت مہنگے اور بڑی

مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں، عوام کو خوفزدہ کرنے کے لیے یرقان کا نام بدل کر ہیپا ٹائٹس رکھ دیا گیا ہے، یہ مرض پہلے بھی موجود تھی لیکن اس کے جراثیم دیکھے نہیں جاسکتے تھے اس لیے نفسیاتی طور پر لوگوں کو آرام اور سکون تھا۔ جب سے خوردبینی آلات ایجاد ہوئے ہیں ہیپا ٹائٹس اے، بی، سی دریافت ہوا ہماری معلومات کے مطابق ڈی بھی دریافت ہو چکا ہے اس کے متعلق تحقیق وریسرچ جاری ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق مسلمانوں کے عقائد اوران کی مالی حالت کمزور کرنے کا یہ مغربی پروپیگنڈہ ہے، جس کی وجہ سے ہم توہم پرستی کا شکار ہو گئے ہیں اور علاج اس قدر مہنگا ہے کہ ہم قرض پکڑ کر اس کا علاج کراتے ہیں، ان حالات کے پیش نظر ہمارا سائل کو مشورہ ہے:

① اللہ پر اعتقاد اور یقین رکھتے ہوئے حسب پروگرام شادی کر دی جائے، اس پروپیگنڈے سے خوفزدہ ہو کر اسے معرض التوا میں ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

② اگر والدین اس پروپیگنڈے سے متاثر ہیں تو طے شدہ تاریخ پر نکاح کر دیا جائے لیکن رخصتی کو ملتوی کر دیا جائے تا آنکہ بچے کا علاج مکمل ہو جائے اور بچی کو بھی حفاظتی ٹیکے لگا دیئے جائیں۔

③ اگر والدین اس قدر پریشان ہیں کہ انہوں نے اس طے شدہ پروگرام کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو ہمارے نزدیک یہ گناہ ہے کیوں کہ ایسا کرنا صلہ رحمی کے خلاف ہے اور مغربی اثرات سے متاثر ہونا بھی مسلمان کی شان کے خلاف ہے۔

④ موت کا ایک وقت مقرر ہے، اس کا وقت آنے پر ہر انسان دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ جدید طب کے مطابق متعدی امراض سے وہی متاثر ہوتا ہے جس کے اندر بیماری قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اگر بیماری مقدر میں ہے تو وہ آکر رہے گی، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ بچے کا علاج کرایا جائے، بچی کو حفاظتی ادویات دی جائیں اور صلہ رحمی کے پیش نظر سنت نکاح بروقت ادا کر دی جائے، اللہ تعالیٰ ہمارے عقائد و اعمال کو محفوظ رکھے اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی توفیق دے۔

سوال قرآن مجید کی تلاوت باعث اجر و ثواب ہے، رمضان المبارک میں اس تلاوت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے، ہمارے ہاں ایک کتابچہ اس حوالہ سے تقسیم کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے ''صرف ۹ منٹ میں ۹ قرآن پاک اور ایک ہزار آیات پڑھنے کا ثواب مل سکتا ہے''۔ اس میں احادیث کے حوالہ جات بھی موجود ہیں، حقیقت حال سے آگاہ فرمائیں۔ (حافظ عبدالغفار السہیل، میاں چنوں)۔

جواب احادیث میں بعض سورتوں اور آیات کی فضیلت کے پیش نظر سوال میں مذکورہ اعداد و شمار کو کافی خیال کر لیا گیا ہے مثلاً سورۂ اخلاص کو رسول اللہ ﷺ نے ایک تہائی قرآن کے برابر بیان فرمایا ہے۔ [صحیح بخاری: فضائل قرآن ۵۰۱۳]

محدثین کرام نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ قرآن کریم احکام، اخبار اور توحید کے بیان پر مشتمل ہے چونکہ اس میں توحید خالص بیان کی گئی ہے اس لیے اسے ثلث قرآن کے مساوی قرار دیا گیا ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس کی قرأت کے ثواب کو ایک تہائی قرآن پڑھنے کے ثواب کے برابر بتایا ہے۔ [فتح الباری: ج ۹ ص ۷۷]

لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان سوال میں ذکر کردہ اعداد و شمار کی جمع و تفریق میں لگا رہے اور قرآن کریم کی

تلاوت کونظر انداز کردے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''کہ اگر کوئی رمضان المبارک میں عمرہ کرتا ہے تو اسے حج کے برابر ثواب ملتا ہے'' اس کا مطلب فریضہ حج سے صرف نظر کرنا قطعاً نہیں ہے۔ بعض سورتوں کے فضائل احادیث میں مروی ہیں لیکن وہ احادیث محدثین کے معیار صحت پر پوری نہیں اترتیں جیسا کہ سورۃ الزلزال کے متعلق ہے کہ وہ نصف قرآن اور سورۃ الکافرون ربع قرآن کے مساوی ہے لیکن اس کی سند میں یمان بن مغیرہ نامی راوی ضعیف ہے نیز بعض احادیث میں ہے کہ سورۃ النصر ربع قرآن اور آیت الکرسی بھی ربع قرآن کے برابر ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی سلمہ بن وردان ضعیف ہے جیسا کہ محدثین کرام نے اس کی وضاحت کی ہے۔ [فتح الباری: ج۹ ص۷۸]

مذکورہ کتابچہ میں بعض احادیث مسند دیلمی کے حوالہ سے بیان کی گئی ہیں، محدثین کرام کے فیصلے کے مطابق اس کتاب کی بیشتر احادیث موضوع اور خود ساختہ ہیں۔ بہر حال سورۂ اخلاص کی فضیلت صحیح احادیث سے ثابت ہے لیکن کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ یا دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم کی تلاوت کونظر انداز کر کے صرف سورۂ اخلاص کو تین مرتبہ پڑھنے کو کافی سمجھ لیا ہو، عام مشہور ہے کہ برگد کے دودھ میں والدہ کے دودھ کی تاثیر ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بچے کو والدہ کا دودھ نہ پلایا جائے صرف برگد کے دودھ پر اکتفا کرلیا جائے، اسی طرح قرآنی سورتوں کی فضیلت اپنی جگہ درست ہے لیکن اعداد و شمار کے پیش نظر صرف انہیں پڑھتا رہے اور قرآن کریم کی تلاوت نہ کرے یہ کسی صورت میں صحیح نہیں ہے۔

سوال میری لڑکی لیڈی ٹیچر کی حیثیت سے سکول میں تعینات ہے، سسرال والوں کا مطالبہ ہے کہ پوری تنخواہ ہمیں دیا کرو، جبکہ اس کا خاوند کسی فیکٹری میں معقول تنخواہ پر ملازمت کرتا ہے، کیا لڑکی کی تنخواہ گھر کے اخراجات کے لیے وصول کی جاسکتی ہے؟

(محمد صادق، راولپنڈی، خریداری نمبر ۲۳۱۷)

جواب شرعی طور پر لڑکی اپنی ملازمت کے دوران ملنے والی تنخواہ کی خود مالک ہے، وہ اپنی مرضی سے گھر کے اخراجات کے لیے صرف کرسکتی ہے، سسرال والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے وصول کرنے کے لیے اس پر دباؤ ڈالیں یا بزور وصول کریں۔ خاوند کو یہ حق تو پہنچتا ہے کہ وہ ملازمت نہ کرائے لیکن وہ بھی زبردستی تنخواہ نہیں وصول کرسکتا، اس سلسلہ میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کو زیادہ طول نہ دیا جائے بلکہ گھر میں بیٹھ کر اسے افہام و تفہیم کے ذریعے حل کیا جائے، لڑکے کے والدین کو خوش اسلوبی سے اس معاملہ میں قائل کیا جاسکتا ہے لیکن لڑکی کو بھی اس کے متعلق غور کرنا ہوگا کہ کہیں دنیا کی یہ دولت اس کی بربادی کا باعث نہ بنے، اصل بات گھر کی آبادی ہے، اس پر کسی صورت میں آنچ نہیں آنا چاہیے۔

سوال بعض لوگ فوت شدگان کے ایصال ثواب یا اپنے گھروں اور فیکٹریوں میں برکت کے لیے قرآن خوانی کراتے ہیں، ہمارے اہلحدیث مدارس تحفیظ القرآن میں یہ سلسلہ موجود ہے کہ بچوں کو قرآن خوانی کے لیے بھیجا جاتا ہے، کیا ایسا کرنا رسول اللہ ﷺ یا تعامل صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ (حافظ احمد مرتضٰی، سیالکوٹ خریداری نمبر ۱۷۶۶)

جواب شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے ان دنوں بے شمار ایسی چیزیں دین اسلام میں داخل کر لی گئی ہیں جن کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت نہیں تھا، ان میں سے مروجہ قرآن خوانی بھی ہے، اس کے ذریعے مردوں کو ثواب پہنچانے کا رواج عام ہو چکا

ہے، اس کے علاوہ گھروں، فیکٹریوں اور مارکیٹوں میں برکت کے لیے بھی مدارس کے طلبا کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں، مُردوں کے لیے قرآن خوانی تو ایک کاروبار کی شکل اختیار کر گئی ہے، دوسرے مزدوروں کی طرح قرآن خواں بھی بآسانی کرایہ پر مل جاتے ہیں، حالانکہ میت کے لیے قرآن خوانی نہ تو قرآن سے ثابت ہے اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ ''کہ انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی'' کی تفسیر میں لکھتے ہیں: امام شافعی اور ان کے اتباع نے اس آیت کریمہ سے یہ مسئلہ استنباط فرمایا ہے کہ قرأت قرآن کا ثواب فوت شدگان کو ہدیہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ وہ ان کی محنت وکوشش کا نتیجہ نہیں ہے اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اس عمل کو مستحب قرار نہیں دیا ہے اور نہ ہی آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی ظاہری حکم یا اشارے سے اس کی طرف راہنمائی کی ہے اور یہ طریقہ کسی صحابی سے بھی منقول نہیں ہے، اگر اس میں نیکی کا کوئی پہلو ہوتا تو وہ ضرور ہم سے پیش قدمی کرتے، نیک کاموں سے متعلق صرف کتاب وسنت پر اکتفا کیا جاتا ہے کسی کے ذاتی فتویٰ، قیاس یا رائے سے کوئی حکم ثابت نہیں کیا جا سکتا، البتہ دعا وصدقہ کا ثواب پہنچنے میں سب کا اتفاق سے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس سلسلہ میں واضح ارشادات موجود ہیں۔ [تفسیر ابن کثیر: ج۴ص ۲۵۸]

اس طرح مکانات ودکانات میں خیر وبرکت کے لیے خود قرآن پڑھا جا سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں مدارس کے طلبا کی خدمات حاصل کرنا، قرآن خوانی کے بعد دعوتِ طعام کا اہتمام کرنا بھی قرون اولیٰ سے ثابت نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''کہ جس نے ہمارے دینی معاملے میں کوئی نئی چیز ایجاد کی جو اس سے نہیں وہ مردود ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الصلح]

لہٰذا ایسے کاموں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ [واللہ اعلم بالصواب]

سوال ایک خاتون (خریداری نمبر ۳۴۷۹) نے متعدد سوالات روانہ کیے ہیں حسب ترتیب سوالات مع جوابات مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ رسول اللہ ﷺ موت کی خبر سنانے سے منع کرتے تھے کیا فوتیدگی کا اعلان کرنا درست ہے؟

☆ اگر عورت کے چہرے پر مونچھیں اُگ آئیں تو کیا انہیں صاف کیا جا سکتا ہے؟

☆ کیا بچوں یا بڑوں کو برہنہ دیکھنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

☆ عشاء کی نماز کے بعد دو نفل ادا کیے جا سکتے ہیں؟

☆ اگر زکوٰۃ کی مدت رمضان سے پہلے پوری ہو جائے تو کیا اسے رمضان میں ادا کرنے کے لیے روکا جا سکتا ہے تاکہ ثواب زیادہ ہو۔

☆ سوال درج کرنے سے حیا مانع ہے۔

جواب جوابات بالترتیب درج ذیل ہیں۔

☆ دورِ جاہلیت میں رواج تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کے فضائل ومناقب بیان کرتے ہوئے گلی کوچوں میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے اعلانات سے منع فرمایا ہے۔ [مسند امام احمد: ج۵ص ۴۰۶]

البتہ مسجد میں سادگی کے ساتھ فوتیدگی کی اطلاع اور نماز جنازہ کا اعلان کیا جا سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حبشہ کے سربراہ حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کے فوت ہونے کی اطلاع اور اس کے جنازہ کا اعلان فرمایا تھا۔ [مسند امام احمد: ج ۲، ص ۲۴۱]

☆ مردوزن کے بال تین طرح کے ہوتے ہیں۔

① جن کے زائل کرنے سے شریعت نے منع فرمایا ہے مثلاً مرد کی داڑھی اور مردوزن کے ابروؤں کے بال، انہیں زائل کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

② جن کا زائل کرنا شریعت میں مطلوب و پسندیدہ ہے مثلاً مردوزن کے موئے بغل وزیر ناف اور مرد کی مونچھیں وغیرہ شریعت نے حکم دیا ہے کہ انہیں زائل کیا جائے۔

③ جن کے زائل یا باقی رکھنے کے متعلق شریعت نے سکوت اختیار فرمایا ہے مثلاً عورت کی داڑھی اور اس کی مونچھیں وغیرہ ان بالوں کے متعلق شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے بلکہ انسان کے اپنے ارادہ و اختیار پر موقوف رکھا ہے، ایسی چیزوں کے متعلق شریعت کا قاعدہ ہے کہ وہ قابل معافی ہیں، ان کا عمل میں لانا، نہ لانا دونوں برابر ہیں۔ [ابوداؤد: الاطعمۃ، ۳۸۰۰]

اب ان کے متعلق وجہ ترجیح تلاش کرنا ہوگی وہ یہ ہے کہ عورت کو داڑھی اور مونچھوں کے بال اس قدرتی نسوانی حسن میں باعث رکاوٹ ہیں۔ پھر عورت کی خلقت اور جبلت کے بھی خلاف ہیں۔ لہٰذا ان زائد بالوں کا زائل کرنا ہی شریعت میں مطلوب ہے۔

[واللہ اعلم]

☆ شریعت نے نواقض وضو کی تعیین کر دی ہے، کسی کو برہنہ دیکھنا نواقض وضو سے نہیں ہے، شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے جو خواتین مدتِ رضاعت کے بعد بچوں کو نہلاتی ہیں اگر ان کا ہاتھ صابن وغیرہ استعمال کرتے وقت ان کی شرمگاہ کو لگ جائے تو انہیں نماز کے لیے نیا وضو کرنا ہوگا۔

☆ عشاء کی نماز کے بعد دو سنت پڑھنے کا احادیث میں ذکر آیا ہے، دو نفل ادا کرنے کی صراحت کسی حدیث میں نہیں ہے ہاں وتر کے بعد دو رکعت ادا کرنے کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کا عمل مبارک ملتا ہے، وہ بھی ہمیں کھڑے ہو کر ادا کرنے چاہئیں، انہیں بیٹھ کر ادا کرنا سنت نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ سے انہیں بیٹھ کر ادا کرنا آپ کا خاصہ ہے، اس کی تفصیل گزشتہ کسی فتویٰ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

☆ اگر مال نصاب زکوٰۃ کو پہنچ جائے اور وہ ضروریات سے فاضل ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے، اگر کوئی زکوٰۃ کا مستحق ضرورت مند ہے تو فوراً ادا کر دینا چاہیے، امید ہے کہ ثواب میں کمی نہیں آئے گی ہاں اگر کوئی ضرورت مند وقتی طور پر سامنے نہیں ہے تو ثواب میں اضافہ کے پیش نظر اسے رمضان تک مؤخر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاہم بہتر ہے کہ جب بھی زکوٰۃ واجب ہو فوراً اس سے عہدہ برآ ہو جائے کیوں کہ زندگی اور موت کے متعلق کسی کو علم نہیں وہ اللہ کے اختیار میں ہے اگر زکوٰۃ دیئے بغیر اللہ کا پیغام اجل آ گیا تو اخروی باز پرس کا اندیشہ ہے۔

☆ خاوند کو فطرت و شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی بیوی سے تمتع کرنے کی اجازت ہے، سوال میں ذکر کردہ صورت اگرچہ شریعت کے خلاف نہیں تاہم فطرت سے متصادم ضرور ہے۔ [واللہ اعلم]

سوال ایک شخص کی داڑھی اتنی طویل ہے کہ ناف سے نیچے تک ہے اور گھنی اتنی کہ رخسار بھی نظر نہیں آتے، ایسی صورت حال کے پیش نظر داڑھی کو رخساروں سے صاف کرنا اور ناف کے نیچے سے کاٹ دینا درست ہے۔ (حاجی ضیاء الدین، بہاولنگر خریداری نمبر ۱۴۰۱)

جواب داڑھی کے متعلق ہمارا موقف یہ ہے کہ اسے اپنی حالت پر رہنے دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی طرف سے بھی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ کیونکہ

① اس کے متعلق امر نبوی ﷺ ہے اور رسول اللہ ﷺ کا امر وجوب کے لیے ہے الا یہ کہ قرینہ صارفہ ہو۔

② اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا یہود و نصاریٰ اور مشرکین و مجوس سے ہمنوائی ہے جبکہ ہمیں ان کی اس سلسلہ میں مخالفت کرنے کا حکم ہے۔

③ اس کی کانٹ چھانٹ تخلیق الٰہیہ میں تبدیلی کرنا ہے جس سے ہمیں منع کیا گیا ہے کیوں کہ ایسا کرنا ایک شیطانی حربہ ہے۔

[۴/النسآء:۱۱۹]

④ داڑھی کا بڑھانا امور فطرت ہے، اس لیے داڑھی کو فطرتی حالت میں رہنے دیا جائے اور اس سے غیر فطرتی عمل نہ کیا جائے۔

⑤ ہمیں نسوانی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ داڑھی منڈوانے سے عورتوں سے مشابہت ہوتی ہے اس سے محفوظ رہنے کا یہی طریقہ ہے کہ اسے اپنی حالت پر رہنے دیا جائے۔

⑥ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فرمان کے مطابق داڑھی منڈوانا ''مثلہ'' کے مترادف ہے اور اس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

⑦ داڑھی منڈوانا ایسا قبیح فعل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے مرتکب دو ایرانی باشندوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

صورت مسئولہ میں بعض اہل علم بایں طور پر نرم گوشہ رکھتے ہیں کہ

① داڑھی کے متعلق مندرجہ ذیل تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے امر نبوی منقول ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما [صحیح بخاری: اللباس، ۵۸۹۲]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ [صحیح مسلم: طہارۃ، ۶۰۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما [مجمع الزوائد: ج۵، ص۱۶۹]

جبکہ یہ تینوں اکابر کے متعلق روایات میں ہے کہ بالعموم یا خاص مواقع پر ایک مشت سے زائد داڑھی اور رخساروں کے بال کٹوا دیتے تھے۔

[حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، صحیح بخاری: ۵۹۲، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ طبقات ابن سعد: ج۴، ص۳۳۴، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مصنف ابن ابی شیبہ: ج۴، ص۸۵]

اگرچہ ہمارے نزدیک قابل عمل راوی کی درایت نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی روایت ہے۔

② امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے سوال ہوا کہ اگر آدمی کی داڑھی بہت زیادہ طول ہو جائے تو کیا کرے؟ آپ نے فتویٰ دیا کہ ایسی حالت

میں اسے اعتدال پر لانے کے لیے کاٹا جاسکتا ہے۔ [باجی شرح مؤطا: ج ۷ ص ۲۲۶]

③ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے امام طبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اگر آدمی اپنی داڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دے اور اس کا طول وعرض اس حد تک بڑھ جائے کہ لوگوں کے ہاں ''اضحوکہ روزگار'' بن جائے تو ایسی حالت میں اسے کاٹا جاسکتا ہے۔ [فتح الباری: ج ۱۰ ص ۴۳۰]

④ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات میں ہے کہ ان کے پاس ایک شخص لایا گیا جس کی داڑھی حد سے بڑھی ہوئی تھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے معقول حد کے نیچے سے اسے کاٹ دیا تھا، حافظ ابن حجر نے طبری کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ [واللہ اعلم]۔

اگر کوئی اس قسم کے دلائل سے مطمئن ہو تو مذکورہ شخص کے متعلق نرم گوشہ رکھنے میں چنداں حرج نہیں ہے بصورت دیگر اسے استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ سنت کی حفاظت پر اللہ کے ہاں بے پایا اجر وثواب کی امید کی جاسکے، ہم نے ایسے بزرگ بھی دیکھے ہیں کہ دوران نماز جب رکوع کرتے تھے تو ان کی داڑھی زمین پر آلگتی تھی، اب وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ہاں کروٹ کروٹ رحمت سے نوازے۔ آمین

سوال پشاور سے کامران لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سوالات کا کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔

① کیا اسلام کا نظام حکومت جمہوریت ہے اگر نہیں تو اہل حدیث اس کے علمبردار کیوں ہیں؟۔

② حدیث کی اقسام ضعیف، موضوع وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضع نہیں کیں، اہل حدیث اسے کیوں مانتے ہیں؟۔

③ کیا اسلام میں شخصی حکومت جائز ہے اگر نہیں تو آپ ایسی حکومتوں کی تائید کیوں کرتے ہیں؟۔

④ کیا شافعی، حنفی اور دیگر مسالک کی عورتوں سے نکاح جائز ہے؟۔

⑤ ایک آدمی ایک گناہ کئی مرتبہ کرتا ہے، ہر دفعہ توبہ کرتا ہے اور اسے چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے۔ کیا ایسی توبہ قبول ہے؟۔

جواب ہم نے متعدد مرتبہ اپنے قارئین کو توجہ دلائی ہے کہ صرف ایسے سوالات کا جواب دریافت کیا جائے جو عملی زندگی سے متعلق ہوں اور ان کی تعداد بھی زیادہ سے زیادہ تین ہونا چاہیے۔ آپ حضرات اپنے وقت کا احساس کیا کریں کیونکہ اس کے متعلق بھی قیامت کے دن باز پرس ہوگی، اب ترتیب وار سوالات کے مختصر جوابات ملاحظہ فرمائیں:

① مغربی جمہوریت، اسلام کا نظام حکومت نہیں ہے۔ جس کی بنیاد یہ ہے کہ عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لیے، اس قسم کی جمہوریت کا کوئی بھی اہل حدیث علمبردار نہیں ہے، اسلام کا نظام حکومت شورائی ہے اور ہم اس کی لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہی نظام حکومت بہتر ہے، جو اسلام کے تابع ہے۔

② حدیث کی مذکورہ اقسام کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق اہم خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو''۔ [۴۹/الحجرات: ۶]

اسی تحقیق اور چھان پھٹک کے نتیجہ میں ضعیف، موضوع وغیرہ معرض وجود میں آئی ہیں۔ محدثین کرام کا یہ مقولہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ''اگر سند نہ ہوتی تو حدیث کے متعلق ہر انسان جو چاہتا کہہ دیتا''۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث کے سلسلہ میں تثبت سے کام لیا ہے۔ ہم اہل حدیث بھی اسی اصول کو بروئے کار لاتے ہیں اور حدیث کی اقسام تسلیم کرتے ہیں۔

③ اگر کوئی حکومت عدل وانصاف اور شریعت کا نفاذ کرتی ہے تو وہ اسلامی حکومت ہے۔ قطع نظر کہ وہ شخصی ہے یا غیر شخصی۔ اسلامی ہونے کا دارومدار اس کے جمہوری اور ملوکیت پر نہیں بلکہ اسلامی قانون کی بالادستی پر ہے، ہماری تائید کی بنیاد یہی کتاب وسنت کی بالادستی ہے۔

④ حنفی، شافعی مسلمان ہیں ان سے شادی بیاہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ شرک کا ارتکاب نہ کریں، دیگر مذاہب میں سے صرف اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ مسلمان خاوند کے ان سے نکاح کے بعد اخلاق متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ قرآن کریم نے اس پہلو کو مدنظر رکھنے کا واضح اشارہ دیا ہے۔

⑤ توبہ کی شرائط یہ ہیں۔ اعتراف جرم، اظہارِ ندامت اور اخلاص کے ساتھ اصلاحِ کردار کا عزم بالجزم، اور اگر مالی معاملہ ہے تو اس کا درست کرنا۔ اگر ان شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے توبہ کی ہے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں شرفِ قبولیت سے نوازی جائے گی، اس طرح دوبارہ گناہ کرنے پر بھی انہی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے توبہ کی جاسکتی ہے۔ اگر گناہ کرتے وقت شروع ہی سے نیت خراب ہو تو یہ توبۃ الکذابین ہے۔ جس کا اللہ کے حضور کوئی اعتبار نہ ہے۔

سوال ملتان سے محمد خاں لکھتے ہیں کہ مندرجہ ذیل سوالات کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب درکار ہے۔

① آج کل عراق میں پاکستانی افواج بھیجنے کے متعلق اخبارات میں لکھا جارہا ہے، اس کے متعلق شرعی لحاظ سے وضاحت کریں۔

② اگر اسرائیل کو تسلیم کرلیا تو ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ براہِ کرم تفصیل سے جواب دیں۔

جواب عراقی عوام، امت مسلمہ کا حصہ ہیں، ان کے حقوق وہی ہیں جو عام مسلمانوں کے ہیں۔ اس وقت ائمہ کفر نے اس بات پر اتفاق کرلیا ہے کہ شجرِ اسلام کو بیخ وبن سے اکھاڑ دیا جائے اور اہل اسلام سے بھی جینے کا حق چھین لیا جائے۔ انہوں نے پہلے افغانستان میں خونِ مسلم سے ہاتھ رنگے، پھر عراقی عوام پر چڑھ دوڑے ہیں تاکہ انہیں صفحۂ ہستی سے نیست ونابود کردیا جائے، شریعت کی نظر میں تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، رنگ ونسل، قوم وملک کی اس میں کوئی تمیز نہیں ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ مصیبت کے وقت اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے اور ضرورت کے وقت اپنے بھائی کا بھرپور تعاون کرے، کسی بھی مسلمان کے خلاف کفار کا تعاون کرنا بہت گھناؤنا جرم ہے جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم کرنا یا اسے دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ [صحیح بخاری: مظالم ۲۴۴۲]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تمام مسلمان باہمی مودت ومحبت اور رأفت وشفقت ایک جسم کی طرح ہیں، اگر اس کا ایک عضو کسی تکلیف میں مبتلا ہوجائے تو پورا جسم اس کی درد محسوس کرتا ہے۔'' [صحیح بخاری: کتاب الادب]

احادیث میں مسلمان کی شان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کفار کے مقابلے میں مسلمان کی مدد کرے گا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں اور وہ اپنے علاوہ کفار کے خلاف یک جان ہیں۔'' [مسند امام احمد: ۲/۲۱۵]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کہ اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔'' [صحیح بخاری: الادب ۶۰۶۴]

کیا یہ اخوتِ اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ عراقی مسلمان جواب امریکی غلامی کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، اس مشکل

وقت میں مدد کی بجائے ان کے خلاف دشمن کی مدد کے لیے فوج بھیجی جائے اور ان کے تازہ زخموں پر نمک پاشی کی جائے، ہمارے نزدیک آزادی کی جنگ لڑنے والے عراقی مجاہدین کے خلاف غاصب امریکہ کی مدد کے لیے افواج بھیجنا حرام ہے، اور یہ اقدام ملی غیرت کا جنازہ نکالنے کے مترادف ہے، ہمیں سوچنا چاہیے کہ اگر ہم اپنے جوانوں کو کسی اسلامی ملک میں اس مقصد کے لیے روانہ کرتے ہیں کہ وہ آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے خلاف امریکہ کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اور اس کے احکام بجالائیں، تو ایسی حکمت عملی اسلامی نقطۂ نظر سے ایک المیہ سے کم نہ ہوگی۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمان فوجی دوسرے مسلمانوں کے قتل میں حصہ دار بنے، اگر ایسا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری دوستی دشمنوں سے ہے، ایسے حالات میں قرآن کا فیصلہ یہ ہے ''کہ جو دشمنوں سے دوستی رکھتا ہے وہ انہیں میں سے ہے۔'' [۵/المآئدہ:۵۱]

رسول اللہ ﷺ نے اس قسم کے قومی جرم کے مرتکب کا جنازہ نہیں پڑھا۔ جیسا کہ مالِ غنیمت سے چوری کرنے والے کے متعلق احادیث میں آیا ہے، اس بنا پر ہمارے حکمرانوں کو سوچنا چاہیے کہ ہماری افواج کو مسلمانوں کے خلاف لڑتے ہوئے مرنے کی صورت میں انہیں مسلمانوں کی دعاؤں اور ان کے جنازوں سے محروم نہ کریں۔

② دین اسلام کا مزاج ہے کہ وہ اس عالم رنگ و بو میں ادیان باطلہ میں غالب آنے کے لیے آیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اسے تمام مذاہب پر غالب کردے۔'' [۶۱/الصف:۹]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین اسلام کو آفاق میں پھیلانے والا اور دوسرے تمام ادیان باطلہ پر غالب کرنے والا ہے۔ یہ غلبہ دلائل کے لحاظ سے ہو یا مادی وسائل کے اعتبار سے، بہرحال اس کے مزاج میں مغلوب ہونا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام اپنی پالیسی کے پیش نظر سب سے پہلے اہل کفر کو دعوت دیتا ہے کہ اسے قبول کرلیا جائے اگر اسے قبول کرلیں تو ان کے حقوق دوسرے مسلمانوں کے برابر ہیں۔ انکار کی صورت میں ان کے سامنے دو راستے پیش کرتا ہے، اگر تم نے کفر نہیں چھوڑنا تو جزیہ دے کر ہماری ماتحتی قبول کرلو، اس طرح انہیں دنیا میں زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر ماتحتی قبول نہ کریں تو پھر انہیں اس عالم رنگ و بو میں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، تا آنکہ وہ ذلیل وخوار ہوکر اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا کریں''۔ [۹/التوبہ:۲۹]

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کو مشرکین سے قتال عام کا حکم دیا ہے، اس کے بعد اس آیت کریمہ میں یہود و نصاریٰ سے قتال کا حکم دیا جارہا ہے، اگر یہ لوگ اسلام قبول نہ کریں تو انہیں جزیہ دے کر مسلمانوں کی ماتحتی میں رہنا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسرائیل کا وجود مسلمانوں کے خلاف ایک گہری سازش کا نتیجہ ہے، مسلمانوں کے خلاف منصوبے بنانا اور انہیں عملی شکل دینا اس کا نصب العین ہے، دیگر کفر کی حکومتیں اس کے مفادات کا تحفظ کرتی ہیں، اس کے وجود کو تسلیم کرنا ایسا ہے کہ گویا مسلمانوں کے خلاف اس کی چیرہ دستیوں کو آہنی تحفظ دینا ہے، قبلہ اول پر غاصبانہ قبضہ اور فلسطینی مسلمانوں کو آتش و آہن کی بارش سے تہس نہس کرنا اس کے مکروہ عزائم کی عکاسی کرتا ہے، پس پردہ کفر کی یہ سازش ہے کہ اہل پاکستان اسرائیل کو تسلیم

کرنے کے بعد خود بخود عرب مسلمانوں سے کٹ جائیں گے اور انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، لہٰذا کفر کی اس سازش سے ہمیں ہر وقت آگاہ رہنا چاہیے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

حرف اول

توحید وعقیدہ

رسالت وولایت

طہارت و وضو

اذان و نماز

جنائز و زیارت قبور

زکوٰۃ وصدقات

حج وعمرہ

روزہ و اعتکاف

خرید و فروخت

وصیت و وراثت

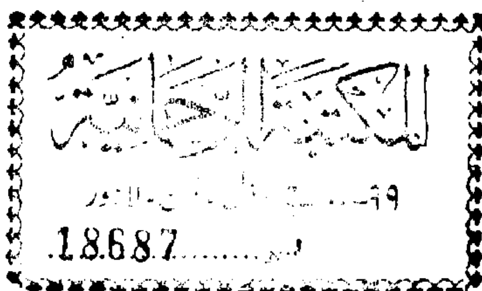
نکاح وطلاق

جمعہ و عیدین

آداب واخلاق

متفرقات







فتاویٰ
اصحاب الحدیث